سالِ اولیں نمبر

قیمت ۳۵ روپئے

یہ ریاست غریبوں کی آسودگی کا سرچشمہ ہو

ریاست مہاراشٹر کا ہر عمل عوام کی بہتری، فلاح و بہبود کے لیے ہے۔ اس لائحہ عمل سے غریب زیادہ سے زیادہ مستفیض ہو سکیں یہی اس کا مقصد ہے۔

اس مقصد کی تکمیل کیلئے چھوٹے کاشتکاروں کی پہچان حال ہی میں بدل دی گئی ہے۔ اور ۶ ہیکٹر تک والی بنجر زمین کی ملکیت رکھنے والے یا ان کا حصول ۱۵ ایکڑ تک ہے ایسے کاشتکاروں کا شمار بھی چھوٹے کاشتکاروں میں کیا گیا ہے۔ کئی کاشتکار اب اس زمرے میں شمار ہونگے اور چھوٹے کاشتکاروں کو ملنے والے تمام فائدے اور سہولتیں ان کو ملیں گی۔

بے سہارا لوگوں کی امداد کرنے والی سنجے گاندھی کی [illegible] علاوہ ازیں بیروزگار جوانوں کو خود کفیل بنانے والی [illegible] حکومت کا ایک اہم اقدام ہے۔ علاوہ ازیں بے گھر مزدوروں کیلئے امداد باہمی کے اصول پر قائم کرنے کی تجویز۔ ملک کی آزادی کے لیے جنہوں نے اپنی جان نچھاور کیں، انکی یادگار کیلئے ریاست میں ۲۰۴ مقامات پر ان کے مجسمات نصب کرنیکی غرض سے ۹ اگست ۹۱ کو سنگ بنیاد رکھا گیا۔ ساتھ ہی ان کے عزیز و اقارب کو مالی امداد دینے کی تجویز کو بھی عملی جامہ پہنایا گیا۔

جن کی قربانیوں کی بدولت آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں ایسے غریب عوام کی فلاح کیلئے ہم پورے عزم کیساتھ ایکبار عہد کریں اور پورے اعتماد کے ساتھ کہیں کہ یہ ریاست غریبوں کی آسودگی کا سرچشمہ ہو۔

(ڈی ڈائرکٹوریٹ جنرل آف انفارمیشن اینڈ پبلک ریلیشنس۔ گورنمنٹ آف مہاراشٹر۔ ممبئی ۴۰۰۰۳۲)

خالقِ انقلابِ ایران حضرت آیت اللہ العظمیٰ خمینی

سوانح حیات :- حضرت آیت اللہ خمینی ۲۰ جمادی الثانی ۱۳۲۰ھ میں ایران کے شہر خمین میں پیدا ہوئے۔ حسنِ اتفاق سے حضرت فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تاریخ ولادت بھی یہی ہے۔

پینتیس سال کی عمر میں آپ "اجتہاد" کے بلند مرتبہ پر فائز ہوئے اور آیت اللہ بروجردی کے وصال کے بعد مسلمانانِ ایران نے آپ کو اپنا مستند مذہبی پیشوا تسلیم کرلیا۔

ایران میں سرمایہ دارانہ نظام کی نحوست کو عام کرنے کی سازش زوروں پر تھی۔ امام خمینی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے ایک آہنی چٹان کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے اور طبرستان میں سیکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اس سازش کے پردے کی دھجیاں اڑادیں اور ایران کے باشندوں کو اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور اس کوشش میں ظالم و جابر حکومت کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو ملک بدر کیا گیا۔ اور آپ ترکی منتقل ہوگئے۔ اور وہاں سے نجف اشرف چلے آئے۔ اور وہیں سکونت اختیار کی اور ایران میں اسلامی انقلاب برپا کرنے کی فکر میں برابر لگے رہے۔

جب ایران میں اسلامی انقلاب کی جڑیں مضبوط ہونے لگیں تو شاہ نے آپ کے نجف سے اخراج کے لیے صدام کو نامزد کیا۔ اوراس طرح آپ کو نجف سے پیرس جانا پڑا۔ لیکن آپ اپنی حکیمانہ رہبری میں اسلامی انقلاب کو آگے بڑھاتے رہے۔ آخر کار ۱۱ بہمن ۱۳۵۷ھ میں آپ پیرس سے ایران لوٹ آئے۔ اور اسلامی جمہوریہ کی بنیاد رکھی۔ اور ایرانی مسلمانوں کو خدمت و ایثار کی اعلا قدروں سے روشناس کرایا۔ اور اس مقدس مجاہد نے مشرق و مغرب کی طاقتور قوموں سے جس انداز سے اپنا لوہا منوایا تاریخ اس کی شاہد ہے۔ آپ نے تمام مخالف طاقتوں کو مغلوب کرکے ایران کی دلیر اور جانباز قوم کے تعاون سے بالآخر ایران میں سلطنت مہدیہ کی بنیاد رکھی۔

سوانح آیت اللہ صدوقی

آیت اللہ صدوقی ۱۹۰۸ء میں یزد کے مذہبی اور روحانی خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد آغا مرزا کا شمار شہر کے مشہور و ممتاز علما میں ہوتا تھا۔ آپ کے جدّ امجد مرزا محمد رضا کرمان شاہی اپنے زمانے کے جید عالم تھے۔

آیت اللہ صدوقی بچپن ہی میں یتیم ہوگئے لیکن اپنے چچازاد بھائی کی زیر سرپرستی حصولِ علم میں برابر لگے رہے۔ اور ۱۹۲۳ء میں یزد میں فارغ التحصیل ہوئے۔ مزید حصولِ علم کے لیے آپ نے چند روز اصفہان میں بھی قیام کیا۔ ۱۹۲۳ء میں آپ اپنے خاندان سمیت قم منتقل ہوگئے۔ اور مسلسل ۱۲ سال حصولِ علوم دینیہ میں مشغول رہے اور اپنی ذہانت اور علمی استعداد سے آیت اللہ حائری یزدی جیسے جید عالم کو کافی متاثر کیا۔ آپ نے حضرت آیت اللہ خمینی کے سامنے بھی زانوے ادب تہ کیا اور اپنے علم میں بیش بہا اضافہ کیا۔

مرحوم آغا وزیری اور اہلِ یزد کے اصرار پر آپ قم سے یزد لوٹ آئے اور یہاں کے دلیر و جانباز عوام کی قیادت سنبھال کر مذہبی مراکز مثلاً مسجد اور مدرسوں وغیرہ کی اصلاح کا کام شروع کیا۔ عوام کے اذہان سے مذہبی اثرات کو ختم کرنے کے لیے شاہ نے "انقلاب سفید" کے نام سے تحریک چلائی تھی۔ سب سے پہلے آیت اللہ [illegible] کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور جب انھیں گرفتار کیا گیا تو ملک کے مختلف علاقوں سے جو لوگ اس پر احتجاج کرنے کے لیے تہران میں جمع ہوئے تھے۔ ان میں آیت اللہ صدوقی پیش پیش تھے۔ آپ ہی وہ فرد واحد تھے جنھوں نے ابادان کے ریکس سینما کے حادثے کی مذمت کرتے ہوئے شاہ کی حکومت کو مورد الزام ٹھہرایا تھا۔

امام خمینی کے ملک بدر ہونے کے بعد امام صدوقی نے ان سے برابر رابطہ رکھا اور اسلامی انقلاب کے سلسلے میں آن سے احکامات حاصل کرتے رہے اور امام خمینی کے مشن کو جاری رکھا۔ جب امام خمینی پیرس منتقل ہوگئے تو آیت اللہ صدوقی نے پیرس جاکر ان سے ملاقاتیں اور ان سے بالمشافہ رہبری اور روشنی حاصل کرکے ایران میں اسلامی انقلاب کی مقدس تحریک کو آگے بڑھاتے رہے۔

امام خمینی سے آپ کا اشتراک ظالم و جابر مخالفین سے دیکھا نہ گیا اور آخر کار ان ظالموں نے آپ کے مقدس خون سے اپنے ہاتھ رنگ لیے۔

کالی داس گپتا رضا

تحقیق و تالیف

اور

شاعری کی روشنی میں

مصنف: ظفر ادیب   مرتب: مانک ٹالا

کالی داس گپتا رضا ظفر ادیب اور مانک ٹالا

اردو ادب کے تحفظ کی یہ تثلیث

اس کی ضامن ہے کہ یہ کتاب اردو ادب میں بلاشبہ ایک اضافہ ہے

قیمت ۳۵ روپے

ناشر: جیوپیٹر پبلشرز بمبئی

تقسیم کار

ساکار پبلشرز (پرائیوٹ) لمیٹڈ

۱۵۷ اجولی بھون نمبر ا۔ ۱۰ نیو مرین لائنز

بمبئی 400020

اردو دنیا نے افسانہ نگاری میں ایک نیا ابھرتا نام

ڈاکٹر اودے سرن ارمان

جو ہندی افسانوی دنیا میں کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ہندی افسانہ نگاری میں اپنا ایک انفرادی مقام رکھتے ہیں

اگر آپ

قومی یکجہتی کے دلدادہ ہیں۔ یا ہندو مسلم اتحاد کے حامی۔ یا دیہات (گاؤں) کی سادہ اور پاک فضا میں زندگی بسر کرنے والوں کی جی داری۔ عزت و ناموس پر مر مٹنا۔ باہمی رفاقت اور غیر فرقہ وارانہ روابط کی دلکش سچی کہانیاں پڑھنا چاہتے ہیں نیز جہیز اور دیگر مجلسی برائیوں کو دور کرنے کی حمایت کرتے ہیں تو

پڑھیے

مان سرور

جو ڈاکٹر اودے سرن ارمان کے اکیس ایسے اچھوتے اور دل و دماغ پر اثر کرنے والے سچائی پر مبنی اردو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جو اپنی دلکشی۔ بہترین لکھائی چھپائی اور دیدہ زیب قومی یکجہتی کے رنگوں میں آپ کی نظروں کو دعوت مطالعہ دے گا۔ قیمت ۲۱/ روپیہ علاوہ محصول ڈاک یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ کسی بھی افسانہ کو شروع کریں اور بغیر پورا پڑھے کتاب کو رکھ دیں۔

ملنے کا پتہ

یو۔ ایس۔ اے۔ ہسپتال

پوسٹ بلاری ضلع مراد آباد .... یو پی

(نوٹ، دفتر ماہنامہ شان ہند، نئی دہلی ۲ ۱۱۰۰۰ سے بھی یہ کتاب دستیاب ہے)

ماہنامہ

پونا

سرپرست و نگراں :-

حکیم رازی ادیبؔ اشرفی
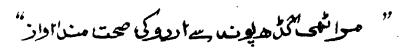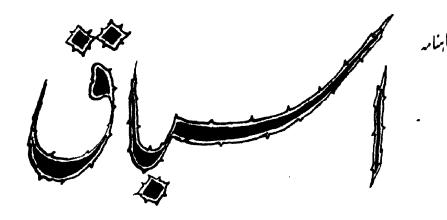
مدیران :- نذیر فتح پوری - سید آصف

تزئین و آرائش :- رشید اعجاز

جلد ۱ - ۲	مارچ، اپریل، مئی، جون	شمارہ ۱۱ - ۱۲ - ۱۳ - ۱۴

اصلاح کار :-

مظہر امام
ڈاکٹر عصمت جاوید
ایم - یوسف
دلدار ہاشمی
مشتاق مدنی
عطار تہر ذوالنہری
رشید اعجاز

قیمت - سالِ اوّلین نمبر - ۲۵ روپے

زرِ سالانہ —— ۱۸ روپے

معاونین :-

کالی داس گپتا رضا
عتیق احمد عتیق
محبوب راہی
ڈاکٹر اودے سرن ارمان
عاصی رامپوری
مناظر عاشق ہرگانوی
شاہد نعیم

مراسلت کا پتہ :-
۸۳، ایروڈا
پونہ - ۶

ترسیلِ زر کا پتہ :-
۵۷۲، ساچاپیر اسٹریٹ
پونہ - ۱

کتابت :- عبدالماجد ماجد، عبدالمجید رشک

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر اور مالک نذیر فتحپوری نے
ہلال آفسیٹ پرنٹنگ اسکول پونہ ۱ سے چھپوا کر ۵۷۲،
ساچاپیر اسٹریٹ پونہ ۱ سے شائع کیا۔

فہرست ابواب

تاثرات

حکیم رازی ادیبی اشرفی - پونہ

اُردو جہاں بدقسمت ہے، وہاں خوش نصیب بھی ہے۔ بدقسمت اس لحاظ سے کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں ہمیشہ زک اٹھاتی رہی ہے۔ تنگ نظر ہم وطنوں نے اپنے سیاسی مفادات کی جنت سجانے کے لیے گلشنِ اردو کو ہمیشہ تاخت و تاراج کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اردو اپنی سخت جانی کے باعث تمام نامساعد حالات کا مقابلہ کرتی رہی سسکتی رہی، متاثر ہوتی رہی، مگر جیتی رہی۔

اُردو خوش نصیب اس لحاظ سے ہے کہ اسے ہر دور میں ایسے چاہنے والے مل گئے۔ جو اس کی حفاظت کے لیے آہنی دیوار کی طرح اس کے گرد کھڑے ہو گئے اور اس پر کی جانے والی ہر یلغار کو پسپا کرتے رہے اور نہ صرف اس کی حفاظت کی بلکہ اس کی سلطنت کے دائرہ کو وسیع بھی کرتے رہے۔ ان محافظین اُردو کی صف میں ان گنت ادباء اور شعراء شامل ہیں جن سے محبانِ اردو کما حقہٗ واقف ہیں۔ یہاں میں صرف غالبؔ اور سر سید احمد خان کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اردو کے دو عظیم محسن ہیں۔ غالبؔ نے اپنے خطوط کے ذریعہ اردو نثر کو جو موڑ دیا۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے سر سید احمد خان نے اردو نثر کو سلیس کیا اور اسے دائرۂ عاشقی سے نکال کر تاریخی، اخلاقی، ملکی و سیاسی اور اسی نوعیت کے مختلف مضامین سے مالا مال کیا۔ ان مضامین کے باعث اردو داں طبقہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ ؎

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا

یعنی زندگی محض عشق و محبت کے فسانوں تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ دنیا کے مروجہ علوم سے واقفیت حاصل کرنا بھی ضروری ہے۔ سر سید کے مضامین نے اردو ادب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا۔ ان کی اقتدا میں دیگر ادباء نے بھی ایسے ہی مضامین قلمبند کرنا شروع کیے۔ ان میں سے ہر ادیب نے اپنے لیے ایک ایک میدان منتخب کر لیا اور مختلف موضوعات پر سینکڑوں کتابیں تصنیف ہوئیں جن کے باعث اردو اس قابل ہوئی کہ دنیا کی دیگر ترقی یافتہ زبانوں کی ہمسری کا دعویٰ کر سکے۔

نثر کے انقلاب کا اثر نظم پر بھی ہوا۔ لہٰذا مسائلِ زندگی سے تعلق رکھنے والی باتیں اشعار میں پیش کی جانے لگیں۔ مولانا حالیؔ اس کے پیش رو تھے۔ اس کے بعد ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند ادب کی تحریک نے اردو ادب میں تہلکہ مچا دیا اور اسے زندگی کا ترجمان کیا۔ آج اردو جس مقام پر ہے اسے دیکھ کر اس کے شیدائیوں کے سینے فخر سے تن جاتے ہیں۔ حضرت داغؔ مرحوم نے بجا طور پر فرمایا تھا ؎

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغؔ

سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

آج اردو عالمی شہرت کی مالک ہے۔ اس کی مقبولیت متعصب لوگوں کو بہت گراں گزر رہی ہے۔ لہٰذا اس کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کا مشورہ بھی اسی سازش کی ایک کڑی ہے۔ ایسے عالم میں اردو کی بقا اور ترقی کے لیے کوشش کرنا یا اس کے لیے کام کرنے والوں کے ساتھ تعاون کرنا ہر محبِ اُردو کا اخلاقی فرض ہے۔ اردو کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ملک کے ہر اس شہر سے جہاں اردو بولنے والے بستے ہیں، اردو اخبار یا رسالہ شائع ہو اور جن جن مقامات سے یہ جرائد شائع ہوتے ہیں ان کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے اور خریداروں کی تعداد میں اضافہ کیا جائے تاکہ اخبارات و رسائل کو مالی مشکلات کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔ محض مالی مشکلات کے باعث بیسوں اچھے اخبارات وعمدہ علمی و ادبی رسائل بند ہو چکے ہیں۔

بہرکیف! اسی خیال کے پیشِ نظر پیلیؔ اردو کے چند پرستار جناب نذیر فتح پوری، جناب دلدار ہاشمی، جناب رشید اعجاز اور جناب سید آصف نے پونہ سے اردو کے علمی، ادبی اور سماجی جریدے کی اشاعت کا ارادہ کیا اور مشورے کے لیے اس حقیر پر تقصیر کے پاس آئے۔ ایک مدت دراز سے میرے دل میں ایک علمی و ادبی جریدے کی اشاعت کی آرزو مچل رہی تھی۔ لہٰذا اپنے جیسے ان دیوانوں کو گیسوئے لیلیٰ اردو کو سنوارنے کے لیے مستعد پا کر میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ میری دیرینہ آرزو کی تکمیل کے لیے یہ ایک تائید غیبی تھی۔ لہٰذا میں نے ان نوجوانوں کی خوب حوصلہ افزائی کی اور رسالہ کی اشاعت کا فیصلہ کر لیا گیا۔ لیکن کوئی جریدہ یونہی شائع نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے بنیادی چیز روپیہ پیسہ ہے۔ خصوصاً اردو کے اخبارات و رسائل کے لیے اس کی فراہمی جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔ لیکن میں ٹھہرا ایک قلندر آدمی جس کے پاس سوائے توکل کے اور کچھ نہیں ہے۔ میرا ایمان ہے کہ اگر اخلاص نیت کے ساتھ کوشش و جد و جہد کی جائے تو اللہ رب العزت کی جانب سے یقینی طور پر نصرت ہوتی ہے۔ کیونکہ ؎

قدرت نے فتوحات کی رکھی ہے یہی راہ

سعی اپنی طرف سے ہو تو اتمام من اللہ

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمیں "لَا تَقْنَطُوا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ" کا درس دیا گیا ہے۔ خدا کی ذات سے ناامیدی کفر ہے محنت اور لگن کے ساتھ کام کرتے ہوئے خدا کی ذات پر بھروسہ رکھا جائے تو کامیابی خود بڑھ کے قدم چوم لیتی ہے۔ آخر فرہاد بھی تو جوئے شیر بہانے میں کامیاب ہو ہی گیا تھا۔

بہرکیف! میں نے ان نوجوانوں سے کہا کہ تم روپے پیسے کی فکر مت کرو۔ اردو کے لیے میں بک جاؤں گا اور تمہیں مطلوبہ روپیہ فراہم

کروں گا ۔ یہ وعدہ میں نے اسی توکل کی بنیاد پر کیا ۔ اور اللہ بزرگ و برتر سے اس کے لیے دعائیں مانگتا رہا اور الحمدللہ میری دعائیں شرف قبولیت حاصل کرتی گئیں اور "اسباق" کے پہلے شمارے کی اشاعت کی تیاریاں شروع ہوگئیں ۔ اسباق کی یہ خوش نصیبی تھی کہ اس سلسلہ میں ہمیں ڈاکٹر عصمت جاوید، جناب کالی داس گپتا رضا و جناب مظہر امام جیسی علمی و ادبی شخصیتوں کی رہبری حاصل ہوئی اور ان کے مشوروں سے ہم مستفیض ہوتے رہے ۔

الغرض، ناتجربہ کاری اور "کرم فرماؤں" کی حوصلہ شکن مخالفت کے باوجود ہماری محنت ولگن رنگ لائی اور "اسباق" کا پہلا شمارہ مئی ۱۹۸۱ء میں بڑی آب و تاب کے ساتھ منظر عام پر آیا ۔ یہ بات نہایت ہی افسوسناک ہے کہ "اراکین اسباق" کی طباعت کے سلسلہ میں ناتجربہ کاری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے طباعت کا تجربہ رکھنے والے "ہمدردوں" نے اپنے بنیک بیلنس میں اضافہ بھی کیا اور "ہمچو دیگراں نیست" کا دعویٰ کرنے والوں نے ہمیں بے علم، غیر دانشور اور نااہل جیسے خطابات سے نوازا اور ہمیشہ بنظر حقارت ہمیں دیکھتے رہے ۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے اندر صبر وتحمل کا جذبہ رکھا ہے جس کے باعث ہم ان تمام باتوں کو برداشت کرتے ہوئے رسالہ کو پابندی کے ساتھ شائع کرنے کی محنت و جدوجہد میں تن دہی سے معروف ہیں ۔ خدا کا احسان ہے کہ "اسباق" نے اپنی زندگی کا ایک سال مکمل کرلیا ہے ۔ اور اب اس کا سالِ اولیں نمبر حسین گٹ اپ کے ساتھ آپ کے ہاتھوں میں ہے ۔ اس کا تمام تر حسن ادارے کے آرٹسٹ اور تزئین کار جناب رشید اعجاز کے فن کا رہین منت ہے ۔

ہمیں اس بات کی بیحد خوشی ہے کہ "اسباق" کا اجرا پونہ کی اس سرزمین سے ہوا جس کی فضائیں حضرت جوش مرحوم ، احمد ندیم قاسمی کرشن چندر مرحوم ، خواجہ احمد عباس اور عصمت چغتائی جیسی ادبی شخصیتوں کے وجود کی خوشبوؤں سے اب تک معطر ہیں ۔ کسی زمانے میں پونہ میں تین یا چار فلم اسٹوڈیوز تھے ۔ اور یہ ادیب و شاعر اپنے فلمی مشاغل کے تعلق سے اکثر پونہ میں قیام پذیر ہوتے رہتے تھے ۔ جن کی وجہ سے پونہ کی ادبی محفلوں میں بڑی رونق رہا کرتی تھی ۔ یوں بھی پونہ کا پرسکون ماحول علمی و ادبی کاموں کے لیے بیحد موزوں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جناب کالی داس گپتا رضا صاحب گزشتہ دس برسوں سے علمی و ادبی تصنیف و تالیف کے لیے پونہ کا ہی رخ کرتے ہیں ۔

پونہ ابتدا ہی سے اردو نواز رہا ہے ۔ یہاں اردو کے ممتاز شعراء کی کمی نہیں ہے ۔ جناب سلیم چشتی مرحوم ۔ پروفیسر غلام دستگیر شہاب صاحب (سابق صدر شعبۂ اردو و فارسی، پونہ یونیورسٹی و واڈیا کالج) ڈاکٹر امانت صاحب (موجودہ صدر شعبۂ اردو و فارسی، پونہ یونیورسٹی و کالج) جناب عزیز قیصری صاحب، جناب عکسی برنی مرحوم، جناب نیر سلیمی صاحب، پروفیسر ابراہیم فیض صاحب، جناب زاہد کمال صاحب، جناب حنیف ساغر صاحب، جناب سحر جلگانوی صاحب، جناب امان اختر صاحب، جناب یونس مظفر نگری صاحب، جناب فطرت سرمدی مرحوم، جناب دلدار ہاشمی صاحب، جناب سید آصف صاحب، جناب نذیر فتح پوری صاحب، جناب سلام فردوسی صاحب و جناب غلام حسین عطار مہر صاحب کے اسمائے گرامی قابل ذکر ہیں ۔ جناب عکسی برنی مرحوم بڑے زندہ دل شاعر تھے ۔ ان کے دم سے پونہ کی ادبی محفلوں میں بڑی زندگی اور رونق رہا کرتی تھی ۔

اسی سرزمین سے مندرجۂ ذیل شعری مجموعے اور تصانیف شائع ہوئیں ۔

شعری مجموعے : (۱) ساغر و مینا ۔ سلیم چشتی مرحوم (۲) لہو رنگ ۔ جلیل الہ آبادی (۳) سنگھرش ہمارا نعرہ ۔ دلدار ہاشمی (۴) نگارش (دیوناگری لپی میں) پروفیسر ابراہیم فیض ۔

تصانیف : (۱) حیاتِ بیدل ۔ ڈاکٹر امانت (۲) چٹانوں کے بیچ ۔ نذیر فتح پوری (۳) زخم اور آہیں ۔ نذیر فتح پوری

اخبارات : گزشتہ پندرہ سالوں سے جناب سحر جلگانوی صاحب پابندی سے ہفت روزہ اخبار 'کاتب' شائع کرتے ہیں جو پونہ، مضافات اور مہاراشٹر کے دیگر علاقوں میں کافی مقبول ہے ۔ مجلس فلاح ملت کے زیر اہتمام مولانا اسحاق ندوی مرحوم کی ادارت میں ہفت روزہ "ملت ٹائمز" شائع ہوا کرتا تھا ۔ بعد میں نامساعد حالات کی بنا پر بند ہوگیا ۔

پونا کی تعلیمی خدمات : پونہ میں کل چھ اردو ہائی اسکول ہیں ۔ جہاں سے ہر سال تقریباً مجموعی طور سے تین سو طلباء و طالبات اردو ذریعۂ تعلیم سے ایس ۔ ایس ۔ سی کے امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں ۔ مولیدینہ ٹیکنیکل ہائی اسکول سے اردو میڈیم سے طلباء ٹیکنیکل مضامین کے ساتھ فارغ التحصیل ہوتے ہیں ۔ علاوہ ازیں، پونہ میونسپل کارپوریشن کے تحت چلنے والے کئی اردو پرائمری مدارس ہیں ۔ مہاراشٹر کے اردو مدارس پر پونہ کا ایک اور احسانِ عظیم ہے کہ یہاں زنانہ اور مردانہ دو ٹریننگ کالج ہیں ۔ جہاں سے ہر سال تقریباً سو معلمین و معلمات فارغ التحصیل ہو کر اردو مدارس کی خدمات کے لیے مستعد ہو جاتے ہیں ۔

بہرکیف! اردو کی خدمت کے تعلق سے پونہ کسی بھی اردو داں علاقہ سے کم نہیں ہے ۔ اسی سرزمین کی ایک اور علمی، ادبی و سماجی پیش کش "اسباق" کی صورت میں آپ کے سامنے ہے ۔ "اسباق" کو آپ زندہ رکھیے ۔ اسے زندہ رکھنا اردو کو زندہ رکھنے کے مترادف ہے ۔

یکم مئی ۱۹۸۲ء

پونہ

دُعا

ریگِ صحرا پہ ابر برسا دے
جلتے خطوں کی آبرو رکھ لے

کہکشاں، چاندنی، دھنک تارے
تیرے ہی روپ کے ہیں آئینے

تو ہرے موسموں کا خالق ہے
سوکھے پیڑوں کو زندگی دے دے

سانپ در آئے ہیں درختوں میں
پنچھیوں کو نئے بسیرے دے

آندھیاں بھی انہیں بجھا نہ سکیں
تیری مرضی سے جو چراغ جلے

تو کہاں ہے؟ کہاں نہیں ہے تو
کون ان گتھیوں کو سلجھائے

برف زاروں کا ہے سفر درپیش
کوئی سورج مجھے عطا کر دے

تیری یادیں دلِ منّزہ میں ہیں
اور ہونٹوں پہ تیرے ہی کلمے

تدیر فتح پوری

اِنتساب
"ادارۂ اسباق" اپنا سالِ اوّلین نمبر
عالی جناب سیّد محمد عبدالقادر ولد مولانا قاری حافظ سید عبدالحیؒ
کے نام منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے،
جن کی ذات
زہد و تقویٰ، ذوقِ علم و ادب و جذبۂ خدمتِ خلق میں
یکتائے روزگار رہے
اور
جن کی بدولت سرزمینِ بمبئی پُر وقار ہے۔
ط (تعارف صفحہ نمبر ۳۸۴ پر ملاحظہ فرمائیں)

سرپرست اسباق

حکیم رازی ادیبی اشرفی

آشنائے حکمت و راز، قلندر صفت، پیکر اخلاص و تسلیم و رضا، محترم حکیم رازی ادیبی اشرفی، پونہ کے کہنہ مشق شعراء میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ آپ کی فطرت کا رنگ آپ کے کلام میں بے حد نمایاں ہے۔ آپ "اسباق" سرپرست ہیں اور آپ کی حکیمانہ و دانشمندانہ رہبری میں "اسباق" بڑی تیز رفتاری سے ترقی کے مدارج طے کر رہا ہے۔ بظاہر ضعیف و ناتواں نظر آتے ہیں لیکن فی الحقیقت نوجوانوں کو شرمانے والا آہنی عزم و حوصلہ اپنے اندر رکھتے ہیں علامہ اقبال کی طرح جہد مسلسل و کوشش ناتمام کے قائل ہیں اور اسے کامیابی و کامرانی کی اساس سمجھتے ہیں۔ کام کے وقت اوروں کے تعاون و اشتراک کا انتظار کیے بغیر تنہا اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی جد و جہد میں لگے رہنا آپ کا طرۂ امتیاز ہے۔ اسباق کے تعلق سے جو بھی کام پیش نظر ہوتا ہے برق رفتاری سے انجام دیتے ہیں۔

"اسباق" کی بقاء اور ترقی کے سوا خدا سے کچھ نہیں مانگتے۔

مدیر اسباق نذیر فتح پوری

آپ شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی، آپ کی تخلیقات میں افسانے، ناول اور ڈرامے شامل ہیں
آپ کی تخلیقات ملک کے معیاری علمی و ادبی جرائد میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ آپ نے اپنی خداداد صلاحیتوں کی
کی بنا پر بہت کم عمری میں ادبی دنیا میں اپنا ایک منفرد مقام بنالیا ہے۔
آپ کے کئی ڈرامے اسٹیج پر پیش ہوکر عوام سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔
محترم حکیم رازی کے بعد 'اسباق' کی ترقی میں آپ کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ 'اسباق' کے لیے تخلیقات
کے انتخاب اور ترتیب میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اپنے ذاتی کاموں پر 'اسباق' کے کاموں پر ترجیح دیتے
ہیں اور نہایت جانفشانی کے ساتھ اس کی ترقی کے لیے شب و روز کوشاں رہتے ہیں۔

مدیر اسباق سید آصف

آپ معاون مدیر کی حیثیت سے ادارہ اسباق سے منسلک ہیں۔ آپ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار اور ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ آپ ایک بہترین اداکار بھی ہیں۔ کئی ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر ناظرین سے داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ جدید شاعری کی طرف آپ کی طبیعت کا جھکاؤ زیادہ ہے۔ سیدھے سادھے اور دلنشیں انداز میں شعر کہنا آپ کا طرہ امتیاز ہے۔ معاون مدیر کی حیثیت سے جناب نذیر فتح پوری کے ہمراہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے 'اسباق' کو خوب سے خوب تر بنانے کی جد و جہد میں لگے ہوئے ہیں۔

دلدار ہاشمی
صدر بزم اردو پونہ

جناب دلدار ہاشمی بڑے صاحب دل اور حوصلہ مند شاعر واقع ہوئے ہیں۔ بذات خود مزدور ہیں اور اس لحاظ سے مزدوروں کے بڑے ہمدرد ہیں اور ان کے مسائل سے کما حقہ واقفیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کے کلام میں مزدوروں کی صحیح پکار سننے کو ملتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ عوامی شاعر ہیں۔

آپ ادارہ اسباق کے ایک اہم رکن ہیں۔

ایم یوسف
ایم اے، بی ایڈ

مولیدینہ ٹیکنکل ہائی اسکول میں ایک کامیاب مدرس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ طبیعت میں سادگی اور منکسر المزاجی پائی جاتی ہے پہلے شعر گوئی کی جانب طبیعت مائل تھی لیکن اب نثر کی طرف مائل ہے۔ قلم برداشتہ لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں آپ ایک اچھے اناؤنسر ہیں۔

عطا مہر
معتمد بزم اردو، پونہ

آپ شاعر بھی ہیں اور مدرس بھی لہٰذا بڑے سلجھے ہوئے ذہن کے مالک ہیں۔ ان کے اشعار قارئین کو دعوت فکر دیتے ہیں بڑے مستقل مزاج شخص ہیں۔ ادارہ اسباق کے رکن کی حیثیت سے اپنی مستقل مزاجی کے ساتھ اسباق کے ادبی سفر کی دشواریوں کو دور کرنے کی سعی میں پیش پیش رہتے ہیں

عبدالمجید رشک

پونہ کے کہنہ مشق شاعر اور بہترین خوشنویس ہیں۔ حاصام اردو پرائمری اردو اسکول پونہ میں صدر مدرس ہیں۔ فارسی اور پشتو زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ادارہ اسباق کی خوش نصیبی ہے کہ کتابت کیلیے اسے آپ کا پورا پورا تعاون حاصل ہے۔ اسباق کے رکن کی حیثیت سے اس کی ترقی کے لیے آپکے قیمتی مشورے مشعل راہ ہیں۔

عبد الماجد

آپ پونہ کے ابھرتے ہوئے خوشنویسوں میں اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ کتابت کا کام بڑی جانفشانی اور ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ سالنامہ کی کتابت کے لیے آپ نے اپنی بہترین صلاحیتوں سے 'اسباق' کو نوازا ہے۔

مشتاق مدنی بی۔ کام

نوجوان اور ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں اور 'اسباق' کے ایک اہم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین خوشنویس بھی ہیں۔ اپنی علمی اور ادبی صلاحیتوں سے 'اسباق' کو مستفید کرتے ہوئے اسے بام عروج تک پہنچانے میں ارباب اسباق کو آپ کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔

ابراہیم اَمر۔ بی۔ کام

آپ نوجوان اور ابھرتے شاعر اور افسانہ نگار ہیں۔ کامرس گریجویٹ ہونے کی حیثیت سے اکاؤنٹ اور آڈٹ کے ماہر ہیں۔ چنانچہ 'اسباق' کے اکاؤنٹ اور آڈٹ کے کام کے اعزازی نگراں ہیں اور بڑی تن دہی سے اپنا کام انجام دیتے ہیں۔

رشید اعجاز

جواں فکر وجواں سال شاعر ہیں۔ آپ کا فکری رجحان بالخصوص جدیدیت کی طرف زیادہ ہے لیکن جدید نظم کہتے وقت شاعری کے اصولوں کو نظر انداز نہیں کرتے۔ آپ ایک اچھے افسانہ نگار اور بہترین آرٹسٹ ہیں۔ 'اسباق' کے تمام شماروں اور سالنامہ کا آرٹ ورک آپ ہی نے کیا ہے

اداریہ ......

ہم بغیر کسی دعوے کے
اسباق کا "سال اوّلیں نمبر"
آپکی خدمت میں
پیش کرتے ہیں!

(ادارہ) .....

باب

ـ بزم اردو ـ

جولائی ۱۹۸۱ء بزم اردو کی نئی ورکنگ باڈی کا انتخاب عمل میں آیا ۔ اور ۱۹۸۱ء تا ۱۹۸۲ء کے لیے مندرجۂ ذیل عہدیداران چنے گئے ۔

(۱) صدر ۔ جناب دلدار ہاشمی (۲) نائب صدر ۔ جناب ایم یوسف ۔ (۳) جنرل سیکریٹری ۔ جناب عطار مہر ذوالنہری

ـ اراکین ـ

(۱) زاہد کمال (۲) نذیر فتح پوری (۳) سید آصف (۴) رشید اعجاز (۵) عبد اللطیف جوہر (۶) ہرؔی آزاد (۷) عبد الماجد (۸) راج ملھاکر (۹) مستقیم شعلہ ۔

ـ تصویر میں ـ

کرسیوں پر دائیں سے بائیں (۱) زاہد کمال (رکن) (۲) عطار مہر ذوالنہری (جنرل سیکریٹری) (۳) حکیم رازی ادبی (سرپرست بزم اردو) (۴) دلدار ہاشمی (صدر بزم اردو) (۵) عبد اللطیف جوہر (رکن)

استادہ ۔ دائیں سے بائیں (۱) عبد الماجد (رکن) (۲) نذیر فتح پوری (رکن) (۳) سید آصف (رکن) (۴) رشید اعجاز (رکن) (۵) ہرؔی آزاد (رکن)

ـ دیگر ممبرانِ بزمِ اردو

(۱) پروفیسر غلام دستگیر شباب (۲) ڈاکٹر امانت (۳) ڈاکٹر شاکر (۴) مشتاق مدنی (۵) مشتاق عرب (۶) ابراہیم امر (۷) عبد المجید رشک (۸) اقبال انصاری (۹) انور مختار (۱۰) ایس ایم یوسف (۱۱) الحاج عبد القدیر

برا نہ مان جو واعظ برا کہے ! ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے

فراق گورکھپوری کے ساتھ : دائیں طرف کالی داس گپتا رضا بائیں طرف ڈاکٹر گیان چند

انڈو پاک کے مشہور فن کار، شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں۔ دائیں طرف سے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی، گوپی چند نارنگ
انتظار حسین (پاکستان) احمد ہمیش (پاکستان) حنیف کیفی بریلوی۔

مدتیں گزریں تری یاد بھی آئی نہ ہمیں　　　　اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں　　(فراق)

عالی جناب ضیا فتح آبادی کے
اعزاز میں، ادارۂ ادب
لندن کی جانب سے ادبی
تقریب

(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر
ضیا الدین احمد شکیب
سوہن راہی، جناب
ضیا فتح آبادی

مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۸۱ء
یوم ولادت، جواہر لال
نہرو اور "شہر سراب کی"
اجرائی تقریب
(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر
قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی
ڈاکٹر عنوان چشتی، پروفیسر
تنویر چشتی، جناب کیدار پانڈے (وزیر ریل)
جناب عطا الرحمٰن انصاری (وزیر آبپاشی)

بارسی ٹاکی۔
جناب محبوب راہی کے اولین
مجموعۂ کلام (شبات) کا جشنِ اجراء
قاضی حسن رضا، محبوب راہی
کی گلپوشی کرتے ہوئے۔

[illegible] چراغوں کے قریب جاؤ تاکہ [illegible] اجالے سے [illegible] (ظفر ایٹوی)

ــــ انجمن ترقی اردو تھانے کا چھٹا جلسہ اور یادِ غالب مشاعرہ ــــ

مائیک پر ڈاکٹر اے اے منشی (چیرمین اردو اکاڈمی)

دائیں سے بائیں : ڈاکٹر رشیدی ، داؤد مظہر ، ایڈوکیٹ اسحاق ، سلمان ماہی (معتمد عمومی) ڈاکٹر منشاء ، سکندر شیخ ، عزیز آذر

شاکر ادیبی ، ودیا دھر گوکھلے (مدیر لوک ستا ، مراٹھی) حفیظ انصاری

(یہ پروگرام ۲۷ فروری کی شب رابوڑی تھانے میں ہوا تھا)
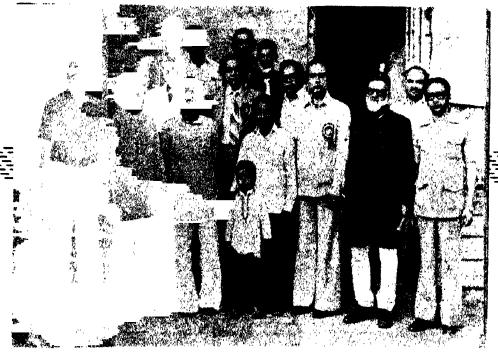
ــــ اُردو صحافت پر پونہ میں سیمینار کے بعد لی گئی ایک تصویر ــــ

دائیں سے بائیں : عبدالستار دلوی ، میجر ظہیر الحسن ، ڈاکٹر منشا ، جناب اے اے منشی ، انیس چشتی ، حکیم رازی ادیبی

دلدار ہاشمی ، محمد اقبال (فرزند نذیر فتح پوری) علی سردار جعفری ، رشید اعجاز ، عبدالمجید رشک ، نذیر فتح پوری ، خواجہ عبدالغفور

محمد جعفر موتی ، عطار مہر ذوالنہری ، ہارون رشید علیگ ۔

مظہر امام صاحب کے
دولت کدہ (کشمیر) پر
لی گئی ایک یادگار تصویر
بائیں سے دائیں: مظہر امام
فرزانہ امام عصمت چغتائی
شہپر امام، مبینہ امام

یکم مارچ ۸۱ء
آکاش وانی بھوپال میں
دائیں سے: محبوب راہی
اقبال مجید، سراج انور
وقار خلیل، آفاق احمد، ولحد یری
عبدالمتین نیاز ۔

۱۵ نومبر ۱۹۸۱ء اوجین میں
دائیں سے بائیں: عبدالحمید گوہر
(اوجین) نذیر فتح پوری (مدیر
اسباق) دلدار ہاشمی (صدر بزم
اردو)

فرصت بود وباش یاں کم ہے   کام جو کچھ کرو شتاب کرو (میر)

(مقام پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف) وجین۔ ایم پی) ہال میں ایک شعری و ادبی نشست۔ بابا ناگ ارجن کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔
کھڑے ہوئے۔ بائیں سے دائیں۔ (۱) انیس لیٹیانی (۲) چندر سین ورآت (۳) شمشیر بہادر سنگھ (۴) ڈاکٹر شریتی و ملا نسکلا (۵) رشید امکان (۶) بابا ناگ ارجن (۷) امیر او جینی (۸) کاشف الہاشمی (۹) سحر اوجینی۔
بیٹھے ہوئے۔ بائیں سے دائیں (۱) قمر صدیقی (۲) پرمود تیواری (۳) سردار پریتم سنگھ پریتم (۴) شکیب نیازی (۵) احمد کمال پروازی (۶) دھنی رام بادل (۷) عبدالحمید گوہر (۸) رمیش سوز۔
مہمانِ خصوصی بابا ناگ ارجن۔ صدارت شمشیر بہادر سنگھ جی۔ نظامت احمد کمال پروازی

عطیۂ خوں ١٠ محرم الحرام ١٤٠٢ھ:۔ عوامی محاذ پونہ کی جانب سے شہدائے کربلا کی یاد میں اجتماعی عطیۂ خوں کا پروگرام منعقد کیا گیا۔
خون کا عطیہ دینے کے بعد کی ایک تصویر۔ استادہ: سید سلطان، خلیل الرحمٰن رازی (خون دینے کے بعد استراحت فرماتے ہوئے) ڈاکٹر اے آر شیخ (صدر عوامی محاذ پونہ) ڈاکٹر نفیس قاضی

نوجوانانِ مدینۃ العلوم ایروڈا پونہ کے زیرِ اہتمام کل پونہ ضلع سیرت النبی، تقریری، تحریری اور قرأت مقابلوں کا انعامی جلسہ
مائیک پر الحاج عبدالقدیر قریشی (دائیں سے بائیں) شیخ صاحب، الحاج شفیع مستری، خالد انصاری، انیس چشتی، دلدار
ہاشمی، مولانا نظام الدین، نذیر فتح پوری، رفیق انصاری ۔

راج ٹھاکر کا پیش کردہ ڈرامہ ایک تارے کی آنکھ" کا ایک منظر۔ راج ٹھاکر اور ارونا بھنگار دوے ۔

ہمت پس از فنا سبب زندگی ہے ... مردوں کا نام سنتے ہیں ہر داستاں میں ہم (آتش)

پونہ سیوا البیوسی ایشن کا یونٹ نمبر ۱ انجمن تعلیم القرآن اسلام پورہ کا افتتاح ۔ ۱ نومبر ۱۹۸۱ء مائیک پر ۔ پونہ کے میئر بھن راؤ پڈول (دائیں سے بائیں) عامدار امین الدین پین والے ، الحاج دادا میاں اور سحر جلگانوی (مدیر ہفتہ وار کاتب)

زمانے پہ حق سب کا برحق ہے تو اے ساقی کیوں سب میں برابر کی تقسیم نہیں ہوتی (ارب مانیکمانی)

باب ۲

فارم نمبر ۴ بابت ملکیت وغیرہ

رول نمبر ۸ دیکھیں

مقام اشاعت :- ۵۷۔ ساچاپیرا اسٹریٹ پونا

وقفۂ اشاعت :- ماہنامہ

ایڈیٹر ۔ پبلشر و مالک :- نذیر فتح پوری

قومیت :- ہندوستانی

پتہ :- ۸۳، ایرونڈا پونہ ۶

پرنٹر :- نذیر فتح پوری

میں نذیر فتح پوری مالک ماہنامہ 'اسباق' اس بات کا اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و اطلاع کے مطابق صحیح و درست ہیں :

دستخط :- نذیر فتح پوری

چند غیر مسلم نعت گو

ڈاکٹر دُرِ محمد پٹھان ۔ پاکستان

اس کائنات کی آنکھ نے اَن گنت انسانوں کو دیکھا ہے کسی نے اس دنیا میں علم و ادب کی ندیاں بہا دیں اور کسی نے اپنی شجاعت کا لوہا منوایا، کوئی سخی کی حیثیت سے دنیا کے سامنے آیا تو کوئی گداگر کے روپ میں در در کی ٹھوکریں کھا کر زمین کی آغوش میں جا چھپا، کسی کے جاہ و جلال نے کبھی شام نہ دیکھی اور کسی سے فتح و کامرانی ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی، کوئی عقل کا مالک بنا اور کوئی حسن کا بادشاہ بنا، وہ سب اپنی اپنی خوبی یا خامی کی بنا پر آج بھی اوراقِ تاریخ میں محفوظ ہیں۔

لیکن اس کائنات نے ایک انسان ایسا بھی دیکھا جو اپنی ذات بابرکات میں کامل و اکمل تھا، جس نے فقیری میں بادشاہی کی اور بادشاہی میں فیاضی کی، جو یتیموں کا ماوا تھا، غریبوں کا ساتھی تھا اور مظلوموں کا سہارا تھا۔ علم و حکمت جس کی میراث تھی، اور حسن و اخلاق جس کی پہچان تھی۔ جب دنیا والوں نے آپ پر اپنے ہی گھر کے دروازے بند کر دیے تو شکوہ و شکایت لب پر لائے بغیر ہجرت فرما گئے۔ جب ہجرت فرمائی تو لوگوں نے یکے بعد دیگرے لڑائیوں کا اہتمام کیا۔ لیکن یہ معصوم اور مظلوم انسان جب فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹے تو سراپا ابرِ رحمت بن گئے۔ بعد میں دنیا بھی آپ کو رحمۃ اللعالمین کہنے لگی۔ پھر آپ کو اپنوں نے محبوب سمجھا اور غیروں نے مطلوب جانا۔ دنیا اسی عظیم اور کامل انسان کو محسنِ انسانیت تسلیم کر کے آپؐ کی عظمت کو سلام کرتی رہی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

ہم جب برصغیر کی مختلف زبانوں کی علمی و ادبی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں تو ہماری نظر سے ایسے بے شمار نام گزرتے ہیں جو بنیادی طور پر تو غیر مسلم تھے لیکن انھوں نے دل کی گہرائی سے ہمارے نبیؐ اور آخری مرسلؐ محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ نمونے کے طور پر یہاں چند زبانوں کے شعرا کا کلام پیش کیا جاتا ہے۔

اُردو شعراء

اُردو ادب میں رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ثنا خوانوں کی کمی نہیں ہے۔ پنڈت پردیسی جی برہمچاری لکھنوی کی نعت (سامرتھی)، پنڈت برجموہن دیال کی نعت (بادہ جامی جام) کنہیا لال لاہوری کی دو تصانیف (یادگار ہندی اور مناجات ہندی)، لالہ منشی رام کی نظم (شاہنامہ)، منشی طوطا رام کی منظوم داستان (طلسم شاہاں) میں دل کی گہرائیوں سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے گن گائے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ پنڈت گنیش لال خستہ، چودھری دلو رام کوثری، شنکر سہارنپوری، لالہ نواب لال شعلہ، لالہ کالکا پرشاد موجود، لالہ تارا چند منشی دوارکا پرشاد اُفق، مصر شرما، لالہ للتا پرشاد میرٹھی، منشی رام سہا تمنا، منشی ہرگوپال تفتہ، مہاراجہ سرکشن پرشاد اور لالہ ٹلکھی رام نے بھی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ثنا خوانی کا حق ادا کیا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

مہاراجہ سرکشن پرشاد نے ثنا خوانی کا انداز کچھ اس طرح اختیار کیا:

اشرفِ انبیا حبیبِ خدا — زینتِ مسندِ جہاں بانی
فخرِ آدم ہیں اشرفِ عالم — ہیں یہ کشّافِ سترِ پنہانی
اُن سے توحید نے ترقی کی — اس تمدن کے ہیں یہی بانی
بذلِ جود و عطا کا کیا کہنا — بحرِ رحمت کی جیسے طغیانی
تھے مروت میں آپ اپنی نظیر — ہوتی دشمن کو بھی پشیمانی
دھاک بیٹھی تھی دل پہ اعدا کے — تھے شجاعت میں ایسے لاثانی
بات بات آپ کی حکیمانہ — ہر نصیحت تھی وعظِ عرفانی
سادگی آپ کی سبق آموز — مٹ گئی کاذبوں کی رہبانی
دخل ہی کیا وہاں تعصب کو — تھا فقط ایک جذبِ روحانی
.........الخ

پنڈت پردیسی جی برہمچاری اپنی "سامرتھی" میں یوں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں:

پریم کی بنسی بجائی سیدِ ابرار نے
پاپ کی کایا مٹائی سیدِ ابرار نے
شوز رہائی شدھ ہو کر بن گئے بالکل پوِتر
وہ مدھر بانی سنائی سیدِ ابرار نے
پاپ میں ڈوبے تھے جوان کو ڈبویا پریم میں
خوب ہی بگڑی بنائی سیدِ ابرار نے

چودھری دلو رام کوثری یوں اقرار کرتے ہیں۔

اوّل ہے سب رسولوں میں بشر رسولؐ کا
ثانی کوئی نہیں پس داورِ رسولؐ کا
مختارِ کائنات تھے سیکن یہ زہد تھا
بوسیدہ بوریا رہا بسترِ رسولؐ کا
مصر و عرب میں روم میں ایران و ہند میں
پھیلا جہان میں علم سراسر رسولؐ کا
قرآنِ پاک معجزہ ہے شاہِ پاکؐ کا
دنیا میں فیض ہے یہ برابر رسولؐ کا
کیوں کوثری مجھے ہو طلب عز و جاہ کی
کیا کم ہے یہ شرف ہوں ثنا گر رسولؐ کا

پنجابی شعراء

اُردو ادب کی طرح پنجابی ادب کی تاریخ بھی غیر مسلم شعرا کی ثناخوانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بھری ہوئی ہے۔ بطورِ نمونہ دو شعرا کا کلام ملاحظہ فرمایے:

پاک پڑھیو کلمہ رب دا محمدؐ نال ملائے
ہویا معشوق خدائیدا ہویا تل الاہ

بابا نانک جی ایک دوسرے مقام پر یوں اظہارِ حقیقت کرتے ہیں:

اُٹھے پیر بوندے رحمن کھاون منگڑی رسولؐ
دوزخ پوندے کیوں رحمن جا چیت نہ آئے رسولؐ

لالا ٹلکھی رام اپنی ایک سہ حرفی "ٹلکھی کا پاک رسول" میں یوں رطب اللسان ہیں:

ختم بخشیا دین اسلام اسنوں سہتے تاج لولاک سہایا سی
رحمت کل جہاں جہاں دے واسطے توں ٹلکھی نبی نوں فرمایا سی

سندھی شعراء

۷۱۲ء میں عربوں کی آمد سے سندھ میں مسلمانوں کی حکمرانی کا آغاز ہوا۔ اور یہ خطہ ۱۸۴۳ء سے ۱۹۴۷ء تک کے وقفے کے علاوہ ہمیشہ مسلمانوں کے زیرِ تسلط رہا ہے۔

دیئے تو ہمتِ عالی سے ... رتبہ ... ت سے خیز (ظفر)

صدیوں کے اس عرصے میں مسلمانوں نے سندھی معاشرے کے غیر مسلم طبقے کو بے حد متاثر کیا ہے۔ غیر مسلموں کی اسلام شناسی اور مسلمانوں کی رواداری نے کبھی بھی رنگ و نسل کے رنگ اور مذہبی جنون اور تنگ دلی کو اس خطے میں پاؤں جمانے کا موقع نہیں دیا۔ یہی وجہ ہے کہ غیر مسلم بھی شاہ عبداللطیف بھٹائی، سچل سرمست اور دوسرے صوفی بزرگوں کے اتنے ہی عقیدت مند ہیں جتنے کہ مسلمان۔

راقم الحروف نے سندھ کے غیر مسلم شعراء پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں ان کی شاعری پر اسلام کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ہم ان سب شعرا کا کلام تو پیش نہیں کر سکتے، صرف دو مثالیں حاضر ہیں:

صوفی آسو رام اپنی پریت کی ریت یوں نبھاتے ہیں:

بجائے کفر ظلمت کان مدد کر یا رسول اللہ
تون آہین نور نورانی منو محبوب سبحانی
نہ کو تنھنجو تیو ثانی کرم کر یا رسول اللہ
خدا فرقان نازل کیو منھنجي مرسل موچاري تو
اکارج قدر بلند جو بیو لطف کر یا رسول اللہ
امت ساری سند و شافع ذلي مرض سندو دائم
پوجک تنھنجو توکان نا فع رحم کر یا رسول اللہ
سوالک قي مٽي مرکين نارن مرچند جلن جيلين
سدا صاحب پيو جلين مهر کر يا رسول اللہ

نانک بھگوان داس اپنی عقیدت کا اظہار اس طرح کرتے ہیں

یا رسولِ خدا سلام علیک	شانِ ربّ العلیٰ سلام علیک
میرِ ارض و سما سلام علیک	سرِ عرشِ علیٰ سلام علیک
مظہرِ کبریا سلام علیک	مرحبا مرحبا سلام علیک
انت بدر الدجیٰ سلام علیک	انت شمس الضحیٰ سلام علیک
زینتِ دو جہاں سید الاتقیا	جلوۂ ماوری سلام علیک
خاتم المرسلین سید الاصفیاء	شافعِ روزِ جزا سلام علیک
سیدی ہاشمی سرور انبیاء	ھادی و مقتدیٰ سلام علیک

ناز رحمان تو فخر "بھگوان" تون
مجتبیٰ مصطفیٰ سلام علیک

اسی طرح برصغیر کے باقی زبانوں کے غیر مسلم شعراء نے بھی رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شانِ اقدس میں گلہائے عقیدت پیش کیے ہیں، جن کو اگر ہم اکٹھا کرنے بیٹھیں تو کئی ضخیم کتابیں مرتب ہو جائیں۔

ڈاکٹر پٹھان نے طوالت کے خیال سے اپنا مضمون یہاں ختم کر دیا تاہم ادارہ "اسباق" کی طرف سے اس میں کچھ اور غیر مسلم شعراء کے نذرانۂ عقیدت کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

جدید اور قدیم اردو نعتیہ کلام کا انتخاب ہے

راجہ مکھن لال مکھن

کوئی ڈیڑھ سو برس پہلے حیدرآباد دکن کے مشہور شعراء میں شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے عمر خیام کی رباعیات کا منظوم ترجمہ بھی کیا ہے۔ ان کا قلمی دیوان کتب خانۂ آصفیہ میں موجود ہے۔ ایک نعت کے چند شعر ملاحظہ کیجیے:

حمید و احمد و محمود تم ہو یا رسول اللہ
سعید و اسعد و مسعود تم ہو یا رسول اللہ
بہر آن و زماں موجود تم ہو یا رسول اللہ
دل و جاں کے مرے مقصود تم ہو یا رسول اللہ

ستیہ پال اختر رضوانی

از خاکِ عرب تا بہ عجم مانتے ہیں
ہاں صاحبِ الطاف و کرم مانتے ہیں
ہم دیر نشیں بھی ہیں تیرے مداح
رہبر جو تھے اہلِ حرم مانتے ہیں

منشی شنکر لال ساقی

پیدائش ۱۸۲۰ء وفات ۱۸۹۰ء منشی ہرگوپال سہاے تفتہ کے چھوٹے بھائی تھے۔ غالب، ذوق، مومن اور شاہ نصیر کا دور دیکھا۔ ایک نعت کے چند شعر۔

جب مرے عشقِ نبیؐ سے مجھے مستی ہوگی
بیخودی ہوگی، بلندی نہ یہ پستی ہوگی
جیتے جی روضۂ اقدس کو نہ آنکھوں دیکھا
روح جنت میں بھی ہوگی تو ترستی ہوگی
عاشقِ زارِ محمدؐ میں ہوا پیری میں
ہستیٔ خضرؑ سے کیا کم مری ہستی ہوگی

پنڈت ہری چند اختر

کس نے قطروں کو ملایا اور دریا کر دیا
کس نے ذروں کو اٹھایا اور صحرا کر دیا
زندہ ہو جاتے ہیں جو مرتے ہیں حق کے نام پر
اللہ اللہ موت کو کس نے مسیحا کر دیا
آدمیت کا غرض ساماں مہیا کر دیا
اک عربؐ نے آدمی کا بول بالا کر دیا

شیو چرن داس اختر

دل آویز ہے قابلِ داد ہے
محمدؐ کا کیا خوب ارشاد ہے
خلاصہ ہے قرآں کے فرمان کا
کہ لالچ نہ کر مال کا جان کا
کبھی سن لے تو جو پیغامِ غیب
ہنر میں بدل جائیں سب تیرے عیب

گرسرن لال ادیب لکھنوی

آؤ ہم سب مل کے بیٹھیں پیار کی باتیں کریں
سرزمینِ یثرب و سرکار کی باتیں کریں
دو جہاں کے سرور و سرکار کی باتیں کریں
فخرِ آدم احمدِ مختار کی باتیں کریں
پریم کی گنگا بہائی جس نے ریگستان میں
روح تازہ پھونک دی مٹتے ہوئے ایمان میں

جگن ناتھ آزاد

حقیقت کی خبر دینے بشیر آیا نذیر آیا
شہنشاہی نے جس کے پاؤں چومے وہ فقیر آیا
بھٹکتی خلق کو رستہ دکھانے رہنما آیا
سفینے کو تباہی سے بچانے ناخدا آیا
مبارک ہو زمانے کو کہ ختم المرسلین آیا
سحابِ رحم بن کر رحمۃ اللعالمین آیا

پنڈت رام پرتاپ اکمل جالندھری

کیا شان ہے جنابِ رسالت مآبؐ کی
نظریں جھکی ہوئی ہیں مہ و آفتاب کی
مذہب کو زندگی کے عمل سے ملا دیا
ممنونِ التفات ہے امت جنابؐ کی
میرے بھی حالِ زار پہ ہو اک نگاہِ لطف
بگڑی بنانے والے جہانِ خراب کی

سردار بشن سنگھ بیکل

کیوں نہ ہم بھی اس جہاں کا پیشوا مانیں تجھے
کیوں نہ راہِ حق میں اپنا رہنما جانیں تجھے
دیکھنے کو دے خدا آنکھیں، تو پہچانیں تجھے
حق کی ہے بیکل صدا شمس الضحیٰ مانیں تجھے
گر مسلمانوں کا اک پیغمبرِ اعظم ہے تو
اپنی آنکھوں میں بھی اک اوتار سے کب کم ہے تو

گدا دستِ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
ہم اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں (سوداؔ)

چمن لال چمن

وہ خاتمِ پیغمبراں ، وہ شاہ وہ شاہِ دوجہاں
وہ غم گسارِ بیکساں روح و روانِ عاشقاں

محبوبِ ربِ دوجہاں

اللہ نے جس کے لیے آیات یہ بھیجے دیے
وہ جس کو ربِ ذوالمنن کہتا ہے خود محبوبِ من

میں کیا کہوں بھرا ے حق

سالک رام سالک

کیوں کرنہ دل و جاں سے مجھے جانے مدینہ
آنکھوں میں لبسا ہے مرے مولائے مدینہ
ہے تنگ بہت تیرگیٔ جہل سے مولا
کس طرح رہے ہند میں شیدائے مدینہ
سُرمے کی طرح آنکھ میں سالک میں لگاؤں
ہاتھ آئے جو خاکِ درِ مولائے مدینہ

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر

تکمیل معرفت ہے محبت رسولؐ کی
ہے بندگی خدا کی اطاعت رسولؐ کی
تسکینِ دل ہے سروِ کون و مکاں کی یاد
سرمایۂ حیات ہے اُلفت رسولؐ کی!
اتنی سی آرزو ہے بس اے ربِ دوجہاں
دل میں رہے سحر کے محبت رسول کی

سندر لال حمید

اک رام سنیہی گیانی گرو کل مجھ کو ملا تھا یاروں میں
وہ بین رسیلے پریم بھرے، دلدار تھا وہ دلداروں میں
لولاک لما کا تاج دھرے وہ کملی والا من موہن
توحید کی مالا ہاتھوں میں، کہتا تھا یہی ناداروں میں
سب مایا ہے اس خالق کی جو خالق ہے ہر کایا کا
تم اس کے ہوتے اپنا سر کیوں دھرتے ہو بچاروں میں
میں سیس نواؤں چرن لاگوں نام محمدؐ جس کا ہے
شُدر اور ویش کیے سب داخل جس نے ہر کے پیاروں میں

فراق گورکھپوری

انوارِ بے شمار محدود نہیں
رحمت کی شاہراہ مسدود نہیں
معلوم ہے کچھ تم کو محمدؐ کا مقام
وہ اُمتِ اسلام میں محدود نہیں

منشی گوبند پرشاد فضا

محمدؐ رہنمائے انس و جاں ہے
رسولِ کبریائے دوجہاں ہے
لقب ہے سیدِ کونین ذی شاں
خدا قرآں میں ہے اس کا ثنا خواں
دعا میری یہ اے شاہِ امم ہے
مجھے بھی تجھ سے اُمیدِ کرم ہے

جگن ناتھ کمال

سلام اے سرورِ عالم سلام اے مہرباں تجھ پر
سلام اے ہادیٔ دیں اے رفیقِ بیکساں تجھ پر
سلام اے فخرِ ہستی اے شفیعِ عاصیاں تجھ پر
سلام اے ظلِ رحماں اے نشانِ کارواں تجھ پر
کمالِ بے نوا کے دل کو تو درد آشنا کر دے
اسے بھی اپنے صدقے بے نیازِ مدعا کر دے

امر چند قیس جالندھری

وہ ابرِ فیضِ نعیم بھی ہے نسیمِ رحمت شمیم بھی ہے
شفیق بھی ہے خلیق بھی رحیم بھی ہے کریم بھی ہے
وہ علم و عرفاں کا ہے مدینہ خزینۂ راز اس کا سینہ
وہ پیکرِ نورِ سرمدی ہے وہ حسنِ خلقِ عظیم بھی ہے
یہ آپ کے قیس کا ہے ایماں حضورؐ ہیں رہنمائے انساں
حضورؐ کا جو نہیں ہے قائل شقی بھی ہے اور لئیم بھی ہے

منشی بشیشور پرشاد منور لکھنوی

آپؐ پر نازل خدائے پاک نے قرآں کیا
سرمۂ توحید سے وا دیدۂ عرفاں کیا
آشکارا زندگی کا جوہرِ پنہاں کیا
پیکرِ اقدس کو رشکِ کعبۂ ایماں کیا
جو نہ سمجھیں آپؐ کا رتبہ وہ اہلِ دل نہیں
اور کوئی جادۂ تسلیم کی منزل نہیں

دیا شنکر نسیم

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری ثمرہ ہے قلم کا حمدِ باری
کرتا ہے یہ دو زباں یکسر حمدِ حق و مدحتِ پیمبرؐ
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے یعنی کہ مطیعِ پنجتن ہے

سرداری لال نشتر

جنابِ محمدؐ شہ انبیا تھے مگر دستگیرِ امیر و گدا تھے
گناہوں کے جس وقت طوفاں بپا تھے وہی کشتیٔ دہر کے ناخدا تھے
میسر یہ قدرت کسی کو کہاں تھی زبانِ محمدؐ خدا کی زباں تھی

دھرم پال گپتا وفا

چھڑا کے بت کی پرستش سکھائی تھی وحدت
ترے خیال کی ترویج عام ہو جائے
ترے خیال میں یہ سخت نامناسب تھا
بشر کوئی بھی بشر کا غلام ہو جائے
رفاہِ عام ہی تیرا تھا جب کہ نصب العین
لقب نہ کیوں ترا خیر الانام ہو جائے

کالی داس گپتا رضا

دوست اور دشمن پہ یکساں مہرباں تو ہی تو ہے
ریگزارِ زیست میں جوئے رواں تو ہی تو ہے
وہ خدا ہی تو ہے جس نے وحی نازل تجھ پہ کی
جس پہ آیا حرفِ قرآں وہ زباں تو ہی تو ہے
بے قراروں کو ہے تیرا آسرا بعدِ خدا
روحِ دل تو ہی تو ہے تسکینِ جاں تو ہی تو ہے

معجزہ شق القمر کا ہے مدینہ سے عیاں
مہ نے شق ہو کر لیا ہے دیں کو آغوش میں (عزیز لکھنوی

حمد

رفیعہ شبنم عابدی
۱۴/۱۰۰ بارہ امام روڈ، بمبئی - ۳ -

تم مجھے قتل کردو
زباں کاٹ دو
انگلیاں چھانٹ دو
زہر قاتل سے لبریز اک جام میرے دہن میں انڈیلو
تختۂ دار پہ مجھ کو مصلوب کردو
میرے ہاتھوں میں کیلیں جڑو
اور جلتے ہوئے ریگزاروں میں
سجدۂ شکر کرتی ہوئی
گرم ذرّوں پہ رکھی ہوئی
میری گردن پہ خنجر چلا دو
میری سرکش صدا کو دبانے کی خاطر
گلا گھونٹ دو !
مگر ——— !!
میرے اندر
جو بیٹھا ہے چھپ کر
پھر بھی وہ بولتا ہی رہے گا
اور "انا الحق" کی آواز سے
کان ہی کچھ نہیں
سارا پیکر تمہارا
بس اک پل میں مجروح ہو جائے گا
اور
رہ جاؤں گا
"میں"
فقط
"میں"

الا اللہ

رزاق افسر

خوف کی تاریکیوں کے دائرے
اور گمان و وہم کے اونچے حصار
یہ نظر میں ناشناسی کا جمود
حوصلوں کے
در پہ پہرے، بزدلی کے
عقل کے
خدشوں کے گہرے تار و پود
حق پسندی کی لگن پر
وسوسوں کے سائباں
آنے والے
کل کی فکر ناتواں کے نام و در
سب کے سب یہ
جس صدا سے ٹوٹ جائیں
اس صدا کا نام نامی
کلمۂ توحید ہے
اس صدا کا نقش اوّل
قتل و خون ہابیل کا
اس کا نقش جاوداں
قربانی حضرت خلیلؑ
اس صدا کا ارتقاء
طاعت پدری، ذبیح اللہؑ کی
اس کی نسبت
ہے حسینؑ کربلا کی استقامت
اور اس کی انتہا
حق پسند آل نبیؐ کا صبر کامل

۳۹۶۳، وین ان گھن روڈ، لشکر محلہ، میسور

بے طلب دیں تو مزا اس میں سوا ملتا ہے ۔ وہ گدا جس کو نہ ہو خوئے سوال اچھا ہے (غالب)

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم

آیا ہے لب پہ نامِ رسولِ کریم کا
جلوہ تڑپ اٹھا ہے ریاضِ نعیم کا

برسا جو ابر آپ کے لطفِ عمیم کا!
گلزار بن کے کھل گیا شعلہ جحیم کا

بحرِ عدن میں لاکھ ہوں لولوئے شاہوار
کچھ رنگ روپ اور ہے دُرِ یتیم کا

اے اہلِ بزم جانبِ بطحا چلا ہو لیں
پیغام لے کر آیا ہے جھونکا نسیم کا

اللہ رے خاکِ بیتِ مقدس کا مرتبہ
مسجود ذرہ ذرہ ہے عرش عظیم کا!

حسنِ ازل نے بھی شبِ والّیل دادِ دی
اعجاز جب عیاں ہوا بالِ رحیم کا

وحدت کو ناز کیوں نہ ہو احمد کی ذات پہ
سمجھایا جس نے راز الف لام میم کا

رتن پنڈوری

شافع اگر حضور رسالت مآب ہوں
پھر کیوں نہ فیض عام ہو رب کریم کا

شاہد نہ ہو سکا کبھی مشہود سے الگ
نورِ خدا ہے نور، رسول کریم کا

کیوں کر بیاں ہو مدحتِ خیر البشر رتن
ہے تنگ قافیہ مری طبعِ سلیم کا!

منقبت

کیا بتاؤں مجھے آج کیا مل گیا
اشرفی جیسا اک رہنما مل گیا

مل گیا جستجو کا صلہ مل گیا
ایک کافر کے گھر میں خدا مل گیا

بیعت دستِ مرشد ہوا جب سے میں
زندگی کو مری حوصلہ مل گیا

ناز کرتی ہے قسمت پہ اپنی جبیں!
بندگی کو ترا نقشِ پا مل گیا

سوچتا تھا دوراہے پہ جاؤں کدھر
خیر سے اشرفی قافلہ مل گیا

روئے مرشد کی تابانیاں کیا کہوں
نورِ احمد کا اک آئینہ مل گیا

جب سے ان کا تصور مجسم ہوا
جو نکھا جلنے والا دیا مل گیا

بابِ اشرف ملا کیا کہوں کیا ملا؟
اس بہانے خدا کا پتا مل گیا

پیر و مرشد کا رازی یہ فیضان ہے
اپنے عرفان کا کچھ پتا مل گیا

حکیم رازی ادیبی۔ پونہ

دیکھ چھوٹوں کو ہے اللہ بڑائی دیتا   آسماں آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا (ذوق)

ظہیر غازی پوری

جب نبیؐ کا ہمیں آسرا مل گیا
زندگی کو نیا حوصلا مل گیا

عکس کے ساتھ ہی آئینہ مل گیا
جب نبیؐ مل گئے تو خدا مل گیا

جو ہیں اہلِ نظر ان کو نامِ خدا
پتے پتے پہ لکھا ہوا مل گیا

اس کا دل اب کہیں بھی بہلتا نہیں
خلدِ طیبہ کا جس کو مزا مل گیا

یادِ احمدؐ میں دھڑکا تھا دل ایک دن
میں نے سمجھا کہ مجھکو خدا مل گیا

دینے والا ظہیر اتنا فیاض ہے
جتنا مانگا تھا اس سے سوا مل گیا

صابر براری، بی اے بی ایڈ

صاحبِ عز و شان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم
کون و مکاں کی جان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ذکرِ خدا ہے قولِ خدا ہے حکمِ خدا ہے وحیِ خدا ہے
آپ کا ہر فرمان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

روزِ ازل سے لیکے ابد تک ساری خدائی پر بیشک
آپ کا ہر فیضان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کوئی نبی تو طور پہ پہنچا اور کسی کا جلوہ دیکھا
عرش پہ ہیں مہمان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

ہے نہ ہوا ہے اور نہ ہوگا خلق میں کوئی آپکا ثانی
آپ ہی ہیں برہان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

عرش پہ جس کو رب نے بلایا رازِ خدائی جس کو بتایا
کون ہے وہ انسان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سامنے ہو وہ بابِ رحمت پیش کریں گلہائے عقیدت
دل میں ہے یہ ارمان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

صابرِ خستہ لاکھ ہے عاصی کیا نہیں بخشش کو کافی
نعت کا اک دیوان، محمد صلی اللہ علیہ وسلم

نعت شریف

کرسن لال ادیب

قلم کو جب شرف حاصل ہوا نعتِ پیمبر کا
بنا ہر لفظ اک تعویز خوفِ روزِ محشر کا

کہا خورشید نے یہ میرا حق ہے کیوں زمیں پائے
لیا آغوش میں کرنوں نے سایہ جسمِ اطہر کا

جمالِ رخ نے بخشا فیض کیا کیا قلبِ مومن کو
مشامِ جاں پہ کیا کیا فیض ہے زلفِ معنبر کا

مدینے کی زیارت کرنے والوں سے یہ سنتے ہیں
وہیں کی خاک میں ہے راز مضمر آبِ کوثر کا

فقیری میں شہنشاہِ دو عالم کا لقب پایا
جھکا سر پائے اقدس پر شہنشاہانِ خودسر کا

ادیبِ خستہ جاں اک بندۂ مجبور و احقر ہے
مگر رتبہ یہ کیا کم ہے بھکاری ہے ترے در کا

۱۴۷، مکند نگر غازی آباد

ظہیر آتش

رہے گا حشر تک قائم یہ میخانہ محمدؐ کا
بجھائے گا ہماری پیاس پیمانہ محمدؐ کا

زمانے بھر پہ کر دیتے ہیں پیہم نور کی بارش
مہ و خورشید دہراتے ہیں افسانہ محمدؐ کا

ہے انساں کیا، کہ ششدر رہ گیا جن و ملائک کو
شبِ معراج وہ پیشِ خدا جانا محمدؐ کا

زمیں کا ذرہ ذرہ کیوں نہ ان کا نام لے آخر
کہ لایا ہے ہزاروں رحمتیں آنا محمدؐ کا

نہیں ہے کچھ ہمارے دل پہ ہی موقوف اے آتش
ہر اک دل ہی ہوا کرتا ہے دیوانہ محمدؐ کا

قندھار واڑی، بانسوارا

سعید منظر

ہے سارے زمانے پہ عیاں شانِ محمدؐ
فرمانِ خداوند ہے فرمانِ محمدؐ

سوچا بھی کبھی تو نے ثنا خوانِ محمدؐ
اوقات کہاں تیری کہاں شانِ محمدؐ

جو گردشِ حالات سے خائف نہیں ہوتے
شاہوں سے تو بہتر ہیں غلامانِ محمدؐ

اللہ کرے اپنا بھی ارمان ہو پورا
مدت سے لیے بیٹھے ہیں ارمانِ محمدؐ

ہر گل سے رسالت کی مہک آتی ہے منظر
مہکا ہے عجب ڈھب سے گلستانِ محمدؐ

مکارالله خان، قندھار واڑی
بانسوارا ۔ راجستھان

بھلائی کر کہ تیرا بھی بھلا ہو
برائی کا ثمر اچھا نہیں ہے ۔ ظفر

فیضانِ رسالتؐ

حضرتِ ادیب مالیگانوی!

قلم جو وصفِ شہہ دو جہاں میں چل نکلا
جو لفظ تھا دُرِ شہوار کا بدل نکلا

نگاہ دل پہ جو ڈالی تمہارے ذکر کیساتھ
ہر ایک گوشۂ دل محفلِ ازل نکلا

ملی ہے عشقِ محمدؐ کی جس کو سرمستی
وہ بن کے رشکِ اویسؓ و بلالؓ چل نکلا

کیا تھا وہم پرستوں نے گرم ہنگامہ
جمالِ حسنِ یقیں، قاطعِ ظلل نکلا

جبیں سے خونِ مقدس ٹپک رہا تھا اگر
زباں سے حرفِ دعا پھر بھی برمحل نکلا

یہ بارگاہِ رسالتؐ کی جلوہ ریزی تھی
اٹھا وہاں سے جو مینارۂ عمل نکلا

نشانیاں تھیں، مہ و مہر کی طرح روشن
مگر نہ ذہنِ ابو جہل سے خلل نکلا

گئے تھے قتل کو آئے حیاتِ نو لیکر
عجیب شان سے عزمِ عمرؓ کا بل نکلا

رہے کمالِ سخن کو نہیں زوال ادیب
کہ یہ بھی لطفِ خداوندِ لم یزل نکلا

نعت

عادلؔ امروہی

ہے کلامِ حق کلام و گفتگوئے مصطفٰےؐ
یوں ہوئی انسانیت کو جستجوئے مصطفٰےؐ

آرزوئے شوق یہ کہتی ہے بڑھ کر چوم لے
جو نگاہیں دیکھ کر آئی ہیں کوئے مصطفٰےؐ

ہر نفس انکی تمنا ہر گھڑی ان کا خیال
بے سر و سامانیاں اور آرزوئے مصطفٰےؐ

میرے حالِ زار کا بھی کچھ بیاں کر دیجیو
اے صبا تیرا اگر جانا ہو سوئے مصطفٰےؐ

حضرتِ صدیقِ اکبرؓ اور عمرؓ عثمانؓ و علیؓ
یہ ستارے ہیں ضیائے روئے مصطفٰےؐ

بھیج کر روح الامیں کو عرش پر بلوا لیا
حق تعالیٰ کو ہوئی جو آرزوئے مصطفٰےؐ

دو جہاں میں چپے چپے پر ہے انکی روشنی
اور عادلؔ ہر طرف مہکی ہے بوئے مصطفٰےؐ

صغرا احمد سحرؔ سندیلہ

عشق کے بے قراروں کی کیا بات ہے
ہجرِ احمد کے ماروں کی کیا بات ہے

مرحبا قطرۂ اشکِ غم
ان چمکتے ستاروں کی کیا بات ہے

شام راحت فزا کیف پرور سحر
ایسے دلکش نظاروں کی کیا بات ہے

شہرِ طیبہ کی گلیوں کا کیا پوچھنا
دلکشا رہ گزاروں کی کیا بات ہے

ساقیِ حوضِ کوثر کا ہمسر کہاں
تشنہ لب مے گساروں کی کیا بات ہے

مل گیا سایۂ دامنِ مصطفٰےؐ
عاصیوں کے سہاروں کی کیا بات ہے

جن کے صدقے ہیں گلہائے باغِ ارم
ان ببولوں کے خاروں کی کیا بات ہے

خاکِ طیبہ پہ شیدا ہیں شمس و قمر
پُرضیا ریگ زاروں کی کیا بات ہے

گلستاں تو مدینے کے ہیں گلستاں
اے سحرؔ خار زاروں کی کیا بات ہے

اے بے جزاؔ اگر ہے بزرگی کی آرزو — دنیا کی رہ گزر میں بزرگوں کی چال چل (ذوقؔ)

باب ۳
مقالات و مضامین

ترتیب

شیخ محمد بشیر وارثی

۳۹۵ ناناپیٹھ پونہ ۲ ۔ فون نمبر ۲۲۲۲۲

قیمت ۱۵ روپے

فنِ لغت نویسی - چند رہنما اصول

ڈاکٹر عصمت جاوید

فنِ لغت نویسی سے کسی زبان کی اس لسانی منزل کی نشاندہی ہوتی ہے جب [illegible] پہنچ کر وہ اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اس حد تک اضافہ کر لیتی ہے کہ اسے استعمال کرنے والے افراد اس زبان کے نسبتہً مشکل اور مبہم لسانی عناصر کو آسان اور معلوم لسانی عناصر کی مدد سے سمجھنے کی ضرورت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لغت کا بنیادی مقصد اسی ضرورت کی تکمیل ہے۔ لغت دراصل حوالے کی کتاب ہے جس میں کسی زبان کے عسیر الفہم اور غریب الفاظ یا (سامی زبانوں کی صورت میں ان کے مادے) بہ اعتبار ہجا ترتیب دیے جاتے ہیں اور ان الفاظ کے محاذی (یا مادوں کے تحت ان مشتقات کے محاذی) ان کے یا تو مترادفات درج کیے جاتے ہیں یا ان کی وضاحت کی جاتی ہے۔ اور اگر یہ ذو لسانی لغت ہو تو اصل زبان کے الفاظ کے معنی دوسری زبان کے ہم معنی الفاظ کی شکل میں پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن لغت کی اہمیت صرف اسی قدر نہیں ہے کہ وہ حوالے کی کتاب ہے۔ لغت کسی زبان کی قوت اور اس کی ہمہ جہتی ترقی کی علامت بھی ہے۔ نیز اس میں کسی زبان کے بارے میں اس قدر خام مواد اکٹھا ہوتا ہے کہ اس کی مدد سے اس زبان کی تاریخی اور ثقافتی ترقی کی سمت و رفتار کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔ لغت لسانی قوت کا اشاریہ بھی ہے۔ اور قومی ثقافتی خزانہ بھی۔ یہ صحیح ہے کہ صرف لغت کے مطالعے میں کوئی شخص نہ تو کسی نئی زبان کے مزاج و منہاج سے واقف ہو سکتا ہے اور نہ اپنی زبان کی اسرار میں درک حاصل کر سکتا ہے۔ زبان سیکھنے اور اس کے مزاج سے واقف ہونے کے سلسلے میں صرف قواعد اس کی دلیلِ راہ بن سکتی ہے۔ کیونکہ وہ زبان کی ساخت کا عرفان دیتی ہے۔ اور ان

اصولوں کی طرف رہنمائی کرتی ہے جو جملہ سازی کے پس پردہ اہلِ زبان کے لیے غیر شعوری سطح پر اور نو سیکھے کے لیے شعوری طور پر اپنا رول ادا کرتے ہیں۔ لغت تو صرف ذخیرہ الفاظ تک رہنمائی کر سکتی ہے۔ لیکن صرف اسی بنا پر زبان فہمی کے سلسلے میں اس کی اہمیت گھٹ نہیں جاتی کیونکہ لغت اگرچہ چلنا نہیں سکھا سکتی لیکن چلنے کے لیے جس توانائی کی ضرورت ہے اسے فراہم کر سکتی ہے۔ وہ الفاظ کی مزاج داں ہوتی ہے۔ وہ ان کے معانی کے نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف فرق سے واقف ہوتی ہے۔ وہ قواعد کی طرح بولنا نہیں سکھاتی لیکن اگر کوئی بولنا سیکھ جائے تو اسے بولنے کا مواد فراہم کرتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسے بولنے کے آداب سے واقف کراتی ہے کیونکہ وہ لفظوں کے برمحل استعمال کے گر سے واقف کرانے میں مددگار کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ زبان کی تہذیبی روایات کی امین بھی ہے اس لیے صرف قواعد اور آرام کرسی پر مطالعے کی مدد سے سیکھی ہوئی زبان کی مضحکہ خیز غلطیوں کی صحت کا معیار قائم کرنے کا حق صرف اسی کو ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ زبان صرف ترسیلِ خیالات کا آلہ نہیں ہے بلکہ ان لسانی عادات کا مجموعہ بھی ہے جو کسی قوم کی تہذیبی روایات کی اندرونی سطحوں سے ابھرتی ہیں۔ اس لیے لغت کسی قوم کی تہذیبی شخصیت کو سمجھنے اور پرکھنے میں چراغِ راہ کا کام دیتی ہے۔

لغت اپنے مختلف مشمولات مقاصد اور طریقِ کار کے اعتبار سے مختلف قسم کی ہوتی ہے۔ ذولسانی لغت، تجارتی لغت (DESK DICTIONERY) لغت برائے طلبہ، سوانحی لغت، فرہنگ اصطلاحات فرہنگ تلمیحات، اساطیری لغت، محاوروں اور ضرب الامثال پر مشتمل لغت، فرہنگ مترادفات،

کنز الالفاظ ([illegible]) غیر ملکی یا غیر زبان کے فقروں اور کلاسیکی ادب کے اقتباسات پر مشتمل لغت، لغات النساء، قاموس الاغلاط وغیرہ کسی لغت کے مافیہ اور اس کی تکنیک کے طریقۂ کار کا دارومدار اس بات پر بھی ہوتا ہے کہ یہ لغت کس لسانی مقصد کے پیشِ نظر تیار کی جا رہی ہے اسی اعتبار سے لغت تاریخی بھی ہو سکتی ہے۔ توضیحی ([illegible]) بھی، قاموسی بھی ہو سکتی ہے اور صرف تلفظ نما بھی۔ اگر لغت کا مقصد تاریخی ہو تو اس میں الفاظ کی تحقیق یعنی مادوں اور ماخذوں کا ذکر ہوتا ہے۔ زبان ایک زندہ نامیہ ہے۔ جو زمان و مکان کے ابعادِ اربعہ میں، جغرافیائی تاریخی اور معاشرتی اعتبار سے اپنا رنگ بدلتی ہے کی طرح زبان کے تغیر ہی میں اس کی زندگی کا راز پنہاں ہے۔ یہ تغیرات صوتی بھی ہوتے ہیں، حرفی بھی اور معنوی بھی۔ صوتی و معنوی تبدیلیوں کی رفتار حرفی تبدیلیوں کے مقابلے میں تیز تر ہوتی ہے تاریخی لغت الفاظ کی تاریخ سے سروکار رکھتی ہے اور اس کی نظر لفظوں کی صوتی و معنوی تبدیلیوں پر ہوتی ہے۔ تاریخی لغت میں الفاظ کی 'اصلیات' ([illegible]) ان کی قدیم اور متروک شکلوں کو موجودہ شکلوں کے علی الرغم پیش کر کے بتائی جاتی ہے اور ہر لفظ کی ابتدائی اصل (Original) کی بھی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مثالوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ مثالیں قدیم ترین تحریری نمونوں سے لے کر تاریخِ ادب کے مختلف ادوار سے تعلق رکھنے والی ادبی تخلیقات تک سے منتخب کی جاتی ہیں۔ جہاں تک اردو اور ہندی

اے ذوق گر ہیں ہوش تو دنیا سے دور بھاگ اس میکدہ میں کام نہیں ہوشیار کا (ذوق)

کیا گیا ہے ۔ جان ٹی پلیٹس کی ذولسانی لغت A Dictionery of Urdu, Classical Hindi and English، اس سمت میں ایک قابل تعریف قدم ہے۔ اس لغت کی سب سے اہم امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تقریباً ہر لفظ کی چاہے وہ ہندی الاصل ہو، فارسی ہو یا عربی۔ اس کی اصلیات کی نشاندہی کی گئی ہے اور ہم صوت لیکن مختلف المعنی الفاظ کی الگ الگ اصلیات درج کرنے کا التزام بھی کیا گیا ہے بلکہ ہی ساتھ تلفظ کا اختلاف اور ترجیحی تلفظ کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے ۔

لغت اپنے مقصد کے اعتبار سے توضیحی بھی ہوسکتی ہے ۔ ایسی لغت کا مقصد صرف کسی زبان کے الفاظ کی موجودہ شکلوں کو معروضی انداز میں پیش کرنا ہے ۔ یہ الفاظ مختلف سماجی گروہوں اور مختلف جغرافیائی خطوں میں تلفظ و معنی کے فرق کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ۔ توضیحی لغت کا کام ان کی صحت کا معیار قائم کیے بغیر انہیں من و عن پیش کرنا ہے لیکن عام طور پر لغت تاریخی و توضیحی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہوتی ہے ۔ ان دونوں پہلوؤں میں کسی ایک پہلو پر زور دینے کی وجہ سے ایسی لغت تاریخی اور توضیحی دونوں میں سے کسی ایک کے زیادہ قریب ہوتی ہے، ایسی لغت مبتدی اور اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ، دونوں کے لیے کارآمد ثابت ہوسکتی ہے بکچھ توضیحی لغات ایسی ہیں جو الفاظ کے معنی نظر انداز کر کے صرف ان کے تلفظ سے سروکار رکھتی ہیں ۔ انھیں تلفظ نما (Pronouncing) لغت کہا جاتا ہے ۔ مثلاً ڈینیل جونس کی (English Pronouncing Dictionery)

اگر کوئی لغت زندگی کے تمام شعبوں میں ہونے والی یا سائنس، فلسفہ و حکمت اور ادب کے شعبوں میں ہونے والی ترقیوں سے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات فراہم کرنے کی کوشش کرے تو اُسے قاموسی لغت (Encyclopaedic Dictionery) کہا جاتا ہے ۔ مشہور لغت نویس ویبسٹر Webster نے اپنی شہرۂ آفاق لغت کے پہلے ایڈیشن میں "وزن اور ناپ کے قدیم و جدید پیمانے" یہودیوں، یونانیوں اور اہل روم میں مروّج پیمائش زماں کی مختلف اکائیاں اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے ڈاک گھروں کی فہرست" سبھی کو شامل کیا تھا ۔ لیکن لغت کا بنیادی مقصد صرف مطالعۂ زبان کے سلسلے میں رہنمائی کرنا ہے اور مطالعۂ زبان کے سلسلہ میں قاموسی معلومات پیرامنی اور ضمنی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس لیے لغت نویسی کا جدید رجحان لغت کو لسانی وظائف تک محدود کرنے کی طرف ہے اور لسانی وظائف کو قاموسی علم سے جوڑنے کے خلاف ۔ جدید لغت ادب اور دیگر علوم سے تعلق رکھنے والے الفاظ کے بارے میں مختصر اور جامع معلومات ضرور فراہم کرتی ہے لیکن لغت استعمال کرنے والوں سے یہ توقع بھی رکھتی ہے کہ وہ تفصیلی معلومات کے لیے کسی قاموس یا مخزن علوم سے رجوع کریں ۔ تفصیلی معلومات کے سلسلے میں سوانحی لغت، فرہنگ اصطلاحات، اساطیری لغت وغیرہ سے مدد لی جاسکتی ہے ۔ عام لغت کا مختصر اور جامع معلومات کی فراہمی سے تجاوز کرنا اپنے جائز حدود سے آگے نکل جانا ہوگا ۔

عام طور پر معیاری اور ترقی یافتہ زبانوں ہی کی لغات تیار کی جاتی ہیں ۔ لیکن آج کل لسانی نقطۂ نظر سے بولیوں کی اہمیت کافی بڑھ گئی ہے اس لیے ایسی بولیوں کی لغات بھی ترتیب دی جا رہی ہیں جن کا کوئی رسم الخط نہیں ۔ ایسی لغت بولی لغت (Dia-lectical Dictionery) ۔ کہلاتی ہے ۔ بولی لغت کا ذکر کرتے ہوئے بلوم فیلڈ لکھتا ہے "ابتدا میں بولی لغت میں صرف ایسے الفاظ شامل کیے جاتے تھے جو تلفظ اور معنی کے لحاظ سے معیاری زبان کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے اس قسم کا التزام بلاشبہ ضروری ہے لیکن آج ہم کسی مقامی بولی کی ایسی لغت کی ضرورت بھی محسوس کرتے ہیں جس میں اس بولی کے تمام الفاظ شامل ہوں اور ان کو صوتی مطابقت اور مناسب معنوی تعریفوں کے ساتھ درج کیا جائے ۔ ایسی بولی لغت کی تدوین جو ایک پورے جغرافیائی علاقے پر حاوی ہو، اس سے بھی بڑا منصوبہ ہوگا ۔"

اس کام کے لیے لسانی جغرافیہ اور لسانی اٹلس کی تدوین ضروری ہے، جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں ہوچکا ہے ۔ ان کی مدد سے ہندوستان میں بھی اس طرز کی بولی لغت کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا جاسکتا

مختلف سماجی سطحوں پر ایک ہی زبان کے الفاظ اختلاف تلفظ و معانی کے ساتھ ادا کیے جاتے ہیں. ایک ہی لفظ کا عوامی تلفظ کچھ اور ہوتا ہے اور ثقہ حضرات اسے دوسرے ڈھنگ سے ادا کرتے ہیں جہلا کے تلفظ کو طبقہ شرفاء میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ اسی لیے قدیم نحوی اور لغت نویس اپنی معیاری زبان کو عوام اور جہلا کے حملوں سے محفوظ رکھتے ہوئے اس کی پاکیزگی اور خالصیت کو قائم رکھنے کی غرض سے قواعد اور لغت تیار کرتے تھے ۔ اسی لیے وہ عامیانہ تلفظ، عوامی تصرفات اور مبتذل اور سوقیانہ الفاظ کو اپنی لغت میں جگہ دینے کے لیے کسی طور پر تیار نہ ہوتے تھے اگر کسی زبان میں ثقافتی اور سیاسی اعتبار تو قدیم لغت نویسوں کا سرمایہ اصرار ہوتا تھا کہ مستعار الفاظ کا تلفظ از روئے اصل ہو اور ان میں پیدا ہونے والے صوتی و نحوی تغیرات کو سند کا درجہ نہ دیا جائے ۔ ان کی نظروں میں ایسا کرنا مذہبی اہانت کے مصداق تھا روایتی قواعد کی طرح روایتی لغت بھی تحکمانہ PRE-SCRIPTIVE - اور امتناعی PROSCRIPTIVE ہوا کرتی ہے ۔ اور روایتی قواعد نویس کی طرح روایتی لغت نویس بھی خود کو زبان کا قانون ساز سمجھتا ہے ۔ انگریزی لغت نویسی میں تحکمانہ اور توضیحی روایات کے فرق کو واضح کرتے ہوئے البرٹ مارک وارٹ ALBERT H. MARCKWART لکھتا ہے ۔

"قدیم روایت کا سہرا سیموئیل جانسن کے سر ہے جس نے ۱۷۵۵ء میں انگریزی لغت تیار کی تھی اس لغت کے دیباچے میں جانسن لکھتا ہے 'ہر زبان میں لغویات اور بے سر پا عناصر شامل ہوتے ہیں ۔ لغت نویس کا فرض ہے کہ وہ انھیں درست کرے یا ان کے استعمال کی ممانعت کرے، جانسن کے قول کے مطابق لغت کا کام تلفظ کو متعین کرنا یا اس کے تعین میں مدد دینا ہے تاکہ زبان خالص رہ سکے ! اس کا مستند استعمال ہو اور اس استعمال میں پائداری آجائے ۔'"

توضیحی روایات کا تذکرہ کرتے ہوئے جس میں الفاظ صرف معروضی طور پر مرتب کیے جاتے ہیں مارکواٹ

شاہراہِ ہستی موہوم میں وہ چال چل اپنی آنکھوں کو بچھا دیں دوست دشمن زیر پا اے آتش

لکھتا ہے ۔

"انگریزی داں اقوام کے لیے سب سے پہلے یہ تصور آکسفورڈ انگلش ڈکشنری نے دیا جس کا قدیم نام تھا ۔

ANEW ENGLISH DICTIONERY ON HISTORICAL PRINCIPALS

اس لغت کے دیباچہ میں اس کے اغراض و مقاصد پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ اس لغت کا مقصد انگریزی الفاظ کو بہ اعتبار ہی اس طرح پیش کرنا ہے کہ قدیم زمانے سے اب تک ان میں جو جو تغیرات ہوئے ہیں انھیں پیش کیا جائے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی ہیئت، معنوی تاریخ تلفظ اور اصلیات کا بھی ذکر ہو ۔ اس لغت میں صرف ادبی زبان کے معیاری الفاظ ہی نہیں بلکہ بول چال کے وہ الفاظ بھی ہیں جو یا تو موجودہ زمانے میں مروج یا متروک ہیں ۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں مصطلحات بھی شامل ہیں اور بولی کی سطح پر ان کا عامیانہ استعمال بھی بتایا گیا ہے ۔"

آکسفورڈ انگلش ڈکشنری تاریخی بھی ہے اور توضیحی بھی ۔ وہ معیاری زبان کو اساس بناتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ بول چال کی زبان کو ادبی زبان پر فوقیت دینا چاہئے ۔ لیکن لغت نویسی میں ضروری نہیں کہ توضیحی لسانیات کے اس بنیادی موقف کو اساس بنایا جائے کیونکہ اگر زبان کے سماجی پہلو کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ بصورت موجودہ معیاری زبان کو عام بول چال کے مقابلے میں ترجیح حاصل ہے یہی زبان اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی جاتی ہے، اخبارات و رسائل میں اسی کا استعمال ہوتا ہے ۔ اسے تعلیم یافتہ شہری گروہ اور اعلیٰ اور متوسط طبقوں کے لوگ استعمال کرتے ہیں تخلیقی ادب میں بڑی حد تک اسی سے کام لیا جاتا ہے ۔ یہ عدالت میں استعمال ہوتا ہے ۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن پر بھی یہی معیاری زبان ذریعہ اظہار ہے ۔ غرض یہی زبان سماجی حیثیت، رکھ رکھاؤ اور عزت و وقار کی ضامن ہے ۔ معیاری اور غیر معیاری زبان استعمال کرنے والے دونوں گروہ معیاری زبان ہی کو افضل و اعلیٰ سمجھتے ہیں ۔ اس لیے جدید لغت نویس کے لیے یہ صورت حال ذوالجہتین سے کم نہیں ۔ کیا وہ زبان کے لفظی خزانے کو جوں کا توں پیش کرے جو توضیحی لسانیات کا تقاضا ہے یا وہ جانسن کی پیروی میں زبان کی خالصیت کو برقرار رکھے میں سمجھتا ہوں کہ آکسفورڈ لغت نے معیاری استعمال کے دوش بدوش غیر معیاری استعمال کو جگہ دے کر پہلے ہی سے درمیانی راہ نکال لی ہے ۔ نور اللغات، فرہنگِ آصفیہ اور پلیٹس کی لغت میں بھی کہیں کہیں عوامی زبان کی تلفظ کی نشاندہی کی گئی ہے ۔ الفاظ کی سماجی حیثیت متعین کرنے کے سلسلے میں موجودہ رجحان غیر جانب دار لیبل استعمال کرنے کے حق میں ہے ۔ انھیں اصطلاح میں "حیثیت کے لیبل" (STATUS LABEL) کہا جاتا ہے ۔ غیر جانب دار لیبل سے مراد ایسی سماجی تعصب سے بری رکھنا ہے ۔ مثلاً کسی لفظ کو عامیانہ متبذل یا سوقیانہ کہنے کے بجائے انھیں "غیر معیاری" یا کم معیاری (Sub Standard) جیسی صفات سے متصف کیا جاتا ہے ۔ ویبسٹر کی تیسری بین الاقوامی لغت Webster's Third International Dictionery میں اسی طرح کے غیر جانبداری لیبل استعمال کیے گئے ہیں بلوم فیلڈ نے ایک پیچیدہ (Complex) لسانی گروہ کی مختلف زبانوں کی درجہ بندی اس طرح کی ہے (۱) ادبی معیار (۲) بول چال کا معیار (۳) علاقائی معیار (۴) کم معیاری اور (۵) مقامی بولی ۔ اردو زبان کی رعایت سے اس میں ایک اور قسم کا اضافہ کیا جاسکتا ہے (۶) عورتوں کی بولی ۔ ایک جامع لغت میں لفظ کی ان تمام قسموں کا احاطہ ہونا چاہئے ترقی اردو بورڈ کی زیر تدوین اردو ۔ اردو لغت اور دوسری روایتی لغات میں عورتوں کی بول چال کی نشاندہی مخفف 'عو' سے کی گئی ہے ۔ علاقائی معیار کے تحت انگریزی لغات میں جس طرح اسکاٹ لینڈی استعمال اور امریکی استعمال (جنھیں حقارت سے بالترتیب Americanism اور Scoticism کہا جاتا ہے) کا ذکر ہوتا ہے ۔ چونکہ اردو زبان کا لسانی خطہ بھی وسیع الذیل ہے اس لیے اردو لغات میں بھی لکھنوی، دہلوی، دکنی کی اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں ۔ نئے نئے چٹپٹے مرکبات اور چٹپٹی اصطلاحات کو بھی لغت میں جگہ ملنی چاہیے لیکن اس سلسلے میں محتاط روش اختیار کرنا لازمی ہے، ایسے مرکبات کو لغت میں بار دینے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ زبان میں ان کا چلن عام ہوا ہے یا نہیں ۔ انگریزی زبان میں لفظ 'ٹیلی گرام' ایک زمانے میں علمی حلقوں میں انتہائی گھٹیا سمجھا جاتا تھا ۔ کیونکہ اصلیت کے اعتبار سے یہ ترکیب دوغلی ہے لیکن آج کوئی انگریزی لغت اسے نظر انداز نہیں کر سکتی ۔ اردو میں 'پبیکرین' اداکارہ، کار لائق اور بوالپسی ڈاک جیسے صدہا از روئے اصل غلط الفاظ مستعمل ہیں ۔ لیکن انھیں قبول عام کا درجہ حاصل ہے اس لیے لغت میں انھیں معیاری ہونے کا درجہ دینا چاہیے ۔ جب کوئی زبان کسی غیر زبان کے لفظ کو قبول کرتی ہے تو اس میں اپنی لسانی عادات، صوتی مزاج ضروریات اور ماحول کے مطابق صوتی و معنوی تصرفات بھی کرتی ہے ۔ 'قیاس' (Analogy) کی بنیاد پر نئے نئے الفاظ بھی گھڑتی ہے ۔ اور اس میں کئی نام نہاد 'دوغلی' ترکیبیں راہ پا جاتی ہیں ۔ یہ صرف اردو کا قصور نہیں بلکہ ہر زندہ زبان کی خصوصیت ہے ۔ اردو لغات میں الفاظ کا وہی تلفظ مستند قرار دیا جائے جسے قبول عام کا درجہ حاصل ہے ۔ آج کوئی بھی اَل مِیّہ (المیہ) کو بالفتح لام نہیں کہتا بلکہ اردو میں اُلمیہ عام تلفظ ہے ۔ جَلاوطن کی جگہ بھی جِلاوطن کہتے ہیں ۔ جواد کو جوّاد، عظَمت کو عظمت، آزَردہ کو آزُردہ، ظُلُمات کو ظُلمات، مُبَقہ کو ملبقہ، چُغَد چُغد، سِفر کو سَفر، اصطبل (اص طبل) کو اصطَبل، مَشَن کو مِشَن اور سِشَر کو سکر کہتے ہیں ۔ افسوس ہے کہ متداول اردو لغات میں ایسے الفاظ یا تو از روئے اصل تلفظ دیا جاتا ہے یا مقبول عام تلفظ کو ثانوی حیثیت دی جاتی ہے ۔ حالانکہ ہونا یہ چاہئے کہ مقبول عام تلفظ ہی کو اردو کو صحیح تلفظ قرار دیا جائے ۔ البتہ جہاں اصل تلفظ بھی علمی حلقوں میں عام ہو جیسے مَرض، معنون، لیت و لعل وغیرہ انھیں ترجیح دی جاسکتی ہے ۔ اس سلسلے میں ماہرین زبان کی ایک کمیٹی تیار کی جاسکتی ہے ۔

چونکہ قواعد و لغت دونوں مل کر زبان کے بارے میں مکمل معلومات فراہم کرتی ہیں ۔ اس لیے لغت کے لیے ضروری ہے کہ وہ قواعد کا سہارا لے ۔ اجزائے کلام جیسے اسم، فعل اور جنس وغیرہ کا ہر لفظ کے ساتھ اظہار ضروری ہے ۔ اظہار تلفظ کے لیے رومن رسم الخط میں لکھی جانے والی زبانوں کے لیے بین الاقوامی صوتی حروف IPA کا استعمال ہوتا ہے ۔ قدیم لغات میں فتحہ ضمہ و کسرہ جیسی

بے فائدہ انفاس کو ضائع نہ کر اے درد ہر دم دمِ عیسیٰ ہے تجھے پاس نہیں ہے (درد)

اصطلاحوں کی مدد سے اظہار تلفظ کیا جاتا ہے لیکن فرہنگ عامرہ اور زیر تدوین اردو۔ اردو لغت میں لفظ کو ارکان تہجی میں تقسیم کر کے ان پر اعراب لگائے گئے ہیں۔ قدیم طریقے میں کتابت کی غلطی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن اس نئے طریقے یعنی اعراب لگانے کے سلسلے میں کتابت و طباعت کی غلطی کا بڑا امکان ہے۔ اس لیے اگر یہ نیا طریقہ اپنانا ہو تو پروف پڑھنے والے کی ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر احتیاط کے باوجود کتابت کی غلطی رہ جائے تو اسے درستی نامے کے ذریعہ ظاہر کرنا انتہائی ضروری ہے۔ کیونکہ عام طور پر پڑھے لکھے لوگ لفظوں کی تذکیر و تانیث، تلفظ یا املا دیکھنے کے لیے ہی لغت دیکھتے ہیں۔ معانی دیکھنے کی ضرورت انھیں کم پڑتی ہے۔ اس باب میں زیر و زبر کی معمولی غلطی جس کا ذمہ دار کاتب ہی کیوں نہ ہو اندیشہ ناک صورتیں پیدا کر سکتی ہیں۔ چونکہ اہل علم اور اعلیٰ جماعتوں کے طلبہ کسی لفظ کی اصلیات اور اس کی قدیم و متروک شکل جاننے یا سائنسی و ادبی اصطلاحات یا تلمیحات کے پس منظر سے واقف ہونے کے سلسلے میں یا اصطلاحات کا مناسب ترجمہ دیکھنے کے لیے لغت سے رجوع ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس ضمن میں فراہم کی ہوئی معلومات جس قدر مستند ہوں گی اسی تناسب میں لغت بھی معتبر سمجھی جائیگی۔

لغت نویسی میں سب سے اہم اور اسی قدر مشکل کام انتخاب الفاظ کا ہے۔ عام طور پر نئی لغت تیار کرنے والے پرانی لغات سامنے رکھ لیتے ہیں اور قدرے حذف و اضافے کے بعد اسے تیار کر لیتے ہیں۔ یہ خیانت کی بدترین مثال ہے۔ نئی لغت تیار کرتے ہوئے پرانی لغات سامنے ضرور رکھنا چاہیے لیکن ان سے الفاظ انتخاب کرتے ہوئے بڑی احتیاط اور لسانی درک کی ضرورت ہے۔ قدیم لغات میں اکثر الفاظ کے شاذ معنی مرقوم ہوتے ہیں۔ جن کا حوالہ بھی نہیں دیا جاتا۔ بعض مرتبہ کسی چیز کے لیے استعمال کیے ہوتے استعارے کو اصل معنی سمجھ کر اس استعارے کے یہی معنی لکھ دیے جاتے ہیں کہیں بے جا اختصار اور کہیں بے جا طوالت سے کام لیا جاتا ہے اور غیر متعلق باتوں میں صفحے کے صفحے خراب کیے جاتے ہیں۔ نئے لغت نویس کا کام یہ ہے کہ وہ اگر کوئی شاذ لفظ پرانی لغت میں دیکھے تو مطالعہ کتب سے اس کے بارے میں اطمینان کر لے کہ اس لفظ کا وجود تھا بھی یا نہیں۔ یا اس کے جو شاذ معنی دیے گیے ہیں وہ مناسب ہیں یا نہیں۔ اگر اسے شاذ لفظ یا کسی لفظ کے شاذ معنی مل نہ سکیں تو پھر یہ دیکھے کہ یہ لفظ یا اس کے شاذ معنی دوسری لغات میں ہیں یا نہیں۔ اگر متعدد لغات اس لفظ یا اس کے معنی میں متفق ہوں یا جزوی اختلاف رکھیں تو اسی صورت میں وہ اسے اپنی نئی لغت میں جگہ دے۔ ورنہ لغت کو خواہ مخواہ ضخیم بنانے سے کچھ حاصل نہیں۔ شاذ معنی کی صورت میں متعلقہ لغت کا حوالہ ضروری ہے۔

پرانی لغات سے حسب ضرورت تو استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن لغت نویس کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ نئی لغت، پرانی لغات کی نقل یا متداول لغات کا خلاصہ ہونے کے بجائے زندہ زبان کے تحقیقی مطالعے کا نتیجہ ہو۔ اگر ہر لغت کے نئے ایڈیشن میں مزید الفاظ کا ضمیمہ شامل نہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوگا کہ زبان کے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ اسے مرتب یا ناشر کی سہل نگاری سے تعبیر کیا جائے گا کیونکہ زندہ زبان تو ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح ہے اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں نئے نئے الفاظ کا اضافہ لازمی امر ہے۔ اردو بھی ایک پھولتی پھیلتی زبان ہے۔ اگر اردو لغت میں اردو جیسی ہندوستان گیر زبان کے علاقائی اختلافات کو جگہ نہ ملے تو یہ لغت ادھوری کہلائیگی۔ اردو صرف شمالی ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ یہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں بھی بولی جاتی ہے۔ دکن کے وسیع علاقے میں آج بھی یہ گھروں میں استعمال ہوتی ہے۔ دکن میں مہاراشٹر بھی شامل ہے۔ دکنی اختلافات کے انتخاب کے سلسلے میں صرف دکنی اردو لغات سے استفادہ کافی نہیں ہوگا کیونکہ اس طرح کی لغات میں صرف ادب سے ماخوذ ایسے دکنی الفاظ ملتے ہیں جنھیں سمجھنے والے آج دکن میں نہیں ملینگے۔ ایسے الفاظ کو صرف دکنی لغات ہی میں رہنے دیا جائے۔ اردو لغت میں مروجہ دکنی الفاظ بالخصوص اردو میں مروج الفاظ کے صوتی و معنوی اختلافات کو جگہ ملنی چاہیے۔ اور یہ کام ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے — [illegible] work کی ضرورت ہے۔ چونکہ لغت کا تعلق تازہ ترین زبان سے ہوتا ہے۔ اس لیے لغت نویس کو چاہیے کہ انتخاب الفاظ کے لیے وہ اخبارات، رسائل اور تازہ ترین تخلیقات نظم و نثر جیسے افسانوں، ناولوں، ڈراموں، مضامین علمی و سائنسی مقالات کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے اور لفظوں کے تواتر استعمال (frequency) کے پیش نظر ان کا انتخاب کرے۔ انتخاب الفاظ کے سلسلے میں پتہ نہیں مرتبین اردو۔ اردو لغت نے یہ اصول کیوں بنایا کہ "افسانوں اور ڈراموں کے مکالموں سے مقامی بولیوں کی سند نہ لی جائے۔" کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی اور دیگر پنجابی افسانہ نگاروں کے اکثر افسانوں میں پنجابی الفاظ ملتے ہیں اسی طرح عصمت چغتائی کے افسانوں میں راجستھانی الفاظ تواتر کے ساتھ ملتے ہیں جن کے معنی سے اردو داں قاری واقف نہیں ہوتا۔ پھر وہ ان الفاظ کے معنی کہاں تلاش کرے؟ یا اگر یہ افسانے داخل نصاب ہوں تو استاد اپنے طلبہ کو ان کے کیا معنی بتائے۔ کیا تدوین لغت کے سلسلے میں ایسے مقامی الفاظ انتخاب کر کے ان کے معنی متعلقہ بقید حیات ادیبوں یا ان زبانوں کے ماہرین سے دریافت نہیں کیے جا سکتے؟

یہ کام مشکل سہی ناممکن نہیں۔ اردو۔ اردو لغت میں لفظ 'رگڑا' کے کئی معنی دیے گیے ہیں۔ لیکن بمبئی میں یہ لفظ مخصوص قسم کی چاٹ کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اب اگر یہ لفظ کسی افسانے میں یا مختلف افسانوں میں تواتر کے ساتھ آئے تو اس کے معنی کہاں تلاش کیے جائیں؟ اسی لغت میں "رگت گھول" کے معنی نوسرہار کے حوالے سے خون میں لت پت تو دیے گیے ہیں لیکن دکن میں یہ لفظ قدرے اختلاف تلفظ کے ساتھ ایک دوا کا نام ہے۔ اس کا لغت میں کہیں ذکر نہیں۔

لغت نویس کا کام یہ ہے کہ وہ مناسب مواد کی فراہمی کے لیے وسیع مطالعے کا ایک منصوبہ بنائے پھر الفاظ چن چن کر ان کی مناسب پرچیاں — [illegible] tion slips tion تیار کرے اور انھیں مناسب خانوں میں ترتیب سے رکھے۔ نئے الفاظ کے سلسلے میں لغت کو تحکمانہ روش سے گریز کرتے ہوئے اسے صرف مناسب اور معیاری بننے کی کوشش کرنا چاہئے۔ اسی وقت اسے سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سوالناموں کے ذریعے (صرف کسی

آگے کسی کے کیا کریں دست طمع دراز وہ ہاتھ سو گیا ہے سرہانے دھرے دھرے (میرؔ)

قبیل الاشاعت رسالے میں چھپوا کر نہیں) ماہرین سے رائیں طلب کی جائیں اور ان میں اتفاق رائے کو ترجیحات میں سب سے اول رکھا جائے۔

لغت نویسی میں انتخاب الفاظ کے بعد اس کی پیشکش (presentation) کی بڑی اہمیت ہے جس لفظ کے معنیٰ بتانے مقصود ہیں اسے اصطلاح میں اندراج (entry) کہتے ہیں۔ بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں جو کسی نہ کسی لفظ سے مشتق ہوتے ہیں یا جو کسی محاورے میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان الفاظ کا الگ سے اندراج کر کے ان کے معنی بیان کرنے کے بجائے انھیں اصل اندراج کے تحت درج کیا جاتا ہے۔ اسے اصطلاح میں ضمنی اندراج Sub entry) کہتے ہیں۔ کسی لفظ کا اندراج یا ضمنی اندراج لغت نویسی میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ہر لفظ کو اندراج کا درجہ دینے سے لغت کی ضخامت بھی خواہ مخواہ بڑھ سکتی ہے۔ اگر ایک ہی لفظ سے کئی محاورات بنتے ہوں تو انہیں ضمنی اندراج کے طور پہ درج کرنے سے کاغذ کی بچت ہوتی ہے۔ محاوروں میں اصل لفظ کو لکھنے کے بجائے ڈیش (–) سے کام لینا کافی ہے۔ لیکن مرتبین اردو۔ اردو لغت نے یہ التزام نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے لغت کی ضخامت خواہ مخواہ بڑھ جائے گی۔ مثلاً لفظ "پاپوش" سے متعلق مختلف محاورات کو اندراجات کا درجہ دیا گیا ہے حالانکہ پاپوش کو ایک اندراج مان کر اس کے تحت اس لفظ سے متعلق تمام محاورات ذیلی اندراجات کے طور پہ پیش کیے جاسکتے تھے (بر سبیلِ تذکرہ: پاپوش کے ذیل میں جتنے محاورے درج ہیں ان میں سے اکثر لفظ 'جوتی' کے ساتھ بھی مستعمل ہیں۔ اگر اس جگہ اس کی صراحت اندرونی حوالے کے طور پر کی جاتی تو بہتر تھا۔)

اندراج کے بعد الفاظ کے ایک سے زائد معانی کی ترتیب کا سوال اہم ہے اکثر زبانوں میں ایسے الفاظ بھی ہوتے ہیں جو یا تو ہم معنی ہوتے ہیں۔ یا ایک لفظ کے کئی معنی ہوتے ہیں، مختلف المعنیٰ الفاظ کی صورت میں یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ کون سے پہلے درج کیے جائیں اور کون سے بعد میں۔ اصولی طور پر وہی معنیٰ پہلے دینے چاہییں جو کثیر الاستعمال ہیں اور جن معنوں میں یہ لفظ بہت کم استعمال ہوتا ہے یا جن معنوں میں یہ متروک ہو چکا ہے۔ یہ معنیٰ سب کے آخر میں دیے جائیں۔ مذکورہ اردو۔ اردو لغت نے کثرت سے شاذ کی طرف جانے کے اصول کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن کہیں کہیں مرتبین سے فیصلے میں غلطی بھی ہوئی ہے۔ مثلاً لفظ "پاٹ" کے پندرہ الگ الگ معنیٰ دیے گئے ہیں شروع میں جو معنی درج ہیں وہ یہ ہیں "تخت" "گدی" مسندِ حکومت، سنگھاسن، راج گدی' قوسین میں یہ عبارت بھی درج ہے (تنہا مستعمل نہیں، راج کے ساتھ ملا کر 'راج پاٹ' بولتے ہیں) ظاہر ہے کہ جب یہ لفظ ان معنوں میں تنہا مستعمل نہیں تو پھر ان دونوں کو سب سے اول جگہ دینا غیر مناسب ہے بلکہ ان کو لفظ راج کے تحت ذیلی اندراج کے طور پہ پیش کرنا مناسب تھا۔ لفظ 'پاٹ' دریا کی چوڑائی اور "چکی کا سطح پتھر" کو سب کے آخر میں یعنی پندرھویں نمبر پہ درج کیا گیا ہے۔ کثیر المعنیٰ الفاظ کے بعض معنی مخصوص سیاق و سباق تک محدود ہوتے ہیں اور ان کا محلِ استعمال [illegible] متعین ہوتا ہے۔ اگر ایسی صورت ہو تو یہ ضروری ہو جاتا ہے [illegible] معنی مناسب مثالوں سے واضح کیے جائیں اور اگر ان مثالوں کے مستند ماخذوں کی نشاندہی بھی کی جائے تو بہتر ہے۔ مثلاً مذکورہ لغت میں 'دانت' کے دوسرے نمبر پہ معنی دیے ہیں۔ 'دندانہ' اور تیسرے نمبر پہ اس کے معنی 'خواہش و رغبت' بتائے گئے ہیں۔ اتنا کافی نہیں ہے۔ دندانہ کے آگے کچھ اس قسم کی وضاحت ہونی چاہیے۔ 'کنگھی کے دانت' 'آرے کے دانت' اسی طرح خواہش و رغبت، والے معنی واضح کرنے کے لیے جملے میں لفظ دانت کے اس مخصوص استعمال کی مثال بھی درج کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ کہنے سے کہ اس کا فلاں چیز پر دانت ہے صرف خواہش و رغبت کا پہلو نہیں نکلتا بلکہ اس میں کسی چیز کو موقع پا کر ناجائز طریقے سے ہڑپ لینے کا جذبہ بھی شامل ہے۔

اگر کسی زبان کی لغت صرف اس کے بولنے والوں کے لیے مرتب کی جائے۔ جیسی کہ اردو۔ اردو لغت ہے تو میری رائے میں چونکہ اہلِ زبان لفظیات کی بنیادی مدوں سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں۔ اس لیے اس طرح کی لغت میں مشہور و متداول الفاظ کے معنی نہ دیے جائیں۔ یعنی ضروری نہیں کہ آگ، پانی، گیہوں جیسے الفاظ کی توضیح و تشریح کی جائے مثلاً مذکورہ لغت میں 'دانت' کے پہلے معنی دیے ہیں "(۱) مسوڑھے میں لگی ہوئی ہڈی جو سامنے سے نظر آتی ہے اور کاٹنے میں مدد دیتی ہے" دانت کو ہڈی کہنا چاہے علم تشریح الابدان کی رو سے درست ہو لیکن کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے پھر کیا جو سامنے سے نظر نہ آئے اور منہ میں چھپا ہو تو وہ دانت نہ کہلائیگا۔ دراصل اس قسم کی تعریف یا تو دائروی ہوتی ہے یا ناکافی۔ ایسی غیر ضروری اور مضحکہ خیز تعریفوں سے بچنا ہی مناسب ہے۔ ایک مشہور چیز کہنا کافی ہے۔ ضرورت پڑنے پر کسی لفظ کی تھوڑی بہت وضاحت کی جاسکتی ہے البتہ اگر الفاظ غیر مانوس، نادر یا مفقود اشیا پر دلالت کریں تو اس صورت میں ان کی تشریح لازمی ہے۔ 'گلبدن' کے متعلق صرف یہ لکھ دینا کہ یہ ایک قسم کا کپڑا ہے یا 'قانون' کے بارے میں لکھنا 'ایک قسم کا ساز' کافی نہیں۔ ایسے الفاظ جو تفصیلی معلومات کے طالب ہیں۔ حسب ضرورت تصویروں کی مدد سے بھی واضح کیے جاسکتے ہیں۔ بلکہ انھیں واضح کرنا ضروری ہے۔ ریختی میں مختلف زنانہ کپڑوں اور زیورات کے نام آتے ہیں۔ میر انیس نے فنِ سپہ گری کی اکثر اصطلاحیں اپنے مراثی میں استعمال کی ہیں۔ میر امن نے اور دوسرے داستان گویوں نے الوانِ نعمت کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہی حال مثنوی سحر البیان اور فسانۂ عجائب کا ہے۔ اول تو متداول لغات (بشمولیت نور اللغات' و فرہنگ آصفیہ) میں اکثر و بیشتر اصطلاحی الفاظ کے معنی ہی نہیں دیے گئے ہیں اور اکثر الفاظ کے معنی مبہم ہیں۔ اگرچہ اس نوع کی تفصیل قاموس کے لیے مناسب ہے لیکن اگر لغت میں بھی ایسے الفاظ کی چند امتیازی خصوصیات بیان کرنے کا التزام ہو تو اس کی افادیت بڑھ سکتی ہے۔

ہم معنی الفاظ کی صورت میں مترادفات بھی دیے جاسکتے ہیں۔ لیکن آگ کے معنی آتش اور نار نہ بتایے البتہ آتش اور نار کے معنی آگ بتائے جاسکتے ہیں۔ اگر مترادفات میں لطیف معنوی فرق ہو تو اسے مثالوں سے واضح کرنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں ایک ہی واقعہ سنیئے جو لطیفے سے کم نہیں "ایک مرتبہ میرے ایک دوست مجھ سے ملنے آئے اتفاق سے کمرے کے باہر ان کی ملاقات میرے

(بقیہ صفحہ نمبر ۵۹)

مرنا قبول ہے نہیں زنہار یہ قبول   منت سے آن کر جو معالج دوا کریں (وزیر)

نئی شاعری

ڈاکٹر وزیر آغا

آج کے ادباء کا ایک فعّال گروہ نئی شاعری اسے قرار دیتا ہے جو نہ صرف نئے زمانے کے مسائل کی عکاسی کرے بلکہ غیر طبقاتی معاشرے کی تشکیل میں باقاعدہ طور پر حصہ بھی لے۔ اس طبقے کے مطابق نئی شاعری کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنے حرکی عناصر کی مدد سے زمانے کی فعال تحریکات کا پوری طرح ساتھ دیتی ہے اور رجعت پسندی کی تکذیب کر کے عوامی بہبود کے امکانات کو روشن کر دیتی ہے۔

اصولی طور پر نئی شاعری کے بیان کردہ یہ مقاصد نیک اور انسانی ہیں۔ اور اگر وہ اپنے ان نیک عزائم میں کامیاب ہو سکے تو شاید ہی کسی ادیب کو اس پر اعتراض ہو کیوں کہ ایک سچا ادیب بنیادی طور پر انسان دوست ہونے کے باعث استحصال اور جارحیت کی مذمت کرنے میں سدا پیش پیش ہوتا ہے۔ دقت صرف اس وقت پیدا ہوتی ہے جب سماجی بہبود کا مقصد فنی تقاضوں کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور ادب اور پمفلٹ میں تمیز باقی نہیں رہتی۔ ہیربرٹ مزو نے بڑی عمدہ بات کہی ہے کہ جو ادب پارہ ادبی اعتبار سے ناقص ہوگا، وہ لامحالہ پراپوگنڈے کا بھی ایک ناقص ذریعہ ثابت ہوگا یعنی سماجی بہبود کے مقصد میں بھی ناکام ہو جائے گا وجہ یہ کہ ادب پارہ عقل و شعور کی مدد سے نہیں بلکہ حواس کے رستے ہمارے قاری کا جزو بدن بنتا ہے۔ اور اپنے اس عمل میں پروپیگنڈے کو بھی فعال بنا دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ بحیثیت ادب پارہ ناقص ہو تو قلب کو متاثر نہ کر سکنے کے باعث ایک ایسی سپاٹ تحریر بن جاتا ہے جو خود پراپوگنڈا کے لیے بھی زہر قاتل ہے مجھے یہ محسوس ہوا کہ ہمارے ادباء کے اس فعال طبقے نے اس ضمن میں انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا ہے اور اس بات کی پروا نہیں کی کہ وہ پراپوگنڈا کو ادب پر ترجیح دینے کی دھن میں اس شاخ ہی کو کاٹ رہا ہے جس پر اس نے بسیرا کر رکھا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس فعال ادبی گروہ کی انتہا پسندی ہی قابل اعتراض نہیں، نئی شاعری کے سلسلے میں اس کی مہیا کردہ ”تعریف“ بھی غلط ہے وجہ یہ کہ اگر ’نئی شاعری‘ سے مراد وہ شاعری ہے جو محض نظریے کی ترسیل کا اہتمام کرے تو پھر آپ اس شاعری کو کون سا دوسرا نام دیں گے جو حالی اور آزاد کے زمانے میں پروان چڑھی تھی اور جو اس دور کے غالب نظریے کو قارئین تک پہنچانے کی داعی تھی۔ دراصل سوال اصولی نوعیت کا ہے اور اس کا نہایت گہرا تعلق شعر کے مزاج سے ہے سوال یہ ہے کہ کیا شاعری اظہار ہے یا حلولیت۔ اظہار کے ضمن میں کروچے اور کولن وڈ کی ان تعریفات سے ہم واقف ہیں جن کے مطابق شعر یا آرٹ پہلے سے خلق شدہ خیال یا تاثر کی ترسیل کا ذریعہ ہے یعنی ادب پارے میں لفظ و معنی متوازی عناصر کے طور پر موجود ہوتے ہیں۔ شاعری تو بقول لوئی آرنڈ ریڈ حلولیت ہے جس سے مراد یہ ہے کہ شاعر پہلے سے سوچے ہوئے کسی نظریے کو شعر کے ذریعہ پیش نہیں کرتا بلکہ خلق کرتے ہوئے ایک ایسے معنی آفریں مواد کو جنم دیتا ہے جو پہلے موجود نہیں تھا۔ جب وہ اس نئے معنی کو دریافت کرتا اور پہچانتا ہے تو اسے جمالیاتی حظ حاصل ہوتا ہے۔ یوں کہہ لیجیے کہ شعر اس مشکیزہ کے مانند نہیں جس میں پانی بھرا ہوا ہے بلکہ وہ تو برف کی اس قاش کی طرح ہے جو بیک وقت برف بھی ہے اور پانی بھی۔ مراد یہ کہ شعر کے قالب میں معنی بند نہیں ہوتا اور نہ شعر زندگی کے کسی پہلو کا ہو بہو عکس ہوتا ہے۔ بلکہ شعر کا بدن اور اس کا معنی یک جان اور یک قالب ہوتے ہیں۔ اگر ہم فن کی تخلیق کے اس عمل سے صرف نظر کر کے فن پارے کو محض باربرداری کا ایک ذریعہ سمجھیں تو ہم یہ سب کچھ ایک زبردست خطرہ مول لیے بغیر نہیں کریں گے۔

سوال فن کی بقا کا ہے۔ اور فن کو بقا صرف اسی صورت میں مل سکتی ہے جب ہم اس کا فطری منصب اسے لوٹا دیں اور یہ منصب کچھ اس طرح ہے کہ آپ کسی لق و دق صحرا میں راستہ بھول گئے ہیں اور اپنے اسپ برق رفتار پر سوار چاروں طرف بوکھلائے ہوئے دوڑ رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلے گا کہ چند ہی لمحوں میں آپ خود بھی تھک جائیں گے اور آپ کا اسپ تازی بھی ہار جائے گا اور پھر آپ کا لق و دق صحرا سے باہر آنا ناممکن ہو جائے گا۔ فن اس بات کا متقاضی ہے کہ آپ گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دیں اور گھوڑے کو اجازت دیں کہ وہ اپنی جبلّت کو بروئے کار لائے تاکہ وہ آپ کو ریت کے جہنم سے نکال کر کسی سرسبز و شاداب علاقے میں پہنچا دے۔ چنانچہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ فن اظہار نہیں بلکہ حلولیت ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ فن کار تخلیق کے عمل میں مبتلا ہو کر معنویت سے لبریز ایک ایسے نئے شعری وجود کو خلق کرتا ہے جو پہلے موجود نہیں تھا نیز یہ خیال یا معنی اپنے لفظی وجود سے کوئی الگ شے نہیں ہوتا بلکہ خیال اور اس کا شعری وجود اسی طرح ایک جان ہوتے ہیں جیسے کوئی چہرہ اور اس پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ اگر کوئی کہے کہ مسکراہٹ کی لکیروں میں فرد کی مسرت کو پیش کیا گیا ہے تو یہ غلط ہے مسکراہٹ بجائے خود مسکراہٹ کا چہرہ ہے۔

اٹھایا کوہ رستم نے اگر تو محنت ناداں ہے   اٹھانا دل کو دنیا سے عجب کارِ نمایاں ہے (سودا)

اس اصولی بحث کی روشنی میں ان توضیحات کو مسترد کرنا چنداں مشکل نہیں جو نئی شاعری کو محض کسی سیاسی یا نیم سیاسی نظریے کی تبلیغ و اشاعت کے واسطے سے پہچانتی ہیں وجہ یہ کہ نئی شاعری کے لیے بھی 'نئی' قرار پانے سے پہلے شاعری قرار پانا ضروری ہے اور شاعری کا وصف یہ ہے کہ وہ شگفتنِ ذات کا مظاہرہ کرتی ہے نہ کہ ترسیل نظریات کا۔ جب یہ بنیاد مہیا ہو جائے تو پھر نئی شاعری کی توضیح کچھ ایسی مشکل نہیں۔ چنانچہ آپ کہہ سکتے ہیں کہ نئی شاعری وجود میں آنے کے لیے تو وہی راستہ اختیار کرتی ہے جو شاعری نے ہمیشہ کیا ہے اور جو ایک قطعاً آزاد اور منفرد عمل ہے۔ البتہ شاعر کی ذات کے حوالے سے وہ روحِ عصر سے ضرور متعلق ہوتی ہے۔ اس بات کی مزید وضاحت یوں ہو سکتی ہے کہ ایک سچا شاعر اپنے زمانے کے سارے اتار چڑھاؤ سے متاثر ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ کوئی شاعر اپنے زمانے کی طرف سے آنکھ میچ کر کسی خواب کے قلعے میں الگ تھلگ زندگی گزار سکتا ہے۔ قرینِ قیاس نہیں۔ یہ بات تو کسی پاگل ہی کو نصیب ہو سکتی ہے یا شاید اس قیدی کو جیسے قیدِ تنہائی کی سزا ملی ہو۔ ایک آدمی تو صبح کا اخبار پڑھتے ہی زندگی کی ہماہمی میں پوری طرح شریک ہو جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ بعض شاعر اخبار پڑھنے کی بدعادت میں مبتلا نہ ہوں لیکن اس کے علاوہ بھی تو انہیں جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے زندگی سے برد آزما ہونے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس لیے خواب کے قلعے میں مستقل بود و باش اختیار کرنے والے شاعر کی منطق میری سمجھ سے تو بالا ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ شاعر اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی زندگی سے اس درجہ متاثر ہوتا ہے کہ زمانہ ایک برقی رو بن کر اس کے سراپا میں جذب ہو جاتا ہے۔ پھر جب وہ فن تخلیق کرتا ہے تو نسلی سرمائے کے ساتھ ساتھ اس برقی رو کی بے نام اور بے صورت صورت کو بھی استعمال کرتا ہے جس کے نتیجے میں زمانہ اس کے فن میں بھی سرایت کر جاتا ہے یہ بات ہر دور میں ہوتی ہے اور فن کی تخلیق اس کے تابع ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر زمانے میں نئی شاعری بھی پیدا ہو۔ نئی شاعری تو اس زمانے میں پیدا ہوتی ہے جو مزاجی طور پر نیا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر صدیوں پر پھیلی ہوئی یورپی تہذیب میں مزاجی طور پر نیا زمانہ نشاۃ الثانیہ کا دور تھا۔ یا پھر نیا زمانہ بیسویں صدی کا دور ہے جس میں ایک نئی تخلیقی جست وجود میں آتی ہے۔ ایک ایسی جست جس نے انسان کو ایک نئے ذہنی اور احساسی افق سے دوچار کر دیا ہے۔ وہ شخص جو اس نئے ذہنی افق سے آشنا ہے اور پھر شعر کی تخلیقی عمل میں مبتلا ہونے پر بھی قادر ہے۔ لامحالہ ایسی شاعری تخلیق کرے گا جو نئی شاعری کے زمرے میں شامل ہوگی۔ ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ ہر سچا شاعر اس نئے افق سے ضرور آشنا ہوتا ہے جس کے باعث اس کی تخلیق میں بھی ایک نیا بُعد پیدا ہو جاتا ہے۔ فن کی دنیا میں متحجرات کا ذکر فضول ہے شاعر ایک زندہ احساس اور بے قرار ہستی ہے۔ جب تک وہ تخلیقی طور پر فعال ہے اپنے زمانے سے اثرات ضرور قبول کرے گا اور روحِ عصر سے ضرور آشنا ہوگا۔

مگر سوال یہ ہے کہ روحِ عصر سے مراد کیا ہے؟ جس فعال ادبی گروہ کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ روحِ عصر کو ایک خاص قسم کی سیاسی بیداری کا متبادل گردانتا ہے۔ اور اس لیے جب "ادب برائے زندگی" کا نعرہ لگاتا ہے تو بھی اس کا روئے سخن زندگی کے ایک خاص سیاسی اور سماجی نظام ہی کی طرف ہوتا ہے میں زندگی (بالخصوص بیسویں صدی کی زندگی) میں سیاست کی کارکردگی اور اہمیت کا منکر نہیں۔ آج سیاست ہماری زندگی کی تشکیل میں ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتی ہے اور آج فرد اپنے چاروں طرف نمودار ہونے والے سیاسی جزر و مد سے ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہ سکتا مگر ساتھ ہی یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں "سیاست" کے سوا

فرد کی زندگی دائرہ در دائرہ پھیلتی چلی گئی ہے۔ پہلا دائرہ گھر کا ہے۔ جہاں اس کے مسائل کی نوعیت خالصتاً نجی ہے۔ دوسرا دائرہ اس کے پیشہ کا ہے جہاں وہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے میں مصروف ہے۔ تیسرا دائرہ مذہب اور فن کا ہے جہاں اسے روحانی تسکین کی تلاش ہے۔ چوتھا دائرہ سیاست کا ہے جہاں وہ ذہنی اور جسمانی طور پر دوسروں سے متصادم ہوتا ہے۔ پانچواں دائرہ حیاتیاتی سطح کا ہے۔ جہاں وہ کرۂ ارض طور پر دوسروں باسیوں مثلاً نباتات، حیوانات اور حشرات الارض سے ایک کبھی نہ ختم ہونے والی جنگ میں مبتلا ہے۔ چھٹا دائرہ آسمانی برادری کا ہے جس میں اس کی زمین محض ایک معمولی سے رکن کی حیثیت رکھتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مراد یہ ہے کہ جب ہم روحِ عصر کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ہماری مراد وہ روح ہے جو فرد کے گرد پھیلے ہوئے لاتعداد دائروں کے پھیلنے اور سمٹنے سے وجود میں آتی ہے۔ اگر اس روحِ عصر کو محض سیاست تک محدود سمجھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم شاعری کو روحِ عصر کی صرف ایک پرت تک محدود کر دیں گے۔ نئی شاعری کی اہمیت اس بات میں ہے کہ اس نے جدید شعور کی مدد سے روحِ عصر کو پہچانا ہے اور اس کا افق ذات سے کائنات تک پھیل گیا ہے۔ اگر نئی شاعری کو محض سیاسی یا نظریاتی شعور تک محدود کرنے کی کوشش ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم رجعت پسندی کے مرتکب ہو کر بیسویں صدی کی مہیا کردہ بصارت اور بصیرت سے خود کو محروم کر رہے ہیں۔

نئی شاعری کی صورت پذیری کے بعد اس کی ترسیل کا مسئلہ آتا ہے یہاں بھی صورت یہ ہے کہ مذکورہ بالا ادبی گروہ نے ترسیل یا ابلاغ کو لین دین کا مترادف جانا ہے۔ موقف اس کا یہ ہے کہ چونکہ شاعری وہی ہے جو نظریے کی حامل ہو اس لیے اس کی ترسیل بھی سو فی صد ہونی چاہیے۔ تاکہ یہ نظریے کو جمِ غفیر تک بآسانی پہنچا سکے۔ چنانچہ یہ طبقہ شعر میں اخفا یا ابہام کے عنصر کو ناپسند کرتا ہے۔ دوسری طرف نئی شاعری کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ وہ داخلی زندگی کے اس خطے کی سیاحت کرتی ہے جس کا پہلے سے کوئی نقشہ موجود نہیں۔ یہ وہ خطہ ہے جس میں نہ تو کوئی راستہ ہے اور نہ سنگِ میل۔ چنانچہ شاعر کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ اس خطے کو بعض خارجی نشانات کی مدد سے معروضی سطح پر پہچانے۔ وہ تو احساسی سطح پر ہی ہوا اور جو واضح خدو

رکھے ہے سرنگوں اس باغ میں کثرت تعلق کی
ثمر کا بیشتر ہونا جھکا دیتا ہے گردن کو (وزیر)

خال نہ رکھتی ہو، اس کی ترسیل تراشیدہ اور خشک زبان میں ممکن نہیں۔ ترسیل جب حواس کی سطح پر ہو تو شاعری وجود میں آتی ہے اس لیے اعلیٰ شاعری میں اخفا اور ابہام کے عنصر کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ نئی شاعری نے بیسویں صدی کی روح کو اپنے اندر جذب کیا ہے اور یہ روح ایک ایسا ہیولیٰ ہے جو بے پناہ امکانات کی آماجگاہ ہے۔ شاید آج سے قبل روحِ عصر کبھی اتنی گہرائی کشادگی اور تہہ داری سے عبارت نہیں تھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ نئی شاعری میں وہ جملہ ابعاد موجود ہیں جو بیسویں صدی کی روح سے خاص ہیں۔ بعض لوگ جب اس روحِ عصر کو محض ایک خاص نظریے تک محدود کر دیتے ہیں تو انہیں اس کی ترسیل میں شاذ ہی کسی مشکل سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن نئی شاعری تو روحِ عصر کی تمام تہہ در تہہ کیفیات سے متعلق ہے اور اس لیے خود بھی تہہ دار اور ایک حد تک مبہم ہے۔

دوسرے نئی شاعری میں ترسیل شعور اور منطق کی سطح پر نہیں بلکہ احساس اور تخیل کی سطح پر ہوئی ہے اس لیے نئی شاعری میں اخفا اور ابہام ہے جو نئے امکانات کی طرف ایک اشارہ ہے۔

نئی شاعری میں روحِ عصر کی آمیزش کا ذکر آیا ہے تو یہ سوال ہو سکتا ہے کہ ایسی صورت میں نئی شاعری نظریے کی حامل شاعری سے کیونکر مختلف ہے؟ یہ اعتراض بالکل بجا ہے۔ مگر اس ضمن میں دو تین باتوں کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ اولاً یہ کہ روحِ عصر کسی نظریے کا نام نہیں۔ یہ تو ایک ایسی سیال شئے یا برقی رَو ہے جس کی کوئی صورت یا معنی مقرر نہیں۔ ثانیاً وہ کچا مواد جو کسی فن پارے کی تخلیق میں صرف ہوتا ہے۔ محض روحِ عصر پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ اس میں لاتعداد دوسرے شخصی اور نسلی تجربات بھی شامل ہوتے ہیں۔ ثالثاً تخلیق کا عمل محض ترسیل کا عمل نہیں جس میں فن کار مڈل مین کا فریضہ ادا کرتے ہوئے ایک فرم کا مال دوسری فرم کو مہیا کرتا ہے۔ تخلیق کا عمل تو یہ ہے کہ شاعر اس کچے مواد کو (جو ایک طرف شخصی، عصری، اور نسلی تجربات پر اور دوسری طرف وسیلۂ اظہار یعنی لفظ صوت وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے اور آپس میں ٹکرا کر بے ہیئت ہو چکا ہوتا ہے۔) تخلیق کے عمل سے گزارتا ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے ایک بالکل نئی شئے خلق کر لیتا ہے۔ دراصل اس ساری تثلیث میں اہم ترین کردار خود شاعر کا ہے۔ جو مزاجاً ایک منفرد ہستی ہے وہ معاشرہ جو شاعروں کے مزاجی اور شخصی فرق کو مٹا دیتا ہے۔ یعنی جس میں رہتے ہوئے شاعر کی انفرادی حیثیت باقی نہیں رہتی، وہاں جو شاعری پیدا ہوگی اس میں بھی تنوع ناپید اور یکسانیت عام ہوگی۔ نئی شاعری کا امتیازی وصف یہ ہے کہ اس نے بیسویں صدی کے منفرد فرد یعنی (INDYIDUAL) کے ذریعے اپنا اظہار کیا ہے نہ کہ جماعتی فرد یعنی ٹائپ کے ذریعے! اس فرد کا ایک اپنا کردار ہے جو بیسویں صدی کی روح کو اپنی تخلیقی اپج سے ایک انوکھی تخلیق میں منقلب کرنے پر قادر ہے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی میں تذبذب بے یقینی، مسائل کی فراوانی اور پیچیدگی نے ہیرو کی تلاش کے جذبے کو ابھارا ہے۔ یہ تلاش خالص مادی سطح پر اس پہلوان نما فرد کے نقش میں ابھری ہے جو یورپی فلموں میں SECRET AGENT کے لباس میں نمودار ہوا ہے۔ یہ ہیرو اساطیر کے ہیرو سے کسی طور بھی کم نہیں اور پلک جھپکنے میں بڑے سے بڑے حریف کو بھی گھٹنے ٹیک دینے پر مجبور کر دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ بیسویں صدی کے فرد نے اس ہیرو کے ذریعے اپنے ہی خوابوں کی تسکین کا سامان مہیا کیا ہے۔ مگر دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیرو کے اس تصور نے شاعر کے ہاں سپرمین یا مردِ مومن کی صورت اختیار کر کے ایک انوکھی عظمت اور توانائی کا اظہار بھی ہے۔ نئی شاعری کا یہ پہلو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس میں ایک ایسے ہیرو کی تلاش کا جذبہ ابھرا ہے جو ایک روز پردۂ غیب سے نمودار ہوگا۔ تفکر اور بے یقینی کو ختم کر دے گا۔ بعض اوقات تو یہ ہیرو واضح خدوخال کے ساتھ سامنے آیا ہے لیکن زیادہ تر اس نے شاعر کے اس احساسی سفر کی صورت اختیار کی ہے جو پیاس کے صحرا سے شروع ہو کر ایک انوکھے روحانی اور جمالیاتی تجربے پر منتج ہوتا ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی ویسٹ لینڈ اس کی ایک اہم مثال ہے۔ اسی طرح اردو کی نئی شاعری سے اس کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

نئی شاعری کسی منصوبہ بندی کا نتیجہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں عنوان کی اہمیت ایک بڑی حد تک کم ہو گئی ہے۔ پرانی شاعری میں عنوان گویا وہ منصوبہ ہے جس کی تکمیل کے لیے نظم کا سارا ڈھانچہ تعمیر ہوا ہے۔ چنانچہ جب برکھا رت، ریل گاڑی یا انقلاب پر نظمیں تحریر ہوئیں تو شاعر شاذ ہی اپنے عنوان کی حد بندیوں سے باہر آ سکا ہے۔ یہی حال اس فعال طبقے کی تخلیق کردہ نظموں کا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا یہ نظمیں بھی عنوان ہی میں شاعر کے عزم بالجزم کا اعلان کر دیتی ہیں۔ یوں نظم سیاحت کے بجائے ملاحظہ —INSPECTION کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور تخلیق کا وہ عمل نامکمل رہ جاتا ہے جو تنقیدی شعور کی دخل اندازی کے باوجود ایک بڑی حد تک غیر ارادی عمل ہے۔ تخلیقی عمل کی ایک عمدہ مثال پودے کا وہ طریقِ کار ہے جس سے وہ غذا بناتا ہے۔ یعنی وہ جڑوں کے ذریعے زمین سے پانی اور نمکیات حاصل کر کے تنے اور شاخوں کے ذریعے پتوں تک پہنچاتا ہے (فن کار کے سلسلے میں آپ اس عمل کو نسلی اور ثقافتی سرمائے سے تاثرات قبول کرنے کا مترادف سمجھیے) پتے کی نچلی سطح پر مسام ہوتے ہیں جو باہر کی فضا سے کاربن ڈائی آکسائڈ حاصل کرتے ہیں۔ (یہ فن کار کے ہاں عصری مظاہر سے تاثرات قبول کرنے کی صورت ہے) پھر پتے میں ایک سبز رنگ کا مادہ کلوروفل ہوتا ہے جو کاربن ڈائی آکسائڈ سے کاربن الگ کر لیتا ہے۔ اس کے بعد کاربن اور پانی (عصری اور نسلی اثرات) ایک محلول سا بن جاتے ہیں۔ (گویا بے ہیئت ہو جاتے ہیں) اور ایک کیمیائی عمل سے گزر کر سادہ کاربوہائڈریٹ یعنی گلوکوز میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی پودے کی غذا ہے (فنکار کے ہاں یہی تخلیق ہے) فرق یہ ہے کہ پودے میں یہ سارا عمل حیاتیاتی سطح پر اور خودکار ہوتا ہے جبکہ فن کار تخلیق کے دوران اپنے تنقیدی شعور کو بھی بروئے کار لاتا ہے۔ دوسرے پودے کا تخلیقی عمل ہر بار گلوکوز ہی کو پیدا کرتا ہے۔ اور اس لیے ہم اسے ثانوی تخلیقی عمل ہی کا نام دے سکتے ہیں جبکہ فنکار کا عمل ہر بار ایک ایسی نئی تخلیق کو وجود میں لاتا ہے جو اپنے عناصر ترکیبی کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ ان سے ماورا ہے اور اسی لیے ایک خالص تخلیقی عمل کی مظہر ہے۔ اس مثال کی ضرورت اس لیے پڑی تاکہ تخلیق کی بنت میں عصری اور نسلی اثرات کے انجذاب کے عمل کو واضح کیا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ جو زمانے کے مسائل اور اپنے نظریات کو براہِ راست تخلیق میں سمونے کی سفارش کرتے ہیں یا تو تخلیق کے عمل ہی سے ناواقف ہیں یا اسے جان بوجھ کر مسخ کرتے ہیں۔ ایسے لوگ اگر نئی شاعری کے علمبردار ہونے کا دعویٰ بھی کرنے لگیں تو کیا یہ سوچنے کی بات نہیں؟ —

سیر کر دنیا کی غافل! زندگانی پھر کہاں
زندگی گر کچھ رہی۔ تو نوجوانی پھر کہاں — (درد)

افسانوی تجربہ، اور اظہار کے تخلیقی مسائل

راجندر سنگھ بیدی

میں معافی چاہوں گا کہ اس مضمون کو لکھنے کے لیے مجھے اپنی ذات سے ہو کر گزرنا پڑ رہا ہے۔ آپ اس لیے بھی درگزر کریں کہ اتنی بڑی مخلوق کی میں بھی اکائی ہوں اس لیے سب کو سمجھنے کے لیے میرے نزدیک یہ ضروری ہے کہ پہلے میں اپنے آپ سے سمجھ لوں۔

افسانوی تجربہ کیا ہے؟ مجھے افسانہ سازی کی لت کیسے پڑی؟ اگر یہ مجھے اور میرے کچھ دوستوں کو پڑی تو باقی دوسروں کو کیوں نہ پڑی۔ کیوں نہیں میں کسی فرنانڈس کی طرح گرجے کے سامنے بیٹھا موم بتیاں بیچتا؟

فن کسی شخص میں سوتے کی طرح نہیں پھوٹ نکلتا ایسا نہیں کہ آج رات آپ سوئیں گے اور صبح فن کار ہو کر جاگیں گے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ فلاں آدمی پیدائشی طور پر فن کار ہے۔ لیکن یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اس میں صلاحیتیں ہیں۔ جن کا ہونا بہت ضروری ہے۔ چاہے وہ اسے جبلت میں ملیں، اور وہ یا ریاضت سے ان کا اکتساب کرے۔ پہلی تو یہ کہ وہ ہر بات دوسروں کے مقابلے میں زیادہ محسوس کرتا ہو۔ جس کے لیے ایک طرف تو داد و تحسین پائے اور دوسری طرف ایسے دکھ اٹھائے جیسے کہ اس کے بدن پر سے کھال کھینچ لی گئی ہو اور اسے نمک کی کان سے گزرنا پڑ رہا ہو۔ دوسری صلاحیت یہ کہ اس کا کام و دہن اس پرند چرند کی طرح ہو جو منہ چلانے میں خوراک کو ریت اور مٹی سے الگ کر سکے۔ پھر یہ خیال اس کے دل کے کسی کونے میں نہ آئے کہ گھاسلیٹ یا بجلی کا خرچ زیادہ ہو گیا۔ یا کاغذ کے ریم کے ریم ضائع ہو گئے۔ وہ جانتا ہو کہ قدرت کے کسی بنیادی قانون کے تحت کوئی چیز ضائع نہیں ہوتی، پھر وہ ڈھیٹ ایسا ہو کہ نقشِ ثانی کو ہمیشہ نقشِ اول پر فوقیت دے سکے۔ پھر اپنے فن سے پرے کی باتوں پر کان دے۔ مثلاً موسیقی! اور جانی پائے کہ استاد آج کیوں سُر کی تلاش میں بہت ہی دور نکل گیا ہے۔ مصوری کے لیے نگاہ رکھے اور سمجھے کہ روشنی واشی میں خطوط کیسی رعنائی اور توانائی سے ابھرے ہیں۔ اگر یہ ساری صلاحیتیں اس میں ہوں تو آخر میں ایک معمولی سی بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ جس ایڈیٹر نے اس کا افسانہ لوٹا دیا ہے۔ وہ گدھا ہے۔

اس کے بعد کوئی بھی چیز افسانے کے عمل کو چھیڑ TRIGGER OFF کر سکتی ہے۔ مثلاً کوئی راہ جاتا اس کی پگڑی اچھال دے یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ جائے جس پر اس غریب کا کوئی بس نہ ہو اور جو اسے بے سلامتی کا شکار کر دے اور وہ اپنے آپ میں ٹھان لے کہ مجھے اس بے تعاون، بے رحم دنیا میں کہیں جگہ پانا ہے کچھ بن کے دکھانا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جب تک آدمی خطرے سے دوچار نہیں ہوتا اس میں مدافعت کی وہ قوت نہیں ابھرتی۔ قدرت کے پاس جن کا بہت بڑا کارخانہ ہے۔

نو عمری میں یہ سب باتیں میرے ساتھ ہوتیں اور مجھے یقین ہے کہ تھوڑے یا زیادہ فرق کے ساتھ دوسرے فن کاروں پر بھی بیتی ہو گی۔ اکثر لوگوں کو حادثے پیش آتے ہیں۔ اور وہ گوناگوں مصیبتوں کا شکار ہوتے ہیں۔ لیکن یہ محض اتفاق ہے کہ وہ فن کے راستے پر سے ہو کر گزرنے کی بجائے کسی اور طرف مڑ لیے۔ صدر ہر جا کہ نشیند، صدر است۔ انہوں نے یا تو اپنے مخصوص کام میں جھنڈے گاڑے اور یا تھک ہار کر جنت کو سدھارے۔ گویا بے عزتی اور پے در پے حادثوں کے بعد کچھ کرنے، بن کر دکھلانے کے سلسلے میں اپنے ملک کے ہر اردو داں نوجوان کی طرح غزل کہنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ کیونکہ چھوٹی عمر ہی میں میری شادی ہو گئی تھی.... آپ میری بات سمجھے۔ کوئی معشوق میرے سامنے تھا ہی نہیں۔ اگر تھا تو مجھے بچہ سمجھ کر ٹال جاتا تھا۔ اگر وہ ہمکے تو وہ میری بیوی جوتا پکڑ کر اسے ہنکا دیتی تھی۔ میں نے تو یہ پڑھ رکھا تھا کہ عشق پہلے معشوق کے دل میں پیدا ہوتا ہے اس لیے میں چپکے سے بیٹھا اس کا انتظار کرتا اور کرتا ہی رہ گیا۔ میں نے ہجر و وصال، وفا بے وفائی رقیب و محتسب کے مضمون مشاعروں کے تتبع میں باندھے مگر وہ سب مجھے جھوٹے اور کھوکھلے لگتے تھے میں نے دیکھا کہ محتسب تو میں خود ہوں۔ رقیب و روسیاہ کی کیا مجال جو فرسنگوں بھی میرے گھر کے پاس پھٹکے۔ یہ تو شادی کے ان لکھے معاہدے کی دو دھاری حد ہے جس کی رو سے اگر رقیب کو قتل نہیں کیا جا سکتا، حوالات کو بھجوایا جا سکتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو فیض کی طرح رقیب کے ساتھ رشتہ پیدا کر سکتے ہیں اور اس کے افادی پہلو سے واقف ہیں گویا زندگی شعر کے سلسلے میں جو بھی تعلیم دیتی تھی میں اس میں کورا ہی رہا۔ اس کے برعکس میڈم زندگی نے تلافیِ مافات میں مجھے دوسرے مسئلے دے دیے۔ مثلاً خانہ داری کے مسئلے، روزگار کے مسئلے، جو کسی طرح بھی عشق کے مسائل سے کم نہ تھے۔ حالات میں ایسا جمود پیدا کر دیا اور بدن میں ایسی کپکپی کہ لاہور کے منڈا بازار سے خریدا ہوا مرا نجا مرانجا اینڈ کو کا ہرن، پھٹا پرانا گرم کوٹ بھی مجھے نہ بچا سکا۔

بس بہت ہوئی، اب میں اپنی بات بند کرتا ہوں کیونکہ "گرم کوٹ" کے بعد میرے ساتھ کیا ہوا اور کیا نہ ہوا یہ کچھ لوگ جانتے ہیں۔ بلکہ کیا نہیں ہوا کے بارے میں انہیں مجھ سے زیادہ واقفیت ہے۔

افسانے اور شعر میں کوئی فرق نہیں۔ ہے تو صرف اتنا کہ شعر چھوٹی بحر میں ہوتا ہے اور افسانہ ایک ایسی لمبی اور مسلسل بحر میں جو افسانے کے شروع

بے قراری کا سبب ہر کام کی امید ہے
ناامیدی ہو تو پھر آرام کی امید ہے (ذوق)

ٹیلر آخر تک چلتی ہے ۔ مبتدی اس بات کو نہیں جانتا اور افسانے کو بحیثیت فن ۔ شعر سے زیادہ سہل سمجھتا ہے ۔ پھر شعر ۔ فی الخصوص غزل میں اپنی آپ عورت سے مخاطب ہیں ۔ لیکن افسانے میں ایسی کوئی قباحت نہیں ۔ آپ مرد سے باتیں کر رہے ہیں ۔ اس لیے زبان کا خیال رکھ رکھاؤ نہیں ۔ غزل کا شعر کسی کھردرے پن کا متحمل نہیں ہو سکتا ۔ لیکن افسانہ ہو سکتا ہے ۔ بلکہ نثری نژاد ہونیکی وجہ سے اس میں کھردراپن ہونا ہی چاہیئے جس سے وہ شعر سے ممیّز ہو سکے ۔ دنیا میں حسین عورت کے لیے جگہ ہے تو اکھڑ مرد کے لیے بھی ہے ۔ جو اپنے اکھڑپن ہی کی وجہ سے صنف نازک کو مرغوب ہے ۔ فیصلہ اگرچہ عورت یہ نہیں ۔ مگر وہ بھی کبھی ایسے مرد کو پسند نہیں کرتی جو نقل میں اسکی چال چلے ۔ ہمارے نقادوں نے افسانے کو داد بھی دی تو نظم کے راستے ہو کر نثر کی راہ سے نہیں جس سے اچھے اچھے افسانہ نگاروں کی ریل پٹری سے اتر گئی اور جو نہیں اتری تھی ۔ تو ایسی توصیف سے متاثر ہو کر انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی لائن کے نٹ بولٹ ڈھیلے کر لیے ۔

یہ طے بات ہے کہ افسانہ کا فن زیادہ ریاضت اور ڈسپلن مانگتا ہے ۔ آخر اتنی لمبی اور مسلسل بحر سے بزد آزما ہونے کے لیے بہت سی صلاحیتیں اور قوتیں تو چاہییں ہی ۔ باقی کی اصناف ادب جن میں ناول بھی شامل ہے ، کی طرف جزواً جزواً توجہ دی جا سکتی ہے ۔ لیکن افسانے میں جزو کل کو ایک ساتھ رکھ کر آگے بڑھنا پڑتا ہے ۔ اس کا ہراول اور آخری دستہ مل کر نہ بڑھیں تو یہ جنگ جیتی نہیں جا سکتی ۔ شروع سے لیکر آخر تک لکھ لینے کے بعد پھر آپ ایک لفظ بڑھانے یا دو فقرے کاٹ دینے کے لیے ہی لوٹ سکتے ہیں ۔ ایراد و اضافے میں نے بے خیالی میں قائم نہیں کی ، کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ افسانے میں ایراد ، اضافے سے زیادہ ضروری ہے ۔ آپکو ان چیزوں کو قلم زد کرنا ہی ہوگا جو بجائے خود خوبصورت ہوں اور مجموعی تاثر کو زائل کر دیں ، اور یا مرکزی خیال سے پرے لے جائیں ۔

اب میں چونکا دینے والی بات کرنے جا رہا ہوں ۔ اور وہ یہ ہے کہ اردو زبان نے ابھی اتنی ترقی نہیں کی ہے کہ افسانے کے سے فن لطیف کو اس طریقے سے سمجھ سکے یا قبول کر سکے جیسے سمجھنا یا قبول کرنا چاہیئے ۔ میری اس بات کو سمجھنے کے لیے آپ پیچھے مڑ کر دیکھیے کہ ہر آن آپ نے ڈکشن پر کچھ زیادہ ہی زور دیا ہے ۔ اس عمل کا گراف بنایا جائے تو وہ میر ، انیس اور غالب کے بعد داغ تک نیچے ہی آتا ہوا دکھائی دے گا ۔ معلوم ہوتا ہے ہم نے فسانۂ آزاد کو ، افسانہ یا ناول ہی سمجھ کر پڑھا ۔ ہم نے اس کا مقابلہ VANITY-FAIR سے کیا ہے ۔ ہم نے آغا حشر کو ہندوستانی شیکسپیئر بھی کہا ہے ۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہم نے دونوں میں سے کسی ایک کو نہیں پڑھا ۔ اور اگر پڑھا تو فرق کو نہیں سمجھا ۔ یہی وجہ ہے کہ پونہ فلم اور ٹیلی وژن انسٹی ٹیوٹ میں ممتحن کی حیثیت سے جب میں نے ایک امیدوار سے سوال کیا ۔

" آپ کو کون سے مصنف پسند ہیں ؟" ــــــــ

تو اس نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا ۔

" مجھے تو دو ہی مصنف پسند ہیں سر ۔ گلشن نندہ اور شیکسپیئر ! "

کبھی " ہمایوں " اور " ادبی دنیا " کے پرچے ــ فیاض محمود اور عاشق بٹالوی کی توصیف میں کالے تھے اور آج ہم ہی افسانے کی تاریخ میں ان بے چاروں کا ذکرِ خیر تک نہیں کرتے ۔ ہم نے افسانے میں زورِ بیان کو اس قدر سراہا ہے کہ ادب تو ایک طرف ، خود ادیب کو نقصان پہنچایا ہے ۔ افسانے میں اظہار کے تخلیقی مسائل میں سے سب سے بڑا مسئلہ گریز کا ہے ۔ لیکن ہمارے شغب آشنا کان گریز کو عجز بیان کا نام دیتے ہیں ۔ ہم ابھی تک داستان گوئی ، فلسفہ رائی اور تاریخی واقعات کو آج کل کے کرداروں کی معرفت پیش کر دیے جانے پر سر دھنتے ہیں ۔ سر دھننے سے مجھے کچھ کد نہیں ہے ۔ کیونکہ وہ تو ہم کچھ بھی کر کے دھنینگے ہی کہ وہ ہماری عادت ثانیہ ہو چکی ہے ۔ مگر تکلیف اس وقت ہوتی ہے جب ہم خطیب ، مورّخ اور فلسفہ بردار کو ہی افسانہ نگار کا نام دیتے ہیں ۔

افسانہ کوئی سودیشی INDIGENOUS شئے نہیں ہے ۔ ہم نے جیتک کہانیاں لکھیں کھتا سرت ساگر لکھی ۔ اور ہم سے لوگ انہیں مغرب لے گئے ۔ جہاں انھوں نے کہانی کو فن بنا دیا ۔ ہیئت میں بیشمار تجربے کیے ۔ جن سے استفادہ کرنے میں ہمیں کوئی عار نہیں ۔ افسانے کے فن کو چھوڑیے ۔ کسی بھی فن کو جانچنے ۔ پرکھنے کے لیے عالمی پیمانے پر اسے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے ۔ یہاں علاحدگی ISOLATION نہیں ہے ۔ ملکوں اور قوموں کی حدیں نہیں ہیں بشرط یہ کہ آپ منٹو کو موسیاں اور مجھے چیخوف کے نام سے نہ پکارنے لگیں ۔ حالانکہ یہ ممکن ہے کہ میں خود کو کادا باٹا کہلوانا پسند کروں ۔ آپکو کیسا لگے اگر میں یہ کہہ سکوں کہ رام لعل اور جوگندر پال ہندوستان کے ہنریش بوبل ہیں اور قرۃ العین حیدر ہاں سویان ! مجھے اس پر بھی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ ہاں سویان ہم وطن اسے اپنے دیس کی قرۃ العین حیدر کہیں ۔

عجب دھاندلی ہے نا ــ معلوم ہوتا ہے اردو اسم بامسمّٰی ہوتی جا رہی ہے ۔ ہنریش بوبل کا ایک جج کردار کہتا ہے ۔

"...... ایسے مقدمے میں انسان قسم کی کوئی چیز ہی نہیں ، کیونکہ ملزم اس کا تقاضہ ہی نہیں کرتے یہ ایک ایسی آمریت ہے جس میں انفرادی اظہار اور خلاقی سہو زمانی ANACHR — ONISTIC ــ بات ہے ......"

مذکورہ ریاضت اور عالمی پیمانے پر گرد و پیش کی آگہی کے بعد ہی افسانے پر عبور حاصل ہوتا ہے ۔ اور جب یہ بات ہو جاتی ہے تو افسانہ لکھنے والے کے اضطراری REFELEXES کا حصہ ہو جاتا ہے ۔ نہ صرف آپکی بے ارادہ بات سے افسانے کا مواد مل سکتا ہے ۔ بلکہ ہر موڑ پر ، ہر نکڑ پر افسانے بکھرے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔ اور وہ تعداد میں اتنے ہیں کہ انہیں سمیٹتے ہوئے افسانہ نگار کے ساتھ قلم ہو جائیں ۔ بہرحال افسانوی تجربے پر عبور حاصل ہو جانے کے بعد یونان کے اساطیری ل ڈاس کا وہ لمس مل جاتا ہے جس سے ہر بات سونا ہو جاتی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہندوستان کا افسانہ نگار سونے کو بھی چھوتا ہے تو وہ افسانہ ہو جاتا ہے ۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ اتنا سونا پا کر ل ڈاس بھی بھوکا مر گیا تھا ۔

افسانہ لکھنے کے عمل میں بھولنا اور یاد رکھنا دونوں عمل ایک ساتھ چلتے ہیں ۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ بڑی بڑی ڈگریوں والے ۔ پی ۔ ایچ ۔ ڈی اور ڈی لٹ اچھا افسانہ نہیں لکھ سکتے ۔ کیونکہ انہیں بھول نہ سکنے کی بیماری ہے ۔ میں ایک دماغی تساہل کی طرف اشارہ کرتا ہوں جسے منٹو نے میرے نام ایک خط میں لکھا ۔

" بیدی تمہاری مصیبت یہ ہے کہ تم سوچتے بہت زیادہ ہو ، معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے سے پہلے سوچتے ہو ، لکھتے ہوئے سوچتے ہو اور لکھنے کے بعد بھی سوچتے ہو " (بقیہ صفحہ ۵۹)

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں ۔۔۔ دل دکھا دیتا ہے لیکن ٹوٹ جانا خار کا (ناسخ)

آج کا ادب

پرویز شاہدی
کشمیر

آج صرف آج نہیں کتنی گزری ہوئی صدیوں کا نقش اور کتنی آنے والی صدیوں کا عکس ہے ایک پل کی کوکھ سے دوسرا پل جنم لیتا ہے۔ گزری ہوئی راتوں کے پیٹ سے نئی صبحیں پیدا ہوتی ہیں۔ وقت ایک ایسی زنجیر ہے جس کی کڑیاں ایک دوسرے سے اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ اگر ایک کڑی کو بھی نکال لیجئے تو پھر پوری زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے گی۔

آج کے اردو ادب پر نظر ڈالنے کے لیے گزرے ہوئے زمانوں پر بھی نظر ڈالنی پڑے گی۔ اردو ادب بھی ہر زندہ ادب کی طرح اپنے سماج اور اس کے تناؤ کا آئینہ رہا ہے۔ ایسا آئینہ نہیں جو آئینہ دیکھنے والوں کے چہروں کے ساتھ صرف وفاداری کرتا رہے۔ بلکہ ایک ایسا آئینہ جو اپنی نظر بھی رکھتا ہے اور جو چہروں کو نکھارنے کا فرض بھی ادا کرتا ہے۔ اور شاعروں، افسانہ نگاروں اور نقادوں وغیرہ نے اپنے اپنے زمانے کی بڑی کشمکش کو بڑے خلوص اور سلیقے سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہت دور جانے کی ضرورت نہیں سہولت کے لیے دوسری جنگ عظیم اور اس کے بعد پیدا ہونے والے اردو ادب تک توجہ کو محدود رکھنا چاہتا ہوں۔

غدر ۱۸۵۷ء اور پہلی جنگ عظیم کی پیدا کی ہوئی الم ناکیوں اور حوصلہ مندیوں کو سمیٹے ہوئے جب اردو ادب دوسری جنگ عظیم کے دور میں داخل ہوا تو اس کے پاس ماضی کا بہت بڑا خزانہ بھی تھا۔ آہیں اور مسکراہٹیں، سسکیاں اور ترانے، آسودگیاں اور ناآسودگیاں، کرب ناکیاں اور طرب ناکیاں مختصر یہ کہ وقت کی بخشی ہوئی تمام نعمتوں اور لعنتوں کا بوجھ سر پر اٹھائے اردو ادب نے دوسری جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی ایسی سرحد میں قدم رکھا، جہاں آزادی اور غلامی، اندھیرے اور اجالے کا ٹکراؤ بہت صاف اور نمایاں نظر آنے لگا۔

جنگ کی تباہ کاریاں، گورے آقاؤں کی لوٹ کھسوٹ غلامی سے پیدا ہونے والی مصیبتیں، سب کی سب اردو شاعروں اور ادیبوں کو دعوت توجہ دینے لگے اردو شاعر اور ادیب حالات کے ساتھ وفاداری کرتے رہے کبھی کھل کر سامنے آتے، کبھی اشاروں کنایوں کی نقاب ڈالے آگے بڑھے۔ شاعروں میں اقبال، جوش، جگر، فیض احمد فیض، ساغر نظامی روش صدیقی، ظفر علی خاں، فراق، مخدوم محی الدین جمیل مظہری، احسان دانش وغیرہ کے نام اس سلسلے میں فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں پریم چند، پنڈت سدرشن، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر، ابراہیم جلیس، وغیرہ کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نقادوں میں مجنوں گورکھپوری، نیاز فتح پوری، آل احمد سرور، احتشام حسین، فراق گورکھپوری، ڈاکٹر اعجاز حسین ڈاکٹر اختر اورینوی، کلیم الدین احمد وغیرہ کے کارنامے ہمیشہ اردو ادب میں بیش بہا اضافے سمجھے جائیں گے دوسرے اصناف ادب میں بھی قابل قدر ترقی کے ثبوت ملتے ہیں۔ ان ترقیوں کا سلسلہ بہت دور تک پھیلا ہوا ہے۔ دوسری جنگ عظیم آزادی اور آزادی کے بعد کے زمانوں کی کڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ لیکن اب بھی نہیں کہ ان کڑیوں میں یکسانیت ہو اور ان کا باہمی فرق بھی نظر نہ آ سکے۔ زمانے جنگ اور حصول آزادی سے پہلے کی کشمکش، آزادی کے بعد اور آزادی کے ساتھ پیدا ہونے والے مخصوص حالات کے زیر اثر ایک نئی کشمکش میں بدلنے لگی۔ آزادی کے بعد کا تناؤ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بالکل نیا نہ سہی لیکن کافی حد تک نیا ضرور تھا۔ تقسیم وطن فرقہ وارانہ درندگی۔ طبقاتی آویزش سب کی سب نئے اندھیروں اور نئے اجالوں کا ہیبت ناک ٹکراؤ ظاہر کر رہی تھیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی انسان دوستی پر بھی نت نئے تعصبات کی یلغار ہونے لگی۔ لیکن اندھیرے اجالوں پر فتح حاصل نہ کر سکے کوئی بھی ادیب یا شاعر گمراہیوں کے طوفان میں بھی انسان دوستی کے راستے سے ہٹا نہیں غم اور غصے کی لہر دوڑی ضرور لیکن وہ برسر اقتدار طبقے کی سمت دوڑتی چلی گئی۔ یہ مسرت کی بات ہے کہ انسانیت نے اپنی معصومیت اور دلفریبی کو برقرار رکھا۔ ادب پر سیاست کا غلبہ اچھے اور برے دونوں ہی پہلوؤں کو نمایاں کرتا ہے۔ ایک طرف ادب میں اگر سیاسی گھن گرج سے کان پھٹنے لگے تو دوسری طرف زندگی کی آواز میں توانائی اور بلند آہنگی بھی پیدا ہونے لگی۔ اردو ادب کی اس بلند آہنگی کا اعتراف نہ کرنا بے انصافی ہے۔

۱۹۴۷ء اور اس کے دو ایک سال بعد سے اردو ادب میں کچھ نئے رجحانات نمایاں ہونے لگے۔ آزادی کے خد و خال صاف نظر آنے لگے۔ ہندوستان نے اپنی شخصیت منوالی۔ زندگی سرحد تعمیر میں قدم رکھنے لگی۔ اب تصویر کا صرف تاریک رخ نگاہوں کے سامنے نہیں۔ اس کا روشن رخ بھی صاف دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن اس نئی صبح کے ساتھ نئی راتیں بھی منڈلا رہی ہیں۔ بین الاقوامی حالات کچھ اس تیزی اور ہیبت ناکی کے ساتھ بدلے اور بدل رہے ہیں کہ کتنے خوابوں کی جنتیں مسمار ہو گئیں۔ کتنے حوصلوں کے محل ان زلزلوں میں ڈولنے لگے خود ہندوستان کے اندر نئی آویزشیں ظاہر ہونے لگیں۔ تعمیر کے راستے میں نئی رکاوٹوں کی ایک

(باقی صفحہ [illegible])

> مشہور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم نے اپنی کتاب "فکر و فن" میں لکھا ہے
> "تنقید نگار کی ذہنی سطح ایک مفکر، فلسفی، سائنسدانوں اور ایک آرٹسٹ کی ذہنی سطح کے برابر ہوگی تب ہی اسکی رسائی اس تخلیقی عمل تک ہو سکے گی جس سے گزر کر ایک فن پارہ وجود میں آتا ہے۔ اسی لیے تنقید سے زیادہ جان جوکھوں کا کام اور کوئی نہیں۔ تنقید لکھنا اپنے آپ کو بہت بڑی آزمائش میں ڈالنا ہے جس فن پارے پر تنقید کی جائے وہ تو علیحدہ خود تنقید نگار کی ذات معرض خطر میں پڑ جاتی ہے"

سرفرازی اسی کو ہو جو ظفر
آپ کو سب کا خاک پا سمجھے (ظفر)

نئی شاعری پر ایک طائرانہ نظر

خ ۔ زماں انصاری
نیشنل ڈفلیس اکاڈمی ، کھڑک واسلا ۔

پچھلے بیس برسوں سے ہماری شعری روایات میں جو تبدیلیاں رونما ہو کر توجہ اور دلچسپی کا مرکز بنی ہیں اور آج جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کو ہم جدید شاعری کے بجائے نئی شاعری کہنا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں ۔ جدیدیت کی روایت سے ہم آشنا ہیں اور آج ہم اجتہاد پر صرف چونکتے نہیں اور نہ سینہ سپر ہو کر صفیں درست کرتے ہیں بلکہ غور و فکر سے کام لیکر ایک راہ متعین کرنا چاہتے ہیں ۔ ہماری نئی شاعری صرف جدید تر ہونے کے سبب سے توجہ کا باعث نہیں بنی ہے بلکہ اس کی طرف توجہ کی سمت چو طرفہ ہے ۔ جس نے اپنے خیالات و احساسات اور اسلوب کی بنا پر ہی متوجہ نہیں کیا ہے بلکہ احساسات اور خیالات کی نئی اپج ، نئی نظر ، نئے طرزِ اظہار اور اپنے طرز انگریزی سے متاثر کیا ہے ۔ وہ صرف اسی لئے باعثِ توجہ نہیں ہے کہ اس نے ادب کی صفوں میں انتشار اور شکست و ریخت کا سلسلہ شروع کیا ، ترقی پسند افیونیوں کی سرخ آنکھوں کو چکا چوند کر دیا ، بلکہ بے معنویت میں معنی و تہہ داری اور ہزار ہا مخالفت کے باوجود مباحثوں ، رسالوں اور کتابوں کے سینکڑوں صفحات میں پھیل کر بھی توجہ اور دلکشی کا مرکز بنی ہے ۔ یہاں نئی شاعری پر باقاعدہ مطالعے کے بجائے نئی شاعری کے ارتقاء اور اس کے رجحانات پر ایک طائرانہ نظر مقصود ہے ۔

جدید اور نئے میں نہ بہت زیادہ فرق ہے اور نہ بہت زیادہ فاصلہ لیکن آج کی شاعری کو پہلے کی جدید شاعری (کل کی شاعری) سے ممیز کرنے میں لفظ نیا ہماری مدد کرتا ہے ۔ حد فاصل مقرر کرنے میں بھی لفظ نیا ہماری رہنمائی کرتا ہے ، جدید اور نئے میں یہی کل اور آج کا فرق ہے ، اس لئے کہ جو کچھ آج سے پہلے لکھا جا رہا تھا اب نہیں لکھا جا رہا ہے ۔ اور جو کچھ اب لکھا جا رہا ہے وہ کل سے بہت مختلف ہے اس لئے نیا ہے اور کل سے آگے بھی ہے ، چنانچہ آج کی شاعری کو نئی شاعری کہنا میری نظر میں زیادہ موزوں ہے ۔ اگرچہ یہاں پر حد فاصل سے مراد کوئی ٹھوس نشان یا لکیر بھی نہیں ہے اس لئے کہ ادب میں قدیم اور نئے کے درمیان خط قائم کرنا کوئی آسان کام نہیں ہوتا ، نئے کا تعلق اس کے ماضی سے اتنا ہی گہرا ہوتا ہے جتنا ہر موسم میں نکلنے والے پھل سے اس کی جڑوں کا ہوتا ہے ۔ اور پھل کی لذت ، ترشی تلخی ، رنگت اور جسامت کا انحصار اس موسم میں ملنے والی ہوا ، زمین ، پانی ، اور کیفیت پر ہوتا ہے ۔

اس امر کا مشاہدہ ہر دور میں کیا گیا ہے کہ ہمیشہ پرانے لکھنے والوں نے نئے آنیوالوں کو مشق ستم کا نشانہ بنایا ہے ۔ اور شدید مخالفت کے رویہ کا اظہار کیا ہے ۔ لیکن جدید ترکی تاریخ میں نئی شاعری کے تعلق سے یہ بات یقیناً نئی اور قابلِ توجہ ہے کہ نئی شاعری اور ان کے شعراء نے اپنے سے پہلے کے لوگوں پر لعن و طعن اور اپنے انتہائی شدید غصے کا اظہار کیا ہے اور ان کی SHORTCOMINGS کی طرف انگلیاں اٹھائی ہیں ۔ یقیناً موجودہ دور پچھلے ادوار کے مقابلے میں تجربات ، مشاہدات اور نظریات و اقدار کی بنا پر زیادہ اہم اور مختلف ہے ۔ تجربات اور مشاہدات قوم و ملک کی طرح ادبی زندگی کی بھی علامت ہوتے ہیں ۔ دنیا کی ہر زبان میں ، ہر زبان کے ادب میں ہر ملک اور قوم میں زمانے کے نشیب و فراز کے ساتھ مشاہدات ، تجربات اور تجزیے ہوتے آئے ہیں اور پھر ہندوستان ایک ابھرتا ہوا ملک ہی نہیں ہے ، بلکہ اس کی زمین نے بھی واقعات ، تجربات اور مشاہدات کو قومی ، مذہبی اور ملکی و ادبی سطح پر دعوت دی ہے ۔ خاص طور سے اردو کی فضا دیگر زبانوں کے مقابلے میں سیاسی الٹ پھیر کی زد پر رہنے کے باوجود پچھلے تیس چالیس برسوں سے تجربات کے لئے ہموار رہی ہے ، اور اس کا موجودہ دور پچھلے تمام ادوار سے مختلف اس لئے ہے کہ جس قسم کے تجربات اور مشاہدات آج ہو رہے ہیں ، جو تبدیلیاں آج رونما ہو رہی ہیں ، جن مسائل سے آج کا انسان دوچار ہے ، نیا شاعر دوچار ہے ویسی مثال اردو ادب کے پچھلے ادوار میں ملنا مشکل ہے ۔ اس بنا پر ہم اس دور کو نیا دور اس دور کے ادب کو نیا ادب کہہ سکتے ہیں ۔

کل کی شاعری اور آج کی موجودہ شاعری کے فرق کو اس طرح بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے پہلے سماج میں اور ادب میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان تبدیلیوں کو تھوڑی بہت رد و قدح کے بعد اس وقت کی شاعری کے لباس میں ڈھال لیا گیا ، گویا شاعرانہ اظہار اور خیال میں وسعت اور تجدید ہوئی ۔ اور ادب کو پہلے سے زیادہ جدید کر لیا گیا اس اثنا میں جو زبردست انقلاب خیالات کے ساتھ ساتھ ہیئت میں واقع ہوا ہے وہ ۱۹۳۶ء کے بعد ہوا ، یعنی تجدید کے رجحانات شدت اختیار کر گئے اور پچھلوں سے زیادہ شدت کے ساتھ ادب پر اثر انداز ہوئے جسکی مثال آزاد نظم اور معریٰ نظمیں ہیں ۔ لیکن ۱۹۵۰ء کے بعد جو نمایاں تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہوئیں وہ پچھلی تمام تبدیلیوں اور تجربوں سے زیادہ مختلف تھیں جس نے نہ صرف خیالات اور احساسات کی رو کو متاثر کیا بلکہ ایک ہی چیز کو بانٹ کر ، توڑ کر ، تبدیل اور تقسیم کر کے اتنے ٹکڑے کر دیے کہ اصل کی صورت ، شکل ، اور ہیئت ہی بدل کر رہ گئی سماج ، اقدار اور انسان کی ذات و صفات میں اس درجہ شکست و ریخت اور عمل تراش و خراش واقع ہوا کہ ادب میں بھی واضح توڑ پھوڑ نظر

جرم بھی کام ہے جسارت کا
بزدلوں سے خطا نہیں ہوتی (عدمؔ)

آنے لگی۔ ہیئت کے ساتھ ساتھ لسانی توڑ پھوڑ اور تراش شروع ہوئی جس کے ساتھ اسلوب FICTION کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ ۵۵ء کے بعد جو ذہن تیار ہوا اور جس نے اپنے دست و بازو کو تحریک دینا شروع کیا اس کا سنگِ بنیاد ترقی پسندوں نے ہی رکھا تھا اس لئے جدید اور نئے کے درمیان ترقی پسندی کو ایک ایسا وسیلہ مان لینا پڑے گا جس کو عبور کئے بغیر نئی شاعری موجودہ دور میں داخل نہیں ہوسکتی تھی؛ لیکن اس عبور اور نئی فضا کے سروسامان کی فراہمی کا تمام تر سہرا ترقی پسندوں کے سر نہیں ہے اگر ایسا ہوتا تو نئی شاعری اور ترقی پسند شاعری میں اتنا واضح فرق نہ ہوتا۔ نئی شاعری کی پنپتی کونپل کو پروان چڑھانے والے اور اس کی نشو و نما میں حصہ لینے والے وہ لوگ بھی ہیں جو نہ مارکسی تھے، نہ انتہا پسند اور نہ ترقی پسند' یہ لوگ تھے جو شور کرتی ہوئی نعرہ لگاتی ہوئی ادبی تحریک سے علاحدہ رہے لیکن اسے پہلو شخصیت؛ اپنی انفرادیت، اپنے اسلوب اور مطالعے کو برقرار رکھا؛ جن کا اسلوب اور لہجہ نہ روایتی تھا نہ لفظی مینا کاری سے مرصع تھا نہ ترقی پسندوں کی دریدہ سجی کا شکار تھا۔ جن کی آوازیں صرف لب و لہجہ کا آہنگ اور بحروں کا زیر و بم اور تغزل کا نغمہ ہی نہ تھا، بلکہ جدید داخلیت اور جدید حسیت کا ملا جلا، گھلا ہوا رچا ہوا احساس تھا جو اپنے اندر معنوی سماجیت کو سمونے کی سعی کر رہے تھے۔ غزل کے بڑے لہجے خصوصاً میر کے دردمندانہ اسلوب اور سادگی پسند انداز کو اپنا رہے تھے اور یہی وہ وقت تھا جب غزل پس منظر سے نکل کر نئے شعراء کی توجہ کا مرکز بن رہی تھی جن میں فراق، شاد عارفی، عدم اور ناصر کاظمی کے نام خاص طور سے گنوائے جاسکتے ہیں۔ لیکن نئی شاعری کے نئے ناموں میں ان کا شمار اس لئے نہیں کیا جا سکے گا کہ آنے والے شعرا نے ان کی بنیادوں پر جو عمارت بنائی وہ ان سے الگ ہے بقول مجید امجد:

"ادب میں دس سالوں کا یہ عرصہ تجرباتی دور کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور تجرباتی دور بننے والی عمارت کے لئے بنیادیں تیار کرتا ہے، تجربہ کرنے والوں کی حیثیت ہمیشہ LIVING DEAD کی سی ہوتی ہے۔" [نیا ادب مجید امجد ص۱۷]

غرض کہ ۱۹۵۵ء کے بعد جو ذہن تیار ہوا اس نے اپنے خدوخال ۱۹۵۵ء اور ۱۹۶۰ء تک پوری طرح واضح کر دیے۔ یہ نیا ذہن اور اس کا دماغ جن جن مسئلوں سے دوچار تھا، جس طرح کی ذہنی پراگندیوں کا شکار رہا اور جس بے چینی، انتشار، تنہائی، خوف اور جرم کے بدترین احساس میں مبتلا کشمکش میں گرفتار تھا اپنے مسئلوں کی نشر و اشاعت اور ان پر اظہار کے لئے ایک نیا زاویہ لے کر سامنے آیا' اپنے تجربات اور مشاہدات کے لیے نئے ذرائع تلاش کئے۔ اپنی ذہنی وابستگی کے اظہار کے لیے نئی لفظیات تراشیں اور جس نے قدیم پیرائے میں اظہار ہی کو نہیں ترک کیا بلکہ ایسے الفاظ اور تراکیب اور اصطلاحوں سے بھی کنارہ کشی اختیار کی جو اس سے پہلے کی شاعری میں رواج پا کر زبان و بیان کی خراد پر چڑھ کر زبان زد ہو چکی تھی لیکن دراصل جو اس کے اپنے اظہار کے لیے ناکافی بلکہ بے سود تھی؛ چنانچہ نئی اصطلاحات، علامات، اشاریت اور لسانی توڑ پھوڑ کے ساتھ ساتھ اس ذہن نے اپنے مشاہدات اور تجربات، اپنے کرب اور اپنی پارہ پارہ، ریزہ ریزہ ہوتی ہوئی ذات اور شخصیت اور سماج کی بدلتی ہوئی اقدار کا احساس کرایا۔ ــــ اسی ذہن سے نئی شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔

نئی شاعری ۵۵ء تک کھل کر سامنے آچکی تھی، اس کا اپنا ایک انداز تھا جس میں آدمی کے ٹوٹ کر بکھرے ہوئے انسان کی ذات تھی، اسکی شکست خوردہ شخصیت تھی جس میں اسکی اپنی آواز تھی، اس کا اپنا لہجہ تھا جو کھردرا' بے ربط اور مبہم تھا لیکن اس کا یہ مبہم انداز اسکی تشکیک ذات کو سمجھنے سمجھانے اس کے نئے ذہن کا مطالعہ اور تجزیہ کرنے میں ہماری مدد کر رہا تھا' اسی ذہن اور مزاج نے ۵۵ء کے بعد اردو ادب کو نیا مزاج اور نیا ذہن دیا جس نے ۵۵ء کے بعد کے ادب کو نیا ادب کہلوایا اور شاعری کو نئی شاعری کہنے کے لیے استدلال مہیا کیا' چنانچہ ہم یہاں یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ تحریر اور اشاعت کے اعتبار سے، زمانے اور وقت کے اعتبار سے' نئے ذہن کی کروٹ کے اعتبار سے نئی شاعری اور نیا ادب وہ ہے جو ۵۵ء کے بعد تخلیق ہوا' لیکن ۵۵ء کی قید کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ اس کے بعد جو کچھ لکھا گیا وہ تمام کا تمام نیا ادب ہے اور جو کچھ اس سے قبل تحریر ہوا وہ نیا نہیں ہے (غیرا زادب تو ہر زمانے میں تحریر ہوا ہے جو بحث کے زمرے سے خارج ہے اور اس کا صرف ایک ہی استعمال ہے یعنی معترضین اپنے طنز میں جان پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لاتے ہیں اور لاتے رہیں گے)۔

غرض یہ ایک ایسا نشان ہے، ایک ایسا اندازکردہ خط ہے جہاں سے نئی شاعری کا صحیح معنوں میں سفر شروع ہوتا ہے جس نے اپنے سفر کے دوران ذہنی شوریدگی، تنہائی اور اس کے خوف کا اظہار کیا جس نے جدید صنعتوں، مشینوں اور رنگا رنگ سائنسی کرامات کی عطا کردہ خوشحالی کے باوجود روحانی اور ذہنی خلاء کا احساس کروایا۔ انسانوں کی بے چارگی اور مجبوری کے ساتھ ساتھ ان مضبوط سہاروں اور چھتوں کے منہدم ہوجانے کا یقین دلایا، جس کے نتیجے میں انسان درماندگی کی حالت میں حیرت زدہ اور تنہا ہے ــــ اسی بے یقینی دہائی اور انہدام نے جدید حسیت کو فروغ دیا ہے جس کے نتیجے میں نئی شاعری کے چند مخصوص رویے پہچانے جا سکتے ہیں، جنہیں ایک چیز اپنی شخصیت کو متحرک رکھنے اور ہر زاویے سے غور و فکر کرنے کا احساس ہے لیکن اسکی شخصیت بھی وہ ہے جو روندی اور کچلی جا چکی ہے، لیکن یہی مجروح و نامراد ذات اپنا ایک حق رکھتی ہے۔ غور و فکر کے بعد ہر طرح کی رائے زنی کا حق' جو ہر طرح کے (خارجی) دباؤ سے مبرا ہے' جس پر کسی جماعت یا کسی تحریک یا کسی نظریے کی پابندی عائد نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ نیا شاعر اپنی شاعری کو کسی طرح کا یا کسی اور کا آلۂ کار نہ بناتے ہوئے شاعری کو صرف اپنی ذات کا آلۂ کار بنانا چاہتا ہے۔ اور یہیں سے ابہام و اشکال اور ابلاغ کا مسئلہ ظہور پذیر ہوتا ہے جسکی معنوی تہہ داری سے انکار ناممکن ہے۔

نئی شاعری کی تعین زمانی کے بعد اب یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا یہ شاعری ہے؟ اپنے پہلے کے زمانے کی شاعری سے بہتر اور اچھی ہے؟ اس سے آگے ہے؟ کیا اس کی

کاش مصروفِ عمل بھی نظر آتے یہ ہاتھ ورنہ ایمان کی یہ ہے کہ دعا جرم نہیں (ادیب مالیگانوی)

زبان اور اس کے ذرائع بہتر ہیں، کیا اس کے رجحانات قابلِ قدر ہیں؟

ان سوالوں کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ اگر شاعری واردات، کیفیات اور حسیات کا دوسرا نام ہے تو حقیقتاً یہ شاعری ہے۔ شاعری اچھی یا بری نہیں ہوتی وہ صرف شاعری ہوتی ہے۔ حسن و قبح کی بحث نقادانِ ادب کا کام ہے۔ ہاں نئی شاعری زمانے کے اعتبار سے آگے ضرور ہے۔ اس لئے کہ یہ بعد کی تخلیق ہے۔ اس کا دائرہ فکر بھی مختلف ہے اور منفرد بھی۔ زبان اور میڈیم کے جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ شاعری اور عوام کی زبان میں یقیناً فرق ہوتا ہے۔ بیز فرق کے ادب اور عوامی بول چال میں رفتہ رفتہ کم ہوتا ہے اور یوں بھی عوامی زبان میں تخلیقی قوت کم ہوتی ہے۔ اس لئے نئی شاعری کے ذریعے ۔۔۔ تخلیقی عمل کی قوت ملی۔ اور جہاں تک رجحان کا تعلق ہے رجحانات وقت کے تیز دھارے کے ساتھ منقلب ہوتے ہیں اور نئی شکل اختیار کرتے رہتے ہیں۔ جن کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ صرف وقت موجود ہوتا ہے۔ جس طرح ترقی پسند رجحانات وقت اور سیاست کے پہلو میں اپنی آخری آرامگاہ تک پہنچ چکے ہیں، وہاں سے ان کو پھر بیدار کرنا نہ ادب کے حق میں سودمند ثابت ہوگا نہ ہی ترقی پسند شاعری کے ہم نواؤں کے حق میں۔ اور اگر اب نئی شاعری کا موازنہ ترقی پسند شاعری سے کیا جائے تو چند لفظوں میں بات یوں صاف ہو سکتی ہے کہ ترقی پسند شاعری خطِ مستقیم کی شاعری ہے ۔۔ جبکہ نئی شاعری کی راہ خطِ مستقیم سے الگ نشیب و فراز اور پیچ و خم کو لیے ہوئے راہ نورد ہے۔ ترقی پسند شاعری ایک طے شدہ پروگرام اور ضابطوں کی شاعری تھی جو نعرہ بازوں کی گونج سے پرشور تھی، آزادی کی صبح نے جس کا انجام بخیر کیا۔ لیکن نئی شاعری آزادی کے بعد پیدا ہونے والے انتشار اور کرب کی شاعری ہے جس کا کوئی پروگرام طے شدہ ہے اور نہ ہی راستہ خطِ مستقیم کی طرح آسان، نئی شاعری نئے شعراء کے پرخلوص مشاہدات، احساسات اور جذبات کی شاعری ہے۔ ذاتی مسئلہ کی شاعری ہے، جو خطِ مستقیم سے الگ دریافت، جستجو اور تحقیق شاعری ہے۔

تعین اور ترقی پسندی سے موازنے کے بعد یہاں فوراً ہمیں ان محرکات کا جائزہ لینا چاہئے۔ جنکی بنیاد پر یہ شاعری سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ان کے محرکات کے زیرِ اثر بیانات ایک الگ مضمون کا مطالبہ کرتے ہیں اس لیے یہاں صرف چند قابلِ لحاظ موضوعات کا تذکرہ مناسب ہوگا۔ یہ موضوعات وہ ہیں جن کی منتخب یقینی طور پر ترقی پسندی پر اثرانداز ہو کر نسبتاً اس کے زوال کا باعث بنی ہے۔

اردو کی نئی شاعری پر مغرب کے اثرات یقینی طور پر پڑے ہیں۔ جو غیر فطری بھی نہیں ہیں، لیکن نئی شاعری مغرب کی کورانہ تقلید یا اختراعی تخلیق بھی نہیں ہے بلکہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے، یہ تلاش و جستجو، بازیافت اور دریافت کی شاعری ہے۔ کہیں یہ تلاش مجموعی نظر آتی ہے اور کہیں انفرادی، جس کے سبب موضوعات اور مضامین اکثر شعراء کے یہاں ملتے جلتے ایک دوسرے سے مشابہ ہیں، لیکن دوسری طرف بعض شعراء کا رویہ ان کا اندازِ نظر اور طرزِ اظہار مختلف ہوتے ہوئے بھی، مختلف نہیں ہے۔ پیچیدہ مسائل پر نظر، مسائل کا طے شدہ المیہ، تنہائی کا شدید احساس اور ذات کے اندر کروٹیں بدلتا ہوا کرب اور اس سے پیدا ہونے والی فکرخیز، غمگین فضا تقریباً ایک ہی طرح کی ہے۔ چنانچہ یہ موضوعات نئی شاعری کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتے ہیں۔

ان موضوعات میں تنہائی اور اس کا کرب غالب رجحان نظر آتا ہے، آج کی شاعری پچھلے ادوار کی رومانیت پسندی سے نکل کر اس کی سطحیت سے بڑی حد تک آزاد ہو چکی ہے اور اس وقت غالب رجحان رومانی نہیں بلکہ حقیقت پسندانہ ہے۔ دو عظیم جنگوں اور ہمارے ملک کے انقلاب نے بہت سارے رومانی تصورات اور اقدار کو بے وقعت کر کے رکھ دیا ہے۔ اور مجموعی اعتبار سے رومانی رجحانیت پر ۔۔ کاری ضرب لگائی ہے۔ چنانچہ ایسے ماحول میں آنکھیں کھولنے والی شاعری کسی مجرد آدرش کا شکار نہیں ہو سکتی، تنہائی کا احساس بھی اس حقیقت پسندی کا لازمی نتیجہ ہے۔ یہ احساسِ تنہائی باہر سے لایا ہوا مستعار احساس نہیں ہے بلکہ خود ہمارے حالات کا پیدا کردہ ہے۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ ہماری نئی نسل زندگی کے میدان میں اس وقت داخل ہوتی ہے جبکہ ہر طرف ایک مایوس کن اور ہیبت ناک فضا چھائی ہوئی تھی۔ آزادی کے بعد کے زخموں کی جلن اور آہوں کی گرمی نے

اس کو ایسے کرب اور تنہائی میں مبتلا کیا کہ وہ صرف اپنی ہی ذات کی طرف لوٹ آیا جس کے احساس نے اس پر ایک DAY DREAMING کی سی کیفیت پیدا کر دی، جس کے نتیجے کے طور پر، نجات کی سعی میں یادوں سے لپٹے رہنے کی خواہش اور واپسی کا رجحان نظر آتا ہے۔ خوابوں کے فوق العادت جزیروں کا سفر اور سبز و سرد وادیوں کی یاد دراصل غیر مطمئن زندگی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔

اسی طرح شہروں کا المیہ، شہر میں رہنے والوں کی بے جان زندگی کی کربناکی اور احساسِ محرومی اور نئے شہروں کی تلاش اہم موضوع ہیں۔ شہروں کی توسیع کے لیے جنگلوں اور دیہاتوں کا زد میں آ جانا اور ان سے مسئلوں کا جنم لینا شعراء کے احساس پر اثرانداز ہوا ہے جس کے نتیجے میں تقریباً ہر شاعر کے یہاں شہروں کا المیہ خاص طور سے ذکر کا باعث بنا ہے۔ شہروں کے ساتھ ساتھ صنعتی تہذیب کی مادی خوشحالی نیز اس سے پیدا ہونے والی مشکلات اور انسانوں پر اس کا نفسیاتی ردِعمل بھی توجہ کا مرکز ہے۔

شہری موضوعات کے علاوہ ایک موضوع وہ جبر ہے جو جدید تہذیب نے اس پر لاد دیا ہے۔ ہوا یہ کہ انسان اپنے ماضی سے کٹنے کے بعد نئی دنیا کی تلاش و جستجو میں اٹھ کھڑا ہوا لیکن سفر کی صعوبتوں نے اس کو نہایت نڈھال کر دیا، اور سلسلہ کار کی درازی ایک ڈراونے منظر کی طرح شعور پر ضرب لگاتی رہی جس کے نتیجے میں بے یقینی اور عدم تحفظ کی فضا چھا گئی، کہ جانے کب کیا حادثہ پیش آ جائے۔ یہ تمام موضوعات نئی شاعری کے ہیں جس میں امید کی کمی اور تاریکی زیادہ ہے لیکن ساتھ ہی اس تاریکی سے برسرِپیکار رہنے کا حوصلہ اپنی جگہ ہے۔

الغرض نئی شاعری کے موضوعات، ان کی تفہیم و تجزیہ ۵۵ء کے بعد کی شاعری سے عبارت ہیں جس کو اسلوب کے اعتبار سے دو بڑے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا گروہ، پاکستان کے جدید شعراء کا ہے جنکے یہاں بعض سیاسی، سماجی اور تہذیبی حالات، نئی راہوں اور نئے اسالیبِ بیان کی شعوری تلاش نے مل

کسی کی ایک طرح پر بسر ہوئی نہ انیسؔ — عروجِ مہر بھی دیکھا تو دوپہر دیکھا (مرزا انیسؔ)

جدید جاپانی نظم — ایک جائزہ

رفعت اختر خاں
شعبۂ اُردو، راجستھان یونیورسٹی
جے پور۔ راجستھان۔

"جاپان نقلچیوں کی ذات ہے"

سارے عالم میں ایک زمانہ تک جاپان سے متعلق لوگوں کا یہی تصور رہا۔ اسی طرح جاپانی ادب کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ جاپانی ادب سراسر چینی ادب کی نقل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جاپان کے کلچر اور تمدن کو فروغ دینے میں چین ہی کا ہاتھ رہا ہے۔ اور جاپان کے ادب، مذہب، فلسفہ زبان وغیرہ نے بھی چین ہی کی مدد سے ترقی کی ہے۔ لیکن یہ اثر بالکل ایسا ہے۔ جیسے ہندوستان کی بیشتر زبانوں پر سنسکرت کا، یا یوروپی زبانوں پر لیٹن اور گریک کا ہے۔ اسی لیے جاپان نے جو کچھ بھی چین سے لیا ہے۔ اسے اپنی تہذیب اور سماج میں اس طرح مدغم کر لیا ہے کہ وہ اس کا اپنا معلوم ہوتا ہے۔

چینی ادب میں عشقیہ شاعری، ڈرامہ، ناول وغیرہ کا لکھنا پڑھے لکھے لوگوں کی نظروں میں ہیچ سمجھا جاتا ہے جبکہ جاپان میں ایسی کوئی روایت نہیں ملتی بلکہ جاپان میں اردو کے قصائد کی مانند باقاعدہ نظموں کے ذریعہ بادشاہوں اور رئیسوں درباریوں کی مدح سرائی کی جاتی تھی۔ ۱۸۶۸ء میں میجی کے زمانہ میں جاپان کی تاریخ مرتب ہوئی۔ اس سے قبل غالباً چار سو سال تک بادشاہ یا حاکم برائے نام ہوتا تھا۔ ساری باگ ڈور سپہ سالاروں کے ہاتھوں میں ہوتی تھی جیسے جاپان میں "شوگن" کہا جاتا تھا۔ جاپان میں "شوگن" کی وہی حالت تھی جو بنیاں میں راجاؤں اور مراٹھوں کے یہاں پیشواؤں کی ہوا کرتی تھی۔ اس زمانہ میں جاپان میں ادب کا چلن برائے نام تھا۔ لیکن میجی کے زمانے سے جاپان کا رشتہ مغربی دنیا سے استوار ہونے لگا تھا۔

تعلقات استوار ہونے کے بعد جاپان پر مغربی دنیا کے اثرات مرتب ہوئے۔ بلکہ ایک جاپانی ادیب کا کہنا تھا کہ جاپانیوں کو اپنا قد بڑھانے کیلیے یورپی خواتین سے شادی کرنا چاہیے۔ اسی طرح جاپانی ادب کو بھی مغربی تنقید کی میزان پر پرکھا جانے لگا۔ میجی سے قبل ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں فرق تھا۔ لیکن میجی کے زمانہ میں انگریزی اور دیگر یورپی زبانو کے اثر سے بول چال کی زبان میں ترقی ہوئی حالانکہ جاپان میں یوروپی تہذیب و ادب کے پھیلنے سے جاپانیوں میں کافی مخالفت ہوئی۔ لیکن ادبی میدان میں اس قسم کی تقلید اور تجربات کو خوش آمدید کہا گیا۔

انیسویں صدی کے آخر میں یورپ کی کئی زبانوں کی نظموں کا ترجمہ جاپانی زبان میں ہوا۔ ایسے ترجموں میں شما جاکی توسو کی نظم "بیت جھڑ کی ہوا کا گیت" وہ نظم ہے جس کے ذریعہ جاپانی ادب میں جدید نظم کا آغاز ہوا۔ جاپان ادب کی تاریخ میں اردو شاعری کیطرح ۱۸۷۴ء کا سال جدید نظم کی ابتدا کا سال ہے۔ اسی سال جاپان کی نئی نسل نے جدید نظم میں طبع آزمائی شروع کی۔ ۱۸۵۷ء میں اوکاتو کے دیے ہوئے لیکچر "ادب کی روایت کو پس منظر میں برتنا اور جدت پیدا کرنا آج کے ادیب اور شاعر کا نصب العین ہونا چاہیئے"۔ نے باقاعدہ جدید نظم کو فروغ دیا جس طرح اردو میں حالی اور آزاد نے ۱۸۷۴ء میں انجمن پنجاب لاہور کے زیر اہتمام موضوعاتی مشاعروں کے ذریعہ جدید نظم کو فروغ دیا۔ اسی طرح جاپان میں اوکاما نے جدید نظم کے موضوعات میں اضافہ کیا۔ اس کے زمانہ میں جاپانی شاعری میں موضوعات میں تبدیلی آئی لیکن شعری لفظیات کو جوں کا توں برتا گیا۔ لسانی انقلاب کے بجائے موضوعاتی انقلاب اور ہیئت کی تبدیلی سے جاپان میں جدید نظم کا آغاز ہوا۔ جدید شاعری کا آغاز ہونے کے باوجود جاپانی نظم کی زبان ایک ہزار سال پرانی زبان بنی رہی گویا دسویں صدی کی زبان انیسویں صدی تک چلتی رہی لیکن ۱۸۶۸ء میں جاپانی نظم پر چینی زبان و ادب کا گہرا اثر پڑا لیکن ۱۸۶۸ء کے بعد یہ اثر دھیرے دھیرے ختم ہوتا گیا اور جاپانی نظم میں مغربی ادب کے اثرات شروع ہوئے نتیجتاً چینی زبان کے اثرات جاپانی ادب میں سے ختم ہونے لگے اور مغربی ادب کے ترجمے باقاعدہ ہونے لگے۔ اس انداز کا پہلا مجموعہ "نئے اسلوب کی نظمیں"۔ شنتائشی کے نام سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوا جس کا جدید جاپانی نظم کے ارتقا میں اہم مقام سمجھا گیا ۱۸۸۵ء میں جدید نظموں کا پہلا مجموعہ "بارہ سکے" یوآسا اور ہانگنبو کے اشتراک سے شائع ہوا۔ ۱۸۹۷ء میں ۵۱ نظموں پر مشتمل جاپانی نظموں کا مجموعہ (ذانکی) واکاناشو شائع ہوا جس میں پہلی بار جوانی اور محبت کے موضوعات پر نظمیں لکھی گئیں۔

توسون نے مجموعہ کے شائع ہونے کے بعد ہمعصر شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا تھا کہ

"جوانی کے تصور نے ایک لمبے عرصہ سے چلی روایت کو ترک کر کے ایک عام فہم زبان کا لباس اوڑھ لیا ہے جس سے شاعری میں نت نئی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں"

۱۸۹۳ء تک جاپانی نظم میں جدید رجحانات و میلانات مکمل طریقہ سے سرایت کر گئے۔ اس قسم کے میلانات کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جاپانی ادیب اوودا ناتسکی نے لکھا تھا کہ "ہماری ادبی دنیا میں ایک نئے قسم کی آب و ہوا کی باڑھ آ گئی ہے۔

و روایات کو ترک کر دیا اور ان کی (مغربی نظم) روایات کو مکمل طور سے نہ برتنا غلط ہوگا۔ اگر ہم ان کی روایات اور اسالیب کو اپنا سرمایہ بناتے ہیں تو ہمارے ادب کا کینوس اور وسیع ہوگا۔"

دوسری طرف کچھ لوگ ایسے تھے جو مغربی تجربات کے مخالف تھے۔ جاپانی ادب میں نظم کا پہلا دور اسی قسم کی کشمکش میں مبتلا رہا اس دور میں جاپانی نظم پر فرانس کے سمبالسٹ موومنٹ کا بڑا گہرا اثر ہوا۔ روبیدا بن نے ۱۹۰۵ء میں فرانس کے علامت نگار شعرا کے مجموعوں کا ترجمہ جاپانی زبان میں کیا۔ اس طرح بیسویں صدی کے پہلے تین دہوں تک فرانس کی علامت نگاری کا اثر جاپانی نظموں پر ہوا۔ دائی کاکو نے اپنی نظموں کے ساتھ ساتھ فرانسیسی نظموں کا ایک مجموعہ ۱۹۲۴ء میں شائع کیا۔ ان ترجموں کے ذریعہ جاپانی زبان و ادب کے مزاج میں تبدیلی آئی اور پھر اس قسم کی تبدیلیوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ ہائی کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

جدید جاپانی نظم کے پہلے اور اہم شاعر اشی کاوا تاکو کی ایک نظم "مثال" مثال بھی پیش کی جاتی ہے۔

امیر دوست نے زمین دکھایا / طاقتور نے لعنت دیا / تو میں نے غصہ میں آکر مکا باندھ لیا / تب ہی میں نے اپنی مضطرب روح کی دنیا میں / دیکھی وہ روح / جو غصہ میں پاگل نہیں تھی / وہ ہنستی ہوئی اور تمسخر دار تھی / اور کہہ رہی تھی / تم کس کو مارو گے / اس مکے سے / اپنے دوست کو / اپنے کو / یا اپنے آپ کے بے ستون ضمیر کو / ...

تاکو باکو کی اس قسم کی نظموں نے جاپان میں دھوم مچا دی اور خصوصاً جاپانی شاعری کی دوسری اصناف مثلاً واکا۔ تانکا اور ہائیکو وغیرہ میں تاکو باکو نے طبع آزمائی کی اور جاپانی نظم کی ہیئت میں انقلاب برپا کیا۔

جاپانی نظموں کو نئی ہیئت اور نئے اسلوب سے مالا مال کرانے والوں میں تاکو باکو کے بعد ہاگیوارا کے شعری تجربوں نے جاپانی شاعری کو ایک نیا شعور عطا کیا۔ ہاگیوارا کی نظموں میں ایک طرف ارضی تصورات ہیں تو دوسری طرف مغربی اثرات کا تصادم نظر آتا ہے۔ ان کی ایک نظم ملاحظہ ہو:۔

بلّی کی لاش

اسٹیج جیسا منظر / خشکی سے ہلکا سا ابھرا ہوا / انسان و جانور کا کہیں نام و نشان نہیں / رہٹ چل رہا ہے / ایک درخت کی دھندلی سایہ میں / میں نے دیکھا ایک عورت کو / انتظار کرتے / اپنے چاروں طرف لپیٹے ہوئے جھینی شال / رنگینی ہوئی اپنے لباس کو / دھیمے دھیمے چل رہی ہے روح کی طرح / آہ! یورا اکیلی عورت / تم ہمیشہ دیر کرتے ہو، کیا نہیں؟ / ہمارا ماضی ہے نہ مستقبل / ہم اصلیت سے ٹوٹ کر مرجھائے پڑے ہیں / یہاں اس خوفناک پس منظر میں / ڈوبی ہوئی بلی کی لاش دفن ہے / ...

ہاگیوارا کی یہ نظم جاپانی ادب میں اس بات کا ثبوت قرار پائی کہ ہاگیوارا نے روایتی انداز کو ترک کرکے جاپانی نظم کو جدت سے ہمکنار کرایا۔ ہاگیوارا کے بعد اس کی پیروی کرنے والوں میں ایک نئے اسکول "چار موسم" کی بنیاد رکھی اور شکا نام کے رسالے کے ذریعہ اپنے اسکول کے خیالات کو عوام تک پہنچایا۔ اس اسکول میں ناکا ہارا۔ ہاگیوارا کا خاص مقلد تھا۔ مثال ملاحظہ ہو۔

موت کا لمحہ

موسم سرما میں آسمان کا رنگ پھیکا / ایک کالے گھونسلے کی آنکھوں کی چمک / پانی جم گیا ہے / بلی جھگڑتی ہے / اور دل خالی / دیوتاؤں کے بنا "امداد کے" بنا / شام کی دھندلی روشنی میں میری آنکھوں میں ٹھہرا ہوا ہے / ایک آہ بھرتا ہوا / میں جھکتا ہوں اور ایک پتھر اٹھا لیتا ہوں / میں پتھر کا ٹھنڈا پن محسوس کرتا ہوں جب / اپنے ہاتھ میں گرمانا ہوا / تو اسے چھوٹ جانے دیتا ہوں / اور اب گھاس میں بھیگا پڑا ہے یہ / چمکتا ہوا / روشنی میں نڈھال / سانس دھیما ہوا / بے جان گھاس سرچھپائے / زمین کی طرف مراقبہ میں / دور فیکٹری کی چمنی کا دھواں / شام کی دھندلی روشنی میں گھر آتا ہے / میری آنکھوں میں / ...

ناکا ہارا کی یہ دونوں نظمیں نئے انسان کے منظر نامہ کو پیش کرتی ہیں خصوصاً قنوطیت، اضطراب، اور جنسی گھٹن ان کی شاعری کے موضوعات ہیں۔ اسی لیے ناکا ہارا کو جاپانی شاعری کا رمبو کہا جاتا ہے۔

جاپانی نظم کے تیسرے دہے میں سرریلزم کا اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ سرریلزم کو فروغ دینے والے میں کتوسونو کا نام پیش پیش ہے۔ اس کی ایک نظم ملاحظہ ہو:۔

کانچ گھر میں لڑکا / بہت دور چاند / سفید پھول / ایک سفید عمارت / گلابی ناری / سفید منظر / نیلا آسمان / سفید لڑکا / پانی ستھی کھڑکی / سفید منظر /

...

جاپانی نظم میں سرریلسٹ رجحان تیسرے دہے سے شروع ہو کر ۱۹۴۱ء تک ایک خاص شاعرانہ انداز سے فروغ پاتا رہا اس وقت کی نسل وہ نسل تھی جس میں افلاس اور بے کاری پھیلی ہوئی تھی۔ عام ذہنیت بگڑی ہوئی تھی انسانیت دم توڑ چکی تھی۔ اس وقت نوجوان شاعروں کی ایک جماعت "دی ویسٹ لینڈ" میگزین سے منسلک تھی۔ ان نوجوان شاعروں نے بے کاری، افلاس، تنہائی کا بیان اور انسانی عظمت کے ترانے گائے۔ ان نوجوان شعراء کی جماعت میں "تامورا" کا نام پیش پیش ہے۔ اس کی نظم کا ایک بند ملاحظہ کیجیے جو انسان کی تنہائی کے احساس کو پیش کرتا ہے:

ننھے پرندے کیوں گاتے ہیں / میرے ایک دوست نے پریس کلب بار میں پوچھا / اس امریکی نظم سے مجھے متعارف کرایا / "لوگ کیوں جلتے ہیں" یہ ہے اگلی سطر / ہم نے بیئر پی / ہم نے بغیر پکوڑے کھائے / ایک میز کے کونے پر بیٹھ کر ایک ادھیڑ عمر انگریز نے پائپ سلگایا / اس کی بیوی ایک ناول میں کھوئی ہوئی تھی / بیس ستمبر کے بعد / اس عمر کی راتیں ٹھنڈک سے بھر جاتی ہیں / ہم تنگ گلیوں میں دھیرے دھیرے چلتے رہے / اور ٹوکیو اسٹیشن پر الگ ہوگئے / "ننھے پرندے کیوں گاتے ہیں" میں جاگ اٹھا خواب سے / گہرے اندھیرے میں / بہت اونچائی سے کسی چیز کو گرتا دیکھا / تب ایک بار پھر خواب میں کھو گیا / اگلی سطر پڑھنے کی خاطر ...

اس میں شک نہیں کہ جدید جاپانی نظم پر فرانس کی علامتی تحریک اور سرریلزم کا گہرا اثر پڑا۔ ان اثرات سے جاپانی نظموں میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ جاپانی نظموں کے مواد اور ہیئت اسلوب اور ٹیکنیک میں تبدیلی آئی۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جاپانی نظم کو صرف مغربی ادب ہی سے ...

آپ نے دل کو مرے دیکھ کے بدلا نہ مزاج آئینہ دیکھنے والے تو سنور جاتے ہیں (خیال شہابی پونوی)

جدید افسانے کا اصل مسئلہ

حمید رقریشی ۔ پاکستان

(حمید قریشی کی اس تحریر کا محرک شہزاد منظر کا مضمون "افسانے میں کہانی کا عنصر" مطبوعہ سالنامہ "اوراق" لاہور ہے! ادارہ قریشی صاحب کی تحریر کو "اوراق" کے شکریہ کے ساتھ اسے پیش کر رہا ہے کیونکہ قریشی کی مذکورہ تحریر ہندوستان کے جدید افسانہ نگاروں کے لیے دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ادارہ)

شہزاد منظر نے اپنے مضمون "افسانے میں کہانی کا عنصر" کا اختتام ان لفظوں میں کیا ہے "انتظار حسین ہی موجودہ دور کے واحد افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے جدید تر رجحان کے حامل ہونیکے ساتھ ساتھ افسانویت کے بھی حامل ہوتے ہیں اور یہی انتظار حسین کی مقبولیت کا سبب ہے۔" (اوراق سالنامہ ۱۹۸۱ء)۔

مضمون ختم کرتے ہی مجھے جوگندر پال کا لکھا ہوا ایک سچ شدت سے یاد آیا۔ "ہماری تنقید میں کہانی کاروں کو ماننے منوانے کا اس قدر ذکر آتا ہے کہ پڑھنے والا بڑی معصومیت سے باور کر لیتا ہے کہ ساری بات ماننے منوانے پر ہی ختم ہو جاتی ہوگی" (روایت ۲)

شہزاد منظر نے اپنے مضمون میں ایک اچھی بحث کا آغاز کیا تھا مگر آخری حصہ میں انتظار حسین کے بارے میں اس طرح فیصلہ صادر کر دیا جیسے یہ سارا مضمون لکھا ہی اس غرض کے لیے گیا تھا۔ یوں فکری سطح پر اٹھائی جانیوالی ایک سنجیدہ بحث ذاتی سطح پر آکر رہ گئی۔ سب سے پہلے تو میں شہزاد منظر کے موجودہ فیصلہ کی تردید میں ان کا ہی ایک پرانا مواد پیش کرتا ہوں۔ مسعود اشعر کے مجموعے "آنکھوں پر دونوں ہاتھ" کے جائزہ میں تحریر فرماتے ہیں "مسعود اشعر کا شمار ان افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جو علامتی طرز کے افسانے بھی فن کاری سے لکھتے ہیں اور کلاسیکی طرز کے افسانے بھی خوبصورتی سے۔ انہوں نے انتظار حسین اور انور سجاد کی طرح خود کو صرف علامت نگاری تک محدود نہیں رکھا۔" (نیا دور" شمارہ ۷۰۔۶۹)

علامت نگاروں میں انتظار حسین اور انور سجاد کا بطورِ خاص ذکر کرنے کے بعد جائزہ کے آخر میں فیصلہ فرماتے ہیں۔ "گذشتہ چند برسوں سے علامتی اور تجریدی افسانے کے نام سے اردو میں اتنے بھدے اور گھٹیا افسانے لکھے جا رہے ہیں کہ بعض دفعہ اردو افسانہ نگاری کے مستقبل سے مایوسی پیدا ہو جاتی ہے لیکن میں جب مسعود اشعر کے افسانے پڑھتا ہوں تو تمام مایوسیاں دور ہو جاتی ہیں ("نیا دور" شمارہ ۷۰۔۶۹)

اردو افسانہ پہلے ہی نقادوں کی عدم توجہی کا شکار رہا ہے۔ ایسے میں اس قسم کے تنقیدی فیصلے اس کے لیے نقصان دہ ہی ہونگے کہ جس کے بارے میں لکھا جائے ساری امیدیں اسی سے وابستہ کر کے باقی سب کو نظر انداز کر دیا جائے ـــــ مجھے اس فیصلے سے اختلاف ہے کہ انتظار حسین موجودہ دور کے اس نوع کے واحد افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے جدید رجحانات کے ساتھ ساتھ افسانویت کے بھی حامل ہیں۔ غلام الثقلین نقوی کے افسانے سائبان والے دن کے عذاب میں جدید تر رجحان کے ساتھ بھرپور افسانویت موجود رہی ہے۔ محمد منشا یاد اور مشتاق قمر کے افسانوں میں کہانی کا عنصر ہمیشہ موجود رہا ہے۔ رشید امجد "بے آزار آدم کے بیٹے" ایسے افسانے دے چکے ہیں جو جدید تر رجحان کے حامل ہونیکے ساتھ ساتھ کہانی بھی بیان کرتے ہیں۔ "ریت پر گرفت" میں ان کے افسانوں میں کہانی قدرے زیریں سطح پر چلی گئی۔ لیکن "سہ پہر کی خزاں" کے افسانوں میں بھرپور کہانی آئی۔ بالخصوص "سناٹا بولتا ہے" میں بھرپور کہانی موجود ہے۔ جوگندر پال اپنے انداز کے منفرد افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں کہانی کئی پرتوں کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ یہ صرف چند مثالیں ہیں۔

ایسے عالم میں شہزاد منظر کا انتظار حسین کے حق میں فیصلہ کس حد تک درست ہے؟ سوچنے کی بات ہے!

انتظار حسین کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ عام طور پر مخالفین نے انہیں یکسر مسترد کر دیا ہے۔ اور دوستوں نے انہیں اپنے عہد کا واحد افسانہ نگار بنا دیا ہے، انتظار حسین کا جدید اردو افسانے میں اتنا اہم کنٹری بیوشن ہے کہ ان پر سنجیدگی اور غیر جانبداری سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ابھی تک یہ کام خاطر خواہ طریقہ پر نہیں ہوا ہے۔

روایتی افسانے میں بے شک تین چار نام بے حد اہم ہیں۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، ممتاز مفتی وغیرہ۔ انہیں ہم اپنے اپنے رویوں کے نمائندہ افسانہ نگار بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن جدید افسانہ نگاروں میں انتظار حسین، غلام الثقلین، جوگندر پال، رشید امجد، منشا یاد، انور سجاد اور متعدد دیگر افسانہ نگاروں کی ترجمانی ہو سکتی ہے۔ آج سے تیس چالیس برس بعد جب جدید افسانے کے اس کینوس کا از سرِ نو جائزہ لیا جائے تب یقیناً یہ ہو سکتا ہے کہ پھیکے رنگ اپنی اہمیت کھو بیٹھیں اور تیکھے رنگ اپنی سچائی سے اس کینوس کو ایک نیا مفہوم عطا کریں۔ تب کسی کے نمائندہ یا واحد نمائندہ ہونے کا صحیح فیصلہ ہو سکے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ شہزاد منظر کے ایک بے ضرورت پیراگراف کی وجہ سے مجھے اپنا موقف بیان کرنا پڑا۔ اب میں شہزاد منظر کی اٹھائی ہوئی بحث کے اصل مضمون کی طرف آتا ہوں۔

شہزاد منظر نے سوال یہ اٹھایا ہے کہ "جدید افسانے کی تعمیر کہانی اور پلاٹ پر ہوتی ہے یا خیال اور احساس پر ـــ؟

جدید افسانے کی اب تک جو مختلف صورتیں سامنے آئی ہیں۔ ان میں تجریدی، خود کلامی، تمثیلی علامتی وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی افسانے میں خود کلامی کے ساتھ تمثیلی، علامتی اور تجریدی شکلیں مختلف لہروں کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔ جوگندر پال کے کئی افسانے اس سلسلے میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔ اور یوں بھی ہوا ہے کہ

چاند پہ جا کے جو لایا بھی تو لایا پتھر ـــ آدمِ نو کی ہے قسمت کا ستارا پتھر (زکیہ عابد)

افسانے پر شروع سے آخر تک ایک فضا چھائی رہی۔ انور سجاد کے کئی افسانے تجریدی فضا کے ضمن میں پیش کیے جا سکتے ہیں۔

کیا ہونا چاہیے؟

میرے خیال میں ایک سچے تخلیق کار کو سوچنے کی ضرورت ہی نہیں اس لیے کہ جو کچھ ہوتا ہے اس کا وہ اظہار کر دیتا ہے۔ جدید افسانے کی یہی تو امتیازی خوبی ہے کہ اس نے ترقی پسند افسانے کی طرح اپنے لیے لائحیں نہیں بنائیں۔ یہ لکھنا ہے، یہ نہیں لکھنا ہے یوں ہونا ہے۔ یوں نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ٹھہریئے! جدید افسانے کی یہی خوبی اس کے لیے جزوی طور پر نقصان کا باعث بھی بن رہی ہے کہ نئے افسانے کے نام پر بعض مضحکہ خیز تحریریں بھی سامنے آ رہی ہیں۔ ان میں ایسے لکھنے والے شامل ہیں جنہیں خود علم نہیں کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ ایسی تحریروں کی اشاعت کی وجہ یہ ہے کہ چند مدیرانِ جرائد کو چھوڑ کر ہمارے بیشتر مدیران نہ صرف یہ کہ جدید افسانے کے بارے میں کچھ علم نہیں رکھتے بلکہ اس کے بارے میں کچھ اچھی رائے بھی نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود جدید افسانہ چھاپنے پر بھی مجبور ہیں۔ ان کی یہی لاعلمی بعض "زیٹ زیٹ" تحریروں کی اشاعت کا موجب بن جاتی ہے۔ لیکن میرے خیال میں یہ جزوی نقصان زیادہ تشویش ناک نہیں ہے۔ کیونکہ بقول قمر احسن "میرے بعض ہم عصر جنہوں نے اس کی پرواہ نہ کی یا اسلوب اور موضوع کی نقالی میں رہے۔ وہ چند برس رسالوں میں خوب چھپنے کے بعد اپنے متوقع انجام کو پہنچ گئے" (نیا افسانہ نئے دستخط)

پہلے بھی ایسا ہو چکا ہے۔ اور آئندہ بھی جعلی جدید افسانہ نگار، جو جدید افسانے کی روح اور اس کی داخلی دلکشی اور حسن سے یکسر محروم ہیں۔ اپنے منطقی انجام کو پہنچ جائیں گے۔ اس لیے ان سے قطع نظر کرتے ہوئے جدید افسانہ کے بارے میں اٹھائے گئے سوالوں کی طرف واپس آتا ہوں۔

جدید افسانے میں (پس پردہ معنویت کے ساتھ) بے معنویت کا سیلاب سا آیا تھا۔ بے معنویت کا یہ سیلاب ضروری بھی تھا کہ لفظوں کی پرانی معنویت جو بنجر ہو چکی تھی اسے بہا لے جائے۔ اور کہیں دور پھینک دے۔ چنانچہ ایسا ہوا۔ لیکن اس کے بعد یہ سیلاب سیلابی کیفیت سے نئی معنویت کے بہاؤ کی کیفیت میں آ گیا میں سمجھتا ہوں کہ جدید افسانے کی سیلابی کیفیت کے بعد یہ دو بہاؤ کی کیفیت رکھتا ہے۔ یہ صورت حال جدید افسانے کے لیے خوش آئند ہے۔ اس لیے کہ وہ جدیدیت کی انتہا سے ہو کر اب اپنی ابتدا اور انتہا کے درمیان اپنی صحیح جگہ دیکھ رہا ہے۔ اگر جدید افسانے میں دم نہ ہوتا تو اپنی انتہا پر پہنچ کر اسی طرح ہو جاتا جس طرح ترقی پسند افسانہ اپنی انتہا کو پہنچ کر دم توڑ دیگا۔

جدید افسانے کا بنیادی عنصر تخلیقی صداقت ہے یہ صداقت اپنا اظہار کسی خیال، تصور یا کیفیت میں کرے یا کسی پلاٹ اور کہانی میں۔ اس کا اسے پابند نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ یہ صداقت اپنا اظہار مختلف لہروں میں کرے جس میں خیال، تصور، اور کیفیت کے ساتھ ساتھ کہانی کا بھی وجود ہو۔ تخلیقی صداقتوں کا اپنا ذائقہ ہوتا ہے۔ جو اپنی پہچان آپ کراتا ہے۔ اسی کو میں جدید افسانے کا ذائقہ سمجھتا ہوں۔

مجموعی اعتبار سے ہندوستان میں بالعموم اور پاکستان میں بالخصوص جو نیا افسانہ لکھا جا رہا ہے وہ نہ صرف تخلیقی صداقتوں سے مملو ہے بلکہ اس عہد کے بڑے افسانوں میں شمار کیا جا سکتا ہے اس سلسلے میں ادب کی ایک طالبہ فرحت نواز کا ایک حوالہ دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

"یہ کہنا غلط ہے کہ دکھ اور تضاد سے صرف ہم جنگ کر رہے ہیں مغرب کی ظاہری چمک دمک سے ہٹ کر ان کے اندر جھانک کر دیکھیے دکھ اور تضاد سے جو جنگ ہم کر رہے ہیں وہ ان کے ہاں بھی جاری ہے۔ مغرب اس جنگ کے روحانی کرب کے چھٹکارے کے لیے مادیت میں پناہ لینے کی کوشش کر رہا ہے جبکہ ہم اس روحانی کرب کے بطنوں سے کسی معجزے کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ (یہ معجزہ بھی ضرور ہوگا) یہی امید اور آس ہمارے اجتماعی شعور کے بیدار ہونے کی دلیل ہے۔ اور اسی وجہ سے میں کہتی ہوں کہ واقعی بڑی کہانی ہمارے ہاں زیادہ لکھی جا رہی ہے!" (۱۹۸۰ء کے بہترین افسانے از فرحت نواز)

جدید افسانے کے سلسلے میں اصل مسئلہ کیا ہے؟ شہزاد منظر نے مضمون کا آغاز ان لفظوں سے کیا ہے۔

" جدید افسانے کی عوام الناس میں عدم مقبولیت کی یوں تو بہت سی وجوہ بتائی جاتی ہیں . . . .

(اوراق سالنامہ ۱۹۸۱ء)

اصل مسئلہ یہ ٹھہرا کہ جدید افسانے عوام میں غیر مقبول کیوں رہے؟

میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ جدید افسانہ کا قاری ابھی تک خود کو افسانہ نگار کے تخلیقی تجربہ میں شریک نہیں کر سکا ہے۔ کیوں نہیں شریک کر سکا۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ لیکن افسانہ نگار کے تجربے میں انہی عدم شرکت کے باعث ہی قاری افسانے سے ہٹنے لگا۔ ذہنی طور پر عدم شرکت کی ایک وجہ تو وہ جعلی افسانہ نگار ہو سکتے ہیں جو تخلیقی صلاحیتوں سے محروم نقال ہیں۔ ان کی تحریروں سے اکتا کر قاری نے دیگر افسانہ نگاروں کو بھی پڑھنے سے انکار کر دیا ایک اور اہم وجہ بھی ہے جسے میں بنیادی وجہ سمجھتا ہوں۔ افسانے میں قاری کی عدم دلچسپی کی اس بنیادی وجہ تک پہنچنے کے لیے ڈاکٹر وزیر آغا کی یہ رائے خاص مدد ہو سکتی ہے۔

" اب تک ہم نے زندگی اور کائنات کو محض چند تک محدود سمجھا ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا کہ اس کے تو لاتعداد ہیں اور ایک ایسا اسرار ہے جو تہہ در تہہ اور نقاب اندر نقاب ہونے کے باعث گرفت میں آنے سے نہ صرف گریزاں ہے بلکہ ہمیشہ گریزاں رہے گا۔ نیا افسانہ نگار بیسویں صدی کے اس انکشاف سے متاثر ہو کر کہانی اور کردار کے مخفی میں اترنے کی کوشش میں ہے تاکہ تصویر کو مکمل۔ اور کردار کو اس کی ثابت و سالم صورت میں دیکھ سکے۔ یہ تو شاید ممکن نہیں کہ وہ اپنی مساعی میں پوری طرح کامیاب ہو مگر اس کی کوشش نے امکانات کے در یقیناً وا کر دیے ہیں۔

(فلیپ "مفتوح ہوائیں" احمد داؤد)

تہہ در تہہ اور نقاب اندر نقاب اسرار کو گرفت میں لینے کے لیے تخلیق کار کو اپنے تخلیقی عمل کے دوران ایسا پر اسرار سفر کرنا ہوتا ہے جو تہہ در تہہ اور نقاب اندر نقاب ہوتا ہے اسی لیے اس کے ہاں کبھی تجریدیت ہے تو کبھی علامت نگاری کبھی پیکریت ہوتی ہے تو کبھی خود کلامی اور کبھی یہ ساری لہریں ایک ساتھ بھی ہوتی ہیں۔ یہ سارے سلسلے افسانہ نگار کے لفظ کے رشتے کو مضبوط بناتے ہیں۔ جدید افسانے کو ایک خلاق قاری ہی صحیح طور پر سمجھ سکتا ہے۔ افسانے کے ابلاغ کی ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ جس تجربے سے افسانہ

آئینے میں وہ دیکھ رہے تھے بہارِ حسن — آیا مرا خیال تو شرما کے رہ گئے (حسرت موہانی)

مقالہ:-

تاریخ شعر و عروض

ایم یوسف - ایم اے، بی ایڈ
پونہ -

انسانی زندگی کا جذبات سے گہرا تعلق ہے دنیا کا کوئی انسان جذبات سے عاری نہیں ہے حتیٰ کہ حیوان بھی ان سے محروم نہیں ہیں۔ مسرت و انبساط غم و افسوس اور حیرت و تعجب کے عالم میں ہماری زبان سے بے ساختہ جو جملہ ادا ہوتے ہیں وہ ہیئت و ساخت کے اعتبار سے عام نثری جملوں سے مختلف ہوتے ہیں اور شعریت سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ شاعری دراصل انسانی جذبات کا دوسرا نام ہے۔

چند روایتوں کی رو سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعر گوئی کی ابتدا ہمارے جد امجد حضرت آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے ہوئی۔ "کامل التواریخ" کے مصنف ابن اثیر اور مولف "زین القصاص" سے مروی ہے کہ جب ہابیل اور قابیل میں بغض و عناد کے باعث مخاصمت پیدا ہوئی اور قابیل نے ہابیل کو قتل کر دیا تو حضرت آدم علیہ السلام بہت مغموم اور رنجیدہ خاطر ہوئے اور اسی کیفیت میں آپ کی زبان مبارک سے مرثیہ کے چند اشعار ادا ہوئے۔ اکثر شعراء کے کلام میں اس کی طرف اشارہ ملتا ہے۔ لہٰذا مرزا صائب فرماتے ہیں ؎

آنکہ اول شعر گفت آدم صفی اللہ بود
طبع موزوں حجت فرزندی آدم بود

علمائے اہل کتاب اس بات پر متفق ہیں کہ کتاب زبور میں عبرانی زبان میں منظوم باتیں پائی جاتی ہیں مثال کے طور پر زبور عبری کے پہلے باب میں مندرجہ ذیل شعر موجود ہے ؎

اشرِھا ایش آشر لوحالخ بعصت
رشاعیم اُبدِرِخ حطائیم لوعماد لو
اُبمشب لصیم لو یاشاب

یعنی "وہ شخص قابل مبارکباد ہے جو بدوں کے مشورے پر گامزن اختیار نہ کرے، نہ ان کے پاس کھڑا ہو اور نہ مسخروں کی ہمنشینی اختیار کرے"

حضرت سلیمان علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصنیف "مثنوی نشید الانشاد" کے پہلے باب میں عبرانی زبان میں یہ شعر موجود ہے ؎

یشاقنی من شی قوت بیشھو کی
طوبیم دِدِخا میاین بریح شمنا
طوبیم شمن تورق شمخا الکن
علاموت اھبوخا۔

یعنی وہ مجھ کو منہ کے بوسوں سے چومے کیونکہ مے سے عشق کا نشہ بہتر ہے۔ تیرے لطیف عطروں کی خوشبو کی طرح تیرا نام ہے جو پسند آ جائے۔ اسی لیے کنواریاں تجھ پر جان دیتی ہیں۔

سردار الانبیاء، فخر موجودات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حالانکہ کوئی شعر ارشاد نہیں فرمایا تاہم شعر پر اصلاح ضرور دی ہے۔

اس ضمن میں صاحب "خزانہ عامرہ" نے ایک واقعہ درج کیا ہے کہ انسٹھ مرد شعراء اور بارہ خواتین شاعرات حضور اکرمؐ کے مداح تھے۔ ان میں سے ایک کعب ابن زبیر نے آنحضرتؐ کی مدح میں مندرجہ ذیل شعر آپؐ کی خدمت میں پیش کیا ؎

اِنّ الرسولَ لنورٌ یُستضاءُ بِہٖ
مُھنّدٌ مِن سُیوفِ الھندِ مسلولُ

"یعنی بے شک پیغمبر ایک نور ہے جس سے روشنی حاصل کی جاتی ہے۔ اور شمشیر ہائے ہند سے تیز و براں ہے اور کھنچی ہوئی تلوار ہے"

آنحضرتؐ نے اس شعر میں بطور اصلاح "سُیوفِ الھند" کو "سُیوفِ اللہ" بنا دیا۔

علاوہ ازیں صحیح بخاری شریف میں غزوۂ احد کے سلسلہ میں جو واقعہ درج ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے بھی شعر کہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ابوسفیان نے ایک ٹیکرے پر چڑھ کر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہا "اُعلُ ھُبَل اُعلُ ھُبَل" (بروزن دو مفتعلن) یعنی اے ہبل بلند رہ اے ہبل بلند رہ (ہبل قریش کا ایک مشہور بت تھا) اس کے جواب میں نبی کریمؐ نے ارشاد فرمایا "اَللّٰہُ اَعلیٰ وَاَجَلّ" (یہ ارشاد بوزن مستفعلن مستفعلن) یعنی اللہ کی ذات بلند تر اور بزرگ تر ہے۔ (ان پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ دونوں بحر رجز کے مربع ہیں)

اس کے بعد ابوسفیان نے کہا "اَلعُزّیٰ لَنَا وَلَا عُزّیٰ لَکُم" (بروزن مفعولن مفاعلن مستفعلن) یعنی عزیٰ ہماری مدد کرے گا اور تمہاری مدد نہیں کرے گا (عزیٰ بھی قریش کا ایک بت تھا) اس کے جواب میں رسول اکرمؐ نے فرمایا "اَللّٰہُ مَولَانَا وَلَا مَولیٰ لَکُم"۔ (بروزن سہ مستفعلن) یعنی اللہ تعالیٰ ہمارا مولا ہے اور تمہارا کوئی مولا نہیں۔ اگر ان باتوں پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ یہ دونوں وزن رجز مسدس سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رسول مقبولؐ نے بھی بالقصد شعر کہا تھا۔

الغرض، شعر گوئی کی ابتدا حضرت آدم علیہ السلام سے ہوئی اور ان کے بعد اکثر پیغمبروں نے بھی شعر کہے ملک عرب میں شاعری کی بڑی دھوم تھی۔ شعرائے عرب کو چار گروہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا گروہ جاہلین قدیم کہلاتا ہے۔ اس گروہ میں سر فہرست مہلہل یعنی امرؤ القیس کوفی بن ربیعہ مرۃ تغلبی کا نام آتا ہے۔ دوسرے گروہ کو مخضرم کہتے ہیں۔ اس گروہ میں وہ شاعر شامل ہیں جنھوں نے کچھ زمانہ جاہلیت

اور کچھ زمانۂ اسلام پایا۔ اس طبقہ کے مشہور شعرا لبید اور حعدی ہیں۔ تیسرا طبقہ "اسلامیین محض" کہلاتا ہے۔ اس طبقہ میں وہ شعرا شامل ہیں جو زمانۂ جاہلیت کے بعد پیدا ہوئے۔ اور چوتھا گروہ "محدثین" کہلاتا ہے۔ اس گروہ میں وہ شاعر ہیں جو رواجِ اسلام کے بعد پیدا ہوئے۔

جب عربی شاعری اپنے کمال کی انتہا کو پہنچی تو فارسی شاعری کی ابتداء ہوئی۔ زمانۂ اسلام سے قبل ہی فارسی شاعری وجود میں آچکی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جب ۳۵۲ھ میں عضدالدولہ فارس پر قابض ہوا تھا تو قصرِ شیرین کے کتابے میں قدیم فارسی میں یہ شعر موجود تھا ؎

ہزیرا بہ کیہان انوشہ بزی
جہان را بگہبان ونوشہ بزی

روایت ہے کہ اس زمانہ سے قبل ہی بہرام گور نے بھی یہ شعر کہا تھا ؎

منم آن پیل دمان و منم آن شیرِ یلہ
نامِ بہرام مرا و پدرم بو جبلہ

۱۹۳ھ میں عباس مروی نے خلیفہ مامون رشید کی مدح میں ایک نظم کہی تھی جس کا مطلع یہ ہے ؎

اے رسانیدہ بدولت فرقِ خود تا فرقدین
گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

۲۵۱ھ کے قریب حکیم ابوحفص سغدی سمرقندی کا بحرِ رمل میں یہ شعر ملتا ہے ؎

آہوکوہی در دشت چگونہ دودا
چوں ندارد یار بے یار چگونہ رودا

اس کے بعد ۳۰۰ھ میں شعرِ فارسی کے سنہرے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں مشہور زمانہ شاعر رودکی نے شعرِ فارسی کو کمال تک پہنچنے کا راستہ ہموار کیا اور اس کے بعد فردوسی طوسی نے شعرِ فارسی کو منزلِ کمال تک پہنچا دیا۔

اردو شاعری کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ اس کا آغاز پانچویں صدی ہجری میں ہوچکا تھا۔ مثال کے طور پر یہ واقعہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ جب ۴۱۳ھ میں محمود غزنوی نے قلعہ کالنجر کا محاصرہ کیا تو اس وقت کے حاکم نندا نے محمود غزنوی سے قلعہ کا محاصرہ نہ کرنے کی درخواست کی۔ اس مقصد کے تحت اس نے 'بھاشا' میں یا 'اردو' میں اسے ایک شعر لکھ بھیجا۔ محمود غزنوی نے اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے قلعہ کا محاصرہ اٹھالیا لیکن اردو لسانیت کے اکثر ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ اردو شاعری کی ابتداء ۷۰۰ھ میں حضرت امیر خسروؒ دہلوی سے ہوئی اور ولیؔ دکنی نے اس کو ترقی دی جن کا انتقال ۱۱۴۳ھ میں ہوا۔

علمِ عروض کا آغاز

عربی میں علمِ عروض کا استخراج سب سے پہلے خلیل ابن احمد بصری بن فراہید بن مالک بن فہم بن عبداللہ بن مالک بن مضر بن ازدی نے کیا۔ ابن عماد کے قول کے مطابق خلیل ابن احمد بصری ۱۰۰ھ میں پیدا ہوا۔ اس کی تاریخ پیدائش "یوم الاحد" سے نکلتی ہے۔

خلیل بے پناہ فہم و فراست کا مالک تھا۔ اس کا کمال یہ ہے کہ اس نے تمام حروفِ تہجی کو بحرِ بسیط کے ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ حالانکہ اکثر حروف مکرر آئے ہیں لیکن حروفِ تہجی کا ایک بھی حرف نہیں چھوٹا۔ وہ شعر اس طرح ہے ؎

صِفْ خَلْقَ خَوْدٍ کَمِثْلِ الشَّمْسِ اِذْ بَزَغَتْ
یَحْظَی الضَّجِیْعُ بِھَا نَجْلَاءَ مِعْطَارُ

وہ واقعہ بڑا دلچسپ ہے جس کے باعث خلیلؔ کے ذہن میں علمِ عروض کی ایجاد کا خیال پیدا ہوا تھا۔ کہتے ہیں کہ وہ ایک بار مکّہ معظمہ کے بازار صفارین سے گزر رہا تھا کہ اچانک کسی نے طشت پر ہتھوڑا مارا۔ خلیلؔ فنِ موسیقی کا ماہر تھا۔ اس ضرب سے جو جھنکار پیدا ہوئی اسے سن کر وہ خوشی سے اچھل پڑا اور بے اختیار کہہ اٹھا "وَاللّٰہِ لَیَکُوْنَنَّ مِنْ ھٰذَا شَیْءٌ" یعنی خدا کی قسم اس چیز جھنکار سے کوئی چیز معلوم ہوتی ہے۔

یہ چیز اس کے ذہن میں بس گئی اور ایک موزونیت وہبی کا خیال اس کے دماغ میں پرورش پانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ حرفی فعل کے اوزان کی مناسبت سے اس نے 'فا' و 'عین' و 'لام' کے موافق انھیں نقراتِ متتابع اور سکناتِ متناسب سے عروض کے اوزان وضع کر لئے۔

ایک بار وہ ایک بیت کی تقطیع کر رہا تھا۔ اس کے انہماک کو دیکھ کر اس کے بیٹے نے سمجھا کہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے والد کے ایک دوست کے پاس دوڑا دوڑا گیا اور خبر دی کہ وہ پاگل ہوگیا ہے۔ اور افاعیل تفاعیل بکتا ہے۔ جب اس کا دوست عیادت کو آیا تو اسے بخریت پایا۔ اپنے بیٹے کی حرکت پر خلیل کو بہت غصہ آیا اور اس نے بیٹے کو مخاطب کر کے فی البدیہہ یہ قطعہ کہا ؎

لَوْ کُنْتَ تَعْلَمُ مَا اَقُوْلُ عَذَرْتَنِیْ
اَوْ کُنْتَ اَجْھَلُ مَا تَقُوْلُ عَذَلْتُکَا
لٰکِنْ جَھِلْتَ مَقَالَتِیْ فَعَذَلْتَنِیْ
وَعَلِمْتُ اَنَّکَ جَاھِلٌ فَعَذَرْتُکَا

یعنی اگر تو اس چیز سے واقف ہوتا جو میں کہہ رہا ہوں تو تو مجھ کو معذور رکھتا اور تو جو کہتا ہے کہ اس سے میں واقف نہ ہوتا تو میں تجھ کو ملامت کرتا۔ لیکن تو نے میری بات نہ سمجھی اور مجھے ملامت کی۔ میں جان گیا کہ تو جاہل ہے لہٰذا میں نے تجھے معاف کر دیا۔

علمِ عروض کا یہ موجد ۱۷۰ھ میں راہیٔ ملکِ عدم ہوا۔ اس لحاظ سے تقریباً ساڑھے بارہ سو برس پہلے علمِ عروض وجود میں آیا۔ جس نے نہ صرف عربی شاعری بلکہ فارسی و اردو شاعری کو بھی اوجِ کمال تک پہنچنے میں مدد دی۔ ● ●

(استفادہ از "قواعد العروض"، مولف منشی سید غلام حسین نور بلگرامی)

"ڈاکٹر بشیر بدر کہتے ہیں" "جدید غزل گو شعرا کی بڑی تعداد کو مایوسی، بے سمتی، اور زندگی کی بے معنویت کچھ اس طرح عزیز ہوتی جارہی ہے کہ غزلوں کی دنیا ہماری حقیقی دنیا سے کہیں زیادہ بے رنگ، افسردہ اور قنوطی نظر آنے لگی ہے"

ڈاکٹر سید محمد عقیل رضوی کہتے ہیں "غزل کا فن ہمیشہ سے ایک عمرانی تجربہ کا فن رہا ہے۔ ہر دور کی زندگی اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ اگر اس میں منعکس نہ ہوسکے تو غزل گو اپنے دور کے تقاضوں سے دور چلا جاتا ہے۔ اپنے دور سے پیچھے رہ جاتا ہے۔"

"طرحِ نو" سے

سرِ شمع سا کٹائیے پر دم نہ مار یئے
منزل ہزار سخت ہو ہمت نہ ہار یئے (آتشؔ)

بقیہ :- فن لغت نویسی -

چھوٹے بھائی محمد ہاشم اشرفی سے ہوئی - انھوں نے پوچھا " آپ کے بھائی گھر میں ہیں ؟ " جواب ملا " جی ہاں اوہ اکلوتے بیٹھے ہیں " جب میں نے اپنے بھائی سے دریافت کیا کہ تم نے ' اکلوتے کیوں کہا ؟ اکیلے کیوں نہ کہا تو جواب دیا " لغت میں اکلوتے کے معنی اکیلا دیئے ہوئے ہیں کیا اکلوتا کے معنی اکیلا نہیں ہیں ؟ "

زبان میں محاورے اور ضرب الامثال بڑی اہمیت رکھتے ہیں - محاورے مخصوص معنی کے حامل ہوتے ہیں - الفاظ کے یہ مجموعے صرف اٹکل سے یا ان کے لغوی معنی کی روشنی میں سمجھے نہیں جاسکتے - یہ زبان کی اندرونی سطحوں سے ابھرتے ہیں - اس لیے کوئی لغت ان سے صرف نظر کرکے لغت کہلانے کی مستحق نہیں ہوسکتی - ہمارے قدیم شعرا نے فارسی کے اکثر محاوروں کا لفظی ترجمہ کرکے انھیں اپنے اشعار میں استعمال کیا ہے - ان میں سے کچھ سکے ایسے چلے کہ جزو زبان بن گئے جیسے فریب خوردن یعنی دھوکا کھانا ، غم خوردن یعنی غم کھانا ، لیکن کچھ کا چلن متروک ہوگیا جیسے انتظار کشیدن ، انتظار کھینچنا - لغت میں متروک محاوروں کی نشاندہی کرنا نہایت ضروری ہے - اسی طرح اردو میں کچھ محاورے انگریزی کے زیر اثر آکر جزو زبان بن گئے ہیں جیسے روشنی ڈالنا ، نئے باب کا اضافہ کرنا وغیرہ انھیں بھی (دوسرے لفظی ترجموں جیسے ، نقطۂ نظر ، پس منظر ، مکتب فکر وغیرہ کی طرح) شامل لغت کرنا چاہیے - یہ الفاظ اور محاورے نہ تو فرہنگ آصفیہ میں ملینگے اور نہ نوراللغات میں - اردو فرہنگ آصفیہ اور نوراللغات اسے بھی بہت آگے نکل گئی ہے - اگر کسی شاذ محاورے کا کسی بڑے شاعر نے لفظی ترجمہ کیا ہو تو اسے بھی لغت میں جگہ ملنی چاہیئے لیکن اس بات کی صراحت ضروری ہے کہ فلاں محاورہ فلاں فارسی محاورے کا لفظی ترجمہ ہے مثلاً مذکورہ زیر تدوین اردو - اردو لغت میں ایک اندراج ہے " دانتوں میں تنکا لینا " اس کے معنی بتائے گئے ہیں (۱) عاجزی کرنا (۲) اطاعت کرنا اور (۳) امان مانگنا - ظاہر ہے کہ یہ فارسی محاورہ کا لفظی ترجمہ ہے اور غالب نے اپنے ایک شعر میں اس لفظی ترجمے سے فائدہ اٹھایا ہے - ایسے شاذ ہی محاورے کے سلسلے میں اندراج معنی کے بعد غالب کے شعر کا حوالہ ضروری تھا - اور اس کی صراحت ضروری تھی کہ یہ محاورہ اردو میں شاذ ہے -

محاوروں کی طرح کہاوت اور ضرب المثل کے تعین میں بھی احتیاط لازمی ہے - مثلاً مذکورہ اردو - اردو لغت میں - پاؤں پاٹ کھلا ہوتا کے آگے قوسین میں کہاوت لکھا ہے - خدا کرے کہ یہ کتابت کی غلطی ہو ورنہ " ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے - راقم نے اردو - اردو لغت سے کچھ مثالیں صرف اس لیے دی ہیں کہ یہ لغت ابھی زیر تدوین ہے اس لیے اسے بہتر سے بہتر بنایا جا سکتا ہے - اردو زبان آج بھی مستند اور زمانے کے دوش بدوش چلنے والی لغت کی منتظر ہے -

• •

بقیہ :- افسانوی تجربہ اور .....

میں سمجھ گیا کہ منٹو کا مطلب کیا ہے ؟ میری کہانیوں میں کہانی کم اور مزدوری زیادہ ہے - مگر میں کرتا کیا ؟ ایک طرف مجھے فن اور دوسری طرف زبان سے مول لینا تھا - اہل زبان اس قدر بے مروت نکلے کہ انہوں نے اقبال کا بھی لحاظ نہ کیا - کسی نے پوچھا " آپ اقبال سے ملے تو کیا بات ہوئی ؟ بولے - کچھ نہیں میں ، جی ہاں - جی ہاں کہتا رہا اور وہ ہاں جی ہاں جی کہتے رہے "

اب حالات میں نسبتاً آسانی ہے - کیونکہ سند کے لیے ہمیں کہیں دور نہیں جانا ہے - پرسوں ہی ڈاکٹر نارنگ مجھ سے کہہ رہے تھے کہ پاکستان میں ایک تحریک چل رہی ہے جو شوکت صدیقی جیسے ادیبوں کی پورب سے آئی ہوئی زبان کو ٹکسالی نہیں مانتی بہرحال میں نے منٹو کی تنقید سے فائدہ اٹھایا اور دھیرے دھیرے اپنی کہانی سے ہاتھ کو مار بھگایا - لیکن اس کا کیا کروں کہ وہ ادھر ادھر سے ہوکر پھر رونما ہوجاتا ہے وہ بے ادائی کی ادا جس کی طرف منٹو نے اشارہ کیا میرے الفاظ میں خاک ہی میں مل کر میسر آتی ہے - لیکن یہی بے ادائی اور قلم برداشتگی جہاں منٹو اور کرشن چندر میں مزا پیدا کرتی تھی - وہیں بدمزگی بھی - منٹو کی تنقید کی وجہ سے میری حالت عورت کی سی تھی - جو مقہوض اور تاراج بھی ہونا چاہتی ہے اور پھر اس کا بدلہ لینا بھی - جب میں نے منٹو کے کچھ افسانوں میں لاابالی پن دیکھا تو انہیں لکھا -

" منٹو تم میں ایک بری بات ہے اور وہ یہ کہ تم لکھنے سے پہلے سوچتے ہو اور نہ لکھتے وقت سوچتے ہو اور نہ لکھنے کے بعد سوچتے ہو "

اس کے بعد منٹو اور مجھ میں خط و کتابت بند ہوگئی - بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے میری تنقید کا اتنا برا نہیں مانا جتنا اس بات کا کہ میں لکھوں گا خاک ، جبکہ شادی سے پہلے مجھے کسی بات کا تجربہ ہی نہیں - اس پہ طرفہ یہ کہ میں نہ صرف بھینس کا دودھ پیتا ہوں بلکہ اسے پال بھی رکھا ہے - میں انہیں کیسے بتاتا کہ اگر اونٹ کا رشتہ مسلمان سے ہے اور گائے کا ہندو سے تو سکھ کا بھی کسی سے ہوسکتا ہے -

افسانہ ایک شعور ، ایک احساس ہے - جو کسی میں پیدا نہیں کیا جاسکتا - اسے محنت سے تو حاصل کیا جاسکتا ہے - لیکن حاصل کرنے کے بعد بھی آدمی دست بہ دعا رہتا ہے - کچھ وافر باتیں سہو ہضم کی وجہ سے بھی اس میں آجاتی ہیں اور کچھ کسی اور ذہنی فتور سے - تسکین کی بات صرف اتنی ہے کہ افسانہ ابھی ہمارے ہاتھ سے نکل کر کسی ایڈیٹر کے ہاتھ نہیں پہنچا - ہم اس میں ایزاد و اضافہ کرسکتے ہیں اور اس پر بات نہ بنے تو پھاڑ کر پھینک سکتے ہیں - اگر ہمینگ وے پانچ سو صفحے لکھ کر ان میں سے صرف چھیانوے صفحے کا مواد نکال سکتا ہے تو ہم ایسا کیوں نہیں کرسکتے ؟ اردو میں بہت عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں اگر ان کی تعداد گنی چنی ہے تو اسکی یہی وجہ ہے کہ اپنے اور دوسروں کے تقاضے پورا کرنے میں ہم یہ نہیں دیکھتے کہ ایمان ہاتھ سے جا رہا ہے - یہ نہیں جانتے کہ ہم ایسے ہی امیج کے قیدی ہوکر رہ گئے ہیں -

• • • •

(ماخوذ اردو افسانہ روایت اور مسائل
مرتبہ گوپی چند نارنگ)

کاہلی متعدد برائیوں کے ایک مجموعہ کا نام ہے - (مشر)

جتنی تھی عاجزی وہ مجھی کو عطا ہوئی بخشا خدا نے آپ کو جتنا غرور تھا (امیر مینائی)

بقیہ: آج کا ادب

پیشہ نظر آنے لگی۔ مفاد پرست طبقے کی سازشیں کبھی نقاب کو اوڑھ کر اور کبھی بے نقاب ہو کر سامنے آنے لگیں۔ بار بار کے جھٹکے لرزہ پیدا کرنے لگے۔ یقین اور بے یقینی کے دوراہے پر کھڑی ہوئی نئی پود اپنے بزرگوں کی فتوحات اور شکستوں کا جائزہ لینے لگی۔ بزرگوں کے اسلحے زنگ آلود نظر آنے لگے۔ اس کے باوجود مستقبل کی تابناکی پر یقین باقی رہا۔ جھنجھلاہٹیں بے دلی، افسردگی، الم دوستی، خود پسندی اپنے اپنے کرتب دکھا رہی ہیں۔ لیکن وہ ولولے اور حوصلے جو پہلے ہی جنم لے چکے تھے۔ نیم جاں ہونے کے باوجود اپنی موت کو دعوت دینے کے لیے تیار نہیں بیدلی کی راکھ میں زندگی کی چنگاریاں کروٹ بدل رہی ہیں۔ آج کا بحران بالیدگی کا بحران ہے۔ افتادگی کا بحران نہیں۔

ادیبوں اور شاعروں کی نسل اپنے بزرگوں کی توانائیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف ہے۔ یہ نئی پود اپنی انفرادیت اور شخصیت کو تسلیم کرنے پر بار بار اصرار کر رہی ہے۔ مغربی علم و ادب سے بڑھتی ہوئی واقفیت نے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کے تخلیقی شعور کو کافی حد تک متاثر کیا ہے۔ آج ان کی اپنی اپنی آوازیں ہیں۔ اپنے اپنے لہجے ہیں۔ نئے نئے اسلوبی تجربے کئے جا رہے ہیں۔ تشبیہوں اور استعاروں سے زیادہ رمز و ایما، اشاروں اور کنایوں پر زور دیا جا رہا ہے۔ ادب کو زیادہ سے زیادہ تہہ دار و لبیار پہلو بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ تمام تجربے کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بعض اچھے بھی ہیں اور بعض خراب بھی۔ ایک بات جو سب سے زیادہ کھٹکتی ہے وہ ہے ان ادب پاروں کی فسردہ اشاریت ترتیب، تنظیم اور تعمیر پر اتنی توجہ صرف نہیں کی جاتی جتنی تاثراتی اشاروں پر کی جاتی ہے۔ اکثر اجزاء کل پر چھا جاتے ہیں۔ اور بات مکمل نہیں ہونے پاتی۔ پھر بھی آج کا ادب تازہ فکر نوجوانوں کے ہاتھ پکڑے آگے بڑھ رہا ہے۔

کہن فکر اور پختہ مشق فنکار بھی حالات سے متاثر ہو کر اپنی آواز اور لہجے کو بدلنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔ بلند آوازی کی جگہ نرم لہجگی لے رہی ہے۔ رزم آزمائی سے زیادہ بزم آرائی کا خیال کیا جا رہا ہے۔ سوز و گداز کے ساتھ ادب میں افسردگی بھی داخل ہو رہی ہے۔ صورتحال اتنی ہی مایوس کن اور اتنی ہی حوصلہ افزا ہے جتنا تیسری جنگ عظیم سے ٹکراتا ہوا انسانی مستقبل۔ ادب کے یہ رجحانات، زندگی اور اس کی ذمہ داریوں کا اعتراف ہیں۔ انکار نہیں۔

پرانے شاعروں میں مخدوم محی الدین، سردار جعفری، فیض احمد فیض، وامق جونپوری غلام ربانی تاباں، مجروح سلطانپوری وغیرہ کے لہجے کی بیدلی بدلے ہوئے حالات کی کہانی کہہ رہی ہے۔

نوجوان شعراء میں خلیل الرحمن اعظمی، شاذ تمکنت، وحید اختر، ابن انشاء، ناصر کاظمی، مظہر امام، اویس احمد دوراں، وغیرہ اپنے انداز و لہجے میں آج کی عصری کشمکش کے گیت گا رہے ہیں۔

تنقید میں بھی زیادہ گہرائی آ رہی ہے۔ پرانی طرز تنقید کا اکہرا پن تہہ داری میں بدلتا جا رہا ہے پرانے نقادوں کا ذوق تنقید ادب کے نئے نئے گوشوں کا جائزہ لے رہا ہے۔ نئے نقادوں میں ڈاکٹر محمد حسن، ڈاکٹر خلیل الرحمن، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ممتاز حسین، ارشد کاکوی، ڈاکٹر گیان چند، ڈاکٹر شکیل الرحمن، نثار احمد فاروقی رشید حسن خاں وغیرہ اردو تنقید میں ایک نئے باب کا اضافہ کر رہے ہیں۔

افسانوں اور ناولوں کی دنیا ابھی تک کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ احمد عباس وغیرہ کی دنیا بنی ہوئی ہے۔ اور بات ہے کہ خود ان کے انداز فکر اور طرز نگارش میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ نئے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں کوئی چونکا دینے والا نام ابھی نہیں ملتا۔ غیاث احمد گدی، ذکی انور وغیرہ کی تخلیقات میں ایک نئی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

دوسرے اصناف ادب بھی نئے حالات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے ہیں۔ لیکن ان میں ابھی تک بہت نمایاں تبدیلیاں رونما نہیں ہوئی ہیں

مجموعی حیثیت سے آج کا اردو ادب حوصلہ افزا ہے، مایوس کن نہیں۔

بقیہ: نئی شاعری پر ایک...

کر ابہام کو راہ دی ہے، دوسرا گروہ ہندوستان کے جدید شعراء کا ہے جن کے یہاں علامتیں نئی ہیں، مواد نیا ہے احساس نیا ہے مگر ابہام بہت کم ہے اور جتنا ہے وہ شاعری کے لیے ضروری ہے۔ بحیثیت مجموعی نئی شاعری ناصر کاظمی، ابن انشاء، ساقی فاروقی، یگانہ، شاد عارفی، اور فراق سے اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے ہندوستان میں خلیل الرحمن اعظمی اور وحید اختر سے ہوتے ہوئے بعد کے غزل گو شعراء تک پہنچی ہے۔ اپنی پہچان کرواتی ہے اپنے رویے اور انداز نظر کو متعین کرتی ہوئی ملتی ہے۔ ان شعراء میں شہریار، بشیر بدر، محمد علوی ہیں شہریار نئی غزل کو احتیاط اور سنجیدگی عطا کرتے ہیں۔ بشیر بدر غزل کو تازگی اور شگفتگی کے ساتھ نئے لفظوں کے استعمال سے روشناس کرواتے ہیں۔ محمد علوی اسے فطری علامتوں کے لبادے زیب تن کرواتے ہیں۔ ان کے علاوہ عادل منصوری کا پیکری اظہار خوابناک فضا کی تعمیر کرتا ہے، شاذ تمکنت اور زبیر رضوی[1] رومانیت لہجے کے دھیمے پن اور دلکشی سے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اسی طرح بشر نواز، مظفل جعفری، پرکاش فکری، صادق، علیق اللہ نئے مزاج سے ہم آہنگ کرواتے ہیں، ان کے علاوہ پچھلے چند برسوں میں جس نئی پود نے اپنی پہچان کروائی ہے۔ ان میں علی گڈھ کے طلباء اور مالیگاؤں کے چند شعراء کا شمار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح ناگپور اور اس کے اطراف کے شعراء میں شاہد کبیر، مدحت الاختر، اور عبدالرحیم نشتر کے نام قابل ذکر ہیں نئی نظم مجید امجد، قیوم نظر، اختر الایمان، اور ڈاکٹر وزیر آغا کی رہنمائی میں محمد علوی، بلراج کومل، عمیق حنفی، باقر مہدی، کمار پاشی، ندا فاضلی مظہر امام، شہاب جعفری اور قاضی سلیم تک پہنچی ہے۔ ●●

---

[1] شعراء کی فہرست نامکمل ہے اس لیے کہ مضمون تعارفی ہے۔ (زماں)

> فکر قلب کا چراغ ہے جب وہ نہ رہیگا تو قلب کی روشنی بھی جاتی رہیگی۔
> (شیخ علی متقی)

بقیہ :۔ جدید جاپانی نظم

جوڑ دیا بلکہ جاپانی شعراء نے جہاں مغربی تحریکات کا اثر لیا ہے تو دوسری طرف ارضی تصورات کو بھی پیش کیا۔

تاکا مورا نے مغربی ادب کی تقلید بھی کی ہے۔ اور اپنی زبان کی انفرادیت کو بھی قائم رکھا ہے۔ ایک جگہ لکھتا ہے کہ:۔

میری زبان میری انتڑیوں کی آنچ ہے/چاول اور مالٹ سویابین اور مچھلی کے گوشت سے پلی ہے/ مغربی ادب کی نظمیں میری ہر دل عزیز پڑوسی ہیں/ پر میری نظم کا لشکر الگ راستہ سے گزرتا ہے۔

جاپانی زبان کی ساخت اردو زبان کی ساخت سے مختلف ہے۔ اس کی اصناف اور شعری ہیئتوں کی ایک مخصوص عروضی تنظیم ہے۔ جاپانی شاعری میں رکن کا وہ تصور نہیں جو اردو یا انگریزی میں ہے۔ اس لیے جنھوں نے جاپانی شاعری کا جاپانی ہیئتوں کی خارجی خصوصیات کے ساتھ اردو یا انگریزی میں ترجمہ کرنے کی کوشش کی ہے انہیں ناکامی ہوئی ہے۔ مثلاً ہائیکو جاپانی نظم کی ایک مخصوص ہیئت ہے جو تین مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے جس کے پہلے اور تیسرے مصرعے میں ۵ - ۵ اور دوسرے میں سات رکن ہوتے ہیں۔ اس ہیئت کو انگریزی میں جارج سیفرس نے اور اردو میں مفضل حق قریشی وغیرہ نے برتنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے مفضل حق قریشی نے جاپانی ہائیکو کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

"چاول کے ایک پودے کی بال
جھک گئی بوجھ سے، کیوں کہ
ایک مکوڑا اس پر آ بیٹھا ہے"

اس ترجمے میں خارجی خصوصیات تو کجا بعض دوسری خصوصیات بھی موجود نہیں ہیں۔ ترجمہ میں نظم کے پس منظر کے طور پر موسم، منظر، اور فطرت کا کوئی تذکرہ نہیں ہے جبکہ ہائیکو میں یہ تمام چیزیں ضروری ہوتی ہیں۔

دراصل جاپانی اصنافِ سخن اپنا مخصوص قسم کا تہذیبی مزاج، پس منظر، آہنگ اور عروض کا جو انداز رکھتی ہیں۔ وہ ہندوستانی زبانوں اور انگریزی ادب کے اصول ارکان سے بالکل مختلف ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جاپانی نظموں کا ترجمہ انگلینڈ، فرانس، اٹلی، اور جرمنی وغیرہ میں نہیں ہوا اور جو تراجم ہوئے۔ وہ بارآور ثابت نہیں ہوئے کیوں کہ جاپانی نظمیں اپنی وضع قطع کے اعتبار سے بالکل الگ ہیں ان میں ردیف قافیہ نہیں ہوتا۔ لیکن آہنگ ضرور ہوتا ہے، احساس ہوتا ہے، اپیل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جاپانی شاعرہ اپنے بچے کی موت پر اس طرح مرثیہ لکھتی ہے ؎

میرا بچہ
تیتری کے تعاقب میں
بہت دور تک چلا گیا

اُٹ، باشو، وغیرہ کے ہائیکو جاپانی ادب میں بہت مشہور ہیں۔ اسی انداز کی ہیئتوں میں کتاؤتا سیڈوکا، لسوسیکا، چوکا، تنکا، رنیگا، ہیکو وغیرہ بھی مشہور ہیں۔ غرض جاپانی نظم روز بروز جدت سے ہمکنار ہوتی جا رہی اور ساتھ ہی عالمی ادب میں اپنا انفرادی مقام منوانے کے لیے کوشاں ہے۔ اردو نظم کا دامن بھی اتنا وسیع ہے کہ اس پر فرانسیسی شاعری کی ہیئت، ترائیلے، فری ورس، جاپانی کی ہائیکو، اور انگریزی کی سانیٹ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اپنی نجی ہیئتوں مثلاً مختصر نظم، نثری نظم، وغیرہ کا اضافہ بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ لہذا جدید اردو نظم کو پڑھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر زبانوں تیز ادب سے بھی واقفیت ہو۔

جدید جاپانی نظم کا شمار اسی ذیل میں کیا جانا چاہیئے......●●

بقیہ :۔ جدید افسانے کا اصل۔۔

نگار دوچار ہوکر اپنی تخلیق مکمل کرتا ہے۔ قاری بھی اس انداز کے تجربے سے گذر چکا ہو۔ اس طرح اس کے لیے تجربے کی ہم آہنگی کے باعث افسانے میں شرکت ممکن ہوسکے گی دوسری صورت یہ ہے کہ اگر وہ افسانہ نگار کے اس تجربہ تک نہ پہنچ سکے تو وہ اپنی ذہنی تخلیقیت سے کام لیکر اس تہہ در تہہ اور نقاب اندر اسرار کے کسی نہ کسی گوشہ اور کسی نہ کسی تہہ تک ضرور رسائی حاصل کرے گا۔

رشید امجد کا "گملے میں اگا ہوا شہر" جس المیہ کی نشاندہی کرتا ہے میری ایک عزیزہ نے اس سے پہلے کبھی جدید افسانہ نہیں پڑھا تھا یہ افسانہ پڑھ کر مجھے اس کے پس منظر کے بابت بھی بہت کچھ بتایا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک اجتماعی المیہ تھا۔ جسے انفرادی سطح پر بھی بڑی شدت سے محسوس کیا گیا تھا۔

میرے افسانے "روشنی کی بشارت" کو میرے دو کرم فرماؤں نے پڑھا۔ ایک نے اسے نیٹشے کی نفی مذہب کے جواب میں مذہب کا اثبات قرار دیا جو انفرادی طریق سے سامنے آیا۔ دوسرا دوست وہ تھا جو اس افسانے میں ماں بہن اور بیوی کے ساتھ چوتھا کردار بھی ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ افسانے کی تمام تر پیچیدگی کے باوجود کچھ اور جس انداز میں، میں نے اس افسانے کو سمجھا ہے۔ اسے اور کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا. اس نے اسرار اپنے ذاتی تجربہ کی حد تک دیکھا۔ تاہم دونوں دوستوں پر افسانے کی کوئی نہ کوئی تہہ ضرور منکشف ہوئی جس سے ان کے افسانے میں شرکت کا جواز بنا۔ یہ سارے لوگ عام طور پر میٹرک۔ ایف۔ اے تک پڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں سے بیشتر نے اس سے پہلے جدید افسانہ سرے سے پڑھا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود نہ صرف انہوں نے افسانے میں اپنی شرکت محسوس کی۔ بلکہ ان میں سے کئی اب جدید افسانے کے باقاعدہ قاری بھی ہیں۔ یہ انفرادی مثالیں میں نے اس لیے دی ہیں کہ ایک تو یہ میرے ذاتی علم میں ہیں۔ دوسرے اس لیے کہ جدید افسانے میں قاری کی شرکت یا عدم شرکت کی وجہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔

چند جعلی افسانہ نگاروں کو چھوڑ کر جن کی تحریریں نقالی محض کی غماز ہیں جدید افسانے کا بنیادی مسئلہ قاری کی عدم دلچسپی اور تخلیقی تجربے میں شرکت سے ذہنی گریز ہے۔ فلمی پرچوں اور الم غلم قسم کی چیزوں نے مجموعی طور پر قاری کی ذہنی سطح کو پست کیا ہے۔ اور اس سے اس کی بے توجہی کے نتیجے میں یہ نہیں ہوسکتا کہ افسانہ نگار بھی قاری کی سطح پر اتر آئے۔ اس کے لیے قاری کو اپنی ذہنی سطح بلند کرنا ہوگی۔ ●●

کام ہمت سے جوانمرد اگر لیتا ہے
سانپ کو مار کے گنجینۂ زر لیتا ہے (آتش)

برق نے میرا نشیمن پھونک ڈالا ہے تو کیا — اور لے آؤں گا تنکے آشیانے کے لیے (دلدار ہاشمی)

٦٥

حرمت الاکرام

ناگ کا من......

کون گوتم بنے
شانتی کے لئے
تیاگ کر محل ــــ برگد تلے
کون دھونی رمائے
جلتے مون کی آگ میں،
وار رو کے لہو میں چھپی برچھیوں کے
بنائے کوئی تن کو رن ــــ شانتی کے لئے
شانتی کے لئے
کون گوتم بنے
بھینٹ دے کون راتوں کا سکھ
بھینٹ دے کون آنکھوں کا حق
نیند سے مول لے دشمنی
بس پئے ناگوں سے پھن اٹھائے دلوں کا
کہ من کو ملے شانتی
شانتی کے لئے

کون گوتم بنے
آتی جاتی ہٹیلی رتوں کے تھپیڑے سہے
دشمنوں جیسی نامہرباں دھوپ کا قہر
انگاروں کے تیر برساتی لو ــــ باولی آندھیوں کا غضب
شیشے کی کرچوں سی بوندوں کی شوخیاں
برف میں ڈوبی قاتل ہواؤں کی بے رحمیاں
ایک برگد تلے بیٹھ کر
آتما میں اتارے
بھرے قرض اک رات کے فیصلے کا
کہ جگ میں شانتی کہاں شانتی
کون گوتم بنے
شانتی کے لئے،
ناگ کا من ہے یہ
شانتی سب کو ملتی نہیں

• رام باغ، مرزاپور، یوپی۔

رونق دکنی سیمابی، جمشید پور

جھانک کر ایک دن دہلیز نے آنگن سے کہا
تنگ دل تو کہ ہے، کیا تجھ کو خبر باہر کی
اپنے پھیلاؤ میں محصور، اسی میں ہے مگن
تو سمجھتا ہے کہ پہلو میں تیرے
ہفت اقلیم سمٹ آئی ہے۔
ایک دو پیڑ تنومند اگ آئے ہیں کیا
تو سمجھتا ہے کہ ہوں سایہ رساں عالم کا
صبح دم رین بسیروں کی وہ شورش توبہ!
تو سمجھتا ہے کہ فردوس سماعت ہے سماں
مگر وہ خلوتِ خاموش کی لذّت اب کہاں
دھوپ اور چھاؤں میں ماحول اُجاڑ
اک وحشت سی مسلّط ہے جو انجانی ہے
ایک ویرانی سی ویرانی ہے۔

اور اک دیکھ مجھے
کس قدر شانِ پذیرائی ہے
صاحبِ خانہ سے لوگ آتے ہیں ملنے جو کبھی
کرتے دریافت ہیں پہلے یہ میرا نام و نشاں
دینے لگتا ہے اُدھر دعوتِ سامانِ نشاط
بوئے گل کی طرح ملبوس مکاں
گنگناتے ہیں در و بام اُدھر
ایک فردوسی سماعت ہے یہ تخئیلی سماں
جب بھی میری طرف لوگوں کی نظر جاتی ہے
شخصیت صاحبِ خانہ کی نکھر جاتی ہے
پیشِ شادابیٔ دہلیز، یہ سنّاٹا درونِ خانہ
لہلہاتا یہ چمن زار اور یہ ویرانہ
لوگ ویران خموشی سے اثر لے کے یہ کہہ اٹھتے ہیں
تنگ دل کس قدر انگنائی ہے۔

سُن کے دہلیز سے آنگن نے کہا خندہ بہ لب
جس کی فطرت تھی تحمل کوشی
مالکِ خانہ کی یہ سچ سہی پہچان ہے تو
شان ہے گھر کی، محلّے کی بھی اک آن ہے تو
تو مگر بھول رہا ہے اے دوست!
مایۂ ناز ان اوصاف کے "دربان" ہے تو
تیرے اس عالمِ گذراں کے ہیں اوقات ہی کیا
تیرے دن رات ہی کیا؟
میں کم آمیز سہی طعنہ زنی خوب نہیں
عافیت جو ہے خموشی میں وہ شورش میں کہاں
تو نہ اس راز کو سمجھے گا کبھی
صحن میں سنتری جیسے جو یہ نگراں ہے درخت
تو نے محسوس کبھی کی ہے گرفت اِن کی سخت
دھوپ اور چھاؤں میں مضمر ہے نظامِ ہستی
ہر نفس جس کا ہے منسوب بہ بنامِ ہستی

بات جب بڑھ کے بہ آمادۂ پیکار ہوئی
سائباں سُن جو رہا تھا دخل انداز ہوا
تھم گئے دونوں حریف!
سائباں نے کہا اے ہم نفسو!
شخصیت ہوتی مکیں کی ہے مکاں سے واضح
نہیں تفریق کوئی آنگن اور دہلیز میں ہے
فوقیت کا یہ جنوں زہر اثر ہوتا ہے
نشہ بھی اس کا باندازِ دگر ہوتا ہے
جذبۂ یک جہتی میں ہیں پنپنے کے اُصول
پھول کی طرح مہکتے ہیں جو یہ ہو تو ہول
"جیو جینے دو" کے جمہوری اصول اپناؤ
کبھی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد نہ الگ بنواؤ •

زباں کھولیں گے مجھ پر بد زباں کیا بد شعاری سے کہ میں نے خاک بھر دی انکے منہ میں خاکساری سے (ذوق)

کالی داس گپتا رضا

ابھی سب کچھ تھا، ابھی کچھ بھی نہیں
ادھ کھلی آنکھوں کی بے رحم جھپک
آدھے لمحے کا بھی وقفہ نہ ملا
سب کتابیں مری گم ـــ؟
ایک ورق بھی نہ بچا ـ ؟
لے اڑا کون انھیں، کس کو وہ دھن پیارا تھا
ایسا بیدار سمجھدار، کہاں اب کوئی
میرے مخطوطوں، کتابوں کی جو چوری کرے
آج کل بیشتر احمق ہی جیا کرتے ہیں

میرا بوسیدہ ذخیرہ، وہ میرا مال و متاع
پرزہ پرزہ سے ورق
کچھ ادھورے، کئی بے ربط
کئی رنگین، منقش، خوش خط
لکھنے والے کا کہیں نام نہیں، سنہ غائب
قلمی چیز مگر کس کا قلم؟ کس کا دماغ ؟

یا پھر ایسے کہ ہے ترقیمہ نہایت کامل
نام، تاریخ، پتا، سب کا مکمّل اندراج
یعنی مخطوطہ بھی، اور صاحبِ مخطوطہ بھی
اور وہ طبع شدہ دو سو برس کے دوران
اک خزانہ جو مرا ہی حق تھا
جس پہ چغتائی کے دیوانِ مصوّر قربان
جس کی نم دیدگی اوراقِ جدیدہ پہ نثار
جس کی دہلیز پہ ذہن آج تلک سر بسجود
حاجت اب جس کو مصنّف کی نہیں
بلکہ ہے قاریِ خودگم کی تلاش
جو اسے پڑھ سکے، بتلا سکے اس کی قیمت

لے اڑا کون اسے، کس کو وہ دھن پیارا تھا
ایسا بیدار، سمجھدار، کہاں اب کوئی ؟
بیشتر آج تو جاہل ہی اگا کرتے ہیں
کون ہوگا وہ خزانے کو چرانے والا
ہو نہ ہو، ہوگا کوئی بک سیلر
درس و تدریس کے شعبے سے کوئی کیا ہوگا
ان کو فرصت ہی کہاں، داخلے اور ٹیوشن سے
سیمی ناروں سے، جلوسوں سے، اکاڈمیوں سے
درس و تدریس تو اک نام ہے، اور نام میں کیا؟
اور کچھ کہہ لو اسے، جیسے کہ شہرت طلبی
یا کہو شعبے کو بازار، جہاں "تھی سس" کی !
ادھ کچی لوٹی ہوئی جنسِ گراں بکتی ہے!

نہیں ہرگز نہیں ـ تعلیم کے شعبے والے
کیوں چرانے لگے بوسیدہ، پرانے اوراق؟
کون پڑھ پائے گا ان کو کسے فرصت ہے یہاں
اور ہوں گے کہیں
پر کوئی بھی ہوں ـ لوٹنے والے تو ہیں
نام کے عالمو! اجلاس زدو! زر طلبو!
دست بستہ میری درخواست ہے یہ
میرا سب کچھ لے لو
مجھے میری کتابیں دے دو

کام سب تقدیر پہ ہیں مانا مگر تدبیر شرط   کچھ سبب بھی چاہیے اس عالم اسباب میں   (واقف)

ایک نظم برائے ۱۹۸۲

یہ سال، سالِ گذشتہ کی قبر پر فاتحہ خواں
خراج اشکوں کے پھول کا دے رہا ہے
اندھیری قبروں میں عہدِ ماضی کا جسم دفن کرکے ہنس رہا ہے
برہنہ سر پر ہے خاکِ ہستی
نحیف کاندھوں پہ آرزوؤں، حسرتوں کا جنازہ لے کر
اداس شہرِ خموش میں پھر کھڑا ہے آخر
دلوں کے صحرا میں گردِ تشکیک اڑ رہی ہے
رگوں میں دردِ جدائی نیلاہٹیں بکھیرے
فسردہ آنکھوں میں خونی منظر ابھر رہے ہیں
صدائیں کانوں میں آ رہی ہیں

٥

یہ سال زخمی یادوں کے داغ دامن سے دھو رہا ہے
لہو کی بوندوں کو پانیوں سے مٹا رہا ہے
ہزاروں چہرے پکارتے ہیں
لہو چھپے گا نہ آستیں میں
لہو بہے یا جمے، لہو ہے
اداس نسلیں سروں کی فصلیں اگا رہی ہیں
نئے حوادث کی آہٹیں سن رہی ہیں
عجیب اندیشے، وسوسے، وہم، دل میں جاگتے ہیں
نجانے لیکے برس بہاروں کے ایام کیسے گذریں؟
خزاں رسیدہ، برہنہ شاخوں پہ موسمِ گل بھی مسکرائے؟
نجانے کیا ہم سب پہ گذرے؟
نجانے کیسے بسر خرابوں میں زندگی ہو؟
یہ مقتلِ وقت، گوشہ گوشہ صلیب روشن
بشارتیں لانے والا ہی آج مصلوب ہو چکا ہے
لہو کے پھولوں سے چادرِ زلیت ڈھک گئی ہے
کفن کفن وقت رو رہا ہے!!

یہ سال بھی گذرے سالوں کی مانند
حسیں امیدوں کا جال ہم سب پہ پھینکتا ہے
بجھے چراغوں میں حوصلوں کا کثیف روغن انڈیلتا ہے
بشارتوں کا طلسم جاگے
جلوسِ ہستی نہ رک سکے گا!
چراغِ امید آندھیوں میں بھی بجھ نہ پائے
دلوں کی قندیل بجھ بجھ کے جل رہی ہے
رگوں میں خوشبو اتر رہی ہے

٥

یہ سال، پھر اپنے ہونٹوں پہ سہمی دعائیں لیکر
دلوں کے دروازے کھٹکھٹائے
ملال کی گرد کو ہٹائے
خدا کی چوکھٹ پہ سربسجدہ دعائیں راہِ قبول ڈھونڈیں
دُعا، کہ یہ سال توشہ دماں، کامراں گذاریں
دُعا، کہ اس سال خونی بارش سے فصلِ جاں تو بچے سلامت
دُعا، کہ اس سال، وقت کے پُل صراط سے تو بخیر و خوبی گذر ہی جائیں
دُعا، کہ یہ سال زخمی انساں کی شفا ہو!
دُعا، کہ ایٹمی جنگ نہ چھڑ جائے
نیا ہیروشیما، ناگاساکی کہیں نہ ابھرے
عرب یا ایران یا ویت نام یا یوگنڈا
کہیں نہ انسانیت فنا ہو
یہ آگ، خون، قحط بارش، سوادِ عالم کو چھوڑ جائے
دُعا کہ اس سال زندگی اپنی منزلوں کے قریب پہنچے
خدائے برتر خدائے دوراں
دلوں سے نکلی دعائیں سن رہا ہے!
فصیلوں پر مسکرا رہا ہے!
چلو کہ منزل پکارتی ہے
چلو کہ چلنا ہی زندگی ہے
سفر ازل ہے!
سفر ابد ہے!!!

نہ پکڑیں دامنِ ایاس ... کہ بہتر ادب کرنے سے ہے جینا ... (ذکی)

دستورِ ازل ۔ مصطفےٰ زیدی (مرحوم)

کل رات مرے گھر کا خرابات تھا روشن
آیات کی لو دیتے تھے اشعار کے معبد
اربابِ حکایت نے سجائی تھی ادب سے
افکار کے قالین پہ اقوال کی مسند
اخلاص کے رشتوں پہ کھنکتے تھے نئے جام
با وضعِ قدیمانہ اخلاقِ اَب و جَد
ایما و اشارات تھے غواصِ معانی
ہر لفظ کا ایک گھیر تھا ہر بات کا اک قد
کھلتا ہوا سا عزیں ہر اسلوب کم و بیش
مٹتا ہوا ہر تفرقۂ احمر و اسود
صہبا کی حرارت سے دھڑکتی تھی صراحی
بیٹھے تھے تہی جام مگر حضرتِ امجدؔ
وابستگیٔ شرع نظر بندیٔ رنداں
پابندیٔ آئین و گرفتاریٔ مقصد
آخر حرم و دیر کے مینار پکارے
اے واقفِ اسرارِ دلِ ہوش و اجد
دستورِ قوانینِ ازل مٹ نہیں سکتے
ہر جور کا اک وقت ہے ہر ظلم کی اک حد

مصطفٰی زیدی جیسے تیکھے، طرحدار اور مضبوط شاعر کے بارے میں کسی نے بھی اس تفتیش کو ضروری نہیں سمجھا کہ ایسا درخشاں شعلہ اس قدر جلد کیوں بجھ گیا ۔
قارئین "اسباق" کو یاد ہوگا کہ مصطفٰی زیدی نے اپنا خاتمہ اپنے ہاتھوں کیا تھا ۔
۱۲ اکتوبر کو مصطفٰی زیدی کی برسی تھی ۔ ادارہ ان کی ڈائری سے ایک غیر مطبوعہ نظم منت کے شکریے کے ساتھ پیش کرتا ہے ۔ • محمد امجد مرحوم

پھر اسی سے ملیں ۔

ہوا کی ردا سر پہ اوڑھے ہوئے
اور آنکھوں میں
اشکوں کے ننھے دیئے
لے کے چلتے ہیں پھر اس نگر میں
جہاں
ہاتھ سنگِ ملامت لئے
منتظر ہیں
ہاں وہی شخص جسکے لئے زندگی
ریت پر
چلتے قدموں کا اک سلسلہ بن گئی
پھر اسی سے ملیں

○ زاہد نوید پاکستان

نصیب ۔

تخلیق کے خمار میں چُور
اک خوش گوار موڑ میں
اس نے جب
بے حساب لوگوں کے نصیب میں
خوشیاں لکھ ڈالی ہوں گی بے شمار
تب
تب اس نے ایک لمحے رک کر
سوچا ہوگا
توازن کی خاطر
کچھ تبدیلی چاہیئے
اور یوں اس موڑ میں
لکھنے کو اگلا نصیب
اس نے جو صفحہ پلٹا
وہ میرا تھا ۔

صوفیہ لطیفی پاکستان

ترا یوں خیال آیا مجھے غم کی دوپہر میں — کوئی جیسے اپنا آنچل مرے سر پہ تانتا ہے — (شفیق شفائی)

ظفر غوری

۲۴۴، اعظم بلڈنگ سرائے کایستھان کوٹہ (راجستھان)

آٹھواں سفر

ساحلوں کی فضا پھر سے روشن ہوئی
شب زدہ کشتیاں نیند سے جاگ اٹھیں
پھر نئے بادباں دھوپ کے تن گئے
موج در موج کچھ خواہشوں کے قدم
لب بہ لب رخصتی گیت سے بن گئے
اجنبی جنگلوں کی طلسمی فضا،
ادھ کھلے خواب زاروں کی مہکی ہوا
دور سے اپنے جانب بلانے لگیں
آنکھ ملتے ہوئے دل کے سندباد کو،
تازہ ارماں لہو میں مچلنے لگا
پھر سفینہ نئی سمت چلنے لگا

"دوسری ہجرت"

آگہی تھی یہ کہ خود نا آگہی
جس نے اک دن
ذہن و دل کی نرم مٹی میں تھا بویا
صرف تخمِ انحراف!
اور کاٹی
بے یقینی کی جواں بھرپور فصل
اس یقین کے ساتھ
کہ اس سے ہی حاصل ہو سکے گی
ہم کو جسم و جاں کی شادابی و سیری،
ذہن و دل کی پرسکوں آسودگی
جب یہ پھل چکھا
تو کانٹے سے روگ ویسے ہیں اُگے
روح میں دوزخ سی دہکی
زندگی خود بن گئی بس ایک ازلی تشنگی،
رنگ لا کر ہی رہا اپنا خمیر
پھر پھڑاتا ہے لہو میں
کب سے اک پیاسا پرندہ
پھر یہ خود آشوبِ فطرت
کس نئی دنیا میں اب لے جائیگی !!؟؟

علامت کا حسن — احمد ظفر پاکستان

جنگلوں کی خامشی میں کم سنی کے قہقہے
جانے کتنی دور کی آبادیوں میں لے گئے
خواہشیں صحرا میں جیسے دور تک اندھے سراب
ایک ماتھے پر کسی غم کے سلگتے چاند نے
چلتے چلتے راستے میں کیوں مجھے آواز دی
ایک آویزہ کسی کے کان میں سورج کی آگ
زلف انبارِ شبِ غم جس طرح ہو دوش پر
ہونٹ، محرابوں میں رکھے تھے لہو کے دو چراغ

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں نہ آیا جنہیں ادیب دنیا میں زندگی کا سلیقہ تمام عمر (ادیب مالیگانوی)

انیس امام

"ابلاغ کا مسئلہ"

زبان کھردری
طرزِ اظہار پیچیدہ
الفاظ سخت
مضامین بے ربط
تخیل ہیجان و لہجہ کرخت
کہاں حل ہوا مسئلہ کوئی ابلاغ کا آج تک
گلابی ہو آنچل کہ دھانی دوپٹہ
چمن کا نکھار
کسی ایک شئے پر نہیں منحصر
ہم آہنگ ہوں جذبہ و فکر و فن تو ہے ساری بہار
مگر اس کی تفصیل سچ پوچھئے تو ہے دشوار تر
نیا تجربہ ہو نیا طرزِ اظہار ہو تو ہے خوب
نظر کس کو آتے ہیں اپنے عیوب

"بے بسی"

برگِ گل بکھرے ہوئے ٹوٹی ہوئی شاخِ حیات
کھو گئے دونوں سنہری خواب کی آغوش میں
کر دیا آخر جدا پاگل ہواؤں نے انہیں
کیا خبر کس آگ کی بھٹی میں دونوں جل گئے
باغباں نے ان کو پہچانا نہ گلچیں نے کبھی
خاک گلشن بھی نہیں معلوم کیا سمجھے انہیں
آنکھ کھولی
لذتِ دنیا اٹھائی
مر گئے
آدمی ہم ہیں ہماری زندگی ایسی بھی کیا
رہ نہیں سکتے ہوا سے زندگی ایسی بھی کیا

حفیظ آتش، امروہہ

والپسی

اب کے جب موسم بدلے گا
میں گھر کے سب دروازوں کو
اِک اِک کر کے خود کھولوں گا
باہر سے کچھ تیز ہوائیں
جانے کیا کیا لے آئیں گی
صحراؤں کی ویرانی بھی
جنگل جنگل سناٹوں کے
خوشبو اونچے کوہساروں کی
سبز درختوں کی خوشحالی
دھوپ اترتی دیواروں پر
کھلی چھتوں پر آزادی سے
موسم کے جانباز پرندے
گذرے موسم کے سارے دکھ
اک اک کر کے سب چن لینگے
اب کے جب موسم بدلے گا

"اس صدی میں"

میں بوڑھا ہوں
مری بینائی نہ دیکھیں
وہ ساری ٹھوکریں جن پر
بہت سے نام لکھے تھے عقیدوں کے
بہت سی ذلتیں، فاقے
ندامت کی سیاہ راتیں
سروں پر جنگ کے سائے
بدن بے روزگاری کے عذابوں سے پریشاں
خودکشی کو زندگی جانے
اگر اس دور کے بھی نام ہوتا
کوئی اوتار، پیغمبر
تو ایسی بددعا کرتا
زمیں پھٹتی
دہاڑے مارتے بادل
مسلسل آگ برساتے

سلوک

زمیں تو گھومتی ہے اپنے محور پہ
فلک پر گردش یکساں
ستاروں کی
چلی آتی ہے صدیوں سے
تمہیں مصلوب کرنا ہے
تو کس کے منتظر ہو ــــ؟
زباں کو کھینچ لو
اور ٹھونک دو ہاتھوں میں کیلیں
مرے اپنے ہو تم
میرے لہو کے ذائقہ کو جانتے ہو

دیدۂ آبلہ پا کو یہی رونا ہے
کہ نہ پہنچا ہو کہیں مجھ سے کسی خار کو رنج (ذوق)

کھلی اور بند آنکھوں کے خواب

نظمی صدیقی سلونوی

کھلی آنکھیں اگر رکھو
تو خواب آتے ہیں
لرزہ خیز، دہشتناک، وحشت زا
مسلسل
بربریت، بے حیائی، آبرو ریزی
سرِ بازار
قتلِ عام، اغواء، غنڈہ گردی
رہزنی، غارتگری
ایسے بھیانک خواب آتے ہیں
اگر آنکھیں کھلی رکھو
کراہیں، سسکیاں، چیخیں
جلوس و جلسہ
لاٹھی چارج، آنسو گیس
نعرے، خشت باری
گولیاں
لاشیں
پولس، کرفیو
نہ جانے کتنے ایسے روح فرسا خواب آتے ہیں
اگر آنکھیں کھلی رکھو
تو کیوں ___ آنکھیں کھلی رکھو
تو کیوں نہ موند لو آنکھیں
کہ بند آنکھوں سے ایسے روح فرسا خواب اکثر دور رہتے ہیں
کہ بند آنکھوں میں جب آتے ہیں شیریں خواب آتے ہیں
سہانے خواب آتے ہیں
مزے کے خواب آتے ہیں
تو کیا میری طرح سب لوگ آنکھیں بند رکھتے ہیں
یقیناً بند رکھتے ہیں
تبھی تو چین سے سوتے ہیں اپنی خوابگاہوں میں
تبھی تو سب کی نظروں سے یہ موذی خواب اوجھل ہیں
مگر کب تک؟
مگر کب تک ___ یہ آنکھیں بند رکھیں گے؟

دو نظمیں

ح۔ عامر
ریسرچ فیلو، شعبۂ فلسفہ
مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

(۱)

میں فہمِ سادہ
کی جہت جہت
لفظوں کی عدمِ سماعت کے
گراں خواب میں
لمحہ لمحہ تراشوں
وہ ایک گونگی
خموش دہشت،
کہاں سے اُتری
تلاش کتنے
خدا تراشے
ذرا سا احساس
کا ملگجا پن
ادھر بھی اترے
میں گھنے جنگلوں کی
اداس حدوں کو
چھو کے اب تک
وحشی پرندوں کے
پروں پہ
سجدوں کی دنیا
بسا چکا ہوں
مجھے بتا دو
اداس لمحوں کی
زباں، کہاں تراشوں

(۲)

جاگتے صحرا میں
پھول کھلے تھے
نیم وحشی
بے سائیگی کی بات تھی
رات،
قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی
آگ
کے گرد
بے جسم سائے
ناچ رہے تھے،
آوازیں
دشاؤں سے
گریزاں
سلگ رہی تھیں
ہرن کی کھال
پہ
بوڑھا سجدہ ریز
ہرن کے گوشت کی
خوشبو، سمٹ رہی تھی
رات
قطرہ قطرہ ٹپک رہی تھی

شاید کہ سر بلندی ہووے نصیب تیرے   جوں گردِ راہ سب کے پاؤں سے تو لگا رہ (میر)

آوازوں کا جشن

علی عباس امید
وشو بھون، بھوپال

اور جب زرد سورج نے
ڈھلتے ہوئے
کالے آنچل سے منھ کو ڈھکا
چار سو جل اٹھے تیرگی کے کنول
ایک محفل سجی
نیند کی جستجو میں بھٹکتی ہوئی
بجھتی آوازوں کا جشن ہونے لگا

اور پھر یوں ہوا
تیرگی کی فصیلیں کچھ اونچی ہوئیں
گرم سانسوں کی خوشبو نے انگڑائی لی
بت سنورنے لگے رنگ گڈمڈ ہوئے

اور تب
سرخ قطروں کی بارش ہوئی
اور برسات نے خامشی سے کہا
ان اندھیروں کا رخ موڑ دو
بجھتی آوازوں کے جشن کی سرحدیں توڑ دو

اور پھر یوں ہوا
چند آوارہ سائے
بکھرتے ہوئے خواب کے ننگے بازو پہ سر رکھ کے رونے لگے
اور پھر سرخ قطروں کی چٹان سے
کھاری پانی کے چشمے ابلنے لگے
بھیڑ کے اس سمندر میں لفظوں کا اک قافلہ
آکے ٹھہرا فقط چند لمحوں کو اور اسکے آنسو لئے
بہہ چلا اس طرف
کھاری پانی کی موجیں جہاں
زندگی کا کنول لیکے اٹھکھیلیاں
کرتی پھرتی ہیں از شام تا بہ سحر
اور میں بجھتی آوازوں کے جشن کو!

آج بھی دیکھ کر
سوچتا ہوں
مرے روبرو دکھ کا ساگر ہے
اس کی کوئی حد نہیں ہے ۔۔۔ کوئی حد نہیں
پھر بھی میں عہد کرتا ہوں ــــــ
اس جشن کی آخری داستاں
مجھ کو لکھنی ہے، لکھوںگا ۔ اب خواہ اس کے لئے
پھر سے مجھے
زرد سورج کے چہرے سے آنچل ہٹانا پڑے

کیکٹس

گلاب میں نے اگائے تھے دوستی کے مگر
خبر نہ تھی کہ معیت میں خار اگتے ہیں
میں خوش تھا دیکھ کے شادابیٔ گلِ رنگیں
وفورِ شوق میں چاہا کہ چھو کے بھی دیکھوں
لہولہان ہوئیں ساری انگلیاں اپنی
چھپے گلاب میں کانٹے تھے چبھ گئے سارے
یہی سبب ہے کہ اب کیکٹس اگاتا ہوں
کہ یہ فریب کسی کو کبھی نہیں دیتے

تاج پیامی
دارالادب مہا پور محلہ آرہ، بہار

پیش آ تعظیم سے جو سب جھکیں تیری طرف ۔۔۔ کون پھر سجدہ کرے جو خم ہو محراب میں ظفر

انکشاف

نفس کو حرص و ہوس سے دور رکھکر
دیکھتا ہوں زندگی کے حسن کی نیرنگیاں
اوراس کے بادۂ صد کیف میں سرشار ہوں
ہر مسرت ہر خوشی
گوش و نظر کی دین ہے
نقرئی پازیب و نغمہ
بربط و چنگ و رباب
بزمِ گیتی کی سجاوٹ
بزمِ ہستی کا شباب
عالمِ بالا سے
اور مافوق فطرت سے نظر اپنی ہٹا کر
جھانکتا ہوں جب بھی اپنی ذات میں
منکشف مجھ پر ہوا ہے
میں کہ کٹھ پتلی نہیں ہوں
میں نہیں مافوق فطرت کا غلام
بلکہ خود مختار ہوں !

زاہد کمال ، پونہ

خودشناسی

میری تکمیل نہیں ہوسکتی
تشنگی بجھ نہیں سکتی میری
جسم کے گھاؤ تو بھر جاتے ہیں
روح کے زخم نہیں بھر سکتے
پھول بن کر یہ نکھر جاتے ہیں

روز کرتی ہے تعاقب میرا
یہی خوشبو میرا سرمایہ ہے
اسی خوشبو کے سہارے اک دن
اپنے بکھرے ہوئے اجزاء چن کر
ماورا کے سبھی دروازوں کو
کھول کر خود میں سما جاؤں گا

• احمدی اپارٹمینٹ
۷۰۰ ، گرودار پیٹھ (نیو)
پونہ - ۲ -

لاکھ اونچی سہی اے دوست کسی کی آواز اپنی آواز بہر حال ہے اپنی آواز (زاہد کمال)

ڈاکٹر امانت ، ایم اے پی ایچ ڈی

اورنگ آباد

تمہارا شہر ہے کچھ اجنبی سا میرے لیے
مرے وطن کی طرح ہے مگر خمار آگیں

تمہیں یہ ناز کہ اورنگ زیب رہتا تھا
مجھے عزیز کہ ہے مرکز سخن یہ زمیں

سراج اور ولی کی روایتوں کے لیے
سلیم[1] و وحید یہاں، عصمت و مجید یہاں

خدا کرے یونہی گل بار و گلفشاں یہ رہیں
دکن میں پھولتی پھلتی رہے ہماری زباں

(۲۰ اپریل ۱۹۸۲ء کو اورنگ آباد میں فی البدیہہ لکھے گئے)

---

[1] جناب قاضی سلیم، سکندر علی وجد، ڈاکٹر عصمت جاوید، اور پروفیسر مجید بیدار۔

⊙ صدر شعبۂ اردو فارسی، واڈیا کالج پونہ

مجھے شک ہے
کہ تم نے ایک دن مجھ کو
صدا دے کر سرِ بازار روکا تھا
مجھے شک ہے
کہ تم نے دیر تک اس دن
مری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھ سے
کئی باتیں کہی تھیں
مجھے شک ہے
کہ تم نے یہ کہا تھا۔ تم
مری غزلیں، مری نظمیں
رسالوں میں، جریدوں میں
ہمیشہ پڑھتی رہتی ہو
تمہیں میرے کئی اشعار ایسے یاد ہیں جیسے وہ
تمہارے دل کی دھڑکن میں دھڑکتے ہیں
لہو میں مل کے رگ رگ میں تمہاری رقص کرتے ہیں
تمہارے ہونٹ ان کے لمس کی شدت سے جلتے ہیں
____ تمہیں ان ساری باتوں سے اگر انکار ہے تو تم
پریشاں اس قدر کیوں ہو
کہ شک تو صرف شک ہوتا ہے
بے بنیاد ہوتا ہے

امان اختر

P.A.O - (OR), B.E.G,
کھڑکی - پونے - ۴۱۱۰۰۳

تو دل میں آتا ہے پہ [illegible] میں نہیں آتا　　بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے　(اکبر الہ آبادی)

سالِ نو سے خطاب

دلدار ہاشمی
۶۴، ایروڈا پونہ - ۶

سالِ نوا تو ہی بتا تجھکو میں کیا پیش کروں
رنگ کلیوں میں نہیں، پھولوں میں خوشبو بھی نہیں
مُشک تو مُشک ہے امکانِ اک آہو بھی نہیں
کوچۂ دل میں کہیں کوئی چراغاں بھی نہیں
اور پلکوں پہ ستارہ کوئی لرزاں بھی نہیں
پیٹ کی بھوک مٹے جس سے وہ ٹکڑا بھی نہیں
دے سکوں تجھکو میں ایسا کوئی تحفہ بھی نہیں
سالِ نو تو ہی بتا ....

بھوک، بے کاری کا زہراب ہے چاروں جانب
ناگ، مہنگائی کا ڈستا ہے یہاں جیبوں کو!
اونچی دکان کے شوکیس پہ نظروں کا ہجوم
اور گلیوں میں سلگتی ہوئی غربت کا دھواں
سالِ نو تو ہی بتا ....

جن کی محنت سے جلا کرتے ہیں محلوں میں چراغ
انکی کٹیا میں اندھیروں کے سوا کچھ بھی نہیں
حالِ مزدور پہ رہ رہ کے ترس آتا ہے
کون ہے ان کا مسیحا جو بچائے آخر!
خونِ مزدور کی رگ رگ سے بہا ہے لیکن
سالہا سال سے یہ ظلم روا ہے اب تک
سالِ نو تو ہی بتا ....

امن مفقود ہوا، خوف نے آنکھیں کھولیں
بھائی نے بھائی کے سینے پہ چلایا خنجر!!
اب بھی موجود ہے انسان میں شیطان کی خو،
اونچ اور نیچ کی خندق میں پڑا ہے اب بھی!
ابنِ آدم کے تنزّل کی کہانی سن کر
خونچکاں دل ہے مرا، روح بھی زخمی ہے مری!!
سالِ نو تو ہی بتا ....

نذرِ آتش ہوئے کتنے ہی غریبوں کے مکاں!
کتنے ارمان جلے کتنے بھرم خاک ہوئے
کتنی ماں بہنوں کی عصمت کے ہوئے تھے سودے
کتنی مانگوں سے سہاگوں کی چمک اجڑی تھی
کیا تجھے سالِ گذشتہ کے ستم یاد نہیں
نام لے لے کے ترا کتنوں نے دم توڑ دیا ——
ایک مٹی کا دیا تک بھی جلایا نہ گیا ——
انکی لاشوں کو کفن میں بھی چھپایا نہ گیا ——

سالِ نو تو ہی بتا . . . .

جب سے اپنایا   قلبِ مایوس میں خوشی دیکھی (دلدار ہاشمی)

قومی ایکتا

اظہار مت سر

ملک آزاد ہوئے ہوگئے چونتیس برس
تب ہمیں آیا ہے یکجہتیٔ قومی کا خیال
کتنی غفلت میں تھے ہم لوگ کہ ہمکو ابتک
اس قدر اہم ضرورت سے سروکار نہ تھا

ہم نے اس ملک کی تاریخ پڑھی ہے یارو
اپنے مہمانوں کی خاطر میں وطن کی یہ زمین

قرن ہا قرن سے خندا لبہ ہے مثال مادر
آکے بستی ہی رہی ہیں یہاں بیہم اقوام
مختلف پھولوں کی خوشبو سے چمن مہکا ہے
مادرِ ہند کی یہ شان قدیمی ہے مگر
مذہب و فرقہ و تہذیب و زباں کی تفریق
اب سے پہلے تو کبھی باعثِ تشویش نہ تھی

ملک کیا پنجۂ اغیار سے آزاد ہوا!
ہوگئے خلق و مروّت ہی سے عاری ہم لوگ
خواب سوراج کا باپو نے جو دیکھا تھا کبھی
دورِ حاضر تو ہے اس خواب کی الٹی تعبیر

ہم سے امیدیں بہت نہرو و آزاد کو تھیں
ہم مگر کچھ بھی نہیں قوم پشیماں کے سوا
فرقہ وارانہ تعصب کے اندھیر ولنے ہمیں
آنکھیں رکھتے ہوئے نابینا سا کر ڈالا ہے

آئے دن ہم نے فسادوں کو ہوا بخشی ہے
پیار چھینا ہے تنفر کی فضا بخشی ہے
رنجش و بغض کی خو حد سے سوا بخشی ہے
حد تو یہ ہے کہ سرِ عام فضا بخشی ہے
عید کے دن کو محرم کی ادا بخشی ہے

اس پہ بھی دعویٰ ہے یکجہتیِ قومی کا ہمیں

ہاں مگر دعویٰ ہے گر صادق و بے شبہ تو پھر
آیئے ماضی کی تاریخ بدل دیں ہم لوگ

صبح کا بھولا اگر شام بھی گھر لوٹ آئے
لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص کو بھولا نہ کہو

شکر صد شکر کے چونتیس برس بعد تو ہم
محرمِ فکر بنے صاحب احساس ہوئے

قومی یکجہتی کو اب عام کریں گے ہم لوگ
گر دیانت ہی پہ مبنی ہے یہ اعلان تو پھر
آیئے ملک کو خوش حال بنانے کے لئے
قوم کو راہِ ترقی پہ چلانے کیلئے
باہمی میل محبت کو بڑھانے کے لئے
امن کی مشعلیں دنیا کو دکھانے کے لئے
رہبر قوم نے اک کام دیا ہے ہمکو
قومی یکجہتی کا پیغام دیا ہے ہمکو

آیئے عہد کریں آج بعد عزم و خلوص
قومی یک جہتی کو اب عام کریں گے ہم لوگ

۱۴۴۴ - رام گنج بازار جے پور ۳۰۲۰۰۳

اختلاف در "من" و "او"

کیوں میری انگلیوں میں پھنس نہیں پائیں، وہ انگلیاں آخر
کیوں میری سانسوں میں گھل سکتی نہ تھی، اس زلف کی بے تاب مہک
کیوں میرے ہونٹوں کو جھُلسا نہیں پائے وہ دہکتے ہوئے عارض وہ جبیں
کیوں میری پیاسی تمنا پہ
برس پائے، نہ اُن آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے امید کے کالے بادل
مجھ کو معلوم ہے کیونکر وہ میرا ہو نہ سکا
یوں نہیں تھا، کہ محبت کی للک سے اسے پرہیز رہا
یوں نہیں تھا، کہ جوانی کا نشہ،
اسکی آنکھوں کو نہ کر پایا تھا، مدھم، بوجھل
یوں نہیں تھا، کہ اُمڈتے ہوئے جذبات، بے آواز رہے
یوں نہیں تھا کہ سسکتے ہوئے نغمات کو ہونٹوں نے دبوچے رکھا
پھر بھی وہ میرا نہیں ہو پایا
مجھکو معلوم ہے کیونکر وہ میرا ہو نہ سکا
کانچ کی دیواروں میں برسوں قید رہی اک شہزادی
برسوں کی اس قید میں یکسر
کانچ کی دیواروں نے اس پر "چھوت" کی دھونی برسائی
کانچ کی بولی ۔ کانچ کے گیت
کانچ کے جلوے ۔ کانچ کے خواب
کانچ کی مورت کے پیروں سے کچلا گیا
اس کے سینے میں بل کھاتا "مانس کا گولا"
"کانچ کے زہر نے اسکی رگوں میں بہتی خون کی دھارا کو بھی
کانچ کے رنگ میں رنگ لیا"
کانچ کی تہذیبوں نے اس کو "موہ" لیا"
"کانچ کی تقدیسوں پر اسکی
کانچ کی نظروں نے سجدوں کے پھول چڑھائے"
کانچ کی پوجا اس کا مذہب ۔ کانچ کی رکشا اس کا تمدن
کانچ کی "دیواروں" میں برسوں "قید" رہی اک "شہزادی"
کانچ کے "محل" میں "بیٹھی" ہوتی ہے "کانچ کی دیوی"
مجھ میں پوشیدہ ہے، تہذیب و روایات سے نفرت کی آگ
مجھ سے ممکن نہیں، انسان کی تفریق کو، قدرت کی مصلحت سمجھوں

کنوے کی ڈور برہمن کی ملکیت سمجھوں
مجھ سے ممکن نہیں، اس نظم و عمل کی تائید
آسماں، بجلیاں، بادل کی پرستش میں مٹے گھٹنوں سے
پھوٹے ہوئے زخمی پودے
کھیت میں رنگ بھرے، سونا اگائے
تخت کا حافظِ فرمان
اُسے کاٹ
شہنشاہی گداموں کی خلائیں پاٹے
مجھ سے ممکن نہیں، اس دورِ کہن کی تجدید
"حل" کی تہذیب کی زنجیر میں نے کاٹی ہے
ان شہنشاہوں کی عظمت
میری آزادی کو پابندِ وفا کر نہ سکی
میں لپکتے ہوئے "چکر" پہ سوار
چاند کو روند کے
مریخ کی طرف ہے میرا عظیم سفر
میں نئے دور کا سپاہی ہوں
مجھ میں پوشیدہ ہے
تہذیب و روایات سے نفرت کی آگ
'بھوک' ہے اک قدرت کی "دین"
پیٹ کی بھوک ۔ ذہن کی بھوک ۔ جسم کی بھوک
بھوک پہ آخر پابندی کیوں!
بھوک ہی میری دولت ہے
اسکی تسلی میری محنت، اسکی تشفی میرا حق
بھوک ہی میرا 'جیون' ہے

سید آصف
۱۲۹۶ قصبہ پیٹھ - پونا-۲

زندگی آ تجھے قاتل کے حوالے کردوں   مجھ سے اب خونِ تمنا نہیں دیکھا جاتا (شکیل بدایونی)

جیون پہ پابندی کیوں
'روئی' کھیت میں اگتی ہے ۔ کپڑا 'مل' میں بنتا ہے
کھیت کا ہل اور مل کی مشینیں!
میں نے ہی قدرت کی قاش سے لوہے کا انبار رچایا
بھٹی میں پگھلا کر اسکو جیسا چاہے روپ دیا
میری محنت نے ہی سارے اوزاروں کو جنم دیا
'پن' سے لیکر 'ٹیلی وژن' تک میری محنت کا جادو ہے۔
یہ 'کاریں'، یہ 'بنگلے'، یہ 'ٹی.وی.'، یہ فریج،
رنگا رنگ دمکتے ہوٹل۔ مدماتے لہراتے بار۔
ان ہونٹوں کی لالی ۔ ان آنکھوں کا کاجل
ان ہاتھوں کے کنگن ۔ ان پیروں کی پائل
محنت نے میرے ماتھے سے بوندے، بوندے، ٹپکا کر
ان کو نکھرا ہے، روپ دیا ہے
لیکن میرے ہاتھ میں اب بھی بھوک کا 'کاسہ' چیخ رہا ہے۔
میرا آخر کیا انجام؟
دیکھ رہا ہوں
پورے سماج میں پھیلی ہوئی ہیں دو ریکھائیں
پہلی ریکھا کے اس اور
نئے 'سمراٹ' براجمان ہیں
محنت کے پیدا کردہ دھن پر ہے اپنا ہاتھ جمائے
پہلی ریکھا کے اس اور، دوسری ریکھا کے بیچ
'وہسکی' کی بوتل کے نیچے رکھا ہوا ہے 'دیش' کا نقشہ
اپنے سمراٹوں کی خوشحالی کی فکر میں
تین پانچ کا دھواں اڑاتے ۔ صوفہ سیٹ میں پھیلی ہوئی ہے
کچھ جانے، کچھ پہچانے 'چہروں' کی نمائش
'دیش' کے راہبروں کا 'جھنڈ' ۔ 'نیائے' دھنوں کے 'مسن'
'ودیا پیٹھ' کی 'چوکھٹ' ۔ پروفیسروں کا 'جھرمٹ'
'سائنس دانوں' کا 'میلا' ۔ 'اخبار نویسوں' کا 'کہرام'
شیئر بازاروں کی حرکت ۔ سوداگروں کی چالیں
و 'جنتس'، 'دیتا آل'، 'سنتیہ سائی' کی اڑانیں
"دھن کے نرماتاؤں کو
قسمت کی 'کھاٹ' سے باندھ کے، ہر دھنتا کا کارن بتلانے
دکھ کی دلدل سے ہی

گم گئے ہیں 'تیجسوی آتماؤں' کے چاند، کنول
یہ راز کی باتیں سمجھانے"
بیٹھی ہوئی ہے سرمایہ داروں کے 'دلالوں' کی
اک چانڈال چوکڑی،
دوسری ریکھا کے اس اور
تیسرا حصہ پھیل رہا ہے ساری دنیا گھیر رہا ہے
مزدوروں کی ہڑتالیں ۔ دہقانوں کی مجلسیں
کلرکوں کے ماتھے کی سلوٹ، ٹیچرس کے جیبوں کے پیوند
اسکولوں پہ سناٹے ۔ بکھرے بالوں پر سیلابیں
کلبو۔ دار کے گیتے ۔ طوائفوں کے کوٹھے
'خالی پیٹ' کی 'تہذیبوں' کی یہ تفسیریں!
تیسرا حصہ پھیل رہا ہے ساری دنیا گھیر رہا ہے
ہم کو تہذیب و روایات کے پھندے میں پھنسا کر کچھ لوگ
جما گئے ہیں
زمینوں پہ، مشینوں پہ، خود اپنا قبضہ
'راج ستا' کی دوڑ ہتھیا کر
خود شہنشاہوں کی عظمت کی روایات کے مختار بنے بیٹھے ہیں
فیکٹریوں کے وہ 'آقا'۔ وہ 'زمینوں کے خدا'
ہم بھی خالق ہیں
مگر درد کے، افلاس کے ۔ تذلیل کے خالق ہیں ہم
ہم کہ مٹی سے اُگا سکتے ہیں ہیرا موتی
لیکن اپنے لئے اک روٹی نہیں بن سکتے
ہم کہ روئی کے کچے بونڈوں سے
پاپلین کرتوں کا۔ ٹیریلین شرٹوں کا، اک ڈھیر رچا سکتے ہیں
اپنی چڈی کے مگر چاک نہیں سی سکتے
ہم فلک بوس عمارت کی چھتوں تک تو پہنچ سکتے ہیں!!
لیکن اپنے کھلے سروں کیلئے
چھپروں کی کمانیں تان نہیں سکتے ہیں
ہم مشینوں میں گوشت لپوا کر
نیل پالش کی چمک ۔ لپ اسٹک کی بہار۔ سینٹ کی خوشبوؤں سے
چند لوگوں کے لئے ۔ رومانس کی دنیا تو سجا سکتے ہیں
اپنے محبوب کے ہونٹوں کا مگر
ایک ہلکا سا تبسم بھی نہیں بن سکتے

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی (مومن)

کس نالی پر چھپت باندھے
کون سے مکتب میں جائیں۔ کن درجوں تک تعلیم کی بھیک کا فیض اٹھائیں
کب مزدوری پائیں۔ کب بے کار رہیں
کب سانسوں کی ڈور بڑھائیں۔ کب سانسوں سے توڑے ناطہ
کس کو من کا میت بنائیں۔ کس سے دل کی بات کہیں
دوسری ریکھا میں بیٹھی
چانڈال چوکڑی کے آدیشوں پر نر بھر ہے
تیسرے حصہ کا جیون
تیسرے حصہ کی وہ بھوک
پیٹ کی بھوک ۔ ذہن کی بھوک ۔ جسم کی بھوک
تپتے سورج سے حرارت لیکر
خون کی بھٹی میں۔ لپسینہ گھول کے۔ ٹوٹتے جسم کو
لوہے کی چادروں میں لپیٹا میں نے
اور لوہے کے ہتھوڑے پہ ٹیک کر ماتھا
میں نے کھائی ہے قسم
پیٹ کی آزادی کی۔ ذہن کی آزادی۔ جسم کی آزادی کی
جانے کب انجانے میں
انجان سفر میں۔ انجانے دوراہے پر
کانچ کے محل کے
کانچ کے دروازے پر لوہے کے ہاتھوں نے دستک دی

کانچ کی نظروں سے پھوٹی تھیں، کانچ کی کرنیں
کانچ کے بربط پر لوہے کے تاروں کی جھنکار اٹھی

جسم کی بھوک پکار اٹھی!
یوں نہیں تھا کہ اسے جسم کی اس بھوک سے انکار رہا
یوں نہیں تھا کہ وہ شیشہ پیکر
میری ان آہنی باہوں میں جکڑ جانے کو بیتاب نہ تھا
پھر بھی وہ میرا نہیں ہو پایا
مجھکو معلوم ہے کیونکر وہ میرا ہو نہ سکا
آہن و شیشہ کا متضاد ملن
ایک کا ٹوٹنا یقینی تھا
اور اس کانچ کی دلوی کو
میرے
آہنی جسم سے شیشے کا بدن پیارا تھا
کشمکش کا یہی عالم تھا کہ سورج نکلا
کانچ کے دروازے پہ لگے تھے کانچ کے تالے
لوہے کے قدموں کے آگے پھیلی ہوئی تھیں
تپتی ہوئی لوہے کی راہیں
چڑھتے سورج جنگ کے بادل کھا بیٹھا تھا
لوہے کا شیشے سے ناطہ ٹوٹ چکا تھا

جس طرف مجمعِ احباب کھڑا تھا جاتی   ہم پہ آئے تو اُسی سمت سے پتھر آئے   (جاتی حیدرآبادی)

صحرا کی دعا

شاہد میر، گورنمنٹ کالج بانسواڑا (راجستھان)

اے ابرِ گریزاں اے ابرِ گریزاں
ہر لحہ رواں ریت کے منظر نہیں دیکھے
سینوں میں پنپتے ہوئے محشر نہیں دیکھے
تو نے کبھی آنکھوں کے سمندر نہیں دیکھے

اے ابرِ گریزاں ....

پژمردہ و افسردہ ہیں اشجار ہر اک سمت
سوکھے ہوئے پتوں کے ہیں انبار ہر اک سمت
مٹنے کے بکھر جانے کے آثار ہر اک سمت

اے ابرِ گریزاں ......

اک قطرۂ شبنم کو ترستی ہوئی دھرتی
تا حدِ نظر دھوپ میں تپتی ہوئی دھرتی
چبھ جاتی ہے آنکھوں میں سسکتی ہوئی دھرتی

اے ابرِ گریزاں ....

دیوانوں کا اسبابِ جنوں چوس لیا ہے
بکھرے ہوئے رنگوں کا فسوں چوس لیا ہے
سورج نے ہر اک شاخ کا خوں چوس لیا ہے

اے ابرِ گریزاں.....

کیا جانے یہ انعام ملا کس بدی کا
سوکھا ہوا رہتا ہے سدا جسم ندی کا
اک لمحے میں کہرام ہے اک ایک صدی کا

اے ابرِ گریزاں ....

دل میں نہیں ہوتی ہے کسی بات کی ہلچل
پیاسا ہے کئی دن سے خیالات کا جنگل
اک دشتِ بلاخیز ہی کر دے کبھی جل تھل

اے ابرِ گریزاں.....

جھلسے ہوئے تپتے ہوئے غنچوں کو ذرا دیکھ
سہمی ہوئی جلتی ہوئی کلیوں کو ذرا دیکھ
کس درجہ تہی دست ہیں پھولوں کو ذرا دیکھ

اے ابرِ گریزاں ....

آ اور اجڑتے ہوئے گلشن میں ٹھہر جا
پانی کو ترستے ہوئے آنگن میں ٹھہر جا
اک فصل کے سوکھے ہوئے دامن میں ٹھہر جا

اے ابرِ گریزاں ...

ہو جائے گا ہریالی کا ہر خواب درخشاں
اے پیاس کی ماری ہوئی بستی کے نگہباں
اس ریت کے صحرا میں بھی ہو جا کبھی مہماں

اے ابرِ گریزاں ....

قربت تری ہر سمت کھلا دیگی گلستاں
شفقت تری خوش رنگ بنا دیگی بیاباں
نسبت تری شاھد کو بھی کر دیگی غزالخواں

اے ابرِ گریزاں ... . اے ابرِ گریزاں ... اے ابر...

۱؎ عنوان حفیظ جالندھری سے مستعار ہے۔

الجھنے ہی نہیں دیتی ہمیں مایگی دل کی ، نہیں تو کون قطرہ ہے جو دریا ہو نہیں سکتا (چبتا)

رُخ بہ رُخ

سُرخ منڈی!
ہرا تیل !!
پیلی کھنک !!!
— تین صفحوں کا اخبار ہے زندگی
اشتہارات کی بھیڑ میں چاندنی
اپنی پازیب کی جھنجھناہٹ پہ روتی ہوئی روشنی!
ایک اک لفظ بے رنگ کی پیکریت چھپوانے پہ معمور ہے۔؟
عکس جتنے بھی ننگِ بصیرت ہیں، سب، !
صاف کرکے دکھانے پہ مجبور ہے !!!

کیوں دہائی نہ دوں اے شکستِ نظر۔؟
آسماں لفظ ہے اور کچھ بھی نہیں،
لفظ خود اک علامت ہے تفہیم کی
— شرم گاہیں چھپانے کی ادنیٰ اسی شئے کے سوا اور ....
کیا نام دوں عقل کو۔
آگہی، خود فریبی، خرابے کی جڑ!
جس کی بنیاد، مفروضہ ہے اور کچھ بھی نہیں،
اور جب! — مدتوں کی اُلٹ پھیر کے بعد بھی،
چاندنی کچھ نہیں،
روشنی کچھ نہیں،
آگہی کچھ نہیں۔
سُرخ منڈی — ہرا تیل — پیلی کھنک !
تین صفحوں کا اخبار ہے زندگی .... •

رشید اعجاز
۹۸۳، بھوانی پیٹھ پونا ۲۔

اِن دنوں

نبض داری سے،
تھکن ہے، نیند کا رشتہ سہی،
ان دنوں آرام دہ بستر پہ میرے
ایک چنگاری پھدکتی پھر رہی ہے۔
میرے اپنے ہی شبستاں میں کہیں جائے اماں باقی نہیں ہے
سرد برفیلی ہوا، دہلیز سے باہر نکلنے کی اجازت بھی نہیں دیتی مجھے
رات بھر کھڑکی سے
کچھ جانے کچھ انجانے ستارے دیکھتا رہتا ہوں میں
اِن دنوں اک کیفیت ہے،
ٹمٹماہٹ جانے انجانے ستاروں کی سناتی ہے مجھے
اک مژدہ، سرسراتا ہے عجب چاروں طرف!
اور پھر محسوس ہوتا ہے کہ آتا ہے کوئی میرے لئے!
سب کے لئے !!!
خون کی حرمت کی خاطر!!
یعنی پس ماندہ پسینے کے لئے!
اِن دنوں ہاں ہاں اِن دنوں!! ہاں ان دنوں،
میں نے ساری عمر کی پونجی لگاکر،
جگمگاتے تین پتھر،
قیمتی ہیرے،
خریدے ہیں کہ نذرانے کی صورت،
آنے والے نور کے قدموں پہ رکھدوں
اپنی آبائی عقیدت!!!
اور — میں
ایک روشن خواب کی امید پر جاگا ہوا
چالیس سالہ نقشِ آدم
اس طرح ہار کے سوجاؤں کہ پھر
جنم لینے کی کوئی حسرت نہ باقی رہ سکے!

ڈائری دیکھ کے ملتا ہوں شناساؤں سے — حافظہ جیب میں رکھتا ہوں جدھر جاتا ہوں (رشید اعجاز)

سہیل عظیم آبادی

جب کوئی اک شہر
روشنی کی آماجگاہ بنے
آنکھوں کو خیرہ کر رہے تھے
اور دور
پتلی پتلی پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا
ایک شخص گاؤں پہنچا
دیکھا کہ!
بہت سارے لوگ
"الاؤ" کے گرد بیٹھے ہیں
ان کے چہرے
"بھوک" سے مرجھائے
بے چہرگی کی علامت بنے ہیں
اس کے اندر
سسکیوں کا
آہوں کا
خواہشوں کا
مچلتا ہوا اک سمندر
کہ اب مر رہا ہے!
وہ چونکا ـــ ؟

گاؤں کی پگڈنڈیوں سے
غموں کی گٹھری سمیٹے ہوئے
شہر کی جانب آیا
دیکھا
رشتے اب
"ٹوٹے دھاگوں" میں
تبدیل ہو رہے
شہروں کی روشنی میں
چہروں کو دیکھا تو
وہ بھر بھرا سا گیا
آنکھیں نمناک سی ہو گئیں
اور اس کا قلم
کہانی کے تانے بانے بننے لگا
مگر آج وہ!
کہانی کا پرتو بنا
اور سو گیا
لیکن کہانی خلاؤں میں
منڈلا رہی ہے!!!

بوندیں

مٹی کا دامن تھامے
دھاروں میں ڈھلتی
پربت کی ان اونچی نیچی راہوں پر
ڈگ مگ ڈگ مگ بہتی بوندیں
کل دریا بن جائینگی۔
پھاڑیں گی دھرتی کا سینہ
گاؤں، شہر، بن
میلوں پھیلا بھرا پرا دھرتی کا کنبہ
ان ہی کے ہاتھوں اجڑے گا
ٹوٹے پھوٹے کٹے کنارے
دھرتی کا بے جان بدن،
روند کے اپنے قدموں سے
یہ بوندیں آگے جائیں گی!

محمد اسداللہ

جو حریم دل میں نہ جل سکا میں وہ بدنصیب چراغ ہوں

نہ تری نظر کا سوال ہوں نہ تری نظر کا جواب ہوں
کبھی ٹوٹ کے جو بکھر گیا میں وہ ایک شیشۂ خواب ہوں

نہ کسی بہار کا حسن ہوں نہ کسی چمن کا شباب ہوں
کسی شاخ سے جو بچھڑ گیا میں وہ آرزو کا گلاب ہوں

مری زندگی ہے رواں دواں کہ میں زندگی کا خیال ہوں
کبھی بے خودی کی دلیل ہوں کبھی میں خودی کی مثال ہوں

غمِ زندگی کا ہوں ترجماں نئی زندگی کا کفیل ہوں
جو کتابِ فکر کی جان ہے میں وہ ایک حرفِ جمیل ہوں

کہیں کاروبارِ شعور ہوں کہیں فکرِ نو کا پیام ہوں
جسے اہلِ دل نہ سمجھ سکیں وہ طلسمِ شوق کا نام ہوں

مجھے مسکرا کے نہ دیکھئے کہ وفا کے سینے کا داغ ہوں
"جو حریم دل میں نہ جل سکا میں وہ بدنصیب چراغ ہوں"

میں وقارِ فکر و شعور ہوں میں کمالِ عزم و ثبات ہوں
جو بلندیوں کی امین ہے میں وہ کائنات حیات ہوں

نئی منزلوں سے ہوں آشنا نئی روشنی کا نقیب ہوں
مجھے زندگی سے نہ کر الگ کہ میں زندگی کا خطیب ہوں

کہیں فکرِ نو کا ہوں دائرہ کہیں شعر و فن کی بساط ہوں
جو غمِ حیات کی جان ہے میں وہ کائناتِ نشاط ہوں

کبھی رفعتوں کا پیام ہوں کبھی عظمتوں کا سفیر ہوں
مری کیا نظیر بنے کوئی کہ میں آپ اپنی نظیر ہوں

رہِ اعتبار میں شوق کا بڑا کامیاب حریف ہوں
میں نگارِ صبحِ جمال ہوں میں ادائے وصفِ لطیف ہوں

طیبہ النساء نگار سہارنپوری

تم اور میں

ڈاکٹر ضمیر الحق ضمیر میرٹھی

گھومتا ہے مری آنکھوں میں ترا عکسِ جمیل
اب بھی ہر لمحہ ستاتی ہے تری یاد مجھے
میں کہ جتنا ترے احساس سے کتراتا ہوں
اور بھی اتنا ہی آتی ہے تری یاد مجھے

میری محبوب تجھے علم نہیں ہے شاید
آج کس طرح مری زیست بسر ہوتی ہے
بستر درد پہ ہر لمحہ گذرتا ہے مرا
اب تو کانٹوں پہ ہر اک شب کی سحر ہوتی ہے

تیری قسمیں، ترے وعدے، ترے عہد و پیماں
عہدِ ماضی کی کہانی کے سوا کچھ بھی نہیں
اپنی ہستی پہ مجھے آج گذرتا ہے گماں
عہدِ عشرت کی نشانی کے سوا کچھ بھی نہیں

گامزن آج بھی ہوں میں تو انھیں راہوں پر
جن کو بخشا تھا کبھی نورِ صداقت تو نے
آج بھی میں تو مقید ہوں انھیں لمحوں میں
میری محسن جنھیں بخشی تھی رفاقت تو نے

عہد و پیمان ترے گونجتے رہتے تھے جہاں!
کس قدر آج ہے سونا وہ محبت کا نگر!
نقش قدموں کے ترے اب بھی فروزاں ہیں جہاں
منتظر آج بھی تیری ہے وہ ہر ایک ڈگر!

جب بھی آتا ہے ترے ترکِ تعلق کا خیال
چین و آرام سے اس لمحہ نہیں سو سکتا
مجھکو تقدیسِ محبت کا بھرم رکھنا ہے
میں کسی طور بھی چاہوں تو نہیں رو سکتا

تو نے صد حیف مجھے لا کے کہاں چھوڑا ہے
کہ شب و روز جہاں غم کی شرر باری ہے
زندگی درد کا پیکر نظر آتی ہے جہاں
تیرے بن زیست جہاں مجھ پہ بہت بھاری ہے
اب تو للہ مری زیست درخشاں کر دے
آتشِ ہجر کو گلزار بداماں کر دے

۳۴۹۔ بساڑی گیٹ
بھمیا کا پل میرٹھ

محبت صلح بھی، پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے (جگر)

نقش

عطار مہر زوالفقار
اردو جونیئر کالج آف ایجوکیشن
پونہ کیمپ

بوسیدہ حالات پہ تھقانے لگے
وحشتیں اور ویرانیاں دیکھ کر
سنگِ مرمر کی دیواریں گویا ہوئیں
اور بہاروں کی غمازی کرنے لگیں
دیکھتے دیکھتے مغربی اک دریچہ کھلا
اور جھونکا ہوا کا ذرا نم ہوا
رنگ بدلے ہوائیں چلیں
پھر گھٹاؤں کا سایہ
اندھیروں کی دھڑکن
تھا غربی ہیولیٰ
حقائق کا رہزن
لیے تھی وہ پہنائیاں
حقارت کی سہمی رعنائیاں
سرخ تہذیب کا اپنا بہایا لہو
سرفروشوں نے
ٹوٹتا ہی گیا خوشنما سا بھرم
راز روشن ہوا
پھر سمٹنے کرن
چند آزادیاں
چند خوشیاں لیے
گھل گئی سارے اجسام میں میٹھی میٹھی چبھن
اور جب
زورِ خوش فہمیوں کا بڑھا
جائزہ
رمزِ خود اعتمادی انا کو دغا دے گیا
روشنی بک گئی
محلِ جمہور پہ
راج ویرانیوں کا ہوا
اور پھر
چیخیں چنگاڑوں کی ابھرنے لگیں

راج ویرانیوں کا ہوا
اور پھر
چیخیں چنگاڑوں کی ابھرنے لگیں

اوڑھ اقدار تو، اے عروسِ ادب   تجھ کو اہلِ قلم زیولاتے لگے (عطار مہر)

قوسِ قزح حلقۂ بازو

ترے خلوص نے کل شب
جو تھوڑی لو دی دی
گماں ہوا کہ میں
قوسِ قزح سے لپٹا ہوں
مرے وجود میں
تکمیل موجِ رنگ ہوئی

کبھی لگا کہ فرشتے
پروں پہ لیکے مجھے
چلے ہیں کاہکشاں کی
حسین وادی میں
تمام رنگ کا طوفاں ہے
نور کی موجیں
میں رنگ و نور کی موجوں میں ہوں
بہایا ہوا
تو میرے حلقۂ بازو میں ہے
سمایا ہوا

لاجونتی

مری زندگی کا
یہی المیہ ہے
کہ میں
اپنے اندر سے باہر
ترا نام بھی
اپنے ہونٹوں پہ لاؤں
تو دنیا ہنسے گی
کہ تو
لاجونتی کی
نازک کلی
اور میں
ریگ زاروں کی
جلتی ہوا
تجھے اور کھلنا
مجھے اور جلنا!

سید احمد شمیم

انتشار

خوشبو رچی تو جی اٹھے
آہٹ سے آنکھ کھل گئی
آواز احتیاط کی دیوار ڈھا گئی
احساس کہ چل پڑا خوابوں کی راہ پر
اک عمر تک یہ دور رہا بے خودی رہی
خود اپنے آپ فخر سے یوں مطمئن رہے
جیسے کہ ہم کو دولتِ کونین مل گئی
دو ہی قدم چلے تھے بھرم سارا کھل گیا
ہے زندگی کہاں؟
یہ ہے بوندوں کا سلسلہ
جانے کہاں سے رستے ہے کوئی پتہ نہیں!!
اندھی نگاہ بت بنی
آواز کو نشاں بنا
ڈھونڈتی رہی
لیکن کہاں... کہ دکھ کے سمندر میں بوند بوند
کھو چکی کہیں
احساس جس کا نام تھا جانے کہاں کہاں کی ٹھوکر کھا گیا
عقل کی بے بسی کی، مشیت کی داستاں
عرفاں کی، آگہی کی، عنایت کی داستاں
قدموں کے نیچے اپنے زمیں اب کہاں رہی!!

رعنا حیدری
اجنتا کلنک
جے سنگھ پورہ، اورنگ آباد
۴۳۱۰۰۱

۸۷

دُہائی

اچانک ریل کے پہیے میں آکر
مر گیا معصوم بچہ
اور ماں کہنے لگی
یا خدا
میں بانجھ ہی رہتی تو بہتر تھا

لازوال المیہ

زرد چہرے کی اداسی
جب بھی آتی ہے نظر
چاہتا ہوں
اسکے اشکوں سے بناؤں
میں وہ تصویرِ الم
جو ہو اک شہکارِ غم
لیکن قلم
موم کی صورت پگھلتا ہے ہمیشہ انگلیوں کے درمیاں

شوکت علی شاہد، مرواجی روڈ، کڈور، چکمگلور

زمانے میں کہیں صبر و سکوں بھی ہاتھ آتا ہے — بس اپنا رخ بدل دیتا ہے دردِ ناشکیبائی (ماہر القادری)

ایک تنکا حقیر ہے لیکن وہ ہواؤں کا رخ بتاتا ہے (افسر میرٹھی)

باب ۶
افسانے
کہانیاں

ترتیب

بے ذوقیِ نظر بزمِ تماشا نہ رہے گی ... (فانی)

بازیافتہ:

"خودکشی"

"نقوش، لاہور" سے ماخوذ

سعادت حسن منٹو مرحوم

دوستوفسکی (ایک روسی مفکر و ادیب) کی طرح منٹو بھی زندگی کے ابتدائی دور میں پرجوش انقلابی اور ترقی پسند نظریات کا زبردست حامی اور مبلغ تھا لیکن بعد میں اس نے محسوس کیا کہ ترقی پسندوں میں بیشتر لوگ اپنے نظریات میں پرخلوص نہیں ہیں۔ چنانچہ اس نے ان کی منافقت کا پردہ چاک کرنے کے لئے اپنے زورِ قلم کو خوب آزمایا۔

از: پروفیسر سجاد شیخ۔ پاکستان

زاہد صرف نام ہی کا زاہد نہیں تھا۔ اس کے زہد و تقوٰے کے سب قائل تھے۔ اس نے بیس پچیس برس کی عمر میں شادی کی۔ اس زمانے میں اس کے پاس دس ہزار روپے کے قریب تھے، شادی پہ پانچ ہزار صرف ہوگئے۔ اتنی ہی رقم باقی رہ گئی۔

زاہد بہت خوش تھا۔ اس کی بیوی بڑی خوش خصلت اور خوبصورت تھی۔ اس کو اس سے بے پناہ محبت ہوگئی۔ وہ بھی اس کو دل و جان سے چاہتی تھی۔ دونوں سمجھتے تھے کہ جنت میں آباد ہیں۔

ایک برس کے بعد ان کو لڑکی پیدا ہوئی، جو ماں پر تھی۔ یعنی ویسی ہی حسین، بڑی بڑی غلافی آنکھیں ان پر لمبی پلکیں، مہین ابرو، چھوٹا سا لب دہن۔ اس لڑکی کا نام سوچنے میں کافی دیر لگ گئی۔ زاہد اور اس کی بیوی کو دوسروں کے تجویز کئے ہوئے نام پسند نہیں آتے تھے وہ چاہتی تھی کہ خود زاہد نام بتائے۔

زاہد دیر تک سوچتا رہا، لیکن اس کے دماغ میں ایسا کوئی موزوں و مناسب نام نہ آیا جو وہ اپنی بیٹی کے لئے منتخب کرتا۔

اس نے اپنی بیوی سے کہا "اتنی جلدی کیا ہے۔ نام رکھ لیا جائیگا"۔ بیوی مُصر تھی کہ نام ضرور رکھا جائے "میں اپنی بیٹی کو اتنی دیر بے نام نہیں رکھنا چاہتی۔"

وہ کہتا "اس میں کیا حرج ہے — جب کوئی اچھا سا نام ذہن میں آئے گا تو اس گل گوتھنی کے ساتھ ٹانک دیں گے"۔

"پر میں اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ — مجھے بڑی الجھن ہوتی ہے۔"

"فی الحال بٹیا کہہ دینا کافی ہے۔"

"یہ کافی نہیں ہے۔ میری بٹیا کا کوئی نام ہونا چاہیئے۔"

"تم خود ہی منتخب کر لو۔"

"یہ کام آپ کا ہے، میرا نہیں"

"تو تھوڑے دن انتظار کرو — میں اردو کی لغت لاتا ہوں — اس کو پہلے صفحے سے آخری صفحے تک غور سے دیکھوں گا — یقیناً کوئی اچھا سا نام مل جائے گا۔"

"میں نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا تھا کہ لوگ اپنے بچوں بچیوں کے نام ڈکشنریوں سے نکالتے ہیں۔"

"نہیں میری جان، نکالتے ہیں — میرا ایک دوست ہے۔ اس کے جب بچی پیدا ہوئی تو اس نے فوراً اردو کی لغت نکالی۔ اور اس کی ورق گردانی کر کے ایک نام چن لیا۔"

"کیا نام تھا؟"

"نکہت"۔

"اس کے معنی کیا ہیں"

"خوشبو"

"بڑا اچھا نام ہے — نکہت — یعنی خوشبو"

"تو یہی نام رکھ لو۔"

زاہد کی بیوی نے اپنی بچی کو جو سو رہی تھی ایک نظر دیکھا اور کہا۔ "نہیں — میں اپنی بٹیا کے لئے پرانا نام نہیں چاہتی — کوئی نیا تلاش کیجئے — جائیے ڈکشنری لے آئیے۔"

زاہد مسکرایا "لیکن میرے پاس پیسے کہاں ہیں؟"

زاہد کی بیوی بھی مسکرائی، "میرا پرس الماری میں پڑا ہے، اس میں جتنے روپے آپ کو چاہئیں، نکال لیجئے۔"

زاہد نے "بہت بہتر" کہا اور الماری کھول کر اس میں سے اپنی بیوی کا پرس نکالا اور دس روپے کا ایک نوٹ لے کر بازار روانہ ہوگیا کہ لغت خریدے۔ وہ کئی کتب فروش دکانوں میں گیا — کئی لغت دیکھے۔ بعض تو بہت قیمتی تھے، جن کی تین تین جلدیں تھیں۔ کچھ بڑے ناقص — آخر اس نے ایک لغت جس کی قیمت واجبی تھی خرید لیا۔ اور راستے میں اس کی ورق گردانی کرتا رہا، تاکہ نام کا مسئلہ جلد حل ہو جائے۔

جب وہ انارکلی میں سے گذر رہا تھا تو اس کو ایک دوست مل گیا۔ وہ اسے اپنی بوٹوں کی دکان میں لے گیا۔ وہاں اسے قریب قریب ایک گھنٹے تک بیٹھنا پڑا، کیونکہ بہت دیر کے بعد اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ جب اس کے دوست کو دورانِ گفتگو میں پتہ چلا کہ زاہد کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے تو وہ بہت خوش ہوا۔ تجوری میں سے گیارہ روپے نکالے اور زاہد سے کہا "یہ اس بچی کو دے دینا، کہنا تمہارے چچا نے دیئے ہیں — نام کیا رکھا ہے اس کا؟"

زاہد نے لغت کی طرف دیکھا، جس کی جلد لال رنگ کی تھی "ابھی تک کوئی اچھا نام سوجھا نہیں۔"

اس کے دوست نے جوتے کو کپڑے سے صاف کرتے ہوئے کہا، "یار نام رکھنے میں دقت ہی کیا پیش آتی ہے۔ ثمینہ ہے، شاہینہ ہے، نسرین ہے، الماس ہے۔"

زاہد نے جواب دیا "یہ سب بکواس ہے۔"

اس کے دوست نے جوتا ڈبے میں رکھا "تو اب جو بکواس تم کرو گے، وہ بھی ہم سن لیں گے۔"

اس کے بعد اٹھ کر اس نے زاہد کو گلے سے لگایا خدا اس کی عمر دراز کرے — نام ہو نہ ہو اس سے

کیا فرق پڑتا ہے؟"

زاہد جب دکان سے باہر نکلا تو اس نے سوچنا شروع کیا کہ واقعی نام میں کیا رکھا ہے۔ خیراتی کا یہ مطلب تو نہیں کہ وہ بڑی خیرات کرتا ہے۔ عیدن کیا بلا ہے ـــــ اور گھسیٹا ـــــ کیا لوگ اسے گھسیٹنا شروع کر دیں ـــــ اور یہ رلدو ـــــ شبراتی؟

اس کے جی میں آئی کہ لغت کسی گندی موری میں پھینک دیں اور گھر جا کر اپنی بیوی سے کہے "میری جان نام میں کچھ نہیں پڑا۔ بس یہ دعا کرو کہ بچی کی عمر دراز ہو ـــــ"

وہ مختلف خیالات میں غرق تھا ـــــ لیکن معلوم نہیں کیوں اس کا دل غیر معمولی طور پر دھڑک رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ شاید یہ اس کی پراگندہ خیالی کا باعث ہے ـــــ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس کی طبیعت بہت زیادہ مضطرب ہو گئی۔ وہ چاہتا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچے اور اپنی بچی کی پیشانی چومے۔

بغل میں لغت تھی ـــــ اس کو اس کو کئی بار دیکھنے کی کوشش کی، مگر اس کا دل و دماغ متوازن نہیں تھا ـــــ اس نے تیز تیز چلنا شروع کر دیا ـــــ مگر تھوڑا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی بری طرح ہانپنے لگا اور ایک دکان کے تھڑے پر بیٹھ گیا ـــــ اتنے میں ایک خالی تانگہ آیا۔ اس نے اس کو ٹھہرایا اور اس میں بیٹھ کر تانگے والے سے کہا "چلو مزنگ لے چلو ـــــ لیکن جلدی پہنچو مجھے وہاں ایک بڑا ضروری کام ہے۔"

مگر گھوڑا بہت ہی سست رفتار تھا۔ یا شاید زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس کو عجلت تھی۔ وہ برق رفتاری سے گھر پہنچنا چاہتا تھا۔

اس نے کئی مرتبہ تانگے والے سے سخت سست الفاظ کہے جو وہ برداشت کرتا گیا۔ آخر جب اس کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تو اس نے زاہد کو تانگے سے اتار دیا۔ ہائی کورٹ کے قریب اس نے زاہد سے کرایہ بھی طلب نہ کیا۔

زاہد اور زیادہ پریشان ہوا۔ وہ جلد گھر پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ کچھ دیر چوک میں کھڑا رہا۔ اتنے میں ایک پٹا ہوا سا تانگہ آیا۔ اس میں بیٹھ کر وہ مزنگ پہنچا۔ کرایہ ادا کیا اور گھر میں داخل ہوا۔

کیا دیکھتا ہے کہ صحن میں کئی عورتیں کھڑی ہیں جو غالباً ہمسائی تھیں۔ وہ دروازے کے پاس رک گیا۔ ایک عورت دوسری عورت سے کہہ رہی تھی، "مشکل ہی سے بچے گی بیچاری ـــــ تشنج کے یہ دورے بڑے خطرناک ہیں۔"

زاہد ان عورتوں کی پروا نہ کرتے ہوئے دیوانہ وار اندر بھاگا۔ اور اس کمرے میں پہنچا جہاں وہ اور اس کی بیوی رہتے تھے۔ اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بیوی کی فلک شگاف چیخ سنی۔

اس کی بٹیا دم توڑ چکی تھی۔ اور اس کی بیوی بے ہوش پڑی تھی۔ زاہد نے اپنا سر پیٹنا شروع کر دیا۔ ہمسائیاں پردے کو بھول کر بے اختیار اندر چلی آئیں اور زاہد کو اس کمرے سے باہر نکال دیا۔

ایک ہمسائی کے شوہر کے پاس موٹر تھی۔ وہ ایک ڈاکٹر لے آیا۔ اس نے زاہد کی بیوی کو ایک دو انجکشن لگائے، جن سے وہ ہوش میں آ گئی۔

زاہد ایک ایسے عالم میں تھا کہ اس کے سوچنے سمجھنے کی تمام قوتیں معطل ہو گئی تھیں۔ وہ صحن میں ایک کرسی پر بیٹھا، بغل میں لغت دبائے خلاؤں میں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنی بچی کے لئے کوئی نام تلاش کرنے میں محو ہے۔

بچی کو دفنانے کا وقت آیا تو زاہد باہوش ہو گیا۔ اس نے کوئی آنسو نہ بہایا۔ کفن میں پڑی بچی کو اٹھایا۔ اور اپنے دوستوں اور ہمسایوں کے ہمراہ قبرستان روانہ ہو گیا۔ وہاں قبر پہلے ہی تیار کرا لی گئی تھی۔ اس میں اس نے خود اسے لٹایا اور اس کے ساتھ لغت رکھ دی۔

لوگوں نے سمجھا، قرآن مجید ہے۔ انھیں بڑی حیرت ہوئی کہ مُردوں کے ساتھ قرآن کون دفن کرتا ہے۔ یہ تو سراسر کفر ہے، لیکن ان میں سے کسی نے بھی زاہد سے اس کے متعلق کچھ نہ کہا۔ بس آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے۔

بچی کو دفنا کر گھر آیا تو اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی کو بہت بخار ہے۔ سرسام کی کیفیت ہے۔ فوراً ڈاکٹر کو بلایا گیا۔ اس نے اچھی طرح دیکھا اور زاہد سے کہا "حالت بہت نازک ہے ـــــ میں علاج کیے دیتا ہوں، لیکن میں صحت کی بحالی کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

زاہد کو ایسا محسوس ہوا کہ اس پر بجلی آن گری ہے، لیکن اس نے سنبھل کر ڈاکٹر سے پوچھا "تکلیف کیا ہے؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا "بہت سی تکلیفیں ہیں ـــــ ایک تو یہ کہ انھیں بہت صدمہ پہنچا۔ دوسری یہ کہ ان کا دل بہت کمزور ہے ـــــ تیسری یہ کہ انھیں ایک سو پانچ ڈگری بخار ہے۔

ڈاکٹر نے چند ٹیکے تجویز کیے۔ دو نسخے پلانے والی دواؤں کے لکھے اور چلا گیا۔

زاہد فوراً یہ سب چیزیں لے آیا۔ ٹیکے لگائے دوائیں بڑی مشکل سے حلق میں ٹپکائی گئیں ـــــ لیکن مریضہ کی حالت بہتر نہ ہوئی۔

دس پندرہ روز کے بعد اسے تھوڑا ہوش آیا۔ ہذیانی کیفیت بھی دور ہو گئی۔ زاہد نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کی بیاری حسین بیوی نے اسے بلایا اور بڑی نحیف آواز میں کہا"

"میرا اب آخری وقت آ گیا ہے ـــــ میں چند گھڑیوں کی مہمان ہوں۔"

زاہد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے "کیسی باتیں کرتی ہو تم ـــــ تمہیں خدانخواستہ اگر کچھ ہو گیا تو میں کہاں زندہ رہوں گا؟"

زاہد کی بیوی نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا "یہ سب کہنے کی باتیں ہیں"۔ میں مر گئی، کل دوسری آ جائے گی ـــــ خدا آپ کی عمر دراز کرے ـــــ اور ـــــ اور ـــــ

اس نے ہچکی لی اور ایک سیکنڈ کے اندر اندر اس کی روح پرواز کر گئی ـــــ زاہد نے بڑے صبر و تحمل سے کام لیا۔ اس کے کفن دفن سے فارغ ہو کر وہ رات کو گھر سے باہر نکلا اور ریلوے ٹائم ٹیبل دیکھ کر ریلوے لائن کا رخ کیا۔

رات کو ساڑھے نو بجے کے قریب ایک گاڑی آتی تھی۔ وہ مغل پورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ تاکہ پٹڑی پر لیٹ جائے اور اسے کوئی دیکھ نہ سکے۔ گاڑی آئیگی تو اس کا خاتمہ ہو جائے گا ـــــ مجھے لمبی عمر کی کوئی خواہش نہیں ـــــ یہ جتنی جلدی مختصر ہو اتنا ہی اچھا ہے۔ میں اب اور زیادہ صدمے برداشت نہیں کر سکتا۔

جب وہ ریلوے لائن کے پاس پہنچا تو اسے گاڑی کی تیز روشنی جو انجن کی پیشانی پر ہوتی ہے دکھائی دی ـــــ لیکن ابھی وہ دور ہی تھی۔ اس نے انتظار کیا کہ جب قریب آئے گی تو وہ پٹڑی پر لیٹ جائے گا۔ (بقیہ صفحہ ۔ ١٠٦)..

جو مدعی بنے اس کے نہ مدعی بنیے
جو نا سزا کہے اس کو نہ نا سزا کہیے (غالب)

"مکتی بودھ"

راجندر سنگھ بیدی

یقین مانیے، اس میں نندلال کا ذرا بھی قصور نہ تھا۔

وہ کیا کرتا

اس کی فلم امبکا چل گئی تھی

میں بھی حد ہوں جو ہندی فلم کے سلسلے میں منطق کی بات کہنے جا رہا ہوں! اس پر میں کہوں گا کہ جس منطق سے ہندی فلم فیل ہوتی ہے اسی سے چل بھی جاتی ہے۔ جیسے اسے کوئی ضد ہو جاتی ہے۔ چلنے یا نہ چلنے کی، ایسی ہی ضد میں نند لال کی پہلی دو فلمیں پٹ گئی تھیں۔ حالانکہ ان میں سے ہر ایک میں ہیروئن اسٹوڈیو کی برسات میں بھیگی بھی تھی کپڑے اس کے بدن کے ساتھ چپکے بھی تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے کپڑے ایکا ایکی کہیں نیچے چلے گئے ہیں اور بدن چھپٹا کے اوپر آگئے ہے۔ بھیگنے سے پہلے کتنی مفلس اور نادار سی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن جب کیا مالدار نظر آ رہی تھی وہ

دوسری فلم میں ہیرو نے خالی ہاتھوں، گلدانوں، صوفے کی ٹانگوں، لیمپ شیڈ، اشیر لیسنر کی زنجیروں اور جانے کن کن ہتھیاروں سے کٹو یوائے ویلن اور اس کے درجن بھر ساتھیوں کو فراش کر دیا تھا۔ کیسے وہ اڑتے شاٹ میں اچھل کر میزنین فلور پر پہنچ جاتا تھا۔ جہاں ایک رستہ ہوتا ہے — بہشت ہوتا ہے۔ جس پر وہ جھولتا ہوا پھر نیچے کے دوزخ میں کود جاتا ہے۔ جبھی وردھی والوں میں سے کسی نے آنا فانا اٹھ کر پانچے سے ہیرو کا سر کاٹ دیا۔ جی بالکل ہی کاٹ دیا۔ یعنی سر الگ اور دھڑ الگ۔ لوگ ہراساں ہو گئے۔ اب کیا ہوگا؟ ارے یہ تو بالکل ہی مر گیا۔

وہ جانتے تھے کہ فلم کا ہیرو مر ہی نہیں سکتا اور پھر ہراساں بھی ہونا چاہتے تھے۔ ہیرو دلہن کو شادی کئے بنا ودھوا کر گیا۔ تو اس سنسار کا کیا ہوگا؟ شری کیسے چل گی؟ مگر جانتے تو ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں ہر اوہ — ؟ جبھی دیکھتے میں کنکریٹ کی دیوار سے دیوی پرکٹ ہو گئی اور ہندی کے سب شیموں کا پالن کرتے ہوئے ہیرو کے پاس چلی آئی۔ سسکتے ہوئے سر کو مُنڈ را میں اٹھایا۔ ایسے دھیرج سے کہ اسے درد نہ ہو اور پھر اسے دھڑ کے ساتھ لگا دیا۔ سر کے لگتے ہی ہیرو نے پہلے ایک چھینک ماری پھر اٹھا اور ہر ہر بول کہتا ہوا ایک طرف یوں چل دیا جیسے کوئی بات ہی نہیں۔ کوئی دھانہ سلام شکریہ نہ ڈنڈوت، لیکن جب ہال میں کیا تالیاں بجی تھیں۔ اگر فلم کے آخر میں لوگوں نے نندلال کو پیٹ ڈالا تو اسکی وجہ اسکرین پلے کی غلطی تھی ... بات یوں ہوئی کہ دیوی کے ہاتھوں سے تو وہ بچ گیا، لیکن کچھ دیر بعد باہر جا کر سمندر میں ڈوب گیا —!

جب نندلال کوئی بی اے فیل نہ تھا۔ جیسے اب امبکا کے بعد وہ پاس نہیں۔ وہ کورا ہی تھا۔ فنانس بروکر، جو اپنی حاجتوں کے پیش نظر روپیہ لوٹا دیئے جانے پر بھی ہنڈی واپس نہ کرتا۔ کہیں سال ایک کے بعد اسے پھر اپنی بھلکڑ اسامی کے سامنے پیش کر دیتا مگر ایک بات نندلال جب بھی پہلے خود ہر کسی کو نمسکار کرتا تھا ویسے آج بھی کرتا ہے۔ ورنہ فلموں میں یہ خلاف وضع فطری بات ہے۔ یہاں تو جو پہلے سلام کا جواب نہ دے سمجھو اسکی فلم چل گئی اور اگر آپ سے پہلے وش کرے تو گھوٹالا ہوا۔

نندلال کی شکل میں کوئی خاص بات نہ تھی، ہماری آپکی طرح کا آدمی تھا وہ۔ عام ہندوستانی قد وہی رنگ روپ، وہی چیچک کے داغ جو بچپن میں بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ لیکن جوانی میں طاقت پکڑنے میں ابھی بھی ایک داب، ایک چھاپ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بیچ میں عضلات کی سکڑن چھوڑ جاتے ہیں۔

البتہ جس میں آدمی بات کرنے میں سر کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیتا ہے۔ آپ اس سے ادھار لینے جائیں تو آخر دم تک یہی لگتا ہے وہ دے گا، نہیں دے گا، دیگا نہیں دے گا۔

گو مجھا سے گدیوں تک آپ ہندوستانی سنوں کی جمع کریں اور ان کی تعداد سے حاصل جمع کو تقسیم کریں تو جواب اوسط نکلتی ہے، وہ نندلال کی شکل ہے، نہیں، ایسے شاید میں آپکو سمجھا نہیں پاؤں گا۔ آپ یہاں سے ایرانی ہوٹل کولار کی طرف چلیں تو، راستے میں دو نکڑ پڑتے ہیں۔ ان پر پڑنے والے ہر تیسرے الل ٹپ آدمی کی شکل نندلال کی سی ہوگی۔ اب سمجھے نا آپ —؟ ٹھیک ہے کرشن کنہیا کا ایک نام نندلال بھی ہے۔ مگر کرشن کنہیا کے گورے چٹے تھے۔؟ وہ بھی تو بھارت ورش میں اترا ور دکن کے میل کی ایک ناکام سی کوشش تھے۔

نندلال کو اپنے نام کے عامیانہ ہونے سے بہت چڑ تھی۔ مگر وہ کیا کرتا؟ نام بھی تو وجود کی طرح آدمی کے ساتھ یوں چپک جاتا ہے کہ ایک ہی بار اترتا ہے — وہ چڑ دراصل پیدا کی گئی تھی۔ ایسی حرکتیں بالعموم عورتیں کرتی ہیں۔ اپنے وجود کو بھول کر۔ فلمی لڑکیاں اسے کہتیں "کیا مہابھارت کے زمانے کے نام رکھ دیا تمہارے ماں باپ نے —؟ اب شونی کمار کو دیکھو۔ ہم اسے پیار سے اشو، اشو تو پکار سکتے ہیں۔ نندو کیا اچھا لگتا ہے؟ معلوم ہوتا ہے جیسے ٹھینگا ہے۔ چنانچہ نندلال

سزا جزا کے فسانے سنا کے واعظ نے سکون چھین لیا ہے گنہگاروں کا! (حنیف ساغر)

نے باقاعدہ اور قانونی طور پہ دیویندر کمار رکھ لیا۔ اس امید میں کہ رکھا نہ اور بے شری اسے دیو دیو کہہ کر پکارینگی تو کتنا اچھا لگے گا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک پارٹی بھی کی جس میں اسکاچ چلی۔ کباب کا رنر سے کباب اور تکے بھی آئے۔ پانچ ساڑھے پانچ ہزار کا خرچ بھی ہوا۔ لیکن نتیجہ کیا نکلا ؟ ہر دوسرے تیسرے اسے کوئی مل جاتا۔ اور کہتا اے نندلال۔ سنا ہے تو نے اپنا نام بدل لیا ہے ؟ ایک دن رینو آئی۔ جو پارٹی کے دن آؤٹ ڈور کر رہی تھی بولی۔

" اتنی بڑی پارٹی کر دی، نندلال جی اور ہمیں پوچھا ہی نہیں — بیوی کہتی

" میں نے تو اس سے شادی کی تھی، بس کوئی دوسرا نہیں جانتی۔ کوئی یتیم تھوڑے ہی ہوں جو آج ایک ساتھ ہو اور کل دوسرے کے ساتھ۔ میرا تو وہی ہے " اور پھر پاس بیٹھی ہوئی عورت نام سے رہتی

" نند لال — !

رول مانگنے کے لئے ایکٹر لوگ دفتر میں آتے ہی رہتے۔ چنانچہ اس دن بھی دیویندر کمار اسٹر کا نام پڑھکر ایک چلا آیا۔ باہر اسٹول پر بیٹھے ہوئے چپراسی نے کہا

" ہاں صاحب اندر ہیں :"

ایکٹر اندر جاتے ہی اپنے پاؤں پر واپس چلا آیا۔

" وہاں تو کوئی نہیں وہی نندلال بیٹھا ہے :"

نندلال کا مکان معمولی تھا۔ اور بیوی بھی معمولی۔ مگر کچھ تو دولتیوں کی بات چلی آئی تھیں اس میں امبکا ہٹ جانے کے بعد۔ اس نے نئی کار خریدی۔ لیکن اسے بیوی کے اردل میں دے دیا۔ اور خود اسی کھٹارے میں گھم گھم کرتا رہا۔ کیونکہ وہ تنگ تھا پھر جوتوں کی طرح بنے پر بھی نندلال بڑا گھر لینے سے ڈرتا تھا۔ اس لئے نہیں کہ کل کلاں شاید اسی میں لوٹنا پڑے بلکہ اس لئے کہ اس کے بھاگیہ اُدے ہونے کی شری گنیش اسی لاطور بھون میں کے دو کمروں اور بالکونی سے ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی کی دیواروں پر اس نے سخت چمکیلے، بھڑکیلے، چکو مار والے رنگ پوت لئے تھے۔ فرج، ٹیلی وژن، تو آج ہر انت رام بے انت سنگھ کے پاس ہوتے ہیں۔ اس لئے کہیں تو امتیازی شان پانے کی پھڑپھڑاہٹ اور بیوی کو خوش کرنے کی لالسا میں اس نے اپنے ڈبل بیڈ کے پائے چاندی مڑھوا لیے۔ اور بیوی بار بار پہلو بدل کر پتی کی بے خوابی کا ساتھ دینے لگی۔ سب کچھ کتنا

فراواں اور کم کم معلوم ہوتا تھا۔ ایک وہ وقت تھا جب فرش بھی عرش تھا ان کے لئے اور ایک یہ جس میں عرش بھی سمٹ کر رہ گیا تھا۔ بہرحال نندلال جو بھی کرتا تھا ان ہی دو کمروں میں اور جو نہیں کرتا تھا وہ بھی انہی میں۔

نندلال کے اردگرد سب چیزیں عامیانہ بلکہ سوقیانہ ہونے کے باوجود ایک چیز بڑی اچھی تھی جو پور جنم کے کسی پھل میں چلی آئی تھی۔ اور وہ تھی مورننگ گلوری کی بیل جو کیسی بے خودی سے اسکے گھر کی دیواروں میں لپکی تھی۔ اس میں اسکارلٹ اور ہلکے پھول چھوٹ کر بہر آتے جاتے کے اندر للاں بخار پیدا کرتے تھے۔ لوگ عام طور سے یہی سمجھتے تھے کہ اس گھر کے باسی کتنے تروتازہ ہیں کتنے خوش مزاج ہیں۔ پھر ان کے جلو میں ریاض کرتی ہوئی کسی لڑکی کی آواز مل جاتی۔

پنگھٹ پہ نندلال چھیڑ گیو رے

اور سدھا نندلال کی بیوی اٹھ کر سب کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیتی۔

— x —

• فلمی اشتراکیت میں کوئی اکیلا نہیں کھاتا۔ کھا بھی نہیں سکتا۔ کسی کے امبکلائے جاتے ہی سب کے کان سوجاتے ہیں اور وہ گنگٹوک کی جونکوں کی طرح سے کچھ یوں چمٹتے ہیں کہ آدمی کو پتہ ہی نہیں چلتا۔ اِدھر آدمی گرتا ہے اُدھر جونکیں گر جاتی ہیں۔ نندلال کا اصیل آدمی ہی کہنا ہوا پایا جاتا ہے۔ اچھا تم میرے تاؤ کے چچیرے بیٹے ہو۔ اچھا۔ ؟ ہاں، ہاں، سنا تھا تمہارے بارے میں، کیا کروں، جب سے امبکا چلی گئی ہے میرا فیوز ہی اڑ گیا ہے۔ بس دیوی ماں کی مہربانی ہے — کیا پیو گے ؟ — اور وہ میرا بھائی پینے کے بجائے کھانے بیٹھ جاتا ہے اور ہمیشہ کھاتا رہتا ہے۔ رات بیوی جب میاں کے ساتھ کھینچ کر سوتی ہے تو کہتی ہے۔

" ہائے جی — تمہارے پتا کا تو کوئی بڑا بھائی تھا ہی نہیں "

" ایں۔ "

نندلال کہتا ہے۔" ان کا کوئی دوست ہوگا۔ سو جاؤ، سرمت کھاؤ میرا۔

ہیرالال پانچواں ورن ہے۔ جو آدے چلا آیا ہے۔ حیرانی کی بات ہے کہ وہ منو مہاراج کی گنتی میں نہیں آیا ؟

بیٹر الگ، پتے الگ، تو دیمک اور ارض بھی الگ ہوتے ہیں۔ اور آج تو اس پانچویں ورن کے بنا واغ سے اور " امبکا " کا کوئی حل ہی نہیں۔

جتنا آپ اس کاسے میں نسل کو ختم کرنے کی کوشش کرینگے اتنی ہی اس میں لچک، اتنا ہی چوبچال پن، اور مقاومت پیدا ہو جائیگی۔ کچھ دیر کے بعد کاکروچ اور چوہے زہر کی گولیاں ہضم کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ آج کوئی نہیں کہ سکتا کہ اسے خوشامد پسند نہیں۔ نہیں وہ خدا سے بھی بڑا ہو گیا ہے۔ پھر آپ اگر پہلو بدلتے نہیں تو یہ ورن بھی بنیا پنیترا بدلا کرنا جانتا ہے۔ آج کا طفلیا کبھی بھی سیدھے سیدھے مرد کو عقلمند اور عورت کو خوب صورت نہیں کہتا۔ وہ ہمیشہ کہتا ہے۔

" ناک کیسی بھی ہے مگر تمہارے چہرے پر پھبتی ہے بھابی خوبصورتی کا مطلب یہی نہیں کہ رنگ گورا ہو آج کل تو۔۔۔۔

رنڈ سالا — سازدن۔ اپنی زبان، اور سامنے والے کے کان کی مالش کرتا رہتا ہے۔ یہ جو آدمی سدھا اور نندلال کے پاس آیا تھا اس کا نام ہیرا تھا۔ شاید لال بھی ہو — ! ہیرالال۔ نام، جوشی، پانڈے، رام نواس کے طریقے الگ تھے اور ہیرالال کے الگ، وہ فلموں میں سنگر ہونے آیا تھا۔ ہیرا آج کے زمانے کا آدمی تھا اسکی شکل ماڈ تھی اور عقل بھی ماڈ، اس کے بال زیادتی کے طرح لمبے تھے، اور گھنے گھناؤنے، انسان کے ہونے کے بجائے وہ کسی گھوڑے کے معلوم ہوتے تھے مگر برل کریم کی کرشمہ سازی سے اطاعت پذیر ہو کر وہ کنڈل اور کڑیاں بن کر کاندھے اور گلے میں لٹک رہے تھے۔ ہیرالال جس کا مقدر پانچواں ورن تھا۔ یوں پہلے ورن کا آدمی تھا — براہمن — اس کا رنگ کھلتا ہوا تھا۔ اور سرخ بھی جیسے پہلے سے پی ہو۔ گول چہرے کو لمبی قلموں نے کر رکھا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ راج بھون ہو جس کے پھاٹک پر گارڈ ہاتھوں میں بندوق لئے کھڑے ہیں — بش شرٹ عنابی، ٹیریلن سیمابی۔ ایسا تضاد ناداری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ یا پھر اس وقت جب آدمی کپڑے کی حد سے گذر جاتا ہے اور فن کے اوج کو چھو لیتا ہے۔ اسکی سپتم کا " سا " کہیں گلے میں بیٹھ گیا تھا جب وہ گاتا تو عورتوں میں کوئی بے نام سے جذبے پیدا ہو جاتے۔

ہیرالال کو بھی انٹری فلم جگت میں آبائی جائداد کو بیچ کر آنے سے ہوئی۔ اس نے بھی فلم بنائی اور خدا آپ

کا حملہ کسے ۔ مار کھائی ۔۔۔ اس کے گرد بھی پانچویں ورن کے میں آدمی جمع ہو گئے اور اسے جنبش ثابت کر کے چلتے بنے ۔ کتنے سانپ لوٹے ہوں گے ہیرالال کے سینے پر ۔ جب اپنی ہی فلم میں اسے پاپولر پلے بیک سنگر کو لینا پڑا ۔ کیونکہ میوزک ڈائریکٹر نامی تھا اور اس نے ضد پکڑی تھی ۔ یہاں کوئی کسی نئے آدمی کو آزمانے کی ہمت نہیں رکھتا ۔ یہ جانتے ہوئے کہ کسی دقت وہ بھی تو نیا تھا اور کسی نے اسے چانس دینے کی حماقت کی تھی ۔۔۔ ایک خلا' اور خوف ہیں جو ہر آن فلم انڈسٹری کے اذہان کا احاطہ کئے رہتے ہیں ۔ بڑے سے بڑے بھی کسی دوسرے بڑے سہارے بڑے پکاتے ہیں ۔

ہیرا کو غلط فہمی تھی کہ اسکی فلم اس بڑے پلے بیک سنگر کی وجہ سے پٹی ۔ اس کا یہ وہم خود پرستی پر نہیں تو کس بات پر مبنی تھا ؟ وہ یہ جاننا ہی نہیں چاہتا کہ فلم کی آمریت میں پلے بیک سنگر تو ایک معدنی شئے ہے ۔ پیسے کی آکسیجن بنانے کے لئے جسے استعمال کیا جاتا ہے اصل بات تو ہیرو ہے اور ہیروئن ۔۔۔ اور کہیں کہیں بیچ میں ڈائریکٹر ۔

رہ رہ کر ہیرا کو مکتی بودھ کی یاد آتی تھی ۔ وہ ہوتے تو اسکی یہ درگت نہ بنتی ۔ مکتی بودھ اپنے زمانے کے ٹاپ کے میوزک ڈائریکٹر تھے ۔ کبھی پورے دیس میں ان کی دھنیں گونجی تھیں ۔ لیکن جب سے چوری یاری رواج ہوئے ۔ وہ پچھڑ گئے ۔ تعیش کے اس قانون میں وہ یک زوجہ آدمی ۔۔۔ عمر بھر ایک ہی محبوبہ کو نہارتے رہے جواب ان کا منہ چڑاتی ، انہیں گالی دیتی ، اور جس کا نام تھا سنگیت بھارتی !

اس پر بھی مکتی بودھ اسی جوش و خروش سے خلاقی کی باتیں کرتے تھے ۔ لوگ انہیں منہ پر تو کچھ نہ کہتے لیکن کچھ دور جاکر ہنس دیتے ۔ ان کی غزل تک کا بھیں اب بھی پہاڑی ، تلک کامود یا گوڑی پوربی ہونا ۔ حالانکہ آج کا تقاضا تھا کہ سر شیو مال کا ہو ، دھڑ ہربن کا اور پاؤں ۔۔۔ کسی کے بھی ۔۔۔ !

ہیرا کا بال بال قرض میں بندھ گیا ۔ اور اب وہ اس منزل پر پہنچ گیا تھا جس میں آدمی آخر بے حیائی اختیار کر لیتا ہے کپڑے جھاڑ کر اٹھتا اور تشنجی انداز میں پورے بازو پھیلا کر کہتا ہے " کچھ نہیں ہے میرے پاس دینے کو ۔۔۔ بگاڑ لو جو بگاڑتا ہے میرا "

سیٹھ لوگ سوچتے اب اس کا اور بگڑ ہی کیا سکتا ہے حوصلے والے اس کے لیے دعا کرتے پچیس پچاس اور بھی دے کر جاتے ۔ تھرڈ رلے دیوار ولں سے ٹکراتے اور یا پھر کھڑ یوں کے دھکے کھاتے ۔

کسی ایک ہاتھی میرے ساتھی کو ہیرا نے فلیٹ لے کر دیا تھا ۔ احتیاج میں ہیرا اسی میں اٹھ آیا تھا ۔ لیکن وہاں بھی فون پر فون آنے لگے ۔ یہ آلہ ۔۔ جو کروڑوں کا کاروبار کرتا ہے ۔ اور یا پھر عاشقوں کی چوچو موموکی ترسیل ، ہیرا کے لئے پھنیرا سانپ بن گیا آخر ایک سہانی صبح کو ہیرا کے اس پرورنے نے اس کا سامان اٹھا کر سڑک پر رکھ دیا ۔ جو سامان بھی نہ تھا ۔

وہاں راشن کی دکان کے ٹکٹ سے ۔ جواب ہیرا کا رین بسیرا تھا ۔ ایک ہی چیز خوب صورت چیز دکھائی دیتی تھی نندلال کے مکان پر لپکی ہوئی بیل ۔۔۔ !

مگر جب " امبکا " شروع بھی نہ ہوئی تھی تو ہیرا نے نند کو آتے جاتے دیکھا تھا ۔ یہ مبادا کے انداز میں اسے نمستے کرتا تھا اور وہ شاید کے انداز میں اسے جواب دیتا ۔ پھر پبلک لیٹرن کے نل سے دھو کر انہیں بنائے ہوئے کپڑوں میں ہیرالال شری روکڑا کے پاس گیا ۔ جو بہت ہی نامی پروڈیوسر تھا ۔ لیکن اس نے اس نیاز مند کو دیکھنے تک کی پروانہ کی ۔ ہیرا کچھ سمجھ گیا جب تک کوئی آدمی خود کو کسی کے لئے ناگزیر نہ بنالے کام چلتے نہیں بھلا ۔۔۔ ؟ اس نے رگھو دلال سے پھر دوستی دہرائی ، اور تاز سینما کے پاس کافی ہاؤس میں جانے لگا ۔ جہاں کسیلی کافی کی ایک پیالی اور بھنے سڑے ہوئے کیشو نٹ کے چند دانوں پہ فلم والوں کی قسمت بن یا بگڑ جاتی ہے ۔ رگھو نے ہیرا کی مدد کرنے کا وعدہ کیا ۔ ہیرا آخر دم تک یہی سمجھتا رہا ۔ رگھو وہ سب میرے لئے کر رہا ہے ۔ مگر وہ تو روکڑا کے انگوٹھے کا نشا نچاہتا تھا ۔

اپنے سیٹھ سے بات کر لینے کے بعد رگھو ہیرا کے ساتھ روکڑا کے ہاں پہنچا ۔ اتنے کم سود پر کسی کو پیسہ ملے تو کون چھوڑتا ہے ؟ جتنا بڑا پروڈیوسر ہو اتنا ہی سود کم لگتا ہے ۔ اور جتنا سود زیادہ ہو اتنا ہی پروڈیوسر کم ہو جاتا ہے ۔

روکڑا کو فون ہو چکا تھا ۔ جب ہیرا اور رگھو بلکہ رگھو اور ہیرا اس کے پاس پہنچے تو انھوں نے خود آگے بڑھ کر اس جوڑی کو ریسیو کیا ۔ اپنے فلمی سیٹ کے سے آفس میں چیک ٹی سیٹ میں انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے بنائی اور پلائی ۔ باتوں میں جب روکڑا صاحب نے کہا

" ہاں ہاں ۔ میں ہیرالال جی کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہوں "

تو ہیرالال اور رگھو نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا ہیرا نے ناز سے رگھو نے نیاز سے ، پھر انگوٹھے کا نشان بھی دستخط وغیرہ ہوئے رقم اس جیب سے اس جیب میں ہوگئی اور دونوں خوش خوش لوٹے ۔ کچھ ہی دنوں میں ہیرالال کو پتہ چل گیا ۔۔۔

ہیرالال نے دیکھا ۔ اسکی اصلی جگہ وہی ہے ، جہاں روکڑا صاحب کا چپراسی بیٹھتا ہے ۔ یا پھر وہی دروازے پر کی سرخ بتی ، صاحب کے مصروف ہونے کی نشاندہی کر رہی تھی ۔ ہیرا باہر بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ صاحب مصروف بھی رہے گا تو کتنی ؟ دو گھنٹے ، چار ، یا پانچ اسے خبر نہ تھی گھنٹے دن میں بدل سکتے ہیں اور دن مہینوں میں ۔

بیچ میں رگھو نے ہیرا کو اس عالم میں دیکھا بھی اور کہا

" تو تو کہتا تھا روکڑا میرا جڑا یار ہے "

" وہ تو میں اب بھی یہی کہتا ہوں "

ہیرالال نے گھبرا کر جواب دیا ۔ " آخر انسان ہے ۔ اس سے بھی مصروفیت ہو ہی جاتی ہے "

ہے بھگوان ۔۔۔ ! مجھے آخر چاہئے کیا تھا ۔۔۔ یہی نا ۔۔۔ ایک پلے بیک ۔۔۔ روکڑا کے پاس !

یہ ایسے ہی تھا جیسے کوئی مفلس اوپر دیکھ کر کہتا ہے ۔ اللہ ۔۔۔ میں آخر تجھ سے مانگتا ہی کیا ہوں ۔ یہی دو روٹیاں نا ۔۔۔ ؟

ہیرا کی فریاد اس مفلس کی فریاد سے بھی زیادہ اندوہ گیں تھی ۔۔۔ غریب نے خدا کے ساتھ جوا کھیلتا بھی ہے تو سٹیک (STAKE) کیا ہوتا ہے اس کا ۔۔۔ یہی دس پیسے نا ۔۔۔ ؟

روکڑہ دوسرے کروڑ کی فکر میں ہے ۔ میں ابھی پہلے کروڑ کی ۔ اور ہنسی جو رونا بھی نہ تھی ۔

پیسہ اس کے پاس آتا ہے جس کے پاس پیسہ ہو ۔ اس لئے ہیرا بھیک مانگ کر بھی کچھ پیسے جیب میں ڈال لیتا تھا ۔ سوگند لیکر کہ وہ اس گداگری کو پیشے کے طور پر کبھی اختیار نہ کرے گا ۔

کام اس کے پاس آتا ہے جس کے پاس پہلے ہی سے کام ہو ۔ اس لئے ہیرا سر بچا جھوٹ بولتا تھا ۔

" پانچ پکچروں میں پلے بیک دے رہا ہوں ۔ کوئی شروع نہیں ہوئی ۔ کوئی ہو رہی ہے ۔

گویا اس نے تین روپے کمائے ۔ جن میں دو کھوٹے تھے ۔ اور ایک چل نہیں رہا تھا ۔ جو چل نہیں رہا تھا ۔ اسے تین ہم اقوف کو دکھایا ۔ جن میں سے دو اندھے تھے اور ایک کو دکھائی نہیں دے رہا تھا وغیرہ ۔

بیچ میں ہیرا کی مکتی بودھ سے ملاقاتیں ہوئیں ۔ یکہ ان کی حالت اور بھی خستہ ہوگئی ہے ۔ ہیرا کو ان کی باتوں سے پتہ چلا ابرِ پشم قلندر ! جیسے میرے پاس آنا ہے آئے ۔ نہیں آنا ۔ نہ آنے ۔ میں نہ گیا کسی کے پاس ۔ غضب خدا کا ۔ یہ گھمسان کا میوزک دینے کے بعد بھی اگر لوگ مجھے بھول گئے ہیں تو بھول جائیں ۔ اور پھر یہ کیا ہو رہا ہے دنیا میں ۔ جھوٹ کا مول ہے ۔ سچ انمول ہو کر رہ گیا ہے ۔

مکتی بودھ کو چاہئے تھا گھر سے باہر نکلتے ۔ تاکہ اسے دیکھ کر ہی کسی کو تو بھولے بسرے یاد آ جائے ۔ اور کچھ نہیں تو کھلی ہوا سے پھیپھڑے ہی صاف ہو جائیں ۔

ایک بار وہ نکلے بھی ــــ اور تو اور اسی سنگیتا بھارتی نے کوڑے کی ٹوکری ان کے سر پر خالی کر دی !

پیسے کو عورت چاہئے تو عورت کو بھی تو پیسہ چاہئے !

اسکے بعد مکتی بودھ اندر ہی اندر ، اور اندر اپنے آپ میں سمٹ گئے ۔ جہاں انھیں اپنے ہی لہو کا سنگیت سنائی دینے لگا ۔

ہیرا لال انکے پاس بیٹھا تھا جب مکتی بودھ نے اپنی مستک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

" جو یہاں لکھا ہے ہیرا ــــ وہ مل کر رہے گا ــــ ! "

ہیرا لال نے مکتی بودھ کے ماتھے کی طرف دیکھا جہاں چند بے ربط لکیروں کے سوا کچھ بھی نہ تھا ۔ بائیں طرف ایک گھنڈی سی بنی ہوئی تھی ۔ شاید اس نے قسمت کے بہاؤ کو روک لیا تھا ۔ جیسی کنڈلی دیکھنے والے پنڈت مکتی بودھ کے پاس سے اٹھ کر چلے گئے تھے ۔ جیسے ان کا بھی سہارا چھوٹ جانے پر انہوں نے جھلا کر ہاتھ ہارمونیم پر مارا اور تھوڑی دیر آ آ کرنے کے بعد ایک غزل شروع کر دی ۔ جو پیلو میں باندھی گئی تھی ۔

کیا جانئے کیا ہو گیا اربابِ جنوں کو
جینے کی ادا یاد نہ مرنے کی ادا یاد

خشوع و خضوع کے آنسو مکتی بودھ کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے ۔ جیسے ہیرا کے بھی بندھ کھول دیئے ۔ یہ وہ دن تھے جب نندلال کی امبکا ہٹ ہو گئی تھی ۔ ہیرا نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھے ۔

ــــ آئیڈیا !

نندلال بری طرح سے پانچوں ورن میں گھرا ہوا تھا ۔ جب کہ ہیرا لال بڑی خاموشی سے آ کر نیا زمند نہ ایک طرف بیٹھ گیا ۔ صاحب سلامت تو ہو ہی چکی تھی ۔ مگر نندلال اسے آگے بڑھنا دینا نہ چاہتا تھا ۔ وہ پہلے ہی جو ڈائریکٹر ، فروزہ اور ان کی قبیل کے لوگوں سے گھرایا ہوا تھا ۔ جیسے ہر امیر آدمی کی بیماری میں ملاقاتی ڈاکٹر حکیم اور ویدین جاتے ہیں ۔ ایسے ہی سب لوگ اسے مشورے دے رہے تھے اگر ناکامی میں نندلال کچھ سوچ بھی سکتا تھا تو اب کامیابی میں وہ بالکل کنفیوز ہو گیا ۔

نندلال جب دوسروں سے باتیں کر رہا تھا تو ہیرا لال اپنی کمین گاہ سے نظر میں اس پر فوکس کرتے لگا جیسے وہ کسی مسمریزم تانترک و دِیا کا گُر جاننے لگا ہو ۔ احتیاج آدمی کو کیا کچھ نہیں سکھا دیتی ! اچٹ کر نندلال کی نظر جو ہیرا پر پڑی تو وہ اپنی نگاہیں ہٹا ہی نہ سکا ــــ جیسے اس نوارد میں کوئی خاص بات ہو ۔

" کیا حال ہے " ــــ نندلال نے تکلفاً پوچھ ہی لیا ۔ اپنی جگہ پر کسمساتے ہوئے ہیرا نے وہیں سے ڈور پکڑ لی

" بس کرپا ہے امبا جی کی ــــ ! "

نندلال چونک گیا ۔ اسے یوں لگا جیسے امبا ماں نے خاص طور پر اسے اس کے ہاں بھیجا ہے ۔ امبا ماں جس نے چھ لاکھ کے خرچ پر کروڑ لوٹا دیے ۔ پھر وہ ڈر گیا ــــ کہیں یہ بھی تو وہ نہیں ہے ــــ ؟

مہینہ بھر ہیرا نے اپنا عندیہ نندلال سے چھپائے رکھا ۔ جس نے نندلال میں ایک عجیب نفسیاتی الجھن پیدا ہو گئی ۔ وہ اب تک لوگوں کی فرمائش اور اپنے انکار کا عادی ہو چکا تھا ۔ ہیرا نے کام بھی پکڑا تو نندلال کے نئے دفتر کا ــــ وہ پائی پائی پر انٹیریر ڈیکوریٹر سے لڑتا ۔ چھبیس ہزار کے خرچ پر نندلال اسے پانچ ہزار ایڈوانس دینا چاہتا تھا ۔ لیکن ہیرا لال نے اسکے ہاتھ روک لیے ۔ اور اسے پانچ سو میں نپٹا لیا ۔ کچھ دن کے بعد پھر اسے ایک ہزار دے دیا ۔ آخر سامان تو ہمیں ہی دینا ہے ۔ اسے تو ــــ اپنے دماغ ہی سے نکالنا ہے نا ــــ ؟ وہی دلیل جس کی وجہ سے کوئی فن کار اپنے پیشے سے روٹیاں نہیں نکال سکتا ۔ لیکھک کو ساتھ پیاز کی دوکان ضرور کھولنا چاہئے ۔

اور ایسا ہوتا بھی ہے کہ جو آدمی پیسے کے لئے لگایا جاتا ہے زیادہ تندہی سے کام کرتا ہے ۔ پھر ہیرا نے سدھا بھابی سے پوجا کا معاملہ طے کیا ۔ نندلال سدھا کا کو ہمیشہ اگنور کیا کرتا تھا ۔ لیکن اب یہ ہیرا کی وجہ سے تھا کہ سدھا کو دفتر کے مہورت پر مکھ رکھا گیا ۔ پوجا میں تو وہ تھی ہی تھی ۔ لیکن دوسری باتوں میں بھی سب سے آگے ۔ اصل میں وہی دیوی تھی جس کے پاؤں کی برکت سے نندلال بنا ۔ سینکڑوں لوگ نندلال کے لئے نہیں " امبکا " کی کامیابی کی خاطر آتے تھے وہ پہلے سدھا کو نمسکار کرتے تھے ۔ جس سے اسے اپنا آپ ضروری اور خوب صورت ــــ اور امبکا معلوم ہونے لگا تھا ۔

ہیرا نے اس قدر خوب صورت طریقے سے نندلال کو گرگوں سے بچایا تو نندلال کے دل میں اس کے لئے عزت بڑھ گئی ۔ پھر آیا وہ آئیڈیا کا دن ۔

دن ابھی شام میں ڈھل نہ پایا تھا کہ نندلال ہی کے گھر میں ہیرا نے عشاء کی نماز کی تیاری شروع کر دی ۔ اس وقت وہ وضو کر رہا تھا ۔ جبکہ نندلال چونکا ۔

" تم مسلمان ہو ــــ ؟ "

" نہیں تو ــــ ! "

" تو پھر یہ ــــ یہ ــــ ؟ "

" میں سیکھ رہا ہوں نماز کیسی پڑھی جاتی ہے ؟ "

" وہ کس لئے ؟ "

" میں ایک مسلم سبجیکٹ SUBJECT بنا رہا ہوں نندلال جی ــــ ہیرا نے کچھ رکتے ہوئے کہا "

" دراصل میں اس کا ٹائیٹل امپا IMPA میں رجسٹرڈ کروا آیا ہوں ــــ اس نے جیب میں سے رسید نکالی ۔ واقعی ٹائیٹل ہیرا لال پنڈت کے نام رجسٹرڈ تھا اور وہ تھا ــــ " سجدہ "

" ارے "

ہیرا نے ایکدم سے کہا جیسے کوئی بھولی ہوئی بات ایک دم سے اسے یاد آ گئی ۔ اور جو پہلے ہی کوندے کی طرح سے مہک کر نندلال کے دماغ میں آ چکی تھی اور اسی لئے منطبق ہو گئی ۔

" یہ ۔۔۔۔ فلم آپ کو بنانی چاہئے ۔ آپ جو کسی بات کا فیصلہ نہیں کر پا رہے ہیں ، آج ہو گیا ۔ فیصلہ بات یہ ہے " امبکا " بنانے کے بعد آپ نے پوری ہندو قوم کو رام کر لیا ہے ۔ " سجدہ " سے پوری قوم کو جیم کر سکتے ہیں ! "

" ہیرا لال "

" جی نندلال جی "

" ٹائیٹل "

" ٹائیٹل میرے نام ہوا تو کیا ہوا ؟ ۔ آپ کے لئے تو میری جان بھی حاضر ہے ۔

ــ × ــ

بگولے دیکھ کر دیوانے نے ــــ زمیں سے اٹھ چلی ہے آسماں سے (بہتر پلونوی)

"نہیں میں سوچ رہا تھا ٹائیٹل بہت ڈھانسو ہے !"
تبھی ہیرالال کو پتہ چل گیا کہ وہ نشے سے تھوڑا آگے ہی نکل گیا ہے۔ چنانچہ اس کے باتوں میں الجھائے رکھنے کی بات سوچی۔ یوں بھی دن بھر ادھر اُدھر جھک مارنے سے نندلال کی مدافعت کی سب قوتیں ختم ہو چکی تھی۔ پھر اس وقت وہاں کوئی دوسرا تھا بھی نہیں۔ سدھا بھابھی جی کے ساتھ سازش کر کے اسنے آنے جانے والے کے تانتے کو بکھیر دیا تھا۔ اس وقت وہ نندلال اور اس کے خدا یا دیوی کے بیچ "اکیلے" تھے ہیرا کہے جا رہا تھا۔
" مسلمانوں کے اٹھتے بیٹھنے۔ ان کے کلچر میں وہ بات ہے جو ہندوؤں کو بھی بہت پسند آتی ہے۔ دیکھو نا۔ کیسے بیٹی باپ کو آداب کہتی ہے۔ اور ساتھ میں ابا حضور بھی۔ سامنے آ کر بھی کتنا خوب صورت پردہ ہے جو آج کے ننگے پن میں کہاں ہے ؟
" میں سمجھ گیا۔"
" نہیں آپ نہیں سمجھے۔ مسلمان جو بھاشا استعمال کرتے ہیں وہ کتنی سندر ہے شکیلہ بانو بھوپالی۔ جب قوالی کرتی ہیں تو گجراتی، ہندو بھی پاگلوں کی طرح سے داد دیتے ہیں۔ چاہے ایک لفظ بھی ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔
" اسکی بات چھوڑو وہ سب سکھا دیتی ہے۔
اس پر نندلال اور ہیرا دونوں مل کر ہنسے۔ انھوں نے دیکھا کہ سدھا بھی کبارڈ کے پیچھے کھڑی ہنس رہی ہے۔ پھر مشاعرے پر بات چل آئی، جسکے سامنے کوٹھی میں کا رنگ نہیں جمتا۔
تو ـــ "امبکا" کے بعد "سجدہ" ـــ بیچ میں نعت، قوالی، مشاعرہ، کوٹھا، غزلیں، جوڑی دار مقیش لگے، ہرتے ہوئے دوپٹے، اور آخر ـــ پیسہ بات ہو چکی تھی مگر نندلال کا قدرتی حربہ آڑے آ رہا تھا۔ یعنی سر کے جھٹکے۔ کبھی لگتا تھا فلم بنے گی، بنے گی نہیں بنے گی۔
میوزک ڈائریکٹر کے طور پر مکتی بودھ کا نام تجویز ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہی ایک ایسے آدمی تھے جو ہیرالال کے پلے بیک سنگر بننے کے خواب پورے کر سکتے تھے۔ ہیرا نے نندلال کے سامنے اپنی بات ہی نہ کی۔ کیونکہ اندر سے وہ جانتا تھا کہ مکتی بودھ آجائیں گے تو وہ خود بھی آجائے گا۔ اس کا چانس سینٹ پرسینٹ ہے۔ نندلال کا اعتراض تھا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مکتی بودھ ایسا سنگیت کار انڈیا نے ابھی تک پیدا نہیں کیا۔ لیکن آج کل وہ بکتے نہیں۔ دوسرا ہندو ہونے کے ناطے وہ نعت کیسے بنائیں گے ؟ پلے بیک سنگر بھی چوٹی کا ہونا چاہیے کیونکہ اردو "کھاشا میں" "کا" دو طرح کے ہوتے ہیں جن میں سے ایک گلے سے نکلتا ہے اور دوسرا ـــ دوسرا نامعلوم کہاں سے۔ ایسے ہی "سا" آ ـــ عرق عشبہ کو ٹھیک سے بولیں تو اتار (عطار) کا زہ کا سہے گا۔
"ہے تو میرے پاس، پر اتنا گاڑھا نہیں ہے "ـــ
اور ہیرا کانپ گیا۔
لیکن جیسے تیسے بھی وہ اتنے بڑے آدمی کو جسکی "امبکا" ہٹ ہو گئی تھی۔ مکتی بودھ کے گھر لے ہی گیا۔ نندلال نے بڑی عقیدت سے انکے چرن چھوئے۔ مکتی بودھ جی وسکی اور دوسرے لوازمات کا بندوبست کر رکھا تھا۔ جتنی دیر لوگ پیتے پلاتے رہے پیتے کھلتے رہے، مکتی بودھ مسلم کلچر ہی کی باتیں کرتے رہے۔ آخر طے ہوا کہ جمعہ کے روز ان سے کنٹریکٹ کریں گے۔ کیونکہ وہی دن دیوی ماں کا ہے۔ نندلال نے جاتے ہوئے بھی اتنے بڑے میسٹرو MAESTRO کے پاؤں پر سر رکھ اور مکتی بودھ جی کو یقین ہو گیا کہ اس دن ان کا کنٹریکٹ ہو ہی جائے گا۔ دونوں لال چلے گئے۔ پیچھے وہی دو کونپرودہ گئے۔ لیکن آج ماں بڑھیا سنگیتا نے اپنے بڈھے کے لئے گاجر کا حلوہ بنایا تھا۔
فلمی دنیا میں ہر خبر جنگل کی آگ کی طرح سے پھیلتی ہے۔ جہاں اتنے بڑے پروڈیوسر کی تصویر میں میوزک دینے کے لئے لوگ مکتی بودھ کے پاس آنے لگے وہاں قرض خواہ بھی جو مایوس ہو چکے تھے۔ مکتی بودھ سب کو ٹہنے لگے
" آپ جمعہ کے روز آجائیے۔ اور اپنا حساب لے جائیے ـــ اور پھر .... نہیں نہیں، جمعہ نہیں ـــ میرا خیال ہے اگلے منگل ـــ بات یہ ہے نندلال چیک میں پیسے دے گا تو وہ سنیچر کو بنک میں پڑ ینگے۔ اور آپ تو جانتے ہیں۔ اس دن کوئی کلیرنس نہیں ہوتی ـــ سوموار کو چیک آجائیگا اور منگل کی شام کو میرے بنک میں آجائے گا۔ اسی لیے بدھ کو ہی آئیں تو اچھا ہے۔
مکتی بودھ حیران ہوئے کہ کسی کو ان کی یہ بات بری نہیں لگی۔ رات جب مکتی بودھ سونے لگے تو ایک عجیب سی شکر گذاری کا جذبہ ان پر رینگنے لگا۔ آخر بھگوان نے سن لی میری ـــ دینا ناتھ شاستری جیوتش اچاریہ تو کہتے بھی تھے کہ بس آپ کے ایسے دن آنے والے ہیں کہ آپ پہلے کے شکھر سے بھی دو پر پہنچیں گے ـ ایک نہیں شاید آپکو پانچ چھے کا کنٹریکٹ بھی ملیں۔ ہو سکتا ہے راج دربار کی طرف سے مان بھی پراپت ہو۔ بس جب آپکے چاند پر سے منگل گذر جائے گا تو پتنی کی طرف سے بھی چنتا نہ رہے گی ـــ اور گوروا کے مارگی ہوتے ہی لکشمی آپکے گھر ڈیرہ ڈال لے گی ـــ پھر انہیں بیوی کا خیال آیا۔ وہ ہنسے ـــ ایک گھر میں دو عورتیں کیسے رہ سکتی ہیں ؟
سٹی سول کورٹ سے ایک تاریخ بھی مکتی بودھ جی کے ہاں کی سب چیزوں پہ لگی تھی۔ جب لال برادرز وہاں تھے تو بڑھیا نے کس صفائی سے چیزوں پر لگی ہوئی تاریخ کی چیپیاں چھپا دی تھیں۔ کسی پر میز پوش ڈال دیا تھا کسی پر چادر، اگلے ہی روز بیلف BAILIFF وغیرہ کو کچھ دیکر مکتی بودھ جی نے سامان پر قبضہ اور نیلامی کی تاریخ اگلے ہفتے تک ملتوی کروالی تھی۔
جمعہ کے روز بھی نندلال ہی کو مکتی بودھ جی کے ہاں آنا تھا۔ پانچ بجے شام کا وقت تھا۔ جب چھے سات بجے ہوئے تو ہیرا کی شکل دکھائی دی۔ اسنے بتایا کہ نندلال کو بیمار پڑی میں "امبکا" کے نئے پرنٹ بنوانا تھے اس سے دیر ہو گئی۔ بات یہ ہے اس فلم امبکا کے ڈیڑھ سو پرنٹ بنوائے اور نیگیٹیو NEGATIVE گھس گیا۔ اس لئے ہر ایک پرنٹ سے ڈیوپ DUPE نکال کر اس سے کاپیاں بنوائیں گے۔ ڈیوپ سے جو پرنٹ نکلا ہے انکل، اس کے مقابلے میں پہلا پرنٹ بھی کچھ نہیں۔ آپ میری خاطر اس کوتاہی کو بھول جائیے۔ آپ میری مدد تو کر ہی رہے ہیں۔ تھوڑی اور کر دیجئے اور وہ یہ کہ آپ نندلال جی کے گھر ہی چلے چلیں۔ تاکہ آنا کانی کا کوئی بہانہ ہی نہ رہے۔ دیکھئے آپ کی عزت میری عزت ہے۔ اور میری عزت تو کچھ ہے ہی نہیں آخر وہ اتنا بڑا اور کامیاب پروڈیوسر ہو کر آپکے گھر آیا ہی تھا نا ـــ ؟ آپ کے چرن بھی چھوئے تھے نا....
مکتی بودھ جی شاید کچھ سوچنے لگے مگر بڑھیا نے انہیں کوئی موقع ہی نہ دیا۔ تسلا جس میں چاول رکھتے تھے اسے خالی دکھا دیا ـــ مکتی بودھ اٹھے اور ہیرا کے ساتھ چل دئے۔ جب ہیرا کہہ رہا تھا۔
" میرے پلے بیک کی بات ابھی نہیں ـــ بعد میں کیجئے گا۔ جب آپ کا کنٹریکٹ ہو جائے۔
لا طور بھون میں نندلال کی بیوی سدھا نے

ڈوبا دیدۂ تر نے وقار ضبط گریہ
ہماری آبرو پانی کی دیواری ہے (نوح ناروی)

ان کی خاطر وغیرہ کی۔ دس بجے تک زندگی کے یہ دو گنارے آپس میں ادھر اُدھر کی بکتے رہے۔ پھر گیارہ بج گئے۔ بارہ اور خون مکتی بودھ کے سر کو آنے لگا۔ ـــ ... میں نے غلط کہا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ کبھی ایک جھوٹ میں سے دس سچ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔

مگر نندلال آخر انسان ہے، ماس سے معروفیت ہو ہی جاتی ہے۔ نندلال کو اب سے ہی آو پرماتما، نہیں موت کا بیلف کیسے ٹلے گا؟

نندلال اپنی اسی پیچ کھچ کرتی لگی گاڑی میں اس وقت یعنی کہ رات کے ایک بجے آیا۔ جبکہ مکتی بودھ ایسی تیسی کہہ کر چلنے ہی والے تھے۔ نندلال لنگڑا رہا تھا۔ پتہ چلا اچانک ہیچش ہو جانے سے اسے ڈاکٹر کے پاس جاکر سرین کے اوپر ٹیکے لگوانے پڑے۔ جو ابھی درد کر رہے تھے۔ یشکر وار دیوی ماں کا دن ہے۔ نندلال نے بتایا۔ اور اس روز وہ برت رکھتے ہیں۔ صبح سے کچھ کھایا ہی نہیں۔

مکتی بودھ نے کہا ـــ "پہلے کھاؤ۔ پھر بات کریں گے۔ آخر انسان اتنی دوڑ دھوپ کرتا کس لیے ہے؟ بہو ـــ چاول ابھی دہی زیادہ دینا ذرا ـــ اور مکتی بودھ نے سی اضطراب میں اپنا ہاتھ پیٹ پر رکھ لیا۔

ہیرالال اور مکتی بودھ ٹیرس پر بیٹھے تھے۔ جہاں ان پر اوس پڑ رہی تھی۔

"یہاں اوس پڑ رہی ہے انکل" ـــ! ہیرالال نے کہا!

"اندر نہ چلے جائیں ـــ؟" مکتی بودھ بولے۔

"نہیں بیٹا۔ اس کا تو کچھ نہیں، وہ ہماری امیدوں پر نہ پڑے، بس ـــ اور پھر وہ کھسیانی سی ہنسی ہنس دیے۔

سب کچھ ہو جانے کے بعد نندلال آیا۔ اور دونوں ہاتھ جوڑ کر مکتی بودھ سے معافی مانگی۔ اس لئے نہیں کہ وہ لیٹ ہو گیا تھا۔ بلکہ پیسے لیٹ ہو گئے، ابھی تک تو بندوبست نہیں ہوا مگر بدھ تک ہو جائے گا۔

جانے مکتی بودھ نے کیسے کہہ دیا ـــ "کوئی بات نہیں بیٹا، بدھ کونسا دور ہے؟ ـــ حالانکہ ان کے دماغ میں دلال، سیٹھیے، بیلف، کیا کچھ گھومنے لگا تھا اور ان سے زیادہ اپنی بڑھیا جو گھوم ہی نہیں رہی تھی۔ باقی ذمے داری ہیرا کی تھی کہ وہ بڑھو کو سمجھائے کہ پیسہ کوئی آسانی سے ڈھیلا نہیں کرتا۔" امبکا "میں کروڑوں کا بزنس ٹھیک ہے لیکن وصولی بھی تو کوئی چیز ہے ـــ؟ پچیس ہزار، تو دفتر کی انٹیریر ڈیکوریشن میں لگ گیا ہے۔ اسے صاحب ڈسٹری بیوٹر اور پیسہ دیں۔ کیا کیا جوڑتے واؤچر VOUCHER اور حساب نہیں بناتے

شہر شہر، گاؤں گاؤں جاکر بکنگ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے لئے ایجنٹ رکھیں تو اسے پانچ سو ہزار سے کیا کم دینگے؟ اگر ڈسٹری بیوٹرس ہو تو اس کی جیب میں پانچ ہزار ڈال دے، ساتھ شراب پلائے۔ اور کوٹھے پر گانا سننے کے لئے لے جائے تو بتائیے وہ ایجنٹ آپ کا ہوا یا ڈسٹری بیوٹر کا ـــ؟ ایمان داری نام کی یہاں کوئی چیز ہی نہیں۔ ایک ہی ایمان دار ایجنٹ ملا تھا۔ چیکنگ کے ایک ہفتے کے اندر جس کی لاش ٹائلیٹ TOILET سے ملی ـــ!

خیر ہیرا کیسا بھی تھا لیکن تھا تو مکتی بودھ جی ہی کا ہی خواہ ـــ ساتھ نندلال کا بھی۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ ہے۔ اصل میں وہ اپنا ہی خیر خواہ تھا۔

لاطو بھون کے ٹیرس سے اٹھ کر چلتے ہوئے مکتی بودھ جی نے صرف اتنا ہی کہا۔

"یہ کاہے کی بیل ہے ـــ؟"

"مارننگ گلوری کی" ـــ نندلال نے جواب دیا۔

مکتی بودھ جی نے اپنی نظریں بچاتے ہوئے کہا۔

"تو پھر ایوننگ گلوری کی بھی کوئی ہوگی۔ نہیں دیکھی تو مجھے دکھیو نہ"۔ اور پھر وہ ہنس دیئے۔ چل دیئے۔

ہیرا میں باقی تو سب ٹھیک تھا لیکن ایک بات غلط تھی، اس نے مکتی بودھ جی کی پوری رقم اور سائننگ اماؤنٹ بھی خود ہی طے کر دی تھی۔ جیسے وہ، مکتی جی، کوئی بات ہی نہیں ـــ ظالم پوچھ تو لیا ہوتا؟ فلم میں جو آتا ہے رشتے جگا لیتا ہے۔ ارے بھائی ہمیں اپنا بیٹا نہیں بیاہنا ہے۔ یہ کمرشل دنیا ہے۔ اس ہاتھ سے کام لو تو اس ہاتھ سے دام دو۔ اور بس ـــ اس سے پہلے یہ بکواس کبھی نہ ہوئی تھی۔ ہوئی بھی تو ہم نے کانٹریکٹ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ اور اب ـــ وہ جگرا اب میں کہاں سے لاؤں؟ ـــ یہ ہیرا کہتا ہے۔ میں نے نندلال کو بھی کہہ دیا ہے کہ انکل کا تو کچھ نہیں ـــ وہ درویش آدمی ہیں ـــ ارے درویش کو کیا حاجت نہیں ہوتی! پھر ـــ فلمی دنیا گروپ سے چلتی ہے۔ آپ ایکبار اس گروپ میں گھس گئے تو جائیے انکل "امبا" گروپ، آج کے سب سے بڑے اور کامیاب پروڈیوسر کا گروپ، ارے بڑے نندلال آئے، اور بڑے گئے۔ اس کے ذریعے آپکی دس تصویریں ملیں گی۔ لئے ملئیے مجھے اسی ایک کی ضرورت ہے۔ بعد کی دس کی اور بیس کی ضرورت نہیں۔ کبھی میرا بھی وقت تھا۔ جب تمہارے ایسے آدمی کو ہفتہ ہفتہ باہر بٹھائے رکھتا۔ کہیں غلطی سے وہ اپنا تھوڑا میرے کرے

میں اعلے تئے تو میں چلا کر کہتا تھا "گیٹ آوٹ اگیٹ آوٹ۔

اور اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے مکتی بودھ سچ مچ چلا اٹھے ـــ "گیٹ آوٹ"۔

"کیا ہوا" ـــ بڑھیا بڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

مکتی بودھ کی سانس دھونکنی کی طرح سے چل رہی تھی، وہ ماتھے پر سے انفعال کے قطرے پونچھ رہے تھے۔

وہی ہو رہا ہے جو تیرے ایسے کھوسٹ کا ہونا تھا بڑھیا نے کہا ـــ اور واپس اپنے بوڑھے بستر پر لیٹ گئی۔

جس دلیری سے تقاضہ کرنے والوں کو مکتی بودھ جی نے بدھ کا وقت دیا تھا۔ اسی بے حیائی سے اگلے سنیچر کا دیدیا۔ (چیک بدھ کو بنک میں پڑے گا تو) حیرانی کی بات یہ ہے کہ بیسوں آئے۔ مگر ٹلے جانے پر کسی نے اُف نہ کی۔ کیا ارادے تھے ان کے؟ وہ شور مچاتے، نالش کی دھمکی دیتے۔ مگر یہ چپ، رام جانے یہ سب مل کر کیا کرنے والے ہیں؟ مکتی بودھ جی کانپ رہے تھے۔

بدھ کے روز موعودہ وقت پر ہیرا نندلال کی بیٹی سدھا کے ساتھ چلا آیا۔ سدھا کے ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبہ تھا۔ جو اس نے مکتی بودھ جی کے آگے رکھ دیا۔

"منہ میٹھا کیجئے انکل"۔

مکتی بودھ اور ان کی بڑھیا نے مٹھائی کا ڈبہ لے لیا۔ اور انتظار کرنے لگے۔ ہیرا بولا۔

"میں آپکے گھر میں ان کشتی کو لے آیا ہوں" ـــ اور اس نے سدھا کی طرف اشارہ کیا۔ سدھا بھی سے بڑی لکشمی کیا ہوگی؟ بات یوں کہ نندلال اوور فلو OVER FLOW لینے کے لئے کلکتہ چلے گئے ہیں۔ ہفتہ بھر میں لوٹ آئینگے۔ جاتے سمے انہوں نے تاکید کی تھی کہ مکتی بودھ جی کو میرا اچانک چل دینا بُرا لگے اس لئے تم میری بیوی کو لے جانا اور ساتھ برج واسی کے ہاں سے اس ملائی کا ڈبہ بھی ـــ اپنی عورت سے بڑی آدمی کی عزت کیا ہوتی ہے؟

مکتی بودھ جی نے سر ہلایا اور بولے۔

"ہوں" ـــ اور ایک نظر اپنی بڑھیا کی طرف دیکھا ان میں پرانے جلال کے دن پھڑ پھڑا کر رہ گئے۔

ادھر ہیرا اور سدھا گئے۔ اور ادھر ٹرانک والے گھر سے ریڈیو گرام، سپیکر، ٹیپ ریکارڈر، ہارمونیم، ستار، فرنیچر، اور کچھ برتن اٹھا کر لے گئے۔

کبھی بھول کر کسی سے نہ کرو سلوک ایسا ۔۔۔ کہ جو تم سے کوئی کرتا تمہیں ناگوار ہوتا (مولوی اسمٰعیل)

"اس کا کیا ہے"۔۔۔؟ ۔۔۔ مکتی بودھ جی نے سوچا۔ دس دن میں جب پیسے آجائیں گے تو چیزیں لوٹ آئینگی اگر جب تک انہوں نے نیلام نہ کردی ہوں تو ۔۔۔ کر بھی دی ہوں تو نئی خرید لینگے ۔ آخر ایک آدمی نے اپنی عورت، اپنی عزت میرے گھر بھیجی ہے ۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؟ یہ کوئی آزمائش ہو رہی ہے ۔ ہو سکتا ہے دس دن میں نندلال کلکتے سے لوٹ ہی آئے ۔

جب ٹانچ والوں نے گھر کی چیزوں پر ہاتھ ڈالا تو مکتی بودھ کی بڑھیا نے ایک دل دوز چیخ ماری، اور اسکے بعد بے ہوش ہوگئی ۔ یہ اچھا ہی ہوا ۔ اگر وہ ہوش میں ہوتی تو دوسروں کے ہوش ٹھکانے کر دیتی ۔ وہ مغلظات سناتی کہ بس ۔۔۔

دس دن بیت گئے، نندلال کلکتے سے نہ لوٹا ۔

اب ہیرا مکتی بودھ سے بچتا پھر رہا تھا ۔ نندلال کا ہاتھ رکھنے اور مکتی بودھ کو پیسہ دلوانے کے بیچ میں وہ کہیں بٹ کر رہ گیا تھا ۔ اسے اپنا آدرش، دور ہٹتا خود میں کہیں گم ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا ۔ نندلال کہیں اس سے بھی کھیل تو نہیں کر گیا؟ نہیں وہ ایسا آدمی تو نہیں ہے ۔ ہیرا نے ایکبار مکتی بودھ کو مِل کر بتایا او ور فلو جھگڑے میں پڑ گیا ہے ۔ اسلئے نندلال نہیں آیا مگر آئے گا ضرور، کچھ دن میں، کہاں جائے گا!

مکتی بودھ جی ہیرا کی بات پر ہونٹ بھینچ کر صرف ایک ہی کہتے رہے ۔۔۔ "ہوں" ۔۔۔ لیکن جب ہیرا چلا جاتا تو اپنے آپ سے کہتے ۔

"مکتی تجھے کیا ہو گیا ہے ۔۔۔؟ کیوں نہیں تو ان پلوں کو ٹھوکر مار کر باہر نکال سکتا؟ اب رہ ہی کیا گیا ہے ۔۔۔؟

اسی سلسلے میں ایک دن مکتی بودھ جی نے ملار نے اپنے شاگرد کو بھیج کر استاد مکب علی کی ستار منگوائی جس پر ہاتھ رکھتے ہی وہ سب کچھ بھول گئے بجاتے ہوئے جیسے وہ اس ساز سے لپٹ لپٹ جاتے تھے ۔ معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے بازوؤں میں کوئی محبوبہ ہے ۔ جس پر جھک جھک کر، جیسے چوم چوم کر، جس پر انگلیاں دوڑا دوڑا کر، وہ کسی نئی زندگی کے سُر نکال رہے ہوں ۔ بڑھیا دیکھ رہی تھی ۔ اور کباب ہو رہی تھی ۔ یہاں کی عورت، وہاں کی عورت کی ہمیشہ حاسد رہی ہے ۔ یہ کہ اسے اپنی ذات میں کھو کر، اپنے مالک میں مدغم ہو کر اسکی ملکہ ہونا چاہیے ۔ سب باتیں ہیں ۔ وہ تو اپنے میاں کی ہر دلعزیزی سے بھی جل بھن کر راکھ ہو جاتی ہے ۔

ایک جھالے کے بعد یکدم مکتی بودھ جی نے ستار ایک طرف رکھ دی ۔۔۔ اور پھر وہی اپنے آپ پر رحم اس پر بھی تو یہ سب اپنے آپ سے ہوتا دیکھ رہا ہے مکتی ۔۔۔ کیوں نہیں تو نندلال سے کہہ سکتا ۔۔۔ نہیں چاہیے مجھے تمہارا سجدہ ۔۔۔ جو سجدہ ہی نہیں ۔

پھر انہیں رستم کے آخری دن یاد آجاتے ہیں ۔۔۔ جن میں وہ روتا اور سر اوپر اٹھا کر، ہاتھ پھیلا کر کہتا ۔ "الٰہ ۔۔۔ کہاں گئے وہ میرے دن جب میں چلتا تھا تو میرے پاؤں زمین میں دھنس دھنس جاتے تھے اور آج ۔۔۔؟"

پھر وہ نعت، جس کی دھن اپنی بیکاری کے دنوں میں مکتی جی نے نکالی تھی ۔ جسے گاتے ہوئے انہوں نے بیچ میں سب بند کر دیا تھا ۔ یہ بھیروی، یہ توڑی، کیا میاں کی، کیا بیوی کی اور کیا کھماچ ۔ سب بکواس ہے ۔ قرآن کی بھی تو آیت ہے ۔

جس رخ زمانہ پھرے، اسی رُخ پھر جاؤ

میں نہیں پھر سکتا ۔ میری ہڈیاں بوڑھی ہو گئی ہیں ۔ جو ٹوٹ سکتی ہیں ۔ مڑ نہیں سکتیں ۔

نہیں ۔ میں یہ نہیں کروں گا ۔ میں نہیں مرغ بادگرد، میں نے اپنے سنگیت، اپنی ماں سے پیار کیا ہے ایشور، عورتیں، بیسوں، سینکڑوں ہو سکتی ہیں ۔ ماں ۔ صرف ایک ۔۔۔ ! کیا میں بھوکا بھی نہیں مر سکتا؟ یہ آزادی مجھ سے کوئی نہیں، کوئی نہیں چھین سکتا ۔

نندلال دس دن بعد بھی نہ لوٹا ۔ بیچ میں ہیرا مکتی بودھ جی کے گھر کا طواف کرتا رہا ۔ مگر ان کا دروازہ کھٹکھٹانے، اندر جانے کی اسکی ہمت نہ پڑی، وہ مکتی بودھ جی سے اتنا نہ ڈرتا تھا جتنا ان کی بڑھیا سے ۔

اب کے جو ہیرا آیا تو ایک تار سے مسلح ۔ تار کلکتے سے تھا جس میں لوٹنے کا تہوار بھی لکھا تھا ۔ اس دستاویز کو کانپتے ہاتھوں میں لیکر مکتی بودھ پھر کچھ بھول گئے ۔ اور آنکھیں سکوڑ کر کہیں دور دیکھتے ہوئے وہ پھر بولے ۔

"ہوں"

ہیرا ۔ اندر سے جانتا تھا کہ اگر مجھے مکتی بودھ کی ضرورت ہے تو انہیں میری بھی ۔۔۔ اور نندلال کی ۔

مقررہ تاریخ کو نندلال واقعی چلا آیا ۔ ہیرا اسے گھیر لگا کر مکتی جی کے ہاں لے ہی آیا ۔ کہا تیقن سے اس کے ہاتھ گھنٹی پر پڑے ۔ بہت دیر تک اندر سے کوئی آواز نہ آئی ۔ آخر پتہ چلا کوئی آ رہا ہے ۔ دروازہ کھلا تو سامنے بڑھیا کھڑی تھی ۔ جو انہیں پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی ۔ اسکی آنکھوں میں فولاد تھا ۔ سارے چہرے پر پرچھائیاں پھیلی تھیں ۔ اور جھریوں میں کوئی سلوٹ جمی تھی جیسے طوفان اور باڑھ کے بعد چھوٹے بڑے ندی نالوں میں جم جاتی ہے ۔

بڑھیا نے ان کو جانے کے لئے کہا نہ بیٹھنے کے لئے ۔ اس پر بھی وہ اندر آکر بیٹھ گئے ہیرا نے پوچھا

"انکل کہاں ہیں آنٹی؟"

پہلے تو وہ ایسے ہی ہٹر بٹر دیکھتی رہی ۔ آخر بولی ۔

"جانے کہاں کھپ گیا ہے بڑھو ۔۔۔؟ اسے تو موت بھی نہیں آتی ۔ کیا کیا تو نے نہ کیے میں ۔"

تین گھنٹے بعد نندلال چیک سمیت لوٹ گئے ۔ ہیرا نے اور کوئی دیر دیکھ لینے کو کہا ۔ مگر نندلال راضی نہ ہوا ۔ اٹھتے ہوئے نندلال نے تسلی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا ۔ چیک وہیں تھا ۔۔۔! ہیرا کی حالت ابتر تھی البتہ ۔ اتنی محنت سے بنی بنائی ہوئی عمارت اسکی ڈھ گئی ۔ جس ٹھیکے دار کو اسے بننے کے لئے دیا تھا، اس نے سیمنٹ سے زیادہ ریت اس میں ملادی تھی ۔

ہیرا گم صم جا رہا تھا کہ دور سے اس کے کان میں کوئی دھن سنائی دینے لگی ۔ جو پیلو میں بندھی تھی ۔

مجھ کو تو نہیں کچھ بھی محبت کے سوا یاد

ہیرا نے نندلال سے پوچھا ۔

"آپ کو کوئی آواز سنائی نہیں دیتی، اس انٹیوب ہل کے پیچھے سے جہاں عرب سا گر ہے؟"

نندلال نے سننے کی کوشش کی اور بولا

"نہیں تو ۔۔۔!"

اور بھی پڑ گئی بیمار کی جاں مشکل میں
مرنے والے سے وہ جینے کی قسم لے کے اٹھے (احمدی بیگم تبسم)

کہانی:۔

دھوپ

انتظار حسین
روزنامہ 'مشرق' لاہور، پاکستان

اس مرتبہ وہ اچانک آنکلی۔ بالکل خلاف توقع۔ وہ امید ہی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس نے اسے منانے کی کتنی کوشش کی تھی لیکن وہ کسی صورت نہ منی۔ سخت ناراض تھی ناراض ہونے کی بات بھی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ پورا منظر اس کے تصور میں ابھر آیا۔ کتنی منت سماجت کے بعد تو اس نے ملاقات کی حامی بھری تھی۔ اور اس کے یہاں کتنا اشتیاق تھا۔ جب وقت طے ہو گیا تو اس کے لئے وقت گذارنا کتنا مشکل ہو گیا۔ کس اضطراب سے اس نے رات سے صبح کی، صبح سے دوپہر، پھر کتنا ان کھٹن کے وہ کس شوق کے ساتھ جناح گارڈن پہنچا۔ جہاں کے ایک سبز گوشے میں یہ ملاقات ٹھہری تھی۔ وہ اس عجلت کے ساتھ گھر سے چلا جیسے اسے دیر ہو گئی ہے۔ جیسے اس نے رفتار سست کی تو وہ ادھر آئیگی اور اسے نہ پاکر واپس چلی جائیگی۔ اس عجلت میں وہ وقت سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گیا۔ مگر اس نے ایک گھنٹہ پہلے ہی سے اس شدت سے انتظار کرنا شروع کیا جیسے وہ اس گھڑی پہنچنے والی ہے۔ جب کوئی رکشا گیٹ میں داخل ہوتی تو وہ سمجھتا کہ وہ آرہی ہے۔ بیٹھے سے کھڑا ہو جاتا اور دیکھنے کی کوشش کرتا کہ رکشا کے اندر کون بیٹھا ہے؟۔ جب رکشا گارڈن میں اپنی حد میں آکر رکتا تو اس میں سے کوئی اجنبی جوڑا اترتا تو وہ تھوڑا سا افسردہ ہو جاتا اور پھر اس بنچ پر جا بیٹھتا جہاں سے وہ گیٹ میں داخل ہونے والوں کو آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ اس مختصر سے عرصہ میں کتنے جوان جوڑے اس باغ میں آئے اور سبز گوشوں میں گم ہو گئے۔ کوئی رکشا میں سوار آیا۔ کوئی اسکوٹر پر بیٹھ کر پیچھے آگے آیا! یوں بھی ہوا کہ کوئی لڑکی اکیلی رکشا سے اتری اور کسی نوجوان نے لپک کر اس کا استقبال کیا۔ جوان جوڑے آتے ہی چلے جا رہے تھے۔ جیسے ساری ملاقاتیں آج ہی، انہی اوقات میں، اسی باغ میں ہوتی ہیں۔ دن بھی تو سہانا تھا۔ دسمبر کا دن، اگر ابر آلود نہ ہو تو کتنا خوب ہوتا ہے۔ اور پھر اس باغ میں جہاں جا بجا وسیع و عریض سبزہ زار تھے۔ سبزے سے اور دھوپ سے بھرے ہوئے ا کتنی دیر وہ سبزے اور دھوپ سے بھرے ہوئے اپنے گوشے میں پتھر کی بنچ پر سراپا انتظار بنا بیٹھا رہا۔ اور پھر وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور ٹہلنے لگا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھا، بڑبڑایا۔

"اب تک تو اسے آجانا چاہئے تھا۔ پتہ نہیں کیا بات ہوئی —— پھر خود ہی دل کو سمجھایا۔

"کوئی ایسی دیر تو نہیں ہوئی۔ کوئی وقت تو رکشا ملنے میں بھی لگ جاتا ہے۔ بس آرہی ہوگی۔"

اور پھر اس نے بڑی بے کلی کے ساتھ ٹہلنا شروع کیا ایک رکشہ کی آواز نے پھر اسے چونکا دیا۔ دل ہی دل میں طے کیا یہ رکشہ ضرور اسی کی ہے۔ تیزی سے گیٹ کی طرف چلا۔ مگر رکشہ اپنی حد پر آکر رک گئی تھی۔ اور جو لڑکی اس میں سے اتری تھی اسے خوش آمدید کہنے کے لئے ایک نوجوان وہاں پہلے سے منڈلا رہا تھا۔ واپس اپنے گوشے میں آیا۔ اور پھر ٹہلنے لگا۔ بڑبڑایا۔

"پتہ نہیں کہاں رہ گئی؟ کمال کر دیا اس لڑکی نے —— پھر۔ بڑبڑایا۔

"پہلے بھی اس نے یہی کیا تھا...... بعد میں فون کرکے معذرت کر لیگی کہ رکشہ نہیں ملی...... مکار —— برہمی سے بڑبڑایا، چپ ہو گیا۔ اس برہمی نے اس پر یہ اثر کیا کہ ٹہلتے ٹہلتے رکا، بنچ پر بیٹھا، جیب میں ہاتھ ڈال کر سگریٹ کی ڈبیہ نکالی، سگریٹ سلگائی اور دھواں اڑانے لگا۔ بنچ کی پشت سے پیٹھ لگائی اور گیٹ سے نظریں ہٹا کر دور درختوں کو دیکھنے لگا۔ یہ منظر کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ یہاں سے وہاں تک دھوپ ہی دھوپ، دھوپ اور درختوں نے مل کر اس پر اثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ دور تکتے تکتے اسکی آنکھیں مندنے لگیں۔ ٹیکسی کے ہارن نے اسے چونکا دیا۔ ایک ٹیکسی قریب ہی آکر رکی تھی سمجھا کہ وہ آگئی ہے۔ اٹھنے لگا تھا کہ اس میں سے کوئی اجنبی جوڑا اترا۔ اور ہاتھ میں ہاتھ ڈال ڈال کر ایک روش پر ہو لیا۔ اٹھتے اٹھتے پھر وہ بیٹھ گیا۔

اب اسکی آنکھوں میں نیند بھر رہی تھی۔ ایکمرتبہ آنکھیں بالکل ہی بند ہونے لگی تھیں کہ اس نے کوشش کرکے اپنے آپ کو سنبھالا۔

"لو مجھے تو نیند آنے لگی۔ میں سو جاؤں۔ اور وہ آجائے۔ دیکھ کے کیا سوچے گی۔؟...... لو جیسے وہ آرہی ہے —— چپ ہوا، پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولا ——

"ملاقات بھی تو تقدیر سے ہوا کرتی ہے —— ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے چپ ہوا۔ پھر دور درختوں میں دیکھنے لگا۔ دھوپ میں اشنان کرتے ہوئے درخت، جیسے ان درختوں سے نیند اتر رہی ہو۔ اسکے پپوٹے بھاری ہوتے گئے۔ آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

ہڑبڑا کر اس نے آنکھیں کھولیں، ابھی ابھی ایک ٹیکسی اپنی حد پہ آکر رکی تھی۔ اور اس کے اندر سے اترنے والے بچوں نے اسی گوشے کی طرف اتنی تیزی سے دوڑ لگائی تھی، اور اتنا شور مچایا تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے کلائی پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی اور حیران ہوا۔

"اچھا۔ میں اتنی دیر سویا تھا —— اور گھبرا کر جب اس نے گیٹ کی طرف نظر دوڑائی تو دیکھا وہ جا رہی ہے۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے کھڑا ہوا۔ مگر اتنی دیر میں واپس ہوتی ہوئی ٹیکسی اسکے قریب پہنچ چکی تھی۔ ٹیکسی کو اس نے اشارے سے روکا، اور ٹیکسی فوراً ہی گیٹ سے نکل کر نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اور جیسے اسکی ٹانگوں سے کسی نے دم کھینچ لیا ہو۔

❁

"آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

"جی کچھ نہیں" —— وہ سٹپٹا گیا۔

"میرے آنے پر کسی سوچ میں پڑ گئے"۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو" —— مگر دل ہی دل میں اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی۔ یہ وقت ملاقات ہے اور تم پچھلے خیالوں میں کھو گئے۔ اس نے اگلے پچھلے خیالوں کو رفع دفع کیا۔ اور باتیں کرنے کے لئے تیار ہو

(بقیہ صفحہ ۔ ۱۰۶)

ہم کو حالات کی سولی پہ چڑھانے والو! ہم نے ہر حال میں جینے کی قسم کھائی ہے (نذیر فتح پوری)

مڈنائٹ سن

رام لعل :-

صبح سویرے ہم لوگ لوکل ٹرین سے نیشنل تھیٹر تک گئے۔ وہاں سے پیدل سمندر ساحل تک جو بہت دور نہیں تھا۔ آسمان پر کالے کالے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ بارش ہونے کا امکان تھا۔ لیکن ہم سب کے پاس چھاتے تھے اور رین کوٹ بھی۔ میں نے کیچڑ سے بچنے کے لئے اینکل شو بھی پہن رکھے تھے جن کے اندر پتلون کے پائنچے گھوس رکھے تھے۔

ایک سڑک پر ویکیم سے کوڑا نگلنے والی موٹر وین اپنا کام کرتی پھرتی تھی۔ ویکم کی گہری سانسیں کاغذ کا کوئی ننھا سا ٹکڑا بھی نہیں چھوڑتی تھیں۔ کوئی کاغذ اڑ کر فٹ پاتھ پر بھی چلا جاتا تو وین کی ہاتھی جیسی سونڈ وہاں تک پہنچ کر اسے اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

کرنل مان فیری ڈاک پر سٹی ہال کے ایک دیو قامت عریاں بت کے سامنے کھڑا ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ بت ایک جوان و مضبوط جسم والی عورت کا تھا اس کے سامنے کرنل مان ایک بچے کی طرح لگا۔ اسی وقت ایک بادل پانی برساتا ہوا ہمارے سروں کے اوپر سے نکل گیا۔ جب تک ہم اپنے اپنے چھاتے کھولتے ہمارے وجود پانی سے تربتر ہو چکے تھے۔ مسز ناتھن نے کھینچ کر اپنے سر سے ریشمیں اسکارف اتار لیا اور دونوں ہاتھوں کی خوبصورت مٹھیوں میں لے کر نچوڑنے لگی۔

فیری بوٹ کے اندر بہت سے مسافر موجود تھے کرنل مان اور ڈاکٹر ناتھن کینٹین سے ہمارے اور اپنے لئے کافی کے کاغذ کے پیالے اٹھا لائے۔ اور اسی وقت بوٹ لنو ون، جزیرے کے لئے روانہ ہو گئی سمندر کا ساحل اور سٹی ہال کی بلند و بالا عالیشان عمارتوں کا سلسلہ اور اس کے سامنے نصب وہ دیو قامت عریاں بت بھی جلدی جلدی نظروں سے اوجھل ہونے لگے۔ جنہیں میں کافی کے گھونٹ پیتے

پیتے کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ اب میرے سامنے سمندر کی لہریں تھیں جو بوٹ کے ساتھ آ آ کر ٹکراتی تھیں میں جلد ہی کرنل مان کی باتوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ مجھ سے میری تازہ اسٹڈیز کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ میں نے قدیم و جدید نارویجئین زبانوں کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کئے تو اس کے چہرے پر کچھ ناخوشگواری سی پیدا ہو گئی۔ وہ بولا۔" یہ آپ کا کام نہیں ہے ہمارا اپنا گھر کا جھگڑا ہے۔"
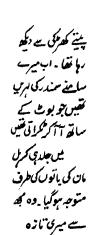
میں نے کہا۔" دنیا کے کسی بھی حصے میں زبانوں کے اختلافات کو تاریخ کے آئینے میں رکھ کر دیکھا جانا چاہیے۔ اور چونکہ، ساری زبانوں کی سرحدیں کہیں نہ کہیں ایک دوسرے سے نہ صرف مل جاتی ہیں بلکہ ایک دوسرے کے اندر بھی گھس آتی ہیں اس لئے ہمیں ان کے مسائل کو سمجھنے کا پورا حق ہے۔ ہمارے اپنے ملک میں دو بڑی زبانوں ـــ اردو و ہندی کے درمیان بھی ایک ایسا ہی ایک جھگڑا چل رہا ہے۔ دونوں ہی عوامی ہونے کی دعویدار ہیں۔ دونوں میں ہزاروں الفاظ مشترک ہیں۔ گرامر بھی دونوں کی ایک ہے۔ صرف رسم الخط الگ الگ ہیں۔

وہ بڑی حیرت سے میری باتیں سنتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر بولا۔" ہم اگر اپنی لائبریری میں اردو زبان کے مسائل پر آپکی تقریر رکھیں تو کیا آپ کرینگے؟"

"کیوں نہیں !"

" ٹھیک ہے، آپ لندن سے واپس آجائیے اس کے بعد دیکھیں گے۔"

پھر وہ مسز ناتھن اور ڈاکٹر ناتھن کے ساتھ میرے لیکچر کے سلسلے میں منصوبہ بنانے لگا۔ اور میں پھر سمندر کی طرف دیکھنے میں محو ہو گیا۔ جس کے آبی جسم پر کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے پھوڑوں یا فالتو ماس کی مانند ابھرے ہوئے تھے۔ بوٹ کسی کسی جزیرے پر مسافروں کو اتارنے، چڑھانے کے لئے ذرا دیر کے لئے رک کر پھر چل پڑتی تھی۔ گھنٹہ بھر کے بعد وہ ایک نسبتاً بڑے جزیرے کے ساحل کے ساتھ جا لگی اور مسافر کشتیوں سے بنے ایک پلیٹ فارم سے ہو کر اس پار اترنے لگے۔

کرنل بولا۔" ہمیں بھی یہیں اترنا ہے۔"

اس وقت پھر بارش ہونے لگی۔ ہم چھاتوں کے نیچے نیچے چلتے ہوئے ایک بس میں جا بیٹھے جو وہاں سے مسافروں کو لے جانے کے لئے پہلے سے موجود تھی بس جلدی ہی بھر گئی۔ اور پھر گھنے اور اونچے اونچے پیڑوں سے گھری ہوئی سڑک پر دوڑنے لگی۔ جزیرہ خاصا وسیع تھا۔ اور سمندر اب ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ کرنل مان نے اسی جزیرے پر ایک بہت ہی خوبصورت کاٹیج بنوا رکھی تھی جس میں دو بیڈ روم، ایک ڈرائنگ روم، چھوٹا سا اسٹور،

سورج کی روشنی میں بھی ظلمت کدہ رہا وہ دل جو اپنے آپ سے ناآشنا رہا (ادیب مالیگانوی)

کچن اور باتھ روم تھا۔ آس پاس کئی کئی ایکڑ پر پھیلی ہوئی زمین اسی کی تھی۔ جس پر لاتعداد پیڑ پودے لگے ہوئے تھے۔ ایک طرف سمندر کا پانی بھی گھسا ہوا تھا۔ لیکن وہ محض ایک تالاب معلوم ہوتا تھا۔ وہاں کچھ لوگ بیٹھے مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔

کرپل کی بیوی جو سٹی ہال میں ملازمت کرتی تھی ہمارے استقبال کے لئے ہفتے کی شام کو ہی وہاں چلی آئی تھی۔ اس نے ہمیں سے جاکر سیدھے چائے کی میز پر بٹھا دیا۔ وہ دونوں ہر سنیچر اور اتوار یہیں آکر گذارتے ہیں۔ ہم لوگ کھڑکیوں کے پردے ہٹا کر بارش کا لطف اٹھاتے رہے اور چائے کا بھی۔ پھر ٹھیک ایک بجے ماریہ کے یہاں چائے کے لئے چل کھڑے ہوئے۔ اب ہم پانچ تھے۔ مسز کرپل مان اور مسز ڈاکٹر ناظن جنگلی میں خود رو بکسیاں توڑ توڑ کر اپنے تھیلوں میں بھرتی گئیں۔ میں رات کو قیام گاہ پر لوٹ کر کھمبیوں کے ذائقے کو یاد کر کر کے دل ہی دل میں خوش ہوتا رہا۔

اب بارش بند ہو گئی تھی۔ اور ہم لوگ پتھریلی اور چکنی پگڈنڈی پر سنبھل سنبھل کر چل رہے تھے۔ آس پاس کی بے پناہ ہریالی کے سلسلہ وار جھنڈوں کے پیچھے چھوٹے چھوٹے کئی مکان تھے۔ وہی جھونپڑیوں جیسے جن کے دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں کے پردے کھنچے ہوئے تھے۔ یہاں انسان بڑے بڑے شہروں کے شور و غوغا سے بچنے کے لئے آتا ہے اور تنہائی سے اپنی ذہنی خوراک حاصل کرتا ہے۔ اگرچہ تنہائی کسی کسی کے لئے عذاب بھی بن جاتی ہے اور خدا کی سب سے بڑی نعمت بھی۔

بلائی لاگیٹ میں ایک کاٹیج کے دروازے پر ایک تنومند گنجا آدمی کھڑا تھا۔ جو ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ کرپل نے بتایا وہ ماریہ کا شوہر ایکسل ہے۔ ایکسل ہم سے فرداً فرداً متعارف ہو کر ہمیں کاٹیج کے اندر لے گیا۔ اور آتشدان کے قریب ایک کرسی پر نیم دراز اپنی افسانہ نگار بیوی سے جاکر ملایا۔ میں نے دہکتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں ایک بالکل بجھی بجھی سی بہتر برس کی خاتون کی طرف بڑی حیرت سے دیکھا جس کا اونچا چھریرا جسم بے حد پرکشش تھا اس کے سر کے بال بالکل سفید تھے۔ اور چہرہ سرخ و سفید کسی قدر لمبوترا بھی جس پر فوراً مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں یک بیک روشنی کی ایک ایسی دلاویز چمک پیدا ہو گئی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ ہم سب سے اٹھ کر ملی اور میرے انڈیا سے آنے کی خبر سن کر تو

وہ میرا ہاتھ کتنے لمحوں تک بڑی مضبوطی سے تھامے ہوئے کھڑی رہی۔ اس کی زبان جیسے اچانک گنگ ہو گئی تھی اور آنکھوں میں آنسو بھی تیرنے لگے تھے۔

اس نے مجھ سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہا۔ "کئی سال ہوئے افریقہ سے بھی ایک رائیٹر آیا تھا۔ وہ ہمارے پاس ایک ہفتہ ٹھہرا تھا۔ اور پھر میرے درد کو بڑھا کر واپس چلا گیا تھا۔"

کچھ لمحے خاموش رہ کر اس نے پھر کہا۔ "اجنبیوں سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے میں ہمیشہ ان کا انتظار کرتی ہوں۔"

اس کے آنسو چھلک پڑے اور اس کا شوہر دوسرے مہمانوں کو ایک اور کمرے میں بٹھا کر ہمارے پاس واپس آگیا۔ بولا۔ "میری بیوی بہت اچھی انگریزی نہیں جانتی۔ لیکن میں آپکی مدد کروں گا۔"

میں نے ماریہ کو بازو کا سہارا دے کر اندر لے جاتے ہوئے دیکھا۔ "یہ جس زبان میں بھی کچھ کہے گی میں سمجھ جاؤں گا۔ اس کی آنکھوں کی زبان بہت آسان ہے۔"

ان کا دوسرا بڑا کمرہ کتابوں، رسالوں، تصویروں اور قسم قسم کی مورتیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہی چھت کے نیچے ڈرائنگ ٹیبل، ڈائننگ ٹیبل اور آرام کرنے کے لئے کئی صوفے پڑے تھے۔ پھر بھی اتنی جگہ باقی تھی کہ بڑے آرام سے اِدھر اُدھر گھوما پھرا جا سکتا تھا۔

اس جگہ نے مجھے آزادی سے سوچنے اور لکھنے کا عجیب سا احساس دیا۔ ماریہ، ایکسل اور میں کمرے کے عین وسط میں کھڑے تھے۔ ماریہ نے سگریٹ سلگائی تھی اور مندی مندی مگر مسرور آنکھوں سے اپنی ان کتابوں کی طرف دیکھ رہی تھی جو اس کا خاوند ایک ایک کر کے مجھے دکھاتا جا رہا تھا۔ (افسانے) ناول، ڈرامے انشائیے، یادداشتیں وغیرہ۔ اس کے پیچھے دیوار پر اس کی جوانی کے زمانے کا ایک بہت ہی شاندار پورٹریٹ ٹنگا ہوا تھا۔ تصویر کو اور اسے دیکھ کر میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔ "وہ بھی انتہا، یہ بھی انتہا"۔

ماریہ نے بتایا۔ "یہ پورٹریٹ میرے ایک مداح قاری نے بنا کر دیا تھا۔"

میں نے کہا۔ "اس نے تم سے عشق بھی ضرور کیا ہوگا"

وہ میری بات سن کر مسکرا دی۔ میں نے اس پورٹریٹ کو اور قریب سے جاکر دیکھا اور کہا۔

"اتنا خوبصورت پورٹریٹ ایک خوبصورت عشق ہی کا اظہار ہو سکتا ہے۔"

اس کے بعد ہم کھانے کی میز پر جا بیٹھے۔ روایت کے مطابق موم بتیاں بھی روشن کر دی گئیں۔ کھانے کے دوران گفتگو بھی جاری رہی۔ ماریہ اور ایکسل دونوں مجھ سے ہندوستان کے بارے میں سوالات پوچھتے رہے۔ ہندوستان کی متعدد زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو زبان کا بھی ذکر چھڑ گیا۔ کھانا ختم ہو گیا۔ لیکن باتیں ختم نہ ہوئیں۔ اب ہم صوفوں پر بیٹھے وائن بھی پی رہے تھے۔ اور نہرو کرشنا مینن، جنتا گورنمنٹ امریکہ، روس، ہنگری وغیرہ پر بھی گفتگو کر رہے تھے یہ سارے موضوعات ایکسل ہی نے چھیڑے تھے۔ ماریہ بڑے مزے سے سگریٹ پیتی ہوئی ہماری باتیں سنتی رہی۔ بیچ بیچ میں کوئی کوئی سوال بھی پوچھ لیتی تھی۔

وہ سگریٹ بہت زیادہ پیتی تھی۔

میں نے اسے بتایا۔ "میں تمہارے افریقی دوست کا وہ مضمون پڑھ چکا ہوں جس میں تمہارے جوان سال شادی شدہ بیٹے کی دردناک موت کا ذکر ہے۔"

اپنے بیٹے کے ذکر پر وہ کہیں دور دیکھنے لگی۔ میلوں دور جو اب کئی برسوں میں تبدیل ہو چکے تھے اور اسے اچانک اشکبار ہوتا دیکھ کر میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اور موضوع بدلنے کے لئے کہا۔ "اپنی کوئی کہانی سناؤ۔"

ایکسل فوراً ایک رسالہ اٹھا لایا جس میں اسکی کہانی 'دی ہسبنڈ' چھپی ہوئی تھی۔ اس نے کہا۔ "ماریہ نارویجین میں سنائے گی اور میں ساتھ ساتھ ترجمہ کرتا جاؤں گا۔"

وہ کہانی ایک مظلوم عورت کے بارے میں تھی۔ جو اپنے شرابی شوہر کے ہاتھوں روز پٹتی تھی اور روز ہی گھر چھوڑ دینے کا مصمم ارادہ کر لیتی تھی لیکن جب اسے اپنے آدمی کے لئے کھانا بنا کر رکھنے اور اس کے کپڑے دھونے، اور ٹوٹے ہوئے بٹن لگا دینے کا خیال آتا تو وہ وہاں سے چلی جانے کا ارادہ ترک کر دیتی تھی۔

عورت کی مظلومیت اور ایثار ہر کہیں ایک سا ہے۔ وہ صدیوں سے مرد کی ضروریات کا وسیلہ بنتی آئی ہے۔ ماریہ بھی ایک عورت تھی۔ اس کا آدمی اس کا عاشق معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسا لگتا تھا وہ اسے کبھی ایک لمحے کے لئے بھی دکھی

ہم سے سیکھیں اہلِ گلشن زندگی کا احترام وقت کے اوراق پر جو نقش جم رکھتے نہیں (یعقوب عثمانی)

نہیں ہونے دیتا ہوگا۔ لیکن پھر بھی وہ کس قدر دکھی تھی۔ اس کی آنکھیں اور اس کی کہانی ایک سسکی داستان کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

جب ہم چلنے لگے تو اس نے مجھے اپنی ایک تصویر آٹوگراف کے ساتھ دی جس میں وہ ایک پیاری سی بچی کو اپنی گود میں لئے ہوئے اسے چوم رہی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ "آج میں نے حقیقی معنوں میں ایک بہت ہی پیاری اور مہربان روح تک پہنچنے کا سفر کیا۔"

یہ سن کر اس نے مجھے بڑے پیار سے گلے لگایا اور چوم لیا۔ اب تک میں کتنے غیر ملکی لوگوں سے مل چکا تھا۔ انہی کی سرزمین پر ــــ مرد، عورتیں، شدید مزاج کے لڑکے اور نوخیز و شوخ لڑکیاں۔ ان کے ساتھ بھی میری بیشتر موضوعات پر باتیں ہوئی تھیں۔ پولٹکس، تارکین وطن کے مسائل، علم و ادب اور جنسیات تک پر۔ کئی ایک کے ساتھ شرابیں پی تھیں ڈانس کیا تھا، اور جوا کھیلا تھا۔ اور ان کے نازک ترین جذباتی لمحات بھی دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ لیکن جس قدر طمانیت اور محبت مجھے اس بزرگ خاتون سے مل کر حاصل ہوئی اسے میں بڑی اہمیت دیتا ہوں۔

ماریہ اور ایکسل ہمیں اپنی کالج کے گیٹ تک چھوڑنے کے لئے آئے۔ میں نے رخصت ہونے سے پہلے ماریہ کو بتایا "میں کچھ روز کے لئے لندن جا رہا ہوں۔ وہاں سے لوٹ کر لیسی بو کے سیمینار میں شرکت کروں گا۔ وہاں سارے ہی مقامی ادیب آئیں گے۔ امید ہے تم سے بھی ایک ملاقات اور ہو جائے گی!"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب تک میں اسے دکھائی دیتا رہا وہ گیٹ پر کھڑی ہاتھ ہلاتی رہی۔ انہی لمحوں میں بادلوں کے پیچھے جا چھپنے والا سورج بھی پھر سے نکل آیا تھا اور اس کا چہرہ اچانک گلنار سا ہوگیا تھا۔

لندن سے لوٹ کر میں دوسرے ہی دن لیسی بو کے سیمینار میں چلا گیا۔ وہاں تیرہ ملکوں کے نمائندہ ادیب اور صحافی پہنچ چکے تھے۔ ہم سب کو اوسلو سے ساٹھ کیلومیٹر دور ایک پہاڑی مہمان سرائے میں الگ الگ کمروں میں ٹھہرایا گیا۔ ہر ایک کمرہ میں ایک آرام دہ پلنگ، صوفہ سیٹ، رائٹنگ ٹیبل، ریڈیو، ٹیلیفون ٹی وی، اور باتھ روم تھا۔ تنہا رہنا مجھے اچھا لگا۔ اگرچہ لکڑی سے بنی ہوئی اس عمارت کے نیچے ڈائننگ ہال میں بہت شور تھا۔ سب سے زیادہ شور مچانے والے ناروجیئن رائیٹرز تھے۔ جن کے دو گروپ تھے پروگریسو اور اینٹی پروگریسو۔ اینٹی پروگریسیو گروپ کے ادیبوں کو شکایت تھی کہ ان کے بیشتر ممتاز ادیبوں کو سیمینار میں مدعو کیوں نہیں کیا گیا۔ ہم لوگ جو ہندوستان، انگلینڈ، آئرلینڈ، ہنگری، افریقہ وغیرہ ممالک سے گئے تھے۔ ان کی زبان سے نابلد ہونے کی وجہ سے یا تو بڑی خاموشی سے ان کے پرجوش چہرے تاکتے رہے یا پھر ایک دوسرے سے متعارف ہوتے رہے۔

پولینڈ کے ایک اخبار کی جرنلسٹ لڑکی گرازنیا سے میری دوستی وہیں ایک ٹیبل پر ہوگئی تھی، وہ لمبی ناک والی دبلے پتلے جسم کی بڑی متحرک لڑکی تھی۔ جس پر انگلینڈ کے ماہنامہ 'سگنیچرز' کے ایڈیٹر کی بھی نظر تھی۔ وہ اسے تین بار اپنی باتوں میں لگا کر میری ٹیبل سے کھسکا کر لے گیا تھا۔ لیکن پہلی ہی شام کو گرازنیا نے میرے کمرے میں آکر شراب پینے کی دعوت قبول کر لی تھی۔ دراصل اسے ہندوستان کے قدیم مذاہب سے بڑی دلچسپی تھی۔ دو ہی پیگ پی لینے کے بعد اس نے بتایا "میں اس یقین میں بری طرح مبتلا ہوں کہ میرا اگلا جنم ہندوستان میں ہوگا اور میں کسی مندر میں دیوداسی بن کر زندگی گزاروں گی۔"

میں نے اسے بہت یقین دلانے کی کوشش کی۔ ہندوستان میں دیوداسیوں کی قدیم رسم ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکی ہے لیکن وہ نہ مانی۔ اور پھر اچانک نشے میں بڑبڑانے لگی۔ "میں بہت جلدی خودکشی کر لوں گی تاکہ جلد سے جلد دوسرا جنم لے سکوں۔"

میں نے اس کا دھیان ہٹانے کے لئے میوزک کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور جب میں نے ریڈیو پر ڈرم بیٹرز کی ایک تیز دھن تلاش کر کے اسے ناچنے کی دعوت دی تو اس نے کہا۔

"ٹھہرو، میں تمہیں اپنا ایک سولو ردم کا کیسٹ سناتی ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی جو اسی گیلری میں تھا۔ جلدی ہی واپس آگئی۔ اس کے ہاتھ میں ٹیپ مشین اور تین چار کیسٹ تھے۔ ایک کیسٹ لگا کر وہ اپنے بار بار پھسلتے آنچل کو سنبھالتی رہی۔ ردم بہت دھیما تھا۔ وہ اسی کے مطابق آنکھیں بند کر کے اور اپنے دونوں لمبے بازو گردن کے پیچھے رکھ کر دھیرے دھیرے اسٹیپ لیتی رہی۔ میں اپنے صوفے میں گڑ دبا ہوا اس کے جسم کو گہری نظروں سے دیکھتا رہا۔ ایک دو بار اٹھ کر اس کا ساتھ دینے کی کوشش بھی کی لیکن مجھے لطف نہ آیا تو پھر سے گلاس بنانے کے لئے بیٹھ گیا۔ ایک گلاس اس کے لئے بھی بنایا اور اس کے سامنے لے گیا۔ میرے ہاتھ سے گلاس لے لینے کے بجائے وہ میرے گلے سے لپٹ گئی اور رو رو کر بتانے لگی ــ

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا میں آج ہی مر جاؤں، اسی طرح ناچتے ناچتے ــ اور ــ روتے روتے!"

میں نے اسے اپنے پاس صوفے پر بٹھا لیا اور اس کے چہرے پر گرے ہوئے بال ہٹا کر پوچھا۔

"تمہیں اپنے بچپن کا کوئی خاص واقعہ یاد ہے؟ تمہارے ماں باپ کیا کرتے ہیں؟ تم لوگ کتنے بھائی بہن ہو؟"

اس نے کہا۔ "میرا باپ ایک گھڑی ساز تھا۔ اب وہ مر چکا ہے۔ میری ماں بہت خوبصورت ہے لیکن میں اس پر قطعاً نہیں گئی ہوں۔ تم دیکھتے ہو میں زیادہ خوبصورت ہرگز نہیں ہوں۔ لیکن میری ماں کو یہ وہم تھا میں ہی اس کی سب سے دلکش اولاد ہوں ــ چار بہن بھائیوں میں سے ــ اور وہ چاہتی تھی کہ میں ایکٹریس بنوں۔ لیکن میں نے جرنلسٹ ہی بننا پسند کیا۔"

اس نے میز پر رکھا ہوا گلاس ہاتھ بڑھا کر اٹھا لیا اور ــــــ ایک ہی سانس میں پی گئی۔ پھر کہنے لگی۔ "مجھے یاد آتا ہے میں اپنے بچپن میں اپنے گھر کی ایک بار کھڑکی سے کود پڑی تھی اور میری ایک ٹانگ ٹوٹ گئی تھی۔ پھر کئی مہینے پلاسٹر میں جکڑی ہوئی پڑی رہ گئی۔ مجھے بس یہی ایک واقعہ یاد ہے۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگی ــ اور اٹھ کھڑی ہوگئی۔

اس نے اپنے بدن کو ادھر ادھر حرکت دے کر سیدھا کیا۔ پھر جھک کر ہاتھوں سے اپنے پاؤں کے انگوٹھوں کو چھوا اور بولی ــ

"پچھلے تین روز سے میں ایک بوائے فرینڈ کے ساتھ تھی۔ آئی ہیڈ ٹو مچ سیکس! بہت تھک گئی ہوں۔ لیکن ناچنے کو جی چاہ رہا ہے۔ آج ہم لوگوں

رقیب بھی تو اسے کان رکھ کے سنتے ہیں
عجب طرح کا مزا ہے مرے فسانے میں (داغ)

کے لئے الاؤ کے گرد ڈانس کا بھی توپروگرام رکھا گیا ہے۔ مجھے وہاں ضرور جانا چاہئے۔"

یہ کہہ کر وہ باہر چل دی۔ "سی یو!" وہ دروازے پر ذرا سی رک کر مسکرائی پھر غائب ہوگئی۔

اگلے روز خوب بارش ہوئی لیکن سارا دن عالمی سنسر شپ پر مقالات اور بحثوں کی نذر ہوگیا۔ ایک پیپر ہم نے بھی انگریزی میں پڑھا تھا "ہندوستان میں اظہار کی آزادی"۔ جس کے نارویجین ترجمے کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں ہر شخص کو دیدی گئی تھیں۔ بحثوں ہی سے اکتا کر کچھ لوگ باہر نکل جاتے تھے۔ گرازینا اسپیکنگ ڈیسک کے پاس اپنے سامنے ریڈوائن کا ایک گلاس رکھے بیٹھی تھی اور اپنے اخبار کے لئے نوٹس لینے میں مصروف تھی۔ ایک مقامی روزنامہ کا رپورٹر مغربی جرمنی کی باربرا گینشگو کو میرے پاس بٹھا گیا تھا تاکہ وہ میری اس کی فوٹو اتروا سکے۔ نارتھ نارویے کا ٹیچر سکو گھم اچانک قرقرش پر پلیٹ لگا کر باہر جانے لگا۔ لیکن ایک مقرر کی کوئی خاص بات سن کر رک گیا اور تیز تیز لہجے میں اسے جواب دینے لگا تو گرازینا زور سے ہنس پڑی۔ میں نے اچانک اسی لمحے ہال کے گیٹ پر ماریہ کو نمودار ہوتے ہوئے دیکھ لیا۔ اور چونک کر کھڑا ہوگیا۔

ماریہ اپنے جوتے ہاتھ میں اٹھائے ہوئے میرے پاس پہنچی۔ تاکہ لکڑی کے فرش پر چلتے وقت آواز نہ پیدا ہو۔ اس نے دوسرے ادیبوں کے ساتھ بس نظروں سے ہی دعا سلام کی اور مجھ سے کہنے لگی۔

"تم جانتے تھے اس سیمینار میں مجھے مدعو نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن میں صرف تم سے ملنے کے لئے آگئی ہوں۔ ایکسل مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا ہے۔"

میں اسے سہارا دے کر باہر لے گیا۔ سیمینار سے میری دلچسپی یوں بھی ختم ہوچکی تھی کہ ساری بحث نارویجین زبان میں ہو رہی تھی۔ میری مترجم نے اگلے روز صبح آنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ وہ اخبارات میں چھپے ہوئی اب تک کی بحثوں کے پورے نوٹس انگریزی میں بنا کر ساتھ لے آئے گی۔ ابھی تک مجھے یہ تک نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ میرے پیپر کے بارے میں کس نے کیا کہا تھا! ایسے وقت میں ماریہ کا آجانا مجھے اچھا ہی لگا۔ اسے میں کینٹن میں لے گیا۔ ہم دونوں نے گرم گرم کافی پی اور پندرہ روز پہلے اس کے جزیرے والے مکان پر اس کے ساتھ ہوئی ملاقات کو یاد کر کر کے ہنستے رہے۔

اس نے بتایا "میرے مرحوم بیٹے کی بیوی اپنے دوسرے شوہر کے ساتھ ایک ویک اینڈ گزارنے کے لئے ہمارے پاس آگئی تھی۔ اور بہت خوش تھی۔ ایکسل نے اس کے ساتھ خوب شراب پی اور رمی کھیلی"

سیمینار ختم ہوگیا تو بہت سے لوگ ادھر ہی پہنچ گئے۔ میں اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے اسے بیڈ پر لٹا دیا اور اس کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اپنے لندن کے سفر کے بارے میں وہاں کون کون سی جگہیں دیکھی تھیں، کن کن لوگوں سے ملا تھا۔ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں سے اور بی بی سی کے انٹرویو میں مجھ سے کون کون سے دلچسپ سوالات پوچھے گئے تھے۔ پھر مجھے اچانک ایک ڈینش لڑکی ایلس یاد آگئی جس نے میرے ساتھ ہوائی جہاز میں لندن تک اور واپسی پر پھر اوسلو تک سفر کیا تھا۔ اسے ڈینش ہونے کا بڑا غرور تھا۔ دنیا کے ہر بڑے آرٹسٹ اور آرٹسٹ کا رشتہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک ڈنمارک سے ضرور ملا لیتی تھی۔ میں نے اسے چھیڑنا شروع کیا تو وہ پریشان ہوگئی۔ سمجھ گئی میں اس کی زیادہ تر باتوں کو سنجیدگی سے نہیں لیتا ہوں یہ سب سن کر ماریہ ہنس پڑی۔

میری باتوں کے دوران وہ سارا وقت میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے رہی۔ اور میری طرف بڑی محبت سے تاکتی رہی۔ میں نے اسے شراب آفر کی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی لیکن اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے پاس ہی بیٹھا رہوں تو میں نے اس کی کمر میں اپنا بازو حمائل کرلیا اور کہا "تمہیں اتنی رات گئے واپس نہیں جانا ہوگا۔ اگر ایکسل آئے گا تو اسے واپس کردوں گا۔"

یہ سن کر اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ کتنے لمحوں تک میری طرف مسرور نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں رفتہ رفتہ آنسو بھی تیر آئے جنہیں چھپانے کے لئے اس نے میرے گال کے ساتھ اپنا گال لگا لیا اور بولی "میں نے اسے منع نہیں کیا تھا لیکن وہ آئے گا تو کہدوں گی واپس چلا جائے۔"

میں بہتر سالہ خوشنما چہرے والی اس نامور ادیبہ کو اپنے پاس پاکر بہت خوش تھا جو اپنی جوانی میں بے پناہ خوبصورت رہی ہوگی۔ اس پہ کتنے لوگ مرمٹے ہوں گے۔ بیٹے کی موت کے غم نے اسے بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اسی لئے اس کی کہانیوں میں بھی بڑا کرب محسوس ہوتا تھا۔

وہ بار بار سگریٹ اور شراب پیتی رہی اور اپنی زندگی کے بارے میں بولتی رہی "میری ماں ایک جپسی قبیلے کی عورت تھی۔ لوگ اس سے بہت نفرت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ اسے ایک جادوگرنی سمجھتے تھے۔ ایک چڑیل بھی جو دوسروں کے بچے اٹھالے جاتی ہے۔ لوگوں کو تنہا پاکر ان کے کلیجے چبا جاتی ہے۔ وہ یہ سب نہیں کرتی تھی تب بھی لوگ اسے اپنی آبادیوں کے نزدیک نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ ایک بار اسے بہت پیٹا گیا تھا۔ لوہے کے ڈنڈوں سے اور پتھروں سے۔ وہ ایک جرمن کسان کی محبت میں گرفتار ہوگئی تھی۔ اس سے راتوں کو چھپ چھپ کر ملنے کے لئے کتنے پہاڑی راستوں اور جنگلوں میں سے ہوکر پہنچ جاتی تھی۔ میں انہی کی مخلوط اولاد ہوں۔ تم نے میری آنکھوں میں شاید غور سے جھانک کر نہیں دیکھا۔ میری دونوں آنکھیں ایک سے رنگ کی نہیں ہیں۔ یہ مکسڈ بلڈ کا نتیجہ ہے۔ اسی لئے لوگ مجھ سے بھی نفرت کرتے تھے۔ اب بھی کرتے ہیں۔ اگرچہ میں نے اپنے ملک کے لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ کئی کتابوں پر انعامات بھی لے چکی ہوں۔ لیکن وہ مجھے بھی ایک چڑیل ہی سمجھتے ہیں۔ اگرچہ میں بے حد خوبصورت تھی شاعر مجھ پر نظمیں لکھتے تھے۔ مصور میری تصویریں بناتے تھے لیکن میرے ساتھ کوئی شادی کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا تھا جس مصور کی تم نے میری بنائی ہوئی تصویر دیکھی تھی وہ مجھ پر جی جان سے فدا تھا۔ لیکن لوگوں کے ڈر سے اس نے میرے ساتھ شادی نہ کی۔ میرا مرحوم بیٹا اس کی نشانی تھی۔ اسے بھی میں نے اپنی ماں اور سوسائٹی سے ملنے والی نفرت ورثے میں دی تھی۔ جسے بھلانے کے لئے وہ بڑی فاسٹ لائف گذار رہا تھا۔ کلبوں میں جاتا تھا بے تحاشہ شراب پیتا تھا اور جوا کھیلتا تھا اور لڑکیوں کے پیچھے بھاگتا تھا کھیل کا بھی شوقین تھا۔ موٹر سائیکل ریس میں جیتنے کے لئے وہ کتنے ملکوں کے مقابلوں میں شامل ہوا۔ آخر اسی میں اس کی موت ہوگئی۔ وہ زخموں سے چور چور ہوکر چل بسا۔ میں اس کی لاش دیکھنے کیلئے مورچری میں گئی اور اسے اتنی بری حالت میں دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی۔ ایکسل مجھے وہیں مل گیا تھا۔ وہ ایک مدت سے میرا قاری تھا۔ میری تحریروں کا بے پناہ دلدادہ۔ مجھے مرنے سے بچانے کے لئے اس نے

برق کا آسمان پر ہے دماغ — پھونک کر میرے آشیانے کو (مومن)

میرے ساتھ شادی کرلی تھی۔ اگرچہ عمر میں مجھ سے کافی چھوٹا تھا۔ وہ کئی لحاظ سے ایک اچھا ہسبنڈ ہے۔ میں اسکی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ ان لوگوں سے بھی بڑے اخلاق سے پیش آتا ہے جنہیں میں بے تحاشا چاہتی ہوں۔ میں تم سے دوبارہ ملنے کے لئے بیتاب تھی۔ میں نے اس سے کہہ دیا تھا مجھے مرنے سے پہلے تم سے ایک بار ضرور ملنا ہے۔ اسی لئے وہ مجھے یہاں لاکر چھوڑ گیا۔"

یہ کہتے کہتے وہ چپ ہوگئی۔ میری طرف گہری نظروں سے دیکھتی ہوئی مسکرانے لگی۔ میں بھی اسکی آنکھوں میں بالکل ڈوباڈوبا سا دیکھ رہا تھا۔ میں نے پہلی بار اس کی دونوں آنکھوں کے رنگوں کے فرق کو پہچانا ۔۔ ایک سبز رنگ کی تھی، دوسری نیلے اور سبز ملے جلے رنگ کی۔ ایک لمحے کے لئے تو میں یہ سوچ کر کانپ گیا، کیا چڑیلیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ اس تنہائی میں وہ موقع پاکر میرا بھی کلیجہ نوچ کر نہ چبا جائے۔ میں نے اپنے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس کرلئے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں وہ مجھے بے انتہا خوبصورت معلوم ہونے لگی۔ جب اس نے مجھے اپنے سینے کے ساتھ چمٹا لیا اور گہرے گہرے سانس لیتی ہوئی کہنے لگی:

"مجھ سے ڈرو نہیں۔ تم مجھے پہلی نظر میں ہی بہت اچھے لگے تھے۔ میں یوں بھی تم سے اسی محبت سے ملتی کیونکہ تم سات سمندر پار سے مجھ سے ملنے کے لئے آگئے ہو۔ کیا تم نے کبھی سوچا تھا کہ میں یہاں ایک چھوٹے سے جزیرے پر تمہارا انتظار کررہی ہونگی کتنے برسوں سے! اسی انتظار میں میرے بال سفید ہوچکے ہوں گے! میرا جسم ڈھل گیا ہوگا۔ تمہیں دینے کے لئے اب میرے پاس کچھ بھی باقی نہیں رہ گیا ہوگا! سوائے محبت کے۔"

اس نے میرے ہونٹوں پر ایک طویل بوسہ دیا۔ جذبے سے بھرپور۔ اور میں نے ایسا محسوس کیا، وہ ایک بوڑھی عورت ہرگز نہیں ہے۔ میرے بدن کے ساتھ لگتے ہی اس کا جسم بیدار ہوگیا ہے۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے اعضاء اور پلپلے گوشت میں اچانک ایک جوان عورت کی سی سختی اور گرمی پیدا ہوگئی ہے۔ اور یہ وہی خوبصورت عورت ہے جسے دیکھ کر کتنے لوگ آہیں بھرا کرتے تھے۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ پھر کچھ بھی نہ دیکھا اور اسے اپنے بازوؤں میں پوری طرح جکڑ لیا۔ اسے بےشمار بوسے دیئے اور جب وہ تھک کر بستر پر گر پڑی تو اپنی آنکھیں بند کرکے بولی۔ "بس! یہاں سر رکھ کر سوجاؤ، بے بی میرے سینے پر۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"!!

بقیہ خودکشی۔! ---

تھوڑی دیر کے بعد گاڑی قریب آگئی ۔۔ زاہد آگے بڑھا، مگر اس نے دیکھا کہ ایک آدمی کہیں سے نمودار ہوا اور پٹڑی کے عین درمیان کھڑا ہوگیا۔ گاڑی تیز رفتار سے آرہی تھی۔ اور قریب تھا کہ وہ آدمی کی اسکی جھپٹ میں آجائے۔ وہ تیزی سے لپکا اور اس آدمی کو دھکا دے کر پٹڑی کے اس طرف گرادیا ۔۔ گاڑی دندناتی ہوئی گذر گئی۔

اس آدمی سے زاہد نے کہا۔ "کیا تم خودکشی کرنا چاہتے تھے"

اس نے جواب دیا "جی ہاں"

"کیوں"

"بس ۔۔ صدمے اٹھاتے اٹھاتے اب جینے کو جی نہیں چاہتا۔"

زاہد ناصح بن گیا۔ "بھائی میرے، زندگی زندہ رہنے کے لئے ہے۔ اس کو اچھی طرح استعمال کرو۔ خودکشی بہت بڑی بزدلی ہے ۔۔ اپنی جان خود لینا کہاں کی عقلمندی ہے ۔۔ اٹھو اپنے صدموں کو بھول جاؤ ۔۔ انسان کی زندگی میں صدمے نہ ہوں تو خوشیوں سے کیا حظ اٹھائے گا ۔۔ چلو میرے ساتھ۔"

(۲۵ مئی ۵۴ء)

—— x ——

بقیہ دھوپ ---

بیٹھا۔ مگر پھر دیر ہوگئی۔ اور اسے کوئی بات ہی نہ سوجھی۔

"ویسے میں سمجھ رہی ہوں تھی کہ میں پہنچوں گی تو آپ سو رہے ہوں گے۔"

"آج میں نہیں سو سکتا تھا۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ آج مجھے کسی کا انتظار نہیں تھا"۔

وہ مسکرائی۔ یہ پاکر وہ بھی مسکرا دیا پھر بولا "دھوپ کا بھی تو اپنا جادو ہوتا ہے۔ آپکو دھوپ کیسی لگتی ہے؟"

"دھوپ کیسی لگتی ہے؟" وہ چکراگئی۔

"جی ہاں۔ میرا مطلب ہے، جاڑے کی دھوپ ۔۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر جاری ہوگیا ۔۔" دیکھئے موسم درجہ حرارت کا نام نہیں۔ کیفیت کا نام ہے ایک موسم باہر ہوتا ہے۔ ایک موسم ہمارے اندر ہوتا ہے اور ہر موسم کا ایک پھل ہوتا ہے۔ معلوم ہے جاڑے کے موسم کا پھل کیا ہے؟

"کیا؟"

"دھوپ!"

"دھوپ؟"

"جی ہاں دھوپ! جاڑوں کا پھل بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ بس جی چاہتا ہے کہ جاڑوں کی دوپہر ہو۔ چاروں طرف دھوپ ہی دھوپ، میں دھوپ میں نہا جاؤں۔ اور سوجاؤں۔ اور پھر کوئی دھوپ پری آئے اور آہستہ سے اپنی انگوٹھی میری انگلی میں پہنا کر چلی جائے۔ اور جب میں جاگوں تو حیرت سے اپنی انگلی دیکھوں اور سوچوں کہ انگوٹھی کسنے پہنائی مگر ..."

کہتے کہتے وہ رکا اور اداس ہوگیا۔ وہ ہنس پڑی۔

"کمال ہے آپ ہنس رہی ہیں۔ اور میں اداس ہوگیا ہوں۔"

"وہ کیوں"؟

"اپنی خالی انگلیاں دیکھ کر! ۔۔ وہ پھر ہنس پڑی ہنستے ہنستے اس نے اس پر ایک نظر ڈالی۔

"اداس ہوکر آپ سو تو نہیں جائینگے۔؟"

"جی ۔۔ اور اسے اچانک لگا جیسے اسکے پپوٹے بھاری ہورہے ہیں" لیجئے مجھے تو سچ مچ نیند آنے لگی۔

"مگر یہاں تو دھوپ نہیں ہے۔ اس نے قہقہہ لگایا۔

"دھوپ؟ وہ غنودآمیز آواز میں بڑبڑایا۔" جاڑے کی دھوپ۔ بس یہی لگ رہا ہے۔ اور اسکی آنکھیں مندتی چلی گئیں۔

اس نے حیرت سے اسے دیکھا۔ دیکھتی رہی، پھر قریب میز پر پڑی ہوئی کتاب اٹھائی۔ اسکے صفحے الٹنے پلٹنے لگی۔ جہاں تہاں سے پڑھتی اور صفحہ الٹ دیتی پھر اس نے ایک لمبی جمائی لی۔ اور کتاب کو الگ ڈال دیا۔ اسے دیکھا۔ وہ تو باقاعدہ سو رہا تھا۔

"عجیب آدمی ہے"۔

وہ بڑبڑائی پھر اسکے پپوٹے بھی بوجھل ہونے لگے۔

پور ڈیئر

جوگندر پال

میں سفید کپڑے پہنے ہوئے ہوں۔ جانے مغرب میں ماتمی لباس سیاہ رنگ کا کیوں ہوتا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کا سفید رنگ ہر دم خوشی یا غمی میں کھلکھلا کر ہنستا رہتا ہے اور سیاہ لباس میں ان کے رنگ کی بشاشت ذرا سی اداس دکھائی دے کر اور بھلی بھلی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن ہم ہندوستانی عورتوں کا گندمی رنگ چھپ چھپ کر ہنسنے کا اور چھپ چھپ کر رونے کا عادی ہے۔ اسی لیے دن کی شگفتہ روشنی میں ہم اپنی مسرت سیاہ ملبوس میں ڈھانپ لیتے ہیں اور اندھیارے سمے ہمارے بدن کی کٹی کٹی گرانباری اطمینان سے سلک کی سفید ساڑی میں منہ چھپا لیتی ہے۔ اور گندمی رنگ کی یہ دونوں کیفیات خوب رو ہیں۔

میں اپنی اطالوی ٹیرالین کی سفید ساڑی کی طرف دیکھتی ہوں جو میرا مرحوم شوہر اپنی موت سے چند ہی دن پیشتر بمبئی کے کسی اسمگلر سے دگنی تگنی قیمت ادا کر کے لایا تھا۔

"شیلی! وہ سالا کسی قیمت پر بھی ساڑی دینے کو تیار نہ تھا۔ میں نے کہا، سالے جاتے کہاں ہو؟ یہ لو پورے ڈھائی سو روپے۔"

اپنی ساڑی کے سفید بے داغ ماتمی رنگ کو تفکر سے دیکھ کر میری آنکھوں میں پانی بھرنے لگا ہے۔

"مرنے والا بے چارہ صرف اسی لیے زندہ تھا کہ میری ہر چھوٹی بڑی خواہش پوری کرے۔ مگر اب؟"

میں نظر اٹھا کے اپنے سامنے انکم ٹیکس آفیسر کی طرف دیکھتی ہوں۔ جو میرے مرحوم شوہر کی جائیداد پر ڈیتھ اسٹیٹ ڈیوٹی عائد کرنے کے لیے میرے پیش کردہ کاغذات پہ اپنا گنجا سر اس طرح جھکائے ہوئے تھا جیسے ــــ جیسے میرا شوہر دیپ بزنس ٹرپ سے لوٹتے ہی اپنی ساری توجہ میرے اوپر مرکوز کر دیتا تھا۔

انکم ٹیکس آفیسر کا چہرہ تنومند ہے۔ دیپ سے شاید دو تین سال چھوٹا ہی ہوگا۔ دیپ سے شادی ہونے سے پہلے میرے بیاہ کی بات ایک انکم ٹیکس آفیسر سے بھی چلی تھی۔ پتا جی نے اسے چائے پہ بلایا تھا۔ لیکن جواب آیا کہ دفتر میں کام زیادہ ہونے کی وجہ سے جناب تشریف نہیں لا سکتے ــــ

اوہ! میں ساڑی درست کر کے اپنے دیپ کے متعلق سوچتی ہوں اور مجھے غصہ آنے لگتا ہے کہ یہ انکم ٹیکس آفیسر میری طرف کیوں نہیں دیکھ رہا۔

"ان کے بیمہ کی رقم کتنی ہے؟" دفعتاً انکم ٹیکس آفیسر سر اٹھاتا ہے۔

"کتنے کی؟" میں دیکھ رہی ہوں اس کا سر ضرور گنجا ہے لیکن سرخ و سپید چہرے پر شیو کیے ہوئے بالوں کی جڑیں بڑی گہری اور گھنی ہیں۔ "ارے ہاں ان کے!" مجھے خیال آتا ہے کہ میرے لہجے سے بیوگی ٹپکنی چاہیے۔ "ڈیڑھ لاکھ!"

جس دن دیپ نے یہ بیمہ کروایا تھا۔ اس رات میں نے اس سے کہا تھا۔ "میری ساری دولت تو تم ہو دیپ!"

"ہاں!" دیپ نے جواب دیا تھا۔ "لیکن میں چاہتا ہوں جب میں نہ رہوں تو بھی تمہاری دولت، تمہاری ساری خوشی بنی رہے!"

"کیسے ــــ؟ کیا ــــ کیا ــــ؟"

مجھے یوں ہی خیال آنے لگا ہے کہ انکم ٹیکس آفیسر بے چارہ کنوارا ہے یا رنڈوا۔ کیونکہ اپنے کام میں کچھ اس طرح گڑا ہوا ہے جیسے اس بھری پُری دنیا میں اس کا کوئی نہ ہو۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا ہے اور میرا منہ بغیر کسی کوشش کے لٹک کر ماتمی ہو گیا اور میں سوچ رہی ہوں کہ میری زندگی اب کیوں کر کٹے گی؟ کیا میں تن تنہا اس پہاڑ کا بوجھ اٹھا پاؤں گی؟ اس کی زندگی کیوں کر کٹتی ہوگی۔ نہیں نہیں ــــ

۔ یہ دولت یہ جائیداد، یہ آنتا بڑا اجڑا ہوا مکان۔ میں اس کا کیا کروں؟ میں اسے بسا سکتی ہوں؟ اکیلی؟ ــــ اکیلی ــــ؟ میں کیا کروں ــــ؟ کس کے پاس جاؤں؟ کس کے ــــ؟ میری آنکھوں سے آنسو پھوٹ پڑے ہیں۔

"آئی ایم ساری میڈم ــ!" انکم ٹیکس آفیسر نے میری طرف دیکھ کر کہا ہے۔ "اگر آپ چاہیں تو ہم یہ کام اگلے ہفتے تک بھی اٹھا سکتے ہیں۔"

"نہیں! کوئی بات نہیں۔" میں نے سوچا ہے مجھے اگلے ماہ کے اوائل میں پہاڑ پر جانا ہے اگر ٹیکس کی ادائیگی نہ ہوتی تو خوامخواہ سارا سرمایہ پھنسا رہے گا۔

"آپ آج ہی سارا کام ختم کر دیجئے!"

انکم ٹیکس آفیسر کے چہرے پر فکر مند ہمدردی کے ساتھ اس کی ہلکی سی مسکراہٹ کہیں بکھر کر مبہم ہو گئی ہیں۔

"جیسی آپ کی مرضی!"

غالباً وہ جانتا ہے کہ اپنی بیوگی کا غم بھلانے کے لیے اس وقت مجھے اپنے مرحوم شوہر کی دولت کی کتنی ضرورت ہے۔

"آپ کے وکیل نے یہ کاغذات بہت محنت سے تیار کیے ہیں۔" وہ سگریٹ سلگانے کے لیے کام کرتے ٹھیر جاتا ہے۔ "اور غلطی کا امکان نہیں، تاہم ہمیں بھی اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے۔"

دیپ سگریٹ سلگایا کرتا تھا تو میں چِڑ جاتی تھی۔

"کئی بار کہا ہے میرے سامنے سگریٹ نہ پیا کرو!"

"تو کیا کسی پرائی استری کے سامنے پیا کروں؟"

ہاں واقعی پرائی استری مرد کو سگریٹ پیتے دیکھ کر جھلاہٹ محسوس نہیں کرتی بلکہ سگریٹ کا دھواں سونگھ کر اس بیچاری کو تو تسکین ہوتی ہے کہ اس پاس کوئی مرد بیٹھا ہے۔

"آپ کا ایک آبائی مکان امرتسر میں بھی ہے؟" انکم ٹیکس آفیسر

ہم بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے ۔۔۔ تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی (مومن)

نے میری جائیداد کے کاغذوں پر نظر دوڑا کر پوچھا۔
"ہاں! حکم سنگھ روڈ پر۔"
حکم سنگھ روڈ پر ہی میری پہلی ملاقات دیپ سے ہوئی تھی۔ ہمارا گھر جالندھر میں تھا لیکن وہاں ایم اے کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ تھا اس لئے میں امرتسر میں اپنے چچا کے ہاں رہتی تھی۔ اور ہر روز کالج جاتے ہوئے حکم سنگھ روڈ سے گذرتی تھی۔ اور فلموں کی انہونی باتوں کی طرح ایک دن میں بارش میں بھیگتی ہوئی جا رہی تھی کہ میرے قریب ایک موٹر کار رکی :
"آیئے!"
مجھے معلوم ہوا میں بارش میں نہیں بھیگ رہی۔ بلکہ کسی سینما ہال میں بہت آرام دہ کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور پردہ سیمیں پر کوئی بہت پیاری فلم دیکھ رہی ہوں۔
"آیئے!"
میں آگئی۔
بارش تیز ہوتی گئی۔ لیکن کار کے شیشے اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ اور میں دیپ کے پہلو کی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی اور دیپ سے متعلق سوچ رہی تھی اور دیپ میرے متعلق سوچ رہا تھا۔
تھوڑے دنوں کے رومانس کے بعد ہی ہماری شادی ہوگئی نہ کامیڈی نہ ٹریجڈی۔ بس جھٹ پیار اور پٹ شادی۔ ان دنوں مجھے ٹریجڈی بہت اچھی لگتی تھی۔ چاہتی تھی کہ ہم دونوں کے والدین ہماری شادی کی کڑی مخالفت کریں۔ اچھا خاصا جھگڑا کھڑا ہو جائے اور پھر دیپ اپنے والدین کو زہر کھا لینے کی دھمکی دے، بلکہ سچ مچ زہر کھا کر مر جائے —— اگر —— اگر وہ واقعی زہر کھا کر مر جاتا تو ایک دو سال تو میں اس کے غم میں سلگتی رہتی۔ اور پھر میری کہیں اور شادی ہو جاتی۔ کسی اور مرد سے۔ جو اب تک زندہ ہوتا۔ مثلاً یہ —— یہ انکم ٹیکس آفیسر!
میں سوچتی ہوں۔ اس سے پوچھوں۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟ لیکن میں چپ چاپ اس کی طرف دیکھ رہی ہوں اور وہ مجھے بتا رہا ہے کہ وہ بھی امرتسر کا ہی ہے۔
ہم بلا وجہ فلم والوں کو کوس کوس کر سوچتے ہیں۔ بھلا یوں بھی کسی کسے پیار ہو سکتا ہے۔ جب مرد کو عورت اور عورت کو مرد کی رفاقت کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگے تو کسی طرح بھی پیار ہو سکتا ہے۔ پہلی نظر میں بھی اور دس پندرہ سال ہر روز، ہر وقت آمنے سامنے ہونے کے بعد اچانک کسی وقت بھی۔ مجھے یہ انکم ٹیکس آفیسر بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ اس کا گنجا سر بھی اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ حالانکہ میں ڈرا کرتی تھی کہ دیپ اگر ذرا بڑا ہو کر گنجا ہو گیا تو میں اس سے کیوں کر محبت کروں گی۔
"تو آپ بھی ہماری گورو کی نگری کے باسی ہیں!"
میں دلچسپی کا اظہار کرنے کے لئے پوچھتی ہوں۔
"آپ کی تعریف؟"
"میرا نام رام کشور ہے" اس نے پہلی بار میری طرف نظر اٹھائی ہے۔ اور چالیس کے لگ بھگ ہونے کے باوجود بہت طفلانہ سی حیا محسوس کر کے "کوئی پانچ سال پہلے میرا دفتر وہیں تھا، پھر میری بیوی کا انتقال ہو گیا تو ——"
میں نے اطمینان کی سانس لی کہ اس کی بیوی نہیں ہے۔
"تو میرے جی میں آئی کہ پنجاب کے ماحول سے نکل جاؤں۔ میں نے ادھر ساوتھ میں ٹرانسفر کروا لیا۔"
لیکن مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ اس وقت ہم دونوں ساوتھ میں نہیں، امرتسر میں ہیں۔ میں پانی میں بھیگتی ہوئی تنہا سڑک پر چل رہی ہوں۔ اور میرے پاس اچانک ایک موٹر کار رکتی ہے۔
"آیئے!"
اور میں آگئی ہوں۔ اور دیپ کے پہلو کی سیٹ پر آبیٹھی ہوں۔ باہر موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ لیکن میں جیسے سینما ہال کی ایک نہایت آرام دہ سیٹ پر بیٹھی ایک نہایت مزیدار فلم دیکھ رہی ہوں۔
لیکن آج پہلے زمانے سے کوئی دس بیس برس بعد میرا فلمی مذاق بدل چکا ہے۔ ٹریجڈی اب مجھے قطعاً پسند نہیں۔ ہر المناک کھیل میں مجھے سسکتی اور خام سی جذباتیت کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مجھے صرف کامیڈی پسند ہے مجھے ہنسنا مرغوب ہے۔ بس جیسے کسی کا منہ مدراس کی لذیذ چاٹ سے لبالب بھر کر پھولا پھولا رہے۔ زندگی کی ہر کہانی کا عنوان بس ہنسی ہی رہے۔
لیکن میں تو اس وقت ماتمی لباس پہنے ہوئے ہوں اور دیپ کو مرے ہوئے ابھی بمشکل دو ماہ ہوئے ہیں۔ اور میں یہاں اسی لیے آئی ہوں کہ دیپ کی جائیداد پر ٹیکس ادا کر کے اسے استعمال کرنے کا روکھا جی بہلانے کا سرکاری اجازت نامہ حاصل کر لوں۔
انکم ٹیکس آفیسر میری طرف دیکھ رہا ہے۔ سرکاری سرد مہری کی بجائے اب اس کی نگاہ میں دوستانہ بے تکلفی کی سی جھلک نظر آرہی ہے۔ وہ ذرا سا مسکرا دیا ہے میں بھی مسکرا دی ہوں۔ ہم دونوں بباطن کھلکھلا کر ہنس رہے ہیں۔ وہ بھی، میں بھی —— لیکن ——؟ پوئر ڈیر دیپ ——! اس کی یاد میں مجھے ذرا سا رو دینا چاہیے لیکن کیا کروں مجھے رونا آہی نہیں رہا۔ ٹریجک خیالات سے مجھے کوفت ہونے لگتی ہے۔ دیپ ہی نے تو کہا تھا کہ وہ چاہتا ہے جب وہ ختم ہو جائے تو بھی میری ساری خوشی بنی رہے۔ دیپ بہت اچھا تھا اور —— اور یہ انکم ٹیکس آفیسر بھی بہت اچھا ہے۔ اور میں بھی بوڑھی نہیں ہوئی۔ نوجوان نہ سہی لیکن ابھی جوان ہوں۔ بیس برس کی عمر تک تو آجکل عام لڑکیاں کنواری رہتی ہیں۔ پیار کی، جینے کی یہی اصل عمر ہے۔ اس سے پہلے تو محض لڑکپن کی زندگی ہوتی ہے —— دیپ زندہ ہوتا تو —— دیپ زندہ نہیں ہے۔ اس کی موت کے ساتھ میری خواہشات نہ مریں تو میرا کیا دوش؟ میں ابھی زندہ ہوں اور —— اور انکم ٹیکس آفیسر بھی زندہ ہے۔ اب وہ میری طرف اور بے تکلفی سے دیکھتا ہے۔ وہ مسکرا دیا ہے اور میں بھی۔ مجھے وہ بہت اچھا معلوم ہو رہا ہے۔ پوئر ڈیئر ڈارلنگ! اس کے سوٹ کی تہہ کتنی خراب ہو گئی قمیص کا کالر میلا پڑ چکا ہے۔ جانے صبح کیا الم غلم کھا کے دفتر آیا۔ بے چارہ تنہا انسان۔
اسے میری ضرورت ہے مجھے اس کی ضرورت ہے ہم نو عمر تھوڑے ہی ہیں کہ دم سادھے ایک دوسرے سے پیار کرتے رہیں، اپنی خوفزدہ شرم سے ایک دوسرے کو اپنے پیار کی بھنک بھی نہ پڑنے دیں۔ کیا میں اس سے کہہ دوں کہ مجھے تم سے محبت ہے رام! آؤ انتظار کر کے ہم اپنی عمریں ضائع نہ کریں۔ آؤ جھٹ پٹ شادی کریں میں بیوہ ہوں اور تمہاری بھی بیوی نہیں ہے لیکن ہمارا مستقبل مسکرا رہا ہے۔ آؤ رام! ہم بھی مسکراتے ہوئے اس کا خیر مقدم کریں۔
"بینک بیلنس کی تصدیق کے لیے بینک کی تصدیق ضروری ہے۔" اس کا لہجہ بہت شفیق تھا "لیکن آپ فکر نہ کیجئے میں خود ہی منیجر کو فون کر کے سرٹیفکٹ منگوا لوں گا۔"
یہ کام دیپ کے تھے یا میرے؟ میں اپنے دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں۔ پر دیپ تو نہیں —— تو —— تم تو ہو۔ تمہارے ہوتے ہوئے کیا مجھے زیب دیتا ہے کہ —— کہ ——!
"لیجئے! آپ کا کام پورا ہو گیا!" اب اس کی مسکراہٹ میں بالکل قطعاً نہیں ہے۔ "ارے میں بھی کتنا احمق ہوں کہ آپ کتنی دیر سے یہاں بیٹھی ہیں۔ لیکن مجھے چائے وائے پیش کرنے کی بھی نہیں سوجھی۔"
"نہیں ——!" (بقیہ صفحہ ۱۱۵)

دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں ترا بلا سے ۔۔۔ دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گذر جا (فانی)

بے چاپ تماشا

رشید امجد

عجب تماشے کی رات ہے ۔
سورج سوا نیزے سے ابھی ذرا اوپر ہے، روشنی کا لبالب بھرا طشت آسمان کے بیچوں بیچ، عجب پراسرار روشنی ہے ۔ نہ ٹھنڈی نہ گرم، بس روشنی ہے،
اور روشنی میں چیزیں دروازوں کھڑکیوں اور چھتوں پر بنی ٹھنی بیٹھی ہیں ۔ عجب تماشے کا عالم ہے ۔
وجود کی آدھی ٹوٹی ریلنگ سے لٹکا میں جھک جھک کر چیزوں کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہوں پہلی نظر میں ہر شئے اجنبی دکھائی دیتی ہے، قرب سے دیکھتا سوچتا ہوں تو کچھ کچھ یاد پڑتا ہے لیکن لفظوں کی گرفت میں نہیں آتا، عجب بات ہے کہ اس لمحہ ہر شئے اپنے خول سے باہر ہے، پہچان دھندلائی ہوئی ہے اور چیزیں اپنے آپ سے نکل کر پھیلتی گئی ہیں، پھیلتی ہی گئی ہیں،
میں ٹوٹی ریلنگ سے اتر کر وجود کے پھیلے تنبو پہ لیٹ گیا ہوں ۔ اور جھک کر نیچے دیکھتا ہوں ___ دور دھندلائے میں ایک جھنڈے بردار جس کا چہرہ اندھیرے میں لپٹا ہوا ہے، زور زور سے جھنڈا ہلاتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے سامنے بیٹھا بچہ توتلی زبان میں سبق رٹ رہا ہے ___
"میلا نام الف ہے ___ میلے ابو کا نام ب ہے، میلے دادا کا نام ___"
جھنڈے بردار کے چہرے کے گرد لپٹا اندھیرا بہت گہرا ہے رفتہ رفتہ بچے کی زبان صاف ہوتی چلی جاتی ہے ۔
"میرا نام ا ہے، میرے ابو کا نام ب ہے، میرے دادا کا نام ___"
میں سر جھٹکتا ہوں ___ کس نے میرا نام ا رکھا ہے، نہیں میں اپنی مرضی سے اپنا نام رکھوں گا ۔"
جھنڈے بردار کی انگارہ آنکھیں گھومتی ہیں، جھنڈا اوپر اٹھتا ہے اور ___ درد کی تیز ٹیس میرے سارے وجود میں دوڑ جاتی ہے ۔
"نہیں میرا نام و نہیں ___"
جھنڈا پھر اوپر اٹھتا ہے،
"میرا باپ ب کیوں، ج کیوں نہیں؟"
ڈنڈا اوپر اٹھتا ہے ___
"میرا نام ا ہے، میرے باپ کا نام ب ہے اور میرے دادا کا نام ___"
ا اور ب، ج اور د ___ ان سالوں کے رشتے پھیلتے چلے جاتے ہیں،
لیکن یہ عجب تماشے کی رات ہے ۔
میرا وجود رینگ رینگ کر ا اور ب کے بوسیدہ چوغوں سے باہر نکل آیا ہے ۔
اس لمحہ چیزیں دروازوں، کھڑکیوں اور چھتوں پر بنی ٹھنی بیٹھی ہیں ۔
اور سورج سوا نیزے سے ابھی ذرا اوپر ہی ہے ___
میں نہ ا ہوں نہ ب، نہ ج
میں صرف میں ہوں
اور پہچان کے بوسیدہ چوغے گل گل کر نیچے گر رہے ہیں ۔ چیزیں ننگی ہوئی جا رہی ہیں ۔ ان کے بھی میری طرح کئی نام ہیں، مگر اس رات، اس عجب تماشے کی رات ہے، ان کے بھی کوئی نام نہیں ۔ لگتا ہے ساری چیزیں اپنے اپنے لبادوں سے رینگ رینگ کر باہر نکل آتی ہیں گلے سڑے کپڑوں کا ایک ڈھیر کونے میں لگا ہوا ہے، کوئی اس طرح دیکھتا بھی نہیں ۔
ہر شئے اپنے ہی تماشے میں محو ہے ۔
عجب ننگا پن ہے، لیکن ننگا پن نہیں، ایک بڑا سا آئینہ ہے جس میں سب کچھ صاف دکھائی دیتا ہے، ذرا ذرا سا نقطہ، باریک سے باریک لکیر ___ اوپر سورج ہے جو ابھی سوا نیزے سے ذرا اوپر ہی ہے،
میں اپنے وجود کے تنبو سے پھسل کر عین تماشے کے درمیان آن گرتا ہوں،
اور میں ا نہیں
ب بھی نہیں
ج بھی نہیں
تو میں کون ہوں ___؟
میں صرف میں ہوں
بغیر کسی نام، بغیر کسی چہرے کے
بس میں ___ میں ہوں!
میں نہ کسی کو جانتا ہوں، نہ پہچانتا ہوں ___
یہ لمحہ بھی عجب ہے کہ تماشے میں لوگ تو ہیں مگر ایک دوسرے کو پہچانتے نہیں، بس خالی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھ کر گزرے چلے جاتے ہیں،
مجھے کوئی پہچانتا ہے ___ میں چیخ کر پوچھتا ہوں
کئی چہرے اوپر اٹھتے ہیں، لیکن نہ تو کسی آنکھ میں شناسائی چمکتی ہے، نہ کسی نام کے حرف سنائی دیتے ہیں
آنکھیں آنکھیں ہی نہیں
لب لب ہی نہیں
صرف ایک میں ہے جو اوپر سے نیچے تک، دائیں سے بائیں تک ساری جہتوں میں پھیلی ہوئی ہے،
الف میں
ازل سے ابد تک میں ___ میں ہی میں
میں ڈبکیاں کھاتا ہوں، ڈوب ڈوب جاتا ہوں،
سانس رکنے لگتی ہے، سر اٹھا کر دیکھتا ہوں، چاروں طرف ایک سمندر ہے، اور میں جو کچھ بھی نہیں، اس سمندر کے سامنے بالکل کچھ بھی نہیں ___ بس ڈوبا جا رہا ہوں ۔ سانسیں بند ہونے لگتی ہیں، منظر
(بقیہ ۱۱۵)

آبادیوں میں دشت کا منظر بھی آئے گا
گزرو گے شہر سے تو مرا گھر بھی آئے گا ۔ (اعتقاد مہتیار)

جنگل

دیویندر اسّر
3/153-E جنگ پوری
نئی دہلی - ۱۱۰۰۵۸

سرائے میں یہ اس کی آخری رات تھی۔
رات کا تیسرا پہر تھا۔
باہر بارش کا شور ابھی کم نہیں ہوا تھا۔
اندر الاؤ کے گرد ہم سب بیٹھے تھے۔ میں، وہ، مادام مردول اور میگھ دوت۔

"تو تم کل جا رہے ہو؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں!" اس نے کہا۔

"لیکن اس سے آگے تم کہاں جاؤ گے؟ آگے تو جنگل ہے"۔ میں نے کہا۔

"اور یہ سرائے اس بستی کی آخری آماجگاہ ہے" میگھ دوت نے کہا۔

"شاید" وہ بولا۔

"اور اس جنگل میں کوئی پگڈنڈی نہیں" میں نے کہا۔

"اور جو بھی اس جنگل میں گیا لوٹ کے واپس نہیں آیا" مادام مردول بولی۔

"لوگ کہتے ہیں بڑا بھیانک جنگل ہے"

"کتنا بھیانک؟" اس نے کہا "اس سے بھی زیادہ جو میں اپنے پیچھے چھوڑ آیا ہوں"

"تم کس جنگل کی بات کر رہے ہو؟" میگھ دوت نے پوچھا۔

"جس میں اس درندے نے مجھ پر حملہ کیا تھا، اور میں نے اس کی ہتیا کر دی"

اس نے ہماری طرف چیرتی ہوئی نگاہ ڈالی۔

"میگھ دوت تم بتاؤ - تم یہاں کیوں آتے ہو؟"

اس نے میگھ دوت کے طرف ایسی نگاہ ڈالی جیسے میگھ دوت میگھ دوت نہیں کوئی کا غذی پیرہن ہو۔

"ایسے ہی - بس یونہی - "میں تو ہر سال آتا ہوں" میگھ دوت نے کہا۔

"ایسے ہی بس یونہی - نہ کوئی فرار نہ کوئی کشش!"

"فرار تو ہے اور کشش بھی" میگھ دوت نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"ایسا ہے فقیر علی" میگھ دوت نے کہنا شروع کیا۔ ہم اسے فقیر علی کہتے تھے حالانکہ اس نے اپنا نام رام سرن دوبے بتایا تھا۔

"جب دلّی میں شدید گرمی پڑتی ہے اور میرے اسٹوڈیو میں ماڈل کے برہنہ بدن سے پسینے کی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگتی ہیں اور میں پیاس سے بے حال ہو جاتا ہوں۔ تم جانتے ہو میرا اسٹوڈیو اندھا مغل میں ہے جہاں بجلی کے پنکھے تو ہیں، ایر کنڈیشنڈ نہیں۔ اور گرمیوں کے دن تو اکثر بجلی چلی جاتی ہے"

میگھ دوت کہہ رہا تھا۔

"بس تم گرمی سے بھاگتے ہو - یا اس ماڈل سے یا اپنے آپ سے" اس نے میگھ دوت کو پھر تیکھی نظروں سے دیکھا۔

اس نے الاؤ میں ایک لکڑی اور ڈال دی۔ ہلکا سا دھواں اٹھا اور پھر شعلہ سا بھڑکا۔ دیوار پر لپکتے ہوئے شعلوں کے سائے میں ہماری پرچھائیاں کسی چھایا ناٹک کی طرح حرکت میں تھیں۔

"میگھ دوت، تم شاید گرمی یا ماڈل سے بھاگ کر آئے ہو جس کی تصویر کشی کرتے کرتے تمہیں وہ یاد آجاتی ہے۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"راگنی!" میگھ دوت نے کہا۔

"ہاں - راگنی - اور تم نے ایک شعر پڑھا تھا -

"بہت دیر تک جسم جلتا رہا - کہ شعلہ سا کچھ اپنی باہنوں میں تھا" پھر راگنی کا کیا ہوا؟ ہاں تم نے بتایا تھا کہ اسے وومن لب اڑا لے گئی - اور پھر وہ زمین پر واپس نہیں لوٹی" وہ یعنی رام سرن دوبے عرف فقیر علی لگاتار بولے جا رہا تھا۔ ہم سب خاموش تھے۔ میگھ دوت نے اپنے گرد چادر اور پھیلا کر لپیٹ لی تھی۔

"لیکن فقیر علی تم کہہ رہے تھے کہ... میں نے کہا

"ہاں - میں کہہ رہا تھا کہ میں نے اسے قتل کر دیا۔ میں مجرم تو نہیں مفرور ضرور ہوں" اس نے کہا۔

"لیکن یہ سب کیسے ہوا؟" مادام مردول نے پوچھا

"بس یونہی! ایک روز بہت رات گئے وہ واپس لوٹا۔ میں بڑی دیر سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ جب وہ آیا تو وہ نشے میں دھت تھا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قمیض کے کالر کھلے ہوئے تھے - اور ٹائی کی گرہ ڈھیلی" اس نے آتے ہی اسٹیریو چلا دیا۔ ڈسکو سنگیت بہت پرشور تھا۔ باہر لان میں چاندنی ہری ہری گھاس سے لپٹ رہی تھی ..."

ہاں۔ ہاں۔ بالکل ایسے ہی تھا" مادام مردول جیسے ایک دم خواب سے چونک پڑی ہو - "رات بہت بہت گئی تھی۔ میں نہ جانے کب سے اس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ آیا - نشے میں میں ڈوبا ہوا۔ اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ قمیض کے کالر کھلے ہوئے اور ٹائی کی گرہ ڈھیلی۔ اس نے آتے ہی اسٹیریو آن کر دیا۔ ڈسکو سنگیت بہت پرشور تھا۔ باہر لان میں چاندنی ہری ہری گھاس سے لپٹ رہی تھی -"

"اور - پھر -" فقیر علی جنون میں بولا۔

دستِ ہا پستی بلندی کی زبردستی سے کب   جھونپڑے اکثر نظر ہیں ایوانوں کے پاس (احسن مارہروی)

"اور وہ دھڑام سے صوفے پر گرا۔" مادام مردولا نے کہا۔ "وہ صوفے کے اندر دھنس گیا۔ جیسے وہ جسم نہیں کپڑے کی کوئی گٹھڑی ہو۔ بے حس بے آواز" "بے رنگ، بے حرکت، بے بو، بے لمس ــ"، اور بے مزہ۔" وہ چلایا۔

"ہاں اور بے مزہ" مادام مردولا نے کہا "میں نے روشنی گل کر دی۔ ایک دم اندھیرا ہوا۔ اور پھر ایک دم چاندنی جیسے سیلاب سی کمرے میں امڈ آئی ہو ــ اور میرے جسم کو انگ انگ شرابور کر گئی ہو ــ اتنی شیتل اتنی نرم اتنی روشن ــ اور میں اس کمرے سے باہر نکل بھاگی اور ہری ہری گھاس پر ننگے پاؤں چلنے لگی۔ میرے جسم پر شب خوابی کا لباس تھا اور میں نے چاہا کاش یہ بھی نہ ہوتا۔ کاش میرا جسم ہی نہ ہوتا۔ صرف چاندنی ہوتی ــ" فقیر علی نے کہا ــ اور ــ تم۔ تم جو چاندنی میں تحلیل ہو چکی تھی۔

سرائے والے قہوے کے پیالے رکھ گیا تھا۔ سماوار میں اور پانی ڈال دیا گیا تھا۔ قہوے کا فرحت بخش دھواں گالوں کو چھو کر جسم کے مساموں میں داخل ہو رہا تھا۔

"کتنی عجیب بات ہے فقیرے ــ" اس نے اپنے آپ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"ایک مادام مردولا ہے جو شیتل، نرم اور روشن چاندنی میں نہانے یہاں آتی ہے۔ اور ایک میگھ دوت ہے جو شدتِ گرمی کا شکار ہے اور ــــ"

"تم نے میرا نام لیا۔ فقیر علی ــ" میگھ دوت جیسے نیند سے چونک کر جاگ اٹھا ہو ــ

"تم کہہ رہے تھے تم نے اس آدمی کو قتل کر دیا" میگھ دوت ابھی وہیں تھا۔ جہاں سے داستان شروع ہوئی تھی۔

"ہاں ہاں۔ جب بھی اس حادثے کا ذکر آتا ہے تم گول کر جاتے ہو۔" میں نے کہا۔ "کیا تمہیں پولس کا ڈر ہے؟"

"نہیں یار۔ ڈر کس بات کا؟ میرے ہاتھ کون خون سے رنگے ہیں۔ میں نے تو صرف اسکی ڈھیلی ٹائی کو کس دیا۔ ذرا زیادہ کس گئی۔ سانس رک گئی۔ اور وہ مر گیا۔ یہ بھی کوئی مرنا ہوا؟ اسے تم قتل کہتے ہو ــ وہی جو مادام مردولا کہتی تھی بس وہی ہوا ــ" بے حس، بے آواز، بے حرکت، بے رنگ، بے بو، بے رس ....." اور بے مزہ" ہم سب یک زبان بولے۔

"ہاں اور بے مزہ ــ" اس نے کہنا شروع کیا "میں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ سب اس اسکائی اسکریپر، ہائی رائز بلڈنگس زمین دوز ہو گئی تھیں۔ سڑکیں بالکل خالی تھیں۔ فراٹے بھرتی ہوئی موٹروں، بسوں کا شور بند، پرندے پہاڑوں کی طرف اڑ گئے۔ ٹریفک جزیرے پر ایک ننگی تلوار الف تھی۔ بھاگتے، دوڑتے، گرتے پڑتے لوگ جیسے ایک دم ساکت ہو گئے۔ پتھروں کا شہر صحرا میں بدل گیا تھا۔ میں نے دونوں بانہیں آکاش میں پھیلا دیں اور وہ ناآسودہ ہی لوٹ آئیں۔ میں بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ میرا جسم بھی شکستہ ہو کر زمین پر آ گرا۔ میں نے اپنے آپ کو چھوا، یہ میں ہی ہوں نا۔ مجھ سے میرا نام، میرا چہرہ، میری پہچان سب چھن گئی تھی۔ اور جب میں نے آنکھیں کھولیں تو میں نے دیکھا۔ معلوم ہے کیا دیکھا ــ" وہ تھوڑی دیر رک کر بولا۔

"کیا دیکھا؟" ہم سب نے ایک آواز پوچھا۔

"میرا جسم جنگل بن چکا تھا۔ اس کے باہر جنگل تھا۔ اس کے اندر جنگل تھا۔ اور ــ اور ــ"

وہ خاموش ہو گیا۔ پھر بولا ــ "ہاں ایک دن میں نے اخبار میں پڑھا کہ امریکہ سے آئے ایک ہندوستانی ماہر آثارِ قدیمہ نے مدھیہ پردیش میں پہاڑ گڑھ کے غاروں میں مصوری کے [illegible] ایسے نمونے دریافت کئے ہیں جو ... ۳۰۲ قبل مسیح کے بتائے جاتے ہیں۔ وشنومت، شیومت، تانترک ودیا ــ سورج کی پرستش کے آٹھوں طریقے ــ سب کچھ ان تصویروں میں موجود ہیں۔ ایک رسم الخط جو تصویر کشی کا رنگ لئے ہیں اور زبان جسکے اسرار ابھی کھلنے باقی ہیں۔ جانتے ہو یہ غاریں کہاں ہیں؟ اس ندی کے کنارے ایک گاؤں کے پاس گھنے جنگل میں جس کے نزدیک خونخوار ڈاکوؤں کی پناہ گاہیں ہیں۔ غاروں کی دیواروں پر چمکیلے، لال، نیلے، پیلے، ہرے، قرمزی رنگوں کی تصویریں ہیں۔ انسان کی شبیہیں جانوروں کے چہرے، پیڑ پودوں کے روپ، سورج اور چاند کی شکلیں۔ لوگ کہتے ہیں یہاں غیر مرئی روحیں اور بھوت پریت اپنے نقش چھوڑ جاتے ہیں جنہیں تم تصویریں کہتے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے ان کی آوازیں سنی ہیں۔" اور جانتے ہو ان غاروں میں آدمی کب سے رہ رہا تھا ــ ایک لاکھ برس قبل مسیح سے ــ"

"ایک لاکھ قبل مسیح ــ" ہم چونکے۔ [ہاں ایک لاکھ قبل مسیح ــ" اسکی آواز گرتی جا رہی تھی۔ ہم نے محسوس کیا۔ جیسے وہ بہت دور سے بول رہا ہو۔ بہت دور سے ــ صدیوں کی دوری سے ــ وہ کہہ رہا تھا۔

"میں کب سے سفر میں ہوں۔ ایک لمبی یاترا میں کئی صدیوں کا فاصلہ طے کر چکا ہوں۔ میں جنگل میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں بڑا ہوا۔ جوان، خوبرو، حساس۔ وہیں میری موت ہوئی ــ اور جب میں نے دوبارہ جنم لیا، بالغ ہوا۔ تو میں نے خود ایک جنگل بنایا۔ لیکن یہ وہ جنگل نہیں تھا جس میں میں جوان، خوبرو، حساس ہوا تھا۔ وہ جنگل تھا جس میں جوان مگر روسیاہ و بے حس ہو گیا۔ اور پھر میں نے ــ"

"اور پھر تم نے اس آدمی کی ہتیا کر ڈالی۔" ہم سب نے کہا۔

"یارو۔ کیا بار بار اس آدمی کی ہتیا کی رامائن چھیڑ دیتے ہو۔ ہتیا ہونی تھی ہو گئی۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ ہم سب خاموش ہو گئے۔ ہم قریب قریب اونگھنے لگے۔ ہم پر نیند طاری ہو رہی تھی۔ الاؤ کی آگ مدھم پڑنے لگی۔ بارش شاید تھم گئی تھی۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ اور سرائے تھی کہ آسیب زدہ روحوں کا مسکن۔ وہ میگھ دوت دھیرے دھیرے بولے جا رہا تھا۔ "یارو جنگل کی بھی کیا بات ہے"

ہم سو گئے تھے۔ جب صبح اٹھے تو وہ نہیں تھا۔ سورج کی ایک ہلکی سی کرن سہمے سہمے قدموں سے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ سرائے والا قہوے کے پیالے ہمارے سامنے رکھ گیا تھا۔ اور وہ سامنے دیوار پر ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ سامنے دیوار پر بڑے بڑے حروف میں کوئلے سے لکھا تھا۔

"یہ ہے نام اللہ کا ــــ"

اگر ہر وقت یہی سوچا جائے کہ لوگ کیا کہیں تو اپنی آزادی کہاں باقی رہ جاتی ہے۔ جو لوگ یہی مصلحت دیکھتے رہتے کہ لوگ کیا سوچیں وہ کبھی کچھ نہیں رہ سکتے۔

ایک مشفق ہی تجھے اے مشوہ گر دیکھا کیے
ہم الگ بیٹھے ہوئے سب کی نظر دیکھا کیے (احسن مارہروی)

میونسپل پارک

انور خان

عمارتوں کے درمیان سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص نمودار ہوا ہے اور پارک کو دیکھ کر ٹھٹک گیا ہے۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب کوئی تھکا ماندہ شخص سیمنٹ کانکریٹ کی عمارتوں میں کے جنگل میں بھٹکتا بھٹکتا اس میونسپل پارک کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے تو ششدر رہ جاتا ہے۔ پارک اسے ایک شفیق ماں کی طرح گود میں لینے کے لئے بے تاب معلوم ہوتا ہے۔

نوارد نے جیب سے رومال نکال کر پسینہ پونچھا ہے اور اطمینان کی سانس لیکر پارک کے ٹوٹے ہوئے لوہے کے دروازے سے گذر کر جس کا ایک پھاٹک ہی ندارد ہے پارک میں داخل ہو گیا ہے۔

پارک اونچی اونچی عمارتوں سے کچھ اس طرح گھرا ہوا ہے کہ دن بھر دھوپ چھاؤں پارک میں آنکھ مچولی کھیلتے رہتے ہیں۔ چند بوڑھے پارک کی شکستہ بینچوں پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ کوئی سوچ میں گم ہے۔ ایک بوڑھا جھکا موٹی سی سوئی انگلیوں میں پھنسائے اپنا پاجامہ سی رہا ہے۔ نووارد نے کھڑے کھڑے ان بوڑھوں کا جائزہ لیا ہے مگر انھوں نے سر اٹھا کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی۔ پارک کے ماحول پر اس کی آمد کا کوئی اثر مرتب نہیں ہوا۔ اس نے رومال موڑ کر جیب میں رکھ لیا ہے۔ نکٹائی ڈھیلی کی ہے۔ کوٹ اتار کر ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اور جوتوں کے تسمے ڈھیلے کرنے کے بعد ایک شکستہ بینچ پر بیٹھ گیا ہے۔ بینچ سے کچھ فاصلے پر ایک سوکھا پیڑ ہے۔ جس کی دو شاخوں کے بیچ ایک کبوتری بیٹھی شاید انڈہ سی رہی ہے۔ بے شمار چیونٹیاں ایک مردہ جھینگر کو درخت کے تنے کی ایک کھوہ کی طرف ٹھیل رہی ہیں۔ وہ غور سے ان چیونٹیوں کو دیکھنے لگتا ہے مگر تھوڑی ہی دیر بعد اس کے پیروں میں کوئی چیز سرسراتی ہے اور وہ چونک کر اپنے پیر ہٹا لیتا ہے۔ ایک چھوٹا سا چوہے کا بچہ دوڑ کر قریب ہی ایک بل میں گھس گیا ہے اور بار بار سر نکال کر اسے جھانک رہا ہے۔ پارک ویران ہے اور اجاڑ۔ پارک کے اندر کی ہوائیں کچھ ٹھنڈ ہے جو ذہن کو سکون دیتی ہے۔

وہ کبھی بوڑھوں کو دیکھتا ہے اور کبھی چوہے کے بل کی طرف مگر اس کا سارا دھیان چیونٹیوں پر ہے جو بڑی محنت سے مردہ جھینگر کو سوت سوت سرکائے چلی جا رہی ہیں۔ پارک کے پرسکون ماحول میں ان چیونٹیوں کی سرگرمی ناقابل یقین سی ہے اور شاید کبوتری کا وجود بھی۔ وہ کچھ اور سوچنا چاہتا ہے مگر چیونٹیاں بار بار اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں اور ہر بار وہ ایک نئی دلچسپی سے ان کی جاں توڑ محنت کا مشاہدہ کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اسی میں کھو جاتا ہے اور اس وقت چونکتا ہے جب اسے احساس ہوتا ہے کہ پارک کی روشنی بہت مدھم ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں کتنا سمے بیت چکا۔ پارک میں ٹھنڈ بھی بڑھ گئی ہے۔ کچھ خوف بھی محسوس ہوتا ہے۔ وہ جھک کر جلدی جلدی جوتے کی ڈوریاں کس کر باندھتا ہے۔ نکٹائی ٹھیک کرتا ہے اور کوٹ پہن کر پتلون کو دونوں ہاتھوں سے جھاڑتا پارک کے باہر آجاتا ہے۔ باہر آنے سے پہلے وہ ایک بار پھر چیونٹیوں پر نظر ڈالتا ہے مگر روشنی اس قدر کم ہو گئی ہے کہ اب وہ نظر نہیں آتیں لیکن وہ اپنے کام میں منہمک ہوں گی اس کا اسے یقین ہے۔ اونگھتے بوڑھوں کے بس ہیولے ہی نظر آرہے ہیں۔

باہر سے یہ پارک اس ماحول میں کس قدر غیر یقینی نظر آتا ہے! جیسے اس کا وجود بس خیالی ہو؟ روشنی معدوم ہوتی چلی جا رہی ہے اور پارک اندھیرے میں غائب ہوتا جا رہا ہے۔ اسے یقین ہے کہ جب وہ یہاں پلٹ کر آئے گا اس پارک کا وجود نہیں ہو گا۔ لیکن اب وہ طے کر چکا ہے کہ ایک نہ ایک روز وہ یہاں پلٹ کر ضرور آئے گا۔ اپنے شبہ کی تصدیق کی خاطر۔

ایک بار پھر وہ کئی عمارتوں کے درمیان سے گذرتا ہوا شاہراہ پر آگیا ہے۔ مگر یہ شاہراہ یقیناً وہ نہیں ہے جہاں سے وہ پہلے آیا تھا۔ اس کا اسے یقین ہے۔ راستہ دونوں طرف حد نظر تک پھیلتا چلا گیا ہے اور سڑک کے دونوں طرف برقی قمقمے روشن ہیں۔ وہ کس طرف جائے؟ کچھ دیر کھڑا وہ سوچتا رہتا ہے پھر یونہی ایک طرف کو چل پڑتا ہے۔ سڑک بالکل سنسان ہے۔ دور دور تک کوئی راہ گیر نظر نہیں آتا۔ نہ ہی کوئی گاڑی گذرتی ہے۔ سڑک کے دونوں طرف عمارتیں ہیں۔ مگر ان میں کوئی رہتا بستا نظر نہیں آتا۔ پھر یہ راستہ کس لئے ہے۔ اور یہ لیمپ پوسٹ، یہ عمارتیں۔ اس کا دل ڈوبنے لگتا ہے آخر وہ کب تک یونہی چلتا رہے گا؟ نہ راستہ ختم ہوتا ہے نہ ہی کوئی موڑ دکھائی دیتا ہے۔ وہ رک جاتا ہے اور خود کو ایک لیمپ پوسٹ سے ٹکا دیتا ہے۔

شاید اسے واپس جانا چاہئے۔ بہتر یہی ہوتا کہ وہ پارک میں ہی رات گذار دیتا۔ مگر کیا وہ پارک اب ہوگا؟ ادھر کھڑے رہنا بھی تو فضول ہی ہے۔ یا پھر اسی دوسری سمت جانا چاہیے ممکن ہے اسے وہ راستہ مل جائے جہاں سے وہ آیا تھا۔ وہ پھر چل پڑا ہے چلتا رہا ہے چلتا رہا ہے۔ اس کے پیر دکھنے لگے ہیں۔ مگر راستہ اب بھی جہاں تک نظر کام کرتی ہے بس سیدھا سیدھا چلا گیا ہے۔ بالآخر اکتا کر کھڑا ہو گیا ہے۔ دونوں طرف بس لیمپ پوسٹ ہیں اور عمارتیں اور سر پر رات ہر سو کسی بھیانک چڑیل کی طرح اپنے پنجے گاڑے بیٹھی ہے۔

راستہ تو ملنے سے رہا۔ مگر اب اس پارک کو

آج بھی اے زندگی تیرا نمائندہ ہوں میں قاتلوں کے شہر میں کس شان سے زندہ ہوں میں (انجم رومانی)

تلاش کرنے کی دھن سوار ہوگئی ہے۔ پیر دکھ رہے ہیں۔ مگر کم ازکم اس طرح یہ منحوس رات تو کٹے گی۔ دن میں راستہ تلاش کرنا بہرحال دشوار نہیں۔ وہ پھر واپس ہوا ہے۔ اور اندازے سے کئی بار اندر عمارتوں کے بیچ چلا گیا ہے۔ کئی بار اسے ایسا لگا ہے جیسے وہ جانے پہچانے راستوں سے گذر رہا ہے۔ مگر ہر بار وہ پھر اسی راستے پر آ کھڑا ہوتا ہے۔ اسے خود پر غصہ آ رہا ہے۔ بھلا پارک اس وقت کیسے مل سکتا ہے۔ وہ تو ویسے بھی تاریکی میں کھو گیا ہوگا۔ ایک پھر وہ بلامقصد بھٹکنے لگا ہے۔ شاید کوئی جانا پہچانا راستہ مل جائے۔ مگر بے سود۔ بڑی دیر بعد وہ شاہراہ پر آیا بھی ہے تو وہی جس پر دیر سے بھٹک رہا تھا۔ اب تو اس میں مزید چلنے کی ہمت بھی نہیں رہ گئی۔ ایک لیمپ پوسٹ سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا ہے۔ جوتے کی ڈوریاں ڈھیلی کی ہیں اور جوتوں کے ساتھ موزے بھی اتار لیے ہیں۔ پیروں کو سیدھا کر کے ڈھیلا چھوڑ دیا ہے۔ قمیض کے بٹن کھول کر تھکی تھکی نگاہوں سے اطراف کا جائزہ لیا ہے۔ دور تک بس ان گنت روشنیاں ہیں اور سیاہ رات اس نے آنکھیں موندلی ہیں۔ برقی قمقموں کی روشنی چھن چھن کر اس کی آنکھوں میں اترنے لگی ہے اور سناٹا اوس کی مانند اس کے بدن میں رسنے لگا ہے۔ گھبرا کر اس نے پھر آنکھیں کھول دی ہیں۔

دور برقی قمقموں کے بیچ سے ایک سیاہ کتا نمودار ہوا ہے۔ میونسپل پارک کی طرح شاید یہ غیر حقیقی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے تھکے ماندے ذہن کی پیداوار۔ کتا خراماں خراماں اس کے پاس آیا ہے اور اسے سونگھتے ہوئے آگے بڑھ گیا ہے۔ یہاں تک کہ پھر روشنیوں میں اوجھل ہوگیا ہے۔

سامنے سڑک پر دو موٹے چوہے دوڑ رہے ہیں۔ کچھ دیر بعد کہیں سے دو اور چوہے آجاتے ہیں۔ چوہے بار بار بیچ سڑک تک آتے ہیں اور لوٹ جاتے ہیں۔ کبھی کبھی کوئی چوہا سڑک پار بھی کر جاتا ہے۔ ایک بار ایک چوہا سڑک پار کر کے اس کے سامنے آگیا ہے اور ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا ہے۔ تھوتھنیوں سے اوپر اس کی تیز خوفناک آنکھیں اور اس کے نکیلے دانت!

چوہا کچھ آگے بڑھا ہے اور وہ سراسیمہ ہو کر اٹھ گیا ہے۔ چوہا واپس دوڑ گیا ہے۔ وہ بیچ سڑک پر جا کر رکا ہے اور مڑ کر وہیں سے سوں سوں کرنے لگا ہے۔ اچانک اس کے پیروں میں کوئی چیز سرسرائی ہے اور اس نے گھبرا کر پیر جھٹکے ہیں۔ ایک جھینگر گرا ہے۔ اور تیزی سے کچھ دور جا کر دبک گیا ہے۔ اس کے آگے پیچھے کئی جھینگر دبکے ہوئے ہیں۔ بیچ سڑک پر وہ چوہا اب تک اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ اپنی طرف دیکھتا پا کر وہ پھر پھنکارنے لگا ہے۔ اس کے بدن میں کپکپی دوڑنے لگی ہے۔ لیکن تب ہی برقی روشنیوں کے بیچ سے کئی کتے ابھرے ہیں اور چوہے سڑک کے دوسرے کنارے پر چلے گئے ہیں۔ کتے خاموشی سے اس کے سامنے سے گذرتے ہوئے پھر روشنیوں میں کھو گئے ہیں۔ شاید وہ خوفناک چوہے اسے پھر پریشان کریں۔ مگر اس سے پہلے کہ جھینگر اور چوہے سڑک پر دوبارہ قبضہ جمائیں فضا سریلی گھنٹیوں سے مرتعش ہوئی ہے۔

روشنیوں کے بیچ سے ایک نقرئی بگھی نمودار ہوئی ہے۔ جسے چھ سفید گھوڑے کھینچ رہے ہیں۔ گھوڑوں کی باگ شہابی رنگ کے ایک معمر شخص کے ہاتھ میں ہے۔ جس کی گھنی داڑھی برف کی طرح اجلی ہے۔ گھوڑے دلکی چال چلتے ہوئے اس کے سامنے سے گذرے ہیں بگھی میں ایک نوعمر جوڑا جو لباس عروسی میں ملبوس ہے ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے بیٹھا ہے۔ بگھی اس کی نظروں سے دور ہوتے ہوتے پھر روشنیوں میں کھو گئی ہے۔ مگر فضا گھنٹیوں کی صدا سے دیر تک تھرتھراتی رہی ہے۔

رات کے ختم ہونے میں ابھی کتنا وقت باقی ہے؟ کیا یہ ممکن نہیں کہ اس کا گھر پیچھے ہی ہو۔ اس کے دستک دیتے ہی اس کی بیوی دروازہ کھولے اور اس سے کہے "آپ اب اتنی رات گئے تک باہر رہنے لگے ہیں؟" یا اس کا بڑا لڑکا نیند اچٹ جانے پر کچھ خفا خفا سا دروازہ کھولے اور بنا کچھ کہے بستر پر لوٹ جائے۔ اس خیال سے تقویت پا کر وہ اٹھا ہے لیکن پھر وہ سوچ کر بیٹھ گیا ہے کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ پیچھے بینک کی عمارت ہو اور دروازے پر ہاتھ رکھتے ہی خطرے کے الارم بجنے لگیں۔

جھینگر پھر آس پاس منڈلانے لگے ہیں۔ چوہے بھی سڑک پر نظر آ رہے۔ اس کے پپوٹے بھاری ہو رہے ہیں۔ اگر وہ سو گیا اور دن بھر سوتا ہی رہا تو؟

اس کے بدن میں جھرجھری دوڑ گئی ہے اور پسینے کی ایک ٹھنڈی لکیر ریڑھ کی ہڈی کو چھوتی ہوئی اتری ہے۔ اسے اپنا گرم بستر یاد آ رہا ہے اور بیوی کی گداز باہیں اور اپنی چھ سالہ بچی کا شگفتہ چہرہ۔ کاش وہ اس منحوس پارک میں داخل نہ ہوا ہوتا۔

جاگتے رہنے کی خاطر اپنے جیب سے پاکٹ نکال کر اسے سڑک پر خالی کر دیا ہے۔ ایک ریلوے پاس آفس کے میز کی چابی، دس دس روپے کے دو نوٹ کچھ ریزگاری اور اس کی بچی کی اپنی ماں کے ساتھ تصویر سب چیزیں کس قدر بے معنی معلوم ہو رہی ہیں۔

ہوا کا ایک خوشگوار جھونکا اس کے جسم سے ٹکرا کر بکھر گیا ہے۔ اور کہیں دور سے ستار کی بہت ہی مدھم آواز شاید سحر قریب ہی ہے۔ اس نے خوش ہو کر سوچا ہے۔ جلد ہی اجالا سارے میں پھیلا ہوگا۔ اور یہ سارے منحوس لیمپ پوسٹ درخت بن جائیں گے۔ سڑک پھولوں سے ڈھکی ہوگی۔ آسمان میں نیلے بادل تیر رہے ہوں گے اور فضا میں طائر مائل پرواز۔ وہ گنگناتا سیٹیاں بجاتا گھر پہنچے گا۔

اس کی آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ ہوا کے جھونکے اب تیزی سے بار بار اس سے ٹکرا رہے ہیں۔ اس کے دماغ کے اعصاب کو سہلا رہے ہیں۔ وہ کوشش کر رہا ہے کہ آنکھیں کھلی رکھے مگر ہوا کے جھونکے اسے مسلسل تھپک رہے ہیں اور تمامتر کوششوں کے باوجود اس کا ذہن ڈوبتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔

آنکھیں بند ہوتے ہی اس نے خود کو پھر میونسپل پارک میں پایا ہے۔ پارک کسی غیر مرئی روشنی سے اب بھی بیدار ہے۔ بوڑھے اونگھ رہے ہیں۔ کبوتری انڈے پر بیٹھی ہے چیونٹیاں بدستور سرگرم ہیں اور مردہ جھینگر درخت کی کھوہ میں بس اب داخل ہونے ہی کو ہے۔

— x —

"گمشدہ مسافروں کی گاڑی"

احمد داؤد (پاکستان)

گاڑی کسی وقت بھی اسٹیشن پر پہنچ سکتی ہے۔ تب مسافروں کا ہجوم منتظر لوگوں کی آنکھوں کو تسکین بخشے گا۔ منتظر آنکھیں سلاخوں سے باہر پھیلی بے ترتیب چھتوں کو ٹٹولتی ہیں۔ اندھیری رات میں دودھیا دھواں، تیز سیٹی، اور کتوں کی پکار آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے۔

منتظر آنکھیں سلاخوں کی قیدی ہیں۔ اور کھلی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا۔ انہیں سہلاتی ہے۔ امید بندھ جاتی ہے گلیاں سنسان چوروں سے بے نیاز کرچو۔ زمانے بیتے قرون وسطیٰ کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے ہیں۔ اب چور دل کا دور نہیں کر گھر خالی ہیں۔ دلوں کی طرح اجاڑ۔ کارنس اور نقطوں کی تاثیر سے بے نیاز کتابوں کی طرح ــــ صرف انتظار کرتی آنکھیں ہیں جو اسٹیشن پر آنے والی گاڑی کی راہ میں پھیلی ہیں۔

وہ آنے والے مسافروں کا منتظر ہے۔

بد وضع۔ بڑے بڑے کیسے اٹھائے، پگڑیوں والے، چکنے بالوں میں گرد پھنسائے۔ ڈبوں میں چلم پیتے نسوار کھاتے مسافر ــــ سوٹ میں ملبوس شہری، خوبصورت بریف کیس اٹھائے، کلائی سے بندھی نفیس گھڑی سے وقت دیکھتے بے وقت مسافر، ٹائی کی شکن درست کرتے ہوئے بابو، نیند میں مندھی آنکھیں اور تھکے جسم والی عورتیں، جگراتے سے چوڑ بچیاں، ملاپ اور جدائی کے کردار آنے والے مسافر ہیں جنکی راہ میں بچھا کھڑکی سے لگا ــــ سلاخوں سے پرے دیکھ رہا ہے

وہ سب اس کے پراسرار شہر کے باسی ہیں!

اسٹیشن کافی دور ہے۔ صرف اس کی نحیف بتیاں، کسی بچھڑے ہوئے انجن کی چھک چھک، کبھی کبھی سودا بیچنے والی کی آواز رات کے سیاہ گلیشیر سے نمودار ہوتی ہے۔ تب منتظر آنکھوں کے سامنے جگنو چمکتے ہیں۔ وہ انہیں پکڑنے کے لئے ہاتھ بڑھاتا ہے اور آگے سلاخیں ہیں جن سے باہر اسکی کھلی ہتھیلیوں کے کناروں سے رات پھسل پھسل جاتی ہے۔

سنسان گلی میں ہوا کا ایک بولتا پھیرا آیا ہے۔

وہ آنے والے مسافروں سے توجہ ہٹا کر گلی میں جھانکتا ہے۔ دن بھر بچوں کے قدموں تلے روندی گلی سسکیاں بھر رہی ہے۔ چاروں طرف کباڑ بکھرے پڑے ہیں۔ پھٹا ہوا فٹ بال ٹوٹی ہاکیاں، کانچ کی گولیاں، بٹوے، پلاسٹک کے ٹوٹے برتن، اور اخبارات کے تازہ ضمیمے ہوا کی رسی سے بندھے گلی میں کھڑ کھڑاتے ہیں۔ وہ ان کے دائرے میں جھوم ڈالتا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا ہے۔ سلاخوں سے جکڑی آنکھیں۔ ان باغوں کی تلاش میں ہیں جہاں اس کا بچپن گذرا۔

"کھلے میدان اور باغوں کے درخت کہاں گئے"۔

"میدانوں میں پلازہ اور مارکیٹیں بن گئی ہیں، اور درخت فرنیچر کے کام ......

"بکومت ــــ! صحیح جواب دو۔"

"یہ تابکاری اثرات کا کیا دھرا ہے"

ہوا میں تابکاری پھیل رہا ہے۔ کھلی کھڑکی سے باہر نکلے ہاتھ کی کمزور ڈھلوانوں پر نیٹرون جھول رہا ہے۔ کسی لمحے بھی دھماکہ ہو سکتا ہے۔ اور ــــ مسافروں کو لانے والی گاڑی خالی آئیگی۔

"سنا ہے کہ نیٹرون بم سے آدمی ختم ہو جاتا ہے باقی ہر شئے سلامت رہتی ہے۔"

"آدمی کے علاوہ باقی ہر شئے کیا ہے؟"

"باقی ــــ کانچ کی گولیاں، بٹوے، ٹوٹی ہاکیاں اخبار کے ایڈیشن۔"

"تمہارا دماغ تو خراب نہیں ــــ بھلا اتنی آسانی سے نیٹرون کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے؟"

"اچھا کوئی اور بات کرو۔"

اور بات تو آنے والے مسافر کرینگے۔ اپنے گاؤں کی باتیں گندم کی فصل کیسی رہی۔ دھنو لوہار کی کھوتی نے کس کا کھیت خراب کیا گاؤں میں کوئی... کوئی ہیر پیدا ہوئی کہ نہیں۔

"کہتے ہیں کہ جب کبھی ــــ کہیں ہیر کا ظہور ہوتا ہے تو ایک وارث شاہ جنم لیتا ہے"۔

"اے یار ــــ اب تو ہیر جوانی سے پہلے ہی رپٹ کر دی جاتی ہے۔ اور وارث شاہ فلم کے گانے لکھتا ہے۔ یا ہوٹلوں میں پکھیاں مار کے چائے بناتا ہے۔"

"واقعی"؟

"ہاں۔ ہاں واقعی!"

"تیری تو مت ماری گئی ہے۔ کوئی اور بات کر"

"کوئی اور بات تو آنے والے مسافر کرینگے۔"

سوٹ میں ملبوس، خوبصورت چمکیلے چمڑے والے بریف کیس اٹھائے، نفیس گھڑیوں سے ٹائم دیکھتے بانکے فائلوں کے بوجھ تلے دبے بابو، پروموشن ڈیموشن کے قیدی، پنشن خورے، بوڑھی ہوئی پھولوں کے بابل، دن بھر کی خبروں سے خوفزدہ مسافر، نیند سے مندھی آنکھوں والے بچے، لڑتی جھگڑتی عورتیں اپنے بچپن، اپنے پٹولوں کی باتیں سنائیں گی، مگر کب ــــ؟ گاڑی کب آئیگی؟

سلاخوں سے باہر پھیلی آنکھیں، گاڑی کی تیز سیٹی پر الارم کھاتیں دھوئیں کے نرم ستونوں سے بغل گیر ہوتیں پٹڑیوں پر بکھر جاتی آنکھیں واپس سلاخوں کے اندر کمرے میں بیٹھے منتظر بشر کی پیشانی تلے دبک جاتی ہیں ــــ!

"اوہو ــــ یہ مال گاڑی سارا مال کہاں لے جاتی ہے؟ آج کل تو لوگ کم سفر کرتے ہیں اور مال زیادہ سفر کرتا ہے"۔

"بھئی مال باہر بھی تو جاتا ہے۔ تجارت بھی کرنی ہوتی ہے نا ــــ، دوسرے ملکوں سے"

"واپس یہ ڈبے خالی آتے ہیں"

"نہیں یار ــــ سوئیاں اور ٹینک لاتے ہیں"۔

"گندم اور کپاس دے کر۔؟"

"بالکل ــــ! یار جمائیاں مت لو۔ یہ اسٹیشن ہے تمہارا گھر نہیں۔ پولیس والے شبہ میں دھر لینگے"۔

"یار یہ گاڑی کب آئیگی؟ میں تو بور ہو گیا۔"

"بس۔ چپ چاپ بیٹھو۔ آ جائیگی۔"

سیٹی کی گونج اور اسٹیشن کے تھڑے، میلے، فرش سے اٹھتی باتوں کی سیلن۔ بوائلر کی بھاپ کے جلو میں اس تک آتی ہے۔ سلاخوں پہ زنگ لگاتی ہے وہ ہاتھ اندر کر کے تھکی آنکھوں کو سہلاتا ہے اور بڑبڑاتا ہے۔

"لوگ ــــ یہ لوگ آہستہ آہستہ ملی زبان میں

نہ سہی قبر میں آ کر مجھے راحت نہ سہی　　　تیرے چکر سے تو اے گردشِ دوراں نکلا (حسن عابدی)

گفتگو کیوں نہیں کرتے۔ ان کی باتوں کے شور سے آنیوالے مسافر تنگ ہونگے۔ اس نے گہری سانس لے کر اسٹیشن کیطرف گھورا۔

"یار گاڑی کب آئیگی؟"

"تمہارے کسی مہمان نے آنا ہے؟"

"مہمان سے بھی زیادہ ــــ ماں ــــ اور بھابھی آرہی ہیں ــــ! مگر تم ــــ؟"

"میرے بھی اپنے آرہے ہیں۔ مسافر سانسے ہی اپنے ہوتے ہیں۔ ارے ساڑھے چار بج گئے۔ چلو بابو سے پتہ کرتے ہیں گاڑی کا۔

سلاخوں کے باہر پھیلی بے ترتیب چھتیں، دور ہر سے اسٹیشن کی بتیاں، اور نیچے گلی میں ردی چیزوں کی بکھری ڈھیریاں۔ نالیوں کے کنارے پڑی گندگی، اور سحری کا ابھرتا ستارہ، آنے والے مسافروں کا ہراول دستہ ہے۔ منڈیوں کے مزدور، ریڑھیوں اور دودھ والوں کی آوازیں، اذان کی صدا اور کسی پرندے کی حمد، آنے والے وقت کا آئینہ ہیں۔

"اف اللہ کتنی خاموشی ہے۔"

"گاڑی جانے کے بعد اسٹیشن قبرستان کیطرح خاموش ہوجاتا ہے۔"

"لیکن گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں ــ بابو کیا کہتا ہے؟"

"اسے خود پتہ نہیں ــ اس کا اپنا بیٹا آرہا ہے!"

"گاڑی تو کئی گھنٹے لیٹ ہے۔"

"اب تو صبح ہو رہی ــــ انتظار کریں ــ یا ــ چلیں؟"

"انتظار......؟ میں تو کئی دن سے آرہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"ہاں"

"میں خود ...... کئی دن ...... کئی رات ...... یا ...... یار کہیں ہم۔"

"چپ رہو .... کل پھر آئینگے۔"

سلاخوں سے باہر پھیلی چھتوں پر بے اثر جمی سحر کی دھیمی سرخی پر پھیلاتی ہے۔ پرندوں کے واویلے اور جاگتے شہر کے طشت پر لوگوں کی حرکتوں کا شور، گلیاں آباد ہونے لگتی ہیں۔ اسٹیشن سے آوازوں کا ریوڑ اسکی جانب بڑھتا ہے۔ اسٹیشن پر گاڑی کھڑی ہے۔"

اندر سے سامان پھینکا جا رہا ہے۔ بکسے، حقے، جوتیاں، ڈائجسٹ۔ بستر بند، اور پانی کی خالی صراحیاں۔!

"مگر پانی پینے والے کہاں ہیں؟"

"پانی پینے والے کہاں ہیں۔؟"

"یار ــ سنا ہے کہ نیٹرون کے استعمال سے آدمی ختم ہوجاتا ہے۔ باقی ہر شئے سلامت ......؟"

وہ سلاخوں کے خلا سے باہیں نکال کر ہتھیلیاں ملتا ہے۔

منتظر آنکھیں، کھلے بازو، اور فریادی ہتھیلیاں مسافروں کی تلاش میں ہیں۔

بقیہ :ــ

پوُر ڈیئر....

"نہیں گیا؟" چپراسی کو بلانے کے لیے وہ اپنی میز پر رکھی ہوئی گھنٹی بجاتا ہے۔

"شیکھر!" وہ اپنے چپراسی سے مخاطب ہوتا ہے۔

"چائے لاؤ اور بسکٹ۔ ٹھہرو، بسکٹ نہیں گرم گرم سموسے لاؤ۔"

اس کا لہجہ صاف تھا۔ یا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو میری ہر سپنڈ کا حق دے دیا ہے۔ بیں: کتنی تھی کہ وہ بھی۔ میری طرح وہ بھی ــــــ!

"آپ امرتسر سے کب آئیں ــ؟"

"کوئی آٹھ ساڑھے آٹھ سال پہلے۔"

لیکن اس وقت میں امرتسر ہی میں تو تھا۔ وہی برسات کا موسم، وہی بھیگی بھیگی لڑکی، وہی موٹر کار، وہی تنہا سڑک۔

اب یہ جھٹ پٹ اپنی کرسی سے اٹھ کر میرے قریب کیوں نہیں آتا۔ سب مرد بزدل ہوتے ہیں۔ دیپ بھی بزدل تھا۔ پوُر ڈئر دیپ! مائی ڈیئر دیپ! مجھ سے ناراض نہ ہونا۔ میں تو صرف اسی لیے اپنی خوشی کا سامان کر رہی ہوں کہ تم خوش رہو۔ تم ہی نے تو کہا تھا نا کہ تم مرکر بھی میری خوشی بنا رہنا چاہتے ہو۔ سو میری خوشی ــ!

"آپ گھر آیئے نا!" انکم ٹیکس آفیسر مجھ سے کہہ رہا تھا۔ میں خوشی سے اچھل پڑی ہوں۔

"یہاں پنجابیوں کے چند ہی تو گھر ہیں!"

اب وہ اصل بات چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

"میری دوسری بیوی ساؤتھ انڈین ہے ــــ وہ آپ سے مل کر ــــــ"

میری آنکھوں میں منوں پانی ابلنے لگا ہے۔

"اوہ! آئی ایم ساری! میں آپ کے غم میں شریک ہوں، میڈم ــ!"

بقیہ

بے چاپ تماشا...

ڈوبنے لگتا ہے۔ ایک عجب اندھیرا ہے کہ اندھیرے بھی نہیں، مجھے اپنی بغل میں لپیٹ لیتا ہے۔

ایک گہری چپ!

صبح پہلے تیز گھنٹی پھر کوئی کندھے ہلاکر مجھے جگاتا ہے،

"آج دفتر نہیں جانا ــ"

"آیئے آیئے مسٹر! آپ کیسے ہیں؟"

"مزاج بخیر ــــ تشریف رکھئے نا"

"السلام علیکم ــ بہت دنوں بعد دکھائی دیئے"

"آؤ بھائی آؤ نا ــــ"

"بیٹے کیسے ہو؟"

"ابو میری کاپیاں ــ"

"جان آج تو بہت دیر لگادی آپ نے ــ

مکالموں کا ایک لامتناہی جنگل، لفظ لگتے چلے جاتے ہیں،

چہرے بھی تو لفظ ہی ہیں!

لفظ لفظ لفظ ــــ بغیر ارادے کے منہ سے نکلتے چلے جاتے ہیں،

مگر وہ رات ــــ وہ تو عجب تماشے کی رات تھی،

سورج سوا نیزے سے ابھی ذرا اوپر ہی تھا، اور ــــــ؟

ستم و جور کے اسباق نواز رہے ہیں ضرور
وہ سبق یاد کرو اب جو تمہیں یاد نہیں (ظرفہ قریشی)

کفّارہ

احمد عثمانی
c/o ماہنامہ "جواز" مالیگاؤں
مولانا آزاد روڈ، نیا پورہ
مالیگاؤں - ٣٠٢٣٢ - ٤

امتیاز خان اپنے چھوٹے سے گاؤں سے چل کر بڑے شہر میں اس لیے آیا تھا کہ وہ شہر میں اپنی زندگی بنائے گا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کو خوب پڑھائے گا۔ اس کا چھوٹا سا کھیت اتنے بڑے کنبے کی پرورش کرنے میں ناکام ہوا تو اس نے اور لوگوں کی طرح شہر کا رخ کیا۔ اسے بار بار ماں کی آنکھوں کے آنسو، باپ کی وحشت بھری چپ، چھوٹے بھائی بہنوں کی مسکراہٹیں یاد آتی تھیں۔ اس نے ان سے وعدہ کیا تھا وہ جلد ہی ان کے لئے ڈھیر سارے کپڑے، کھلونے، مٹھائیاں اور اچھی اچھی کتابیں بھیجے گا۔

لیکن اب تو اس کا ہی پیٹ خالی تھا۔ اس کا جسم تھک کر چور چور ہو رہا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے گرنے ہی والا تھا کہ چند آدمی اس کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے۔ اور ایک نے کہا۔

"بھائی صاحب! ہم اس شہر میں اجنبی ہیں۔ راستہ معلوم نہیں ہے۔ آپ ہمیں بازار کا راستہ بتا دیجئے یا وہاں تک چھوڑ دیجئے۔ ہم آپ کا محنتانہ ادا کر دینگے۔"

"لیکن آپ کون سے بازار جانا چاہتے ہیں یہاں کئی بازار ہیں"۔

"اب آپ سے کیا چھپانا۔" اس نے بائیں آنکھ دبا کر کہا "بازارِ حسن سمجھے جناب"

وہ اپنی تمام قوت یکجا کر کے کھڑا ہوا۔ اور انھیں لے کر چلنے لگا۔ ایک آدمی نے اسے سگریٹ پیش کی تو اس نے نہیں لی دوسرے نے بھنے ہوئے چنے پیش کئے جو اس نے لے لئے۔

چلتے چلتے ایک آدمی نے پوچھا۔

"آپ کب سے یہ دھندا کر رہے ہیں؟" اسے غصہ تو بہت آیا لیکن اس کی بھوک غصے پر غالب آ گئی۔ اس نے جواب دیا "صاحب! دھندا وندا تو میں نہیں کرتا۔ آپ جیسے شریف لوگ مل جاتے ہیں تو رہنمائی کر دیتا ہوں۔"

اپنی شرافت کا سن کر وہ لوگ خوش ہو گئے۔ اور اس سے کہا" آپ اچھے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ آج آپ ہمارے مہمان رہیں گے۔ ہمارے ساتھ کھانا کھائیے۔ ہم آپ کو خوش کر دینگے۔"

تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ لوگ منزل پر پہنچ گئے۔ وہ انھیں لئے ہوئے ایک بلڈنگ میں داخل ہوا۔ یہاں عجیب سی سڑاند پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ کچرے کے ڈھیر تھے۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ مکان کیا تھا اچھا خاصا قیدخانہ تھا۔ جیسے بہت ساری عورتوں کو اچھے اچھے کپڑے پہنا کر قید کر لیا گیا ہو۔ ہر طرف میں جالی دار لوہے کا پھاٹک تھا۔ عورتیں روشنی کی چکاچوند میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ پھاٹک پر ایک ہٹا کٹا آدمی کھڑا تھا۔ اس کا کام پھاٹک کھولنا اور بند کرنا تھا۔ وہ ایک پھاٹک پر رک گئے اور دروازہ کھولنے کے لئے کہا۔

ایک موٹی کالی بھدی عورت بھد بھد چلتی ہوئی آئی اور پھاٹک کے پاس کھڑی ہو گئی۔ اور بولی

"کوئی لفڑا نئی منگتا۔ جلدی نکلنا منگتا۔ پہلے پیسہ دینا۔"

جب اس نے بازو کھڑے ہوئے آدمی کو اشارہ کیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور وہ اندر داخل ہوئے اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ تو اندر چلے گئے۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

اس کے لئے یہ زندگی کا ایک نیا تجربہ تھا۔ نئی بدبو تھی۔ نئے لوگ تھے۔ لیکن اسے اطمینان تھا کہ اس بدبو میں، انھیں نئے لوگوں میں اس کی بھوک مٹ جائے گی۔ ایک وقت کا کھانا اس میں چلنے کی قوت تو دے آئے گا۔ وہ انھیں خیالات میں غرق بیٹھا تھا کہ وہی بھدی عورت آئی اور بولی

"اے چھوکرا! تم نئی جاتا"؟

"نہیں"

"تو پھر ادر کائے کو آیا؟"

"یہ نیا لوگ باہر سے آیا۔ ان کو لے کر آیا"۔

"اچھا، اچھا۔ تم ادر لایا۔ اچھا کیا" عورت نے اسے سر سے پیر تک دیکھا مضبوط بدن کا نوجوان نظر آیا اس نے کہا "ادر کام کرے گا؟"

"کیا کام؟"

جو بی ام بولے گا۔ تم کو ام پگار (تنخواہ) دیگا رات دن ادر رہنا مانگتا"۔

اس نے سوچا ٹھیک ہی بولتی ہے۔ ایک ٹھکانا ہو جائے گا۔ کچھ دنوں بعد پیر جم جائیں گے تو کوئی نیا کام تلاش کریں گے۔ اس نے جواب دیا

"ٹھیک ہے۔ کام کرونگا۔"

"بولو کیا پگار لے گا؟"

"جو تم دے دو"

"کھانا کھلا کر سو روپیہ دیگا بولو منجور"

اس نے اس کے لہجے میں کہا" منجور"

"کیا نام ہے تمارا؟"

"امو" وہ امتیاز خان سے امو بن گیا تھا۔ امتیاز خان یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنا نام بھی بدل لیا تھا۔ اب وہ ایک نیا آدمی تھا۔

"امو" عورت نے نام دہرایا۔ اچھا نام ہے۔

اندر کھنکتی چوڑیوں اور ہنسی کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن وہ ان سے بے نیاز کھویا ہوا بیٹھا

کتنی تحریریں سجی ہیں وقت کی دیوار پہ
کون کہہ سکتا ہے کیا مٹ جائے کیا باقی رہے (ممتاز راشد)
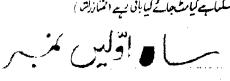
تھا۔ وہ عورت مسلسل اس کا جائزہ لے رہی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ چھوکرا ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ بولتا کم سنتا نہیں۔ تھکا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اور بھوکا بھی۔ اس نے باہر والے کو آواز دی۔ سات ٹھنڈا ایک سینڈوچ اور ایک چائے منگوائی۔

باہر والا فوراً ہی یہ تمام چیزیں جالی دار کے پاس چھوڑ گیا۔ ایک ٹھنڈے کی بوتل اس نے لی اور کچھ اندر بھجوا دیئے۔ چائے اور سینڈوچ امو کو دے دیئے۔

سینڈوچ اور چائے دیکھ کر اس کی بھوک شدید ہو گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھائے۔ لیکن سینڈوچ اٹھاتے اٹھاتے اس کی سوکھی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے ٹپک پڑے۔ موٹی بھدی عورت اس کے پاس آ بیٹھی "کھالے۔ او کھانا منگتا" اس کی ممتا ابھر آئی تھی۔ اس کی آواز بھی روندھی ہوئی تھی۔ وہ اس نوجوان کو اپنے بیٹے کے روپ میں دیکھ رہی تھی۔ جو اس بھری پری دنیا میں کہیں کھو گیا تھا۔ یا اسے چھوڑ گیا تھا۔

امتیاز خان جواب امو تھا۔ اس نے جلد ہی اس گھر کی نائیکہ لکشمی کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اور اسے فائیو اسٹار، تھری اسٹار یا جہاں کہیں بھی ہو مال پہنچانے اور واپس لانے کا کام سونپا گیا۔ وہ اپنا کام برابر کرتا اس طرح اسے کافی بخشش بھی مل جاتی۔

اب وہ ذرا دھلے ہوئے اچھے کپڑے پہنتا، اچھا کھاتا لیکن کبھی کبھی اس کے اندر کا امتیاز خان جاگتا تو اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ زہر کھا رہا ہو اور اس کے بدن پر یہ اجلے اجلے کپڑے نہیں ہیں بلکہ زہریلے سانپ لپٹے ہوئے ہیں۔ لیکن پھر امو اسے سلا دیتا کیونکہ مجبوری ایسی تھی کہ اس شہر میں وہ صرف اپنے آپ کو جانتا تھا۔ وہ بے چین سا تھا۔ جب بھی اسے موقع ملتا وہ ادھر ادھر جا کر کام تلاش کرتا۔ لیکن وہی ضمانت پہچان، اس کا راستہ روک دیتی۔

پہلے مہینہ کی تنخواہ ایک سو روپیہ جب اس کے ہاتھ میں آئے تو اس کا ہاتھ کانپ گیا۔ وہ سوچنے لگا "یہ سو روپیہ گھر بھیجے یا نہیں؟ وہ زہر جو وہ خود کھا رہا ہے اسے دوسروں کو بھی کھلانے کا اسے کیا حق ہے؟" لیکن جس طرح اس کی بھوک نے اسے ذلیل ترین کام کرنے پر مجبور کر دیا تھا اسی طرح ماں باپ اور بھائی بہنوں کے سوالیہ چہروں نے دوسرے دن سو روپیہ گھر بھیجنے پر مجبور کر دیا۔ "وہ تو محنت کی مزدوری لیتا ہے۔ اسے کیا سروکار کہ مزدوری دینے والا کیا کرتا ہے۔" اس نے سوچا۔ لیکن روز رہ کر اس کے ذہن میں سوئیاں سی چبھتی تھیں۔ لیکن زندگی رکنے والی تھوڑی ہی تھی۔ وہ تو دوڑ رہی تھی۔

اسے اس دھندے میں چھ ماہ گذر چکے تھے۔ اس نے اپنی تنخواہ برابر گھر بھیجی تھی۔ اور بخشش کا روپیہ اپنے پاس رکھا تھا۔ ابھی تک پانچ سو روپیہ ہی ہوا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ایک ہزار کی بندی رقم ہو جائے تو وہ یہاں سے بھاگ جائے گا۔ چھوٹا موٹا دھندا کرے گا۔ یہاں روپیہ تھا، روشنی تھی لیکن وہ خوشی نہ تھی جو ایک کسان کو ہل چلا کر ہوتی ہے۔ یہ خوشی مصنوعی تھی۔ وہ روز رات کو ماضی اور حال کے بارے میں غور کرتا۔ دیر تک منصوبے بناتا اور توڑتا۔

ایک رات وہ دیر تک اپنے رونے کے عمل میں مگن تھا کہ پاس والے کیبن سے آوازیں آنے لگیں۔ یہ کیبن لکشمی کا تھا۔ اس نے وقت کا اندازہ کیا تین یا چار بجے ہوں گے۔ کسی مرد کی آواز تھی وہ کہہ رہا تھا۔

"لکشمی دیکھ لے یہ سودا بڑے فائدہ کا ہے۔ جان جوکھم میں ڈال کر تیرے لئے لایا ہوں۔ جھوٹی شادی رچانا پڑی، پنڈت کو دینے پڑے اور ایک ہزار اس کے چچا کو دیئے۔ بہت خرچ ہو گیا، لاکھاں پانچ ہزار روپیہ"

"یا پچ ہجا۔ اتیری ماں نے کما کر رکھے اتنے۔ تین ہجار رے۔ پر کوئی لفڑا نئی منگتا۔ پچھو تو نے جو چھوکری لایا تھا وہ تیری ماں نکلی۔ کتنا لفڑا کھڑا ہو گیا تھا۔"

مرد نے کہا۔ "اے یہ تو جنگل کی ہرنی، پہاڑوں کی ملکہ یہاں کون اس کے لئے آئے گا اور پھر میں نے بیاہ لیا ہے۔ اور اس کے چچا کو ساہوکار کا قرض چکانے ایک ہزار بھی دیئے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں خود ہی سیدھی ہو جائے گی اور تو تو اچھے اچھوں کو ٹھیک کر کے رکھ دیتی ہے۔ یہ کس کھیت کی مولی ہے۔ لاکھاں رقم تین ہزار ہی دے دے۔"

امو نے اپنے کیبن سے جھانک کر دیکھا ایک بوڑھا ایک خوبصورت لڑکی کو اندر لا رہا تھا۔ اس نے لڑکی سے کہا "یہ میری بہن ہے۔" لڑکی نے لکشمی کے پیر چھوئے۔ لکشمی نے اسے گلے سے لگا لیا۔ اتنی دیر میں وہ آدمی باہر چلا گیا۔ لکشمی نے اسے اپنے کیبن میں بٹھا دیا اور امو کو آواز دی۔

وہ لکشمی کے کیبن میں گیا۔ تو لڑکی کو دیکھ کر اس کے بدن میں جھرجھری سی آئی۔ لڑکی کیا تھی معصوم حسن تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ دوبارہ بیچی جا چکی ہے لکشمی نے امو سے کہا "دیکھ کسی کمرے میں کچھ کھانے والے کو ہو تو لا، پھر باہر دیکھ کوئی ہوٹل کھلا ہو تو اس چھوکری کے لئے کھانا منگتا ہے۔"

پھر اس نے لڑکی سے پوچھا "کیا نام ہے تیرا؟" لڑکی نے نظر جھکائے ہوئے کہا "سیتا"۔

"اے یہ تو بہت پرانا نام ہے۔ تیرا نام تو موہنی ہونا چاہیئے۔ آج سے تو موہنی"۔ موہنی کو منہ ہاتھ دھونے کا کہہ کر وہ باہر آ گئی۔

امو باہر جا چکا تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ہر قیمت پر اس معصوم کو اس دوزخ سے نکال لے گا۔ اس ذلیل جگہ اتنے دن رہنے کا کفارہ وہ اس طرح ادا کرنا چاہتا تھا۔ بلڈنگ سے اتر کر اس نے ایک اونگھتے ہوئے ملباری سے سبزی، پاؤ اور ابلا ہوا انڈا لیا اور اوپر چلا گیا۔ لکشمی نے اس سے کہا۔ نیا چھوکری کو کھلا دے۔

امو نے کھانا سیتا کے سامنے رکھا وہ نیم غنودگی میں بیٹھی کوئی حسین خواب میں تیر رہی تھی۔ امو نے اسے جھنجوڑا تو وہ ہڑبڑا کر جاگ پڑی۔

"لو کھانا کھالو۔ بھوکی ہو گی۔" سیتا نے اس کے ہاتھ سے کھانا لے کر کھانا شروع کیا۔ چند نوالے کھانے کے بعد اس نے امو سے پوچھا "وہ کہاں ہیں؟"

"کون؟"

"وہ جن کے ساتھ میں آئی ہوں؟"

امو نے سوچا سب کچھ بتا دے۔ لیکن یہ موقع نہ تھا اگر وہ بتا دیتا تو اس کی اپنی زندگی اور نوکری کو خطرہ ہو سکتا تھا۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اور اس نے لکشمی کو سیتا کے کیبن میں بھیج دیا۔

دوسرے دن نیند پوری کر کے سیتا اٹھی۔ لکشمی نے اسے اچھی سی ساڑی اور بلاؤز دیا۔ نہا دھو کر اس نے کپڑے پہنے تو یوں لگا کالے کالے بادلوں میں مسکراتا چاند نکل آیا ہے۔ لکشمی اس کا حسن دیکھ کر تصور ہی تصور میں اپنے آپ کو نوٹوں کے ڈھیر کے سامنے بیٹھی دیکھتی رہی۔ اور سوچتی رہی کہ یہ لڑکی اس کے وارے

(۱۲۱ — [illegible])

تکلف سے بری ہے حسن ذاتی
قبائے گل میں گل بوٹا کہاں ہے (آتش لکھنوی)

شہر

آنند لہر
ایڈوکیٹ ہائی کورٹ
جموں و کشمیر (جموں)

پنج تیرتھی پر کھڑے شخص نے کہا" یہ سڑک یہاں سے نہر کی طرف جاتی ہے ۔" اب وہی آدمی نہر کے قریب کھڑا ہے اور کسی سے مخاطب ہوئے بغیر کہہ رہا ہے" یہ سڑک یہاں سے پنج تیرتھی کی طرف جاتی ہے "

لگتا ہے سڑک نہ کہیں جاتی ہے نہ کہیں سے آتی ہے ۔بلکہ قائم و دائم ہے ۔ یہ لوگ ہیں جو جاتے بھی ہیں اور آتے بھی ہیں ۔صدیوں سے اس سڑک پر چلتے ہوئے لوگ ایک ہی طرح کی باتیں کرتے ہیں ان تمام لوگوں کے ایک ہی طرح کے مسئلے ہیں ۔ برس بیتے ، یُگ بیتے مگر لگتا ہے کہ ایک لمحہ بھی نہیں بیتا ۔لوگ قائم و دائم بھی رہتے ہیں اور مٹتے بھی رہتے ہیں ۔ لوگ جو صرف لوگ ہی ۔ہے حالانکہ بڑی کوشش کی گئی ان کو ماں ، بہن ، باپ ، بھائی بنانے کی ۔آدمی ۔آدمی ہی رہتا ہے ۔ اسے آخر اپنا درد خود ہی محسوس کرنا پڑتا ہے ۔

سلسلوں کی لڑائی نے جو حادثے پیدا کئے وہ اس شخص نے اپنے تھیلے میں بند کر دیئے ہیں ۔ جب بھی کوئی کنواری لڑکی اپنی آنکھوں کی پیاس بجھانے کی کوشش کرتی ہے تو وہ شخص آہستہ سے حادثہ پھینک دیتا ہے ۔پیاس جو آنکھوں کو لگتی ہے ۔خوبصورت چہرے دیکھنے کے لئے ۔کانوں کو لگتی ہے کنوارے لفظ سننے کے لئے ۔ ہاتھوں کو لگتی ہے جواں جسموں کے ابھار چھونے کے لئے ۔ پیاس بس پیاس ہے جو نہ کبھی بجھتی ہے نہ بجھے گی ۔کیونکہ یہاں یہ ہر چیز اپنے وجود کو قائم رکھنا چاہتی ہے ۔کوئی چیز ختم نہیں ہونا چاہتی ۔حالانکہ ہر چیز کا وجود ہی اسکی قید کی وجہ ہے ۔مگر اپنے وجود کو ساتھ لئے ہر کوئی رہائی کی لڑائی لڑ رہا ہے ۔ اور یہ بے وجہ جنگ صدیوں لمبے جاری ہے ۔ اس کا نہ کوئی مقصد ہے نہ کوئی وجہ ہے ۔ اور نہ ہی چاہئے لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وقت بیوپاری ہے ۔ وہ چہروں ۔ رشتوں ، ناطوں کا بیوپار کرتا ہے ۔

یہ شہر بھی زندگی کی طرح الجھا ہوا ہے ۔اسکے بطن سے پیدا ہونے والے مکان ، پارک ، سڑکیں اسکی اس کہانی کو بیان کرتے ہیں ۔محسوس ہوتا ہے کہ یہ شہر بھی جینا چاہتا ہے ۔آگے بڑھنا چاہتا ہے ۔آگے بڑھکر ایک بہت بڑا شہر بننا چاہتا ہے ۔اب آس پاس کے دیہاتوں کو بھی اپنے اندر سمیٹنا شروع کر دیا ہے ۔ ہر دیہات کی اپنی انفرادیت ہے ۔ ایک کہانی ہے ۔ شہر کی طرح دیہات بھی آگے بڑھنا چاہتا ہے ۔یہی بات ہے کہ پہلے مقابلہ ہوتا ہے ۔ اور پھر جا کر شہر آگے بڑھتا ہے ۔ اس شہر کے اندر کئی کہانیاں بستی ہیں ۔ ایک بار ایک کھڑکی سے آنکھوں نے ایک خوبصورت چہرے کو دیکھا ۔ یہ راز دیواروں نے جذب کر لیا اور وہاں پہ ایک کہانی بن گئی ۔ وہ کہانی آج تک قائم ہے ہر دیہات بھی ایک کہانی ہے ۔ اس کے جنم کی کہانی ۔ اس کی جوانی کی کہانی اور پھر اسکے ختم ہونیکی کہانی ۔لگتا ہے کہ یہ شہر بھی کہانی کا مجموعہ ہے ۔

ایک گلی اس شہر کی سب سے خوبصورت سڑک سے بچھڑ کر ساتھ والے محلے کی طرف جاتی ہے ۔

بہت پرانی بات ہے کہ ایک خوبصورت لڑکی کی آنکھیں ایک غریب لڑکے سے ٹکرا گئیں ۔ کیونکہ غریب صرف غریب ہوتا ہے ۔ امیر یا تو خوبصورت ہوتا ہے یا خوبصورت نہیں ہوتا ۔ اور غریب یا تو بدصورت ہوتا ہے یا بدصورت نہیں ہوتا ۔ اور پھر آنکھوں کی باتیں آنکھوں میں رہیں ۔ یہاں پر لوگ آنکھوں کی زبان نہیں سمجھتے حالانکہ آنکھیں خوبصورت افسانے بیان کرتی ہیں ۔ کان کہے ہوئے الفاظ سنتے ہیں اور زبان سوچے ہوئے لفظ بولتی ہے ۔ مگر آنکھوں کے اندر نہ کہے ہوئے لفظ ہیں اور نہ سوچے ہوئے فقرے ۔ بس ایک ایسی زبان ہے جس کا کوئی حرف نہیں ہے اسلئے یہ نہ لکھی جا سکتی ہے اور نہ پڑھی جا سکتی ہے البتہ محسوس کی جا سکتی ہے ۔ خوبصورت جسموں کو جب آنکھیں چومتی ہیں تو یہ زبان محسوس ہوتی ہے ۔

آخر ایک دن کہے ہوئے لفظ لڑکی کو اٹھا کر لے گئے ۔ آنکھوں نے کافی احتجاج کیا مگر ان کی کسی نے نہیں سنی اور لڑکے نے خود کو اندھا کر دیا اس کے لئے اندھیرا ہو گیا ۔ مگر سارا شہر اسی طرح چمکتا رہا ۔ یہاں تو پھول کا کھلنا بھی ایک کہانی ہے اور پھول کا مرجھانا بھی ایک کہانی ۔ اور کہانی صرف کہانی ہوتی ہے ۔

یہ ایک عجیب سلسلہ ہے ۔ ایک چکر ہے ۔ اور پھر وہ شخص اپنی انگلیوں کو اپنے کانوں میں ڈال کر زور سے چیخا ۔

" میں گونگا ہوں ، میں بول نہیں سکتا ۔ میری آواز ہی نہیں ہے ۔"

تمام لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے ۔ بھیڑ میں سے ایک شخص نے کہا ۔

کیونکہ اس نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ڈالی ہوئی ہیں ۔ اس لئے اسے اپنی آواز سنائی نہیں دیتی ۔ لہٰذا بہتر یہی ہو گا کہ اسکی انگلیاں کاٹ دی جائیں ۔"

مگر اس شخص کی انگلیاں کاٹنے کے باوجود وہ اپنی آواز نہیں سن سکا ۔ حالانکہ وہ آدمی بول سکتا ہے ۔ یہ راز بعد میں ظاہر ہوا کہ اس نے اپنی انگلیاں اسلئے کانوں میں ڈالی ہوئی تھیں

افسانہ :-

نسل کا نوحہ

شبیر ہاشمی

۵۲۳، نیو وارڈ، مالیگاؤں

کڑی دھوپ میں کام کرنے والوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ انہوں نے جب سے ہوش سنبھالا تھا۔ تب تو وہ اپنے آپ کو اسی تکلیف دہ حالت میں پاتے تھے۔ ہوسکتا ہے کبھی ان کے اجداد نے ان حالات سے نجات پانے کی کوشش کی ہو لیکن اب تک تو حالات وہی تھے۔ جن کا شکوہ انہوں نے اپنی اگلی نسل سے اور اگلی نسل نے اپنی اگلی نسل سے ۔۔۔۔ سنا تھا۔ اور اب تک یہ لوگ ان حالات کے عادی ہو گئے تھے۔

میں نے بھی انہی لوگوں کے درمیان آنکھیں کھولی تھیں۔ میں انھیں بچپن سے دیکھتا چلا آرہا تھا ۔۔۔ بڑی عجیب سی زندگی تھی۔ جب بھی آسمان پر ابر کا کوئی ٹکڑا بھٹکتا ہوا ان کی طرف آنکلتا تو چند لمحوں کے لئے ملنے والا سایہ بھی انہیں خوشی سے پاگل بنا دیتا تھا۔ میں ان کی حالت کو دیکھتا اور کڑھتا رہتا۔
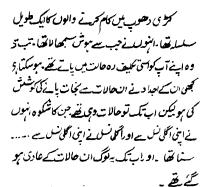
اچانک ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ میں کڑی دھوپ میں کام کرنے والوں کے اعتماد اور بھروسے کی علامت بن گیا ہوں۔ وہ دن میری زندگی کا بہت خوبصورت دن تھا۔ اب لوگوں کی بھیڑ میرے اشاروں کی منتظر رہنے لگی۔ میں خطاب کرتا تو وہ انتہائی عقیدت سے میری باتوں کو سنتے۔ اور جب میں کوئی حکم دیتا تو وہ اسکی تعمیل میں اپنی جان کی بازی لگا دیتے ۔۔۔ اور جب میرے لبوں سے نکلتا کہ "کام بند"! تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک کام کرتے ہوئے بے شمار ہاتھ یوں رک جاتے جیسے کسی نے ان ہاتھوں کے کام کرنے کی صلاحیت اچانک سلب کرلی ہو۔ اور میں اک انجانی مسرت سے جھوم اٹھتا

"کیپٹن"!

"ہاں!؟ میں نے فائل پر سے نظریں اٹھاتے ہوئے آواز کی سمت دیکھا۔

"آج ہڑتال کا دسواں روز ہے"!

"تو پھر!؟"

"اگر ہم جلدی کسی نتیجے پر نہ پہنچے تو لوگ بھوکوں مرنے لگیں گے ۔۔۔ اور ۔۔۔ ویسے بھی اب لوگ ہڑتال سے بیزار ہونے لگے ہیں۔ مجھے تو خوف ہے کہ کہیں عام بے زاری نہ پھیل جائے۔"

"ہاں تم ٹھیک کہتے ہو۔" میں اس نکتہ پر غور کر چکا ہوں۔ لیکن تم فکر مت کرو۔ ہماری تحریک کسی ناکامی کا شکار نہیں ہوگی۔ کل کا دن فیصلہ کن دن ہوگا"

دوسرا دن کڑی دھوپ میں کام کرنے والوں کے مظاہرے کا تاریخی دن تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی زنگار رنگ ہیولوں کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر موجزن نظر آتا تھا۔ "مردہ باد" "مردہ باد" کے فلک شگاف نعروں سے ساری فضا گونج رہی تھی۔ میں جلوس سے علیحدہ ہوکر اس طویل ترین جلوس کو دیکھ رہا تھا۔ اور ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوبا ہوا تھا۔ کہ کچھ پرچھائیاں میرے قریب آگئیں۔

"آپ یہاں"؟

"ہاں! کیوں؟"

"ہم بوڑھے پیڑ کے قریب ہیں"! انہوں نے اطلاع دی۔ میں خاموشی سے ان کے ساتھ ہولیا۔ کیونکہ یہی ہماری منزل تھی۔

آگے بوڑھے پیڑ کے گارڈس مظاہرین کو روکنے کے لئے کافی آگے بڑھ آئے تھے۔ بوڑھا پیڑ آج بھی بے حد تناور اور مضبوط دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی شاخیں بے لمبی انجانی سرحدوں تک پھیلی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ سایہ انتہائی گھنا اور راحت بخش تھا۔ اس کے نیچے زرنگار کرسی پر بوڑھے پیڑ کے نگراں بڑی تمکنت سے جلوہ آرا تھے۔ مظاہرین کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نگرانوں کے چہروں پر خوف اور بے زاری کے ملے جلے سایے ایک ساتھ گڈمڈ ہوگئے تھے۔ ان میں سے ایک نے بڑی ناگواری کے ساتھ اپنے گارڈس کو اشارہ کیا کہ وہ مظاہرین کو خاموش کرائیں۔ مگر مظاہرین بھلا گارڈس کی کب سننے والے تھے"۔ زندہ باد" "مردہ باد" "پیکے رہیں گے" کا شور اور تیز ہوگیا میں اسی زرنگار کرسی والے کی طرف جس نے مظاہرین کو خاموش کرنے کے لئے اپنے گارڈس کو اشارہ کیا تھا۔ بڑھنے لگا تو گارڈس نے مجھے اپنے حلقے میں لے لیا۔ میں آہستہ آہستہ کرسی والے کی طرف بڑھا۔ تو شور اور تیز ہوگیا۔ اب کرسی والے نے ملتجیانہ انداز میں میری جانب دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

"بھائی! خدا کے لئے پہلے اس ناگوار شور سے مجھے نجات دلاؤ"۔

میں بھیڑ کی جانب پلٹا تو مجمع گارڈس کے قابو سے باہر ہو رہا تھا۔ اور وہ بے چارے اب تھک کر ہانپنے بھی لگے تھے میں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا کہ زمین سے آسمان تک مکمل سکوت کی حکمرانی قائم ہوگئی۔ اور میں ایک عجیب فاتحانہ شان سے پھر کرسی والے کی طرف متوجہ ہوا۔ اور ایک عرض داشت پیش کی اور یوں گویا ہوا ۔۔۔

"عزت مآب کرسی والے!" ہم تمہارے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ تم بھی ہم میں ہی سے ہو ۔۔۔ اور ہم سے خوب واقف بھی ۔۔۔ کبھی تم بھی ہمارے نگہبانوں میں تھے اور ہمارے لئے بوڑھے پیڑ سے سایہ حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کیا کرتے تھے۔ جس کے لئے ہم آج تک لڑ رہے ہیں۔ لیکن اچانک تم بدل گئے ۔۔۔ اور بھول۔

"نہیں مجھے سب یاد ہے" زرنگار کرسی سے پہلی مرتبہ آواز آئی۔

کیا ملا عرض مدعا کر کے

بات بھی کھوئی التجا کر کے (رند)

"مجھے سب یاد ہے" مگر تم کیا جانو کہ میں یہاں آ کر کبھی بڑی ذمہ داریوں اور کیسے زبردست مسائل سے دوچار ہو گیا ہوں۔ تمہیں تو سایہ چاہئے۔ وہ بھی تھوڑا سا۔ اور اس کے لئے اتنی بے صبری ہو؟ خیر تم میرے قریب آؤ تو میں تمہیں بتاؤں کہ میری کیا مجبوریاں ہیں۔"

میں کرسی والے کے قریب پہنچا۔ لوگوں کی بھیڑ ہم دونوں کو گفتگو کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اور پھر جب میں بات ختم کر کے پلٹا تو بے اختیار میرے لبوں سے نکلا "ہڑتال ختم!"

"سائے کا کیا ہوا؟" لوگوں نے پوچھا۔

"بہت جلد بوڑھے پیڑ کے نگراں ہمارے لئے سایہ کا بندوبست کریں گے۔ یہ کرسی والے کا وعدہ ہے۔"

"زندہ باد" کے شور سے ایکبار پھر فضا گونج اٹھی۔

___ وعدوں سے بہل جانے والے ایکبار پھر اپنے اپنے کام پر جا پہنچے۔

رات آدھی سے زیادہ گذر چکی تھی۔ مسلسل آفس کام سے میں تھک بھی گیا تھا۔ اس لئے اب اٹھ کر آرام کرنے کے لئے جانا ہی چاہتا تھا کہ اچانک فرشتے نے پوچھا۔

"بوڑھے پیڑ کے نگراں نے بدعہدی کی ہے۔" فرشتے کے تیور بڑے خراب تھے۔

"ہاں اب تو ایسا ہی لگتا ہے۔"

"سایہ نہ مل سکا تو آپ پر سے بھی لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔"

"نہیں ایسا نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟"

"میں بوڑھے پیڑ کی جڑوں کو بیک وقت ڈائنامیٹ سے اڑا دوں گا۔" میں نے انتہائی سرد مہری سے جواب دیا۔

"جڑوں کو اڑا دو گے۔" فرشتے کے لہجے میں انتہائی حیرت تھی۔

"ہاں۔ رو میں نے ساری تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔"

"اور کہیں بوڑھے پیڑ کو اس کی خبر ہو گئی تب؟"

فرشتے نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"نہیں ایسا نہیں ہو سکے گا۔" میں نے آفس سے نکلتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

اپنے کمرے میں داخل ہوا تو میرا نحیف و نزار ساتھی ایک صوفے پر پڑا شاید سو گیا۔ یا پھر شاید جاگ ہی رہا تھا۔ میں نے آنکھ بچا کر اپنے بستر پر پہنچنے کی کوشش کی۔ تو اچانک اس کی آواز نے تن بدن میں آگ لگا دی۔

"تمہارا فیصلہ تمہاری جھنجھلاہٹ کی دلیل ہے۔"

اس کی کمزور آواز میں بھی مضحکہ اڑانے کا انداز صاف ظاہر تھا۔

"تم کیا جانو۔" میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے جھلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ سوال کتنی بار پوچھو گے؟"

"بہتر ہوگا تم اب کہیں اور ڈیرہ جماؤ۔ میرا کمرہ خالی کر دو" میں نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں شاید اب اس کی ہی نوبت آنے والی ہے۔" لیکن پھر بھی میں یہی کہوں گا۔

"تمہارا فیصلہ تمہارے منتشر ذہن کا فیصلہ ہے، یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔"

"خاموش!" میں پوری قوت سے چیخ پڑا۔

اور پیر پٹکتا ہوا کمرہ سے باہر نکل آیا۔ غصے اور پریشانی نے عجیب حالت بنا دی تھی۔ یہ تھا کون میں نہیں جانتا تھا اس سے میرا خون کا رشتہ تو نہیں تھا۔ مگر جب سے ہوش سنبھالا تب سے اسے اپنے ساتھ ہی پاتا تھا۔ اس لئے کبھی کبھی اپنا سا لگتا تھا۔ بات بات میں اس کی ٹوکنے والی عادت نے اب مجھے اس سے متنفر بنا دیا تھا۔ اور اس وقت تو وہ بالکل ہی ناقابل برداشت ہو گیا تھا۔

باہر نکلا تو ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکے بھلائے ہوئے ذہن کو راحت بخشنے لگے۔ میں بے ارادہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اچانک ایک لوہے کا ہاتھ اندھیرے کے عقب سے نکلا اور اس سے پہلے کہ میں کہیں پناہ لے سکوں میں پوری طرح اسکی گرفت میں تھا۔ اب پنجرے کی سلاخوں کو شمار کرنا میرا مقدر تھا۔

بات کھل ہی چکی تھی۔ مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور الزام سے انکار پر ڈٹا رہا۔ اچانک ایک دن میں نے دیکھا کہ میرا کمزور ساتھی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے میری جانب چلا آ رہا ہے۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

"بہادر تو بہت ہو۔ اقبال جرم سے ڈرتے ہو" اس نے اسی تیکھے انداز میں کہا۔ جو اس کا حصہ تھا۔

"اچھا تو اب آپ یہاں بھی میرا پیچھا نہیں چھوڑنے والے ہیں۔" میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

"میں تمہاری بھلے کی کہتا ہوں۔" اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

"دور ہو جاؤ میری نظروں سے" میں نے سلاخوں میں سے اپنا ہاتھ نکال کر اسے زور سے دھکا دیا تو وہ سامنے والی دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کے ماتھے سے خون بہنے لگا۔ مگر اس وقت میرے دل میں اس کے لئے رحم کا کوئی جذبہ نہیں تھا۔ اس نے عجیب نظروں سے میری جانب دیکھا۔ اب اس سے نظریں ملانا میرے بس سے باہر تھا۔ میں دوسری طرف دیکھنے لگا۔

ٹھیک اسی وقت ایک تیز آندھی چلنی شروع ہوئی آندھی تیز ہوتی گئی۔ تیز اور تیز۔ یہاں تک کہ ہر چیز گرد و غبار میں چھپ کر رہ گئی۔ قریب کی کسی چیز کو دیکھنا بھی مشکل ہو گیا ___ میں دونوں آنکھوں پر ہاتھ رکھے زمین پر بیٹھ گیا ___ آندھی چلتی رہی ___ پھر آہستہ آہستہ اس کا زور ٹوٹنے لگا ___ اور فضا صاف ہونے لگی ___ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا تو میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

میں بوڑھے پیڑ کے راحت بخش سائے میں زرنگار کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ کڑی دھوپ میں کام کرنے والوں نے مجھے زرنگار کرسی پر دیکھا تو خوشی سے اچھل پڑے۔

"سب سے پہلے میں تمہارے لئے سایہ کا بندوبست کروں گا۔" مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگی۔ مگر جواب میں زندہ باد کے فلک شگاف نعرے نے جیسے کان کے پردے ہی پھاڑ دیئے۔ میں بوڑھے پیڑ کے نگرانوں سے مشورہ کرنے لگا۔ اور وہ مجھے اسرار و رموز سمجھانے لگے۔ دن گذرنے لگے ___ اور پھر ایک طویل مدت گذر گئی۔

___ اور ایک روز پھر کڑی دھوپ میں کام کرنے والوں کا ایک طویل جلوس میرے سامنے تھا۔ میرے گارڈس انہیں روکنے کی پوری کوشش کے باوجود ناکام ہو رہے تھے۔ ان کے زبردست شور نے مجھے جھنجھلا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اپنے گارڈس کو حکم دوں۔ میں نے دیکھا کہ ایک کونے سے ایک نوجوان میری جانب بڑھ رہا ہے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ تو اس نے جانے کیا سمجھ کر مجمع کی طرف پلٹ کر کچھ اشارہ کیا۔ اور زمین سے آسمان تک مکمل سکوت کی حکمرانی قائم ہو گئی ___ اور وہ میری جانب ایک فاتحانہ شان سے پلٹا ___ پھر ایک عرضداشت میری خدمت میں پیش کی۔ اور کہا۔

"کرسی والے! ہم تمہارے لئے اجنبی نہیں۔ تم بھی ہم میں ہی سے ہو۔ اور ہم سے خوب واقف بھی۔ کبھی تم ہمارے لئے ___"

"ہاں مجھے سب یاد ہے۔ تمہیں سایہ چاہئے نا؟"

"ہم نے کب سایہ دینے سے انکار کیا ہے" تم میرے قریب آؤ تو میں تمہیں بتاؤں کہ ___ اور جب ہماری

گفتگو ختم ہوئی تو جوشیلے نوجوان نے ہڑتال واپس لینے کا اعلان کر دیا۔ لوگوں نے اس سے کچھ پوچھا۔ جانے اس نے کیا جواب دیا ۔۔۔ اور بھیڑ منتشر ہو گئی۔

ایک روز تاروں بھرے آسمان کے نیچے، زمین کے سخت کشادہ سینے پر کڑی دھوپ میں کام کرنے والے سر جوڑ کر بیٹھے تھے ۔۔۔ بوڑھے پیڑ کا سایہ ہمارے بھروسے اور اعتماد کی علامتوں کو کھا جاتا ہے۔ وہ منحوس ہے۔ بوڑھے پیڑ ہی کو ختم کر دیا جائے ۔۔۔ لوگوں کے منہ میں جھاگ اب گاڑھے لعاب میں تبدیل ہو چکا تھا ۔۔۔ رات ڈھلنے لگی ۔۔۔ زبانیں بھی تھک کر ہانپنے لگیں ۔۔۔ اور پھر یہاں تک کہ خاموش ہو گئیں۔

فیصلہ! خاموشی ۔۔۔ نتیجہ ۔۔۔ صفر...

اور جب اسی حالت میں کافی دیر ہو گئی تو ان ہی میں سے ایک باریش بوڑھا اٹھا جس نے ابتک پورے شور شرابے میں حصہ نہیں لیا تھا ۔۔۔ لوگوں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر وہ کہنے کی طاقت پہلے ہی ختم کر چکے تھے۔ اس لئے کہتے کہتے۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو چکی تھیں۔

بوڑھے نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا ۔۔۔ کہ اب ہمیں سائے کے لئے جد و جہد نہیں کرنی چاہئے۔ سب نے آنکھیں پھاڑ کر بوڑھے کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں پھر بند ہونے لگیں۔

بوڑھے نے بڑی متانت سے اپنی بات آگے بڑھائی اب ہمیں ایک ایسی نسل تیار کرنی چاہئے جو ایک زبردست اور آخری جواب دہی کے تصور سے آشنا ہی نہیں اسے حاصل زندگی سمجھتی ہو۔ تب اس میں سے ہمارا جو لیڈر اٹھے گا۔ صرف اسی کو بوڑھے پیڑ کا سایہ کبھی نہیں کھا سکے گا۔

"بولو! ایسی نسل تیار کر سکو گے"؟ اس نے نظریں اٹھائیں۔

سب کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ اور ان کے خراٹوں کی دھیمی دھیمی آواز رات کی خاموش فضائیں اپنے حصار کو بلند کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

بقیہ :۔ **کفارہ**

نیلام کر لیگی۔

امو نے دیکھا تو اس نے اپنے ارادے کو پھر سے دہرایا۔ اس نے اپنے ٹرنک سے تمام رقم نکال کر جیب میں رکھ لی کہ موقع ملتے ہی سیتا کو بھگا لے جائے گا۔ اور اس کے گاؤں چھوڑ دیگا۔

دوپہر تک سیتا عرف موہنی کے کئی فوٹو لے گئے۔ اور تھری اسٹار اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں پہنچا دیئے گئے۔ لیکن لکشمی نے فوٹو لے جانے والوں کو سخت تاکید کی کہ گاہک یہاں لاؤ۔ باہر نہیں۔

اسی دن رات میں تقریباً گیارہ بجے ایک آدمی آیا اور اس نے لکشمی سے کچھ کہا۔ لکشمی نے دھیرے سے انکار کر دیا۔ ان کی یہ باتیں اشاروں میں ہو رہی تھی۔ آدمی نے دو انگلیاں بتائیں۔ لکشمی پھر بھی خاموش رہی تو اس نے تین انگلیاں بتائیں۔ اس کا مطلب تھا تین ہزار اور سیتا عرف موہنی کو کسی فائیو اسٹار میں بھیجنا تھا لیکن لکشمی ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ کوئی نخرا نہ کھڑا کر دے۔ اس آدمی نے کہا "وہ کسی ملک کا شہزادہ ہے بڑا آدمی بہت بڑا۔ اب چار پر راضی ہو جا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔ اور تیرا آدمی بھی تو ہے نا۔ یہ برقعہ اس کو اڑھا دے اور ساتھ کر دے" اس نے برقع لکشمی کی طرف بڑھا دیا اور کہا۔ "میں باہر سفید رنگ کی امبیسیڈر میں ہوں۔ امو کو بتا دینا"

لکشمی سیتا کے کیبن میں گئی۔ وہ کسی فکر میں ڈوبی ہوئی لیٹی تھی۔ لکشمی نے کہا "بیٹی لیٹے لیٹے تھک گئی ہو گی جرا گھوم پھر آ۔ ممبئی تو رات میں بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

پھر اس نے امو کو آواز دی، جو اس آواز کا ہی منتظر تھا۔ امو جب اندر گیا تو لکشمی نے اسے سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ "لے میری موہنی کو ممبئی گھما لا۔ اور کسی ہوٹل میں کھانا کھلا اور اس کا جو من چاہے دلا دینا۔ باہر سفید امباسڈر کھڑی ہے اسمیں جانا" وہ جانے اٹھی اور باہر جانے لگی تو لکشمی نے کہا "بیٹی کسی کی نظر نہ لگے۔ اس لئے یہ برقعہ پہن کر جا یہاں اچھے لوگ نہیں ہے۔"

سیتا نے چپ چاپ برقعہ اوڑھا۔ جب وہ باہر نکلنے لگے تو سیتا کو احساس ہو گیا کہ وہ ایک جہنم سے نکل کر دوسرے جہنم میں پہنچ چکی ہے۔ اس نے امو کا ہاتھ پکڑ کر کہا "یہاں کیا ہوتا ہے؟ یہ کون سی جگہ ہے؟ مجھے یہاں سے نکالو" امو چپ چاپ چلتا رہا۔ اس نے باہر دیکھا ملباری ہوٹل کے قریب نکڑ پر ایک سفید امبیسیڈر کھڑی تھی۔ وہ سیتا کا ہاتھ پکڑ کر مخالف سمت بڑھ گیا۔ ایک اندھیری گلی میں مڑ کر اس نے سیتا سے کہا "دیکھ یہ ایسا نرک ہے جس میں پھنسنے کے بعد آدمی بچ نہیں سکتا۔ ایک ہی راستہ ہے کہ تو بھاگ چل میں تجھے تیرے گاؤں پہنچا دوں گا۔"

سیتا چلتے چلتے رک گئی۔

"میرے گاؤں نہیں تیرے گاؤں۔ میرا گاؤں بھی ایسا ہی نرک ہے۔"

امو نے کہا "سوچ لے، میرا نام امتیاز خان ہے اور تو سیتا!"

سیتا نے جھک کر اس کے پیر چھوئے اور کہا "تو جو کوئی بھی ہے، میرا دیوتا ہے کیونکہ اتنے لوگوں میں تو ہی ایک انسان نظر آتا ہے۔ تو جہاں چاہے چل میں تیرے قدموں میں اپنی زندگی گذار لونگی"

وہ دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اندھیرے میں بڑھ گئے۔ دونوں کے چہروں کی چمک اندھیرے میں بھی ایک دوسرے کو نظر آ رہی تھی۔ سیتا کا چہرہ جہنم سے نکل کر جنت کی طرف جانے کی خوشی میں چمک رہا تھا اور امو کا اس لئے کہ وہ آج پھر امتیاز خان بن کر اپنے گاؤں لوٹ رہا تھا اور اپنی گذری ہوئی ذلیل زندگی کا کفارہ بھی ادا کر چکا تھا۔

بقیہ :۔ **شہر .....**

کر زور سے بول سکے۔ اپنی آواز سن سکے۔ یہاں یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم میں ہر شخص ایک دوسرے کی گالی تو سنتا ہے مگر اپنی آواز نہیں سنتا۔ سچ تو یہ ہے کہ اسکی آواز ہی بہتر طور پر اس کے دکھ درد بیان کر سکتی ہے۔

دن گھٹتے ہیں مگر پھر بڑھ بھی جاتے ہیں۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو یہ اسی طرح قائم و دائم ہیں پھر بھی نہ جانے کیوں ہر روز انسان کی زندگی سے کچھ کم ہو جاتا ہے۔ یہ تو بس گھٹتا ہی رہتا ہے۔ یہ انسان ہے جو گھٹتا رہتا ہے۔ اور یہ شہر ہے جو پھیلتا رہتا ہے ہم میں سے ہر ایک کی پہلے ایک نجی زندگی تھی۔ اور نجی زندگی کی نجی خواہشیں بھی تھیں۔ خوبصورت اور کنواری خواہشیں۔ اپنا وجود سمیٹنے کی خواہش۔ اپنی آنکھوں کی خواہش۔ اپنے کانوں کی خواہش اپنے جسم کی خواہش۔ اب صرف اس شہر کی ہی خواہشیں ہیں۔ روشن ہوتا ہے تو پورا شہر ۔۔۔ اندھیرا چھا جاتا ہے تو پورے شہر پر۔

اور ہم میں سے کچھ سمجھ رہے ہیں کہ سڑک بیچ تیرھی کی طرف جاتی ہے اور کچھ سوچ رہے ہیں کہ نہر کی طرف۔ مگر خود آنے جانے میں مصروف ہیں۔

گوارا کب ہے یہ اہلِ وفا کو

تری آنکھوں کا کاجل پھیل جائے (فطرت سرحدی)

لایعنی

رشید اعجاز
۹۸۳ جوانی پیٹھ پونہ ۔ ۲

"میرے پر مجھے واپس دے دو!"۔
"کون سے پر؟" مجھے تو کچھ یاد نہیں۔"
"وہی جن پر میری پرواز کا مقصد ٹکا تھا!"
"وہی نا! شیشے جیسے، بے رنگ؟"
"ہاں ۔ وہی"
"وہ تو قینچیوں کی زد میں آگئے!"
"نہیں! یہ نہیں ہو سکتا"
"لیکن ایسا ہوا ہے دوست!"
"کیا کہہ رہے ہو؟ اس سے پہلے بھی تو کئی قینچیاں چلی تھیں اُن پر! لیکن ....
"لیکن کیا ۔ ؟"
"جیت ہمیشہ پروں کی ہوتی تھی قینچیاں دھار کھو بیٹھی تھیں۔"
"ہوا ہوگا کبھی ایسا بھی۔ مگر اس بار شکست پروں کی ہوئی۔"
"تو ... تو وہ کیا ہوئے؟"
"کتر لئے گئے!"
"اور؟"
"ہوائیں بکھر گئے!"
"یقین نہیں آتا"
"تمہارے یقین کرنے نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے"
"تو پھر؟"
"تم ... تم ایسا کرو ... دوسرے پر لے جاؤ!"
"کون سے"؟
"جو بھی تمہیں پسند آجائیں، سنہرے، رپہلے، سرخ ہرے، پیلے نارنجی یا کسی اور رنگ کے"
"لیکن! میرے پر تو بے رنگ تھے، اور میرا جسم بھی تو بے داغ ہے!"
"تب تو تم کالے پر بھی لے سکتے ہو۔ کانٹراسٹ سفید جسم اور یہ کالے پر بابت جچو گے!"
"مگر بے داغ جسم پر کالے پر کیونکر کھپ سکتے ہیں؟"
"کھپا تو کسی طرح دے رہا ہوں .... ہمارے دوست ہونے کے ناطے ۔ ورنہ .....!"
"ورنہ کیا؟"
"ورنہ یہ کہ تمہارے پر تو گئے کہیں دوسرے بھی ہوا نہ ہو جائیں ۔ پرواز کا موسم شروع ہو چکا ہے"۔
"اوہ! اب سمجھا"
"کیا سمجھے؟"
"تم نے اسی طرح میرے بے رنگ پر کسی اور کے حوالے کئے ہونگے"
"نہیں میں ایسا کبھی نہیں کرتا ۔ تمہارے لئے تو محض دوستی کے ناطے"
"اچھا اچھا، رہنے دو ... لیکن مجھے نہیں چاہیئں یہ کالے پر، یہ رنگ بھی کوئی رنگ ہے؟ کالا! سیاہ ظلم و ظلمت کی علامت! اندھاپن!
"تو بھیا چمکدار لے لو نا، سنہرے سورج کی کرنوں میں ڈھلے دھلائے ۔ یا رپہلے چاندنی کی طرح ٹھنڈی مسکان والے"
"لیکن یہ چمک تو صرف دکھاوا ہے!"
"تم بھی عجیب ہو، مقصد اور دکھاوے کے پھیر میں پڑے ہو!"
"کیا مطلب!"
"مطلب یہ کہ اس چکر سے چھوٹو اور پرواز کے مزے لوٹو ۔ زندگی چار دن کی ہے، پھر تم تو دو پہلے ہی گنوا چکے ہو!"
"میں نے خود نہیں گنوائے، گنوائے گئے ہیں مجھ سے!"
"ہاں ہاں جانتا ہوں ۔ میں سب جانتا ہوں۔ خیر! جو کچھ ہوا سو ہوا، اب کیا کہتے ہو؟"
"میں کیا کہوں؟ کچھ سمجھ میں نہیں آتا ۔ میرے پر"
"یقین کرو دوست! وہ منتشر کر دیئے گئے!"
"میرے پر ہوائیں منتشر کر دیے گئے اور تم دیکھتے رہے!"
"میں کیا کرتا بھائی ۔ تم تو جانتے ہی ہو تیز ہواؤں کے موسم میں سبھی اپنے پر کھول ڈالتے ہیں ۔ اور ان کی حفاظت کے لئے میں ہی دکھائی دیتا ہوں انہیں۔ چلے آتے ہیں سبھی اپنے اپنے پر رکھوانے ۔ اب کسی سے ناکہتے بھی نہیں بنتا ۔ ایسے میں ....."
"ہاں تمہاری بات بھی ٹھیک ہے ۔ پروں کے امین ہو نا! لیکن"
"پھر وہی لیکن؟ میری مانو ۔ بڑا اچھا موسم چل رہا ہے سرپھری ہوائیں دم توڑ چکی ہیں ۔ کئی ایک تو اپنے پر بھی گئے ہیں کچھ پڑے ہیں جو تم دیکھ رہے ہو ۔ پسند کر لو انہیں میں سے اور خوب ڈٹ کر اڑو۔
"اچھا! تو یوں کرو ..... وہ ۔ وہ سنہرے پر دے دو مجھے۔"
"سنہرے؟ .... ہنہ .... اچھا لے لو ۔ تم بھی کیا یاد کرو گے؟"

—x—x—x—x—x—x—

"ارے؟ کیا ہوا؟ کیا بات ہے تم اتنی جلدی واپس آگئے؟ اور پھر یہ کیوں کھول ڈالے؟ یا باندھے ہی نہیں ابتک ۔ ؟"
"نہیں چاہئیں مجھے یہ ۔!"
"کیوں .... ؟"
"بہت وزنی ہیں، اڑان بھرنے میں دقت محسوس ہو رہی ہے!"
"تم نے کچھ غلط کھا لیا ہوگا"
"میں نے کچھ کھایا ہی نہیں"
"کچھ کھایا ہی نہیں ۔ ؟ ... تو پھر ہو سکتا ہے کہ بھوک کی وجہ سے، بدن میں کچھ ہلکان آگئی ہو ۔ تم یوں کرو پہلے پیٹ بھر کھا لو تا کہ یہ وزنی نہ لگیں!"
"پیٹ بھر کھا لوں گا تو اڑوں گا کیونکر؟"
"خالی پیٹ بھی تو اڑ نہ سکو گے ۔ پیٹ بھر نہ سہی مگر اتنا تو تمہیں ضرور کھانا چاہیے کہ پروں کو سنبھال سکو۔"
"اس کے لئے تو بازار جانا ہوگا .... اور پیسے ...."
"تو کیا ..... قلاش ہو؟"
"تم سے کیا چھپانا ۔ !!"
"اچھا تو یوں کرو ۔ نور بخش کے لنگر چلے جاؤ ۔ آج جمعرات ہے، شام تک بھیڑ لگی رہتی ہے وہاں!"
"میں بھکاری تو نہیں"
"بھئی! تم نے آدھی عمر یونہی گذار دی مگر تمہاری اکڑ

زوال جاہ و دولت میں بس اتنی بات اچھی ہے کہ دنیا کو جو بھی آدمی پہچان جاتا ہے (اکبر الہ آبادی)

ہنس گئی۔ ایک دو وقت کہیں کھا لینے سے کوئی بیمار تو نہیں ہو جاتا۔ میرے پاس بھی پکا پکایا کچھ نہیں۔ آج کے دن میں کچھ کھاتا ہی نہیں۔ ورنہ تمہیں بھی کھلا دیتا"۔

"چھوڑو یار — یہ کھانے وانے کا چکر۔ تم یہ بدل دو ذرا ہلکے والے"۔

"اب ہلکے والے کہاں سے لاؤں اور پھر تم تو رنگوں کے پھیر میں پڑ جاتے ہو!.... تمہیں انہیں سب کم و بیش ایک سے وزن والے ہیں.... تم مانتے کیوں نہیں چلے جاؤ بھائی! وہاں تمہیں کوئی کچھ بھی نہیں کہے گا۔ ہاں ہاں جاؤ شاباش، ارے ہاں یہ سنہرے پر یہیں چھوڑتے جانا۔ واپسی میں پھر دے دوں گا۔ جاؤ۔ جاؤ۔ میں ذرا کمر سیدھی کر لوں...."

— — — — — — — —

"کون ہے....؟"

"میں ہوں!"

"آ گئے تم۔ آؤ۔ آؤ۔ اندر آ جاؤ" "کھا چکے یا یونہی لوٹ آئے؟"

"کھا چکا ہوں۔ کچھ توانائی محسوس کر رہا ہوں"۔

"یہ ہوئی نا بات! اب تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پھر میں ہی باندھتا ہوں تمہارے پر۔ دیکھوں تو کیسے اڑ نہیں پاتے"۔

"ہاں! کچھ دیر لیٹنا ہی چاہیئے۔ کھانا زیادہ ہی ہو گیا"۔
"کہیں لمبی تان کر سو نہ جانا۔ مجھے گھنٹے بھر بعد جانا ہے۔ میں تو یونہی کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گیا ہوں"۔

"ہاں ہاں! میں بھی لیٹوں گا ہی، خوب سو چکا ہوں" جب سے پر کھول کر تمہارے پاس رکھوائے تھے تب سے سو ہی رہا ہوں تھا"۔

"اچھا! بڑی لمبی نیند لے لی اس بار تم نے"۔

"اور اسی کا نتیجہ بھگت رہا ہوں، اپنے پر گنوا چکا ہوں"۔

"چھوڑو دوست! یہ سنہرے پر بھی تمہارے پروں سے کہیں بہتر ہیں۔ میں خود تو اڑتا نہیں لیکن ہر اڑنے والے پر میری نظر رہتی ہے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے، سنہریت ہی کی اجارہ داری دیکھی ہے ہر قسم کی پرواز پر چھائے رہتے ہیں یہ۔ گو آجکل ان کے بھرم کھلتے جا رہے ہیں"۔

"شاید اسی لئے تم نے بڑی فراخ دلی سے مجھے دے دیئے یار"۔

"تم تو خوامخواہ شک کرنے لگے دوست!"

"اچھا! سچ بتانا کیا ہوئے میرے بے رنگ پر؟"

"تم کو ابھی تک یقین نہیں آیا میری بات پر"۔

"نہیں یہ بات نہیں۔ میں کچھ اور سوچ رہا تھا"۔

"کیا سوچ رہے تھے؟"

"کہہ دوں"!

"ہاں۔ ہاں"

"برا تو نہیں مانو گے"؟

"تمہاری کسی بات کا برا منانا ہوتا تو اب تک خفا بھی ہو جاتا۔ کہو بے تکلف ہو کر کہہ جاؤ"۔

"میں سوچ رہا تھا.... شاید میرے پر تمہیں پسند آ گئے۔ اور تم انہیں باندھ کر خود اڑنا چاہتے ہو"۔

"میں نے کہا نا! میں تو اڑتا نہیں۔ بہت اڑ چکا اپنے دنوں میں۔ سب کچھ بے کار رہے۔ اور پھر ایسی کونسی خوبی تھی تمہارے شیشے نما پروں میں کہ مجھ میں اڑنے کی تمنا جاگتی"؟

"انہیں پرواز کا مقصد لکھا تھا! منزل کی اچوک نشاندہی تھی"!

"میں تو مقصد وغیرہ کا قائل نہیں دوست! تم جو چاہو سمجھو سوچو لیکن یہ حقیقت ہے کہ تمہارے پر ضائع ہو چکے"!

"خیر جانے دو! میں نے جو سوچا تھا وہ کہہ دیا"۔

"تو اب میری طرف سے دل صاف ہے نا"!

"بالکل"......

— — — — — — — —

"آہا! — لوٹ آئے کہو کیسی رہی سنہری پرواز؟"

"ہنہ"

"کیوں! کیا مزہ نہیں آیا؟ اور ہاں تم بہت جلد لوٹ آئے۔ اڑان تو تم نے ٹھیک ہی بھری تھی۔ بہت اوپر تک گئے تھے کیوں؟...."

"ہاں کافی اوپر تک ہو آیا۔ مگر!"

"مگر وگر کچھ نہیں۔ تم بہت تھکے ہوئے لگ رہے ہو۔ آنکھیں بھینچی ہیں۔ شاید ابھی تک نیند کا غلبہ ہے"

"آنکھوں میں.... نیند نہیں، ان پروں کی چمک ہے"

"ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے ان پروں کی چمک نے تمہاری آنکھوں پر اثر ڈالا ہو"

"اتنا کہ اندھا محسوس کر رہا ہوں خود کو...."

"تو دوران پرواز تم ان کی سنہریت ہی کو دیکھتے رہے"۔

"میں نے بہت کوشش کی کہ میری نظران کی جانب سے ہٹی رہے۔ مگر یہ کسی طرح ممکن نہ ہو سکا۔ ان پروں کے خم کچھ عجیب گستاخ سے ہیں!"

"اور تمہیں ان گستاخیوں کو تابع کرتے نہیں بنا، شاید"۔

"یہ بازوؤں کا حکم مانیں تب نا۔! اور تو اور یہ تو اس طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے جہاں سے انہیں توانائی ملتی ہے۔ پرواز کے لئے حرکت نصیب ہوتی ہے"

"ہاں.... یہ بات تو ہے ان میں، بڑے خود نگر ہیں یہ کہیں دیکھیں بھی تو خود ہی خود کو....!"

"سب کچھ جانتے ہوئے پہلے ہی کیوں نہ کہہ دیا تم نے؟"

"بھئی مانگے تو تم نے ہی تھے۔ میں نے سوچا تم انہیں کنٹرول کر ہی لوگے.... اور پھر...."

"پھر کیا....؟"

"پھر یہ کہ.... یہ پر جسکی ملکیت ہیں وہ اس بار اڑان بھرنے کے قابل ہی نہیں۔ اسی لئے دے دیئے تھے تمہیں"۔

"کیوں؟ ان پروں کا مالک اڑان بھرنے کے قابل کیوں نہ رہا۔ ایسی کیا بات ہو گئی؟"

"گزرے موسم کی ہواؤں نے اسکی پرواز میں وہ وہ کیڑے نکالے کہ بیچارہ شرم سے پانی پانی ہو گیا۔ اور گھبیا کر اسطرح سویا ہے کہ اب جاگنے کی امید کم ہی نظر آتی ہے۔ کم از کم اس رت میں تو اڑنے سے رہا"۔

"ہو سکتا ہے اسکی غلط پرواز محض انہیں پروں کی وجہ سے رہی ہو۔!"

"تم تو شکی ہو! جہاں ذرا سا میل ہاتھ لگا فوراً تیل بنانا شروع کر دیا۔ خیر! چھوڑو۔ اب کیا کہتے ہو.... انہیں قابو میں کر لوگے یا...."

"بالکل نہیں! انہیں بس میں کرتے کرتے میں اپنی توانائی کھو بیٹھوں گا۔ انپر نظر ڈالتے ہوئے میں، اندھا ہو جاؤں گا"۔

"اچھا تو کھول دو انہیں میں کچھ اور دکھاتا ہوں"۔

"دیکھنے کے ساتھ ساتھ تعارف بھی ہو جائے تو اچھا رہے گا۔ پوری معلومات کے بغیر اب ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا کسی میں"!

"چلو! — یونہی سہی!"

— — — — — — — —

"یہ دیکھو! دھرے ہیں سب کے سب۔ پہلے تم اپنی پسند کہیں نکالو۔ جو بھی پسند کر لوگے اس کے بارے

بے تکلف یہ مرے پاس چلی آتی ہے — جیسے ہر ساعت غم میری ملاقاتی ہے (عروج زیدی)

میں پوری پوری تفصیل بتاؤں گا۔"
"تم سب سے متعلق بتاتے چلو... میں پسند کرلونگا۔"
"کیوں خوامخواہ سب کے پول کھولتا بیٹھوں۔ بہت وقت لگ جائے گا۔ تم ایسا کرو۔ دو چار رنگ کے پسند کرلو پھر میں معلومات بھی دئیے دیتا ہوں۔"
"کوئی مضائقہ نہیں..... وہ گلابی کیسے ہیں؟ ذرا دیکھوں تو....."
"لو! دیکھ لو! ہیں تو بہت مناسب، ان میں سفید رنگ کی آمیزش بھی ہے۔"
"ایسا ہی لگتا ہے، اچھے نظر آتے ہیں۔ اور شاید ہلکے بھی ہیں۔ کیوں؟"
"لیکن ایک بات بتا دوں!"
"کیا؟ کونسی بات؟"
"دو غلے ہیں یہ! نہ صاف سرخ نہ صاف سفید..."
"تو اس سے کیا ہوتا ہے۔"
"بہت کچھ ہوتا ہے۔ جب ہواؤں کی تان سرخی پر ٹوٹتی ہے تو صاف مکر جاتے ہیں کہ ہم لال نہیں۔ اور جب سفیدی عتاب زدہ ہوتی ہے تو....."
"میں سمجھ گیا۔ لیکن... لیکن اسطرح ــ اڑنے والے کو بچا لیتے ہونگے یہ سرپھری ہواؤں سے..."
"کاش ایسا ہوتا!"
"تو کیا ایسا نہیں ہوتا؟"
"تم جو سوچ رہے ہو، وہ نہیں کرتے یہ۔ ایک طرف ہواؤں کے نرغے سے نکلتے ہیں تو دوسری طرف بازوؤں کو سمجھاتے ہیں کہ 'جھک جاؤ! ہوچکی پرواز ہواؤں کا موڈ کچھ ٹھیک نہیں۔ ہم تو نارمل فضاؤں کے لئے بنے ہیں ان پاگل ہواؤں سے کون لڑے۔'"
"اچھا! تو یہ میدان چھوڑ کر بھاگنے والوں میں سے ہیں؟"
"ٹھیک ہی سمجھے"
"تب تو نہیں چاہئیں یہ۔"
"ہاں تمہارے مزاج کے لئے ٹھیک نہیں ہیں۔"
"وہ ــ وہ، نیلے نیلے آسمانی رنگ کے کیسے ہیں؟"
"ویسے تو بہت اچھے ہیں مگر!....."
"مگر کیا ــ؟"
"دورانِ پرواز ان کا کیا رویہ ہوتا ہے میں نہیں جانتا"
"کیا مطلب؟"
"نیلگوں پس منظر میں ان کا کچھ ٹھیک نہیں۔ کچھ پتہ ہی نہیں چلنے دیتے یہ، آنکھوں کو دھوکا دیتے ہیں۔"
"لیکن ــ ایسا تو ان کے ساتھ ہوتا ہوگا جو زمین ہی سے ان پر نظر رکھنا چاہتے ہوں۔"
"اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ ان سے متعلق میری معلومات کچھ زیادہ نہیں۔ اگر تم پسند کرو تو اپنی ذمہ داری پر لے سکتے ہو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"
"ہاں احتیاط بہتر ہے۔"
"وجن سے متعلق کچھ بھی نہ معلوم ہو سکے انہیں پتے باندھ کر تجربے کرتے پھرنا ٹھیک نہیں۔"
"ہاں احتیاط بہتر ہے۔"
"تب تو تمہیں کچھ سمجھاؤ، میں کچھ الجھن محسوس کر رہا ہوں"
"میری مانو گے۔؟"
"ہاں ــ ہاں۔ کیوں نہیں۔"
"وہ اُس طرف دیکھ رہے ہو، اُس کونے میں۔؟ وہ چھینٹے دار.....؟"
"وہی۔ دراصل وہ سفید اور بے داغ ہی تھے لیکن ایک خاص مقصد کے تحت ان پر رنگ برنگے چھینٹے ڈال دئیے گئے ہیں۔ دیکھو تو۔ کیسے خوبصورت ہیں۔ ہرے، نارنجی، نیلے، پیلے، ساری قوس قزح کے چھینٹے کیسے بھلے لگتے ہیں۔"
"اِدھر تو دینا۔"
"یہ ــ یہ لو، دیکھ لو۔ وزن بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔ بآسانی سنبھالے جا سکتے ہیں۔"
"ہاں! ہیں تو کچھ ایسے ہی۔"
"ایک اور بات بتاؤں؟"
"کہو۔ کہو۔"
"ان میں ایک خاص بات ہے۔ اور وہ یہ کہ ان کا مزاج تمہارے مزاج سے بالکل ملتا ہے۔"
"یعنی۔؟"
"تم بھی تو مقصد، نیکی، بدی، تلاش وغیرہ کے چکر میں پڑے رہتے ہو نا۔ ان پروں کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی ہے۔"
"کس کس کے ہیں یہ؟"
"چھینٹے دار پر اس کے ہیں، جیسے نروان، نجات سیدھی راہ وغیرہ وغیرہ کی تلاش رہتی ہے اور جو صرف اسی مقصد کے تحت پرواز میں جٹا رہتا ہے۔"
"ہوں" ــ
"تو اور ان پروں میں ہوا کے خلاف شدت بھی ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ ٹوٹتے بھی نہیں۔"
تو بس ٹھیک ہے یہی چل جائیں گے۔"
"لو! اچھی طرح کس لو۔ انکی ابتدائی اڑان زلزلے دار ہوتی ہے۔ سمجھ لو....."
"اچھا ــ!!..."
"ہاں۔ انہیں بازوؤں سے باندھنے والا پہلی ہی جست میں ہیولا معلوم ہونے لگتا ہے۔"
"لیکن دوست! ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔"
"وہ کیا؟"
"جب یہ ٹوٹتے بھی نہیں، ان میں ہواؤں کے خلاف شدت بھی ہے اور سب سے بڑی بات کہ یہ مقصدی ہیں تو اس طرح بے کار کیوں پڑے ہیں، ان کا باندھنے والا کیوں سو رہا ہے؟"
"آرام کی ضرورت سب کو پڑتی ہے، اور..... اور شاید اسے ابتک اپنے صحیح راستے کا علم نہ ہو سکا ہو ہو سکتا ہے۔"
"رک کیوں گئے۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟ کیا ہو سکتا ہے؟"
"میں یہ کہہ رہا تھا، ہو سکتا ہے تم انہیں باندھ کر صحیح راستہ معلوم کر ہی لو۔"
"اور اس جگہ پہنچ جاؤں جس کے لئے یہ پر وجود میں آئے ہیں۔"
"اور کیا"
"اور ایک ایسی منزل پر اتر پڑوں جو.. ہو سکتا ہو میری نہ نکلے۔"
"دیکھو دوست! تم اپنے وہ پر گنوا چکے ہو جن پر تمہاری پرواز کا مقصد لکھا ہوا تھا۔ تمہاری اپنی منزل کے نشان کندہ تھے۔ سچ بتانا کیا تمہیں اپنی منزل کا ہلکا سا خاکہ بھی یاد ہے؟"
"نہیں۔ بالکل یاد نہیں۔"
"تو ــ ایسی حالت میں صرف پرواز اور پرواز کا ہی خبط باقی رہ جاتا ہے۔ ہے نا!..... تب کسی نہ کسی منزل تک پہنچ جانا ہی عقلمندی ہے۔ کسی مقام پر تو پرواز کا خبط ٹوٹے،..."
"واقعی تم دوست! تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔"
اچھا! چلو تیار ہو جاؤ۔ میں نے اچھی طرح کس دئیے ہیں یہ چھینٹے دار پر..... لے اپنی پرواز مکمل ہی سمجھو..."

ـــ ــ ـــ ــ ـــ ــ ـــ ــ ـــ

"مجھے تو یوں لگتا ہے تم اپنے پروں کے ساتھ اڑنے کا فن بھی گنوا چکے ہو۔"

آنکھ سے ہو خوں نشانی کس طرح
اک جگہ ہو آگ پلتی کس طرح (ظرف قریشی)

"نہیں میں اپنا فن نہیں بھولا۔ اچھی طرح جانتا ہوں اڑان کس طرح بھری جاتی ہے، پرواز کیسے کہتے ہیں"۔
"پھر کیا بات ہے کہ تم بار بار زمین کا رخ کر لیتے ہو؟"
پر کیسے بھی ہوں، کسی کے ہوں، ایک ماہر پرواز کے لئے یہ بات ضمنی حیثیت رکھتی ہے سنہرے پر تمہیں بھاری اور چمکدار معلوم ہوئے۔ دوسرے پروں کو بندھوانا تم نے گوارا ہی نہ کیا اور اب یہ چھینٹے دار پر بھی تمہیں نہیں اڑا سکے۔!"
"ان پروں سے میں اڑا تو خوب ہوں مگر۔۔ تم نے ان سے متعلق جتنی بھی معلومات فراہم کی تھیں، بس یونہی سی نکلیں ۔۔۔"
"کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"بہت کچھ کہونگا ان کے بارے میں کیونکہ میں نے عملی طور پر آزمایا ہے انہیں"۔
"اور صرف نقائص پر ہی نظر رہی ہوگی تمہاری۔ ایسی حالت میں میری بتائی ہوئی خوبیوں کی طرف کون توجہ دیتا"۔
"یہ بات نہیں، ان چھینٹے دار پروں میں خوبیوں سے زیادہ عیب بھرے ہیں۔ اور جو چند خوبیاں ہیں وہ بھی ابہام زدہ"۔
"میں نہیں سمجھا!"
"پہلے انہیں کھول دو میرے بازوؤں سے تب بتاؤں"۔
"یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ یہ لو کھول دیئے اب بتاؤ!"
"تم نے کہا تھا، یہ چھینٹے دار پر متقصدی ہیں، ہواؤں کے خلاف ان میں شدت بھی ہے اور یہ لوٹتے بھی نہیں۔ یاد ہے نا!"
"یاد ہے، یاد ہے یہی کہا تھا میں نے"
"سب ڈھکوسلا۔ وہم۔ گمان۔ دکھاوا اور صرف دکھاوا ایک طرح کی اپنے تئیں ایک نمائش سمجھ لو!"
"اوہ"
"ہاں میں سچ کہہ رہا ہوں۔ دیکھو ذرا غور سے دیکھو ان پروں کو۔ ہر رنگ دوسرے سے بیزار لگے گا۔ یہ صرف ایک گٹھاؤ کی صورت میں جمے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ۔ ورنہ بال نہ بال الگ اور قطعی الگ ہے۔
"اوہ۔! واقعی۔؟
"میں نے ابتدائی اڑان ہی میں یہ بات محسوس کر لی تھی۔ ہر رنگ ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی فکر میں محو ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ انکی ابتدائی پرواز بقول تمہارے نتائج دار ہوتی ہے"۔
"اور ۔۔۔ سر پھری ہواؤں کے خلاف شدت؟"
"ایک انجانے خوف اور خود تسلط کردہ خوف کے سبب ہے"۔
"گہری بات، میری سمجھ میں نہیں آئی ۔۔۔!"
"میں نے محسوس کیا ہے جیسے یہ پر ماضی میں کہیں دور، بہت دور کسی سمجھ میں نہ آنیوالی مشکل سے دوچار رہے ہوں ۔۔۔ یا ۔۔۔ پرواز کے کسی مشکل ترین مرحلے پر ان کی نادان پھڑپھڑاہٹ نے انہیں کسی غیر مرئی قوت سے ڈرایا ہو۔ اسی لئے ان کے رگ و پے میں بہت گہرائی تک خوف اتر چکا ہے"۔
"میں اب بھی نہیں سمجھا۔!"
"یوں سمجھو دوست! یہ پر خود کسی نہ کسی سے ڈرے سہمے ہوئے ہیں"۔
"لیکن کس سے؟ ۔۔۔ اور کیوں؟"
"ہو سکتا ہے اسی سے جسکی تلاش ہی ان کا مقصد ہے، منزل ہے، نروان، نجات، ۔۔۔"
"لیکن تم کسی غیر مرئی قوت کا ذکر کر رہے تھے۔؟"
"سمجھ میں نہ آنے والی ہر قوت غیر مرئی قوت کہلا سکتی ہے"۔
"تم بہت پرانی بات سنا رہے ہو، آج کے دور میں پردے اٹھتے جا رہے ہیں"۔
"یہی کہنا چاہتے ہو نا! کہ خوف دور ہوتا جا رہا ہے"۔
"یہی سمجھ لو!"
"لیکن! ان پروں کے ساتھ ایسا ابھی تک نہ ہو سکا۔ اپنے ہم رنگوں پر، ندیدہ، نہ پرکھا خوف مسلط کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہتے"۔
"عجیب باتیں بتا رہے ہو تم دوست!"
"اور سنو گے؟"
"بتاؤ۔ بتاؤ۔ واقعی میری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے"۔
"ان میں جتنے بھی رنگ ہیں سب کے راستے ایک دوسرے سے مختلف ہیں"۔
"لیکن منزل تو ایک ہی ہے نا؟"
"ہو سکتا ہے، منزل ایک ہی ہو مگر وہ ۔۔۔ ابھی تک اوہام سے باہر نہیں ہے۔ اور دوسری بات، جب ایک ہی قافلے والے الگ الگ راستوں پر چلنا چاہیں گے تو کون منزل پہ پہنچے گا۔ اکا دکا راہرو منزل تک سلامت پہنچ بھی گئے تو قافلے کی ضرورت ہی کیا رہ جاتی ہے ۔۔۔؟"
"کہتے جاؤ۔ میں سن رہا ہوں"۔
"یہ رنگ برنگے پر اسی صورت میں اپنی خود شناس منزل پر پہنچ سکتے ہیں جب انہیں ایک دوسرے سے بالکل الگ کر دیا جائے۔ یا انہیں کسی ایک ہی رنگ میں رنگا جائے"۔
"یہ کیونکر ممکن ہے"۔
"اگر نہیں، تو سمجھ انکی کوئی منزل نہیں۔ ان میں کسی قسم کی شدت نہیں۔ انکا کوئی مقصد نہیں۔ سب کچھ بکواس" اور ۔۔۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ انہیں باندھ کر اڑنے والا ازل سے پرواز کرنے کے باوجود منزل کی تلاش میں ناکام ہے۔ اسکی اڑان سوائے تکان کے کچھ نہیں۔ اور بقول تمہارے آجکل تو بالکل سویا پڑا ہے"۔
"میں تو تمام پروں میں انہیں ہی اچھا سمجھ بیٹھا تھا خیر اب کیا ارادہ ہے تمہیں اب کچھ اور دکھانا فضول ہی ہوگا، ہلکے اور آمیزش والے دو غلے پر میں خود تمہیں دینا نہیں چاہتا سنہرے، روپہلے، چمکدار سب ایک سے ہیں۔ آجا کے یہ چھینٹے دار رہ گئے تھے سو وہ بھی ۔۔۔۔۔
"چھوڑو ۔۔۔ اب تو تاسف بھی بے کار ہے لیکن میں ۔۔۔ میں کیا کرونگا اب، کیا پرواز نہیں کر سکوں گا؟"
"کیوں نہ تم ۔۔۔"
"بے جھجک کہو ۔۔۔ رکو مت۔ کہو کیا کہتے ہو اب"
"کیوں نہ تم انہیں میں سے کچھ کو تراش خراش کر اپنے لئے مناسب پر ترتیب دے لو"
"لیکن اس طرح تو بہت سے ضائع ہو جائیں گے اور وقت بھی بہت لگے گا۔ اب میں مزید وقت گنوانا نہیں چاہتا۔ پھر ان پروں کے مالک اگر ۔۔۔"
"وہ سب میں دیکھ لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ سب کو اچھی طرح دیکھ لو اور پھر خوبیاں خوبیاں ایک طرف جوڑ کر تم بہت کچھ کر سکتے ہو۔ یعنی اپنے لئے مناسب اور معقول پروں کی تخلیق ۔۔۔ چلو میں بھی ہاتھ بٹاتا ہوں"
"اچھا چلو ایسا ہی کرتے ہیں ۔۔۔ ارے ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ۔۔۔ وہ ایسے متعلق تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں؟ ہکن سے متعلق؟ ۔ وہ۔ وہ سرخ، گہرے سرخ"

یہ وقت بتائے گا شعلہ ہوں کہ شبنم آنسو ہوں ابھی وقت کی پلکوں پہ رکا ہوں (حنیف ساقی)

"ہاں۔ہاں۔وہی"
"میں نے سوچا۔تم بے داغ بدن رکھنے والے، اس رنگ کو پسند کروں نہ کروں!"
"تم کیا جانتے ہو ان کے بارے میں؟"
"جاننا کیا؟ ساری دنیا دہشت زدہ ہے اس رنگ سے، ساری خوفناک چیزوں کا تصور ابھرتا ہے انہیں دیکھ کر! جیسے۔آگ۔خون۔۔۔۔"
"لیکن اِس رنگ سے خوفزدہ رہنے والے یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ اس میں گہرائی ہے۔گیرائی ہے"
"ہوگی، میں اپنی نہیں دنیا کی بات کہہ رہا تھا"
"اور میں! تمہارے اپنے تجربات سننا چاہتا ہوں"
"بنا آزمائے کچھ کہنا مشکل ہے میرے لئے"
"چلو! تو انہیں بھی آزمائے ڈالتے ہیں"
"اور۔اگر خوامخواہ کی تھکن ہاتھ آئے تو مجھے نہ کہنا۔"
"نہیں کہونگا۔چلو نکالو۔وہ سرخ گہرے لال پر۔سفید اور بے داغ بازوؤں پہ اب یہی سہی"

— x — x — x — x — x —

"آہا۔لوٹ آئے نا؟ میں نہ کہتا تھا خوامخواہ کی تھکن ہاتھ لگے گی"
"یہ کیوں نہیں دیکھتے کہ میرے چہرے پہ تھکن نہیں تمانیت ہے، پرواز کا اعتماد ہے اور میں تین دنوں بعد لوٹا ہوں"
"تین دنوں بعد ہی سہی! مگر زمین تو دیکھی تم نے۔یہ سرخ پر بھی تو بے کار ہوئے"
"نہیں! یہ بالکل بے کار نہیں، اس بار میں صرف تمہارے لئے اترا ہوں"
"میرے لئے۔۔؟"
"ہاں، اور یہی کہنے کے لئے کہ فضول، تمام پروں کے ڈھیر لئے بیٹھے وقت گنوا رہے ہو تم"
"یعنی کیا مطلب ہے تمہارا؟"
"آگ لگا دو اس ڈھیر میں، یہ سب کے سب ناکارہ ہیں! پرواز کے نام پہ دھبہ، بال و پر کے نام پہ کلنک"
"دھبہ؟ کلنک؟۔آگ لگا دوں ان سب میں۔میں کچھ سمجھا نہیں دوست!"
"تمہیں سمجھانے کے لئے ہی اس مرتبہ زمین دیکھی ہے میں نے ورنہ اب تک میرا وجود نظروں کے لئے نقطہ ہو گیا ہوتا"
"ارے تو سمجھاؤ نا"
"سمجھا تو رہا ہوں کہ سرخ پروں کے سوا سب میں آگ لگا دو۔سب کچھ ضائع کر دو"
"پھر وہی بات! لیکن کیوں؟ سرخ پروں کے علاوہ اگر سب بے کار ہیں تو تمہاری نظر میں، دوسرے تو اسی سرخیت سے بے زار ہیں"
"یہ انکی غلط فہمی ہے یا غلط پروپیگنڈا!"
"لیکن خوامخواہ کیوں ہونے لگا پروپیگنڈا؟ اسکے ساتھ اپنے اپنے تجربات بھی ہونگے"
"تجربہ صرف نظروں کے لمس سے حاصل نہیں ہوتا، صرف سماعت کی عرق ریزی تجربہ نہیں کہلاتی۔برتنا بھی کوئی چیز ہوتی ہے"
"میں نہیں مانتا، کچھ باتوں کے لئے سماعت پر اعتبار کرنا ہی عقلمندی ہے۔ہر شئے کے لئے برتنا پرکھنا نادانی کے سوا کچھ بھی نہیں"
"تم صرف لفظیات سے کام لے رہے ہو دوست!"
"اور تم؟"
"میری باتوں میں چھان پھٹک ہے"
"کس اعتماد سے کہہ رہے ہو تم؟"
"ہاں مکمل آگہی، چھان پھٹک کے بنا ممکن نہیں اور آگہی ہی اعتماد بھی دلاتی ہے۔مجھے خوشی ہے کہ مجھ میں اعتماد عود آیا ہے ورنہ میں تو مایوس ہو چلا تھا"
"چلو مان لیا، تمہیں یہ سرخ پر ہر طرح مناسب لگے مگر دوسروں کو فنا کر دینے والی بات حلق سے نہیں اترتی"
"یہ مشورہ دے کر میں نے دور اندیشی سے کام لیا ہے دوست! اگلے چند موسموں میں تم سب کچھ سمجھ جاؤگے اور وہی کروگے جو میں اب کہہ رہا ہوں"
"تب کا تب دیکھا جائے گا"
"میں کہتا ہوں۔جو تم کل کروگے وہ آج ہی کیوں نہیں کر ڈالتے؟"
"تمہارا مطلب یہ ہے کہ آئندہ چند موسموں میں سرخ پروں کے علاوہ سارے کے سارے ناکارہ گردانے جائینگے"
"ہاں میں یہی سمجھانا چاہتا ہوں"
"ایسی کیا خوبی ہے انمیں؟"
"ان پروں کی خوبیاں، انہیں بازوؤں پہ سنبھالنے کے بعد ہی معلوم ہوتی ہیں۔ان کے کامل ہونے کا ثبوت دوران پرواز ہی مل سکتا ہے"
"لیکن! جو انہیں باندھنا ہی نہ چاہیں۔۔۔وہ؟"
"وہ۔۔۔۔!۔انسے متعلق پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کے مریض ہی رہیں گے"
"لیکن اس رنگ کی دہشت ہی لوگوں کو ان کے قریب نہیں آنے دیتی"
"میں کہہ چکا ہوں دوست! سب کچھ جان بوجھ کر اڑائی ہوئی باتوں کا اعادہ کر رہے ہو تم"
"کن کی اڑائی ہوئی باتیں؟"
"انہیں کی، جو یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ اس رنگ والوں کی صحیح نشست کے بعد ہی وہ اپنی ازل سے چلی آرہی اجارہ داری کھو بیٹھیں گے"
"اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ اس رنگ کی اصلیت کو چھپایا جا چکا ہے!"
"اچھی طرح، اس میں کوئی شک نہیں"
"تو۔۔۔تو۔۔۔ہر موسم میں یہ سنہری، چمکدار، نیلی، پیلی، رنگ برنگی پروازیں، یہ خرابی ہوا کا واویلا۔؟"
"سب کے سب خود ساختہ وسوسے، یا جانی بوجھی سازشیں!"
"تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے دوسرے رنگوں کے مالک اڑنا ہی نہیں چاہتے۔صحیح معنوں میں پرواز کے مزے لینا ہی نہیں جانتے؟"
"اڑنا ضرور چاہتے ہیں، پرواز کے مزے لوٹنا بھی جانتے ہیں، مگر ان کا بھرم تو صرف سطحی پروازوں میں ہے۔اور سب کی سطحیں مختلف مگر محدود و فراز رکھتی ہیں ان کے دم خم بے حصار نہیں، دائرہ بند ہیں سب کے سب!"
"تو کیا تم حصار توڑ چکے ہو؟"
"ہاں انہیں گہرے سرخ پروں سے میں وہاں تک ہو آیا ہوں جہاں تک میرے اپنے پر بھی مجھے نہ لے جا سکے تھے۔اور اب میں اسقدر اوپر جاؤں اتنا اٹھوں گا کہ اپنے مقصد کو چھو سکوں"
"تو کیا تمہیں اپنی پرواز کا مقصد یاد آگیا۔؟"
"ہاں میری اڑان کا مقصد ہی اٹھنا اور اوپر ہی اوپر اٹھتے رہنا ہے"
"لیکن کہاں تک؟"
"اس مقام تک جہاں۔۔۔آدمی، انسان ہو جاتا ہے"
"دوسرے بھی یہی کہتے ہیں"
"کہنے اور اڑنے میں فرق ہوتا ہے۔کہنے والوں کو لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے اور اڑنے والے صحیح پروں کے حاجت مند میں خوش ہوں کہ مجھے صحیح پر مل چکے ہیں"۔

(باقی صفحہ ۱۲۰)

"لوبان"

شمیم صادقہ
شعبۂ اردو
گورنمنٹ ویمنس کالج
مریم منزل ـ گردنی باغ
پٹنہ ـ ۸۰۰۰۰۲

صبح سے ہی لائن گڑبڑ تھی۔ مجھے ایک ضروری فون کرنا تھا۔ روما کو ـــ مگر جب بھی ڈائل کرتا۔ لائن انگیج ملتی ـ پتہ نہیں کیوں؟ ـــ کئی کوشش کے بعد گیارہ بجے کے قریب جوابی رنگ سنائی دینے لگی تو میں نے فون اٹھایا ـ

"للی ـــ ہلو للی ـــ آج کہاں ملوگی؟ ـــ ہنس پارک نہیں ـ یہ پارک اور رستورنٹ میں ملتے ملتے تھک گیا ہوں ـ آج وہاں نہیں۔ کچھ نیونیس تو ہونا ہی چاہیے ایسا کرو میرے لاج میں آجاؤ ـ سالے لڑکے پکنک پہ گئے ہیں ـ شام کو واپس آئینگے ـ تم آجاؤ ـ آج ہم دن بھر ساتھ رہینگے ـ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ـ آئی لو یو للی"۔

"تم آج دفتر سے جلدی تو نہیں آرہے ہو؟"

"شاید نہیں ـــ کیوں؟ ـــ

"کیونکہ مجھے ودیا کے ساتھ اسکی بہن کے بچے کے رینہ پراشن میں جانا ہے ـ تمہارا آرڈر فرج میں رکھ جاؤنگی اگر جلدی.....

"نہیں آج کلب میں ایک پارٹی ہے ـ میں تمہیں کہنے ہی والا تھا کہ آج .....

"میں تمہاری پارٹی کو خوب جانتی ہوں ـ وہاں وہ چڑیل سجاتا ہوگی اور .....

"اور مجھے بھی تمہارے انیہ پراشن کا پتہ ہے ـ انیل سے ملنے کے لئے ہر بار نئے بہانے .....

"نہیں سیما آج نہیں مل سکونگا ـ"

"کیا مجھ سے دل بھر گیا ہے ـ یوں بھی میری سہیلیاں نے اکثر تمہیں رتنا کے ساتھ دیکھا ہے"۔

"ممی ونٹ بی ستی ـ وہ میری چھوٹی بہن کی دوست ہے"۔

"رئیلی یو آر ہیلڈ بیک! ـــ"

"پلیز! ـــ آپ لوگ ـ آپ سب! فون رکھ دیجئے مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے"، شاید میں یہی کہنے والا تھا ـ مجھے یہی کہنا بھی چاہئے ـ مگر فون میں نے خود رکھ دیا ـ اور روما کو کچھ کہنے کا حوصلہ ایسے پاش پاش ہو گیا جیسے کچے شیشے کا گلدستہ کچے فرش پہ آن گرا ہو ـــ میں بہت دیر تک خالی الذہن سا سوچتا رہا ـــ

اور پھر آہستہ سے ڈرائنگ روم سے چل کر بیڈ روم میں آگیا ـ پھر برآمدے میں ـــ مجھے کچھ کرنا تھا شاید بہت کچھ ـ آج میں نے دفتر سے چھٹی لے رکھی تھی۔ ویسے بھی میں ایک آفیسر تھا ـ اس لئے میری حاضری اور غیر حاضری میں سمتوں کا بعد نہ تھا ـ مگر آج میرا روما کو فون کرنا بہت ضروری تھا ـ میں یہ ضروری بات اس کے یہاں جاکر بھی کہہ سکتا تھا ـ مگر جو لوگ فون کے عادی ہوتے ہیں انہیں پتہ ہے کہ بعض باتیں، صرف اور صرف فون سے کی جاسکتی ہیں ـ وہ بڑی جذباتی، بڑی ہی ـــ آئیڈیلسٹک اور امیجینیٹو لڑکی تھی ـ اس کے ساتھ ہمیشہ روشنی کا ہالہ سا، ایک اذرشیہ گھیرا رہا کرتا تھا ـ اسکی باتوں میں اتنی سچائی اور ایسی معصومیت ہوتی کہ جب، جتنی دیر، وہ میرے ساتھ، میرے پاس ہوتی، میں خود کو اردگرد کے بلند حصاروں کی مضبوط دیواروں سے آزاد، نیلگوں فضاؤں میں پرواز کرتا ہوا ایک خوش رنگ پرندہ محسوس کرتا ـ اور جب وہ آنے والی زندگی کی باتیں کرتی تو ایک ایک پل ایسے جی اٹھتا جیسے مستقبل کے اندھیروں میں ڈوبے ہوئے روز و شب آنچل میں چھپائے ہوئے جگنوؤں کی طرح جگمگا اٹھے ہوں ـ اسکے لئے ایک ذمہ دار، مصروف ترین اور حقیقت پسند انسان ہونے کے باوجود، جب بھی حقیقتوں کے شعلے مجھے جھلسانے لگتے، میرا جی بے اختیار روما سے باتیں کرنے کو تڑپ اٹھتا ـ اسکے تخیل کا گلزار واقعی ایسا ہی تھا! ـــ جیسے تپتے صحرا میں کسی نے ٹھنڈے پانی کی صراحی رکھ دی ہو ـ اور آج کا دن بھی کتنا عجیب و غریب تھا ـ "اُفوہ! ـــ روما ـــ یہ فون ٹھیک کیوں نہیں ہوتا!" ـ میرے اندر عجیب سی بے کلی تھی ـ جیسے اس سے باتیں کئے بغیر میں کچھ نہیں کرسکتا ـ جیسے ایک آہنی خیال نے میرے ذہن پہ مسمریزم کر دیا ہو ـ میں نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد ریسیور اٹھایا ـ

"سر! ـ میں ہوں جیون ورما! ـــ سر بنگلے پر آپ کا آرڈرلی کہہ دیتا ہے، صاحب آرام کر رہے ہیں ـ سر میں مزید پانچ ہزار کے نذرانے کا بندوبست کرونگا ـ مگر مجھے لیو ویکنسی کے بعد ٹرمینیٹ ہونے سے بچا لیجئے ـ آپ نے کہا تھا، آپ مجھے ایڈجسٹ کر دینگے ـ رتن بابو کی چھٹی ختم ہونے کو ہے ـــ دیا کیجئے سر ـ جو حکم کیجئے گا، حاضر کرونگا"۔

"میرے بیٹے کی کاپی تم نے دیکھی؟ ـــ بھئی فرسٹ کلاس تو تم دوگے ہی ـ مگر نمبر اتنا بڑھا دو کہ دو ایک پیپر کے نمبر کو کوَر کرلے ـــ اور وہ ٹاپ آجائے ـــ یاں ٹاپ سیکریٹ ہی رہیگا ـــ بھئی اگر وہ فرسٹ کلاس کے لائق ہوتا ہے تو نہیں کیوں؟"

"بیٹے دیپو ـــ آج اسکول سے آکر ممّی کے یہاں چلے جانا ـ وہیں کھانا کھا کر کھیلنا ـ میں ساڑھے تین بجے آؤنگی ـ شنو کی ممّی کے ساتھ نون شو کا پروگرام بن گیا ہے ـ مگر خبردار پاپا کو نہ بتانا"۔

جھنجھلا کر میرا جی چاہا، ریسیور دیوار پہ دے مارو ں

مگر ایسا آج پہلی بار نہیں ہوا تھا ۔ اکثر لائن ایسے ہی پھنس جاتی اور گھنٹوں پھنسی رہتی ۔ پتہ نہیں لوگ ٹاپ سیکریٹ باتیں اتنے اطمینان سے فون پہ کیسے کر لیتے ہیں ۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ آپریٹر کے علاوہ بھی کوئی اور راکوئی انجانا فرد بھی بڑی آسانی سے انکا راز دار بن جاتا ہے ۔ شاید اس لئے کہ اب ویلیو زکی اہمیت نہیں رہ گئی پرسنل اور امپرسنل محض ڈکشنری کی زینت ہیں ۔

پھر دفتر کا پیون کچھ ضروری فائلیں لے کر آ گیا ۔ میں کچھ دیر تک انہیں پڑھتا اور رکھے ہوئے مہر کے نیچے دستخط کرتا رہا ۔ واقعی ایک آفیسر کو دن بھر اتنی بار اپنا نام لکھنا پڑتا ہے کہ اگر اتنی مرتبہ وہ خدا کا نام لکھے تو کچھ ہونے پہ یقین نہ سہی ، سکونِ قلب تو حاصل ہو ہی جائے گا ۔۔۔ مگر یہ بھی میرے لئے صرف خیال محض تھا ۔ بلکہ اگر میں سچائی کے ساتھ اعتراف کروں تو کہہ سکتا ہوں ، ایسی باتیں میرے ذہن میں ہمیشہ ہی اوما کے تصور کے تحت کلبلایا کرتی تھیں ۔ جیسے بے حد فاسٹ اور حال کا آدمی ہونے کے باوجود میرے اندر کا ماضی کہیں موجود تھا ۔۔۔ میں نے اوما کے نمبر ڈائل کئے ۔

" دوست ۔۔۔ چھ سو روپئے کا انتظام کر دو ۔ بیوی کی حالت اچانک بگڑ گئی ہے ۔ تم تو جانتے ہو اسے ٹیومر ہے ۔ اگلے مہینے پی ۔ ایف سے نکال کر سارے قرض چکا دوں گا ۔ نہیں ایسا مت کہو ۔ بچا سے کیا ہوگا ؟ ۔۔۔ ہاں ؛ خیر یہی سہی ، پہ ملتے ہی تم یہ روپے لے لینا ۔ میں بنیا ، دھوبی ۔ اخبار اور دودھ والے کو ایڈوانس نکلنے تک کی مہلت کے لئے کہوں گا ۔ تم میری بیوی کی زندگی مجھے دے دو ۔۔۔ تم بھگوان نہ سہی ، پیسہ تو ہے ۔ "

" منیجر صاحب ۔۔۔ میرے بچے نے اسٹینڈرڈ ٹون کے لئے ٹسٹ دیا ہے ۔۔۔ آپ ذرا خیال رکھئے گا ۔ پہلے کیا کہتا اسے نہیں بھئی ، دو ہفتے آپ کے یہاں لاکر کیا تیاری کرواتا ۔ وہ آل ریڈی اسٹینڈرڈ ٹو میں پڑھتا ہے ۔ اینڈ ہی از اے بریلینٹ اسٹوڈنٹ آف دَکلاس ۔ ٹیوشن کی ضرورت ہوتی تو لاتا ۔۔۔ اوہ آپ دو سو روپئے لیتے ہیں ۔۔۔ خیر وہ میں آپ کو مٹھائی کھانے کے لئے دے دونگا کیا ، نام اور رول نمبر ؟ ۔۔۔ لکھئے نوٹ کر لیجئے ۔۔۔

" ڈاکٹر صاحب ، آپریشن کی ساری تیاری ہو چکی ہے ۔ انیستھیسیا بھی دیا جا چکا ہے شاید آپ بھول گئے کہ آج آپ کا او ٹی ہے ۔ پیشنٹ از ویری سیریس ڈاکٹر ۔ ابھی آپ کو کلینک میں دو آپریشن کرنے ہیں ؟ ۔۔۔ کیا ؟ ہم لوگ شروع کر دیں ۔ آپ اسٹیچنگ تک پہنچ جائیں گے ۔ مگر سر ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا ۔ پیشنٹ منسٹر کا آدمی ہے ۔۔۔ ۔ پہلے کہتا ، مگر کب ؟ ۔۔۔ کیا ؟ ۔ انہ منسٹس کی اب اسٹرلائزیشن چیک کر دی ۔۔۔ یو آر جسٹ کمنگ ہنگ گاڈ "

" یار مدن ۔۔۔ تمہارے لڑکے نے اپلائی کیا یا نہیں ۔ ریسرچ آفیسر والے پوسٹ کے لئے ۔۔۔ انٹرویو بورڈ میں سارے میرے اپنے آدمی ہیں ۔۔۔ اسے بھئی نہیں کیا ہے تو بیک ڈیٹ سے کروا دو ۔۔۔ کیا ؟ وہ سمپل بی ۔ اے ہے ۔ ارے بھئی میں پتہ بتا رہا ہوں ، نوٹ کرو اور اس پتہ پر سو روپے لے کر جاؤ ۔۔۔ جب کی ، جس نام کی ڈگری یا سرٹیفکٹ جو چاہے وہ بنا کر دے گا بس یہ نوکری تمہارے بیٹے کے لئے ریزرو سمجھو "۔

اور آخری بار میں نے آہستہ سے ریسیور رکھ دیا ۔ یہ کہے بغیر کہ ۔

" پلیز فون رکھ دیجئے ۔ مجھے ایک ضروری بات کرنی ہے "

میں خالی الذہن سا ، وہیں چپ چاپ بیٹھا رہا ۔ جیسے میری ساری طاقت ۔ میری اسمارٹنس آہستہ آہستہ مفلوج ہوتی جا رہی ہو ۔۔۔ فون کی گھنٹی ٹرن ٹرن کر رہی تھی ۔ مگر میرے ہاتھ فون کی طرف نہیں بڑھ رہے تھے کیونکہ میں جانتا تھا ، اس وقت مجھے اُما ہی فون کر سکتی ہے ۔ حالانکہ میں خود اسے فون کرنے کے لئے بے چین تھا ۔ صبح سے ہی کوشش کر رہا تھا ۔۔۔ مگر اُن دکھی سچائیوں کی آنی نے میرے جھوٹ کو تار تار کر ڈالا تھا ۔ اور میرے اندر اسے یہ کہنے کی ہمت نہ کی تھی کہ " بابا کسی طرح راضی نہیں ہوئے ۔ انہوں نے اپنے کلیگ کی بھانجی سے میری بات طے کر دی ہے "۔

میں نے آہستہ سے ریسیور اٹھا لیا !!! •

بقیہ : ۔ ۔ ۔ ۔

لا یعنی ۔۔۔۔۔

" تو تم اور اڑو گے ؟ "

" ہاں ۔ اڑوں گا خوب اڑوں گا ، مجھے جو کہنا تھا میں کہہ چکا اچھا ! خدا حافظ ۔۔۔۔ "

اور اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے اڑان بھری ، سرخ اڑان ، آگ اور خون کی رنگت والی اڑان ، گہرائی اور گیرائی دیکھنے والی اڑان ، اپنے تئیں آخری اڑان ۔۔۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے خلاؤں میں تحلیل ہوتا چلا گیا ۔

وہ سوچ رہا تھا اس نے اچھا ہی کیا ، پروں کے امین ، اپنے دوست کو ایک نیک اور سچا مشورہ دے آیا ۔۔۔۔ ۔ اوہ لیکن یہ کیا ؟ ۔۔۔ یہ لڑکھڑاہٹ کیسی ؟ صحیح پرواز میں مگن ان پروں کو اچانک یہ کیا ہو گیا ؟ یہ سلگتے اور جلنے کی بو کیسی ؟ اور اس نے دیکھا ، اسکے سرخ پر دھڑا دھڑ جل رہے ہیں اور وہ خود ایک دہکتے ہوئے گولے میں تبدیل ہوتا جا رہا ہے ۔

۔۔۔۔ نیچے ۔۔۔ بہت نیچے زمین سے بھی دھواں سا اٹھ رہا تھا ، شاید پروں کا امین ، اس کا دوست ، اسی کے مشورہ پر سرخ پروں کے علاوہ تمام پروں کے ڈھیر میں آگ لگا چکا تھا !!! ۔۔۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس ! نزاکتِ آواز دیکھنا (مومنؔ)

افسانہ:-

”شریانوں میں دوڑتا لہو“

علی امام نقوی

۸۳-جولی میسکو چیمبرز

II نریمان پوائنٹ ممبئی ۴۰۰۰۲۱

طبیعت نڈھال ہے، جوڑجوڑ دکھ رہا ہے، جی چاہتا ہے اٹھوں، اٹھ کر باتھ روم میں گھس جاؤں گیزر آن کر کے گرم پانی کے ٹب میں پڑا رہوں، پھر وہ سوٹ پہنوں جو میرے برتھ ڈے پر ملڈریڈ نے گفٹ کیا تھا۔ لیکن .... اٹھنے نہانے اور سوٹ پہننے میں جوڑوں کی تکلیف بڑھ نہ جائیگی، پھر کیا کیا جائے ـــ؟ چپ چاپ بستر پہ پڑا رہوں، آنکھیں بند کئے۔

———— ٥ ————

”ہم سب کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں ـــ لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ ہماری معیشت کا ڈھانچہ دن بدن کمزور کیوں ہوتا جا رہا ہے؟

”سر ...... ماہرین بھی ..... اسی فکر میں مبتلا ہیں“

”لیکن وہ اپنے مقصد میں کب کامیاب ہوں گے؟“

چیف آفیسر کا سوال میٹنگ میں موجود لوگوں کے ہونٹوں پر تالا ڈال دیتا ہے ـ سب نظریں جھکائے، ٹیبل پر پھیلے فائلوں کو دیکھنے لگتے ہیں۔

”پی، ایم، مجھ سے جواب طلب کرتے ہیں ...... اور میں آپ سے پوچھتا ہوں ...... ہم ہر سوال نوٹ چھاپ کر اس ڈھانچے کو کب تک مضبوط کریں گے۔“

”اسے ہم مضبوط بھی نہیں کہہ سکتے۔“

”ظاہر ہے۔ اس طرح تو ہم اپنی اکنومی کو اور بھی کمزور کر دینگے۔“

”ماہرین دوچار روز ہی میں اپنی رپورٹ آپ کی سیوا میں پیش کرینگے۔“

”ٹھیک ہے لیکن ..... لیکن مجھے صحیح رپورٹ چاہیئے۔“

”صاحب“

”صاحب“

”ہنھوں“

”آفس سے ..... منیجر صاحب کا فون ہے۔“

”کہدو صاحب سو رہے ہیں۔“

”جی ..... اچھا۔“

وہی ایکسپورٹ، امپورٹ، یہ آرڈر پورا کرنا ہے، یہ ریجکٹ ہو گیا۔ آپ بتائیے کیا کیا جائے ـ؟ یہ منیجر ہے یا بھڑ بھونجا۔ کم بخت ذرا ذرا سا کام پوچھ کر کیا کرتا ہے ـــ لکیر کا فقیر ...... بیڈ ٹی کاؤنٹر سے سگریٹ اٹھانی چاہیئے، ایک سگریٹ پینے کے بعد شاید کچھ ریلیکس ...... لیکن ..... لیکن ہاتھ کون بڑھائے اس میں سے سگریٹ نکالے، پھر لائٹر جلایا جائے، نہیں، نہیں ..... بس یوں ہی ٹھیک ہے ارے .... ارے ـ یہ ..... یہ سینے میں جلن کیسی ـــ؟ اف .... اف

”ما ...... ر ...... یا“

”.............“

”او .... ماریا“

”یس ...... یس سر“

”ذرا .... ڈاکٹر ڈمری ..... کو فون لگاؤ ..... اس سے بولو ..... کم سون“۔

———— • ————

”تو آپ سب آچکے“

”یس سر“

”یہ اخبارات دیکھو، ٹائمز، ایکسپریس، فری پریس، اسٹیٹسمین، اکنومک ٹائمز، سب ایک ہی سوال پوچھ رہے ہیں! ..... آپ سب بتائیں میں کس کس کو کیا کیا بتاؤں؟ اور کیسے بتاؤں کہ حکومت نوٹ کیوں چھاپ رہی ہے۔ سب کا کہنا ہے کہ اس طرح نوٹ چھاپ کر ہم ملک میں غریبی کی جڑیں گہری اور مضبوط کر رہے ہیں۔

”سر ..... رپورٹ۔“

”آپ کی رپورٹ ان کی زبانیں بند کر سکتی ہیں۔“

”لیکن اس میں حکومت کا قصور کیا ہے؟“

”ہماری کوئی خطا نہیں۔“

”میرے خیال سے بس اتنی کہ ..... ہم نے تھوڑی سی لاپرواہی برتی ہے! ـــ اور اس سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا ہے۔“

”یہی آپکی رپورٹ ہے۔“

”تقریباً“

———— ٥ ————

”اوہ ...... مائی گاڈ۔“

”واٹ ہیپن“ “WHAT HAPPENED

”یور بلڈ سرکیولیشن سسٹم از ناٹ فنکشنگ“

“YOUR BLOOD CIRCULATION SYSTEM IS NOT FUNCTIONING”

”پھر ـــ؟“

”طبیعت گری گری رہتی ہے ـ؟

”ہوں“

”بھوک لگتی ہے پر کھانے کو جی نہیں چاہتا؟

”ٹھیک“

”جوڑ جوڑ دکھتا ہوگا؟“

”بالکل“

”ہلکی ہلکی گھبراہٹ بھی .....

”ہاں ڈاکٹر ہاں“

———— • ————

”اسمگلنگ بہت بڑھ گئی ہے“

”وہی تو ہمیں بے حال کئے ہیں۔“

پینگ ہے کھیلنے کی لذت سے بے خبر آسنے دیانہ دل پہ یہ الزام لٹ گئے (بشر نواز)۔

" ادھر ذخیرہ اندوزوں نے تباہی مچا رکھی ہے "
" لوگوں کے پاس دو نمبر کا پیسہ بہت ہو گیا ہے "
" ہمارا انکم ٹیکس ڈپارٹمنٹ کیا کر رہا ہے ؟ "

" .... "

" پولیس کیا کر رہی ہے ؟ "

" .... "

" و جلینس والے کیا کر رہے ہیں "

" .... "

" تم لوگوں نے چپ کیوں سادھ لی ؟ جواب دو ! "

— ٥ —

" میں نے کہا نا ..... بلڈ سسٹم میں خرابی واقع ہو گئی ہے "
" لیکن یہ کیسے ہوا ؟ "
" خون گردش کرتے کرتے کہیں جانے رکنے لگتا ہے ! "
" یعنی میرا دل ...... "
" نہیں دل برابر کام کر رہا ہے لیکن شریانوں میں لہو دوڑنے کا جو سسٹم ہے اس میں گڑبڑ ہو گئی ہے "
" پھر کیا ہوگا ؟ "
" گھبرانے کی بات نہیں ہے ، میں دوائیں لکھتا ہوں تمہیں کچھ پابندی سے رہنا ہوگا ۔ پرہیز بہت ضروری ہے ..... اگر تم نے پابندی کی ، پرہیز کیا ..... تو بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے "
ٹیب لیٹس ، کیپسول ، انجکشن ، چھیکی ، کڑوی گولیاں یہ کھاؤ ، وہ نہ کھاؤ ، کم کھاؤ ۔
زیادہ محنت نہ کرو ، دماغ پر بوجھ نہ ڈالو ، سوچنا چھوڑ دو ، لیکن سوچنا کیسے چھوڑ دوں !
میرا بزنس ، یار دوست میری محبوبہ ملاڈ زیڈ ڈی میلو ..ان کیا چیز ہے ۔ میری جان ۔ جان ہے تو جہان ہے ۔ ڈاکٹر نے انجکشن کی سرنج میں شورہ گھولا اور سوئی کو پیپے کو .. میں اتارتے ہوئے بولا
" بس کچھ دن کی بات ہے "

— ٥ —

" اب کیسی طبیعت ہے ؟ کیا اب بھی طبیعت گری گری رہتی ہے "
" نہیں "
" کھانے کو جی چاہتا ہے ؟ "
" آف کورس "
" بدن دکھتا ہے ؟ گھبراہٹ وغیرہ "
" نہیں بالکل نہیں ! "
" اچھا ..... بریچ کینڈی ہسپتال میں ایک بار پھر اپنا چیک اپ کرا لو ہم دونوں ہی مطمئن ہو جائیں گے ۔

— ٥ —

رپورٹ پڑھنے کے بعد ڈاکٹر ڈمری نے اطمینان کا سانس لیا ، اس نے بیڈ کی کاؤنٹر سے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا ایک سگریٹ ڈاکٹر کو پیش کیا ، الیکٹرونک لائیٹر کا بٹن کھلا شعلے کی زبان لپلپائی ، ڈاکٹر نے پہلا طویل کش کھینچنے کے بعد دھواں چھوڑتے ہوئے کہا ۔
" اب تمہارا بلڈ سسٹم اپنے معمول پر آ گیا ہے "

— ٥ —

" گلی گلی ۔ سمگلنگ کا مال بک رہا ہے "

" .... "

" آخر میں اوپر کیا جواب دوں ! "
" پولیس اپنا فرض پورا کر رہی ہے سر "
" پھر یہ سب کیا ہے ؟ ہماری اکنومی ڈل ہو گئی ..... جانتے ہو کیوں ؟ اس لئے کہ روپے کی رولنگ رک گئی ..... میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ .... "
" ہم سمجھ رہے ہیں سر "

— ٥ —

شام جب رات کی زلفوں میں پناہ لے چکی تو نیند کی دیوی نے اسے لوریاں دیں ، ابھی ابھی ڈاکٹر اپنے بچوں کے ساتھ اوٹی سے لوٹا تھا تین دن کی مسلسل کار ڈرائیونگ نے اسے تھکا دیا تھا اور رات کے آنے سے پہلے ہی نیند کی دیوی نے اسے لوری سنانی شروع کر دی تھی ۔
ٹیلی فون کی گھنٹی کی مسلسل تکرار سے ڈاکٹر ہڑبڑا کر اٹھا ، نائٹ بلب آن کر کے اس نے کریڈل میں سے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا ۔ اور پھر اس کا سر جھک گیا ۔ آنکھوں میں نیند کی جگہ گہری مایوسی اور گہرا دکھ اتر آیا ۔ بے دلی سے اس نے ریسیور کریڈل پر ڈالا ۔
" وہ اب نہیں رہا ..... پرسوں بریچ کینڈی میں داخل ہوا اور آج ...... "
دوسرے دن وہ اپنے آفس میں سر جھکائے بیٹھا تھا اور اس کے مریض کی پوسٹ مارٹم رپورٹ اس کے سامنے پڑی تھی ۔ موت کی وجہ کے کالم میں لکھا تھا
"BLOOD CIRCULATION SYSTEM NOT FUNCTIONING."

— ٥ —

وقت جوں جوں رائیگاں ہوتا گیا
زندگی کے کام یاد آنے لگے (عدم)

افسانہ :۔

اِمتحان

ڈاکٹر آدیسرن ارمان
یو۔ایس۔ہاسپٹل بلاری ۔ مراد آباد

"ابّا جان! آپ اپنے چمن سے کسی کو بھی پھول توڑنے نہیں دیتے مگر ابھی ابھی جو پنڈت جی گئے ہیں ان کو آپ منع کیوں نہیں کرتے جبکہ ہر روز پھول توڑ کر لیجاتے ہیں" ڈاکٹر افتخار حسین کے لڑکے انتظار حسین نے خفیف سے شکایتی لہجے میں اپنے باپ سے کہا ۔

"بیٹے! اس کے کئی وجوہ ہیں ۔ ایک تو یہ کہ یہ ہمارے پڑوسی ہیں ۔ دوسرے یہ صرف پانچ ہی پھول توڑتے ہیں اور تیسرے ان پھولوں کو یہ ایک مقدس کام کے لئے لے جاتے ہیں اور اکثر لوگ ان کو سونگھ کر اور کچل کر پھینک دیتے ہیں"۔

"کون سے مقدس کام میں لاتے ہیں"؟

"مندر میں بھگوان کو چڑھاتے ہیں"۔

"کیا پھولوں کے بغیر بھگوان کی پوجا نہیں ہو سکتی ؟"

"ہو سکتا ہے ان کا ایسا ہی خیال ہو"۔

"جب دنیا میں پھول نہیں تھے تو یہ لوگ کیسے پوجا کرتے تھے"؟

"پھول ہی دنیا میں پہلے پیدا ہوئے ، انسان بعد میں"

"اچھا ابا جان! یہ بتائیے میں نے کہیں پڑھا ہے کہ بھاگیرتھ جی نے پوجا کر کے گنگا جی کو آسمان سے اتارا تھا تو وہ شیو جی کی جٹاؤں میں سما گئی تھیں بعد میں اُن کی بھی پوجا کی گئی تو شیو جی نے جٹائیں نچوڑیں اور گنگا جی بہنے لگیں پھر اسی گنگا جل کو ہندو لوگ شیو تیرس کے دن شیو جی پر کیوں چڑھاتے ہیں جبکہ یہ انھیں کی دین ہے"۔

"تمہاری بات صحیح تو ہے مگر بیٹا ....!" ابھی ڈاکٹر صاحب بات پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ باہر سے آواز آئی "ڈاکٹر صاحب! کیا آج ٹہلنے نہیں چلنا ہے ؟" وہ ان کے بے تکلف دوست تھے قدرت اللہ ۔

"آج بچے کی وجہ سے دیر ہو گئی معاف کیجئے گا" ڈاکٹر صاحب نے کہا ۔ اور چلتے چلتے اپنے بیٹے کی تمام باتیں سنا دیں ۔

"ڈاکٹر صاحب! واقعی کبھی کبھی بچے بھی بڑی بڑی عجیب باتیں کرتے ہیں ۔ کل میرا لڑکا اخبار پڑھتے پڑھتے بولا" ابّو! شہر والے گاؤں والوں کو گنوار کیوں کہتے ہیں ؟"

میں بولا "کیونکہ شہری لوگ اپنے آپ کو دیہاتیوں سے زیادہ مہذب تعلیم یافتہ ہوشیار اور چالاک سمجھتے ہیں"۔ یہ سنتے ہی وہ بے ساختہ بولا "آپ نے آج تک کسی بھی گاؤں میں ہندو مسلم فساد کا کوئی واقعہ اخبار میں پڑھا یا کسی سے سُنا ؟"

"کبھی نہیں بیٹے" میں نے کہا ۔

"کیا کبھی کسی گاؤں میں کرفیو لگتا سُنا ؟"

"بالکل نہیں" میری بات سنتے ہی وہ اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بولا ۔ اس پر بھی یہ شہری لوگ اپنے آپ کو مہذب کہتے ہیں"۔ ڈاکٹر صاحب اپنے لڑکے سے یہ باتیں سُن کر میں تو بالکل خاموش رہ گیا ۔ کوئی جواب نہ بن پڑا مجھ سے"

اس طرح دونوں یار باتیں کرتے ہوئے آر۔ڈی ٹاٹا اسکول جمشید پور کے پاس پہنچ گئے جہاں سے پوسٹ آفس راکھا کوپر کالونی مارکیٹ میں دکان نمبر ایک ٹھاچار قریب ہی تھی جس پر ڈاکٹر صاحب ۔ روز سویرے پان کھا کر ٹہلنے جایا کرتے تھے یہ ان کا روز کا معمول تھا ۔ اس دکان کا مالک پنواڑی شنرنیواس اپنے پانوں کے لئے پورے شہر میں مشہور تھا ۔ دور دور سے پان کے شوقین اس کی دکان پر پان کھانے آیا کرتے تھے اس کی دکان کے سامنے کی نالی ہر وقت پیک تھوکنے والوں کی وجہ سے سرخ رہتی تھی ۔

"ہاں بھئی شنرنیواس" ڈاکٹر صاحب کے اس ادھورے جملے کا پورا مطلب سمجھتے ہوئے شنرنیواس نے عاجزی کے ساتھ کہا "ڈاکٹر صاحب ابھی تیار کرتا ہوں" یہ کہہ کر اس نے جلدی جلدی ہاتھ چلانا شروع کر دیئے ۔

"وشنو ہوٹل کا کیا مطلب ہوتا ہے ڈاکٹر صاحب؟" سامنے ہوٹل پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتے ہوئے قدرت نے پوچھا ۔

"ایسا ہندو ہوٹل جس میں ماس وانس نہیں پکتا ہو"

"مگر میں نے تو دیکھا ہے کہ گوشت خوروں کے لئے یہ دوسرے ہوٹل سے گوشت لا کر سرو کر دیتے ہیں تو کہاں رہا ان کا وشنو پن"!

"یہ دوکانداری کی باتیں ہیں"۔ سامنے آتی ہوئی ایک حسینہ کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے قدرت اللہ کو ہنس کر ٹال دیا ۔ قدرت اللہ بھی ٹھٹھکا ۔ وہ بھی ادھر ہی دیکھنے لگا لیکن اس نے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اس طرف سے ہٹانے کے لئے چٹکی لیتے ہوئے کہا ۔

"ڈاکٹر صاحب! پنواڑی کی دوکان پر جو ہندو فلم ایکٹریس کا فوٹو لگا ہے یہ عورت تو اس سے بھی حسین ہے"!

"ہاں ہاں میں جانتا ہوں یہ آپ جیسے آدمیوں کے لئے ہے جو تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں ۔ میں اس تصویر کو دیکھتا ہوں جس کے دونوں پہلو حسین ہوں"۔

یہ جملہ ختم ہوتے ہوتے حسینہ قریب آ گئی اور آن کی آن میں آگے بڑھ گئی وہ کنکھیوں سے دیکھتی ہوئی جا رہی تھی ۔ ان دونوں کو بھی یہ بخوبی محسوس ہو گیا تھا ۔ اس کا پیل ساڑی میں ملبوس گداز جسم چست کولہے ۔ پتلی کمر کسے کسے شانے ۔ پروائی میں لہراتے ہوئے ناگ کے جوڑے کی طرح سیاہ چمکیلی چوٹیاں ، جھیل کے پانی کی مستانی لہروں کی طرح کولہوں پر ملتی ہوئی پشت پر ابھرتی بیٹھتی خوبصورت چنچل سلوٹیں ۔ گوری گردن میں پڑی سونے کی چمکدار زنجیر طلوعِ آفتاب کی ترچھی کرنوں سے جھلملا رہی

ہم انتظارِ صبح میں جاگے تمام رات
نکلا جو آفتاب تو وہ بھی گہن میں تھا (ظفر علی خاں)

تھی۔ یہاں لگی سرخ ایڑیاں چپلوں کا ایک فیتہ اور ایک شرمیں پٹاپٹ کی آواز یہ بھی چیزیں ثبوت تھیں اس بات کا کہ یہ وہ تصویر ہے جس کے دونوں رخ حسین ہیں قدرت قدرت اللہ نے دھیمی سی آواز میں کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو ڈاکٹر! اسی لئے پرسوں اس عورت کو بھی اندر والے کمرے میں لے گئے تھے۔ دیکھتے دیکھتے جی نہیں بھرا تو اور کرتے بھی کیا؟"

"کون سی عورت؟"

"جسکی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا اور جب وہ باہر نکلی تو مسکرا رہی تھی تم بھی خوش تھے یاد آیا؟"

"ٹھیک ہے یاد آگیا۔ دیکھو قدرت بھائی سب آنکھوں سے دیکھتے ہیں مگر نظر نظر میں فرق ہوتا ہے تمہیں کیا معلوم کہ میں اسے کس نظر سے دیکھ رہا تھا۔ تمہارے اس شک کو دور کرنے کے لئے آج مجھے وہ بات زبان پر لانی پڑ گئی جسکو میں کسی سے بھی کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دیکھو بھائی وہ عورت پرسوں اپنے بیمار بچے کو لائی تھی۔ میں نے اسے مناسب دوا دیدی اور کچھ دوائیں بازار سے خریدنے کو بھی لکھ دیں جو اس وقت میرے پاس نہیں تھیں اور کہہ دیا کہ جب کل تم آؤ تو یہ دوائیں بھی لیتی آنا۔ بس ان کا طریقۂ استعمال سمجھا دوں گا۔"

جب وہ صبح کو آئی تو دوائیں لے آئی میں نے ترکیب استعمال سمجھاتے سمجھاتے جو اسکے چہرے پر نظر ڈالی تو مجھے ناک بغیر پھول کے دکھائی دی جبکہ اسکی ناک میں کل سونے کا پھول تھا آج اسکی جگہ جلو پر گویا پھول کے برابر نشان تھا جو پھول کے نیچے ڈھکا رہتا تھا۔ اور ایسے لگ رہا تھا جیسے چھپے ہوئے اپلے کے نیچے سے دوب گھاس نکل آئی ہو۔ میں کئی باتیں سوچتا رہا۔ کہیں کھو گیا یا کسی نے چھین لیا مگر میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ میں یہ جاننا بھی چاہتا تھا کہ وہ پھول کہاں گیا؟ آخرکار میں اسے اندر لے گیا اور اس سے بولا۔

"بیٹی! تو مجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھ اور جیسے ایک بیٹی اپنے باپ سے کچھ نہیں چھپاتی ہے تو بھی مت چھپانا میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تیرا سونے کا پھول کہاں گیا؟"

یہ سنکے اس نے بڑے معصوم انداز سے میری طرف دیکھا اور نظریں جھکا کر بولی۔

"اسے سترہ روپے میں گروی رکھ کے دوائیں لے آئی۔ غریبی غریب ہی کو ستاتی ہے اور ہمیں غریبوں کو"

یہ بات سن کر میں نے اس کی کمر تھپتھپائی اور کہا!

"بیٹی! تو نے یہ ٹھیک ہی کہا۔ جو غریبی میں زیور گروی رکھ کر کام چلا لیا۔ اور قرض کی دیمک سے بچ گئی اب

ایک کام کر" میں نے سو روپے کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے پھر کہا۔

"یہ لو! اور ادھر سے جاتے ہوئے اس پھول کو چھڑا لینا جب دوا لینے آؤ تو اس پھول کو پہن کر آنا۔ سونی ناک اچھی نہیں لگتی ہے سہاگ کی چیزوں کو جسم سے الگ نہیں کرتے ہیں۔"

یہ سن کر وہ سہمی اور ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ یہ اسکی شرافت اور ایمانداری کی علامت تھی میں نے اسے سمجھایا

"بیٹی! بچے کو اپنے باپ سے جو بھی ملے خوشی سے لے لینا چاہئیے اور دینے کا حق بھی ہوتا ہے۔ لو اور گھر جا کر ساری باتیں اپنے شوہر کو بتا دینا تاکہ تم دونوں کے بیچ کسی بھی طرح کا شک جنم نہ لے۔"

یہ سن کر وہ مسکراتی ہوئی مؤدبانہ طریقے سے میرے پیر چھوئے اور ہاتھ جوڑ کر نمستے کی، نوٹ لیا اور مسکراتی ہوئی باہر چلی گئی۔" میں بھی اسی لئے خوش تھا۔ اس روز مجھے محسوس ہوا کہ کسی ضرورتمند کی مدد کرنے میں دل کو کتنی خوشی ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع تھا جو میں نے رمضان میں ایک اچھا کام کیا۔" قدرت اللہ کا شانہ ہلاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کہا "اب سمجھ گئے ہم دونوں کے مسکرانے کا کارن؟"

"سمجھ گیا ڈاکٹر صاحب! معافی چاہتا ہوں میں نے ناحق آپ پر بدگمانی کی"۔

"شرینواس! پان بن گئے کیا؟" قدرت نے بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

"ابھی دیتا ہوں صاحب! میں آپکی باتوں میں پان بنانا ہی بھول گیا تھا۔"

"تمہیں ہماری باتوں میں کیا مل رہا تھا؟ تم دکاندار ہو ان باتوں سے کیا لینا۔ شرینواس! آج تک ہم نے تمہاری ٹانگ کی بابت نہیں پوچھا کہ کیسے کٹی؟"

"ڈاکٹر صاحب پوچھ کر کیا کروگے؟ اس کی بڑی دکھ بھری کہانی ہے"۔ پان لگاتے ہوئے بولا" ایکبار میرے گھر ڈکیتی پڑی تھی ٹانگ میں گولی لگ گئی۔ تمام جمشید پور میں میں دکھایا کسی سے علاج نہیں ہوا۔ آخرکار آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ دہلی میں داخل ہوا اور وہاں مجھے لنگڑے کا خطاب ملا یعنی میری ٹانگ کاٹ دی گئی۔ اس وقت میں ابھی پڑھ رہا تھا۔ اور میری شادی بھی ہوگئی تھی، اگر شادی نہ ہوئی ہوتی تو اتنی محنت مشقت نہ کرنی پڑتی۔"

"یہ تو اچھا ہوا جو تم شادی شدہ تھے ورنہ نکمے بن جاتے" یہ سن کر وہ مسکرا دیا۔

"تم کونسی کلاس میں پڑھتے تھے،" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"بارہویں کلاس کا امتحان دیا تھا۔ جب میرا نتیجہ آیا تو میری ایک ٹانگ مجھ سے جدا ہو چکی تھی۔ میں نے اپنے سکول میں ممتاز حیثیت پائی تھی سب مجھے شاباشی دے رہے تھے اور میں تھا کہ رو رہا تھا!"

"کیونکہ تمہاری ٹانگ کٹ گئی تھی" قدرت اللہ نے کہا۔

"لنگڑے لولے کیا پڑھتے نہیں ہیں۔ ملال یہ تھا کہ میرا ڈاکٹری پاس کرنے کا خواب مٹی میں مل گیا تھا۔"

"کیا تمہارے پاس بوٹنی بایولوجی تھی؟"

"جی" شرینواس سست ہو کر بولا۔ ڈاکٹر صاحب پان کا بیڑا ہاتھ میں لئے نہایت سنجیدگی کے ساتھ کھڑے کھڑے سوچ رہے تھے کہ کتنے ہونہار تو وہ بھی نہیں تھے۔ قدرت اور قسمت بھی منہ دیکھ کر انصاف کرتی ہے یہ سوچتے ہوئے اور پان منہ میں رکھتے ہوئے چل دیئے۔

"ڈاکٹر صاحب! ذرا ٹھہریئے، یہ لیتے جایئے"

شری نیواس نے کہا۔

"کیا ہے؟" متعجب ہو کر انہوں نے کہا۔

"پرسوں جس لڑکی کو آپ نے ۱۰۰ کا نوٹ دیا تھا وہ میری بیوی تھی۔ اس نے آپکی شرافت کا سارا قصہ مجھے سنایا تھا۔ اچھا ہوا اس وقت آپ آگئے، ورنہ میں اسی کے ہاتھ یہ روپئے آپکے اسپتال ہی میں بھجوا دیتا آپکی غریب پروری کا شکریہ۔ غریبی کوئی مصیبت نہیں ہے جو اس کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے جائیں۔ یہ تو ایک امتحان ہے اور ایمان والے اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ برکت اپنی ہی کمائی میں ہوتی ہے ڈاکٹر صاحب!"

خدا نہیں ہے تو کیا ہے ہمارے سینوں میں — وہ اک کھٹک سی جسے ہم ضمیر کہتے ہیں (شاذ تمکنت)

جرم و سزا

مانک ٹالا :
کھار، بمبئی .

مدن اپنی کال کوٹھری میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔ اگلے روز صبح سویرے اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے گا۔ اس کی آخری اپیل بھی خارج ہو گئی تھی۔

اس کی سوچ اور سمجھ کی قوتیں سلب سی ہو رہی تھیں۔ ہوش و حواس شل ہو رہے تھے۔

مادرِ وطن کی خدمت کی راہ میں یا کسی اونچے آدرش کی خاطر اسے موت کی سزا ہو جاتی تو ہنستا گاتا پھانسی کے پھندے پر جھول جاتا لیکن اسے یہ سزا ایک نوجوان عورت کے قتل کے جرم میں ہوئی تھی ــــ ایسا جرم جو اس سے کبھی سرزد نہیں ہوا تھا۔

یہ سارا واقعہ بالکل بمبیا فلموں کی طرح انتہائی ڈرامائی انداز میں ہوا تھا۔ موسم سرما کی ایک اداس سی شام تھی۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ وہ کمپنی باغ کے ایک ویران گوشے میں ایک بنچ پر اکیلا بیٹھا کسی برہن کا دردناک سا گیت گنگنا رہا تھا۔ سردی کے کارن سارا باغ خالی ہو چکا تھا اور وہ بھی اٹھنے کے لئے پر تول رہا تھا کہ باغ کے دوسرے سرے سے کسی عورت کی دردناک چیخ سنائی دی۔ وہ بھاگم بھاگ وہاں پہنچا لیکن اسی دوران میں قاتل بھاگ چکا تھا۔ عورت کے سینے میں ایک بڑا سا رام پوری چاقو پیوست تھا۔ اور وہ درد کی شدت سے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ سے چاقو اس کے سینے سے کھینچ باہر نکالا۔ اور خون کا فوارہ ابل کر اس کے کپڑوں کو داغ دار کرتا ہوا چلا گیا۔ عورت ایک آخری چیخ مار کر وہیں ٹھنڈی ہو گئی۔

اور یہاں قدرت نے اس کے معاملے میں ایک اور ستم ظریفی یہ کر دی تھی کہ جہاں حسبِ عادت پولیس جائے واردات پر سب سے آخر میں پہنچتی ہے وہاں سب سے پہلے آن موجود ہوئی۔ ہوا یوں کہ عین اس وقت باغ کے باہر سے ایک پولیس وین گزر رہی تھی۔ اور عورت کی چیخ سن کر وین کے ڈرائیور نے فل بریک مار کر گاڑی روک دی۔ گاڑی میں ایک انسپکٹر اور تین چار سپاہی تھے سبھی بھاگے بھاگے وہاں پہنچے۔ مدن خون میں لت پت ہاتھ میں چاقو تھامے کھڑا تھا ــــ

اس نے زندگی میں کبھی کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ لیکن دو تین مرتبہ عادی مجرموں کی سنگت میں گرفتار ہو کر چھوٹی بڑی سزائیں کاٹ چکا تھا۔ اس لئے اس کی سبھی دلیلیں اور اپیلیں بیکار ثابت ہوئیں۔

عورت کا خاوند شہر کے نچلے درمیانی علاقے میں پرچون مال کی دکان داری کرتا تھا۔ سارا دن گراہکوں کے ساتھ مال کے بھاؤ تاؤ کی کھٹ پٹ میں گزار کر رات گئے تھکا ماندہ گھر لوٹتا۔ روکھی سوکھی کھا کر لمبی تان کر سو رہتا۔ عورت کی طرف خاص توجہ نہ دیتا تھا۔ یا نہ دے سکتا تھا۔ ادھر عورت جوان طرحدار اور آنکھوں سے بات کرنے والی۔ وہ اس طرح کے حالات سے کیسے نباہ کر سکتی تھی۔ اس نے بھی ادھر ادھر کے مردوں سے آشنائی پیدا کر لی تھی۔ اسی لئے اڑوس پڑوس میں کافی بدنام ہو چکی تھی۔ عورت کے خاوند نے بھی اپنے بیان میں کہہ دیا تھا کہ اسے اپنی عورت کے کریکٹر پر شبہ تھا۔ اور کہ ہو سکتا ہے کہ مدن بھی اس کا کوئی آشنا ہو اور کسی آپسی جھگڑے کی وجہ سے مدن نے اشتعال میں آ کر اس کی بیوی کا قتل کر دیا ہو ــــ

مدن مشکل سے چھ سات برس کا تھا کہ وہ شرنارتھیوں کے ایک بے سرو سامان قافلے کے ساتھ اس شہر کے ایک شرنارتھی کیمپ میں آ پہنچا تھا۔ وہ اپنے ماں باپ بھائی بہنوں سے بچھڑ گیا تھا۔ اور اسے یہ بھی پتہ نہ تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا موت کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ کئی سال اس نے شرنارتھی کیمپ میں گزار دیئے ــــ کیمپ کے سکول میں تھوڑی بہت تعلیم بھی حاصل کی تھی۔ اور جب کیمپ ٹوٹا تو وہ پھر زندگی کے دوراہے پر آ کھڑا ہوا۔ پاپی پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے اس نے طرح طرح کے کام کئے۔ امیر گھرانوں کے برتن مانجھے۔ لوگوں کا سامان ڈھویا۔ فٹ پاتھ پر سبزی اور پھلوں کی دکان سجائی۔ لیکن کہیں بھی امان نہ ملی فٹ پاتھ کا باسی تھا اس لئے اس کی دوستی بھی فٹ پاتھ کے مکینوں کے ساتھ تھی۔ جو اکثر جرائم پیشہ لوگ تھے۔ یا حالات کی مجبوری انہیں جرائم کی طرف دھکیل دیتی تھی۔

مدن اپنی خداداد ذہانت کے باعث، مخدوش حالات کے باوجود، تعلیم بھی حاصل کرتا رہا حتیٰ کہ اس نے ہندی، اردو اور انگریزی میں بہت اچھی استطاعت پیدا کر لی۔ جرائم پیشہ لوگوں کے درمیان رہ کر اسے ان لوگوں کی خصلت اور نفسیات کا مطالعہ کرنے کے موقعے بھی میسر ہوئے ذہن کی اپج نے آخر ایک روز اس کے ہاتھ میں قلم پکڑا دیا۔ اور اس نے اپنے انہی ساتھیوں کے حالات ان کی خصلتوں، عادتوں اور نفسیات کے بارے میں کچھ مضمون لکھ مارے جو اس کی امید کے خلاف بہت مقبول ہوئے۔

وہ کیچڑ میں رہ کر بھی کنول کی طرح اچھوتا تھا۔ لیکن جب کیچڑ کے چھینٹے اڑتے ہیں تو دامن داغ دار ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ ناجائز دارو کا دھندہ کرنے والے ایک گروہ کے ساتھ گرفتار ہو کر چھ ماہ کی سزا پائی۔ وہ ان کے دھندے میں حصے دار نہیں تھا۔ اور اگر وہ ان کے دھندے کی ساری تفصیل پولیس کو بیان کر دیتا تو شاید چھوٹ بھی جاتا لیکن اس نے اپنے فٹ پاتھ کے ساتھیوں کے ساتھ دغا کرنے پر جیل کی چار دیواری کو ترجیح دی۔

جیل میں پہنچ کر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ یہاں آ کر اس نے محسوس کیا کہ وہ چھوٹی جرائم گاہ سے بڑی جرائم گاہ میں پہنچ گیا ہے۔ جیل کے باہر جرائم کا سکول تھا تو اس کی چار دیواری کے اندر جرائم کی پوری یونیورسٹی قائم تھی۔

ہنسیں کھیلیں اے داغ یاروں سے کہہ دو کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے (داغ)

عام سادھارن مجرم جنہیں صالح اور صحت مند ماحول میسر ہوتا تو شاید وہ اچھے انسان اور مہذب شہری بن سکتے تھے۔ لیکن وہ عادی مجرموں کی دن رات کی صحبت میں ان کی "تجارت" کے گر سیکھ رہے تھے۔ گویا قید کا مقصد سدھار نہیں بگاڑ تھا۔ جیل میں بڑے، مجرموں کی دھاندلی، عام قیدیوں کے ساتھ جیل کے افسروں کی بدسلوکی۔ بے ایمانی اور بے رحمی کے واقعات اس کے ذہن کے پردوں پر نقش ہوتے رہے۔

جیل سے رہائی کے بعد اس نے فرضی ناموں سے جیل کی زندگی پر مختلف اخباروں میں کئی مضامین لکھے جن کی بہت دھوم مچی۔ اس کے نتیجے میں جیل کی زندگی میں کچھ سدھار بھی ہوئے لیکن نمک کی کان سے شکر کیسے حاصل ہوتی ۔۔۔؟

ایک اور مرتبہ جب وہ اسی طرح کے حالات میں گرفتار ہو کر قید ہوا تو اسے قتل کے مجرموں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ دن رات ان کی سنگت میں رہ کر ان کے پچھلے حالات اور نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا۔ سفاک صفت ڈاکو اور قاتل جو گوشت پوست کے انسانوں کو گاجر مولی سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ اور اپنے قتل و غارت کے واقعے نون مرچ لگا کر، سینہ پھلا کر فخریہ انداز میں بیان کرتے تھے اور کھلے بندوں موت کا مذاق اڑاتے پھرتے تھے۔ لیکن جب ان کا پھانسی کے پھندے پر جھول جانے کا وقت آتا اور انہیں تختۂ دار کی طرف لیجایا جاتا تو ان کی زبان میں لکنت آجاتی اور ٹانگیں کانپ رہی ہوتیں۔

ان ہی دنوں ایک مرتبہ اس کے دماغ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر وہ خود اسی طرح موت کے آخری دن کال کوٹھری میں گزار رہا ہو تو اس کی اپنی ذہنی کیفیت کیسی ہوگی؟۔ موت سے پہلے کے آخری لمحے جب اس کی آخری خواہش پوچھی جائے گی جب اسے نہلانے کے لئے کہا جائیگا پھر دو سپاہی اسے پکڑ کر تختۂ دار کی طرف لے جائیں گے بسر کے اوپر کالا تھیلا ڈال کر اس کو گردن تک ڈھانپ دیا جائے گا۔ ان آخری لمحوں کے محسوسات کی داستان اگر وہ لکھ سکے تو واقعی ایک تہلکہ مچ جائے۔ لیکن وہ لکھ کیسے سکے گا؟ اس کے لئے تو اسے کسی کا قتل کرنا پڑیگا ۔۔۔ اور اگر قتل کئے بغیر ہی وہ قتل کے جرم میں پھنس بھی جائے تو یہ بھی کیا ضروری ہے کہ اسے پھانسی کی سزا لگے۔ ہو سکتا ہے عمر قید کی سزا ہو جائے۔ اور وہ زندگی بھر جیل میں چکی پیستا رہ جائے ۔۔۔ اور اگر پھانسی کی سزا ہو بھی گئی اور اسے سچ مچ پھانسی لگ گئی تو وہ اپنے ان آخری لمحوں کی داستان کس طرح قلم بند کر سکے گا! ان ساری الجھنوں کے باوجود اس کے دماغ میں ابھری ہوئی خواہش روز بروز مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی۔

زندگی میں اس نے بہت سی رنگین اور حسین چیزوں کی خواہش کی تھی۔ ست رنگی دھنک کی طرح دل خوش کن خواہشیں ۔۔۔ لیکن قدرت نے ہمیشہ اس کی ان خواہشوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔

لیکن قدرت کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ جب اس نے اس خواہش کا اظہار کیا تو اس کی یہ خواہش پوری کر دی گئی۔ اور وہ اب اپنی تنگ کال کوٹھری میں زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا تھا۔

لیکن اسے اب بھی یقین تھا کہ قدرت اسقدر سنگ دل نہیں ہو سکتی کہ اسے ایک کردہ گناہ پہ موت کے منہ میں دھکیل دیگی۔ اسے اب بھی کسی چمتکار کا انتظار تھا۔

لیکن یہ معجزہ نہ ہونا تھا، نہ ہوا ۔۔۔ ڈاکٹری معائنہ کے بعد اسے پھانسی کے تختے پر لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ اس کے سر اور چہرے پر کالا تھیلا چڑھا کر اس کی گردن پر پھندے کی گرہ مضبوط کر دی گئی تھی۔ اور جلاد مجسٹریٹ کے اشارے کا منتظر تھا۔

گھڑی میں پھانسی کے وقت میں ابھی دو منٹ باقی تھے مجسٹریٹ ہاتھ میں گھڑی لئے کھڑا تھا اس کی نگاہیں منٹ کی سوئیوں پر مرکوز تھیں۔ ہائے کتنے جان لیوا تھے یہ لمحے ۔۔۔ وہ کیوں نہیں ہاتھ کا اشارہ کرتا کہ یہ جاں گسل انتظار ختم ہو ۔۔۔ لیکن مجسٹریٹ اپنے فرض سے مجبور تھا وقت سے پہلے وہ اشارہ نہیں کر سکتا تھا۔

اتنے میں باہر سے ایک عجیب ہلچل اور بھاگ دوڑ کی آوازیں سی آنے لگ گئیں۔ ایک سپاہی دوڑا چلا آ رہا تھا۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اور دور سے ہاتھ میں پکڑا ہوا کاغذ لہرا لہرا کر دوسرے ہاتھ سے پھانسی روک دینے کا اشارہ کر رہا تھا۔

مجسٹریٹ نے پھانسی رکوا دی۔ اور نئے آرڈر کے پہنچنے کا انتظار کرنے لگا۔ نئے حکم نامہ میں لکھا تھا کہ مقتول کے خاوند نے کچھ ہی دیر پہلے اپنے جرم کا اقبال کر لیا تھا کیوں کہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے جرم کے بدلے کوئی بے گناہ پھانسی کے تختے پر چڑھ جائے ۔۔۔ چنانچہ نئے سرکاری آرڈر کے مطابق پھانسی رکوا دی گئی۔

جلاد نے پھندے کی گرہ ڈھیل کر کے پھندے کو نکالا۔ اور چہرے سے کالا تھیلا اتارا۔ مدن ۔۔۔ لڑھک کر جلاد کی بانہوں میں آگرا ۔۔۔ اس کی روح کا پنچھی جسم کا پنجرا توڑ کر ان جانی خلاؤں میں پرواز کر چکا تھا۔

۔۔ ۔۔

ادب اور زندگی

مشہور نقاد مجنوں گورکھپوری فرماتے ہیں "ادب انسان کے بہترین خیالات و جذبات کے اظہار کا نام ہے اور انسان کے خیالات و جذبات خلاء میں پیدا نہیں ہوتے بلکہ ایک خاص تہذیب اور ایک خاص ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔"

ادب و آرٹ

مشہور نقاد کلیم الدین احمد کی رائے ملاحظہ فرمائیں "سماجی حالات سے ادب پیدا نہیں ہوتا اور نہ ہو سکتا ہے، آرٹ کا ذریعہ فن کار کی کاوشوں سے ہوتا ہے سماجی کاوشوں سے نہیں۔"

حسن وہ گرم حقیقت ہے اٹھائے جو نقاب کعبہ و دیر کے ماتھے پہ پسینہ آجائے (عدم)

رشتہ

ہاجرہ شکور
دہلی۔

کئی بنیادی سوال ہمیشہ جواب سے محروم رہتے ہیں ہاں انسان اپنے طور پر ان کا کوئی جواب فرض کر لیتا ہے ایسا ہی ایک سوال ہے سماج انسان کے تابع ہے یا انسان سماج کا غلام ہے؟ انسانی رشتے جسمانی قربت سے پیدا ہوتے ہیں یا دماغی تعلق اور دنیاوی رشتوں سے؟ شردمنی نے اس کا جواب دیا ہے وہ کتنا سچ ہے اور کتنا غلط ——! واضح کوئی بات نہیں ہے دھندلے دھندلے سے خیالات ہیں۔

شردمنی کو کبھی میں پسند کرتا تھا۔ ناپسند تو آج بھی نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے وقفے کے لئے میں نے اُسے جیون ساتھی بنانے کے خواب ضرور دیکھے تھے وہ لڑکی ہی ایسی تھی میں بدذوق نہ تھا جو اسکے جادو سے بچ سکتا۔ صاف اور سیدھے الفاظ اور سلجھے ہوئے نظریات اسکی بائیس سالہ جوانی کو پختگی کا رنگ بخشتے تھے۔ وہ میری زندگی کا مقصد نہ تھی لیکن میرا خواب ضرور تھی۔ میں اس پر نرمی اور شائستگی کا رعب ڈالنا چاہتا تھا لیکن دراصل میں بھی شرک چھاپ مجنوں ہی تھا۔ اپنی کم اہمیتی جس کو میں خوامخواہ اسکی منگنی کی خبر سے جوڑتا رہا۔ مجھکو غم و غصہ سے دیوانہ بنا گئی۔ انتقام کے جوش نے مجھے وہ حرکت کرنے کے لئے اکسا دیا جسکی مجھے اپنے آپ سے امید نہ تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ حادثہ گیا بیتا ہو گیا لیکن نہ جانتا تھا کہ زہر کے بیج کا پودا پھوٹ چکا ہے۔

آج چار سال بعد اس سے ملنے کے بعد میرے جذبات خود میرے لئے اجنبی بن گئے ہیں پتہ نہیں میں خوش ہوں یا دکھی۔ اسٹیشن سے واپسی پر یہی سب کچھ میرے دماغ میں گھوم رہا ہے۔

چار سال پہلے ہم دونوں ایک ہی جگہ ملازمت کرتے تھے۔ اس نے انگریزی ادب میں ایم۔ اے پاس کیا تھا۔ وہ مترجم کا کام کرتی تھی اور میں سیکشن آفیسر تھا۔ ہم روز ہی ملتے تھے لیکن کچھ دنوں بعد سرکاری نوعیت کی ملاقاتیں ذاتی رنگ میں رنگی جانے لگیں۔ میں نہ جانے کیوں یہ سمجھنے لگا کہ میں اسکے دل میں جگہ پانے لگا ہوں۔ ایکدن جب میں اس سے صاف بات کرنے ہی والا تھا تو میں نے محسوس کیا کہ آج کچھ خاص بات ہے۔ خوبصورت گلابی ساڑی میں لپٹا سراپا۔ پہلی کے چاند کی پہلی کرن کی طرح جگمگاتی اور نازک حسن کی وہ تصویر آج بھی ذہن میں زندہ ہے۔

پانچ بجے تک میں اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا۔ دفتر بند ہونے کا وقت آگیا۔ وہ بھی اپنی چیزیں سنبھالنے لگی۔ باہر اسٹول پر افیمی چپراسی بیٹھا رہ گیا۔ تنہائی پا کر میری ہمت بڑھی میں نے بہت غور و فکر سے ترتیب دیا ہوا یہ فقرہ ادا کر دیا۔

" شردمنی تمہارے خوبصورت ہاتھوں میں ایک انگوٹھی کی کمی ہے۔ میں یہ کمی پوری کرنا چاہتا ہوں تم ایکدن میری بڑی بہن کے گھر چلنا وہ تم سے مل کر بہت خوش ہونگی "

" سر آپکی بات میری سمجھ میں آئی اگر یہیں یہ اظہارِ محبت تو نہیں ہے؟ میں نے آپکو اس نظر سے نہیں دیکھا اور آپکو شاید پتہ نہیں کہ آج ہی صبح میری منگنی ہو چکی ہے دو ہفتے بعد شادی ہو جائے گی۔ کل پرسوں تک سب کو دعوت نامے مل جائینگے "!

اسکے الفاظ سے زیادہ اس کا سپاٹ اور بے نیاز لہجہ میرا خرمن ہوش و خرد جلا کر راکھ کر گیا۔ محبت کھونے سے زیادہ بے غیرتی کا پاگل کر دینے والا احساس میں ہمیشہ کا شریف مہذب اور رکھ رکھاؤ والا انسان کبھی نہ ٹوٹنے والا شیشے کی طرح جب ٹوٹا تو چور چور ہو گیا۔ اکتوبر کی پیدائش کی وجہ سے فطرت میں عقرب کا اثر غالب آگیا۔ میں اپنی توہین کا انتقام لینے کے لئے تیار ہو گیا۔

بجلی سی کی تیزی سے میں نے باہر کھلنے والے دروازے کی چٹخنی لگائی۔ باہر اسٹول پر افیمی چپراسی بیٹھا رہا۔ اندر کے نیم تاریک کمرے میں۔ اس شیطان کا راج ہو گیا جو ہر انسان کے قالب میں رہتا ہے۔ عظیم الشان سرکاری عمارت کا وہ حصہ بالکل سنسان تھا۔

میرا ذہین دماغ سوچ رہا تھا کہ عورت کے ساتھ محبت جتانے اور اپنانے کا جو طریقہ ہے وہی اس سے انتقام لینے کا بھی ہے۔ یہ قدرت اور معاشرے کا کیسا کھیل ہے۔

آ: کہانی مختصر ہے آدھے گھنٹے بعد جو کیدار اندر آیا کہ دفتر بند کرے تو میں اکیلا تھا۔ پتہ نہیں کب شردمنی جا چکی تھی۔ میں جیسے اپنے آپ کو بھولا ہوا ایک کرسی پر پڑا تھا۔ شردمنی پھر دفتر نہیں آئی۔ اس کا استعفیٰ آیا۔ جس پر کسی کو تعجب نہیں ہوا کیونکہ شادی کے بعد نوکری چھوڑنے کا فیصلہ وہ پہلے ہی سنا چکی تھی۔ دس دن بعد یہ خبر آئی کہ اسکی شادی ہو گئی ہے کلکتہ سے بارات آئی وغیرہ۔

میں ذہنی الجھنوں اور پچھتاوے کے درمیان راستہ ڈھونڈتا رہا۔ میں اندر ہی اندر بالکل ٹوٹ گیا تھا۔ اداس دل لئے ایک مہینے کی چھٹی لے کر میں اپنے گاؤں چلا آیا۔ وہاں پر میں پاگلوں کی طرح بے مصرف پھرتا رہتا۔ کھیتوں میں گھومتا رہتا۔ منڈیر پر بیٹھے کلی کو پھول بنتے دیکھتا رہتا۔ نجانے کیا سوچتا رہتا۔ دن گذرتے گئے۔ گھڑی کی سوئیاں آگے بڑھتی رہیں لیکن میرے لئے وقت ٹھہر گیا تھا۔ وہ دو آنکھیں جن میں لق

آگے آگے کوئی مشعل سی لئے چلتا تھا
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں (شاذ تمکنت)

سے زیادہ حیرت بھری تھی۔ میرے اعصاب پر سوار ہو گئی تھی۔ حالت ایسی ہو گئی کہ ماں تھا اٹھ کر پیر اپنے آئیں اور والد صاحب نے بڑے بھائی کی معرفت ماہ بیاہ سے ... بیٹے کی حرکت سمجھی۔ میرے رہنے کا بندوبست ... جبل پور کے گھر کر دیا گیا۔ یہاں چھوٹے چھوٹے بچے مجھے ... گھیرے رہتے۔ میں ٹھیک ہوا لیکن ٹیس باقی رہ گئی۔ یہ درد اور تڑپ ہی اس جبریہ تعلق کی یادگار ... میں نہ جانتا تھا کہ ایک اور نشانی بھی موجود ہے

وقت نے میرے ... کے آگے تجربہ جوڑ دیا میں انڈر سیکریٹری ہو گیا۔ دفتر بدل گیا بلکہ منسٹری بھی بدل گئی۔ میری زندگی سدھر چلی تھی۔

میں ہمیشہ سے جبل قدمی کا عادی تھا۔ جنگ پور میں رہنے کے باعث اکثر نظام الدین اسٹیشن تک پیدل ہی آ جاتا تھا۔ اور پھر آج تو میں ایک دوست کو لینے آیا تھا لیکن کیا پتہ تھا کہ گردش ایام پھر کی طرف گھوم جائے گی۔ میرا دوست تو نہیں آیا لیکن جبل پور سے آنے والی گاڑی سے وہ اتری۔ وہی یاسمین ... شرومنی۔ فرق بس اتنا تھا کہ چار سال پہلے آخری بار جب دیکھا تو وہ گلابی لباس میں تھی اور آج آسمانی رنگ کی ساڑی میں موسم سرما کا پورا کھلا ہوا گلاب میرے سامنے تھا۔ مانگ میں سیندور کی ہلکی سی لکیر اسے ایک محتاط فاصلے پر بٹھا رہی تھی۔ ہاتھ میں چھوٹا سا سوٹ کیس اور بوجھ کی وجہ سے کمر کے خم کو واضح کر رہا تھا۔

میں چاہتا تو اسے نظر انداز کر سکتا تھا۔ میرے دل کے اندر بیٹھا ہوا چور اس کے سامنے جانے سے کترا رہا تھا وہ جبل پور سے آنے والی گاڑی سے اتری تھی۔ میں کسی کو لینے آیا تھا۔ میرا وہ دوست تو نہیں ملا لیکن شرومنی سے ملاقات ہو گئی میں اسے نظر انداز نہ کر سکا خدا جانے کیوں میں اس کے پاس بڑھا چلا آیا شاید معافی مانگنے تجدید محبت کی غلطی کرنے یا پھر محض تجسس کی خاطر۔ وہ پلیٹ فارم پر کھڑی تھی۔ اس کی جھکی ہوئی نگاہ میرے اوپر پڑی۔

"کیسی ہو شرومنی۔" بے شمار باتیں جو میں کہنا چاہتا تھا، ان کے بدلے صرف یہ کہہ سکا۔

"آپ کی مہربانی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بات کر رہی تھی۔ لیکن وہ مجھے طنز آمیز محسوس ہوا۔

"تمہارے شوہر کیسے ہیں؟" مرضی کے بغیر میں نے پوچھا۔

"وہ جبل پور میں ہی ہیں چھوٹی بہن کی شادی تھی اسلئے میں جلد چلی آئی وہ، ماں جی، اور ہمانشو ایک دو ہفتے بعد آئینگے۔" وہ بہت سادگی سے بات کر رہی تھی۔ بات کرتے کرتے ہم پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے۔

"شرومنی! میں تم سے کتنا ملنا چاہتا تھا۔ تم مجھے بے حس، بے شرم سمجھو گی لیکن میں سچ مچ تم کو خوش اور مطمئن دیکھ کر بہت ہلکا محسوس کر رہا ہوں خدا کا شکر ہے کہ میری غلطی نے تمہاری زندگی تباہ نہ کی۔" میں بہت خلوص سے کہہ رہا تھا۔

"سریندر جی! جسکو آپ غلطی کہہ رہے ہیں وہ ایک ایسا آتش فشاں تھا جسمیں میری روح تک جل گئی میں اسے کبھی نہیں بھول سکتی۔ زندگی بھر کے لئے ایک یادگار ساتھ ہے۔" وہ جوش میں بولتی چلی گئی۔ باتوں کی دھن میں ہم ایک اجڑے ہوئے پارک میں چلے گئے۔ چاروں طرف ٹریفک تھا لیکن ہم ان سب سے دور جا چکے تھے۔ اچانک میرے دل میں ایک نیا خیال آیا۔

"کیسی یادگار؟" میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پوچھا۔

"کوئی اور یہ نہ جان سکا لیکن میں جانتی ہوں ہمانشو آپکا ہی بیٹا ہے۔ اگرچہ میرے دل میں آپ کی کوئی عزت نہیں لیکن میں جانتی ہوں کہ آپ مجھے بلیک میل نہیں کر سکیں گے۔ اور کریں بھی تو مجھے اس کا کوئی خوف نہیں ہے سمیر کو دنیا کی کوئی طاقت میرے خلاف نہیں بھڑکا سکتی۔"

میرا دل بہت زور سے دھڑک رہا تھا۔ میں تیتیس سال کا کنوارہ مرد اچانک خود کو باپ محسوس کر کے خوف زدہ ہو گیا۔ "کہاں ہے ہمانشو میں اس سے ملنا چاہتا ہوں" میں نے اچانک کہہ دیا۔ پھر زبان روک لی۔

"ہمانشو آپکی غلطی اور حیوانیت کا نتیجہ ہے لیکن آپ اس کے باپ نہیں۔ میرا بیٹا کسی جانور سے رشتہ نہیں رکھتا۔ وہ سمیر جیسے بلند انسان کی شخصیت کا پرتو ہے۔" صاف اور سیدھی بات خنجر کی طرح دل میں اتر گئی۔

"کیا تم اسے ٹھیک سمجھتی ہو کہ سمیر دوسرے کے بچے کو اپنا بچہ سمجھ کر پرورش کئے جا رہے ہیں۔ تم نے انہیں نہ بتا کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔"

"میں ان کو بتاتی بھی تو کیا ــــ اگر مجھے ذرا بھی یہ احساس ہوتا کہ آپکی یہ غلطی ایک سوالیہ نشان بن کر سامنے آئے گی تو میں یہ شادی نہ ہونے دیتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ شادی کے فوراً بعد ہی میں نے محسوس کیا ــــ کہ یہ ــــ ظلم ہو گیا ہے۔ اس کے بعد میں کر ہی کیا سکتی تھی۔ ان کے دماغ میں کبھی ایک پل کے لئے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ بچہ ان سے نہیں ہے ــــ حقیقت بیان کرنے سے کسی کو سکھ نہ ملتا۔ ان کا دماغی سکون غارت ہو جاتا اور میں اور ہمانشو شاید لاوارث رہ جاتے۔"

"تمہارا ضمیر تم کو کیسے چین لینے دے رہا ہے سمیر کے ساتھ تم دھوکا کر رہی ہو۔" میں نے پرزور الفاظ میں کہا۔

"کیسا دھوکا ــــ؟ کیا ماں باپ کا رشتہ صرف جسمانی ہوتا ہے؟ جسم آدھی حقیقت ہے اور سماج پوری۔ باپ بیٹے کا رشتہ سماجی ہوتا ہے۔ یوں بھی یہ آدھی سچائی کس کا بھلا کرتی۔ میری اس حرکت کو خود غرضی سمجھا جا سکتا ہے لیکن حیوانیت نہیں۔ آپ کبھی ہمانشو سے ملنے یا حق جتلانے کی کوشش نہ کریں۔ پہلے ہم کلکتہ میں تھے۔ پھر جبل پور چلے گئے۔ دلی کبھی کبھار آنا ہوتا ہے۔ آج آپ سے ملاقات ہو گئی مجھے آپ سے نفرت نہیں کیونکہ آپ کی وجہ سے میرا کچھ بگڑا نہیں۔ سماج میں بھی میرا مقام برقرار رہا۔ یہ مکاری نہیں بلکہ ایڈجسٹمنٹ ہے۔ مجبوریوں سے سمجھوتا اور نفع نقصان کے درمیان توازن، میرا ضمیر مطمئن ہے۔"

وہ اپنا سوٹ کیس اٹھا کر چلنے لگی۔

"جب میں تمہارے لئے اتنا حقیر ہوں تو تم نے مجھے یہ سب کیوں بتایا؟" میں نے وہ سوال پوچھا جو میں کتنی ہی دیر سے سوچ رہا تھا۔

"آپ سمجھے نہیں" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ ایک زہریلی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر کوندگئی۔ "یہ میرا انتقام ہے۔ آپ نے مجھے ساری زندگی کے لئے بوجھ دیا تھا لیکن میں نے اسے موتیوں کے ہار کی طرح گلے میں ڈال لیا۔ اب میں نے اصلیت بتا کر آپ کو جو تڑپ دی ہے اسے آپ گلے کا ہار نہ بنا سکیں گے۔ پھر بھی یہ دکھ آپ کو زندگی بھر ڈھونا ہو گا۔"

وہ سڑک پر آگئی۔ ایک ٹیکسی کو روک کر اسمیں بیٹھ گئی۔ گاڑی اسٹارٹ ہوئی۔ ہلکا آسمانی سراپا برق کی طرح چمک کر غائب ہو گیا۔ میں وہیں بیٹھا رہ گیا۔ نجانے کیوں مجھے انتقام کے تلخ جام میں کھٹ مٹھا ذائقہ آرہا تھا۔

ــــ ٭ ــــ

تو جہنم کو کیا دیا تو نے (داغ)

مجھ گنہ گار کو جو بخش دیا

سرنگ

ابواللیث جاوید
معرفت ڈاکٹر طلحٰہ رضوی برق
مِلکی محلہ۔ آرہ ـ ۸۰۲۳۰۱

منظروں کا کیا ہے!
فضا کے کینوس پر آسمان جیسا رنگ پھیلائے گا ویسا ہی منظر آنکھوں کے سامنے ہوگا۔
اور اس دن منظر کچھ یوں تھا ـــ
شکستہ دیواروں کا لامتناہی سلسلہ یہاں سے وہاں تک پھیلا ہوا تھا اور سروں پر تیز دھوپ کے نوکیلے خنجر جھول رہے تھے۔ دھوپ میں تپتا ہوا بے آب وگیاہ میدان اپنے بدن پر رینگتے ہوئے سائے کو محسوس کر رہا تھا۔ ان سایوں میں بے چینی تھی۔ رفتہ رفتہ سائے بڑھتے جا رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارا میدان پرچھائیوں سے بھر گیا تھا۔ اتنی ساری پرچھائیاں آخر کہاں سے آگئیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ وہ کسی سوراخ سے نکل رہی تھیں اور میدان میں پھیلتی جا رہی تھیں۔ ہر سمت سے چیونٹیاں ہی چیونٹیاں ابل رہی تھیں۔ ایک خاموش سفر جاری تھا۔ یہ ریلا کہاں سے آرہا تھا اور کہاں رکے گا کسی کو بھی خبر نہیں تھی۔ بس ایک سلسلہ تھا جو ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔
اتنا سب کچھ تھا مگر مکمل سکوت تھا۔ صرف خاموشی اور کچھ نہیں۔ ساری بھاگ دوڑ کسی سوچے سمجھے منصوبے کے تحت تھی۔ ہر سایہ بخوبی جانتا تھا کہ اسے کہاں اور کدھر جانا تھا۔ بے اطمینانی اور بے یقینی قطعی نہیں تھی۔ اگر بے اطمینانی اور بے یقینی ہوتی تو اتنا بڑا اژدحام بے نظمی اور ہنگامہ خیزی کا شکار ہوئے بغیر کبھی نہ رہتا۔ اب تک مختلف سمتوں سے 'زندہ باد' 'مردہ باد' جیسے نعرے، پتھراؤ، توڑ پھوڑ، بھاگم بھاگ جیسی کیفیت ضرور پیدا ہو چکی ہوتی اور یہ بھی ممکن تھا یہ میدان بجائے سایوں کے خون کے دھبوں سے بھر جاتا۔ اور پھر تو منظر کچھ اور ہی ہوتا۔

ہر طرف دھنواں، شعلے اور معصوم و بے گناہ لوگوں کی چیخیں فضا میں تیرتی رہتیں۔ پولس کی گاڑیاں دوڑتیں، گولیاں دندناتیں، ماؤں کی گودیں اجڑ جاتیں۔ اور سہاگنوں کی مانگ کا سیندور دھلتا، درس گاہیں سونی ہوتیں، کتابیں دیمک زدہ ہو جاتیں اور ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا۔
مگر یہ یہاں سب کچھ نہیں تھا۔ بڑا ہی اطمینان اور سکون تھا۔
میں حیرت و استعجاب کے عالم میں دور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں بار بار اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتا اور دماغ پر زور دے کر سوچتا کہ میں کہاں ہوں۔ مگر یہ جگہ میرے لئے بالکل اجنبی تھی۔ سارا ماحول اجنبی تھا۔ یہاں مجھے جاننے والا کوئی بھی نہیں تھا۔ میں تن تنہا کھڑا سامنے کے میدان کی بھیڑ کو دیکھتا رہا۔ میں اس بھیڑ میں شامل بھی تھا اور اس سے الگ بھی۔ اک عجیب سی کیفیت تھی ہماری مجھ سے باتیں کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کوئی ایسا نہیں تھا جو مجھ سے پوچھتا تم کون ہو؟ یہاں کیوں کھڑے ہو اور کیا چاہتے ہو؟ میں ایک اذیت ناک سی گھٹن میں مبتلا تھا۔ میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا، کچھ پوچھنا چاہتا تھا مگر یہاں تو کوئی بھی نہیں تھا جو میرے پاس پل بھر کے لئے بھی رکتا۔ سب سائے تھے جو چلے جا رہے تھے نہ جانے کہاں جا رہے تھے۔ انہیں رکنے کی مہلت بھی کہاں تھی!
'چلو ـــ چلو ـــ چلو ـــ' دھیمی دھیمی سرگوشیوں کی سی آوازیں آرہی تھیں۔ چلو ـــ چلو ـــ کی تکرار سے ایک عجیب سی نغمگی ہواؤں میں گھل گئی تھی اور سفر کی سی کیفیت مسلط ہوگئی تھی۔ ہر آدمی سفر پر تھا۔ بس چلتا ہی جا رہا تھا۔ کوئی بھی رکا ہوا نہیں تھا۔ بس کہ قدم بڑھ رہے تھے۔ ایک دریا تھا جو بہہ رہا تھا۔ ساری چیزوں کو اپنے ساتھ بہائے جا رہا تھا۔ بس چل چلاؤ کا موسم تھا۔ ہوائیں بھی چلو، چلو کی صدائیں لگا رہی تھیں۔ ہر چیز بس چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔ چلو،
چلو،
چلو،
میرے بھی قدم آگے بڑھنے کو مچل رہے تھے۔ صرف ایک میں ہی تھا جو رکا ہوا تھا۔ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ سارے لوگوں کو چلتا دیکھ کر میں بھی اس سفر میں شامل ہونا چاہ رہا تھا۔ چلنے سے قبل میں نے ایک بار پھر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میرا ہم سفر کوئی نہیں تھا۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بہنیں، نہ بھائی، نہ بیوی، نہ بیٹے، نہ بیٹیاں، نہ دوست نہ دشمن میں تن تنہا تھا۔ مجھے سارے لوگوں کی محبتیں بار بار یاد آنے لگیں۔ میری آنکھیں انہیں ڈھونڈتی رہیں اور اس کے بعد نم بھی ہوگئیں۔ اب میرے سامنے اداس اداس سا غم ناک منظر تھا۔ ہر چہرہ اترا ہوا ہر منظر دھواں دھواں۔ آخر کار میں اس اجنبی بھیڑ میں شامل ہوگیا۔ اور آگے بڑھنے لگا۔ میرا یہ نامعلوم سفر تھا۔ میں کہاں جا رہا تھا، میرے یہ قدم کہاں رکیں گے، مجھے خود اس کی خبر نہیں تھی۔ لوگ چل رہے تھے اس لئے میں بھی چلتا رہا چلتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چلتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ چلتا رہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
صدیوں کی مسافت کے بعد لوگوں کا اژدہام اس بڑی چٹان کے پاس رک گیا جو کسی سرنگ کے دہانے پر رکھی ہوئی تھی۔ چٹان کے اس طرف سے

فنا بغیر بقا کا مزا نہیں ملتا
خودی مٹاؤ نہ جب تک خدا نہیں ملتا (احسن مارہروی)

بہت سارے لوگوں کی آوازیں صاف آ رہی تھیں ۔ ایسا لگتا تھا اندر بہت گہما گہمی تھی ۔ چٹان کی اس طرف بڑا ہی سکوت تھا ۔ آہستہ آہستہ ادھر کے لوگ چٹان کی تہہ کے راستے سرنگ میں داخل ہونے لگے تھے اور بھیڑ دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی ۔ میں بھیڑ سے الگ ہٹ کر چٹان کی تہہ میں بنے کوتاہ راستے اور اس کے بعد کی سرنگ کے متعلق سوچ رہا تھا ۔ چٹان کی تہہ کا راستہ اتنا کوتاہ تھا کہ اس میں کسی انسان کا سمانا بہت مشکل تھا ۔ اگر کوشش بھی کی جاتی ۔ تو دم گھٹ جانا یقینی تھا ۔ اور پھر اس کے بعد سرنگ میں نہ جانے کیا عالم ہو ۔ خدا جانے وہاں روشنی تھی یا تاریکی ۔ زمین سخت تھی یا دلدل ۔ تنگ پھر بھی سرنگ تھی ۔ مجھے یاد آیا ۔ اس سال جب میں اپنے دوستوں کے ساتھ پہاڑ کی سیر کو گیا تھا تو وہاں کے پرانے قلعے میں چند سرنگیں دیکھی تھیں ۔ کہا جاتا ہے کہ ایسی سرنگیں بادشاہ نے بنوائی تھیں تاکہ جنگ کی صورت میں ان سرنگوں کے راستوں سے قلعہ کے دور دراز علاقوں تک محفوظ طریقہ سے جایا جا سکے اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ کیا جا سکے ۔ یہ سرنگیں نہایت پرخطر اور تاریک تھیں ۔ چند ساتھیوں نے ہمت کی اور اندر جا کر دیکھنا چاہا ۔ مگر تھوڑی ہی دور کے بعد تاریکی تھی اور آگے راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔ اندر دھند اور تاریکی ہی تاریکی تھی ۔ گھٹن کا احساس تھا اور زہریلے جانوروں کے حملے کا خوف تھا ۔ فوراً سب کے سب باہر چلے آئے وہ سب بری طرح کانپ رہے تھے ۔ خوف و ہراس کے نقوش ان کے چہروں پر نمایاں تھے ۔ سرنگ کی گھٹن اور تاریکی معاذاللہ !

کہا جاتا ہے کہ کسی دشمن کے حملہ کرنے پر بادشاہ سلامت نے اس سرنگ کے راستہ اپنی بہت بڑی فوج کو دلی تک جانے کا حکم دیا تھا ۔ اور حکم کی تعمیل میں فوج سرنگ میں داخل ہو گئی تھی اور مہینوں کی مسافت طے کر کے دہلی پہنچی تھی مگر راستہ میں فوج کی کثیر تعداد گھٹن، زہریلے جانوروں کے حملہ اور دیگر صعوبتوں کی کی وجہ سے موت کے گھاٹ اتر گئی تھی ۔ ان کی روحیں اب تک اس سرنگ میں بھٹک رہی ہیں ۔ چند کوئلے کی کانیں بھی میں نے دیکھی تھیں ۔ میلوں میل اندر ہی اندر چلے جایئے ۔ سورج کہیں بھی نہیں، روشنی کہیں بھی نہیں ۔ چاروں طرف کوئلے ہی کوئلے ۔ صاف ہوا بھی نہیں کہ کھل کر سانس لے سکیں ۔ گھٹن اور تاریکی ....

سرنگوں کی تاریخ میرے سامنے کھڑی ہنس رہی تھی اور میں پسینہ میں شرابور اپنے حالات کا جائزہ لے رہا تھا ۔ سامنے سرنگ اور چٹان کی تہہ کا کوتاہ راستہ مجھے اندر جانے کی دعوتیں دے رہا تھا ۔ میرے چاروں طرف گھٹن اور تاریکی کا جال بچھا ہوا تھا ۔ لگتا تھا میرا وجود اس جال میں اب پھنسا کہ تب پھنسا ۔

میں اب سرنگ کے چٹانی راستہ کے قریب کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا ۔ اس طرف کی آوازیں اب صاف سنائی دینے لگی تھیں ۔ کچھ جانی پہچانی آوازیں بھی تھیں ۔

'تمہارا کالج کب کھل رہا ہے ؟'

'.............'

'وقت پر چلے جانا !'

یہ دادا جان کے جملے تھے جن کی شفقتوں نے میری ہر گام پر رہنمائی کی تھی ۔ ان سے میری آخری ملاقات بھی نہیں ہو سکی تھی ۔ میں واقعی کالج میں تھا اور وہ گاؤں پر ......

انہوں نے اپنی عمر کی ایک لمبی مدت کلکتہ میں گوروں کے ساتھ بتائی تھی ۔ سب گورے انہیں بابا کہتے تھے ۔ اور اپنی کوٹھی کا سب کچھ ان کے حوالے کر دیتے تھے کہ ان کی ایمانداری و دیانتداری کی کوئی مثال نہیں تھی ۔ اتنے با اصول، باعمل اور با مقصد لوگ اب کہاں ملتے ہیں ! رات رات بھر عبادت میں گزارتے اور سب سے کتنی محبت رکھتے ۔ جب ریٹائر ہو کر گاؤں لوٹے تو گاؤں والوں نے جو عزت بخشی وہ ایک ضرب المثل ہے ۔ میری ڈیوڑھی صبح و شام لوگوں سے کھچا کھچ بھری رہتی ۔ دادا جان کا پیکر میری نظروں کے سامنے تھا ۔

'بھلا اتنی رات گئے تم کہاں سے آ رہے ہو ؟'

'.............'

'کل سے تم کو موہن کے ساتھ دیکھنا نہیں چاہتی'

دادی نے وہ ڈانٹیں پلائی ہیں کہ دماغ کھٹا ہو گیا ہے ۔ ان کی باتوں کا جواب میں نے ہمیشہ خاموشی سے دیا اور آخرکار وہ بگڑتے بگڑتے خاموش ہو گئیں ۔ پھر ان کی ممتا کا وہی عالم ۔ بچپن میں انگلی پکڑائی اور مدرسہ میں داخل کرا دیا ۔ کسی دن اگر پڑھنے سے جی چرایا تو دو دو ہاتھ دیکر مولوی غلام رسول کے حوالے کر آئیں اور کھانا بند ۔ ان کی سختی کا کیا کہنا ۔ سارے بچے تھر تھر کانپتے ۔ مگر جوا ہر حلوائی کے یہاں سے مٹھائی منگوائی تو سب بچوں کو بانٹنے کے بعد میرے لئے کچھ اور چھپا کر رکھ دیا اور موقعہ پاکر دھیرے سے کھلا دیا ۔ جب خوش رہتیں تو کیا کیا باتیں کرتیں ۔ دلچسپ اور مزیدار ۔ ہر بات پر کھل کھلا کر ہنستیں تو پان اور زردہ کی خوشبو تمام پھیل جاتی ۔ جب کبھی دروازہ پر بیٹھ جاتیں تو بستی کے ہر گذرنے والے سے اس کی خیریت دریافت کرتیں ۔ ہر گذرنے والا انہیں ادب سے جھک کر سلام کرتا تو وہ ڈھیر ساری دعائیں دیتیں میری زندگی کی تمام تر خوشیاں انہیں کی مرہونِ منت ہیں ۔ انہیں جب بے رحم موت ہم سے چھین کر لے گئی تو میرے گھر کی تمام خوشیاں ہم سے روٹھ گئیں ۔ گھر سونا سونا سا ہو گیا ۔ میری گلی سنسان ہو گئی ۔ ہر گذرنے والا وہاں تھوڑی دیر رکتا اور ڈبڈبائی آنکھوں کے ساتھ گذر جاتا ۔ ایک رونق اٹھ گئی تھی میرے گھر کی ۔ اور دادی اماں کا بارعب و باوقار چہرہ میری آنکھوں میں گھوم گیا تھا ۔ میری آنکھیں نم ہو گئی تھیں ۔

'بیٹا یہ کپڑا گلاب چند بابو کے یہاں سے خاص کر تمہارے لئے لایا ہوں ۔ اب کیا کپڑا ملے گا جو پہلے مل چکا ہے ۔ جاپانی لٹھ چھ آنہ گز، مکسن زینا آرہ فضی ٹو سوا روپے گز ۔۔ اور کلکتہ میں تو ٹوئی روپیز سوٹ ملتا تھا !'

بڑے ابا کے موتی جیسے دانت باہر تھے کتنی شفقت کتنا پیار تھا ان کے دل میں میرے لئے ۔ اپنے بچپن سے انہیں ایک شفیق باپ کی شکل میں دیکھا ہے کہتے ہیں میرا بچپن بڑے لاڈ و پیار سے گذرا ہے ۔ دوسری جنگ عظیم کا وہ زمانہ تھا ۔ غیر ملکی سامانوں کی بھرمار تھی ۔ میرے لئے طرح طرح کے جاپانی کھلونے چینی گڑیا بڑے ابا لایا کرتے اور میں باہر کی دالانوں میں کھیلا کرتا ۔ ان کی یہ شفقت میرے لئے برابر ہی قائم رہی ۔ اور پھر جب وہ ہم سے بہت دور چلے گئے تو اب میری آنکھوں میں ان کی صرف تصویر سی محفوظ رہ گئی ہے ۔

'ارے بیٹا یہ تیرا افسانہ چھپا ہے ؟'

حیرت سے کلکتیا ابا رسالے کے اوراق دیکھ رہے تھے اور پھر پیار بھری نظروں سے مجھے دیکھا

'بیٹا یہ میری ڈانٹ کا اثر ہے کہ تم اس قابل بن گئے !'

اور مجھے یاد آیا، انگریزی کی فرسٹ بک پڑھاتے

پانی کی لکیریں

خالد حسین
بلاک ڈیویلپمنٹ آفیسر
ارناس، ضلع ادھام پور، جے۔ کے

سرحدی حفاظتی پولس کے حوالدار کرنیل سنگھ نے اپنے چوکی افسر انسپکٹر رندھاوا کو سلوٹ مار کر کہا۔

"صاحب! دو پاکستانی جاسوس سرحد پار کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں۔ واپس پاکستان جا رہے تھے کہ ہمارے جوانوں نے پکڑ لیا۔"

"جامہ تلاشی لی؟" انسپکٹر نے وردی پہنتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں! ایک کی جیب سے دو روپے والا پاکستانی نوٹ اور دوسرے کی جیب سے ہماری کرنسی کے ایک ایک روپیہ والے چار نوٹ ملے۔ اور کچھ نہیں ملا صاحب!"

"اور کچھ نہیں ملا......؟" انسپکٹر نے بڑی حیرانگی سے پوچھا۔

"نہیں صاحب! لیکن ایک کی جیب سے مونگ پھلی کے دانے اور دوسرے سے ریوڑیاں ملی تھیں۔ دونوں مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھاتے ہوئے اور فلم 'بوبی' کا گیت ...... 'ہم تم اک کمرے میں بند ہو جائیں اور بوبی آجائے' گاتے گاتے سرحد پار کر رہے تھے کہ رنجیتے اکرشتے اور ڈیوٹی نے دونوں کو جا پکڑا۔ بہت پھڑ پھڑائے...... لیکن ہم نے پھڑکنے نہیں دیا۔ کہتے ہیں کہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے۔ بھلا...... یہاں بیساکھی کے میلے میں ان کی کونسی اماں ناچ رہی تھی جس سے ملنے آگئے مسٹلے...... کہیں کے!"

"چلو بھئی کرنیل سنگھ! دکھاؤ تو بھلا، کون سے جاسوس پکڑے ہیں آپ لوگوں نے۔" اس نے اپنے خیمے سے نکلتے ہوئے کہا۔ اور دونوں چوکی کی جانب چل پڑے۔

—— 'ستواری' کی اس چوکی پر انسپکٹر رندھاوا کو آئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ یہی کوئی چار مہینے ہوئے ہوں گے۔ ملک کے لئے اپنی جان تک قربان کرنے کے جذبے نے اسے تعلیم مکمل نہیں کرنے دی۔ اُسے ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت لڑائی میں ایمرجنسی کمیشن مل گیا۔ اور پھر اسے جنگ کے کسی اگلے مورچے پر بھیج دیا گیا۔ جہاں اس کے جذبے کی گرمی نے اس کی بڑی مدد کی۔ اور اس نے دلیری کے کئی کارنامے انجام دیئے۔ جنگ ختم ہوتے ہی رندھاوا کو بھی دوسرے عارضی بھرتی کئے گئے فوجیوں کی طرح فوج سے نکال دیا گیا۔ لیکن اس کے ویر چکر نے اسے کئی چکر کرانے کے بعد بارڈر سیکورٹی فورس میں انسپکٹر بنا دیا۔ ان چکروں نے رندھاوا کے سارے جذبات ٹھنڈے کر دیئے تھے اور اب اسے اچھے بُرے کی پہچان ہو گئی تھی۔ اس نے بھارت ماتا کے اصل دشمن اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے تھے۔

—— اس نے دونوں جاسوسوں کا سر سے لیکر پاؤں تک جائزہ لیا، بارہ، تیرہ تیرہ سال کے کمسن لڑکے۔ گورے چٹے چہرے، چانٹے پڑنے سے اور بھی سرخ ہو گئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئیں چہرے پر انگلیوں کے نشان، دونوں سہمے ہوئے ایکدوسرے سے لگ کر بیٹھے ہوئے تھے۔

"کیوں بھئی لڑکو! تم کہاں سے آئے ہو؟" انسپکٹر رندھاوا نے ذرا رعب سے پوچھا۔

"ہم جناب کھلیاں سے آئے ہیں!"

"کھلیاں تو پاکستان میں ہے، تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟"

"پتنگ لوٹنے!"

"پتنگ لوٹنے؟"

"جی ہاں!"

"تو لوٹی پھر تم نے پتنگ؟" انسپکٹر رندھاوا نے جرح کی۔

"نہیں جی!"

"کیوں؟"

"پتنگ ہمارے ہاتھ نہیں آئی۔ وہ آم کے پیڑ کی ٹہنی سے جا اٹکی۔"

"پھر تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے؟ یہاں کیا کر رہے؟"

"صاحب! یہ بالکل جھوٹ بول رہے ہیں۔ بکواس کر رہے ہیں۔ انہوں نے پہلے یہ بیان دیا کہ یہ بیساکھی کا میلہ دیکھنے آئے تھے صاحب! یہ پکے جاسوس ہیں۔ ایسے کئی لڑکوں کو دشمن نے جاسوسی کی تربیت دیکر ہمارے ملک میں بھیجا ہے تاکہ ہم پر ایک اور حملہ کی تیاری کی جا سکے۔ یہ دشمن کی نئی چال ہے۔" حوالدار کرنیل سنگھ نے انسپکٹر رندھاوا کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"تم دونوں کا نام کیا ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"میرا نام محمد طفیل چیما ہے۔" نکر پہنے ہوئے لڑکے نے جواب دیا۔

"میرا پورا نام عبدالعزیز باجوا ہے لیکن مجھے سب جیجی کہتے ہیں۔" پتلون پہنے ہوئے نے جواب دیا۔

"تم دونوں کی عمر کیا ہے؟"

"میری عمر تیرہ سال ہے" طفیل نے جواب دیا۔

"ماں کہتی ہے کہ میں نے چودھویں سال میں پاؤں رکھا ہے۔" عزیز نے کہا۔

"تم آپس میں کیا لگتے ہو؟" (باقی صفحہ ۱۴۸)

(اے تو تیرا ذکر کسی کی زبان پر ...... ہوں غیر بھی تو چوم لوں مناسب بیان پر (راسخ مارہروی))

"جی! ہم دونوں خالہ زاد بھائی ہیں۔"
"رہتے کہاں ہو اور کیا کام کرتے ہو؟"
"میں گورنمنٹ ہائی اسکول ڈالو والی میں ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں، اور ہم رہتے بھی وہیں ہیں" طفیل نے جواب دیا۔

"میں بھی ساتویں جماعت میں پڑھتا ہوں اور اس سامنے والے گاؤں کھلیاں میں رہتا ہوں، آج کل ہماری چھٹیاں ہیں۔ اسی لئے طفیل مجھے ملنے آیا ہوا تھا"

"اچھا تو اب سچ سچ بتاؤ کہ تم یہاں کیا لینے آئے تھے؟ دیکھو اگر تم لوگوں نے سچ بتایا تو ہم تمہیں چھوڑ دیں گے۔ ورنہ تمہاری چمڑی ادھیڑ کر اس میں بھوسہ بھر دیں گے اور تمہارا گوشت چیلوں اور کوؤں کو کھلا دیں گے۔ سچ بتاؤ کہ تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟ تمہارے سپرد کیا کام کیا گیا تھا؟ یہاں تم کن کے پاس رہے ہو؟ تمہارے کتنے آدمی یہاں کام کر رہے ہیں؟" انسپکٹر رندھاوا نے ایک ہی سانس میں ڈھیر سارے سوال کر ڈالے۔ اس کی آنکھیں دونوں لڑکوں کے چہرے پر مرکوز تھیں ــــ سپاٹ چہرے، وہ دونوں کبھی ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور کبھی انسپکٹر کی طرف ــــ

"جناب! ہم بالکل سچ کہہ رہے ہیں" ججی نے روتے ہوئے کہا۔

"خدا پاک کی قسم! ہم یہاں پتنگ لوٹنے آئے تھے، بات یوں ہوئی کہ ہم دونوں چھت پر پتنگ اڑا رہے تھے۔ ایک کٹی ہوئی پتنگ کو دیکھتے ہی میں نے اپنی پتنگ کی ڈور چھوٹے بھائی نصیر کو دی اور خود پتنگ لوٹنے دوڑ پڑا۔ میرے پیچھے پیچھے طفیل بھی دوڑا اور ہم دونوں 'بوکاٹے' کہتے کہتے آپ کے گاؤں تک پہنچ گئے۔ دوری کتنا ہے بس گنتی کے یہ دو چار کھیت ہی تو پھلانگنے پڑتے ہیں" ججی نے ہاتھ سے راستہ ناپتے ہوئے کہا۔

"اور جب تمہیں پتہ چل گیا تھا کہ یہ ہمارا گاؤں ہے تو تم لوگ واپس کیوں نہیں لوٹ گئے؟" حوالدار کرنیل سنگھ نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ اس کی خوفناک صورت دیکھتے ہی طفیل بول پڑا۔

"نہیں جی! یہ سامنے کے گاؤں سے ڈھول بجنے کی آواز آ رہی تھی۔ ڈھول کی آواز سن کر ہم سے نہ رہا گیا۔ ہم دونوں تماشہ دیکھنے وہاں چلے گئے۔

وہاں جناب! ایک ڈھولیا، ڈھول بجا رہا تھا اور لوگ بھنگڑا ناچ رہے تھے۔ بہت ہی شور و غل تھا۔ کچھ لوگ دارو پی کر آوازے کس رہے تھے۔ ڈھول کی تال پر ہم دونوں بھی ناچ پڑے، ایک بوڑھا ناچتے ناچتے میرے پاس آیا۔ اس نے مجھے اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اور پھر ہم سبھی ناچتے گاتے، نواں شہر پہنچے میں اور ججی بھی۔ وہاں جب ایک بس پر سوار ہونے لگے تو ہمیں پتہ چلا کہ وہ جموں جا رہے تھے۔ نہر پر بیساکھی کا میلہ دیکھنے۔ ججی نے بھی مجھے میلہ دیکھنے کے لئے کہا۔

"جناب یہ تو مانتا ہی نہیں تھا لیکن جب میں نے اس سے کہا کہ ہم شام تک واپس لوٹ آئیں گے، تب اس نے بھی حامی بھری" عزیز نے طفیل کی بات کاٹتے ہوئے کہا ــــ

"میرے ابا اکثر کہا کرتے ہیں کہ جموں ......
نہر پر بیساکھی کا ایک بہت بڑا میلہ لگتا تھا، اور وہ دو آنے کرایہ خرچ کر کے ایک گھنٹے میں نہر پہنچ جایا کرتے تھے، سارا دن میلہ کی رونق دیکھ کر شام کو گھر واپس لوٹ آتے ــــ ہم بھی ایک بس میں بیٹھ گئے ــــ اور جناب! ہم نے وہاں بیساکھی کا میلہ دیکھا۔ جی بھر کے بھنگڑا ڈالا۔ گنے چوسے قلفی کھائی، میلہ دیکھنے کے بعد ہم نے ایک فلم بھی دیکھی"

"ہاں جی! جھوٹ بولے کوا کاٹے، کالے کوے سے ڈریو" طفیل جھٹ سے بیچ میں بول پڑا۔

"چپ کرو طفیل! یہ مونچھوں والا 'ظ' ظالم پھر مارے گا" عزیز نے طفیل کے چٹکی بھرتے ہوئے کانا پھوسی کی۔ اردو قاعدہ میں 'ظ' کے خانے میں ہے نا بالکل اسی سردار کی تصویر؟"

"ہاں ہاں! بالکل اسی کی تصویر ہے۔ جبھی تو اس ظالم نے ہمیں مارا" طفیل نے کرنیل سنگھ کو دیکھتے ہوئے گردن ہلائی۔

"لیکن جموں جانے کے لئے تمہارے پاس پیسہ کہاں سے آئے؟" انسپکٹر رندھاوا نے تفتیش جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

ججی کے پاس تو کوئی پیسہ نہیں تھا۔ پر میرے پاس دو روپے کا اپنا ایک نوٹ تھا۔ نواں شہر پہنچ کر میں جموں کی ٹکٹ لینے کے لئے وہ نوٹ ٹکٹ کلرک کو دینے ہی لگا تھا کہ ججی نے روک دیا اور کہا کہ یہاں پاکستانی نوٹ نہیں چلتے۔ میرے ابا نے حج سے میرے لئے ایک گھڑی لائی تھی ہم نے وہ گھڑی وہاں، ایک گھڑی ساز کو بیس روپے میں فروخت کی تب کہیں جا کر ہم جموں پہنچے ہم نے وہاں میلہ دیکھا فلم دیکھی اور پھر بس میں ہی بیٹھ کر واپس 'نواں شہر' پہنچ گئے۔ اور اس راستے سے واپس اپنے گاؤں کو جا رہے تھے کہ ان ظالموں نے ہمیں پکڑ لیا اور بہت پیٹا" طفیل نے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا اور رونے لگا۔

"انہوں نے ہمیں چھوٹا دیکھ کر مارا ہے۔ اگر میرے ابا کو پتہ چل جائے تو وہ ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔ بڑے پہلوان بنے پھرتے ہیں" عزیز نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ــــ تیرے ابے کو کھائیں سور ــ حرامی۔ ابے کا رعب دکھاتے ہو، تیرے ابے کی ماں کی ..... صاحب یہ کتے جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بالکل یقین نہ کریں۔ گورو مہاراج نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی مسلا تیل والا بازو تلوں کی بوری میں ڈال دے اور پھر اتنی ہی قسمیں کھائے کہ جتنے تل اس کے بازو پر لگے ہوں، تب بھی اس کی بات کا یقین نہ کرو۔ صاحب! یہ پکے جاسوس ہیں انہیں ہیڈ کوارٹر بھیجنا چاہئے۔ خود انٹروگیشن سنٹر والے سب کچھ اگلوا لیں گے" حوالدار کرنیل سنگھ انسپکٹر رندھاوا کو مشورہ دے رہا تھا۔

انسپکٹر نے دونوں لڑکوں کو چپ کرایا اور کرنیل سنگھ کو گھورتے ہوئے پوچھا۔
"کس گورو صاحب نے، یہ تلوں والی بات کہی تھی؟"

"یہ تو میں نہیں جانتا صاحب، پر یہ بات ہے بالکل سچ ہمیں گرنتھی جی نے بتائی تھی۔ اور وہ کوئی جھوٹ تھوڑی بولیں گے"

"ایسی غلط باتیں پھیلاتے ہوئے تم لوگوں کو شرم آنی چاہئے" انسپکٹر رندھاوا نے کرنیل سنگھ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔ اور جیپ منگوانے کا حکم دیا۔ وہ یہ کیس ہیڈ کوارٹر بھیجنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لینا چاہتا تھا۔

ــــ جیپ 'نواں شہر' کی طرف دوڑ رہی تھی۔ اور ..... عزیز اور طفیل کی نظریں اپنے گاؤں کی طرف ــــ ہموار راستہ ــــ لیکن کتنا پرپیچ ــــ ہمالے سے بھی مشکل ــــ نظریں دیکھتی رہیں۔ فاصلہ بڑھتا گیا ــــ اور جیپ لکشمی واچ ہاؤس کے سامنے رک گئی۔

کیا ہے فانی کر رہا تھا عالم فانی کی سیر
آگے آگے بے خودی تھی پیچھے پیچھے ہوش تھا (فانی)

مٹی کی ناک

مشرف عالم ذوقی
مہادیوا روڈ آرہ ۔ ۸۰۲۳۰۱

ہمیشہ کی طرح اس نے اپنا میلا چیتا گچھا کاندھے سے اتارا اور گمتی والے دکان سے سٹے بچھا لیا سات بج گئے تھے ۔ ہلکی ہلکی دھوپ چاروں طرف پھیل گئی تھی گمتی والی دکان پر پان چباتے ہوئے لونڈے چھوکروں کی باڑھ آگئی تھی ۔ چندو شاہ کے ہاتھ حرکت میں آگئے تھے ۔ وہ پان بھی تیا تا جا رہا تھا ساتھ ہی باتیں بھی بناتا جا رہا تھا ۔ دکان کے پاس کھڑے چھوکرے آتی جاتی لڑکیوں کو دیکھتے اور ایک دوگندے فقرے ہوا میں اچھال کر ہی ہی ہی ہی کرنے لگتے ۔ پھر عجیب سا چہرا مہرہ بنا کر چندو شاہ سے مخاطب ہوتے ... بیٹے چندو ... ایک بڑھیا مسلے دار پان لگانا ۔ لونگ الائچی سمیت ... ہی ہی ... ہی ہی ...

ان سب باتوں سے بے نیاز وہ اپنے گھٹنے موڑ لیتا ۔ اور ہاتھ کو ہوا میں اٹھا کر زور زور سے چلانے لگتا ... مائی باپ ... دس پیسے کا سوال ہے مائی باپ ... بھوکا ہوں ... کل سے کچھ نہیں کھایا ۔ ... مائی باپ ......

دکان پر کھڑے لونڈے چھوکرے اس کی چلاہٹ سن کر عجیب سا منہ بناتے ۔ ناک سکوڑتے اور اپنی ترچھی غصیلی نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے کہتے " سالے چپ ۔ بک بک کرتا ہے جب دیکھو ۔ چین سے بیٹھنے نہیں دیتا ۔

وہ خاموشی سے ان سڑک چھاپ لونڈوں کی باتیں سنتا ۔ اور سنی ان سنی کرتے ہوئے پھر اپنے پرانے کلمہ دہرانے لگتا ۔ سڑک پر آمد و رفت میں لمحہ لمحہ اضافہ ہوتا جاتا اور لمحہ لمحہ اس کی آواز تیز ہوتی جاتی ۔

یہ جگہ اسے بہت پسند تھی ۔ اس سے قبل وہ بس اسٹینڈ کے پاس گچھا بچھا کر بھیک مانگتا تھا ۔ مگر وہاں مشکل سے دن رات کی کمائی ایک روپیہ ہو پاتی ۔ بس آتی تو لوگوں کا اژدہام بس کی طرف دوڑ پڑتا ۔ ایسے میں بھلا اسے کون بھیک دیتا ! ۔ شدید دھوپ میں پسینہ پوچھتے ہوئے ، بس کا انتظار کرتے ہوئے لونڈے ، چھوکرے میم یا صاب کے پاس اپنی خالی کھولی ڈولیا گھماتا بھی تو نفرت کا زہر اگلتی ہوئی ایک حقارت بھری آواز ابل پڑتی ... ہٹ بے ... ہٹ سالا ... چلے آتے ہیں سالے بھیک مانگنے ... ایک ایسے ہی اپنی جان نکل رہی ہے ...

یہ اس کے شروع کا دور تھا ۔ اس وقت وہ بھیک مانگنے کے فن سے شاید بالکل ہی ناواقف تھا ۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بھیک کب کن وقتوں میں اور کیسے لوگوں سے مانگنی چاہیئے ۔ یہ بڑا صبر آزما دور تھا ۔ بھیک کم ملتی تھی اور لات زیادہ ۔ انہیں دنوں اسکی ملاقات " گھر کی رام " سے ہوئی ۔ اللہ جانے اس کا نام کیا تھا ۔ مگر اس کی ٹولی والے اس کی بڑی عزت کیا کرتے تھے ۔ وہ راہ چلتے ہوئے مسافروں کو اپدیش دیتا تھا انہیں دھرم کی راہ اختیار کرنے کو کہتا ۔ دھرم کا راستہ ہی سورگ کا راستہ ہے ۔ وہ آنکھیں موندیں بتاتا ۔ لوگ باگ ٹھہر ٹھہر کر سننے لگتے ۔ اور اس کے پھیلے گچھے میں سکوں کی باڑھ آجاتی وہ بھیک مانگنے کی اس کلا سے واقف نہیں تھا ۔ لوگ پیسے اکٹھے کرنے کے لیے کیسے کیسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں ۔ ان سب باتوں کی جانکاری اسے ذرا بھی نہیں تھی ۔ وہ کوئی پیدائشی بھکاری تو تھا نہیں کہ بچپن سے ہی سب کچھ دیکھتا اور سمجھ جاتا ۔

بچپن کی ہلکی ہلکی منہدم سی یادیں اس کے ذہن میں اب بھی محفوظ تھیں جس وقت اس نے ہوش سنبھالا ، اس وقت اس کا دنیا میں کوئی نہ تھا ۔ تب سے فٹ پاتھ ہی سب کچھ تھا ۔ ماں باپ بھائی بہن ، دوست ، محب وغیرہ سب کچھ ۔ انہی دنوں وہ ایک ہوٹل میں برتن مانجھنے کا کام سیکھنے لگا تھا ۔ اس کام میں محنت تو بڑی پڑتی تھی مگر کھانا اچھا مل جاتا تھا ۔ کبھی کبھار خوش ہو کر ہوٹل مالک کچھ پیسے بھی تھما دیتا ۔ ہوٹل میں برتن مانجھنے والے اس کی طرح ہی کئی لڑکے تھے ۔ چھٹی کے وقت وہ عجیب عجیب باتیں کرتے ... فلم کی ، سنیما کی ، ہیرو ہیروئنوں کی ۔ وہ سنتا اور اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا ۔ پورے ایک روپے چھپن پیسے لگتے ہیں فلم کے ۔ اس کے دوست شاہانہ شان سے کہتے ۔ اور لمحہ لمحہ وہ اداسی کے بھنور میں ڈوبتا جاتا ۔ فلم دیکھنے کا خیال جب شدت سے زور پکڑ گیا تو ایک دن اس سے رہا نہ گیا ۔ اور مالک کے بکس سے اس نے کچھ پیسے چوری کر لیے ۔ اور نائٹ شو اپنے سارے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے چلا گیا ۔

اور یہیں سے اس کی گراوٹ بھری زندگی کی شروعات ہو گئی تھی ۔ وہاں سے لوٹنے تک مالک کو اس کی چوری کا پتہ چل چکا تھا ۔ اور پھر اس پر لات جوتوں اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی ۔ وہ دکان سے باہر نکال دیا گیا ۔ پہلی بار زندگی میں اس نے عجیب سی تنہائی محسوس کی ایک عجیب سے اکیلے پن کا احساس جاگا ۔ پیٹ کی بھوک اور ذہن پر بیتر چلی آندھی نے اسے ہاتھ پھیلانے

پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر بارہ تیرہ سال کی ہوگی۔ دکان سے در بدر ہونے کے بعد جو مسئلہ عظیم اس کے سامنے تھا وہ تھا کھانے کا۔ مالک پیسہ نہ دیتا تھا۔ نہ سہی مگر کھانا تو اچھا دیتا تھا۔ اس کی بھوک تو مٹ جاتی تھی۔ مگر کھانے کا مسئلہ اب چوہے کی طرح پیٹ میں دوڑ دھوپ مچانے لگا تھا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ سورج نے پورا دہانہ کھول رکھا تھا۔ اور اس تیز جلا دینے والی دھوپ میں وہ ننگے پاؤں نکل کھڑا ہوا۔ اسکول گیٹ کے پاس بہت سے بھکاری بچے کھڑے ہوئے تھے۔ جو چاٹ، آئس کریم کھاتے ہوئے بچوں کی طرف للچائی نظریں پھیر رہے تھے۔ بڑی دیر تک وہ یہ سب دیکھتا رہا۔ اس بیچ اپنے اندر اپنی گراوٹ کی ہمت ٹٹولتا رہا۔ اس کے قدم معطل ہو گئے تھے۔ چہرہ بھوک اور گرمی سے نڈھال ہو گیا تھا۔ انہی دنوں پہلی بار اس نے سیکھا۔ بھیک کے معاملے میں یہ بچے بڑے سخی ہوتے ہیں۔ ہاتھ پھیلاؤ تو بلا تامل دس پیسے کا سکہ ہتھیلیوں پر جگمگا اٹھے گا۔

اس کے ہاتھوں پر بھی دس اور پانچ کے کئی سکے جگمگا اٹھے۔ مگر آگے روز تک پھیلے ہوئے راستے اتنے سکڑے تھے جہاں اس کی پہنچ نہیں تھی۔

پھر رفتہ رفتہ اس کی ہمت بندھنے لگی۔ راہ چلتے بابوؤں کو ٹوک کر کہتا۔۔۔ "بابو جی! ایک پیسہ صبح سے بھوکا ہوں۔۔۔" بابو ایک ترچھی غصیلی نگاہ اس پر ڈالتا اور خاموشی سے آگے بڑھ جاتا۔ "مائی ایک پیسہ۔۔۔؟۔۔۔" مائی اس کے جوان شریر کو تکتی اور اپدیش سناتی ہوئی آگے بڑھ جاتی۔ اور دوکاندار تو اس معاملے میں "ہٹلر کی اولاد" کی ثابت ہوئے تھے۔ یہ انہی دنوں کی بات ہے جب اس نے نیا نیا یہ پیشہ اپنایا تھا۔ اور اچانک ایک دن اس کی ملاقات گھورکی رام سے ہوئی تھی۔ جو کلکٹریٹ کے پاس اپنا گدا بچھائے، گوتم بدھ کے اسٹائل میں آسن جمائے، ایک خاص رعب سے مذہب کا اپدیش جھاڑا کرتا تھا۔ اس پاس کے لوگ، آفس کے کرمچاری، کچھ دیہاتی، عورتیں، بوڑھے۔ ادھیڑ سوکھے ہوئے چہرے خوشی سے ٹھٹک جاتے اور بغور گھورکی رام کی باتیں سننے لگتے۔

"بابا بہت مہان پرش ہیں۔"

"بابا کتنا سچ کہتے ہیں۔۔؟"

"ہم دھرم سے کتنے اگیان ہیں۔ بابا تم سچ مچ مہان ہو۔"

جتنی دیر وہ وہاں کھڑا رہا، اتنی دیر تک وہ بابا کے بارے میں ایسی ہی باتیں سنتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے کان پک گئے۔ بابا کے پھیلے ہوئے میلے چکٹے گدے میں دس، پانچ، پچیس تک کے سکوں کی باڑھ آگئی تھی۔ وہ اپنی حیران کن آنکھیں گھورکی رام کے چہرے پر پھیراتا رہا۔ بابا اتنا کچھ کیسے کر لیتا ہے۔ بابا نے یہ سب کہاں سے سیکھا۔۔۔ کاش بابا اسے بھی سکھا سکتا۔۔۔"

رات کے وقت جب کلکٹریٹ میں موت جیسا سناٹا حاوی ہو جاتا تو بابا نہیں خاموشی کے ساتھ گدے میں اکٹھے پیسے کو سمیٹتا۔ پھر اس کی طرح ہی چھ کردوں میں یہ پیسے تقسیم کر دیتا۔ وہ کئی دنوں تک چھپ چھپ کر یہ انوکھا سا کھیل دیکھتا رہا جب اس کے برداشت کی حد ختم ہو گئی تو ایک دن خاموشی سے وہ گھورکی بابا کے پاس آیا اور ان کے چرنوں میں گر پڑا "کچھ ہمیں بھی سکھاؤ بابا"۔

بابا نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھا۔ اور اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔

"میں بابا نہیں گھورکی رام ہوں۔ تمہاری طرح ہی ایک آدمی۔"

"مگر بابا۔۔۔" اس کے ہونٹ کانپے۔۔۔"

"سمجھ گیا۔۔۔" بابا ہنسے۔۔۔ "تمہاری ساری پریشانی، سارے دکھ میں سمجھ گیا۔ کل سے تم آجانا"

گھورکی رام دیر تک سمجھاتا رہا۔ وہ کھلی کھلی آنکھوں سے اس کے چہرے کو نہارتا رہا۔ گھورکی رام نے پہلا اپدیش دیا۔ کبھی بھی اپنے اس کام کو گرا ہوا مت سمجھو۔ دوسرا اپدیش تھا۔ کوئی دے چاہے نہ دے پر غصے میں کبھی مت آؤ۔ غصہ بھکاری کی موت ہے۔۔۔"

گھورکی رام بتاتا گیا اور وہ اثبات میں سر ہلاتا گیا۔

آج اپنے اس عظیم پیشے کی عظمت کا اسے سچے دل سے احساس ہوا تھا۔

بابا کے پاس سے ہو کر سب سے پہلے وہ اسٹیشن گیا۔ اور گاڑی کا انتظار کرتی ہوئی ایک مسلم عورت کے پاس جا کر ٹھہر گیا۔ سامانوں کے قریب اس کا چھوٹا سا لڑکا شرارتی انداز میں ادھم مچائے تھا۔

چند لمحوں تک وہ سوچتا رہا۔ پھر آگے بڑھ کر بولا "اللہ آپ کے بچے کی عمر دراز کرے، دس پیسے کا سوال ہے مائی باپ۔"

عورت نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے لخت جگر کی طرف جس کی آنکھوں میں میٹھے میٹھے خواب اور ہلکے ہلکے سوال تیر رہے تھے۔ آہستگی سے اس نے پرس کھولا اور ایک دس کا سکہ اس کی طرف بڑھا دیا۔ دوسرے ہی پل اس نے بچے کو آگے بڑھ کر چوم لیا۔

اس کے مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اس پیشے میں مسکراہٹ بڑی چیز ہے۔ بھوکے رہو تو بھی مسکراؤ۔ پیٹ کی آنتیں قل ہو اللہ احد پڑھیں تو بھی جبراً مسکراؤ ورنہ خالی خولی ٹلا لیا گھماؤ۔ اس کی باچھیں کھل گئی تھیں دل ہی دل میں اس نے جے گھورکی بابا کا نعرہ بلند کیا اور آگے بڑھ گیا۔

گھورکی رام نے اسے جینے کا فن تو سکھا دیا تھا۔ مگر اس طرح دوڑنے دھوپنے میں مشکل بہت تھی۔ صبح سویرے اسٹیشن۔۔۔ وہاں سے بس اسٹینڈ۔۔۔ پھر دوپہر میں ٹفن کے ٹائم اکلب پھر چرچ۔۔۔ وہاں سے دیوی استھان۔۔۔ رات کے وقت جب فٹ پاتھ کے نرم نیچ لبستہ بستر پہ لیٹتا تو اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا ہوتا۔ جلد ہی اسے نیند آجاتی۔ دوسرے روز کی یہی مشغولیت اس کے سارے جسم میں ایک عجیب سی کراہیت بھر دیتی مگر جینے کے دوسرے سامان اس کے پاس اور کہاں سے آتے۔۔۔ اور یہی بات ایسی تھی جہاں وہ مکمل طور پر ہار جاتا تھا۔

جس دن چوک پر گپتی کی دکان سے سٹے فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوا اس کا اپاہج دوست کنگرو مرا۔ اس کے دوسرے دن سے ہی اس نے وہ جگہ ہتھیانے کی سوچ لی۔ جب تک کنگرو زندہ رہا۔ وہ جگہ اس کی جاگیر رہی۔ اب جب کنگرو نہیں رہا تو کیوں نہ اس جگہ کو وہ اپنی جاگیر بنا لے؟ جگہ تھی بھی بہت اچھی۔ لوگوں کی چہل پہل صبح چار بجے سے رات کے ایک بجے تک جاری رہتا۔

ایک تو چوک - دوسرے سٹا ہوا اپھیلا کالج ....
سینما ہال ... بچوں کا اسکول ... مارکیٹ
سب کچھ آس پاس .... پھر بھلا اس سے اچھی جگہ
دوسری کہاں ہوتی ... ؟ پہلے بھی وہ دیکھتا تھا کنگرو یہیں
لیٹا رہتا تھا ۔ اور آس پاس سے گذرتے ہوئے
لوگ اس کے پھیلے ہوئے کپڑے میں دو پانچ کے سکے
ڈالتے جاتے ۔ اس نے سوچ لیا تھا ۔ وہ بھی بس کل
سے ایسے ہی بیٹھ جائے گا ۔

دوسرے دن وہ بھور سے ہی یہاں پہنچ گیا
تھا ۔ پھر گمٹی والی دکان سے لگے اپنے کپڑا بچھا دیا ۔
اور کنگرو کی طرح ہی پیر پھیلا کر لیٹ گیا ۔ سات بجے
کے قریب گمٹی والا مالک آیا ۔ اور اس کی طرف
ایک ترچھی غصیلی نظر ڈالتا ہوا بولا ... سالا ...
ایک مرا دوسرا جنم لیا ۔ سالا میری کمائی میں دخل
ڈالتا ۔ سالا حرامی کا بچہ .... بھچٹ سالا یہاں سے
.... ۔

اس نے گنا ۔ گمٹی کی دوکان والے اس مالک
نے چار جملوں میں اسے چار بار سالا بنایا تھا ۔
اس کی بڑی بڑی خونیں آنکھیں اس کے سارے جسم
میں دھنس گئی تھیں ۔ اور اس کی زبان کی تیز
کڑواہٹ سے اس کا سارا ذہن لہولہان ہو گیا
تھا ۔ مگر فوراً ہی اسے گھورکی رام کا اپدیش یاد آیا
'کبھی غصہ میں مت آنا ۔ غصہ بھکاری کی موت
ہے "۔

اس نے چہرے پر جبراً مسکراہٹ پیدا کی ۔
پھر بولا "کیوں خفا ہوتا ہے بابا ۔ آخر بیٹھنے میں
حرج ہی کیا ہے ۔ کوئی تیرا کھاتا تو نہیں "۔

'ایک تھپڑ ماروں ۔ سالا چندو شاہ سے منہ
لڑاتا ہے '۔

وہ آدمی غصہ میں مرنے مارنے پر تل گیا تھا ۔
اس نے ایک سہما سا احتجاج کیا ۔ ' پر بابا کنگرو
بھی تو ....

آدھے جملے میں ہی وہ آدمی ابل پڑا تھا ۔ اس
کو کوڑھ تھا ۔ لاکھ بار بولا پر وہ نہیں مانا ۔ تو ہم کیا
کرتا ۔ سالے کے جسم میں ہاتھ لگاتا ؟ اتنا کہہ کر بیچ
سے اس نے فٹ پاتھ کی نالی کے پاس ایک تیز بلغمی
کھکھار پھینکا ... اس بیچ اس کی دکان کے پاس
ایک دو لونڈے جمع کرکے جٹنے لگے تھے ۔
" پان لگاؤ شاہ '

'آج بڑی دیر کردی شاہ '
'لانگ الائچی ملا کر بڑھیا مسالے دار پان
بناؤ شاہ '۔

بکری کا وقت ہونے کے پہلے وہ شخص جلدی
جلدی دکان کھولنے لگا ۔ پھر ایک نفرت بھری نگاہ
اس کی طرف ڈالتے ہوئے بولا " ٹھیک ہے سالے ۔
آج بیٹھ جا ۔ کل سے بیٹھا نا ! ٹانگ توڑ دوں
گا ۔ سمجھے '۔

وہ سہم گیا تھا ۔ اور ڈر سے سہمے سے
وجود کے ساتھ آوازیں لگانے لگا تھا ۔ سڑک پہ
چہل پہل شروع ہو گئی تھی ۔ اور اس کے پھیلے کپڑے پر
آتے جاتے لوگ پیسوں کی بارشیں کرنے لگے
تھے ۔ رات میں جب اس کے کپڑے میں سمٹے پیسے
گنے تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ سات روپے
.... کچھ پیسے ۔ اس کا مطلب ، کنگرو بڑی شان
سے رہتا ہوگا ۔ اس نے خوش خوش چادر سمیٹی ۔
پیسے جیب کے حوالے کئے ۔ اور یہ سوچتا ہوا ،
کھانے پینے اور سونے کے خیال سے آگے بڑھ گیا
کہ چاہے جو ہو جائے ۔ کل سے وہ ڈیرا اڈا لے گا ۔
تو یہیں ۔ اسی جگہ ــــ

دوسرے دن بھی ہلکی ہلکی ڈانٹ ڈپٹ کے
بعد اس نے اسی جگہ اڈہ جما لیا تھا ۔ آج چندو شاہ
نے اس پہ ہاتھ بھی اٹھا دیا تھا ۔ پھر کہا تھا ــــ
'تم جادے نسے جادے چالیس کا ہوگا ہاتھ
گو رسب سلامت ۔ سالا تم کما نہیں سکتا "۔

نفرت کے زہر جیسی کوئی شئے اس کے حلق سے
پار اتری ۔ اور چندو شاہ کا یہ جملہ تیر کی طرح اس کے
جسم میں پیوست ہو گیا تھا ۔ اب یہاں اڈہ جمانا
اس کے روز کا معمول بن گیا تھا ۔ چندو شاہ سے
روز تھوڑی بہت بگڑی بگاڑ ہو جاتی ۔ کبھی کبھی ایک آدھ
ڈنڈے ٹریفک پولیس سے بھی کھانے کو مل جاتے
مگر گھورکی رام کا اپدیش اسے فوراً یاد آ جاتا ۔
'کبھی غصہ میں مت آنا ' ۔ غصہ بھکاری کی
موت ہے "۔ اور اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے
گھورکی رام نے اپنے بال یوں ہی دھوپ میں
سفید نہیں کئے ہوں ۔ بلکہ یہ تو اس کے اپنے
تجربات ہیں ۔ انہی تجربات کی بھٹی میں تپ کر اس
کا جسم کندن بنا تھا ۔ اور انہی سب باتوں کو سیکر
گھورکی رام کے لیے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ

بنتا گیا تھا ۔
مگر اچانک اس دن چندو شاہ کے اپدیش
نے اسے ذہنی طور پر کمزور کر دیا تھا ۔ اس کی
ہمت توڑ دی تھی ۔ اور آواز کا زخم پھوڑوں کی طرح
اس کے جسم میں پھٹنے لگا تھا ۔ اور اسے ایسا لگنے
لگتا ــــ جیسے چندو شاہ ٹھیک کہتا ہو اس
پیشے میں سب کچھ ہے مگر عزت نہیں ہے ۔ جس کے
آگے سر جھکاؤ تو لگتا ہے ایک پل میں ساری عزت
چلی گئی ہو اور اسے ایسے موقعوں پر گھورکی رام
کی بات یاد آ جاتی ۔ ' ہمارے پیشے میں عزت کو کوئی
استھان نہیں ہے ' ۔ اور گھورکی رام کی یہ بات
اسے بہت مضحکہ آمیز لگی ۔ آخر عزت بھی کوئی چیز
ہے ۔ ایسی زندگی کس کام کی جس میں عزت نہ ہو ۔

اور پھر دوسرے دن ایک عجیب سا واقعہ ہو
گیا ۔ اس دن شام کے وقت پہلے بٹور کر وہ اسٹیشن
کے پاس سے گزر رہا تھا ۔ اس دن 'مندا ' تھا ۔
اس لئے جلدی ہی وہ اٹھ گیا تھا ۔ بجلی کے کھمبوں اور
مکانوں میں ٹمٹماتے ہوئے نیلے پیلے بلبوں کی
روشنی پھیل گئی تھی ۔ اس نے اپنی ششدر
آنکھوں سے دیکھا ۔ پلیٹ فارم کے ایک کونے
میں ایک اندھا شخص کپڑا بچھائے 'لیمن چوس '
بیچ رہا تھا ۔ لوگ باگ ٹھہر کر اس سے 'لیمن چوس '
خریدتے ہیں ۔ اور اس کے ذریعے بتائے گئے پیسے
اس کے ہاتھ میں تھما دیتے ہیں ۔ اس کے ذہن میں
ایک عجیب سا دھماکہ ہوتا ہے ۔ حقیقت بھرے سچ
کی تلخی اس کے سارے جسم میں سرایت کر جاتی
ہے ۔ اسے تعجب ہوا ۔ کوئی ایسا بھی تو ہو سکتا
ہے جو اسے پیسہ نہ دیں ۔ یا دے تو کم دے ۔
سوالوں کی تہہ اس کے ذہن پہ مرتب ہونے لگی
تھی ۔ اور انہی سوالوں کے دائرے میں قید چھٹپٹاتا
ہوا وہ خاموش قدموں سے اس اندھے شخص کے
پاس آیا ۔ اس کے ہاتھوں میں دس کا گھسا ہوا سکہ دبا
تھا ۔

'دس کا لیمن چوس دو بابا '۔
بابا نے خاموشی سے دس کے سکے کو پکڑا
پھر آہستگی سے بولے ۔ ' پانچ اٹھا لو ' ۔
'ذہن پہ سائیں سائیں کرتی ہوئی آندھی کو
دبائے اس نے پانچ 'لیمن چوس ' اٹھا لیے بہت
دیر تک خود میں بہت جھومتا رہا ۔ پھر جب اس سے

رہا نہ گیا تو پوچھ بیٹھا۔
'بابا! تم اندھے ہو کر بھیک نہیں مانگتے۔ کیا تمہیں یقین ہے تم جتنا کھوگے، لوگ تمہیں اتنا ہی دیں گے یا جتنا لیمن چوس کھوگے۔ لوگ اتنا ہی اٹھائیں گے؟'
'یہ تو اپنے اپنے ایمان اور اعتقاد کی بات ہے۔'
وہ شخص پھر لیمن چوس بیچنے میں لگ گیا تھا۔ اور اس کے ذہن میں ایک عجیب سی بجلی کوندا اٹھی تھی اس کے سامنے دو باباؤں کی تدریج ننگی ہو کر کھل گئی تھی۔ ایک یہ بابا تھے اور دوسرا وہ گھور کی بابا۔ وہ سوچ رہا تھا — دونوں میں کون بڑا ہے؟... کون عظیم ...؟

دوسرے روز خلاف معمول چندو شاہ کی آنکھیں حیرت و خوشی سے اُبل آئی تھیں۔ وہیں اس کی گمتی سے سٹے وہ بھک منگا اپنا گمچھا بچھائے تھا جس پہ ایک ڈبے میں لیمن چوس بھرا ہوا تھا۔ اور وہ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا...' دس پیسے میں پانچ پانچ پیسے میں دو.... لیتے جاؤ بابو... دس میں پانچ...... پانچ میں دو.....

چندو شاہ نے پایا۔ آج اس کے چہرے پر ایک عجیب سی رونق، آنکھوں میں خوبصورت چمک اور ماتھے پر روشن آبھا آگئی ہو۔ جیسے ہی دونوں کی آنکھیں ٹکرائیں، خلاف معمول بھک منگے کی آنکھوں میں فخر و غرور کا جذبہ آگیا تھا۔

— — —

بقیہ:— سُرنگ....

پڑھاتے ایک زناٹے دار طمانچہ میرے گالوں پہ لگ چکا تھا۔ اور آنکھوں کے سامنے چھائے اندھیروں میں کتاب کے حروف مٹ گئے تھے۔ اور میں کتاب چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا تھا۔ ان کی ڈانٹ میرا تعاقب کرتی رہی۔ میں بھاگا بھاگا سیدھے بازار پہنچ گیا۔ چہرہ سرخ اور آنکھیں سوجھی ہوئی۔ عالمگیر چچا نے مجھے دیکھا اور معاملہ سمجھ گئے۔ انہوں نے مجھے مٹھائی کھلائی اور ہاتھ پکڑ کر گھر پہنچا دیا۔ اب تک کلکٹیا ابا کا غصہ ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ انوکھی مسکراہٹ کے درمیان مجھے دیکھتے رہے۔ ان کی پُرتپاک شخصیت — ہائے ہائے

آوازوں کی بھیڑ میں چند مانوس آوازیں۔ چٹان کی تہہ کا کوتاہ راستہ مجھ پہ بھاری ہونے لگا۔ میں نے جھٹ مڑ کر پیچھے کی طرف امداد طلب نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا کہ شاید کوئی مانوس چہرہ نظر آجائے اور مجھے اس جان لیوا راستے میں سمانے سے بچا لے مگر دور دور تک صرف سایوں کی بھیڑ تھی اور کسی بھی چہرے کے خدوخال نمایاں نہیں تھے۔ میں نے زور زور سے امینہ کو پکارنا چاہا، نشاط کو پکارنا چاہا مگر میری زبان گنگ ہو چکی تھی اور آواز حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ میرا سارا وجود اپنی بے زبانی پہ لرز رہا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر بھاگ جانا چاہا مگر میرے قدم میرا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا میرے قدموں کی ساری طاقت سلب کر لی گئی ہو اور میرے پیر بے جان ہو گئے تھے۔

اب تک تیز آندھیوں کا دور شروع ہو چکا تھا اور ہوائیں سائیں سائیں چلنے لگی تھیں۔ جدھر سے لوگوں کا ہجوم آرہا تھا اس طرف سے زوردار ہوائیں چلنے لگی تھیں۔ اور ان ہواؤں کے بہاؤ میں سائے پانی کی طرح بہہ بہہ کر چٹان کی تہہ والے راستے میں سمانے لگے تھے۔ صرف تیز ہواؤں کی زناٹے دار آواز ساری فضا پہ چھائی ہوئی تھی۔ ورنہ سایوں کی کوئی آواز نہ تھی۔ سائے بڑی آسانی سے چٹان میں گم ہوئے جا رہے تھے۔ اب ہواؤں کے زور نے مجھے بھی چٹان کی تہہ کی طرف بہانا چاہا۔ میں نے بڑی بے بسی کے عالم میں ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا شاید کوئی عزیز آجائے اور مجھے اس چٹان کی تہہ میں گم ہونے سے بچا لے۔ مگر پیچھے تو کوئی بھی نہیں تھا۔ دور دور تک صرف سائے ہی سائے تھے [illegible] بڑی حسرت بھری [illegible] سے دیکھتا رہا..... دفعتاً چند انسانی پیکر میری طرف دوڑتے ہوئے نظر آئے۔ ان کے خدوخال ابھی تک نمایاں نہیں ہوئے تھے۔ ہواؤں کا زور اور بڑھ گیا تھا۔ وہ پیکر میری طرف دوڑتے رہے آخر وہ قریب آگئے۔ میں نے بغور دیکھا۔ میری بیوی بیٹے اور بیٹیاں تھیں۔ وہ سب کے سب زور زور سے چلا رہے تھے — لوٹ آیئے — رک جایئے رک جایئے —، ہوائیں مجھے دھکیل کر چٹان کی طرف لئے جا رہی تھیں۔ میرے قدم کسی ایک مقام پر جم نہیں پا رہے تھے اور میں کچھ بول بھی نہیں پا رہا تھا۔ ان کی آوازیں میں صاف سن رہا تھا۔ وہ سب کے سب رو رو کر مجھے روک رہے تھے۔ ان کی آوازوں میں کتنی بے بسی تھی۔ کتنی حسرت تھی۔ میرا جی چاہ رہا تھا اپنا ہاتھ انہیں پکڑا دوں تاکہ وہ مجھے روک لیں۔ مگر وہ سب میری رسائی سے دور تھے۔ اب میں چٹان کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا میں چٹان کی تہہ کے کوتاہ راستے میں توڑ پھوڑ کر سما جاؤں گا۔ سرنگ کی تاریکی، گھٹن اور کوتاہی کا مجھے خیال آیا اور مجھ پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میری آنکھیں اشکبار ہو اٹھیں۔ میں نے الوداعی نگاہ اپنی بیوی اور بچوں کی طرف اٹھائی۔ جو مجھ سے دور کھڑے زار و قطار رو رہے تھے، آہ و فغاں کر رہے تھے مگر میں نہایت بے بسی کے عالم میں ہواؤں کی زد پر تھا اور لمحہ بہ لمحہ سرنگ کے قریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ ایک زوردار ہوا کا جھونکا آیا اور میرے قدم اکھڑ گئے میں سر کے بل گر پڑا۔ میرا سر چٹان کی تہہ میں پھنس گیا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا اور دل بری طرح گھبرانے لگا۔ اتنا دل گھبرایا کہ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا اور دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ میں اپنے بستر پہ پڑا چاروں طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ کمرہ میں دبیز اندھیرا تھا۔ میں نے جلدی سے اٹھ کر لائٹ کا سوئچ آن کیا مگر بجلی غائب تھی۔ مجھے محسوس ہوا میں ابھی تک اسی اندھیری سرنگ میں محصور ہوں۔ جہاں چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی، گھٹن ہی گھٹن ہے اور جیسے جیسے دم گھٹ رہا ہو [illegible] ہوں ●

افسانہ:

"وائرس"

خورشید احمد مگی ۔ خان پور ۔ پاکستان

9630 دنوں کی پیہم، اور شبانہ روز عرق ریزی کے بعد کہیں جا کر میں "آزاد خیالی" کے موضوع پر اتنا بڑا تھیسس لکھنے کے قابل ہوا۔ اس موضوع پر اور دانشوروں نے بھی خوب خوب قلم چلائے مگر میں نے سالوں اور مہینوں کے تجربات، مشاہدات اور محسوسات کی روشنی میں جب یہ تھیسس لکھا تو نہ صرف مجھے ڈپلوما دیا گیا بلکہ گولڈ میڈل سے بھی نوازا گیا اور ایک سرٹیفکیٹ مرحمت کیا گیا جسے پاس رکھتے ہوئے میں ریاست کی شمالی سرحد سے جنوبی سرحد تک اور مشرقی سرحد سے مغربی سرحد تک خوب خوب آوارگی کر سکتا تھا۔ اس سرٹیفکیٹ کے پاکٹ میں ہوتے ہوئے مرے اس عمل میں کوئی روک ٹوک ڈالنے والا نہیں تھا ۔ اگر ہوتا تو وہ یہ سرٹیفکیٹ دیکھنے کے فوراً ہی بعد اپنی اس حیثیت سے دستبردار ہونے پر مجبور ہو جاتا۔

یہ ریاست کا قانون تھا کہ ۔ اس میں آزاد خیالی اور آوارگی جیسی سہولیات بظاہر حاصل تھیں، اور بہت نمایاں طور طریقہ سے ــ لیکن ان سہولیات کے استعمال کے لئے ضروری تھا کہ مستعمل ان آرٹیکلز کی معنویت اور مقصدیت سے بہرہ ور ہو اور میں ــ میں تو ان میں نقطی مفاہیم و معانی تلاش کرتے تھے اور ان کے اظہار میں ایسی صناعی و کاریگری کا مظاہرہ کیا تھا کہ نہ صرف مجھے ڈپلوما ملا بلکہ گولڈ میڈل اور سب سے بڑی بات "آزادی" کا پروانہ ! مجھے نہ تو ڈپلوما ہاتھ میں لے کر اور نہ ہی گولڈ میڈل سینہ پر سجا کر وہ خوشی ہوئی جو آزادی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے ہوئی ۔ میں آزاد تھا ۔ افکار میں ــ اعمال میں ۔ ان پر کوئی قدغن نہیں تھا ۔ میں شمالی سرحد سے جنوبی سرحد کی طرف اور مشرقی سرحد سے مغربی سرحد کی طرف دوڑتا گھومتا، پھر رہا تھا کہ اس سے مجھے بے پناہ مسرت و انبساط ملتی تھی ۔ جتنا عرصہ مجھے اس آوارگی میں لذت ملتی رہی، میں لذت اٹھاتا رہا ۔ اس مسلسل الفت ولذت میں کبھی کوئی رخنہ نہ پڑا !

مگر اس وقت میں سوچنے پر مجبور ہو گیا جب ایک انسپکٹر نے مرے نہایت قریب آکر، مرے سایہ سے اپنا سایہ جوڑتے مجھ سے سرٹیفکیٹ طلب کیا ۔ جو میں نے اسے دکھایا ۔ وہ تسلی کے ساتھ سرٹیفکیٹ واپس کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا مگر اپنا سایہ ــ مرے سایہ میں مدغم کر گیا اور میرا سایہ مجھ سے جدا ہو کر مری آزادی اور آوارگی پر کڑی نظر رکھنے لگا ۔ وہ انسپکٹر اپنا سایہ مجھے دے گیا تھا اور میرا سایہ اپنے ساتھ لے گیا ۔ مجھے بروقت اس کا احساس بھی ہو گیا اور یہ بات بھی ناگوار گزری ۔

9630 دنوں کی عرق ریزی کا مقصد فوت ہو رہا تھا ۔ اور بے پناہ دکھ بھی ۔ چنانچہ جوابی اقدام کے طور پر میں سایہ پر گہری نظر رکھنے لگا ۔ لیکن جونہی دن ڈوبا اور میں دیکھنے کی صلاحیت 12 گھنٹہ کے لئے کھو بیٹھا تو میرا سایہ ــ بے پاؤں مجھ سے علیحدہ ہو گیا اور مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ سراغرسانی والے اس انسپکٹر کے گروہ کے پاس چلا گیا جو مری خون پسینے سے حاصل کی ہوئی آزادی پر کڑا پہرہ لگانے کے لئے پر تول رہے تھے ۔ رات کو چونکہ میں دیکھ نہیں سکتا تھا اس لئے سایہ کا پیچھا کرنے سے قاصر تھا البتہ ــ

سایہ سورج طلوع ہوتے ہی مرا تعاقب شروع کر دیتا تھا ! اس سایہ کا خوف مری ذات میں دراڑیں ڈال کر روح تک میں اتر گیا اور میں ــ خارجی آزادی و آوارگی کے مسرت آگیں لمحوں کی لذت سے نکل کر ذات کے خوف کے حصار میں منتقل ہو گیا ــ خوف جو مری جڑوں میں اتر گیا ۔ اور جب یہ مری پہلی جڑ تک پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ میں فی الحقیقت کیا ہوں ؟ وہ کیا ہے ؟ اور مرا اس سے کیا تعلق ہے ؟

مسلسل کئی دن رات میں اسی تعلق پر سوچتا رہا ڈپلومے لینے والے دوسرے لوگوں نے بھی اس بارے میں سوچا ہو گا ۔ بلکہ سوچا تھا اس لیے مجھے ان کی علیحدہ علیحدہ کمیونٹیاں نظر آئیں ! مرا خیال ہے کہ انہوں نے محض اپنی اپنی انفرادیت کو قابل پرستش بنانے کے لئے اپنے اپنے مقلدین کے گروہ در گروہ بنا لئے تھے ۔ ورنہ سبھی کی انفرادیت کی خارجی سطح کی تہہ میں ایک ہی حقیقت کارفرما تھی جس کا مجھے اب ادراک ہو چکا تھا ! مجھے کشف ہوا تھا کہ بات صرف ایک صرف ایک ہے "ایک" ــ "ایک" ! میں نے سجدہ کیا اپنے آپ کو اپنے ذات کے خوف کی اتھاہ گہرائیوں میں مجھے اس اکائی کا تصور ملا تھا مگر اس کے ساتھ ہی خوف دوبارہ مرے سامنے آن کھڑا ہوا کہ ہماری ریاست میں اس قسم کی تصور کی پوجا پاٹ کرنے والوں کو افیونی سمجھا جاتا تھا ! مگر میں نے تو افیون کا رنگ تک نہیں دیکھا تھا ۔ اس حقیقت کو جانتے ہوئے سایہ اس رات مجھ سے علیحدگی کے بعد ــ

انسپکٹروں کی میٹنگ میں مری روزمرہ رپورٹ درج کرانے کے فوراً ہی بعد واپس آ گیا، ایک گھنٹے سے افیون کی گولی لیتا آیا ! وہ افیون میں نگل گیا ۔ اور پھر نشہ کے عالم میں صبح اٹھا، سورج نکلنے سے پہلے تو قریب کی مسجد میں چلا گیا، سحر کا وقت تھا میں نے مسجد کی چھت کا اینٹیں گن ڈالیں اور پھر ان سب کی درازوں میں موجود صرف ایک اللہ کو سجدہ کر کے باہر آ گیا ۔ ڈپلوما میرے پاس تھا میڈل سینہ پر آویزاں، اور سرٹیفکیٹ ہاتھ میں ــ میں چھوٹی بڑی گلیوں میں چلتا رہا اور جب ایک چوڑی گلی میں سے گزر رہا تھا تو ایک گرجا سے ٹن ٹن کی آواز آنے لگی میں اس آواز کے تعاقب میں وہاں چلا گیا اس میں موجود دو دو چار مصلوبوں کی طرح عبادت کی ــ

ایسوع مسیح کے تقدس میں پیشانی پر ہاتھ پھیر اور سینہ پر ہاتھ رکھ کر دعا کی، اس لمحے وہی "ایک" میرے سامنے تھا البتہ مسجد میرے ذہن سے محو ہو چکی تھی وہاں سے فارغ ہو کر نکلا تو پھر ڈپلوما، میڈل اور سرٹیفکٹ کا استعمال کیا، شمالی سرحد سے جنوبی سرحد اور مشرقی سرحد سے مغربی سرحد کی طرف آوارگی کے دوران ایک مندر کے سامنے سے گزرا تو سنکھ بجایا جا رہا تھا۔ میں مندر میں چلا گیا۔ رام اور کرشن کی مورتیوں کے آگے سرنیہوڑا۔ اب میں مسجد کی طرح گرجا کو بھول چکا تھا اور مندر میں بھی صرف "ایک" کو ہی دیکھ سکا! وہی ایک حسن کا ادراک مجھے اپنی ذات کی اتھاہ گہرائیوں کے خوف کے نتیجہ میں ملا تھا اس سارے عرصہ میں خوف ان اتھاہ گہرائیوں کی گہرائی تلے دب چکا تھا لیکن جونہی میں مندر سے باہر نکلا، مری آنکھ کھل گئی، افیون کا نشہ ہرن ہو گیا اور میرا سایہ ــــ اسی پرانے، بوسیدہ اور بوڑھے انسپکٹر کی صورت میں مرے سامنے ہتھکڑی لیے کھڑا تھا۔

"کیا بات ہے؟"

"ہمیں نہیں معلوم!"

مرے ہاتھوں کی زبان بولی جس پر اس نے تالے ڈال دیئے اور ہتھکڑی اپنی پتلون کی بیلٹ سے باندھتے ہوئے مجھے اپنے ساتھ لے چلا!

بظاہر ان لوگوں کو اس بات کا کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں مسجد کیوں گیا؟ کیونکہ سفارت کاروں کے دکھاوے کے لیے جتنا یہ بات اہم تھی کہ مسجد کا وجود ان کی ریاست میں ہو! اتنا ہی اہم یہ بات تھی کہ مسجد میں بھی کوئی وجود موجود رہو لیکن اس پر انہیں سخت اعتراض تھا کہ وہی وجود جو مسجد میں تھا، دوسرے وقت گرجا میں تیسرے وقت مندر میں۔

"آخر کیا بات ہے؟" اس بوسیدہ قسم کے انسپکٹر سے انسپکٹر نے دریافت کیا!

"مجھے افیون کی ایک پوری ڈلی کھلائی گئی تھی!" میں نے کہا!

"نہیں! افیون کی ایک پوری ڈلی مرے پاس محفوظ ہے۔ تمہیں تو ذرہ برابر افیون نہیں کھلائی گئی!" میرے سایہ نے مری ہی پینٹ کی جیب سے افیون کی سالم ڈلی نکال کر میز پر پھینکتے ہوئے کہا!

"مجھے تو اس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے ورنہ کون ہے ــــ؟ جو اللہ کو بھی مانتا ہو، یسوع مسیح کا نام لیوا بھی ہو اور رام کا پجاری بھی! کوئی بھی صحیح العقل یہ فعل سرزد نہیں کر سکتا"، ایک انسپکٹر نے میرے بارے میں رائے دی!

"ٹھیک ہے!" اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کرا دو اور ــــ رپورٹ کا انتظار کرو!" بڑے افسر نے حکم دیا!

ڈاکٹروں کا ایک لمبا چوڑا بورڈ! کمپیوٹر جیسی مشینیں اور نہ جانے کیا کیا؟ مرا دماغی معائنہ کرتے رہے، ہر ڈاکٹر نے، ہر کمپیوٹر نے، ہر مشین نے اس مفروضے کی تردید کی تو ڈاکٹروں کا بورڈ سر پکڑ کر بیٹھ گیا! بڑا ڈاکٹر بولا!

"ہو سکتا ہے یہ ایسی بیماری ہو جو بالکل نئی ہو اس لئے ہمارے احاطۂ علم میں نہ آسکی ہو اور نہ ہی کمپیوٹر کی رسائی اس تک ممکن ہو؟"

"کیوں نہ ہم اس کا آپریشن کریں کہیں ــــ" دوسرا بڑا ڈاکٹر بولا! جس کی سب نے تائید کی! مرا آپریشن کیا گیا، ایک ایک خلیہ کو، ایک ایک مسام کو، ایک ایک ریشہ کو ادھیڑ کر رکھ دیا گیا، مگر آپریشن ناکام رہا! ــــ ناکامی سے جھنجھنا کر بڑے ڈاکٹر کو اپنی گذشتہ شہرت کی روشنی کے دائرے میں چکر سا آنے لگا۔ لیکن چکر تو نہ آیا البتہ چھینک پر چھینک آنے لگی!

اسے چھینکوں کا دورہ پڑنے لگا۔ دوسرے ڈاکٹر مرے دریدہ بدن کو نظر انداز کر کے بڑے ڈاکٹر کے علاج معالجہ میں لگ گئے! مگر یہ چھینک کا مرض بھی مرے مرض کی طرح ان کے دائرۂ علم سے باہر کی چیز نکلا! ــــ بڑا ڈاکٹر مرا ڈپلوما، گولڈ میڈل اور سرٹیفکیٹ لے کر مسجد میں گیا! اللہ کو سجدہ کیا، گرجا گیا یسوع مسیح سے دعا کی، مندر گیا رام کی پوجا پاٹ کی مگر ــــ

بظاہر چھینکوں کے دورے کی شدت میں کمی نہ آئی البتہ ذاتی طور پر وہ افاقہ محسوس کر رہا تھا جبکہ بڑے ڈاکٹروں کا بورڈ اپنے سے بڑے ڈاکٹر کا مرے جیسا آپریشن کرنے کے تصور سے ہی خوفزدہ ہو رہا تھا۔

"ادب اور انقلاب"

اختر حسین رائے پوری فرماتے ہیں "ادب کی تخلیق میں دو طاقتیں کام کرتی ہیں، ماحول اور شخصیت ادب جذبات کا اظہار ہے اور جذبات ماحول سے متاثر ہوتے ہیں۔ اچھے خیالات اچھے ماحول کے محتاج ہیں۔ ادب نگاری بھی ایک قسم کا سماجی عمل ہے۔"

وہ لاش ہے جیسے ساحل کی موج ٹھکرا دے

قصّہ کوتاہ قدوں کا

م۔ق۔ خان
معروف گنج، گیا، بہار

"پرانی بات ہے
لیکن یہ انہونی سی لگتی ہے
وہ سب بونے تھے
اور سیرت سے عاری تھے
وہ جب بھی آئینے میں اپنا قامت دیکھتے
مغموم ہوجاتے"
— (زبیر رضوی)

ایک لمبا کارواں تھا جس کا ہر فرد بلند و بالا قدوقامت کا تھا۔ ہر کے ہاتھ میں جھنڈا تھا یا اشتہار ہر کا رنگ الگ ہر اشتہار پر کچھ ایسے کلمات تھے جس کا مفہوم الگ! ہر شخص زور زور سے نعرے لگا رہا تھا لیکن ہر کا اپنا الگ نعرہ تھا۔

وہ اس کارواں میں شامل ہوگیا۔ اس کا کوئی اپنا گھر تھا نہ منزل! کارواں شور کرتا بڑھتا جا رہا تھا۔ سڑک کی دونوں جانب دوکانیں تھیں۔ دوکانداروں نے سارس کی طرح گردنیں باہر نکالیں اور ایک دوسرے کے چہرے دیکھے۔ جب کہیں سے کوئی اشارہ نہیں ملا تو دھڑا دھڑ دوکانوں کے پٹ بند کئے اور وہ بھی اس کارواں میں آملے۔ جب وہ ان نعروں اور شور سے کچھ نتیجہ اخذ نہ کر سکا تو ایک جگہ رک گیا۔ شدید بھوک اور پیاس نے اسے نڈھال کر دیا تھا۔

ابھی رکا تھا کہ گردوپیش میں دھب دھب کی آواز کا جنگل کھڑا ہوگیا اور اس سے قبل کہ وہ راہِ فرار اختیار کرتا، کوتاہ قدوں کی ایک فوج وہاں موجود تھی۔ دیکھتے دیکھتے ان کا حلقہ تنگ ہو گیا۔ اور سنگینیں اس کے جسم کو چھیدنے کو بیتاب نظر آنے لگیں۔ اس نے آسمان کی جانب دیکھا آسمان گردوغبار سے ڈھکا تھا۔

"اوپر کیا دیکھتا ہے"؟

اس نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"ادھر کیوں دیکھتا ہے؟" کئی آوازیں ایک ساتھ آئیں اور سنگینیں اور قریب آگئیں۔

اس کی زبان چپٹیا کر رہ گئی۔ اپنی صفائی پیش کرنے کی اسے عادت نہیں تھی۔ ان میں سے ایک نے اس کے سامنے آکر حکم دیا "چل میرے ساتھ ساتھ"

اس بار اس کی زبان کا بے پر و بال پنچھی پھڑ پھڑایا۔ "آخر کیوں، میرا جرم؟"

"خبردار! یہ یہاں بتانے کی چیز نہیں۔ تھانے میں چل کر تمہیں سب کچھ پتہ چل جائے گا۔"

اس کے سامنے ان کے ساتھ چلنے کے سوا اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ایک نے بڑھ کر اس کے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنادی اور دوسرے نے منہ پر پٹی باندھ دی۔ وہ ان کے ساتھ چلنے پر مجبور تھا کہ سنگینوں کی زبانیں اسے چاٹ رہی تھیں۔

ابھی کچھ دور گیا ہوگا کہ سڑک کے بیچوں بیچ ایک بڑی فوجی گاڑی نظر آئی۔ اس سے ایک شخص نیچے اترا جو فوجی اعزازات اور تمغوں سے لدا تھا۔ اس نے اسے غور سے دیکھا اور نفرت کا اظہار کرتا ہوا اس نے اس کے منہ پر تھوک دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی سارے سپاہیوں نے اس کے منہ پر تھوکا۔ جب یہ سنت پوری ہوچکی تو پھر قدم آگے بڑھے۔ اس کا حلق خشک ہوکر کانٹوں کی طرح چبھ رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو منہ تک لاکر پانی پینے کا اشارہ کیا۔

ایک سپاہی قریب بہتے ہوئے نالے کے پاس گیا۔ اور ڈھیر ساری کیچڑ اٹھا لایا۔ وہ یہ دیکھ کر کانپ گیا۔ اس نے بہت احتجاج کیا، ہاتھ پاؤں مارے لیکن کیچڑ اس کے حلق میں ٹھونس دی گئی۔

ایک افسر نے ہدایت کی "اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دو" اور اس کے بعد اسے ایک گاڑی سے باندھ دیا گیا۔ چند منٹوں تک سڑک پر گھسٹتے رہنے کے بعد وہ ہوش و حواس کھو بیٹھا جب اس کی آنکھ کھلی تو اس نے اپنے کو ایک کمرہ میں پایا جس کی دیواریں تین جانب سیاہ تھیں اور ایک جانب موٹی موٹی لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اب اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ ہاتھ آزاد تھے جسم پر صاف ستھرے کپڑے تھے، جسم میں نقاہت بھی نہیں تھی۔ نہ بھوک تھی نہ پیاس! ایک سپاہی نے اسے ایک میز کے سامنے لاکر کھڑا کیا جس کی دوسری جانب کوئی اعلیٰ افسر بیٹھا تھا۔ اس نے غور سے قیدی کو دیکھا اور دریافت کیا۔

"تم جانتے ہو تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"

"نہیں" اس کی زبان سے یہی ایک لفظ نکلا۔

"تم اس دیو قامت قوم کے کارواں کے ساتھ تھے جو برابر سڑکوں پر گشت لگا کر امن وامان کو درہم برہم کرنے پر تلا ہے۔ تھے نا؟"

"میں اس کارواں کے ساتھ تھا لیکن ...."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔ تم ان کے ساتھ نعرے لگا رہے تھے؟"

میں نعرے لگا رہا تھا لیکن ان سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے۔ تمہارا قد ان لوگوں کے برابر ہے۔"

"اس بات پر میں نے غور نہیں کیا۔ مجھے تو وہ سارے لوگ کافی قدآور نظر آرہے تھے۔"

"نہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگوں سے تمہارا قد اونچا ہی تھا۔ بہرحال یہ بتاؤ تمہارا گھر کہاں ہے؟"

"مجھے یاد نہیں کہ میرا گھر کہاں ہے!"

"عجیب و غریب آدمی ہو! آخر کہیں تو رہتے ہوگے۔ میں کیسے مان لوں کہ تم اسی وقت سڑک سے اگ آئے تھے۔ کہاں رہتے ہو؟"

"میں نے کہا کہ ......"

"بتاؤ — اس کارواں میں شریک ہونے کے پہلے کہاں تھے؟"

"جیل میں" اس نے آخرکار جواب دیا۔

(۱) یہ عنوان زبیر رضوی کی نظم کی نقل ہے۔

شمشیروں میں خاک ہے کر دست آئے وقت [illegible] زندگی بھر کی [illegible] سلا دینے لگے (ثاقب)

"اس سے پہلے کہاں تھے، دو سال پہلے تین سال پہلے، پانچ سال پہلے"۔

"میں دس سال کے بعد اسی دن جیل سے رہا ہوا تھا"

"اچھا تو تم پیشہ ور مجرم ہو۔ پہلی بار کس جرم میں پکڑے گئے تھے؟"

"اس بار مجھے ایک بند کوٹھڑی سے اٹھا کر جیل لایا گیا تھا کیونکہ میں پست قد تھا اور حاکم وقت دیو قامت"

"بس یہی ایک جرم تھا؟ خبردار جو ذرا بھی جھوٹ بولے۔ میرے پاس سارے کاغذات محفوظ ہیں"

"ایک جرم اور تھا۔ ان کی تعزیرات کے مطابق بولتے رہنا ضروری تھا اور خاموش رہنا جرم قرار پایا تھا"

"جو بھی ہو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ اب نیا قانون نافذ ہو چکا ہے اور اس کے مطابق تم غدار ہو۔ تمہارا لمبا قد، تمہاری موت کا باعث ہے۔ تم نعرے لگا رہے تھے اور کارواں میں شامل تھے۔ اور اس نئے قانون کے مطابق تمہیں پست قد اور خاموش رہنا چاہیئے تھا۔ تمہیں صلیب پر چڑھا کر شہر کی عام شاہ راہ پر لٹکا دیا جائے گا کہ آنے والی نسل تمہیں دیکھ کر درسِ عبرت حاصل کر سکے"

(مرکزی خیال ہنریخ بوئل کی کہانی سے مستعار)

بقیہ:- پانی کی لکیریں .....

"بھئی! تمہیں تو سخت بھوک لگی ہوئی ہے پھر انکار کیوں؟"

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور پھر طفیل ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"ابا کہا کرتے ہیں کہ اگر کافر کے ہاتھوں کچھ کھاؤ تو گناہ ہوتا ہے"

"لیکن بیٹا! کیا میں تمہیں کافر لگتا ہوں؟ میرے بھی تو تمہاری ہی طرح ہاتھ پاؤں، ناک منہ ہے۔ اور پھر میں بھی تو اسی خدا کے آگے سیس جھکاتا ہوں جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ بیٹا ہم بھی انسان ہیں تمہارے اباجان کو کسی نے غلط بتایا ہے"

انسپکٹر نے طفیل کو اپنی گود میں بٹھاتے ہوئے سمجھایا "سچ"

"ان لڑکوں نے تمہیں کوئی گھڑی فروخت کی ہے؟" انسپکٹر نے پوچھا۔

"نہیں سردار صاحب! میں تو انہیں جانتا بھی نہیں"

"سچ سچ بتاؤ، ورنہ میں ابھی تمہاری کھال ادھیڑ دوں گا" انسپکٹر گرجا —

طفیل کی شناخت پر انسپکٹر نے گھڑی برآمد کرلی اور جیپ واپس چوکی کی طرف چل پڑی۔

"کیوں بھئی کرنیل سنگھ! اب ان لڑکوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے" انسپکٹر رندھاوا دونوں لڑکوں کو اپنے خیمے کی طرف لے جاتے ہوئے کرنیل سنگھ سے پوچھا۔

"جو آپ مناسب سمجھیں صاحب"

— "کیوں بھئی لڑکو! تم نے کچھ کھایا پیا بھی ہے یا نہیں؟" انسپکٹر نے طفیل کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں! لیکن ہمیں سخت بھوک لگی ہوئی ہے"

"اچھا تو بتاؤ، کیا کھاؤ گے؟"

"...! کچھ نہیں"

"بیٹا! بالکل سچ"

"پھر تو ہم جی بھر کر کھائیں گے۔ ہمیں بہت زوروں کی بھوک لگی ہے" عزیز نے اچھلتے ہوئے کہا۔

کھانا کھانے کے بعد انسپکٹر رندھاوا نے ڈیوٹی پر کھڑے دو سپاہیوں کو ہدایت دیتے ہوئے کہا۔

"دیکھو بھئی! ان دونوں لڑکوں کو سرحد پار کرا دو لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ اُن کے سپاہی گشت پر نہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم تو انہیں چھوڑ دیں اور وہ پکڑ لیں —"

"سپاہیوں نے سلوٹ مارا اور دونوں لڑکوں کو لے گئے — انسپکٹر انہیں دور تک جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا ..... اس کا چہرہ پھول کی طرح کھل اٹھا تھا اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں لیکن اس کے کانوں میں کچھ ہلکی ہلکی سی آوازیں پڑ رہی تھیں۔

"انسپکٹر نے ان سانپ کے بچوں کو چھوڑ کر اچھا نہیں کیا۔ اب اسکی خیر نہیں۔ کل تک خود اسے معلوم ہو جائے گا" آوازیں ابھرتی رہیں — اور انسپکٹر چپ چاپ اپنے خیمے میں چلا گیا۔

سزا جزا کے فسانے سنا کے واعظ نے سکون چھین لیا ہے گناہگاروں کا (حنیف ساغر)

مثالی کردار کی تلاش

عبدالعزیز
امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ،
بمبئی ۳ .

اس صبح میں بہت اداس تھا۔
صبح بھلے ہی اداس نہ ہو میرا دل ضرور اداس تھا۔
اور جب دل اداس ہو تو ساری دنیا اداس نظر آتی ہے۔
دھرتی پر اگر گلابی شامیں، اداس، کالی راتیں بے چین، اُبلی صبحیں غم گین نہ ہوتیں تو شاید کہانیوں کا بھی جنم نہ ہوتا۔ میری کہانیاں لکھنے کا راز تو اداسی ہی میں مضمر ہے۔ اسی لئے خوشیوں اور مسکراہٹوں سے مجھے طبعی وحشت ہے کہ کہیں یہ میری کہانیاں مجھ سے چھین نہ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک مجھے نہ اپنی اداسی کا کبھی شکوہ ہوا نہ دوسروں کی خوشیوں کا گلہ۔
اس صبح میں بہت ہی اداس تھا۔ میرے دل پر ایک تازہ چوٹ لگی تھی۔ میری حالت اس زخمی ہنس کی مانند تھی جو تیر سے گھائل ہو کر تڑپ رہا ہو لیکن موت اس سے روٹھ چکی ہو۔
انٹر میں دو بار فیل ہونے کے بعد میں نے طے کرلیا تھا کہ پڑھائی میرے بس کا روگ نہیں لیکن والد بزرگوار کے حکم سے سرتابی کی مجال مجھ میں نہیں تھی۔ اور ان کے حکم کے مطابق ایک بار پھر میں نے خود کو کالج کی سنگین عمارت میں پایا۔ میں برآمدے میں کھڑا ہوا تھا۔ اداس، شکستہ دل، تبھی میرے کانوں میں وہ جملے پڑے۔ کوئی کہہ رہا تھا۔
"بے چارہ! انٹر میں دوسری بار بھی فیل ہوگیا۔ پھر بھی وہ ایک مثالی کردار۔ اس کی کہانیوں میں مقصد نام کی کوئی چیز ہوتی ہی نہیں۔ پھر بھی اسے گمان ہے کہ وہ ایک اچھا کہانی کار ہے۔"
میں وہاں سے ہٹ گیا۔ لیکن وہ الفاظ میرے ذہن میں بار بار گونج رہے تھے۔ 'مثالی کردار' اور 'کہانی کار' میں نے طے کرلیا کہ اب جب تک کسی مثالی کردار پر کہانی نہ لکھ لوں چین سے نہیں بیٹھوں گا۔
انہی تصورات میں کھویا کینٹین میں داخل ہوا کہ تمام مثالی کرداروں کا ٹھکانہ کالج کینٹین ہی ہوتی ہے۔ ممکن ہے میرا مقصد بھی حل ہو جائے۔ مجھے داخل ہوتے دیکھ کر میرے ایک دوست نے مجھے آواز دی۔ اور میں اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا۔ اور اپنے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔ میرے آس پاس کئی خوش حال اور معزز گھرانوں کے افراد بکھرے پڑے تھے۔
ابھی میں ان کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ میرے دوست نے چائے کا آرڈر دیتے ہوئے مجھ سے کہا 'ان سے ملاقات ہے آپکی؟' آپ ہیں محمود واجد صاحب'
ان سے مصافحہ کرتے ہوئے ان کا شاندار گیٹ اپ دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ ضرور یہ بھی کسی چھوٹی موٹی ریاست کے نواب ہوں گے۔ میرے دوست نے محمود صاحب کی تعریف میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ ان کی طول طویل گفتگو کا لب لباب یہ تھا کہ محمود صاحب ایک اعلیٰ گھرانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا کاروبار بہت لمبا چوڑا ہے۔ 'بمبئی گلاس ویر' کی شاندار دکان بھی انہی کی ہے۔ کیمپس کارنر کے نزدیک ان کی کوٹھی ہے۔ ان کے پاس ایک مرسیڈیز گاڑی بھی ہے۔ لیکن وہ کالج میں اپنی امارت کا رعب گانٹھنا پسند نہیں کرتے۔ اس لیے کار سے نہیں آتے۔ مذہبی کاموں میں اور دوسرے سوشل کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔
کیا یہ ایک مثالی کردار نہیں؟ میں نے سوچا۔ میں ان کے بارے میں اور معلومات حاصل کرنا چاہ رہا تھا مگر چائے ختم کرتے ہی وہ اٹھے اور بائی بائی کہتے ہوئے کینٹین سے باہر نکل گئے۔ اور کون مثالی کردار ہو سکتا ہے؟
میں نے مختلف میزوں پر نظر دوڑائی۔ لیکن کچھ طے نہیں کر پایا۔ کینٹین میں بھیڑ ہو چکی تھی۔ میں کالج سے باہر آگیا۔ باہر فٹ پاتھ پر ایک بنگالی عورت فوراً میری طرف لپکی۔ "بابوجی! پیسا، امی بھوکا ئے بابو"۔ اس کی گود میں ایک سوکھا سا ادھ ننگا بچہ چمٹا ہوا تھا۔
میں نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب درد تھا۔ شاید وہ رونا چاہتی تھی مگر اس کی آنکھیں خشک ہو چکی تھیں۔ میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک سکہ رکھ دیا۔ "بھگوان تومار بھلا کرون" اس نے کہا۔ بچے نے بھی اپنا ایک ہاتھ اوپر اٹھایا۔ مگر تب تک وہ بھکارن کسی اور کے پیچھے دوڑی۔ 'کیا یہ ایک مثالی کردار نہیں'؟
میرے اندر چھپے کہانی کار نے پوچھا۔ شاید اس بچے کے سوا اس عورت کا کوئی نہیں۔ یہ عورت بھیک کیوں مانگتی ہے؟ کیا اس بچے کا باپ نہیں ہے؟ شاید مر گیا ہو یا پھر کسی نے اس بھکارن کی؟ بھوک مٹانے کی خاطر اپنی بھوک مٹائی ہوگی اور یہ تحفہ دے دیا ہوگا۔
میرے سامنے دو مثالی کردار تھے۔ میں کس کی کہانی لکھوں؟ محمود واجب صاحب کی یا اس بھکارن کی؟ کئی بار میں نے لکھنے کا ارادہ کیا لیکن کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا۔
رات بھر بارش ہوتی رہی۔ چھت ٹپکنے کے کارن میں سو نہ پایا۔ بستر پہ لیٹے لیٹے میں اس بھکارن کے بارے میں سوچتا رہا یا محمود صاحب کے بارے میں۔ آخر میں نے طے کرلیا کہ کہانی لکھ ڈالوں۔ بیگ کھولتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ فاؤنٹن پین تو میرے ساتھی کے پاس ہی رہ گیا ہے جس کہانی کو میں لکھنا چاہتا تھا بہرحال ان لکھی ہی رہ گئی۔
اگلے روز کالج میں اپنے دوست سے گیٹ پر ہی مڈبھیڑ ہوئی۔ بڑے بدحواس سے دکھائی دیئے۔
"کیا بات ہے؟ کچھ پریشان نظر آ رہے ہیں آپ؟"
میں نے پوچھا۔
"یار بات یہ ہے ـــــ وہ محمود صاحب تھے نا۔ اس روز کینٹین میں تعارف کروایا تھا جس سے میں نے تمہارا ـــ یار وہ بڑے چار سو بیس نکلے گھڑی اور قلم لے کر غائب ہو گئے۔ امپورٹڈ گھڑی تھی یار چھ سو روپے کی۔ پولیس میں بھی رپورٹ کر دی ہے"۔
قلم کا نام سن کر مجھے اپنا قلم یاد آیا (بقیہ صفحہ ۱۵۱)

یہ رکے رکے سے آنسو یہ گھٹی گھٹی سی آہیں ۔۔۔ یونہی کب تلک خدایا غم زندگی نبھائیں (مجروح سلطانپوری)

"بند"

ڈاکٹر محمد افسر خاں
۵۲۷ جبلپور۔ ایم. پی۔ ۴۸۲۰۰۲

سویرا گھاٹیوں سے اترتا ہوا، دھواں دھواں، میدانوں میں بڑھا آرہا تھا۔
کون روک سکتا تھا اُسے؟
کوئی نہیں ــــ یہ تو اس کا حق ہے۔

ارجو کی آنکھوں میں سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ ذرا ذرا وہ سرخ بھی ہوگئی تھیں۔ یو ہوں کیوں نہیں مسلسل سات راتوں کا جاگنا تو دیوی دیوتاؤں کو بھی گراں گزرے گا۔ پھر وہ تو ارجو تھا ــــ ایک بہت ہی معمولی آدمی ــــ ایک بہت ہی غیر معمولی آدمی۔

غیر معمولی اس لئے کہ وہ بہت کچھ پڑھنا لکھنا سیکھ گیا تھا۔ صرف بابو لوگوں کی "دیکھا سنی" میں۔ شہر کے پوسٹ آفس میں پانچ روپیہ ہفتہ بھی جمع کرتا تھا۔ اور جھونپڑی کو سجانا سنوارنا بھی تھا۔

معمولی اس لئے کہ وہ حمالی کرتا تھا، ننگے پیر چلتا تھا اور موٹے کپڑے پہنتا تھا۔

بارہ گھنٹے محنت کر کے کچھ گھنٹے وہ ایمانداری سے آرام بھی کرتا تھا۔ لیکن ابھی تو وہ سات راتوں کا جاگا ہوا تھا۔ چپ چپ۔ گم صم۔

"میں کہتی ہوں تم سو کیوں نہیں جاتے اب رہ کیا گیا ہے بکھیڑا!"

"سونا تو ہے لاجو، پر اٹھائے گا کون؟"

"تم اتنا جی بھاری کروگے تو میں کہاں سے لاؤنگی دھیرج؟ میرا من تو اور بھی ہلک جاتا ہے"

ارجو نے لاجو کی پیٹھ کا سہارا لیا تو لاجو کے کاندھے اور ڈھلک گئے۔ لاجو تو چاہتی تھی کہ کسی طرح ارجو کچھ دیر نیند لے لے۔

ادھر شہر سے بڑی دور میدانوں کی طرف اب سے کچھ گھنٹے پہلے ــــ!
کچھ رونق تھی، کچھ سونا پن تھی، کچھ سنگی ساتھی سکھیاں تھیں۔ کہار تھے، سجو تھی۔ بجلی کی طرح تیز "سٹل" جانے والی کسی کے ہاتھ وہ اسی لئے تو نہیں لگی تھی۔ اس کے ہونٹ تو بالکل بجلی سے تھے۔

تو ارجو اور لاجو کی یہ اکلوتی "مچھریا" ایک شکاری لے ہی گیا کیونکہ یہ تو جگ کی ریت ہے۔

تھا سیدھا سادھا جوان، چھٹی کے دنوں گھومتا پھرتا ادھر آنکلا تھا کہ سجو سے ٹکرا گیا۔

"کیا کرتے ہو؟"
"اسکول میں چپراسی ہوں"
"ماتا پتا"؟
"نہیں رہے"!
"دھرم جاتی؟"
"مانوتا"!

سجو کو لگا "باپو" کھل گیا ہے نہیں تو یہ سوال نہیں پوچھتا۔ پھر پندرہ دنوں بعد شادی کا بکھیڑا تھا چار لوگ اکٹھا ہوئے، شادی ہوگئی۔ سب ساتھی تھے اس لئے اپنے تھے۔ پھر اپنوں سے کون دھرم جاتی پوچھتا۔

ــــ جیسا ارجو تھا اس سے ایک ہاتھ آگے لاجو تھی۔ چھلکے تو سبھی لیکن خوشی کے آنسو کسی نے کچھ مانگا نہیں اور کسی نے کچھ دیا نہیں۔ سجو تھی جو سونے کی پھلی پھر کوئی کیا مانگتا۔

ارجو اور لاجو پھر اتنے ہی تنہا ہوگئے، جتنے اب سے بارہ برس پہلے تھے۔

ارجو جب بیٹھا تو ہمیشہ لاجو کی پیٹھ سے پیٹھ لگا کر اس کے کاندھوں پر گردن گرا کے۔ پہلے پہل تو لاجو کو بڑی فکر ہوئی کہ کسی سکھی نے ایسا نہیں بتایا یہ کیسا مرد ہے؟

بعد کو کچھ دنوں میں جب منہ کھل گیا تو آوازیں بھی بدل گئیں۔

"تم سارا بوجھ میری پیٹھ پر کیوں ڈال دیتے ہو۔ میری پیٹھ کوئی تمہاری پیٹھ تھوڑے ہی ہے کہ من دو من لادلوں"

"اور پیٹھ کے بجائے پیٹ پر لادوگی تو پیٹ پھٹ جائے گا چھاتی چیٹ جائیگی... جب حمالی نہیں کرتا تھا تب پیٹھ اتنی حساس نہیں تھی۔ اب سب سے زیادہ "چین" پیٹھ سے ہی ملتی ہے"

پھر ایک دن وہ لوٹا تو خالی ہاتھ آیا۔ گودام بند تھا کام کہاں سے ملتا۔ کام نہیں ملا تو مشکل ہو گئی جو کچھ تھا تو دوپہر تک ختم ہوگیا۔ پھر رات آئی تو بھوک سے جلتی ہوئی۔

کوئی کچھ نہیں بولا۔ لیکن آنکھیں بولتی رہیں۔ لاجو کو آنکھوں کی بولی پر بڑا کمال حاصل تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لاجو کو دیکھنے کے بعد ارجو سو نہیں سکا تھا۔

"کیا کرتے ہو؟"
"حمالی"
"ماتا پتا؟"
"نہیں رہے؟"
"دھرم جاتی؟"
"مانوتا"

لاجو کا "بابا" ان سوالوں سے زیادہ پوچھ تو سکتا نہیں تھا۔ کیونکہ یہ سوال اسکی اپنی حیثیت کے اندر تھے۔ تو لاجو کا بیاہ ارجو سے ہوگیا۔

بیاہ کیا ہوا بس جھونپڑیاں بدل گئیں۔ پہلے وہ مال گودام کے پاس والی جھونپڑی میں رہتی تھی اب شہر سے باہر میدانوں میں نئی خوبصورت سی جھونپڑی میں بسیرا تھا۔ لیکن صرف جھونپڑی ہی کیوں اور بھی بہت کچھ بدلا تھا۔

> خالی دماغ اور قینچی کی طرح چلنے والی زبان میں گہری دوستی ہوتی ہے "اوچھی اور بے سروپا" یہ باتیں سوچتا ہے اور وہ تشہیر کرتی ہے۔
> (اڈیٹر)

کنوارے من کا کنوارہ پن بدلا تھا۔
چولی کا نمبر بدلا تھا۔
ہرنی سی چوکڑی بھرنے والی چال بدلی تھی۔

پہلے پہل تو وہ بہت "بور" ہوئی ــــ اونگھ اونگھ کر بہت پریشان ہوئی۔ کہاں تک جھرنے میں جاکر نہاتی، کہاں تک بدل بدل کر ساڑیاں دھوتی۔۔

ایک تو پانی ٹھنڈا بہت تھا۔ "دوجے" اسے اپنے "گورے پن" کا احساس تھا۔ کپڑے اتارنے سے پہلے دیر تک اور دور تک آنکھیں پھاڑ کر نہارتی۔ جھرنے کا پانی جتنا ٹھنڈا تھا اتنا صاف بھی۔ لاجو نے محسوس کیا کہ اس کا رنگ کھل گیا ہے۔ لیکن ارجو تو بس پیٹھ سے پیٹھ لگانا ہی جانتا تھا۔ اسے گوری کالی پیٹھ سے کیا۔

تو وہ خالی ہاتھ لوٹا تھا ــــ

خالی ہاتھ' اس لئے کہ ان میں نہ پیسے تھے اور نہ خوراک، لیکن لوٹتے ہوئے ایک چھوٹی سی تصویر وہ پیٹ میں کھونس لایا تھا۔ ہاتھ اتنے صاف تھے نہیں اور کپڑوں میں سب جیب پھٹے ہوئے تھے۔ تو وہ تصویر اس نے پیٹ پر کھونس لی تھی۔

لاجو کو لگا کچھ ہو رہا ہے ــــ ہمیشہ تو ارجو کے ہاتھ اس کے اپنے پیٹ یا سینے پر ہوتے تھے لیکن آج وہ لاجو کے پیٹ پر تھے۔

"یہ میرا پیٹ ہے۔ تمہارا نہیں۔

"یہی تو دیکھ رہا ہوں کہ ترا ہے یہ پیٹ۔ پر کتنا خالی خالی۔۔"

"تیرا پیٹ بھی تو خالی ہے نا"۔ جھوٹ ہی لاجو نے ارجو کے پیٹ پر ہاتھ رکھا اور واپس کھینچ لیا۔ پھر بولی۔

"چل جھرنے پر نہا کر آتے ہیں رات نیند اچھی آئے گی۔" لیکن ارجو نے بات کا رخ لاجو کے نہ چاہتے ہوئے بھی موڑ دیا۔ وہ کم از کم آج ٹال جانا چاہتی تھی۔

"میں۔۔۔ میں اپنے پیٹ میں ایک بہت پیارے بچے کی تصویر چھپا کر لایا ہوں میں چاہتا ہوں کہ یہ تصویر تیرے اندر چلی جائے۔ پیٹ تیرا خالی ہے نا۔ بھر جائیگا۔"

پھر سنجو کے پیدا ہوتے ہوتے لاجو کے لئے ارجو بہت کچھ جوڑ چکا تھا۔ لیکن سارے جوڑ آج اسے کھولنے پڑے۔ لاجو اور ارجو نے سب کچھ ٹیلے کو سونپ دیا۔ سونے کی مچھلی ابھی گھنٹے بھر پہلے ٹیلے کے کانٹے میں جا چکی تھی اور ارجو، لاجو کی پیٹھ سے پیٹھ لگائے چپ سادھے بیٹھا تھا۔

لاجو ہمیشہ ہی ارجو سے کسی نئے سوال کے پوچھنے میں گھبراتی تھی۔ ایک بار اس نے پوچھا تھا۔

"تم اتنے بڑے بڑے بورے گھنٹوں ادھر سے ادھر کرتے رہتے ہو۔ پیٹھ نہیں چھلتی؟"

"تیرا بابو گھر پہ کب ملتا ہے؟"

"کیوں؟"

"کیونکہ میں تجھے ادھر سے ادھر کرنا چاہتا ہوں"

ارجو اس سادگی سے پہاڑ جیسی بات بول گیا جیسے سچ مچ وہ لاجو کو ایک گوشت پوست کا بورا ہی سمجھتا ہو جس کا ادھر سے ادھر کر دینا اس کے لئے چٹکیوں کا کام ہو۔

ایک سوال ایک بار اور لاجو نے پوچھا تھا نتیجے میں سنجو اس کے پیٹ میں ارجو نے ڈال دی تھی۔ اور اسکے بعد تو وہ جیسے سارے سوال ہی بھول گئی تھی۔ لیکن جب کوئی سوال اسے بہت پریشان کرتا تو وہ اسے اپنے "پیٹی کورٹ" کے کمربند میں گانٹھ لگا کر بھول جاتی ــــ ایسے جانے کتنے سوال۔

"میرا بابا دوبارہ آج تک مجھ سے کیوں نہیں ملا"۔

"اس ویرانے میں اور لوگ اپنی جھونپڑیاں کیوں نہیں بناتے"؟

"سنجو کبھی ادھر آئے گی یا نہیں ــــ؟"

"ارجو کو رات کھانسی کیوں آتی رہتی ہے۔!"

"میرا شریر اکثر گرم تپیلی سا تپنے کیوں لگتا ہے۔!"

دونوں چپ تھے۔ لیکن ارجو کے ہاتھ لاجو کی پیٹھ سے لگے اسکی کمر کے چاروں طرف گھوم رہے تھے۔ پھر۔۔۔

لاجو' بارہ سال میں تو نے اتنی بہت سی گانٹھیں لگا لیں اور مجھے بتایا تک نہیں۔۔۔؟"

"اب دیر کس بات کی ہے۔۔۔ من کو چین ایسے بھی تو ملتا ہے نا!

"تجھے تو معلوم ہے۔ میرے پاس ایک سی سندر بچے کی تصویر نہیں ہے"

"تیرے من کو چین بھی نہیں اور تو سوتا بھی نہیں۔ پھر کہاں تک مر مر کر جیئے گا تو"؟

"میرے ہاتھوں میں صرف سمسیائیں ہیں، سمسیائیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ اب تو ہر سال سمسیاؤں کو جنم دے"

سویرا جھونپڑی کی چھت تک آ گیا تھا۔ لاجو تھکان اور نیند سے چور جیسی بیٹھی تھی ویسی ہی بستر پر لڑھک گئی۔ اور ارجو آج پھر مال گودام کی طرف چل پڑا۔ زیادہ دور ابھی نہیں گیا تھا کہ دھیان آیا۔ ــــ آج گودام بند رہے گا۔ اسے معلوم تھا کہ لاجو جھرنے پر دوپہر بعد ہی آتی ہے۔ وہ گانٹھیں کھولتا ہوا جھرنے کی طرف نکل گیا۔

بقیہ:- مثالی کردار کی۔۔۔

"اور میرا قلم کہاں ہے؟ اس روز آپکے پاس ہی رہ گیا"

"تمہیں اپنے قلم کی پڑی ہے یہاں میری اتنی قیمتی گھڑی چلی گئی" انہوں نے جھنجلا کر کہا "گھڑی مل گئی تو قلم بھی مل جائے گا۔ اسی قلم کی تو میں بات کر رہا ہوں"

یہ کہہ کر وہ تو تیزی سے نکل گئے میں اپنے قلم کا افسوس ایک دوست کے ساتھ کلاس میں جا بیٹھا۔ دوپہر میں کالج چھوٹنے پر باہر نکلا تو فٹ پاتھ پر ایک پیڑ کے نیچے وہی بھکارن سوتی نظر آئی۔ اس کا بچہ اس کے سوکھے پستانوں سے دودھ حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اور چیخ چیخ کر رو رہا تھا۔ قریب ہی ایک ٹین کے ڈبے میں کچھ روٹی کے سوکھے ٹکڑے تھے جن پر سرخ چیونٹیوں نے یلغار کر رکھی تھی۔ راہ گیر بے پروائی سے گذر رہے تھے۔ انھیں بھکارن کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

میں فٹ پاتھ پر کھڑا سوچنے لگا ایک بھرپور دودھ مثالی کردار اب میرے سامنے ہیں لیکن کہانی کیسے لکھی جائے۔ قلم تو محمود صاحب لے گئے ہے۔

مرد خور

(اپنے محترم، بزرگ، اور شفیق دوست رشید اعجاز کی نذر)

مشتاق مدنی (بی کام)

رائل عمان پولس۔ پوسٹ بکس ۲، آفیسرس کلب مسقط۔ سلطنت آف عمان۔

اٹلانٹک بار میرے لئے نیا نہیں ہے۔ وہ میرے جیسے آدمی کے لئے نیا ہو بھی نہیں سکتا۔ اس لئے کہ اس قسم کے بار میں جس طرح کی ذلیل حرکتیں کی جاتی ہیں وہ سب مجھ جیسے ہی ذلیل آدمیوں کی بدولت ہوتی ہیں میں یہ نہیں کہتا کہ میں شریف نہیں ہوں لیکن کیا شریف آدمی ذلیل آدمی نہیں ہو سکتا؟ اگر نہیں ہو سکتا تو پھر میں کیونکر ہوں؟ اصل میں سارا قصہ یہ ہے کہ شرافت اور ذلالت ایک ہی ماں کی دو جڑواں بیٹیاں ہیں جو بوقتِ ضرورت اپنا رنگ و روپ کاڑھ لیتی ہیں۔

یوں دیکھا جائے تو اس بار میں میرے کئی دوست اور شناسا ہیں۔ لیکن سریندر اور پربھاکر کو میں اپنا سچا دوست تصور کرتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہ دونوں بے حد شریف انسان ہیں۔ بلکہ صرف اس لئے کہ وہ دونوں میری ہی طرح اول درجے کے ذلیل ہیں۔ سریندر کا جانوروں کی کھالیں سپلائی کرنے کا بزنس ہے لیکن وہ کئی بار ان کھالوں میں افیم اور چرس کی اسمگلنگ کرتے ہوئے پکڑا گیا ہے جس روز جتنا بھاری نقصان ہوتا سریندر ضرورت سے زیادہ خوش ہوتا اور جی بھر کے شراب پیتا اور پلاتا تھا۔ جیسے اسے اپنے اندر کے اس ذلیل جانور سے بھی بہت پیار ہے۔ سور کہیں کا!

پربھاکر بھی ایک بزنس مین ہے۔ لیکن میں آپ کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ وہ کس نوعیت کا بزنس کرتا ہے برُے دھندے والوں کے بھی اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ اور بعض اوقات انسان بڑے جھمیلے میں بھی پھنس جاتا ہے۔ یعنی مجھ جیسا انسان جو ذلیل ہوتے ہوئے بھی ایسے دھندے کو برا سمجھتا ہے۔ لیکن مجھے پربھاکر کے بزنس سے کیا! پربھاکر تو میرا دوست ہے روز میرے سنگ شراب پیتا ہے اور رسیلے گانے گاتا ہے اور لطیفے سناتا ہے۔ جہاں تک اس کے دھندے کا تعلق ہے تو وہ بہت ہی unique قسم کا ہے۔ شریف آدمی جس کا نہ لیے سنتے [illegible] اس کا وہ کان بھک سے اڑ جائے۔ لیکن میں تو آپ کو اس کے دھندے کے بارے میں سرے سے بتا ہی نہیں رہا ہوں تو پھر آپ کے کان پھٹ جانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا!

اس بے کیف، روکھی پھیکی، زرد چہرے والی زندگی میں اگر سریندر اور پربھاکر جیسے دوست مل جاتے ہیں تو اس شخص کی خوش قسمتی کا کیا کہنا! ہم لوگ اپنی اپنی زندگی کے جوئے میں غرق پئے جا رہے تھے۔ اور نقطہ مستقل تھا وہی اٹلانٹک بار! یہاں ایک عجیب قسم کی خوشگواریت کا احساس ہوتا تھا ہمیں! یوں لگتا تھا جیسے ہم سب غیر شعوری اور غیر محسوس طریقے پر اپنے اپنے جسموں اور دماغوں اور چہروں کے خول اتار کر اس بار میں داخل ہوتے ہیں۔ صاف شفاف، نیچرل، اور بحیل original

انہی دنوں ایک ادھیڑ عمر کی خاتون میری زندگی میں در آئی!

مسز ڈیسوزا۔ چہرے بشرے اور عمر سے مسز ضرور لگتی تھیں۔ لیکن اس کی عادتوں اور حرکتوں میں بچپن کی بو آتی تھی۔ رنگ و روغن زدہ رخسار، آنکھوں کے کونوں سے پوشیدہ طور پر جھلکتی ہوئی کاجل کی کٹار بھدا جسم اور سیاہ مائل دانتوں کی لڑی۔ جب وہ ہنستی تو رونے کو جی چاہتا تھا۔ لیکن وہ بلاشبہ ایک ذہین عورت تھی اور مرد کی ہر کمزوری سے پوری طرح واقف!

غیر محسوس طریق پر وہ میری کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی بہت کچھ بن گئی۔ اپنی زندگی کی شام سے گذرتی ایک ۴۵ سالہ عورت مرد کی اس قدر شدید کمزوری بن سکتی ہے یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ ایک دن مجھ سے کہنے لگی۔

"میرے ہسبنڈ چاہتے ہیں کہ میں ان کو طلاق دے دوں، کیا تم مجھ سے شادی کر سکتے ہو؟"

"میں۔۔۔" میں کچھ نہ بول سکا! نہ 'ہاں' نہ 'نا'

وہ غصے سے بولی "تمہیں کچھ بولنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ بزدل آدمیوں کی آنکھوں کی زبان مسز ڈیسوزا سمجھتی ہے!"

"میں۔۔۔میں بزدل نہیں ہوں!" میرا لہجہ یکایک غصیلا ہو گیا۔

وہ ایک قہقہہ مار کر بولی "'نا' کہنے کا حق تو میں نے تم سے چھینا بھی نہیں تھا۔ تم آسانی سے 'نا' کہہ سکتے تھے۔ میں نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا" میں نا کیسے کر سکتا تھا مسز ڈیسوزا!"

"نہیں! مسز ڈیسوزا نہیں! مسز بلڈی فل کہو"

"بلڈی فل"؟

"کیوں! تمہیں تعجب کیوں ہوا یہ جان کر! تم بلڈی فل نہیں ہو؟"

او ہو ——— ! کیا تو واقعی۔۔۔۔

وہی بار! لیکن ایک میز پر تین نہیں چار ساتھی! میں، سریندر، پربھاکر اور مسز بلڈی فل۔ اس کی شمولیت نے ہماری ذہنی فضا کو ڈسٹرب disturb نہیں کیا۔ بلکہ خوشگواریت ہی بخشی۔ سریندر اور پربھاکر بھی بہت خوش تھے اس سے مل کے۔ وہ عورت تھی بھی ایسی، زندہ دل، زندگی کا بھرپور قہقہہ۔ ہر بات ہر کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والی۔ جب سریندر نے اسے بھابی کہنے کی کوشش کی تو وہ بھڑک کر بولی

"دیکھو سریندر! میں اپنے کبھی بھی ملاقاتی کے کسی ساتھ کو چاہے وہ خوشگوار لمحے کی پیداوار ہو یا منحوس گھڑی، رشتہ داریوں کے جال میں پھانسنا نہیں چاہتی اس خوبصورت حسین اور ذلیل زندگی کی پتھریلی اور سنگلاخ راہوں سے اچھلتے کودتے میں صرف

[illegible] سکوت ٹوٹ گیا، بتلاؤ! ایسے میں کس نے مجھے پکارا ہے (مقبول ایی)

خوشیاں حاصل کرنا چاہتی ہوں ۔ یہ صرف اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ذاتی رشتہ داریوں نے مجھے بہت دکھ پہنچائے ہیں ۔ تم مجھے صرف دوست کے نام سے یاد رکھ سکتے ہو"

اس نے بوتل کھولی" ہمارے گلاسوں میں شراب انڈیل کر بولی ۔

"آج کا دن کتنا اچھا ہے ۔ آج ہم چاروں مشترکہ طور پر اس گذرتی ہوئی رات کے اس حسین لمحہ کی تخلیق میں مصروف ہیں ۔ تم لوگ شراب پیو میں ناچوں گی!"

وہ ڈانسنگ فلور تک گئی اور رقص کرنے لگی۔

کس قدر عجیب ناچ تھا وہ! اس ناچ میں ایک منجھے ہوئے رقاصہ کے نہ کوئی بھید تھے نہ بھاؤ! ہر قسم کی قید اور پابندی سے آزاد ناچ رہی تھی وہ! اور جھوم رہی تھی اور جھوم جھوم کر تالیاں بجا رہی تھی۔ جیسے اسے اسکی استطاعت اور حیثیت سے بڑھکر کوئی خوشی مل گئی ہو ۔ ناچتے ناچتے وہ بھیڑ میں گم ہونے لگی۔ اس کا ہیولا ہماری نگاہوں کے سامنے مدھم پڑنے لگا ۔ شراب کا نشہ تیز ہی اتنا تھا ۔ رات لمحہ لمحہ ہمارے وجود میں اتری جا رہی تھی ۔ ناچ کے بعد مسز بلڈی فول غائب تھیں !

میں نے اسے تلاشنے کی کوشش کی نہیں! کیا فائدہ زندگی کی خوشی، غم، دکھ سکھ، ملنا، بچھڑنا ان تمام احساسات سے عاری فطرت تھی میری! سطحی! جیسے چکنے گھڑے پر پانی کی کوئی بوند لمحہ بھر سے زائد ٹھہر نہیں سکتی اسی طرح میرے احساس پر یہ سب چیزیں بمشکل ہی لمحہ بھر کو ٹھہر پاتیں اور پھر خود بخود ختم ہو جاتیں زندگی جینے کے لئے بے حسی کا احساس ضروری ہے ورنہ ....

کئی دن گذر گئے، شراب کا نشہ، سگریٹ کے دھوئیں اور مصنوعی آرائشوں اور زیبائشوں سے سجے سجائے دن! میں مسز بلڈی فل کو بھول گیا۔ اور جب بھول گیا۔ تو یہ احساس ہوا کہ اس کی معیت میں میں اپنا آپ کھو چلا تھا ۔ اس کو کھو کر جیسے مجھے اپنا پورا آپ مل گیا ۔ میں نے خود کو پا کر اپنے آپ کو مکمل کر لیا۔ اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ۔ لیکن! لیکن ....

سریندر اور پربھاکر ....؟

ایک روز سریندر نے حیرت انگیز انکشاف کیا! صبح سویرے ابھی بستر سے اٹھا بھی نہ تھا کہ اس نے کمبل کھینچ کر مجھے جگایا۔

"اٹھو! جلدی اٹھو! قیامت آگئی ہے!

"کیا ہوا؟" میں ہڑبڑا گیا ۔

"میں نے کل رات اسے حسین کلب میں دیکھا تھا پربھاکر کے ساتھ!"

"کسے؟ کیسے دیکھا تھا؟"

"تمہاری مسز کو! مسز بلڈی فل کو"!

پرسکون اور شانت ذہن میں کھلبلی مچ گئی ۔ چند لمحے میں خواہ مخواہ پیچ و تاب کھاتا رہا ۔

سریندر نے پوچھا "اب کیا کرو گے؟"

"کرنا کیا ہے؟ ہمارے تمہارے اور اس کے لئے کوئی بھی شئے کوئی بھی حرکت کوئی بھی قدم غیر متوقع اور اضطراری نہیں ہے ۔ وہ عورت اتنی صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ جب چاہے مسز بلڈی فل، مسز پربھاکر، مسز سریندر بن جائے"

سریندر کے جانے کے بعد کیے بعد دیگرے کئی رنگ میرے چہرے پر آتے جاتے رہے ۔ خلاف معمول میں اس دن بار میں نہیں گیا۔ رات میں اپنے کمرے میں بیٹھا ٹی وی کا پروگرام دیکھتا رہا ۔ ایک بار خیال آیا کہ برسوں کے اس تسلسل کو صرف ایک عورت کے لئے نہ توڑنا چاہئے ۔ لیکن دل میں، روح میں، جسم کے کہیں کسی مہین، باریک، حساس گوشے میں یہ خیال کانٹے کی طرح چبھ جاتا کہ وہ مجھے چھوڑ کر کیوں گئی!

ٹی وی کا پروگرام دیکھ کر میں سو گیا ۔ سہانے سپنے میں نے کبھی نہ دیکھے تھے ۔ شراب کے نشے میں دھت سونے کی جو عادت جو پڑی تھی ۔ لیکن اس رات میں نے ایک بند بھی نہیں جھپکی ۔ اور ۔ ایک کے بعد ایک حسین خواب قطار اندر قطار بند پلکوں کی اوٹ میں آتے جاتے رہے ۔ کیا رات میں دیکھے جانے والے خواب اس قدر حسین بھی ہو سکتے ہیں؟ آج تک میں نے کیوں اس طرح سے نہیں سوچا؟

کھٹ ... کھٹ ... کھٹ کی آواز تیز ... تیز تر .....

میں نے دروازہ کھولا، سریندر، پربھاکر اور وہ میرے سامنے کھڑے تھے ۔

ایک لمحے، بس ایک لمحے کو میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس کا چہرہ نوچ لوں ۔ مگر پھر میں نے اپنے اعصاب پر قابو پا لیا ۔ شدید ملاقات کے بعد یکایک بچھڑنا اور پھر ملنا ۔ کتنا عجیب سا لگتا ہے زندگی اپنے اندر کتنے رنگ رکھتی ہے؟ وہ زور سے چلائی ۔

"ہائے ہنی! کیسے ہو؟ اچھے تو ہو؟"

میں صرف مسکرا کر رہ گیا ۔ ایک دھندھ، گہری اور ناقابل تسخیر خاموشی کمرے میں رینگ رہی تھی ۔

وہ تینوں صوفے پر بیٹھ گئے ۔ سریندر اور پربھاکر میرے پرانے ساتھی تھے ۔ لیکن آج یکایک یہ ان دیکھی اور غیر محسوس دیوار کیوں ہمارے درمیان حائل ہے؟ وہ دونوں اسقدر چپ کیوں ہیں؟ وہ اٹھی اور میری پرسنل الماری میں سے شراب کی بوتل نکال کر بولی ۔

"تم سب لوگ اس قدر بدھو جیسے کیوں بیٹھے ہو؟"

اس نے چار گلاسوں میں چار پیگ بنائے ۔ فریج سے سوڈا اور ٹھنڈا پانی نکال کر اسمیں ملایا ۔ اور اپنا گلاس اٹھا کر زور سے بولی "چیئرس"!

پھر اس نے ٹیپ ریکارڈر آن کر دیا ۔ موسیقی کی ہلکی، پیاری اور دلآویز لہریں سماعت سے ٹکرا کر عجیب سا نشہ پیدا کر رہی تھیں ۔ پھر آواز اونچی ہوتی گئی ۔ اونچی ــــ اور اونچی! رات لمحہ لمحہ نشہ بن کر ذہن و دل میں در آتی رہی ۔ ہیولے مدھم پڑنے لگے ۔ تاریکی بڑھنے لگی اور اس تاریکی میں ہم دور تک بے تحاشہ بھاگتے رہے ۔ اپنے جسم کو اپنی سماعت کو، اپنی آنکھوں کو اپنے وجود سے ہٹائے بھاگتے رہے ۔ پھر تھک گئے ۔ اور سو گئے اور کھو گئے اور مر گئے !

دوسری صبح پربھاکر نے مجھے فون کیا ۔ اس کی آواز سے وحشت کا اندازہ ہوتا تھا!

"کتیا! سور کی بچی! حرامزادی! سنتے ہو؟ کیا کیا کہہ رہا ہوں ۔ سنتے ہو؟"

"کیا ہوا؟ میں نے دھیمے سُر میں پوچھا!

"وہ چلی گئی ۔ سریندر کی بیوی نے مجھے بتایا کہ سریندر رات گھر نہیں آیا ۔ میرا خیال ہے کہ .....!

میں نے مسکرا کر فون رکھ دیا ۔

منٹو کو جنگ سے سخت نفرت تھی ۔ وہ امن کا متوالا تھا ۔ اور ہمیشہ امن و سلامتی کا درس دیتا رہا ۔ اسے معلوم تھا کہ پائیدار امن انسانی مساوات اور اخوت کے بل پر ہی قائم ہو سکتا ہے ۔

وہ نہیں بھولتا جدھر جاؤں
ہائے میں کیا کروں کدھر جاؤں (مصحفی)

واپس آنے والے

انور امام
روڈ نمبر ۱ روم نمبر ۸۹ جواہر نگر، بمقام آزاد نگر مانگو جمشید پور۔

گاؤں کی چت لیٹی ہوئی زمین کو اپنے بوڑھے ہونے کا شدید احساس گھیر لیتا۔ وہ سوچ و فکر میں ڈوب سی جاتی اور کبھی کبھی وہ چونک اٹھتی ـــــ شہر کی جانب روانہ ہوتے قافلے کو آس بھری نظروں سے تاکا کرتی ـــ گھنٹوں تاکا کرتی، جب تک کے قافلے نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جاتے۔

ادھر پچھلے کئی برسوں میں زمین نے ہر روز ایک نئے قافلے کو اپنے سفر پر روانہ ہوتے ہوئے دیکھا تھا جو گاؤں کی اس سوندھی سوندھی خوشبو سے بہت دور ـــ بہت دور شہر کی پر آسیب فضاؤں میں منڈلاتے رنگوں میں خود کو ضم کرنے کی کاوشوں میں لگے ہوئے تھے ـــــ شاید وہ نہیں جانتے کہ ہر علاقے کے اپنے الگ رنگ ہوتے ہیں، الگ فضا ہوتی ہے، الگ مسکراہٹ، الگ رشتے ہوتے ہیں اور تمام رشتوں کو ٹھکرا کر وہ چنگھاڑتے ہوئے اژدھے نما شہروں کی جانب چل پڑے۔

کھیتوں نے جب ان کی جانب دیکھ کر کھنکارا تو وہ اپنے چہروں کو اندر اپنے اندر چھپا کر سفر پر چل پڑے۔
لہلہاتی فصلوں نے ان کے گلوں میں باہیں ڈال دیں
برساتی نالے مسکرا کر ان کے سامنے ابھر آئے
سہانی شام
کھل کھلاتی صبحیں
چلچلاتا دن
بوڑھی آنکھیں
پژمردہ چہرے
آباو اجداد کے نام
کوئل کی کوک
پرندوں کے قہقہے
کتوں کی بھونکیں
سیاروں کی آوازیں
بلیوں کی چمکیلی آنکھیں

کوئی بھی ادا انہیں نہ بھائی، اور وہ بڑھتے ہی چلے گئے ـــ روانگی سے قبل ان کے نام ایک Form آیا تھا جس پر صاف صاف تحریر تھا کہ تم اپنے جسم کی کوئی ایک نشانی اپنے کھیتوں کو دے آؤ ـــ تاکہ وہ کبھی تمہاری پہچان میں ہماری مددگار ثابت ہو۔ اور پھر نشانیوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔

کسی نے اپنی آنکھیں اس امید پہ کھیتوں کے حوالے کیں کہ وہ ان کی آنکھوں سے ہر اونچ نیچ کو سمجھ پائیں گے۔ اور ان کا حق ان کے والدین کے حصے میں چلا جایا کرے گا۔

کسی نے اپنے ہاتھ قلم کیے کہ آنے والی نسلیں ان ہاتھوں کے سہارے اپنی الجھی ہوئی راہیں سلجھا سکیں گی۔ اور کھیت ہمیشہ جاگتے رہیں گے۔

کسی نے اپنے چہرے کو ہی مسخ کر ڈالا، کہ یہ بھی خوبصورتی کی ایک اہم علامت ہے۔ اور ہم سب تو بے چہرہ لمحوں کی پیداوار ہیں ـــ تمام مسخ شدہ چہرے ایک جیسے ہوں گے تو ان میں کوئی تفرقہ نہ ہوگا۔ اور کھیت ان سبھوں کو ایک جانیں گے۔

اور کسی نے تو اپنے پاؤں ہی کاٹ کر کھیتوں میں گاڑ دیئے ـــ کہ کھیتوں کو ارتقا کے لیے پیروں کی بھی ضرورت ہوگی ـــ ہم نہ رہ ہونگے، تو بھی ہمارے پیروں کے سہارے آگے، اور آگے بڑھ جائیں گے۔

یہ امیدیں نئے ذہن کی پیداوار تھیں۔ نئی سوچ اپنے ڈھنگ سے ارتقا کی بلندی کو چھونا چاہتی تھی۔ وہ پچھلے تمام تجربات کی نفی کرنے کو تیار تھے ـــ اور یہی وہ جذبہ تھا جو انہیں کھوکھلی قبروں میں دفن کیے جا رہا تھا۔

کہ زمین چت لیٹی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔ اور کھیت کروٹ بدل رہے تھے۔

قافلے کی عطا کردہ نشانیاں ان کے جسم پر بوجھ کا بن کر اپنا حق مانگ رہی تھیں ـــ اور مختلف قسم کی بیماریوں کی شکل میں یہ نشانیاں ان کے جسم پر اگ رہی تھیں۔

کھیتوں نے جس وقت ان نشانیوں کو قبول کیا تھا ـــ یہ احساس تک نہ تھا کہ کل یہ نشانیاں اندر پاتال میں جا کر ان کو اندر ہی اندر ٹکڑوں میں بانٹ دیں گی ـــ اور آنے والے وقت میں کوڑھ کی شکل میں ابھر یں گی۔

ہوری نے بھی ان باتوں کو محسوس کیا تھا۔ اس کی بوڑھی جھکی کمر کچھ اور جھک گئی تھی۔ اور ادھر چند برسوں سے اس نے بھی کھیتوں سے اپنی نظریں چرانی شروع کر دی تھیں ـــ جبکہ کھیت ہر صبح ہوری کاکا کی خیریت پوچھ لیا کرتے تھے۔ اور وہ بے چارے الٹی سیدھی بڑبڑاہٹ کے بعد آگے بڑھ جایا کرتے تھے۔

آج صبح جب ہوری مندر کی جانب چلا، تو راہ میں اجنبیت کے احساس نے اسے گھیر لیا۔ وہ ٹھٹھک گیا۔

"کیوں رے بھیکو ـــ آج یہ ساری فضا بدلی بدلی کیوں لگ رہی ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اپنا سب بےگانہ ہو گیا ہے۔"

"کاکا شہروں کی طرف جانے والے اپنی الگ دنیا بسانا چاہتے ہیں، خوابوں کی دنیا ـــ" اس کی آواز میں درد تھا ـــ جسے ہوری نے بھی محسوس کیا اس کی بوڑھی آنکھیں بھیکو کے چہرے پہ جم گئیں "کیا یہ ہمارے خوابوں کی دنیا نہیں ہے ـــ یہ ٹکر ٹکر ہماری جانب دیکھتے کھیت ـــ یہ لہلہاتی فصلیں ـــ یہ سوندھی سوندھی مٹی کی خوشبو، یہ اپنائیت یہ پیار ـــ اور یہ حسین پرشباب گنگناتی دھرتی ـــ ہم سب ایک دیس ایک قوم کے لوگ، سب کے دکھ سکھ ایک ہے، کیا یہ ہمارا سنہرا خواب نہیں ہے ـــ بولو بھیکو، بولو اب خاموش کیوں ہو ـــ؟" بوڑھا ہوری خلا میں تک رہا تھا ـــ نگاہوں کے سامنے گذشتہ دنوں کے گرم ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ ایک جم غفیر نگاہوں کے سامنے ابھرا۔

یہ زمین میری ہے۔
تو پھر میری زمین کونسی ہے؟

(باقی ۱۶۶)

صبح کے درد کو راتوں کی جلن کو بھولیں
کس کے گھر جائیں کہ اس وعدہ شکن کو بھولیں (جاں نثار اختر)

دریچے کھل گئے

صدیق عالم
ڈسٹرکٹ جج کورٹ، پورولیا-۱۵۱۳۱۲ے

صبیحہ اپنے مکان سے باہر آئی اور گلی میں کھیلتے ہوئے بچے چیخ پڑے۔

اسکی اپنی کھڑکیوں پر شام کی لالی ابھی تک قائم تھی۔ چچی صائمہ جب سے آئی تھیں، گلی کی طرف کھڑکیاں کو کھولنے کا رواج تقریباً بند کر دیا گیا تھا۔ چچی صائمہ پردہ دار خاتون نہیں تھیں مگر انھیں اس گلی سے خوامخواہ چڑ تھی۔ صبیحہ انھیں سمجھاتی۔ "مگر یہ گلی تو زیادہ تر سنسان پڑی رہتی ہے۔ اور اگر اس میں بچے نہ کھیلیں تو اسکے ہونے کا فائدہ ہی کیا ہے؟" مگر اکیلی صبیحہ گلی کے نکڑ تک پہنچتے پہنچتے چچی صائمہ کا خیال دل سے نکال دیتی اور وہ دیکھتی کہ مین روڈ کے مکانوں کے درخت تاریکی سے لوٹنے لگے ہیں۔ اور کہ ابھی وہ تو اپنے کالج کی تعلیم تک مکمل نہیں کر پائی ہے۔

تو صبیحہ مکان سے باہر آئی اور یکایک گلی میں بچوں نے اپنا کھیل ختم کر دیا۔ "یہ بچے کبھی اچھے گھروں میں پیدا نہیں ہو سکتے" چچی صائمہ نے چھوٹتے ہی اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ "یہ اور ان کے والدین، دونوں سماج کے ناسور ہیں۔ بشرطیکہ ....." اور چچی صائمہ یہ ٹکڑا لگانا کبھی نہ بھولتیں۔ "ان کے کوئی والدین ہوں تو۔ میرا مطلب فوری والدین سے ہے۔" چچی صائمہ عمر میں اس سے دس سال بڑی تھیں۔ مگر یہ دس سال کا فرق دونوں کو ایک دوسرے سے اتنی دور لے گیا تھا کہ جب کبھی صبیحہ کو پلٹ کر چچی صائمہ کی طرف تکنے کا موقع ملتا، اسے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوتی کہ وہ تو چچی کو سمجھ ہی نہیں سکتی۔ پانچ سال پہلے، جب صبیحہ اسکول میں پڑھتی تھی۔ اس نے سنا تھا، چچی صائمہ نے اپنا مذہب بدلنے کے لئے چچا سے طلاق حاصل کر لیا تھا۔

اور اسی سال گرمی کے موسم میں صبیحہ نے گلی کی طرف کھڑکی کھول کر دیکھا۔ چچی صائمہ رکشا سے اتر رہی تھیں۔ اور اپنا مذہب بدلنے کے بعد وہ یکایک لامذہب ہو گئی تھیں اور صبیحہ سے انھوں نے کہا تھا۔ "چھ برس کے اندر میں اپنے خدا کو پا لوں گی۔ اچھا یہ تو بتا خدا کیا ہے؟"

"اوہ انٹی! میرا امتحان سر پہ ہے۔"

"شملہ میں ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔" بعد میں چچی نے مین روڈ پر ٹہلتے ہوئے پراسرار لہجے میں کہا تھا۔ "ایک بار ایسا ہوا کہ میں اس بوڑھی عورت کے نرغے میں آ گئی۔ بہت بور ہوئی میں۔ میں کنونٹ سے کچھ دور ایک پہاڑی سڑک پر کھڑی برفیلی چوٹیوں کی طرف تاک رہی تھی کہ جانے وہ کہاں سے نکل آئی۔ اس نے میری مٹھی پکڑ کر اس میں ایک پتھر تھماتے ہوئے کہا 'بہت جلد تم بچوں سے مانوس ہو جاؤ گی۔' جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ مگر میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ وہ پاگل ہرگز نہیں تھی۔"

"پھر بھی میں اس بوڑھی عورت کو سمجھ نہیں سکتی۔ اور پھر ابھی میری عمر ہی کیا ہے؟" صبیحہ نے کہا تھا۔ اسے ڈھلان پر پٹرول پمپ کے کنارے جھومتے ہوئے یوکلپٹس کے پیڑ پسند نہیں آئے تھے۔ اور نہ ہی بیکری کے شوکیس کے شیشوں پر پینٹ کی ہوئی قیمتیں۔ اسے تو صرف خنک ہوا تک ہی وہ راس آئی تھی۔ اور چچی صائمہ تک "گرچہ وہ ہمیشہ کی مانند سنکی ہو رہی تھیں اور صبیحہ نے فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ وہ چچی صائمہ سے متاثر ہونا بند کر دیگی۔ مگر چچی صائمہ ہر سال گرمی کی چھٹیوں میں آتی رہیں۔ جب صائمہ کے پاس مصروف رہنے کا کوئی بہانہ نہ ہوتا۔ یہاں تک کہ وہ انکی عادی ہو گئی۔

تو گلی سے نکڑ کی طرف جاتے ہوئے صبیحہ سوچ رہی تھی، کالج کے دنوں میں کیا ہر لڑکی میری ہی طرح بے چین رہتی ہے؟" سونیا! سونیا! "ایک چھت سے کوئی لڑکی پکار اٹھی۔ گرمی کی رات چھتوں کو آباد کر دیتی ہے۔ جب سمل، پیپل اور کسم کے درختوں کے نئے پتے فضا میں نرمی دوڑا دیتے ہیں اور یکایک دیر سے کھلے ہوئے کسی اپارٹمنٹ پر ایک عورت چیخ پڑتی ہے۔ شام خوبصورت ہو یا اداس، کچھ لوگوں کی زندگی میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ابھرتا۔ نکڑ پر صبیحہ اکیلی تھی اور یہ خوف اسے کھائے جا رہا تھا کہ کسی بھی لمحے اسٹریٹ لیمپ جل سکتے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ لیمپ کبھی نہ جلیں۔ یہ رات یوں ہی گمنام سی، تاریک سی، چپ چاپ سی پڑی رہے۔ صائمہ چچی اس وقت کیا کر رہی ہونگی۔ انھوں نے ٹیبل لیمپ جلا لیا ہوگا۔ اور اخبار سے انکی نظر پھسلتے پھسلتے کسی بہت ہی معمولی سی شئے پر مرکوز ہو گئی ہوگی۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے۔ "چچی صائمہ اگر آپ کے بچے ہوتے (اور آپ نے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔) تو آپ اس رات کا مطلب سمجھ پائیں۔ دوسرے اور بھی کروڑوں لوگوں کی طرح آپ کے لئے خدا کی ذات صرف ایک بہانہ ہے۔ جب تک آپ کے اندر کی محرومی زندہ رہیگی۔ آپ کو خدا کی ضرورت پڑیگی۔ اس خدا سے فرار حاصل کرنے کے لئے آپ کو اپنی محرومی کے گڑھے سے نکلنا ہوگا۔ تب آپ اپنے اصلی خدا کو پا سکینگی۔

اسٹریٹ لیمپ نیچے ڈھلان تک جل اٹھے اور رات نے بڑھ کر صبیحہ کو اپنی آغوش میں چھپا لیا۔ اسے حیرت تھی کہ بیس برس کی ہو جانے پر بھی اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ مردوں کی انگلیوں کا لمس کیسا ہے؟ میدان کی طرف صبیحہ اتر گئی۔ اور یکایک جنگلے پر جھک کر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ دنیا سے دور،

میں اس خیال سے مڑ مڑ کے دیکھتا ہوں خیالؔ
پس غبار کوئی کارواں تو نہیں (خیالؔ انصاری)

یہاں، اکیلی وہ کس کے لئے اتنی بے چین ہے؟" اس کے پیچھے، سڑک پار کچیلی کھڑکیوں کی قطار ہنس رہی تھی۔ اور تب ہوا ایک مخصوص انداز کے ساتھ چل پڑی، وہ اس کے بال اڑتے اڑتے اس کے چہرے کی طرف لوٹ آتے۔ چچی صائمہ اپنے بال اس طرح سمیٹ کر باندھ لیتی ہیں جیسے وہ پر لگا کر اڑ ہی تو جائینگی۔ انکل عورت کے معاملے میں بڑے بے ڈھنگے رہے ہوں گے۔ ورنہ طلاق کے بعد مجرد کی زندگی نہ گذارتے۔ اس پانچ سال کے عرصہ میں وہ یونان سے مشکل سے پانچ بار بھی نہیں لوٹے ہونگے۔ طلاق کے بعد انھوں نے مونچھیں رکھ لی تھیں جن سے شادی کے بعد انھیں محروم ہونا پڑا تھا کیونکہ صائمہ چچی کو مونچھوں سے ہول آتا تھا۔ اور چچی صائمہ کا ذکر کرتے وقت وہ مسکرانے لگتے "صائمہ میں سب کچھ ہے" وہ کہتے "صرف اس کے اندر اچھی دوست بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ ایسی عورتیں ہمیشہ اپنے ساتھ بے انصافی کی مرتکب ہوتی ہیں۔ مسیح کے صلیب پر چڑھ جانے کا واقعہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر صائمہ جیسی لڑکیاں اپنے لئے ہر موڑ پر ایک صلیب کی تخلیق ضرور کر لیتی ہیں"

"جب تم صائمہ کا ذکر کرتے ہو تو احمق سے لگتے ہو" ابا نے کہا تھا کیونکہ صائمہ چچی کو وہ بچپن سے جانتے تھے جب صائمہ چچی چار سال کی تھی اور ابا دہرادون میں جیو-لاجکل سروے آف انڈیا سے منسلک تھے۔ اور آفس سے واپسی پر صائمہ چچی کے باغ میں صائمہ کے ابا کے ساتھ شعر نشانہ بنایا کرتے اور اردو شاعری کی نئی پود کو تخریبی تنقید کا نشانہ بنایا کرتے۔ بلکہ ایک بار تو وہ صائمہ چچی کے آبا پر عاشق بھی ہو۔ تھے رہ گئے تھے۔ اور ان تمام باتوں کا نتیجہ آخرکار صائمہ چچی اور انکل کی شادی کی شکل میں نکلا تھا۔

جلسے شادی کے علاوہ زندگی کا اور کوئی مقصد ہو ہی نہیں سکتا، صبیحہ واپس لوٹنے لگی۔ سڑک کشادہ تھی۔ نیچے میدان میں چاند ایسے نکلا تھا جیسے کسی نے برف کا ایک بڑا سا گولا میدان کے کنارے رکھ دیا ہو۔ اس کا سایہ تارکول کی سڑک پر پھیلتا جا رہا تھا بیکری کی دکان کا شیشہ تاریک پڑا تھا۔ پٹرول پمپ کی روشنی میں ایک آدمی چار پائی پر بیٹھا بیڑی سے شغل کر رہا تھا۔ ایک لاری پٹرول پمپ سے سڑک پر آگئی اور اس کی ہیڈلائٹس کی روشنی میں صبیحہ کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اس تابناک اندھیرے سے نکلنے کی جد و جہد میں وہ ایک بے بہت سے جھپک سی گئی۔ اور پٹرول پمپ کا آدمی ہنس کی، گھبراہٹ پر ہنس پڑا۔ صبیحہ اس ہنسی کی تلخی کو کسی بھی خانے میں نہ رکھ سکی مگر جب پٹرول پمپ بہت پیچھے ڈھلان میں ڈوب گیا تو یکایک وہ اپنے آپ کو گلی کے نکڑ پر پاکر حیران رہ گئی۔ اپنی اضطرابی کیفیت میں اس نے یہ فاصلہ کس تیزی سے طے کر لیا تھا؟ اسے بہت افسوس ہوا۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ اس نے سوچا چچی صائمہ اب بور ہو کر میرا انتظار شروع کر چکی ہونگی اور مجھے دیکھتے ہی کہینگی۔

"تم اتنی دیر باہر رہ جایا کرتی ہو کہ کوئی بھی یقین نہیں کریگا کہ تم کسی سے ملنے نہیں جاتی۔"

"مجھے کسی کے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟" صبیحہ نے ہر بار کا جملہ زیر لب دہرایا اور ہنس پڑی۔ اسی بہانے وہ بھی اشارے میں کچھ بتا دینا چاہتی ہے۔ جیسے میں نہیں جانتی۔

گلی آس پاس کے مکانوں کی روشنیوں سے نیم تاریک سی ہو رہی تھی۔ وہ عمر میں جتنی بڑی ہو رہی ہے حجم میں یہ گلی اتنی ہی سکڑتی جا رہی ہے۔ اس گلی میں گل مہر کے کچھ پیڑ بھی تھے جو موسم گرما کے آغاز میں لال بھبھوکے سے ہو کر آسمان کے نیچے بکھرے رہتے۔ ایک بار صبیحہ نے گل مہر کے پھولوں کا ایک گچھا لاعلمی میں توڑ لیا تھا۔ اپنے اس جرم کو وہ مدت تک معاف نہ کر سکی تھی۔ مگر یکایک وہ بڑی ہونے لگی اور اس کے بالوں کو پھولوں کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور چچی صائمہ نے ایک دن اسے اپنے سینے سے لگا کر اس کے کان میں کہا تھا۔

"یقین کرو تم خوبصورت ہو۔ میں اگر لڑکا ہوتی تو تمہیں اغوا کر کے لے جاتی۔ ارے تم تو اتنی خوبصورت ہو کہ کوئی بھی لڑکا تمہارے لئے جیل جا سکتا ہے"۔

مگر اس وقت گل مہر کے پیڑ گل مہر کے پیڑ سے نہیں لگ رہے تھے۔ نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو اپنی طرح محسوس کر رہی تھی۔ نہ ہی یہ گلی ہمیشہ کی مانند تنگ نظر آ رہی تھی اور جو سامنے کی کھڑکی سے اکارڈین کی آواز ابل رہی تھی تو یہ ہمیشہ کی طرح بے ہنگم ہوتی ہوئی بھی بے ہنگم سی نہیں لگ رہی تھی۔ اور صبیحہ نے سوچا۔

"صائمہ چچی ٹھیک کہتی ہیں۔ میں جوان ہو رہی ہوں اور واقعہ یہ ہے کہ میں خوبصورت بھی ہوں۔ مگر اس میں میرا کیا قصور؟"

چچی صائمہ اسکی توقع کے خلاف بیٹھک میں نہیں تھیں بلکہ وہ اوپر کی منزل کی اندرونی بالکنی میں چچا کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ اور ان کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ چچا نے اپنا کلین شیوڈ چہرا صبیحہ کی طرف موڑ کر کہا۔

"کل میں صائمہ سے سول میرج کر رہا ہوں۔ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دیکھو میں نے مونچھیں صاف کر لی ہیں"۔

صبیحہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے یہ ہونا ہی تھا جیسے یہ رات اس کے علاوہ کسی انجام تک پہنچ ہی نہیں سکتی تھی اس نے جھک کر چچی صائمہ کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں۔

"تو چچی، میں گلی کی طرف والی کھڑکیاں کھول دوں؟"

پھر چچی کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بیٹھک کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی۔ مگر بیٹھک کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بھونچکی سی رہ گئی۔ گلی کی طرف تمام کھڑکیاں باٹوں باٹ کھلی ہوئی تھیں۔ جن کے باہر چاند روشن تھا۔ گل مہر کے پیڑ ہوا میں سرسرا رہے تھے اور اکارڈین کی آواز تیر رہی تھی۔ صبیحہ پردے کو سرسرا کر اپنے رخسار سے مس ہوتے دیکھ کر چونک پڑی۔ اس نے مڑ کر دیکھا دروازے پر چچی صائمہ چچا کی بانہوں میں بانہیں ڈالے کھڑی تھیں اور مسکراتی نظروں سے صائمہ کی طرف تاک رہی تھیں۔

شاعر حضرات سے

اردو شاعری اور شاعروں سے متعلق ہندی میں پچاس مجموعے ترتیب دینے کے بعد ان دنوں میں ہندی میں ہی قدیم اور جدید شعراء کے منتخب اشعار کا ایک ضخیم مجموعہ مرتب کر رہا ہوں سبھی شاعر حضرات سے درخواست ہے کہ وہ مختلف موضوعات پر اپنے دس ایسے اشعار ارسال فرمائیں جو زبان و بیان اور خیال کے اعتبار سے زبان زد عام ہونے کا حکم رکھتے ہوں۔

شعری ذوق رکھنے والے حضرات و خواتین سے بھی گذارش ہے کہ وہ جدید شعراء کے اپنے پسندیدہ اشعار مجھے بھیجیں۔ اگر ایک شعر بھی منتخب کیا گیا تو، معاون کی حیثیت سے ان کا اسم گرامی مجموعے میں شامل کیا جائے گا۔

پرکاش پنڈت، ۱۳۴۴ جینا بلڈنگ 'شاہدرہ' دہلی - ۳۲

دیمک

محمد طارق
معرفت محمد شفیق انعامدار
قاضی پورہ۔ کھولاپور۔ ۴۴۴۸۰۲
ضلع، امراوتی (مہاراشٹر)

کچھ روز سے وہ گہری سوچ میں ملوث تھا۔ دیر تک جاگتے رہتا تھا۔ بستر پہ چت لیٹے اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے دبائے چھت کی شہتریں تکتے رہتا تھا۔۔۔۔

گھر کے تمام افراد خوش تھے۔ اسکی بوڑھی ماں اور اس کے دو چھوٹے بھائی دو بہنیں۔ تمام کے چہرے آنے والی مسرت سے کھلے ہوئے تھے۔۔۔۔

گھر کی دیواروں کو سپیدی دے دی گئی تھی، بے ترتیب سامان قرینے سے سجا دیا گیا تھا۔ چھت پر تنے ہوئے مکڑی کے جالے، گرد و غبار صاف کر دیئے گئے تھے۔ آنگن کی سطح متوازی کر کے اسے بھی گوبر سے لیپ دیا گیا تھا۔ غرض کہ گھر اندر اور باہر سے لیپ لپا کر تیار کر لیا گیا تھا۔۔۔

گھر کے تمام لوگوں نے خوشی خوشی گھر کو سجانے سنوارنے کا کام کیا تھا۔ وہ بھی اپنے چہرے پر مسرت کا خول چڑھائے ان میں شامل ہوتا رہا تھا۔

رات کی تاریکی میں وہ مسرت کا خول آپ ہی آپ اس کے چہرے سے اتر جاتا تھا۔ اور اس کا رنجیدہ و اداس چہرہ کمرے کی سفید دیواروں کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔۔۔۔

—— جیسے جیسے دن گذر رہے تھے۔ گھر کے تمام افراد کی مسرتیں پر شباب ہونے لگی تھیں۔۔

اور وہ ——!

اس کے ذہن و دل کو لگی ہوئی دیمکیں اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھیں۔۔۔

ڈاکٹر نے ایک دن سے کہا تھا کہ، تم ان دیمکوں کو باہر نکال پھینکو نہیں تو ایک دن وہ تمہیں کھا ہی جائے گی!!"

اور وہ ڈاکٹر کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا تھا کس قدر مایوس کن تھی اسکی مسکراہٹ —— اُف!!

مسکرا کر وہ گمبھیر لہجے میں بولا تھا "ڈاکٹر صاحب! کیسے؟ کیسے پھینک دوں میں انھیں نکال کر، بوڑھی ماں کی بیماری، دو چھوٹے بھائیوں کی پڑھائی آسماں سے باتیں کرتی مہنگائی —— جوانی کی دہلیز پر کھڑی ہوئی میری دو بہنیں —— اور۔۔۔ میرے ناتواں کندھے۔۔۔۔

میں پانچ سو روپے کمانے والا ایک ایماندار کلرک۔۔۔۔۔ میں کیسے پھینکوں ان دیمکوں کو اپنے اندر سے نکال کر —— میں چاہتا تو ہوں انھیں نکالنا۔ مگر جیسے انہیں مجھ سے بے حد پیار ہو گیا ہے۔ میری روح سے، میرے بدن سے —— وہ مجھے کھا کر ہی دم لیں گی شاید!!

آج دیمکیں اسکے ذہن و دل میں کلبلا رہی تھیں اس کے سینے میں شدت کا درد ہو رہا تھا اس قدر شدت کا درد اسے کبھی نہیں ہوا تھا ——

اس نے اپنے اس مرض کا ڈھنڈورا نہیں پیٹا تھا۔ یہاں تک کہ گھر کے کسی فرد کو خبر تک نہیں ہونے دی تھی کیونکہ اسے یہ کبھی گوارا نہیں تھا کہ اپنے دکھ میں کسی اور کو شریک کر کے ان کی زندگیوں کو گھٹن لگا دے ——!

اپنی زندگی کے دکھوں کو وہ مسرت کے خول میں بھر کر اپنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور دوسروں کے ساتھ بھی ——

تمام نے اسے زندہ دل کے لقب سے نوازا تھا۔ وہ زندہ دل، جس کا دل کبھی کا مر چکا تھا —— شاید اسی وقت جب اس کا باپ مرا تھا۔ اور گھر کی تمام تر ذمہ داری اس کے کندھوں پر آ گئی تھی تب ہی، اسی وقت اس نے سوچا تھا کہ میرے باپ کا دل بھی موت سے پہلے ہی مر گیا ہوگا۔ برسوں پہلے ہی وہ بھی میری طرح، اپنے سینے میں مردہ دل کا لوتھڑا لئے زندگی کی گاڑی جس میں ہم سب سوار تھے مریل بیل کی طرح کھینچتا ہوگا ——

میرا باپ —— مریل بیل جس کی ہڈیوں کا تمام گودا پگھل پگھل کر زندگی کی گڑھی میں بہہ گیا ہوگا —— اور گوشت ان دیکھی آگ میں جل کر کباب بن گیا تھا۔ تب اسے۔ اس مریل بیل کو "قصائی" نے ایک دن ذبح کر ڈالا۔

اسی طرح ایک دن اسکی چھری مجھ پر بھی چل جائے گی۔۔۔۔

دیمکیں اس کے ذہن و دل میں کلبلا رہی تھیں چیونٹیاں سی اس کے بدن میں رینگ رہی تھیں۔۔

چار روز بعد اسکی بہن کی شادی تھی۔ بہت انتظار کے بعد اسکی بہن کو رشتہ آیا تھا۔ اس ایماندار کلرک کے گھر۔۔۔۔

اپنی بہن کی شادی کے لئے اس نے چار ہزار روپے "فنڈ" نکالا تھا۔ اور پانچ ہزار روپے "کلرک یونین" سے سود پر قرض لیا تھا۔

سات ہزار کا لڑکے والوں کی مرضی (جس میں لڑکے کی مرضی بھی شامل ہے) کے مطابق جہیز خریدا تھا۔ زیور الگ، جو اسکی ماں کی شادی کا تھا۔ اور دو ہزار روپے قریبی رشتہ داروں، جان پہچان والوں کی دعوت کے لئے رواج سے مجبور ہو کر رکھ دیا تھا ——

اگلے ماہ سے اسے، قرض اور فنڈ وضع ہو کر ماہانہ

کالی گھٹا میں کوندا لپکا، رو کے جو کوئل کوک گئی
جتنی گہری سانس کھینچی تھی اتنی لمبی ہوک گئی (آرزو)

انتظار

ذاکر عزیزی
بنگلہ دیش۔

جب شام کو رمضان علی نعیبن بی کے کاندھے کو اپنے بائیں ہاتھ سے پکڑے ہوئے اور داہنے ہاتھ سے لاٹھی ٹیکتا ہوا محلے کی گلیوں سے گذرتا ہوا بازار کی طرف جا رہا ہوتا، تو محلے کے بچے ان دونوں کے پیچھے یوں تالیاں بجاتے اور شور مچاتے کہ جیسے کوئی بندر والا اپنے بندر کا کرتب دکھانے کے لئے ڈگڈگی بجاتا ہوا گلی سے گذر رہا ہو۔

اور ایسے موقع پر رمضان علی نعیبن بی کے ساتھ خاموشی سے یوں گلی سے گذر جاتا ہے جیسے گلی کے بچے تالیاں بجا بجا کر اس کا شایان شان استقبال کر رہے ہوں۔ اور ایسے اچھلتے اور اچانک استقبال سے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا جاتا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں کہتا۔ اف تک نہیں کرتا۔ مگر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتا۔ اور یوں گھٹن محسوس کرتا جیسے وہ انسان نہ ہو۔ ایک ناسور ہو جو سماج کے جسم میں آہستہ آہستہ رس رہا ہو۔

جب وہ بازار پہنچا تو وہاں کی رونقیں اور گہما گہمی میں کھو کر وہ بچوں کی شرارتوں کو فراموش کر جاتا اور وہ بازار کی ایک ایک گلی ایک ایک موڑ کا چکر کاٹتا ایک ایک دوکاندار کے آگے ہاتھ پھیلاتا اور اللہ کے نام پر بھیک مانگتا اور رات گئے جب وہ اپنے گھر واپس لوٹتا تو اسے تھکن کا شدید احساس ہوتا۔ وہ زمین پر بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ جاتا اور اپنی بجھی ہوئی آنکھوں سے گھر کے تاریک ماحول میں جانے کیا کیا تلاش کرتا۔ اور نعیبن بی گیلی لکڑی سے چولہے میں، آگ پیدا کرنے کی کوشش میں جھنجھلا اٹھتیں۔ اور سارا کمرہ جب دھوئیں سے بھر جاتا تو رمضان علی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگتے اس وقت رمضان علی کے دل میں کرب کا عنصر عود کر آتا۔ اور وہ نعیبن بی سے بڑے ہی ہمدردانہ انداز میں مخاطب ہوتا۔

"نعیمہ بیگم!"

"جی!"

"ایک بات کہوں سنو گی!"

"کہئے بھی۔ کیا بات کہنا چاہتے ہیں۔"

"میں کہنا چاہتا ہوں کہ آخر اس بڑھاپے میں کب تک چولہا پھونکتی رہو گی؟"

"جب تک قسمت میں لکھا ہے۔ چولہا تو پھونکنا ہی پڑیگا۔"

"آخر تم اپنے بیٹے اور بہو کی خبر کیوں نہیں لیتی ہو۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ لوگ زندہ ہیں۔ اور ہمیں ستانے کے لئے کہیں چھپ گئے ہیں۔"

"لیکن میرا دل کہتا ہے کہ غنڈوں نے انھیں لے جا کر قتل کر دیا ہوگا۔"

"کیا کہا نعیمہ بیگم! ایسا بھی ہو سکتا ہے؟"

"ہاں! وہ منظر میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ وہ لوگ اب لوٹ کر کبھی واپس نہیں آئیں گے۔"

"یہ آج کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہو تم۔ چند ہی روز پہلے کی تو بات ہے کہ جب میں ڈھاکہ جا رہا تھا تو شاہد نے کہا تھا۔ 'دادا جان! میرے لئے وہ تین پہیے والی سائیکل ضرور لیتے آیئے گا۔' عابد اور شاہینہ نے کہا تھا 'نہیں دادا جان! اس کے لئے کچھ مت لائیے گا، ہم لوگوں کے لئے چابی والی موٹر ضرور لیتے آیئے گا۔' اور اتنی ساری فرمائش پر تمہیں یاد ہے نسیمہ ان بچوں کو ڈانٹا تھا کہ 'بد تمیز! چپ رہو! تم لوگ دادا جان کو بہت پریشان کرتے ہو۔' اور پھر میں جو ڈھاکے سے واپس لوٹا تو یہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ لوگ مجھے ستانے کے لئے ضرور کہیں روپوش ہو گئے ہیں۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ لوگ زندہ ہیں۔"

اور اس روز نعیبن بی نے رمضان علی کی دل جوئی کے لئے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ "آپ اطمینان رکھیں۔ اگر وہ لوگ زندہ ہوں گے تو ایک نہ ایک دن ضرور ہم لوگوں سے آملیں گے۔" یہ کہہ کر نعیبن بی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔

نعیبن بی کے اس جواب سے رمضان علی کو گرچہ ایک گنا اطمینان ہو جاتا مگر ایک بے چینی تھی کہ جو ہر لمحہ اس کے سینے میں موجزن ہوتی اور وہ دل ہی دل میں بے سکونی کی کیفیت محسوس کرتا رہتا تھا۔

لیکن میں جانتا ہوں کہ رمضان علی کا اب اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ صرف وہ ہے اور اس کی بوڑھی شریک حیات نعیبن بی۔ یہ لوگ پھول باڑی میں رہتے تھے۔ کافی جگہ، زمین کے مالک تھے کھیتی باڑی کے علاوہ غلے کا اچھا خاصا کاروبار تھا۔ ان کا بیٹا سلیم احمد جوان تھا۔ پڑھا لکھا تھا اور کافی ہونہار بھی۔ وہ بھی اپنے باپ کے کاروبار میں ہاتھ بٹاتا تھا گویا یہ گھرانہ بڑا ہی خوش حال گھرانہ تھا۔ مگر کیا کیجیے کہ ملک میں اچانک ایک بہت بڑا انقلاب آیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا ملک درندگی کی لپیٹ میں آ گیا اور انسان مثل شیطان ننگا ناچنے لگا۔

اور کئی ماہ بعد جب رمضان علی ڈھاکہ سے اپنی جان بچا کر پھول باڑی واپس آیا تھا۔ تو اس نے اپنے گھر میں صرف نعیبن بی کو موجود پایا تھا۔ اور جب نعیبن بی نے رمضان علی کو بتایا کہ چند حملہ آور اچانک گھر کا دروازہ توڑ کر کمرے میں داخل ہو گئے تھے اور ہمارے چاند کے ٹکڑوں کو پکڑ کر جانے کہاں لے گئے تو رمضان پر جیسے سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ چند لمحے وہ چپ چاپ پتھر کی مانند کھڑا رہا سلیم کا چہرہ، نسیمہ کا بھولپن۔ شاہد، عابد اور شاہینہ کی معصومیت اور گھر سے لپٹے ہوئے ہنسی اور

قہقہے کے شور نے ایک بار اس کے ذہن کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یہ اس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے اس پرسکون گاؤں میں بھی ایسا ہوسکتا ہے۔ اور اس کے دل کی گہرائی سے خون کی ایک موج اٹھی اور وہ نصیبن بی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر بلک بلک کر رونے لگا۔

پھر رمضان علی کسی طور یہ بات ماننے کے لئے تیار نہ تھا کہ ایسا ظلم اور ایسی بربریت بھی ہوسکتی ہے۔ کیونکہ اس نے دنیا دیکھی ہے۔ ایسا کبھی بھی تو نہیں ہوا پھر آج ایسا کیوں کر ہوسکتا ہے؟۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ یہ سب فریب ہے۔ اور اسے یقین تھا کہ اس کا بیٹا، بہو، اور پوتے پوتیاں اب بھی زندہ ہیں۔ اور اس نے نصیبن بی کے ساتھ انھیں ہر جگہ تلاش کیا۔ ہر شہر، ہر کوچہ، ہر در ودیوار سے پوچھا، لیکن کسی نے ان کا پتہ نہیں بتایا۔ اس کے بیٹے کا سراغ کہیں نہ ملا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوا۔ وہ کہتا تھا مایوسی کفر ہے۔ میں کافر نہیں ہوں۔ اور میں جہاں رہتا ہوں یہ بھی کافروں کا ملک نہیں ہے۔ پھر میرے بچوں کو کون قتل کرسکتا ہے؟ وہ زندہ ہیں اور کہیں دور دیس چلے گئے ہیں۔

انھیں دنوں میں نے رمضان علی اور نصیبن بی کو ریلوے پلیٹ فارم پر بڑے ہی خستہ حال میں دیکھا تھا۔ بھوک اور پیاس سے نڈھال دیکھ کر مجھے ان دونوں پر بڑا ترس آیا تھا۔ اور میں نے انہیں بنی حسن سے کہہ کر کیمپ میں ایک کمرہ نما جھونپڑی الاٹمنٹ کروایا تھا اور ریلیف کارڈ بھی بنوا دیا تھا۔ مگر جوں جوں ریلیف کی مقدار میں کمی واقع ہوتی گئی۔ رمضان علی معاشی طور پر بدحواس ہوتا گیا۔ آخر وہ دن بھی دیکھنا پڑا کہ اپنے پیٹ کی خاطر دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانا پڑا۔ بھیک مانگنا پڑا۔ مگر یہ خیال کہ اس کا بیٹا، اس کی بہو اور اس کے پوتے پوتیاں زندہ ہیں۔ اور ایک نہ ایک روز وہ لوگ ضرور واپس آئیں گے۔ اس کے سینے میں پرورش پاتا رہا۔

اب یہ عالم تھا کہ بوڑھے رمضان علی کی بینائی تقریباً ضائع ہوچکی تھی۔ مگر بیٹے بہو اور پوتے پوتیوں کی یادیں اب بھی اس کی آنکھوں میں روشن تھیں۔ ادھر کئی ماہ سے وہ مستقل میرے گھر پر آنے جانے لگا تھا۔ اور مجھ سے اپنے بیٹے کا کوئی فرضی خط لاکر مجھ سے پڑھواتا، سنتا اور اس کا جواب بھی لکھواتا۔ اس طرح کبھی کبھی وہ ہشاش بشاش اپنے گھر کی طرف لوٹ جاتا اور کبھی کبھی اس کے چہرے پر مردنی اور مایوسی کے بادل چھا جاتے۔ جیسے اب اس کا بیٹا کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔ وہ بڑا ظالم اور بے مروت ثابت ہوا، جو خوامخواہ اپنے والدین کو ستا رہا ہے۔

ایک روز وہ میرے یہاں آیا اور کہنے لگا۔

"شاکر صاحب! یہ دیکھئے کل میرے بیٹے سلیم کا خط آیا ہے۔ ذرا پڑھ کر تو سنائیے۔ میرے بیٹے نے کیا لکھا ہے؟"

میں نے وہ پوسٹ کارڈ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ یہ پاکستان کے زمانے کا پرانا پوسٹ کارڈ تھا۔ میں نے ایک نظر پوسٹ کارڈ پر ڈالی اور دوسری نظر بوڑھے رمضان علی پر۔ اس کا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔ چہرے پر ایک تجسس کی کیفیت طاری تھی کہ پتہ نہیں اس کے بیٹے نے کیا لکھا ہے۔ مجھے اس روز بھی اس پر بڑا ترس آیا۔ میں نے دل میں سوچا آخر اس شخص کو میں کیا پڑھ کر سناؤں۔ اسے کیوں یقین نہیں آتا ہے کہ اس کا بیٹا عرصہ ہوا شہید ہو چکا ہے۔

"کیا ہوا شاکر صاحب!" "آپ خاموش کیوں ہیں۔ پڑھ کر سنائیے بھی تو سہی۔ کیا لکھا ہے میرے بیٹے نے؟"

میرے اندر یہ حوصلہ نہیں تھا کہ اسے صاف صاف کہہ دوں کہ بڑے میاں یہ تو پرانا خط ہے۔ تمہارا بیٹا تو کب کا مرچکا ہے۔ پرانی لکیریں کیوں پیٹ رہے ہو۔ مگر یہ میں نہیں کہہ سکا۔ بلکہ میں نے اس کی دل جوئی کی خاطر یوں ہی خط کا فرضی مضمون پڑھ کر سنایا۔

ابا جان! تسلیم عرض کرتا ہوں۔

عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ لوگ برا نہیں منائیں گے۔ یہاں آنے کے بعد مجھے کافی جدوجہد کرنی پڑی ہے۔ اور اب یہاں ہوائی جہاز میں پائلٹ کی حیثیت سے ملازمت کر رہا ہوں۔ بچے اسکول میں پڑھ رہے ہیں۔ شاہد، عابد اور شاہینہ وغیرہ آپ لوگوں کو بہت یاد کرتے ہیں اور آپ لوگوں کو سلام لکھواتے ہیں۔ میں اس کوشش میں ہوں کہ آپ کو اور امی کو جلد کراچی بلوا لوں۔ ہم لوگ آپ لوگوں کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔ چند روز اور صبر کیجئے۔

امی کو سلام عرض کیجئے ـــــ آپ کا بیٹا۔

سلیم احمد۔

پھر میں نے دیکھا کہ خط کا مضمون سننے کے بعد رمضان علی کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ فرطِ جذبات سے وہ کانپنے لگا اور مجھ سے مخاطب ہوکر بولا۔

"دیکھا شاکر صاحب! میں نہ کہتا تھا کہ میرا بیٹا زندہ ہے اور ایک نہ ایک روز ضرور ہم لوگوں کو اپنے پاس بلالے گا۔ ذرا آپ ایک اور تکلیف کریں کہ اس کا جواب بھی لکھ دیں۔ بڑی مہربانی ہوگی شاکر صاحب! بڑی مہربانی ہوگی۔ لکھ دیجئے کہ سلیم بیٹا! تمہارا خط پانے کے بعد مجھے یہ آرزو ہونے لگی کہ جیسے میرے جسم میں پر لگ جائیں۔ اور میں اڑ کر تمہارے پاس چلا آؤں۔ اور اپنی شاہینہ گڑیا کو ہوائی جہاز پر بٹھا کر ساری دنیا کی سیر کراؤں اور لکھ دیجئے کہ شاہینہ کی چابی والی موٹر ہمارے پاس محفوظ ہے۔ شاہد اور عابد کی تین پہیے والی سائیکل بھی اور.........اور........."

پھر یہ سب کہہ کر وہ اداس ہوگیا اور بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ "مگر شاکر صاحب! خط لکھنے کی بجائے وہ یہاں خود کیوں نہیں چلا آتا ہے"۔ اس روز میری آنکھ کے کٹورے بھی آنسوؤں سے لبریز ہوگئے تھے۔

کئی روز کے بعد ایک شام کو جب رمضان علی کا اس گلی سے گذر ہوا تو بچوں کے شور کے ساتھ نصیبن بی کے بھی چیخنے کی آواز گلی میں گونج رہی تھی۔ کسی شریر بچے نے بوڑھے رمضان علی کے سر پر ایک پتھر دے مارا تھا۔ اور بوڑھا رمضان علی نیوراکر وہیں زمین پر لیٹ گیا تھا۔ سر سے سرخ سرخ خون ابل رہا تھا۔ اور نصیبن بی اپنا آنچل آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر بچوں کو کوس رہی تھیں۔

"ارے ظالمو! تیرے ہاتھ ٹوٹیں۔ تیرا بھی اللہ چاہے گا تو یہی حشر ہوگا۔ شیطانو! سور کے بچے کمینے، بدمعاش......"

"چپ رہو نصیبہ بیگم! چپ رہو۔ ان بچوں کو کچھ نہ کہو۔ یہ بچے ہیں۔ آخر میرے شاہد اور عابد بھی تو شریر ہیں۔ وہ بھی تو شرارتیں کرتے تھے۔ تمہیں یاد نہیں شاہد نے بھی تو ایک بار غلیل سے ایک راہ گیر کے سر کو زخمی کر دیا تھا اور کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ خاموش رہو نصیبہ! یہ ہمارے بچے ہیں۔

دل جو دھڑکا تو یوں جاگ اٹھی

میں نے [illegible] (شاہد صدیقی)

انہیں مت کوسو۔ انھیں گالیاں مت دو۔"

پھر وہ زمین پر سے اٹھا۔ اور نعیمن بی نے کپڑا جلا کر اس کی راکھ کو اس کے زخم پر رکھ دیا۔ خون بند ہوگیا اور رمضان علی نعیمن بی کے ساتھ لاٹھی ٹیکتا ہوا دھیرے دھیرے بازار کی طرف یوں چل پڑا جیسے وہ بھیک مانگنے نہیں جا رہا ہو بلکہ وہ اپنے بیٹے کے پاس یہ شکایت لے کر جا رہا ہو کہ دیکھو تمہارے شاہد اور عابد نے یہ کیا شرارت کی ہے ہمارے ساتھ۔

ایک روز صبح سویرے وہ پھر وہی پوسٹ کارڈ لے کر میرے پاس آیا۔

"شاکر صاحب! کل ہی ڈاکیہ نے یہ خط دیا ہے پڑھئے تو سلیم نے کیا لکھا ہے؟"

اس روز میں کچھ جلدی میں تھا۔ ایک جگہ نئی نئی ملازمت ملی تھی۔ اور وہاں پہونچنے کا وقت تقریباً ہو چلا تھا۔ مگر بوڑھے رمضان علی کی دلشکنی بھی مجھے منظور نہیں تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے کارڈ لے لیا اور گویا پڑھ کر سنا دیا۔ اس کے بیٹے نے لکھا تھا۔

"ابا جان، تسلیمات!

کل ہوائی جہاز لے کر میں بیروت جا رہا ہوں۔ ایک ہفتہ کے بعد وہاں سے لوٹوں گا۔ وہاں سے واپسی پر آپ کے لئے کلیرنس روانہ کر دوں گا۔ کلیرنس کا کام کچھ باقی رہ گیا ہے۔ شاہد، عابد اور شاہینہ دادا اور دادی کو سلام لکھواتے ہیں۔ بہو بھی سلام عرض کرتی ہے۔ آپ کا بیٹا: سلیم احمد۔"

خط کا فرضی مضمون سنا کر میں دفتر کی طرف چلا گیا۔

کئی روز تک پھر رمضان علی میرے پاس نہیں آیا۔ بازار میں بھیک مانگتے ہوئے بھی وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ استفسار پر بیگم نے بتایا کہ "رمضان علی چچا کئی روز سے بیمار ہیں۔"

میں اسی وقت اس کے گھر پر گیا تو دیکھا کہ وہ چٹائی پر چت لیٹا ہوا تھا۔ اور نعیمن بی پائنتی میں دائیں بیٹھی اس کے پاؤں دبا رہی تھیں۔ میرے پاؤں کی آہٹ پا کر بوڑھے رمضان علی نے پوچھا۔

"کون ہے نعیمہ بیگم! دیکھو تو کون آیا ہے کیا!"

"میں ہوں رمضان چچا، میں ہوں، شاکر۔"

"ارے شاکر بابو! کہاں غائب تھے اتنے دنوں سے، میرے بیٹے کا ایک خط اور آیا ہے۔"

اس نے آہستہ آہستہ کروٹ بدل کر تکئے کے نیچے سے وہی پوسٹ کارڈ نکالا اور مجھے تھماتے ہوئے کہا

"ذرا پڑھئے تو شاکر صاحب! یہ خط میرے سلیم نے بیروت سے بھیجا ہے۔"

"میں نے اس کے ہاتھ سے وہ پوسٹ کارڈ لے لیا۔ یہ وہی پرانا پوسٹ کارڈ تھا۔ جانے کیوں مجھے اس دن بڑے میاں کی یہ روز روز کی حرکت بری لگی۔ عجیب پاگل ہے، دیوانہ ہے۔ اسے یقین کیوں نہیں آتا ہے کہ اس کا بیٹا عرصہ ہوا شہید ہو چکا ہے۔ بستر پر سنجار میں تپ رہا ہے۔ مگر اس بیٹے کی یاد ابھی تک اپنے تاریک سینے میں روشن کئے ہوئے ہے۔ پھر میں نے اس سے کہا۔

"رمضان چچا! یہ خط بیروت سے نہیں کراچی سے آیا ہے"۔

اور خوشی سے اس کا سارا جسم کانپنے لگا۔ جیسے اس کا خط نہیں بلکہ اس کا بیٹا سلیم دروازے پر آگیا ہو۔ اور رمضان علی اس کے استقبال کے لئے دوڑ کر دروازے تک جانا چاہ رہا ہو۔ پھر اس نے بڑے تجسس سے پوچھا۔

"کیا لکھا ہے میرے سلیم نے، ذرا جلدی پڑھ کر سنائیے شاکر بابو!"

"اس نے لکھا ہے سلیم کے ایک دوست نے لکھا ہے کہ بیروت سے آنے والا جہاز راستے میں حادثے کا شکار ہوگیا۔ اور سلیم اس حادثے میں ہلاک ہوگیا۔"

بے ساختہ میری زبان سے یہ فرضی جملے یوں نکلے جیسے اچانک کمان سے تیر چھوٹ گیا ہو۔ اور میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ جانے اس بوڑھے رمضان پر ان جملوں کا کیا اثر ہوا ہوگا۔ کہ رمضان علی نے اسی لمحہ تیور بدل کر کہا۔

"نہیں شاکر صاحب! میرا بیٹا کبھی نہیں مر سکتا یہ خط اس کے دوست نے نہیں لکھا ہے بلکہ کسی دشمن نے مجھے پریشان کرنے کے لئے ایسا لکھا ہے۔ میرا دل کہتا ہے شاکر صاحب کہ وہ زندہ ہے"۔

اور یکایک اس کی آواز بھرا گئی۔ پھر اس نے کہا۔

"شاکر صاحب! وہ ایک نہ ایک دن ضرور لوٹ کر آئے گا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ لے کر آپ کے پاس آؤں گا۔ اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ وہ زندہ ہے۔"

پھر میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں اس نے آخری بار ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور جیسے آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"جس بیٹے کو دیکھنے کے لئے چھ سال سے یہ بوڑھی آنکھیں ترس رہی ہیں۔ بھلا وہ کیسے مر سکتا ہے شاکر صاحب! ذرا سوچئے تو کہ وہ کیسے مر سکتا ہے، وہ کبھی نہیں مر سکتا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ اور میں حیرت بھری نگاہوں سے اس کے چہرے کو تکتا رہ گیا۔

بقیہ:—

دیمک...

تنخواہ میں سے ڈیڑھ سو روپے ملنے والے تھے —
ڈیڑھ سو روپے... اور... اور
اس کے ذہن و دل میں دیمکیں بڑھتی گئیں —
کلبلانے گئیں...

دل کے درد میں شدت سے اضافہ ہونے لگا——
اس کا بدن پسینہ میں شرابور ہوگیا۔ اسے اپنی ہڈیوں میں گودا گھلتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

یکلخت پھر اسے ایسا لگا جیسے کسی بے رحم قصائی نے اس کے دل میں چھرا گھونپ دیا ہو اس کے ہونٹوں سے ایک غمناک کراہ نکلی ۔سر ایک طرف لڑھک گیا...۔

"آدمی کا حقیقی کردار اس وقت پہچانا جا سکتا ہے۔ جب وہ ایسے وقت میں بھی ارتکاب جرم سے باز رہے جب اسے یقین ہو کہ اس پر شک بھی نہیں کیا جائے گا ——
(میکالے)

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کر لے — ہم تو کل خواب عدم میں شب ہجراں ہوں گے (مومن)

پاکدامن

س۔ ن۔ فہمی
(سید نصیر الدین فہمی)
خالصپور۔ کھلنا
بنگلہ دیش۔

اللہ ہی جانے ایسی کیا بات تھی کہ جب کبھی اس سے آنکھیں چار ہوتیں میں لرز جاتا اور اپنا وجود اس کی تیز نگاہوں میں مجھے ڈولتا محسوس ہوتا۔ گرچہ میری ہمیشہ یہ کوشش ہوتی کہ اس سے سامنا نہ ہو کیونکہ آنکھوں سے دل اور دل سے جگر تک یہ تیر نظر اترتا چلا جاتا ہے جسکی خلش آدمی کو ناکارہ بنادیتی ہے۔ اور یہ کہ وہ فقط نگاہ سے ہوتا ہے فیصلہ دل کا بھی اسی طرح ایک حقیقت ہے جیسے آنکھوں کا تھا قصور چھری دل پہ چل گئی، اور میں اسی گھائل ہونے کے خوف سے سہما رہتا مگر وہ ہر آن میری ٹوہ میں لگی رہتی تھی۔

میں اب اس مقام پر ہوں جہاں عشق و محبت کی آنکھ مچولی، بے معنی ہوکر رہجاتی ہے۔ میں بھلا ایک شادی شدہ مرد، تین تین بچوں کا باپ، میرے کاندھوں پر بے شمار ذمہ داریاں، میرے اردگرد سماجی قیود کا پہرہ اور ہر آن عزت خاک میں مل جانے کا خوف ذہن پر سوار رہتا۔ آخر کسی طرح اور کس برتے پر اس کی گرم نگاہی کی تاب لاتا! اس کی مست نظروں سے چھلکتے ہوئے جام کو اپنے ہونٹوں سے لگا لیتا؟ یا محبت کا جواب محبت سے دینے کی کوشش کرتا؟

شہروں کی بڑھتی ہوئی آبادی، آسمان سے باتیں کرتی ہوئی گرانی اور دیگر اشیائے تصرف کی نرخوں کے ساتھ ساتھ رہائشی مکان کے کرایے میں اضافے کے باعث لوگ دالان سے کمروں اور کمروں سے چھوٹے ڈربوں میں چپ چاپ سمٹتے جا رہے ہیں۔ ایک ایک باڑی میں چھ چھ، آٹھ آٹھ کرایہ دار مختصر مختصر سے کمروں میں بال بچوں سمیت اس طرح ٹھنسے ہوئے ہیں جیسے باڑے میں ریوڑ یا ڈربوں میں مرغیاں۔ وہ بھی ہماری طرح ایک کرایہ دار کی حیثیت سے اس بڑی سی باڑی میں پچھلے دو ماہ سے رہتی چلی آرہی تھی۔ اس کا نام تھا رشیاں اور اس کے ساتھ بیوہ ماں اور دو کم عمر بہن بھائی تھے۔ ان تینوں کی کفالت وہ ایک بیرونی امدادی ادارے میں ملازمت کے ذریعہ کرتی تھی ——— گرچہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کی ملازمت آج بھی معیوب خیال کی جاتی ہے۔ مگر ملک کے نام کی تبدیلی نے اس عیب کو مجبوری کا لبادہ فراہم کردیا ہے اور اس جیسی ہزاروں جوان اور کنواری لڑکیاں اپنے بوسیدہ حال خاندان والوں کی کفالت کا ذریعہ بنی ہوئی ہیں۔

۲۲،۲۳ سال کی عمر، گورا رنگ، لمبا قد، تبی کی طرح کھڑی ناک، خمیدہ ابرو، غلافی آنکھیں اور پتلے پتلے ہونٹ۔ غرض وہ حسن و خوبصورتی کی ایک منہ بولتی مورت تھی۔ مگر اس کی مثال گلاب کے اس پھول جیسی تھی جسکے پودے کو کبھی سینچا نہ گیا ہو۔ جو غلطی سے کھل تو گیا ہو مگر غسل شبنم کو ترس رہا ہو ——— مجھے اس کے جذبۂ ایثار اور خزاں رسیدہ زندگی پر ترس آتا اور میں اسے احترام کی نظروں سے دیکھتا لیکن میں جب بھی باہر سے گھر آتا، یا جب تک گھر میں موجود رہتا وہ کسی نہ کسی بہانے ہمارے گھر آتی، بیگم سے چھیڑ چھیڑ کر باتیں کرتی، اس کے کام میں مددگار ہوتی، ہمارے بچوں کو گود لیتی اور بار بار میری طرف مڑ کر دیکھنے کی کوشش ضرور کرتی۔ میں اس صورتحال سے بوکھلا کر رہ گیا تھا اور ہر وقت وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ کا ورد کرتا رہتا۔ مجھے ہر وقت یہ فکر دامن گیر رہنے لگی کہ باڑی کے دوسرے کرایہ داروں کو اگر ذرہ برابر بھی شک ہوجائے کہ وہ کیوں ہر وقت میرے گھر کا چکر لگاتی رہتی ہے تو 'بواؤں' اور 'خالاؤں' کی چل نکلیگی اور ان کی کانا پھوسی اور 'نوچ' مجھے دوسرے مکان کی تلاش پر مجبور کرکے ہی چھوڑیگی۔ اور اس صنعتی علاقے میں مکان کی تلاش جوئے شیر لانے سے کسی طور کم نہیں۔ لاچار مصروفیت کا بہانہ بناکر میں زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہنے لگا۔

——— یہ صورت حال کئی مہینوں تک قائم رہی۔ آخر میں نے جوئے شیر کی تلاش پر خود کو کمربستہ کرلیا۔ کیونکہ گھنٹوں گھر سے اور بال بچوں سے دوری مجھے بے حد مہنگی پڑنے لگی تھی۔ مگر انھیں دنوں خدا کو میرے حالِ زار پر ترس آگیا۔ وہ لوگ اس مکان سے ہی نہیں بلکہ اس شہر سے بھی چلے گئے۔ میری جان کو ہوا لگی۔ شکرانے کے طور پر شیرنی فاتحہ کراکر پڑوس میں تقسیم کرائی اور مطمئن ہوگیا۔

ایک روز میں اپنا البم الٹ پلٹ رہا تھا کہ ایک خالی جگہ کو دیکھ کر مجھے ٹھٹھک جانا پڑا۔ پھر پورے البم کو ہی کھنگال ڈالا مگر تجسس میں کمی نہ آئی۔ بیگم سے استفسار کیا "اس جگہ ایک تصویر تھی کیا ہوئی؟" جواب ملا "وہ تو رشیاں لے گئی"۔ "ہیں! رشیاں لے گئی؟ مگر اسے دی کس نے؟ پھر تم جانتی تھیں کہ وہ میری سب سے اچھی تصویر تھی۔ دینے سے پہلے مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا۔ ہونہہ۔ مجھے پتہ تھا کہ اس کی بے طرح آمد و رفت ضرور گل کھلا کر رہے گی۔ عجیب واہیات لڑکی تھی۔ نہ جانے باہر وہ کیا کیا کرتی ہوگی؟ کمبخت ہر وقت مجھے گھور گھور کر دیکھا کرتی تھی۔ میں آج تم کو بتاتا ہوں کہ صرف اسی کی وجہ سے میں نے ان دنوں گھر رہنا کم کردیا تھا۔ مگر افسوس ہے بیگم کہ تم عورت ہوکر بھی اسے نہ پہچان سکیں"۔

"توبہ! توبہ!! آپ بھی آج کیسی باتیں کررہے ہیں؟"

(باقی صفحہ ۱۶۴)

یہی معیار تجارت ہے تو کل کا تاجر
برف کے باٹ لیے دھوپ میں بیٹھا ہوگا (شکیب جلالی)

"عفریت"

ایم۔ یوسف۔ ایم۔ اے۔ بی۔ ایڈ
۱۱۵/۱۰ نیتاجی تحریک، وانوری،
پونہ - ۴۱۱۰۰۱

چلتے چلتے جب پیروں کی طاقت جواب دینے لگی اور تکان سے بدن ٹوٹنے لگا تو میں سستانے کے لیے راستے کے کنارے ایک گھنے اور سایہ دار پیڑ کے نیچے لیٹ گیا اور آنکھیں موند لیں۔ کچھ لمحوں کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے فرحت بخش جھونکوں نے ایک ماں کی طرح تھپک تھپک کر مجھے سلا دیا۔

اچانک مجھے محسوس ہوا کہ زمین ہل رہی ہے اس کے ساتھ ہی فضا میں تپش کا بھی احساس ہونے لگا جو بتدریج بڑھتی چلی جا رہی تھی اور رفتہ رفتہ وہ اتنی شدت اختیار کر گئی کہ میں پسینہ میں شرابور ہو گیا۔ چند ثانیوں کے بعد مجھے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دینے لگی، جس میں بچوں، عورتوں اور مردوں کی خوف اور درد و کرب میں ڈوبی ہوئی چیخیں بھی شامل تھیں۔ میں سوچنے لگا شاید قیامت برپا ہو گئی ہے اور اہل دنیا کو میدان حشر کی طرف ہانکا جا رہا ہے۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ دوڑتے ہوئے لوگ میرے سامنے آ گئے۔ ان کے زرد اور خوف زدہ چہرے دیکھ کر میرا دل دہل گیا۔ دوڑتے ہوئے وہ بار بار پیچھے مڑ کر بھی دیکھ لیتے تھے۔ شاید کوئی ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ ان کی خوف زدگی سے متاثر ہو کر میں بھی ان کے ساتھ بھاگ نکلنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ ذوقِ تجسس نے میرے قدموں کو جکڑ لیا۔ میرے دل میں تعاقب کرنے والوں کو ایک نظر دیکھ لینے کی خواہش پیدا ہو گئی۔ چنانچہ میں وہیں رکا رہا اور میری نگاہیں اسی سمت میں نگراں ہو گئیں جہاں سے متعاقب کے آنے کا گمان تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد لوگوں کے عقب میں ایک عجیب و غریب اور ہیبت ناک 'عفریت' دکھائی دیا جس کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے جو قریب و جوار کی تمام چیزوں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر رہے تھے۔ اس کے غار جیسے کھلے ہوئے منہ سے سانس تباہ کن آندھی کی طرح خارج ہو رہی تھی جس کی زد میں آ کر بڑے بڑے پتھر، چھوٹے چھوٹے کنکروں کے مانند اڑ رہے تھے۔ اس کے لمبے لمبے اور طاقتور ہاتھوں میں بجلی کی طرح چمکنے والی ننگی تلواریں تھیں جو زد میں آئے ہوئے لوگوں کی گردنوں کو گاجر اور مولی کی طرح کاٹتی چلی جا رہی تھیں۔ اس کے لانبے اور بھاری پیروں سے لپٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے زمین ہل رہی تھی۔

اس ہیبت ناک عفریت کو دیکھ کر میری گھگھی بندھ گئی اور خوف سے میری آنکھیں بند ہو گئیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے چاروں طرف آگ کی لپٹیں محسوس ہوئیں۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ دیو پیکر مخلوق میرے سر پر کھڑی تھی۔ اس نے تلوار کی نوک میرے سینے پر رکھ دی اور بادلوں کی سی گرج رکھنے والی آواز میں مجھے مخاطب کیا۔

" اے ذلیل انسان! مجھے دیکھ کر بھی تیرا بے خوفی کے ساتھ یہاں رکا رہنا میری قوت و جلال کی توہین ہے۔ تیری یہ گستاخی میں ہرگز برداشت نہیں کر سکتا میں تیرے وجود کو خاک میں ملا دوں گا"۔

اس کی یہ باتیں سن کر میری روح فنا ہونے لگی۔ لیکن جونہی مجھے یہ خیال آیا کہ میں انسان ہوں، اشرف المخلوقات ہوں، خدا نے مجھے دیگر مخلوقات کے مقابلے میں بے پناہ صلاحیتوں، قوتوں اور حوصلوں کا خزانہ بخشا ہے، اس دہشت کا اثر زائل ہونے لگا اور مجھے اپنے اندر ایک بے پناہ قوت پیدا ہوتی محسوس ہوئی۔ اور میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا اور اس کی شعلہ بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے مخاطب کیا "میں تجھ سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں اور تیرا مقابلہ کرنے کے لیے میں نے کمر کس لی ہے لیکن اس مقابلہ سے پہلے میں جاننا چاہوں گا کہ تو کون ہے؟" اس نے اپنے چوڑے چکلے، چٹان کی طرح مضبوط سینے پر ہاتھ مار کر کہا "میں فساد ہوں، تباہی و بربادی کا نقیب، غارت گرِ امن و سکون، غاصبِ عصمت و آبرو! میرے ایک ہاتھ میں موت ہے اور دوسرے میں تخریب! میری آنکھوں میں انسانوں کے لیے نفرت و عداوت کے شعلے ہیں جو ہر چیز کو جلا کر راکھ کر دیتے ہیں۔ میرے قدموں کی ٹھوکریں زلزلے پیدا کرتی ہیں۔ اور زمین کو تہس نہس کر دیتی ہیں"۔!!! میں نے کہا "اے اپنی طاقت پر گھمنڈ کرنے والے، سن! میں اشرف المخلوقات ہوں۔ بظاہر میں ضعیف و ناتواں سہی لیکن کائنات کو مسخر کرنے کی طاقت رکھتا ہوں۔ تیری میرے سامنے کوئی حقیقت نہیں ہے میں محبت و انسانیت کی ٹھنڈک سے تیری آنکھوں میں بھڑکنے والے نفرت و عداوت کے آتش کدوں کو سرد کر دوں گا۔ تیرے ہاتھوں سے انسانیت کا خون بہانے والی تلواروں کو چھین کر انھیں اتحاد و اتفاق کے گلشن سجانے کی صلاحیت بخشوں گا۔ جہاں محبت و غم گساری، صلح و آشتی اور امن و سکون کے پھول کھلیں گے"۔

میری یہ باتیں سنتے ہی اس عفریت کی آنکھوں سے نکلنے والے شعلے یکلخت بجھ گئے۔ اس کے ہاتھوں سے ننگی تلواریں گر پڑیں۔ اس کے بھاری قدم کانپنے لگے اور وہ ایک اکھڑے ہوئے درخت کی طرح

زندہ انگڑائی

مشتاق احمد عرب
مومن پورہ - پونہ -

اس رات جب میں اپنے فلیٹ پر پہونچا تو میرے ذہن میں خیالات کا ایک طوفان برپا تھا۔ میں سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے صوفے میں دھنس گیا یادوں کے بند دریچے پے بہ پے کھلتے گئے۔ میرے تصور کے پردے پر صرف کوثر کا چہرہ تھا۔

کوثر .... سنجیدگی کی مورت

اس سے پہلی ملاقات یونیورسٹی کے ہال میں ہوئی تھی اس کی شخصیت عام لڑکیوں جیسی نہیں تھی اس کے چہرے کی سنجیدگی، غیر معمولی ذہانت کا پتہ دیتی تھی اس دن یونیورسٹی میں پنڈت جواہر لال نہرو کی سالگرہ کا جشن منایا جارہا تھا۔ اور تقریری مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ جلسے کے دوران وہ اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی تھی۔ مقابلہ ہوا۔ تقسیم انعامات کے وقت میری کامیابی کا اعلان کرتے ہوئے یونیورسٹی کی جانب سے مجھے طلائی تمغہ پیش کیا گیا۔ تالیوں کے شور میں جب میں تمغہ لے کر اپنی نشست پر پہونچا تو ایک مترنم آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

"مبارک ہو"

"شکریہ" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس رسمی گفتگو نے میرے دل میں عجیب سی نہ ختم ہونے والی کسک پیدا کردی تھی دوبارہ ملاقات کے لیے میرا دل بے تاب رہا۔

کرسمس کی تعطیلات کے بعد ایک دن جب میں یونیورسٹی کے لان کے ایک گوشے میں بیٹھا انگریزی میگزین دیکھ رہا تھا کہ اسی مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"ہیلو مسٹر سلیم"

اوہ کوثر تم! میں حیرت زدہ اس کی طرف دیکھنے لگا۔

بیٹھو۔ میں نے لان کی ہریالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہری بھری گھاس کے مخملیں فرش پہ بیٹھے ہوئے ہم کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔

اس دن کے بعد ہم روزانہ ملنے لگے۔ اس کا قرب پاکر میں محسوس کرنے لگا کہ میرے اندر کوئی انجانی حس بیدار ہوچکی ہے۔ رفتہ رفتہ میرے دل میں اسکی محبت کی شمع روشن ہونے لگی۔ لاکھ کوششوں کے باوجود میں اپنا مدعا بیان کرنے سے قاصر رہا۔ ہر دفعہ میرے عزم کا دامن اسکے سنجیدہ شخصیت کے سامنے میرے ہاتھوں سے چھوٹ جاتا اور پھر کوثر سے ملاقاتوں نے ایسا موقع ہی نہ دیا جو اظہار محبت کے لیے سازگار ہو سکے۔

ایک خوش گوار سی شام تھی، ہم گاندھی پارک کے الگ گوشے میں بیٹھے بحث کررہے تھے۔ باتوں باتوں میں میں نے اس سے پوچھا "کوثر! تم نے کسی سے پیار کیا ہے؟ میرا مطلب ہے تم نے کسی کو چاہا ہے! میرے اس سوال پر وہ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھی رہی۔ کچھ وقفہ کے بعد اس نے اپنا سر اٹھا کر کہا "سلیم! محبت وہ آگ ہے جس سے کھیل کر میں نے کسی کو چین سے زندگی گزارتے نہیں دیکھا۔ زندگی کی آزادی کو بے چینی میں بدل کر جینا مجھے پسند نہیں"...... اس کے اس فلسفیانہ جواب کو سن کر میرے دل پر پہلی بار چوٹ کا احساس ہوا۔

وقت گزرتا رہا ..... اس دوران کوثر سے جتنی ملاقاتیں ہوئیں وہ ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ میرے دل میں اس خواہش نے بار بار جنم لیا کہ میں اسے اپنا ہم سفر بنالوں لیکن وہ صرف میری ہم نشیں ثابت ہوئی۔

امتحانات ختم ہونے کے بعد کوثر اپنے وطن چلی گئی۔ اور میں اپنے وطن۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد میں نے ملازمت اختیار کرلی۔ ملازمت کی مصروفیتوں سے میرے ماضی کے نقوش ذہن میں دھندلے ہوکر رہ گئے۔ پانچ برس گذر گئے۔ اس مختصر سے عرصے میں بہت ساری تبدیلیاں آگئیں۔ اسی دوران میرا تبادلہ بمبئی ہوگیا۔

صاحب! کھانا لگاؤں؟"

مجھے بھوک نہیں ہے۔ تم کھالو ..... میں نے راموسے کہا

صبح جب آفس جانے کے لیے نکلا تو بس اسٹاپ پر اچانک میری نظر ٹھہر گئی۔ کوثر کو بس اسٹاپ پر کھڑی دیکھ کر میں سکتے میں آگیا۔ دوسرے ہی پل اس نے مجھے دیکھ لیا۔ غالباً وہ بھی مجھے پہچان گئی۔ غم و خوشی کے ملے جلے جذبات لے کر میں اس تک پہونچا۔

کوثر تم!

سلیم! میں تمہاری ہی تلاش میں تھی۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ تمہارا تبادلہ اسی شہر میں ہوا ہے۔

مگر کوثر! تم یہاں کیسے؟

کیا ساری باتیں یہیں پوچھوگے۔ آؤ کہیں چلتے ہیں پھر باتیں ہونگی۔ ہم دونوں ٹیکسی سے پورب ریسٹورنٹ پہنچ گئے۔ ٹیکسی میں دونوں اپنے خیالات میں گم تھے ریسٹورنٹ پہنچتے ہی میں نے نشست کے لیے ایک گوشہ منتخب کیا اور بیرے کو چائے کا آرڈر دے کر گفتگو کا آغاز کیا۔ کوثر نے بتایا۔

"میں یہاں مہاراشٹر کالج میں بحیثیت لکچرار کام کررہی ہوں"

"کہاں رہتی ہو؟"

"باندرہ میں ایک فلیٹ کرایے پر لے رکھا ہے"

"اور تمہارے شوہر؟"

میرے اس سوال پر کوثر ایکدم اداس ہوگئی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے اس سوال نے اسے الجھنوں کے کنوئیں میں دھکیل دیا ہو۔

یہ منصب بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں (ذکی دہلوی)

معلوم ہوتا ہے جیسے تم بہت پریشان ہو؟" میں نے تجسس آمیز نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا

اوہ سلیم! میں تمہیں کیسے بتاؤں زندگی نے میرے ساتھ کتنا بڑا مذاق کیا ہے۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد میری ماں نے میری شادی ایک بڑے بزنس مین سے کردی۔ ایک سال تو ہم ساتھ رہے کبھی کبھی وہ بزنس کے سلسلے میں دوسرے شہر بھی جایا کرتے ہیں لیکن پچھلے تین سال سے وہ بزنس کے بہانے سنگاپور میں رہنے لگے ہیں۔

"پھر"؟

شروع شروع میں تو ان کے خط برابر آتے رہے لیکن پھر طویل انتظار کے بعد کبھی کبھی ان کا خط آجاتا۔

وہ بھی اپنائیت سے دور جذبات سے عاری......

یہی نہیں ان کے گھر والوں نے میرا جینا حرام کردیا۔ مجبوراً مجھے وہ گھر چھوڑنا پڑا اور میں میکی ماں کے پاس آگئی ماں میری اس بربادی کو برداشت نہ کرسکی مجھے زندگی کے اس طوفان میں اکیلا چھوڑ کر چلی گئی۔"

سلیم! میں نے زندگی کے تین سال نشیب و فراز میں گزارے، کتنے کٹھن حالات کا میں نے مقابلہ کیا۔ میری ساری خوشیاں اور تمنائیں وقت کے ظالم ہاتھوں برباد ہوگئیں۔ مجبوراً میں نے نوکری کرلی یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو رقص کرنے لگے۔

کوثر کی اس بربادی کو میں برداشت نہ کرسکا۔ اپنے آنسو چھپا کر میں نے اسے دلاسا دیا اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا۔

پانچ برس کی طویل مدت کے بعد آج پھر وہ میرے سامنے تھی، زندگی سے بیزار، اندیشوں اور وہموں میں گھری ہوئی۔

دوسرے دن صبح جب بستر سے اٹھا تو ذہنی تھکاوٹ جوں کی توں قائم تھی۔ چاہا کہ کسی طرح کوثر کا واقعہ بھلا دوں مگر اسے نہ بھلا سکا۔ سہ پہر کے قریب میں کوثر کے فلیٹ پر اس سے ملنے گیا۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔ "میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی" بیٹھئے! میں ابھی آتی ہوں...... اور میں اس کے مختصر سے لیکن خوبصورت سے ڈرائینگ روم میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چائے کی ٹرے لیے ہوئے نظر آئی۔ ٹرے میرے آگے رکھتے ہوئے کہنے لگی "چھٹیوں میں وقت گزاری کے لیے ساحل پر جاتی ہوں قدرتی مناظر میں کھو کر وقت کو بانٹتی ہوں...... آج چھٹی ہے اگر آپ بھی میرے ساتھ...... یہ کہتے ہوئے اس نے کچھ ہچکچاہٹ محسوس کی۔

کیوں نہیں...... میں نے اس کی بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد ہم ساحل پر تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ غروب آفتاب کا منظر پانی میں نہایت ہی دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔

کوثر کا چہرہ جو کل مایوسی کے کہر میں ڈوبا ہوا معلوم ہو رہا تھا آج گلاب کی طرح شاداب نظر آنے لگا۔

قدرتی مناظر کا لطف لیتے ہوئے کوثر ریت پر لیٹ گئی۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اب سورج غروب ہو چکا تھا۔

کوثر کی پیاسی نظریں میرے جذبات سے کھیل رہی تھیں۔ میرے دل کی گہرائی میں کوثر کے نقوش ضرور تھے۔ مگر اب تو کوثر کسی اور کی ہو چکی تھی۔ اس خیال کے دائرے نے میرے مقید جذبات کو آزادی کی اجازت دی۔ میرے بدن میں گو شعلے بھڑک رہے تھے۔ مگر سماجی نقطۂ نظر سے ہمارا ملاپ ناممکن تھا۔

اس خیال کے آتے ہی میں نے کہا۔ "کوثر اب ہمیں چلنا چاہئے۔ رات ہو چکی ہے"

میرے اس اصرار پر کوثر اٹھ گئی۔ میری جانب رخ کیا اور انگڑائی لینے لگی۔ میں خاموش تھا۔ ہمارے گرد شام کی سیاہی ہلکی ہلکی پھیل گئی تھی۔ اس منظر نے کوثر کی انگڑائی کو زندہ کردیا اور اس کے دونوں ہاتھ میرے گلے میں جھولنے لگے

٥ — × — ٥ — × — ٥

> نقریب کے بھوکے یہ ثابت کرتے ہیں کہ وہ قابلیت میں کورے ہیں۔
>
> فیثا غورث
>
> اعتماد نہ مانگ کر پایا جاتا ہے نہ خریدا جاتا ہے، وہ تو محبت کی طرح خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔
>
> گاندھی جی

بقیہ:- پاک دامن ...

وہ بے چاری تو سو فیصد ہی ایک ہی تھی۔ وہ تو ہمارے بچوں پر جان چھڑکتی اور اپنوں سے بڑھ کر انہیں مانتی تھی۔ اسے صرف ریشماں ہی کیوں؟ خالہ بھی آپکو اکثر محبت سے دیکھتیں اور دعائیں دیتی تھیں (یہ خالہ ریشماں کی ماں تھی) جانتے ہیں! وہ آپکو اپنا بیٹا کہتی تھیں اور ہمارے بچوں کو پوتا سمجھ کر پیار کرتی تھیں۔ ان کا بڑا لڑکا ہوبہو آپکا ہم شکل تھا اور آپکے خصائل بھی بالکل اس سے ملتے جلتے ہیں۔ بے چارا بھرپور جوانی میں ہی لسانی عصبیت کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بے چاریاں کتنا آپ کو چاہتی تھیں...... چھی! چھی!! آپ لوگ بھی عجیب وہ ہیں۔ ہر کسی کے بارے میں فوراً غلط اندازہ قائم کر لیتے ہیں۔ آپ اسے واہیات کہہ رہے ہیں حالانکہ وہ آپکو اپنے کھوئے ہوئے بھائی کی طرح چاہتی تھی اور ایک بڑے بھائی کی طرح آپکا احترام کرتی تھی۔ اس کے پاس اس کے بھائی کی کوئی تصویر بھی نہیں رہی۔ اسی لئے جاتے وقت اپنی پسند سے وہ فوٹو لے گئی ہے تاکہ اسے فریم کروا کر اپنے گھر میں سجائے گی اور ....

وہ نہ جانے اور کیا کیا الم غلم بکتی رہی مگر میرا حال کچھ یوں تھا جیسے کسی کو بازار کے بیچ ننگا کر دیا گیا ہو۔

بقیہ:- عفت ...

زمین پر گرا۔ اور ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگا۔ چند لمحوں تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ معاً اس کا پہاڑ جیسا بدن موم کی طرح پگھل پگھل کر بہنے لگا اور چشم زدن میں اس کا نام و نشان مٹ گیا۔ اپنی اس عظیم الشان فتح پر میرا سینہ فخر سے تن گیا۔

اچانک میرے چہرے پر درخت کے پتوں سے اوس کے چند قطرے ٹپک پڑے اور میں خواب سے بیدار ہو کر تعجب خیز نظروں سے ماحول کا جائزہ لینے لگا۔

صبح نمودار ہونے والی تھی۔ چند ہی لمحوں کے بعد سورج نے مشرق سے اپنا سر ابھارا اور سارے عالم میں صلح و آشتی اور امن اور اتحاد و سکون کی کرنیں بکھرنے لگا۔ درختوں پر طیور محبت و دوستی اور اتحاد و اتفاق کے گیت گانے لگے اور صبح کی فرحت بخش ہوا مسرت و انبساط کا پیغام سنا سنا کر اہل دنیا کو بیدار کرنے لگی!!!

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں   تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل (رند)

اپروچ

(اندازِ رسائی)

سید آصف

سنیئے ....۔

جی ۔

یہ شاید ... آپکا رومال .... ۔

شکریہ ۔

ایک کوشش تھی، اجنبی چہرے پہ پہچان کی لکیریں کھینچنے کی جسے شکریہ جیسے خوبصورت اور مہذب لفظ نے شکست دی تھی ۔

وہ کون تھی ۔ کیا تھی ۔ کہاں رہتی تھی ۔ کیا کرتی تھی کس مذہب سے تعلق رکھتی تھی، کیا نام تھا اس کا ۔ میرے پاس اتنے سارے سوالات میں سے ایک سوال کا بھی جواب نہیں تھا میں صرف اتنا جانتا تھا وہ لڑکی تھی ۔ صرف لڑکی ہوتی تو بھی کوئی بات نہیں، لیکن وہ ایک خوبصورت لڑکی تھی ۔ اور نہ میں پیر تھا، نہ پارسہ ۔ جوانی اپنے شباب کے ساتھ کچھ سوال بھی پیدا کرتی ہے، اور کچھ مانگیں بھی ۔ وہ جواب تھی میرے سوالوں کی، وہ تشفی تھی میرے مانگوں کی ۔

شہری راستوں کا اصول ہے وہ سورج اگتے ہی بھیڑ کا لہو اپنی رگوں میں دوڑانے لگتے ہیں لہو کا یہ سفر رات گئے تک جاری رہتا ہے ۔ اس لہو کا چہرہ ہوتا ہے ۔ ایک نہیں ۔ انیک ۔ لال، پیلا سفید، کالا، جوان، بوڑھا ۔ عورت، مرد ۔ الگ الگ روپ ہوتے ہیں اسکے ۔ اس میں ایک چہرہ میرا بھی شامل تھا ۔ اور ایک چہرہ اس کا بھی ۔

محبت اک کشش کا نام ہے ۔ پہلی نظر کی کشش چہرہ اجنبی ہو کر پہچانا ۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ بچپن سے ذہن کے کسی کونے میں تربیت پاتا ہوا ایک موہوم خاکہ، جب کسی چہرے سے اچانک ٹکرا جاتا ہے ۔ یہ کشش جنم لیتی ہے ۔ پہلی نظر کی کشش، جس کا نام محبت ہوتا ہے ۔ یہ وہی چہرہ تھا ۔ جو میرے ذہن میں تربیت پاتے ہوئے خاکہ سے ٹکرا گیا تھا ۔

کشش اپنے آپ میں مقناطیسی اثر رکھتی ہے ۔ وہ جتنا دور جاتی، میں اتنا ہی اسکے پاس کھنچ جاتا ۔ وہ بار بار مجھے ٹال جاتی ۔ میں بار بار کسی بہانے کے پل سے اس تک پہنچ جاتا ۔

سنیئے .... ۔

جی ۔

آج شاید بس جلدی نہیں آئیگی .... ۔

ممکن ہے .... ۔

کیوں نہ ہم ٹیکسی سے چلیں .... ۔

کہاں؟

جہاں آپ کو جانا ہے .... ۔

آپکو بھی وہیں جانا ہے ؟

شاید .... ۔

میں شاید جیسے لفظ کے ساتھ سفر کی عادی نہیں شکریہ

شاید جیسے لفظ کے ساتھ سفر کے معنی ڈھونڈنا میرے بس کی بات نہیں ۔ البتہ تبھی بس آگئی ۔ میرا بنایا ہوا پل توڑ کر وہ بس پہ سوار ہو گئی، اور میں بے بس کھڑا رہ گیا ۔

آج کی تیز رفتار دوڑتی دنیا میں لفٹ بہت اہم شے کا نام ہے ۔ کسی ویران علاقے میں جہاں نہ بس کی امید ہو نہ ٹیکسی کی، راہ چلتی کار کو ہاتھ دکھائیں اور وہ رک جائے، تو خود کو خوش قسمت سمجھ لینا چاہئے ڈگری حاصل کر لی، اور بغیر کسی جدوجہد کے نوکری مل جائے ۔ معمولی رقم لگا کر کوئی سرکاری ٹھیکہ مل جائے ۔ اور کاروبار کے نام پر آفس، ٹیلی فون، کار یا اسکوٹر حاصل ہو جائے ۔ سماجی خدمات کے نام پر دو چار چندے کی رسیدوں کے ذریعہ منسٹر کی کرسی حاصل ہو جائے، تو سمجھ لیجئے قسمت نے آپکو لفٹ دے دی ہے ۔ لیکن ایسی لفٹ میرے نصیب میں نہیں تھی ۔ میں محض ایک اجنبی لڑکی سے پہچان کی حد تک لفٹ مانگ رہا تھا ۔ اور وہ کسی مغرور کار کی طرح فراٹے بھر رہی تھی، روپوش ہو رہی تھی ۔

کوشش آدمی کو چاند تک پہنچا دیتی ہے ۔ اس کے لئے دو چار مرتبہ آسمان سے زمین پہ گرنا پڑے تو مایوس نہیں ہونا چاہئے ۔ کوشش جاری رہے ایک نہ ایک دن چاند تک رسائی ممکن ہے، یہ سائنس نے ثابت کر دیا ہے ۔ سو میں بھی ہارنے والا نہیں تھا ۔

سنیئے ... ۔

جی ۔

شو ہاؤس فل ہے .... ۔

دیکھ رہی ہوں ۔

میرے پاس ایک ٹکٹ زیادہ ہے اگر آپ مناسب سمجھیں تو .... ۔

میرا ٹکٹ رزرو ہے ۔ میں بغیر ٹکٹ رزرو کرائے شو اٹینڈ نہیں کرتی ۔ شکریہ ۔

آج چہرے پر نہ مایوسی تھی نہ شرمندگی ۔ نہ کوئی نیا بہانہ ۔ نیا پل بنانے کی کوشش تھی نہ بنایا ہوا پل ٹوٹنے کا رنج ۔ صرف غصہ تھا، شدید غصہ ۔

تکلف کی بھی حد ہوتی ہے ۔ احترام بھی تبھی ممکن ہے جب اس کا ردعمل بھی احترام ہو ۔ غرور بھی تب تک برداشت کیا جا سکتا ہے، جب تک کہ وہ آپکی انا کو ٹھیس نہ پہنچائے ۔ آج انا کو چوٹ پہنچی تھی اب وقت آگیا تھا فیصلے کا ۔ خواہ موافق ہو خواہ مخالف ۔ تکلف اس کے بس کا نہیں تھا ۔ احترام کے وہ قابل نہیں تھی ۔ اور غرور .... ۔

یوں تو روٹھے ہیں مگر لوگوں سے
پوچھتے حال ہیں مرا اکثر (نظام رام پوری)

آج مجھے اس کے غرور کا مزاج پوچھنا تھا۔

سنیئے......

جی۔

آپ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہیں؟

میں کچھ نہیں۔

کیا اب تک آپ کو میری محبت کا احساس نہیں ہوا؟

ہوا۔

تو پھر......

آپ کا اپروچ غلط رہا۔

مطلب......؟

آپ جب چاہیے تب ملاقات طے کر سکتے تھے۔

یعنی آپ کو بھی مجھ سے......؟

جی نہیں!

پھر......؟

میں ایک کال گرل ہوں۔ آپ جب چاہیں مجھے بلا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ اپروچ صحیح ہو۔ خدا حافظ

اپروچ...... اسناٹے کے گرداب میں میری محبت، میری انا نہ جانے کتنے چکر کاٹے۔

بقیہ:-

واپس آنے والے

اس کا فیصلہ ہم اس گورے سے کروالیں ــ ورنہ بعد میں ہم اسی بھول بھلیوں میں پھنسے رہیں گے۔ گورے نے مسکرا کر ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ "یہ والا اُمارا... اور اُو والا اُمس کا....." گورا زور زور سے قہقہہ لگانے لگا۔ اس کی زہریلی ہنسی فضا میں پھیلنے لگی۔

اور پھر آسمان سے آگ برس پڑی تھی ــ

"ہوری.... اے او ہوری.... وہ رحمت خان مارا گیا۔ شہر سے گاؤں آتا ہوا راستے میں ہی ٹھکانے لگ گیا ــ ارے وہی تیرا پرانا دشمن.... یہ تو پاگل کی طرح میرا منہ کیا تک رہا ہے؟ وہی جس سے پچھلے برس تمہارے کھیتوں کا جھگڑا آن پڑا تھا"

"کون دشمن؟ کیسا دشمن؟ بھلا بھائی بھی بھائی کا دشمن ہوتا ہے ــ ارے کہیں پانی پر لاٹھی مارنے سے، پانی الگ ہوا ہے کیا ــ؟"

"ہر ایک قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے۔ جو خیالات قوم کے دماغ کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت ــ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے ــ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی تھی۔ اب قدرت کے قومی خیالات نے بلوغیت کے زینے پر ایک قدم اور بڑھایا ہے۔"

منشی پریم چند

اور پھر ہوری پاگلوں کی مانند بلوائیوں کے بھرے پُرے مجمع میں گھس پڑا تھا ــ انہیں للکارا انہیں غیرت دلائی ــ اور تب رحمت خان کی بیوہ اور بچوں کو پاکستان بھجوا دیا

آگ کسی حد تک سرد ہو گئی تھی۔

اور آج ہوری ماضی سے حال کے دروازے پر آ کھڑا ہوا۔

لیکن ادھر چند برسوں میں جو ایک نیا خواب جاگا تھا، وہ ایک بہت بڑے خطرے کی بات تھی ــ اور اس فکر نے ہوری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ آج تک ہوری نے کھیتوں کو مسکراتے، دھرتی کو گنگناتے، فصلوں کو لہلہاتے دیکھا تھا ــ لیکن آج کچھ اور ہی رنگ تھا۔ یہ سب ان شہروں کے پر آسیب ماحول کی دین تھا۔ اور لوگ اسے لے کر گاؤں کی طرف لوٹ رہے تھے ــ جس کے نتیجے میں کل رات رحمو قصائی اور شرما لوہار میں تو تو میں میں ہو گئی تھی۔

ٹھیک ہی تو ہے ــ جب لوگ اپنے اپنے پھرنے کھونے لگیں گے تو ایسا ہی کچھ ہوگا ــ کہ کوئی کسی کو پہچانیگا نہیں، اور نگاہوں کے سامنے صرف دھرم اور ذات کے خلائے ابھر آئیں گے اور ہم رو پڑیں گے۔

بات آئی گئی ختم ہو گئی ــ مگر لاوا اندر ہی اندر پک رہا تھا ــ اور پھیلتا جا رہا تھا۔

مندر کا کلس اونچا ہونے لگا۔

مسجد کا مینار آسمان کو چھونے لگا۔

ہر ایک اپنا اپنا قد اونچا کرنے لگا۔

اور ایک زہریلی فضا سارے ماحول کو اپنے لپیٹ میں لے چکی تھی ــ جو ہوری جیسے نہ جانے کتنے لوگوں کو فکر و تردد کی اندھیری رات کا اسیر بنا رہی ہے ــ

قافلوں کی عطا کردہ نشانیاں کھیتوں میں سانپ بن بن کر پھنکارنے لگیں ــ اور زمین کے جسم پر اپنا زہر اتارنے لگیں۔ زمین چیخ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ــ اور روح کا پنچھی کہیں دور پرواز کر گیا، اس کی گنگناہٹ کہیں کھو گئی ــ

کھیتوں کی حدیں گھٹ گئیں۔ وہ سکڑتا چلا گیا۔

فصلیں بوند بوند پانی کو ترستی سوکھ کر کانٹا بن گئیں۔

اور تب سارے منظر تبدیل ہو گئے۔

ساری نشانیاں کہیں کھو گئیں۔

قافلے واپس لوٹے۔

لیکن سب بے چہرہ تھے ــ اور اپنی اپنی نشانیاں ڈھونڈ رہے تھے۔

بوڑھا ہوری غور سے واپس آنے والوں کو تک رہا تھا ــ اس کی آنکھوں میں امید کی شمع جل رہی تھی۔ اس کی ڈبڈبائی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے ــ شاید یہ خوشی کے آنسو تھے۔

گم صم بیٹھی زمین چہک اٹھی ــ کھیت لہلہانے لگے ــ حالات اعتدال پر لوٹ آئے۔ گاؤں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے شہر کی گندگی کو دھو دیا ــ اب ہر تہوار میں تمام مذہب و ملت کے لوگ شامل ہوتے، خوشیاں مناتے۔ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں ہاتھ بٹاتے۔

اور تب ہوری نے محسوس کیا کہ اب نئی کونپلیں پھوٹ رہی ہیں!!

گل پھینکے ہیں اوروں کی طرف بلکہ ثمر بھی
اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی (سودا)

جستجو کا کرب

نذیر فتح پوری
۸۳، ایروڈا، پونہ - ۴۱۱۰۰۶

میں سوچتا ہوں ـــــ یہ بمبئی بھی کتنی عجیب جگہ ہے۔ کیسا انوکھا اور دلچسپ مقام ہے۔ رونقوں کا شہر، رنگینیوں کا گہوارہ۔ دھرتی کا چاند بلکہ سورج خیالوں کی جنت۔ ادیبوں، شاعروں اور فنکاروں کی سنہری امید۔ اور بھی نہ جانے لوگوں نے اس کے کیا کیا نام رکھ چھوڑے ہیں۔ ایک شخص سے جب میں نے بمبئی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔

"بمبئی چور قاتلوں اور پاکٹ ماروں کا گھر ہے" بات حقیقت کے قریب تھی اس لئے مجھے برا نہیں لگا۔

سوچتا ہوں ـــــ میں بھی بمبئی کا کوئی نام رکھ دوں اسے ایک ایسا نام دے دوں جو سب سے الگ ہو۔ جو حقیقت کے حرفوں کو توڑ کر بنایا گیا ہو، جو صداقت کا آئینہ ہو سچائی کا سرچشمہ ہو جس سے اوروں کا درد منسوب ہو اور میری روح کا کرب شامل ہو۔

میں دیکھتا ہوں ـــــ میرے کمرے کے سامنے والے کمرے میں شاردا رہتی ہے۔ اُنیس بیس برس کی حسین اور خوبصورت لڑکی جس کے گلابی چہرے کی سرخی دیکھکر افق پر چھائی ہوئی سرخی کا تقدس آنکھوں میں اترتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پاکیزگی کے ٹھاٹھے مارتے سمندر کو دیکھ کر اس سے آنکھ ملانے کی ہمت نہیں پڑتی۔

شاردا کا باپ پہلے کسی فلمی ادارے میں کام کرتا تھا۔ ابھی ایک سال سے وہ گھر ہی میں رہتا تھا۔ اب اس کے دو ہی کام ہیں ایک تو وقت بے وقت اپنی بیوی سے جھگڑا کرنا اور دوسرا اپنی بیٹی شاردا کی لائی ہوئی تنخواہ پر قبضہ کرنا۔ جب مہینے کی پہلی تاریخ کو شاردا اپنی تنخواہ لیکر آتی ہے تو اس کا باپ اسکے دروازے میں داخل ہونے سے پہلے ہی اچک کر اسکے ہاتھ سے پرس چھین لیتا ہے۔

میں دیکھتا ہوں ـــــ شاردا کا خاندان شریف باعزت اور متوسط خاندان تسلیم کیا جاتا ہے سماج میں اس کے باپ کی زیادہ نہ سہی مگر عزت ہے۔ محلّے کی کمیٹی کا چیرمین ہونے کے ساتھ ساتھ مہنومان کے مندر کی مجلسِ مشاورت کا پانچواں رکن بھی ہے۔ ادب سے بھی اسے کچھ لگاؤ ہے اسی لئے کبھی کبھی ہم مل بیٹھتے ہیں، وہ مجھے اپنے گھر چائے پر مدعو کرتا ہے۔ کسی وقت ناشتے پر بھی بلالیتا ہے، میں اس کی آواز پر کھنچا چلا جاتا ہوں۔ اپنی پوزیشن کا خیال نہیں کرتا، یہ بھی نہیں سوچتا کہ روز روز کسی کے گھر جانا کہاں کی شرافت ہے؟

کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ میں بنا بلائے ہی ان کے یہاں چلا جاتا ہوں، میرے ان کے یہاں بار بار جانے کا مقصد خود میری سمجھ سے باہر ہے۔ حالانکہ شاردا کو ادب سے کوئی دلچسپی اور تعلق نہیں ہے۔ کبھی اس نے میری چھپی ہوئی کوئی کہانی پڑھنے کی خواہش ظاہر نہیں کی۔ جب میں اس کے باپ کو اپنے اشعار سناتا ہوں تو وہ انتہائی بے توجہی بے رخی اور اکتاہٹ کا مظاہرہ کرتی ہے۔ جب میں کبھی اسے مخاطب کرنے کی جسارت کرتا ہوں تو وہ گھبرا کر اپنا آنچل درست کرنے لگتی ہے۔ کبھی نظریں جھکا کر اور سمٹ کر آگے کو بڑھ جاتی ہے میں اس کی اس بے اعتنائی اور عدم دلچسپی کو اس کی شرم وحیا پر محمول کرتا ہوں۔ جس وقت میں اسے شرما کر اپنے آپ میں سمٹتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں بمبئی کے لئے بہت سارے نام گھومنے لگتے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ کوئی خوبصورت سا نام بمبئی سے منسوب کردوں مگر نہ جانے دل کے کس کونے کھدرے سے ایک آواز ابھرتی ہے۔ "نہیں، ابھی نہیں"

مجھے بمبئی کے لئے کوئی نہ کوئی نام ضرور تلاش کرنا ہے۔ شاردا میری تلاش کی پہلی منزل ہے۔ سوچتا ہوں کہ اس کے دل آویز خدوخال کے کسی نکتے پہ جھلکتا ہوا کوئی دلفریب نام مل جائے یا اس کے غنچہ نما حسین لبوں پہ کھیلتے ہوئے زیرِ لب تبسم کی موجوں میں ہچکولے مارتا ہوا کوئی نام مل جائے یا پھر اس کی ریشمی زلفوں کے کسی خم میں بندھا ہوا کوئی خمدار نام اچانک ٹوٹ کر میری جھولی میں آپڑے اور میں اسے اٹھا کر بمبئی کی روشن پیشانی پہ چسپاں کردوں۔

شاردا گوناگوں خوبیوں کی مالک ہے جہاں وہ خوبصورتی میں بے مثال ہے وہاں تندرست اور صحت مند جسم بھی رکھتی ہے، خاندانی شرافت اس کی ہر ادا سے ٹپکتی ہے، اس کی فطرت میں بے تکلفی نام کو بھی نہیں ہے، میں نے کبھی اسے بلند آواز سے بولتے اور قہقہہ مار کر ہنستے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شاردا مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔ اور میں اس کی رگ رگ میں سرایت کررہا ہوں۔ مگر یہ صرف میرا وہم ہے۔ وہ میری طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ اور دیکھے بھی کیوں؟ اس کا مجھ سے کیا واسطہ؟ زمین اور آسمان کبھی گلے نہیں مل سکتے، میرے پاس اس کی محبت کے جواب میں دینے کے لئے کیا ہے؟ چند کہانیاں جن کی بازار میں کوئی قیمت نہیں، چند گیت اور غزلیں جو ساز اور آواز کے لئے ترس ترس کر دم توڑ چکی ہیں۔ جنھیں میں نے سینے پہ سنبھال کر رکھ کر اپنی بیاض میں دفن کردیا ہے۔ اب اس

اداۓ حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گار نظر کو حجاب آتا ہے (فیض)

قبرستان کو گلے لگائے پھرتا ہوں۔ محلوں کے خواب دیکھنے والی قبرستان کے بھکاری کو اپنے دل کا بادشاہ کیسے بنا سکتی ہے ؟ میں نادان ہوں جو ایسی باتیں سوچتا ہوں۔ مگر کیا کروں سوچنا آدمی کا پیدائشی حق ہے۔ اور یہ حق آزادی کے ساتھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

میں صرف سوچتا ہوں ـــــ میں نے کبھی اسے آزمانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ سات سو روپے ماہانہ تنخواہ پاتی ہے۔ وہ اپنے گھر کا تمام بوجھ اپنے نازک شانوں پہ اٹھائے پھرتی ہے۔ اور مجھ سے خود میری اپنی زندگی کا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا۔ مہینے کی پہلی تاریخ شاردا کے گھر میں دیوالی کے دیپ جلاتی ہے اور میں ہول جلانے کے قابل بھی نہیں ہوں۔ جس کمرے میں رہتا ہوں وقت پر اس کا کرایہ بھی ادا نہیں کر پاتا۔ کیا کروں، ادیب ہوں، اور ہمارے ملک کے شاعروں اور ادیبوں کا یہی حال ہوتا ہے۔

"کس قدر تلخ ہے زندگی ؟"

"کتنی زہریلی ؟"

"کتنی کڑواہٹ ہے اس میں ؟"

کتنا ادھورا پن ہے مجھ میں، نہ جانے کتنے لوگ اس آباد دنیا میں میری طرح ادھورے اور برباد ہیں۔ سب کچھ ہو کر بھی کچھ نہیں کا احساس شب و روز روح کو دیمک کی طرح چاٹتا رہتا ذہن کے کھوکھلے گنبد میں جب اپنی ناکام اور ناتمام تمناؤں کی سسکیاں سنتا ہوں تو میرے کان پھٹنے لگتے ہیں۔ آخر یہ بھی کوئی زندگی ہے؟ آدمی اپنی ایک تمنا بھی پوری نہ کر سکے ؟

اب یہ تمنا بھی کوئی تمنا ہے کہ "بمبئی کا کوئی نام رکھوں ؟"

کوئی کہے گا کہ میرا دماغ چل گیا ہے۔ ایک باہوش اور پختہ ارادہ رکھنے والے شخص کے لئے یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ تو جناب ! اس بات کا یہی جواب ہے کہ میں اپنے ہوش و حواس پر قائم ہوں اور میری قوتِ ارادی انتہائی مضبوط اور ناقابلِ یقین حد تک پختہ ہے۔ اگر میں چاہوں تو شام تک بمبئی کے درجنوں نہیں سینکڑوں نام رکھ دوں ـــ مگر نہیں ـــ میرا احساس مجھے جستجو کی تلقین کرتا ہے۔ میں جب اپنے دل کی گہرائیوں میں جھانکتا ہوں تو آواز کی بازگشت سماعت کے پردوں کو چیرتی ہوئی میرے کھوکھلے وجود میں گھس جاتی ہے مجھے جھنجھوڑتی ہے اور کہتی ہے۔

"نہیں ! ابھی نہیں، ابھی سفر کے اختتام کا وقت نہیں آیا، ابھی منزل وہم و گمان سے بھی دور ہے۔ تلاش جاری رکھو، کیونکہ تلاش زندگی کا دوسرا نام ہے اگر تم نے جستجو کا کرب کھرچ ڈالا تو زندگی ننگی ہو جائے گی بے گور و کفن۔ پتھروں میں ہیرے، دریاؤں میں موتی، لوگوں میں انسان، دنیا میں ایمانداری، خلاؤں میں سکون، دعاؤں میں اثر، کھنڈروں میں رونق، جستجو کو کن کن صعوبتوں سے نہیں گذرنا پڑتا۔ دکھ سہنے پڑتے ہیں ـــ درد ڈھونڈنا پڑتا ہے، مگر مجھے ان سے کیا؟ مجھے تو صرف بمبئی کے لئے ایک نئے انوکھے اور روشن حرفوں والے نام کی تلاش ہے۔

شاردا خود ہی حسین نہیں بلکہ وہ ہماری بستی کا حسن ہے، اس کے چہرے میں پورے بمبئی کا حسن سمٹ آیا ہے، جیسے لوگ چاند کو دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں ویسے ہی ہم لوگ شاردا کے روشن چہرے کو دیکھ کر اپنی بے تاب اور پیاسی آنکھوں کی تشنگی بجھاتے ہیں، ہر ایک کے دل میں شاردا کے قرب کی دبی دبی سی تمنا کروٹیں لیتی ہیں۔ مگر اسکی رعب دار شخصیت کے پیش نظر کسی کو لب کشائی کی ہمت نہیں ہوتی۔ سب اپنے آپ میں گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ دل کا مدعا زبان کی دہلیز پہ آ کر دم توڑ دیتا ہے، دبی ہوئی تمنا کو اور دبا دیا جاتا ہے۔

کبھی کبھی زینہ چڑھتے یا اترتے وقت اس کی قیمتی ساڑی کے کنارے بدن سے بڑھ جاتے ہیں اور میرا دل بھی جوان ہو اٹھتا ہے اور میں بے تاب ہو کر دل ہی دل میں فیصلے کر بیٹھتا ہوں۔ بمبئی کا نیا نام رکھ ہی دوں، تلاش نے مجھے تھکا دیا ہے"

شاردا کی جانب سے آج تک کسی ایسی بات کا اظہار نہیں ہوا جس سے میں سمجھوں کہ اس کے دل میں میرے لئے کوئی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ شاردا ایک قیمتی اور مہنگا خواب ہے جسے بڑے لوگ ہی دیکھ سکتے ہیں۔ مجھ جیسے قلاش آدمی کے لئے...... آگے کچھ بھی کہنے کو جی نہیں چاہتا۔

شاردا ایک باہوش لڑکی ہے۔ وہ جانتی ہے کہ میں ایک معمولی قلمکار ہوں۔ میں اس کے حسن کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے تو ملا سکتا ہوں مگر اس کے پیٹ کی دوزخ کو روٹی کا ایندھن فراہم نہیں کر سکتا۔ اس کے جسم کو ڈھانکنے کیلئے خوبصورت ساڑی اور گلے کی آرائش کے لئے قیمتی نیکلیس نہیں خرید سکتا، اس کو سماج اور برادری میں وہ مقام نہیں دلا سکتا جو آج اسے حاصل ہے سماج ادب کو نہیں روٹی کو دیکھتا ہے۔ پیٹ شاعری سے نہیں اناج سے بھرتا ہے، زندگی کے الجھے ہوئے مسئلوں کا علاج کہانیوں سے نہیں روپیوں سے ہوتا ہے۔ اور شاردا روپے کماتی ہے۔

شاردا روز صبح دس بجے گھر سے نکلتی ہے اور شام ڈھلے لوٹتی ہے، کبھی کبھی تو آدھی رات کے بعد بھی آتی ہے۔ بہت تھکی تھکی سی، ٹوٹی ہوئی سی۔ میں ہمیشہ اس کے آنے کے بعد ہی سوتا ہوں، میرا دروازہ اس وقت تک بند نہیں ہوتا جب تک شاردا اپنے گھر کا دروازہ کھول کر اندر نہیں چلی جاتی۔

کل رات شاردا تین بجے گھر لوٹی تھی۔ اسکے قدم کسی شرابی کی طرح لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ آج بہت تھکی تھکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی پریس کی ہوئی ساڑی سلوٹوں سے بھری ہوئی تھی۔ بالوں کی لٹیں بے ترتیب اور بکھری ہوئی تھیں۔ اس کے حواس گم تھے۔ کشادہ پیشانی پر کھنچا ہوا سُرخ قشقہ اپنے دائرے سے ہٹ کر پیشانی کی سلوٹوں میں منتشر ہو گیا تھا۔

میں "سماج سدھار سوسائٹی" کے جلسے سے لوٹ رہا تھا جس وقت وہ ٹیکسی سے اتری تو میں دیوار کی اوٹ میں چھپ گیا۔ پھر میں اس کے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگا، اس نے ایک بار بھی مڑ کر نہیں دیکھا۔ تھکے تھکے قدم اٹھاتی ہوئی وہ سیڑھیاں طے کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد جب اس نے اپنے کمرے کے سامنے رک کر بیل بجائی تو اس کے باپ نے دروازہ کھولا۔ اور گھبرائے ہوئے انداز میں دروازہ کھولا۔

"آج بہت دیر کر دی، تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا ؟"

شاردا نے ایک اچٹتی نگاہ اپنے باپ کے

تراغرور، مرا عجز، تا کجے ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے (سودا)

چہرے پہ ڈالی اور جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ اس کے باپ نے دھیرے سے دروازے کے پٹ بند کر دیئے اور میں دروازہ کھول کر اپنے کمرے میں داخل ہو گیا۔ میرا دل اٹھا جا رہا تھا، شاردا کا لٹا ہوا سراپا، بکھرے ہوئے بال، پیشانی کو بوسہ رنگ بناتا ہوا منتشر سندیا اور سلوٹوں بھری ہوئی ساڑی۔

شک و شبہات کی وہ مبہم سی تصویر جو ایک عرصہ سے میرے ذہن کے کینوس پر لرز رہی تھی آج اس پر یقین کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔

رات کانٹوں کے بستر پہ گذری۔ صبح کے انتظار نے آنکھوں سے نیند چھین لی۔

معمول کے مطابق دس بجے سے پہلے میں نے اپنا دروازہ کھول لیا۔

دس بج گئے مگر شاردا باہر نہیں نکلی، ساڑھے دس بجے گئے، میں اس کے کمرے کے دروازے کو تکتا رہا۔ مگر وہ نہیں کھلا۔ میری بیتابی بڑھنے لگی۔ اس کی خیریت معلوم کرنے کے لئے جیسے ہی میں آگے بڑھا بند دروازے کے پیچھے سے شاردا کی دبی دبی سی سسکیاں میری سماعت سے ٹکرا گئیں، میرے قدم رک گئے، اندر ایک دبا دبا سا ہما بھارت چھڑا ہوا تھا۔ دستک کے لئے اٹھایا ہوا میرا ہاتھ ٹھہر گیا۔

"نہیں، نہیں اب میں اس شیطان کے پاس نہیں جاؤں گی،" شاردا کی آواز میں نفرت تھی، احتجاج تھا، بغاوت تھی۔

"اگر تم اس کے پاس نہیں جاؤ گی تو اس گھر کا کیا ہوگا" اس کے باپ کے لہجے میں اندیشے کی جھلک تھی۔

"میں کچھ نہیں جانتی، مجھے کچھ نہیں معلوم، میں اپنے آپ کو اور تباہ و برباد نہیں کر سکتی، گندگی کا یہ بوجھ اب مجھ سے نہیں ڈھویا جاتا" شاردا کا فیصلہ سن کر اس کی ماں کہہ رہی تھی۔

"تمہاری اس ضد سے ہمارا گھر برباد ہو سکتا ہے۔ ہماری عزت خاک میں مل سکتی ہے۔"

"کونسی عزت ماں، تم جس عزت کا راگ الاپ رہی ہو وہ تو کب کی لٹ چکی ہے، اس وحشی نے سب کچھ لوٹ لیا۔ کچھ بھی تو نہیں چھوڑا!" شاردا کے لہجے میں حقارت تھی۔ تاسف تھا، بے بسی تھی۔

"وہ وحشی نہیں شاردا! ہمارا ہمدرد ہے، ہمارے خاندان کا خیر خواہ ہے" اس کا باپ اپنی عزت اور بیٹی کی عصمت کے لٹیرے کی شان میں قصیدے پڑھ رہا تھا۔

"ہاں بیٹا! وہ ہر مہینے ہمارے گھر سات سو روپے بھجواتا ہے اس رقم کے طفیل ہم عزت کی زندگی گزار رہے ہیں، تم سمجھنے کی کوشش کرو" یہ اس کی ماں تھی جس کے لہجے میں التجا تھی، فریاد تھی۔

"اگر وہ ہمارا ہمدرد اور خیر خواہ ہوتا تو آپ کو نوکری سے الگ کیوں کرتا" یہ شاردا کا سوال تھا

"اگر اس دن تم ضد کر کے میرے ساتھ شوٹنگ دیکھنے اسٹوڈیو نہیں جاتیں تو شاید یہ دن کبھی نہیں آتا" یہ اس کے باپ کا جواب تھا۔

"مگر میں تھک چکی ہوں، مجھ میں اب اور چلنے کی ہمت نہیں ہے۔ میں اب اپنا سفر ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ تباہی کے اس راستے پر اب مجھ سے نہیں چلا جاتا" یہ شاردا کے جاگے ہوئے ضمیر کی صدا تھی۔

"تم ہماری پہلی اولاد ہو، ہم تمہیں بیٹے کی جگہ سمجھتے ہیں۔ تمہیں ابھی تھکنا نہیں چاہیئے۔ جب تک تمہارے چھوٹے بھائی بہن پڑھ لکھ کر قابل نہ بن جائیں تب تک تمہیں اپنا سفر جاری رکھنا ہوگا ان معصوم بچوں کا مستقبل تمہاری ٹھوکر میں ہے چاہے تو اسے ٹھوکر مار کر اندھیروں میں دھکیل دو چاہے اسے تابناک بنا دو۔ اور پھر یہ زندگی اسی کا ساتھ دیتی ہے جو چلنے کی ہمت رکھتا ہے۔ تھک کر بیٹھنے والوں کو دنیا ٹھوکر سے الگ کر دیتی ہے" یہ اس کے باپ کی ناصحانہ تقریر تھی۔

"اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو گیا کہ میں اپنے کنبے کو پالنے کے لئے اپنے بدن کو بیچتی ہوں تو کیا ہوگا!" یہ بیٹی کا سوال تھا۔

"آج کی دنیا میں دولت کی اہمیت ہے، لوگ روپے کمانے کے لئے نہ جانے کیا کیا بیچ دیتے ہیں، بدن بکتا ہے تو کوئی نہیں دیکھتا، مگر جب پیٹ خالی ہوتا ہے تو دنیا دیکھتی ہے، جب عزت عریاں ہو کر سربازار نیلام ہوتی ہے تو لوگ تماشہ دیکھتے ہیں۔ مگر جب یہی عزت کپڑوں کی تہوں میں فروخت ہوتی ہے تو خریدار کے علاوہ کوئی نہیں دیکھتا" یہ ایک باپ کا جواز تھا بیٹی کے سامنے

"ہمارے علاوہ کوئی تمہارے کام کے بارے میں نہیں جانتا، سب یہی جانتے ہیں کہ تم "فیمس پکچرز" کے دفتر میں ٹائپسٹ کا کام کرتی ہو" یہ اس کی ماں کا دلاسہ تھا۔

شاردا خاموش تھی، اس کا باپ کہہ رہا تھا۔

"ہمت کرو اٹھو نہاؤ، یہ لو پرس، وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

شاردا کی آواز اب بھی خاموش تھی، لگتا ہے وہ ہار چکی ہے، تھک گئی ہے اپنی بے بسی کے آگے اس نے سر جھکا دیا ہے۔ اب اس کی سسکیاں بھی بند ہو چکی ہیں۔ شاید اس نے عزم سفر کر لیا ہے، میں دبے قدموں اپنے کمرے میں واپس آ گیا ہوں۔ میرے ہٹتے ہی شاردا دروازہ کھول کر باہر آ گئی ہے، اس کا باپ کہہ رہا ہے۔

"ہاں یاد آیا، آج آخری تاریخ ہے، شام کو تنخواہ لے کر آنا ہے۔ کل منی کی فیس بھرنا ہے اور مہینے کا راشن بھی لانا ہے۔"

شاردا نے اپنے باپ کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا ہے اور مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ ایک اچٹتی سی نگاہ میرے کھلے ہوئے دروازے پر ڈالتی ہوئی زینہ اتر رہی تھی۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ یہ بات اس کے اور اس کے گھر والوں کے علاوہ میں جانتا ہوں۔ وہ پستیوں کی طرف جا رہی ہے، یہ زینہ اس کے لئے گہری کھائیوں میں اترتا ہے جہاں ذلت کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں۔

مگر میں اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں چاہتے ہوئے بھی اسے تباہی کے راستے سے نہیں روک سکتا، کیوں کہ محض جذبات زندگی کی مشکلوں کا حل نہیں ہو سکتے۔

اب یقین ہو گیا کہ کوئی ایک نام بمبئی کا بدل نہیں ہو سکتا۔ انوکھے نام کے لئے شاید زندگی کے ان گنت مسائل کی طرح ان گنت ناموں کو جوڑ کر ایک نام کرنا ہوگا اور وہ نام بمبئی کے سوائے دوسرا نہیں۔

باوجودیکہ پَر و بال نہ تھے آدم کے
وہاں پہنچا کہ فرشتے کا بھی مقدور نہ تھا (میر درد)

ترتیب

سب سے روشن
سب سے بلند
اور سب سے تیز رَو

ہزاروں ناموں کے جھرمٹ میں ایک نام ..... جو سورج بن رہا ہے۔ ہجوم تک رہا ہے اکر داوراں آنکھیں اس نام پر مرکوز ہیں ۔ وہ اپنی اونچائی پر بہت خوش ہے کہ اب کوئی دوسرا نام اسکی جگہ نہیں لے سکتا ..... یا وہ اتنی بلندی پر پہونچ چکا ہے کہ اس کی موت کسی بھی طرح ممکن نہیں ..... یا وہ سب کی پہونچ سے بہت دور ہے۔ یا ..... چاروں اور خاموشی ــــــ

لمحوں کا دریا پرسکون ..... دھندھی دھند... لہروں کی آواز ..... قدموں کی آہٹ ــ شاید کوئی دستک دے رہا ہے ۔ نہیں کوئی شئے قریب آرہی ہے ..... نہیں وہ خود کسی کی طرف کھنچ رہا ہے ۔ نہیں دریا نے اپنا رخ بدل دیا ہے ۔ شاید ہزاروں رات پہلے کے لمحات اسے پھر سے چھو رہے ہیں... وہ غور سے دیکھتا ہے ــــــ

ایک دھندلا دھندلا سا نام اس سے قریب ہو رہا ہے ۔ وہ چونک اٹھتا ہے ۔ "یہ دھندلا دھندلا سا نام ..... یہ بجھا بجھا سا نام ۔ یہ پرانا بہت پرانا نام ..... ہاں" اسے یاد آتا ہے۔ یہ نام اس کا محسن ہے اس وقت جبکہ سب طرف اندھیرا تھا اور کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا ۔ اسی نام کی روشنی میں وہ آگے بڑھا تھا ۔ ہجوم کو اس بات کی خبر نہیں کہ اسی بجھتے ہوئے پرانے نام نے اسے راستہ دکھایا تھا ..... یا اسے چمکنے کا انداز دیا تھا ..... یا وہ بہت دور تک اسکی روشنی میں چلا تھا یا.....

.....

"ابھی تو ہجوم کو اس بات کی خبر نہیں ؟" اسکی آنکھیں چمک اٹھتی ہیں ۔

ایک چیخ ــــــ ایک قہقہہ ۔
اس نے اس پرانے نام کو قتل کر دیا ۔
وہ مٹا مٹا سا نام اب اس روشن نام کی تاریخ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کٹ گیا ۔
(وہ مطمئن ہے)
اب ہجوم کو خبر نہیں ہو سکے گی کہ اتنا عظیم، اتنا بلند اور اتنا روشن نام ایک پرانے نام کی آغوش سے نکلا ہے

سلطان سبحانی

نشاط بک سینٹر۔ مالیگاؤں

میں: ایک سلسلہ

آس مٹ گئی ــــ دل بجھ گیا ــــ سانس سانس زخمی لگتی ہے ــــ لمحہ لمحہ بھاری ہو گیا ہے ــــ اب کوئی خواہش نہیں ۔ پورا بدن... سارا وجود زخموں میں کھو چکا ہے ۔ زخم ہی زخم جن پر چیونٹیوں کی یلغار ..... شب و روز یلغار کر رگ رگ میں انھوں نے سرنگیں بچھا دی ہیں ۔

میں جس جگہ ہوں یہ زمین کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے ۔ ایک ننھا سا جزیرہ جس کے چاروں سمت سمندر ہے ۔ میں یہاں سے کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتا ۔ میں کہیں جا بھی نہیں سکتا ۔ بس، قید ہوں اس جزیرے میں اور شاید اس لیے قید ہوں کہ یہ چیونٹیاں مجھے نوچتی رہیں ۔ کیا میرا مصرف یہی ہے ؟ عرصہ ہو چکا ہے ان چیونٹیوں کو سہتے سہتے ۔ اب تو ہڈیوں تک ان کی رسائی ہو چکی ہے ۔

اب بچنے کی کوئی امید نہیں کہ رگ رگ میں انہوں نے سرنگیں بچھا دی ہیں ۔ کوئی راستہ نہیں میں کس طرح ان سے نجات پاؤں اور چاروں سمت سمندر ــــ سمندر، سمندر، سمندر اور صرف سمندر ..... میں کہیں بھاگ بھی تو نہیں سکتا میں کہیں جا بھی تو نہیں سکتا ۔

لیکن ہاں! ایک راستہ ضرور ہے ۔ صرف ایک راستہ ۔ ان چیونٹیوں سے نجات صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ میں خود کو سمندر میں اچھال دوں ۔ اور اگر میں ایسا کر گزرتا ہوں تو پھر تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا وجود ہی مٹ جائے گا ۔ کہانی ہی ختم ہو جائے گی ۔

اور یہ چیونٹیاں ــــ ؟

یہ سب تو اب تک مجھ سے زندہ ہیں ۔ سب ... سب یہ سب میرے وجود میں جیتی ہیں ۔ میری رگیں ۔ میرا بدن ان کا مسکن ہے ۔ انکی بھوک پیاس بھی مجھی میں ہے ۔ پھر اب میں کیا کروں ؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے سوائے ایک بات کے ۔ میں یوں بھی تو سمندر کے حوالے ہو کر مٹ ہی جاؤں گا تو اس سے تو بہتر ہے کہ کیوں نہ ان کی خاطر زندہ رہوں ۔ اگر ــــ میں اس جزیرے میں اس طرح مٹ رہا ہوں تو کیا ہوا، ان سب کے اندر زندگی کی ایک نئی لہر بن کر پھر سے ابھر رہا ہوں ۔

وسعتِ قلب و نظر جب ہو گئی حاصل مجھے ۔۔۔ سنگ ریزوں میں نظر آئی تری محفل مجھے (شفیق پونوی)

سچ اور پہاڑ

نان سنس !
میں پلنگ سے اچھلا ۔ زمین پر آ دھمکا ۔ لائٹ آن
کر دی ، دیکھا کوئی نہیں ہے ـــــ صرف میں ہوں ۔
اکیلا میں ـــــ
سچ کہتا ہوں . میں نے اسکی بارہا کوشش کی ہے اور
مسلسل میری متجسس نگاہوں نے ، فکرمند ذہن
نے اور میرے جسم نے ، اسکو چاہا ہے کہ میں اس
کو پالوں ـــــ لیکن کس کو ؟
باہر گلی سے بے کار کاغذوں کے پھڑپھڑانے
کی آواز آ رہی ہے ۔

- - - - - - - - -

ہاں میں نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ سچ بولوں ۔
سچ ؟ !!!
لیکن سچ کہاں ! وہ تو پہاڑ پر ہے ۔
میرے ہونٹ مسکراتے ہیں ۔ نان سنس
باہر گلی سے ناکارہ اور بے کار کاغذوں کے پھڑ
پھڑانے کی آواز آ رہی ہے ۔

حمید سہروردی
بیڑ ۔ مہاراشٹر

مکالمہ

سورج اپنی آنکھیں کھولے ایک ایک ذرے
کو دیکھ رہا ہے . اور خوش ہونے کے گمان میں ایک
طویل سفر طے کر رہا ہے . اس کے اطراف آگ ـــــ
اور تیز آگ اور آگ کے اندر کسی نامعلوم شخص کی
شبیہہ بار بار نظر آ رہی ہے . ہو سکتا ہے کہ بے
شمار سرابوں میں یہ بھی ایک سراب ہو ـــــ تم
دیکھو ۔ ممکن ہے ، تمہارے لیے یہ کوئی نئی بات
نہ ہو ـــ میں تمہارے ٹھکانے پر آ چکا ہوں . ہنوز
مکان کے اندر صدر دروازہ پر بھاری سا قفل لٹک
رہا ہے . ممکن ہے تمہارے مکان کے اندر سورج
کی شعاعیں نہ پہنچ سکنے کی وجہ سے لال بھبوکا ہو رہی
ہو ۔ گھبراؤ نہیں ـــ میں سمجھتا ہوں کہ خالی مکان بھی
خالی نہیں ہوتا . اس کے اندر ہم ہوں یا نہ ہوں . مگر وہ
ہماری آمد کا منتظر ضرور رہتا ہے اور کیا کہوں ـــــ
بس اتنا ہی کہوں گا کہ پھر تم بچ رہے ہو ـــ مگر کب
تک ، اور کیوں ؟
ـــــ کوئی بھی مشعل بردار خوف ناتمام لیے دربدر
کی خاک چھان سکتا ہے مگر تم کس لیے ۔ ایک راستہ
یہ بھی ہے کہ تمہاری سفری یوز منقطع لمحوں کا خواہشمند
ہے . کیا تمہارے لیے یہ ممکن ہے ؟
تم میری آمد کا انتظار کرو ۔
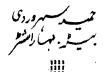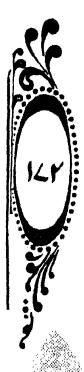
عرفان عارف

آواز کا حصار

وہ آواز بہت عرصے سے میرا تعاقب کر رہی تھی۔

وہ بہت عجیب تھی۔ کچھ تو سمجھ میں آنے والی اور کچھ سمجھ سے باہر کبھی وہ مہمل ہوتی اور کبھی تشریح کی حدوں کو پار کر جاتی۔

لاشعور میں جب یہ آواز ابھرتی تو نہ معلوم کیسی کیفیت طاری ہو جاتی۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ یہ درندگی تک پہنچ کر واپس ہو جاتی اور اس وقت ہر شئے سے لاپرواہی ظاہر ہوتی۔ خیالات پرانی گپھاؤں اور صدیوں برس پرانے غاروں کی طرف پرواز کر جاتے ہیں کسی ایک غار میں اپنے آپ کو محسوس کر کے آنکھ کو بند کیے اس سے بھی ہزاروں برس پرانے زمانے میں سفر کرنے لگتا۔ یہ آواز ہی کا کرشمہ تھا۔

مگر ـــــ اس بار آواز نئے پیرہن کے ساتھ جلوہ گر ہوئی وہ خیالات کی بلندی کو چیرتی ہوئی چلی گئی ـــــ درندگی کو چھو کر واپس ہونے والی اس آواز میں غضب کی جرات تھی ـــــ اب جسم و روح پر اس کی حکمرانی تھی ـــــ

ایک بار میں سفر میں تھا۔ آواز کا سایہ میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے دیکھا کہ ویرانے میں ایک پھول کھلا ہے۔ گلاب کا پھول تھا۔ میں اسے توڑنے کے لیے آگے بڑھا لیکن توازن قائم نہ رکھ سکا۔ اور گلاب پر گر پڑا۔ اس پر بوجھ کا پڑنا تھا کہ وہ سمٹنے لگا۔ لیکن اس کی تازگی نکھر گئی۔

اب اس گلاب کو میں نے اپنے کمرہ میں سجا کر رکھ لیا ہے۔ تاکہ اس کی خوشبو تاحیات میری سانسوں میں بسی رہے۔

اب وہ آواز جو مجھے صدیوں پرانے غاروں میں لے جاتی تھی، بند ہو چکی ہے۔

اپنے سماج میں

اس نیم برہنہ آدمی کے جسم پر لپٹا ہوا بوسیدہ کپڑا اچھٹ ہو کر گر گیا۔ کیونکہ جھونپڑی کو ایک کتے نے کھینچ لیا تھا ـــــ وہ برہنہ ہو گیا اور اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔ کیونکہ بارش ہو رہی تھی اور وہ فٹ پاتھ کے کنارے کھڑا تھا۔

اس نے دیوار کی طرف اپنا رخ پھیر لیا اور دونوں ہاتھوں سے چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔ کچھ لوگ قریب کی عمارت کے نیچے کھڑے تھے اور اسے دیکھ کر ہنسنے لگے تھے۔

کچھ قہقہے بارش کے زور کو چیرتے ہوئے دور تک چلے گئے۔ کچھ لڑکے خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ یہ اسکول کے بچے تھے۔ ایک بار قہقہے پھر بلند ہوئے۔ لیکن اچانک فضا میں ساکت ہو گئے کیونکہ ایک طالب علم نے جس کے شانے پر اسکول کا بستہ لٹک رہا تھا۔ اپنے پھٹے ہوئے قمیص سے اس کے جسم کو لپیٹ رہا تھا۔ طالب علم نے مڑ کر ہنسنے والوں کو دیکھا۔ ان کے سر نیچے جھک گئے۔ طالب علم کو یوں محسوس ہوا جیسے ان آدمیوں کے جسم پر کپڑے نہیں ہیں۔

ـــ × ـــ

ضرورت

دوپہر کی شدید گرمی تھی۔

اچانک دروازے کے پٹ کھلے۔

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں"؟ وہ سامنے کھڑی تھی۔

اسے دیکھ کر وہ حیرت میں پڑ گیا۔ کچھ دیر آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔

ہوش سنبھالتے ہوئے بولا۔

"ہاں ہاں۔ آؤ ـــــ وہ کمرے میں داخل ہوئی۔

"دیکھیے میرے یہاں وہ دونوں سے اناج نہیں ہے۔ اگر آپ.....

"میرے یہاں بہت ہے"۔ اس نے بہت قریب ہوتے ہوئے جواب دیا۔

جواب میں مزاحمت نہیں تھی ـــــ

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا ... نے جا (احمد فراز)

ڈاکٹر ایم آئی ساجد

نزد کچی مسجد رکھام گاؤں ، بلدانہ ۔

انتخاب

مہیش اینڈ مہیش اینڈ ورما ٹریڈنگ کمپنی کے خوبصورت ویٹنگ روم میں ہم کل ملا کر پندرہ لڑکیاں اپنی اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لیے منتظر سی بیٹھی تھیں ۔ ہم سب ہی یہاں اسٹینو گرافر کی پوسٹ کا انٹرویو دینے آئی تھیں ۔ ہم سب نوجوان خوبصورت اسمارٹ غیر شادی شدہ تھیں اور اپنے کام میں قابل و ماہر ۔ ہم سبھوں میں بس ایک ہی مسز تھیں ، مسز ملہوترا ! دبلی پتلی معمولی شکل و شباہت والی الجھی الجھی خاموش سی عورت ۔

انٹرویو گیارہ بجے شروع ہو کر چار بجے ختم ہوا ، ہم میں سے ہر ایک کو امید تھی کہ انتخاب اسی کا ہوگا ۔ آخر پانچ بجے کے قریب چپراسی نے آ کر آواز لگائی "آپ میں سے مسز ملہوترہ کون ہیں ؟ " اپنا آرڈر لے لیں ۔"

ہم سب ایک دوسرے کا منہ حیرت سے دیکھتے ہوئے واپس ہونے لگیں ۔ سب سے آخر میں تھی ۔ گیٹ کے دروازے پر میں نے سنا ایک چپراسی دوسرے چپراسی سے کہہ رہا تھا "رمو ! تمہیں پتہ ہے آج جو اسٹینو گرافر لگی ہے وہ ایک صاحب کے ساتھ کالج میں پڑھتی تھی ۔ سنا ہے دونوں میں بڑی گہری دوستی تھی ؟" میں نے بے خیالی میں اس طرح سر ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ میں آ گیا ہو ۔

حصار

آج سے چھتیس برس قبل جب وہ پیدا ہوا تھا تب بہت ہی غریب مفلس ، گمنام اور بے یار و مدد گار تھا ۔ اس کے چاروں طرف غریبی و مفلسی کے بد ہئیت سایوں کا حصار تھا ۔ لیکن آج وہ اس حصار کو توڑ چکا ہے ۔ اپنی تعلیم ، محنت ، دیانتداری اور سچی لگن کی بنا پر بڑا آدمی بن چکا ہے ۔ روپیہ پیسہ ، عزت ، شہرت ، نام و نمود ، خوشحالی سب ہی کچھ اس کے پاس ہے ۔ ان چھتیس برسوں میں اس نے بہت کچھ پایا ہے تو کچھ کھو بھی دیا ہے ۔ اولاد کا سکھ اور والدین کی محبت کا ورق اس کی کتاب زیست سے بدقسمتی کے سیاہ ہاتھوں نے الگ کر کے پرزے پرزے کر دیا ہے وہ ان نعمتوں کے حصول کے لیے اپنا سب کچھ دینے کو تیار ہے ۔ لیکن خریدار کا کہیں پتہ نہیں ....!

—— × —— × ——

زندگی

جب وہ سپنوں کی دنیا سے باہر آیا تو اس کے چاروں طرف موت بکھری پڑی تھی ۔ بچے بوڑھے جوان خون میں لتھڑے پڑے تھے ۔ اس کی بیوی ، خوبصورت جوان دولہا بنا ہوا بیٹا ۔ سرخ ساڑی میں لپٹی خوبصورت نئی نئی بہو جیسے ابھی ابھی بیاہ کر اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ بس کے ذریعہ اپنے گھر لے جا رہا تھا ۔ وہ بس میں بیٹھے بیٹھے سوچ رہا تھا کہ بیٹے کی شادی خوب دھوم دھام سے ہوئی ۔ بہو خوب جہیز ساتھ لائی ہے ۔ امیر گھرانے کی لڑکی ہے ۔ شادی پر اٹھایا گیا قرض بھی آہستہ آہستہ بیٹے کی تنخواہ سے ادا ہو جائے گا ۔ زندگی اطمینان سے گزرے گی اب کوئی فکر نہیں وہ یہیں تک سوچ پایا تھا کہ بس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور دیکھتے دیکھتے اس کی بیوی ، اور بیٹا ہلاک ہو گئے بہو چل بسی دیگر کئی لوگ موت کا شکار ہو گئے چند لمحوں میں یہ کیا ہو گیا ؟ دیکھتے ہی دیکھتے سارے خواب بکھر گئے خوشی ماتم میں بدل گئی اور پل بھر میں دنیا تہہ و بالا ہو گئی

رات کا جادو

صبح جب وہ سو کر اٹھا تو خلافِ معمول سر میں شدید درد کا احساس ہو رہا تھا ۔ پورا بدن جیسے ٹوٹ رہا تھا اور ایک تھکی تھکی سی کیفیت ذہن پہ حاوی تھی ۔ وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بستر پہ یوں ہی بیٹھا گزری رات کے واقعے پہ غور کرنے لگا ۔

اپنے ایک امیر دوست کے شدید اصرار پہ وہ پہلی مرتبہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل گیا تھا ۔ جہاں چند شناسا اور آ ملے ۔ پھر شدید انکار کے باوجود بھی اسے چھٹکارا نہ ملا ۔ گوشت ، کباب ، تلے ہوئے جھینگے ، چائنیز ڈش اور تلخ و تند شراب کے پیگ پہ پیگ ۔ وہ بہت جلد بہک گیا ستم بالائے ستم ہیجان انگیز موسیقی اور کیبرے نے بھی اس کے نشے کو دوہرا کر دیا اور محفل بکھر جانے پہ کار کے ٹھنڈے جھونکوں نے تو اس کے رہے سہے حواس بھی معطل کر دیے اسے پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کب اور کس حال میں اپنے گھر پہنچا اور کس طرح بستر تک اس کی رہنمائی ہوئی ۔ اور اب اس کی بیوی اور دونوں بچے اسے اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے کوئی اجنبی غلطی سے گھر میں آ گیا ہو ا وہ ان سے نظریں چراتا ہوا جلدی سے باتھ روم میں گھس گیا ۔

کیا کہوں دیدۂ تر یہ تو مرا چہرہ ہے
سنگ کٹ جاتے ہیں بارش کی جہاں دھار گرے (شکیب جلالی)

پیڑ

ان تینوں بچوں نے ایک پیڑ لگانے کی سوچی۔ ان میں سے ایک نے گڑھا کھودا ..... دوسرے نے بیج بویا ــــ اور تیسرے نے پانی ڈالا۔ ان تینوں نے قسم کھائی کہ اس پیڑ کا پھل ہم تینوں بانٹ کر کھائیں گے .....

وقت کے ساتھ ساتھ وہ تینوں جوان ہوئے پیڑ بھی بڑا ہو چکا تھا۔ ان تینوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ اور ان کے بچے بھی سمجھ دار ہو گئے تھے۔ پیڑ بھی اب پھل دینے لگ گیا تھا۔ پھل تینوں میں برابر برابر تقسیم کر لیتے لیکن اب تینوں میں ہر کوئی سوچتا کہ کاش پیڑ اس نے اکیلے لگایا ہوتا...... اس پیڑ نے ان تینوں کی زندگی میں ایک کڑواہٹ سی گھول دی تھی..... ایک کھنچاؤ کی حالت پیدا ہو گئی تھی...... کبھی کبھی لے دے بھی ہو جاتی...... ایک دن ان کے بچوں نے آپس میں صلاح کی...... اور پھر اس رات ان تینوں کے بچوں نے اس پیڑ کو کاٹ ڈالا۔

معرفت قیوم الدین ملک
قطب الدین لین
دریاپور، پٹنہ

مہذب

فضل امام ملک

بس میں سوار ہونے والے لوگ صورت سے ہی شریف نظر آ رہے تھے۔ تن پر اچھی پوشاک، گلے میں لٹکتی ٹائیاں اور انگلش کے جملوں کا تبادلہ ان کے مہذب ہونے کا ثبوت تھا......

بس کھلی اور کنڈکٹر کا ہاتھ ان لوگوں کے سامنے سوالیہ انداز میں پھیل گیا۔ "کہاں جانا ہے بابوجی.....؟ ارے بھئی بریگیڈ جانا ہے..... کتنا بھاڑا ہے ایک آدمی کا؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

بابوجی!...... بھاڑا تو پانچ روپے ہیں لیکن آپ لوگ دو ہی کے حساب سے دے دیں تو میرا کام بھی بن گا...... آپ کا بھی بنے گا..... ویسے بھی گاڑی تو خالی جا رہی ہے ــــ کنڈکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بات ان لوگوں کی سمجھ میں آ گئی۔ اور پھر پانچ کے حساب سے ایک دس کا نوٹ کنڈکٹر کو انھوں نے تھما دیا۔ کنڈکٹر ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔

اگلے اسٹاپ پر گاڑی رکی اور ایک بوڑھا دیہاتی پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس بس پر وارد ہوا۔ "بابا کہاں جانا ہے؟".. کنڈکٹر کی آواز گونجی۔

بریگیڈ بیٹوا ــــ" دیہاتی کی کمزور سی آواز مہذب لوگوں کے قہقہے میں گم ہو گئی۔ اور اس نے اپنے تھیلے میں سے پانچ کا نوٹ نکال کر کنڈکٹر کی جانب بڑھا دیا۔ کنڈکٹر نے اسے تین روپے واپس کر دیے ...... ای کا ہوا ـــــ بھاؤ تو پانچ روپیہ ہے......!

ارے بابا رکھ بھی لو ــــ مہذب آدمی میں سے ایک بولا۔

"نا بابوجی دیش کے ساتھ ہم بے ایمانی نا ہی کرتے" اور اس نے باقی کے تین روپے کنڈکٹر کو تھما دیا کنڈکٹر ٹکٹ پھاڑ کر آگے بڑھ چکا تھا اور مہذب آدمیوں کے قہقہے کہیں کھو سے گئے تھے۔

پھر عنایت کیجئے وہ عہد عاشقی کا جنوں   پھر وہی دے دے الٰہی جذبہ کالج   (ککسی برنی)

تعلق کا راز

شہر میں چاروں طرف حیوانیت برہنہ رقص کر رہی تھی۔ قدم قدم پر لاشیں پڑی تھیں گلی کوچوں کو خون سے سجایا جا رہا تھا۔ چاقو چھرے تلواریں اور بھالے کھلے عام استعمال کیے جا رہے تھے شہر کی حالت تاریخی جنگ کے میدان جیسی ہو گئی تھی جس پر حیوانیت غالب آنے کی کوشش کر رہی تھی اونچی اونچی عمارتوں سے دستی بم مٹی کے تیل اور پٹرول کی بوتلوں کی بارشیں ہو رہی تھیں۔ بندوق اور پستول کی گولیاں دیوالی کی رات کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ اور ان سب پہ ماؤں بہنوں بیٹیوں اور معصوم بچوں کی آہ و بکا چیخ و پکار غالب آنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی یہ کھیل صرف مذہب کے نام پر کھیلا جا رہا تھا۔ اور وہ سارے شہر میں بے خوف قہقہہ لگاتے دوڑ رہی تھی جیسے شہر میں کوئی جشن منایا جا رہا ہو اور سیکڑوں کھیل تماشوں کا انتظام کیا گیا ہو۔ اور وہ ایک ہی دن میں سارے کھیل تماشے دیکھ

نواب رونق جمال۔ ایم اے
چاندنی چوک
امراوتی ۔ ۴۴۴۶۰۱

لینا چاہتی ہو۔

محافظوں کے ایک دستے نے شہر پر قابو پانے کے لیے گولیوں کی بوچھار کر دی جیسے آسمان سے اچانک گولیوں کی بارش ہونے لگی ہو۔ لوگ خوف و ہراس سے گھروں میں چھپ گئے تھے کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ مکان کی کھڑکی کھول کر باہر کا منظر دیکھتا۔ گولیوں کی آوازیں اور محافظوں کے دن دناتے ہوئے قدموں کی آواز روح کو لرزا دے رہی تھی لیکن وہ پھر بھی بے خوف جوانی کی بہار سے لدی چندی فقر سے گندے کپڑوں میں لپٹی مسکراتی قہقہے لگاتی گلی کوچوں کو روندتے ہوئے دوڑ رہی تھی کہ محافظوں کے ایک گروپ نے لپک کر پکڑ لیا۔

"اے چھوکری کہاں بھاگ رہی ہے؟ ادھر آ!
روح کو لرزا دینے والی کرخت آواز لیکن وہ خوف سے بے نیاز مسکراتی رہی۔
کون ہے تو.... کیا نام ہے تیرا.... کہاں جا رہی ہے!"
خاموشی..... اور حیرانی صرف حیرانی!
"کیا تو جانتی نہیں ہے کہ شہر میں فساد چل رہا ہے کرفیو لگا ہوا ہے گھومنا پھرنا اور گھر سے نکلنا منع ہے۔"
جواب میں ہلکی سی مسکراہٹ!
"کس مذہب سے تعلق ہے تیرا شکل و لباس سے تو مسلمان نہیں لگتی!" -
جواب میں ایک فلک شگاف لیکن معصوم قہقہہ۔
"ارے یہ تو بہت زیادہ بہادر اور دلیر بننے کی کوشش

(بقیہ صفحہ ۱۷۸)

مجرم

اس کیس کی وجہ سے انسپکٹر وجے کافی پریشان تھا۔ اپنی دس سالہ سروس کے دوران اس نے بے شمار گنہگاروں کو قانون سے سزا دلوائی تھی۔ اب تو اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ مجرم کا چہرہ دیکھ کر ہی وہ پوری کہانی پڑھ لیتا تھا۔ ہر مجرم پولس اسٹیشن

معین الدین عثمانی ایم اے
۲۶۴ پشاہونگر۔ جلگاؤں

آنے کے بعد اپنے جرم سے انکار کرتا تھا۔ مگر وہ لڑکی اپنے جرم کا اقبال کر رہی تھی۔ ۲۰ سال کی وہ معصوم دوشیزہ چوری کے الزام میں پولس اسٹیشن لائی گئی تھی۔ اس کے کپڑے معمولی قسم کے تھے مگر چہرے سے شرافت ٹپک رہی تھی۔ اس کی معصومیت اور سادگی نے انسپکٹر وجے کو کافی پریشان کر دیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کریں۔

پولیس اسٹیشن میں اس نے جو بیان دیا تھا وہ بھی چونکا دینے والا تھا۔ بہت اصرار کے بعد اس نے انسپکٹر وجے سے کہا ـــ ہاں انسپکٹر صاحب! اس دکان سے کپڑے میں نے ہی چرائے تھے۔ میں نے یقیناً چوری کی ہے اس کے لیے مجھ کو آپ یا قانون جو چاہے سزا دیں میں اسے بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر انسپکٹر صاحب میں نے چوری کیوں کی تھی۔ یہ جاننے کے بعد بھی آپکا قانون کچھ نہ کر سکے گا کہ قانون اندھا ہوتا ہے آپکی عدالتوں میں فیصلے جذبات اور انسانیت کو بالائے طاق رکھ کر اصولوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔

انسپکٹر صاحب اس بے رحم دنیا میں اگر آپ کے قانون نے بھی ہماری حفاظت نہ کی تو میری طرح کی لڑکیاں سماج کے ان گندے کیڑوں کی نظر ہو جائیں گی جن سے میں بھاگ کر آئی ہوں۔ انسپکٹر صاحب آج سے ایک سال قبل میں بھی ایک شریف قسم کی زندگی گزار رہی تھی۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد میری شادی ہو گئی۔ مگر قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کوئلے کی کان کے حادثے میں میرے شوہر مارے گئے۔ ان کے بعد میں اکیلی رہ گئی۔ جیسے جیسے دن گزرتے گئے میری حالت ابتر ہوتی گئی۔ ان کی نشانی میرے پیٹ میں پل رہی تھی۔ مگر آپ کے سماج کے لوگوں نے مجھے سہارا دینے کی بجائے طرح طرح سے ستانا شروع کر دیا۔ ایسی حالت میں میرا کوئی بھی ٹھکانہ نہ تھا۔ فاقوں کی نوبت آ گئی موت سے بدتر زندگی جیتے ہوئے میں نے سوچا کیوں نہ میں چوری کر کے جیل چلی جاؤں۔ وہاں پر تو کھانے کو ملے گا۔ پیٹ میں پلتے ہوئے بچے کی بھی پرورش ہو جائے گی اور دنیا کی نظروں سے بھی پناہ ملے گی ـــ پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

انسپکٹر وجے کو اس واقعہ نے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ لڑکی کو اس کے جرم میں گرفتار کرے یا نہیں۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا واقعی یہ لڑکی مجرم ہے؟

کس نے چھیڑا انتہائے دل محبت کے ساز پر
ہو گئی کیفیت دنیا و دیں حاصل مجھے (شفیق پونوی)

صغیر احمد صغیر
منی مسجد گیلوال بیگھہ
گیا (بہار)

شریف لوگ

وہ نہ جانے کب سے انسانیت کی کھوج میں بھٹک رہی ہے۔ لیکن ابھی تک اسے انسان نہیں ملا۔ وہ در در کی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔ وہ پورے شباب پر ہے اور جوانی اسکے انگ انگ سے ٹپک رہی ہے۔ لیکن اس عمر میں اس کی گود میں ایک نوزائیدہ بچہ بھی ہے۔ لیکن اس بچّے کا باپ کون ہے.....؟ ہم! آپ!! ساری دنیا!!!

اُف ساری دنیا کا باپ وہ اپنے گود میں لیے پھر رہی ہے۔ اور صرف اس دنیا کی ستم ظریفی پر آنسو بہا رہی ہے آخر کیوں اسے کوئی سہارا نہیں دیتا___ اپنی ہوس کا شکار بنا کر سڑکوں اور گلیوں میں بھٹکنے کے لیے کیوں چھوڑ دیا۔ کیا وہ انسان نہیں؟ اگر وہ انسان ہے تو اسے بھی سماج میں انسانیت کا درجہ ملنا چاہیے۔

.........وہ انسان کون ہے؟ کہاں رہتا ہے۔ جس نے اس حسین دوشیزہ کی آبرو پر حملہ کیا___ وہ بھی اس سماج میں رہتا ہے۔ اور شاید وہ اپنے گلے میں انسانیت کا تمغہ لٹکائے پھرتے ہیں۔ لیکن کیا کرتے ہیں سب جانتا ہے۔ لیکن کوئی زبان نہیں ہلا سکتا۔ اس لیے کہ سماج بدنام نہ ہو جائے۔

سماج.....سماج.....سماج.....لوگ کہتے ہیں سماج کے دائرے میں رہ کر کام کرو۔ لیکن یہ کس سماج کا قانون ہے کہ کسی کی عزت لوٹ کر اسے سڑکوں پر چھوڑ دیا جائے اور اسے سماج سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ آوارہ ہے بدچلن ہے۔ اور وہ.....سماج کے ٹھیکیدار ہیں بڑے اچھے اور پاک دامن ہیں۔ کیوں؟ ___ انسانیت کا خول پہننے والے ___ ایک دن پاپ تیرے گریباں تک بھی پہنچ جائے گا۔ اور تیری انسانیت سب کے سامنے نمایاں ہو جائے گی۔ لیکن تجھے کوئی کچھ نہیں کہے گا کیونکہ تو سماج کا رہبر ہے نا___ دولت پر عزت کو خریدنے والے۔ دولت ہی تجھے ایک دن ڈس لے گی۔

میری نظریں اس حسینہ کا تعاقب کر رہی ہیں جو اپنے بچّے کو لے کر ماری ماری پھر رہی ہے۔ ابھی ابھی وہ ایک انسان کے پاس گئی ہے اور کہہ رہی ہے___ "بابوجی! میرا بچّہ دو دن سے بھوکا ہے۔ کچھ پیسے خدا کے نام پہ دے دو۔۔

اور وہ انسان اس کے سراپا حسن کا جائزہ لے کر اپنی نوکرانی کو آواز دیکر کہتا ہے___" اس کے بچّے کو لے جاکر دودھ پلا دو___!

اور پھر اس لڑکی کو اشارے سے چلنے کو کہتا ہے۔ اور وہ چلنے کو تیار ہو گئی۔ کیونکہ وہ بھی دو دن سے بھوکی تھی۔ اور پھر وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا اس کے ہاتھ میں دس دس کے کئی نوٹ پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ اپنے بچّے کو لے کر وہاں سے چل پڑی۔ اس نے محسوس کیا۔ اس کے اردگرد ہزاروں بچّے بلک رہے ہیں سسک رہے ہیں اور اپنی بھوک کا اظہار کر رہے ہیں دودھ مانگ رہے ہیں۔ اور وہ سب سے پیچھا چھڑا کر بھاگ رہی ہے۔ بھاگ رہی ہے___ دوڑتے دوڑتے وہ ایک کار کی زد میں آگئی ہے۔ اس کا وجود سڑک پر پھیل گیا ہے___ شاید وہ انسانیت کی تلاش میں دارالبقاء کو چلی گئی۔ کیا اسے وہاں انسان ملے گا___؟؟

حفاظتی خیمہ

شہر میں آج فساد کا دوسرا دن تھا گذرے ہوئے دن کی طرح آج بھی کہیں... کہیں آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ بندوقوں اور مشین گنوں کی آواز انسانی چیخوں کے تسلسل کو توڑ دیتی تھیں۔ اس نے گزرے ہوئے دن کی شام کو اپنے گھر کی کھڑکی سے منھ باہر نکال کر سامنے کی بستی کی طرف دیکھا تھا۔ اور گھبرا کر واپس کھڑکی بند کر لی تھی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ لوگ کل دوپہر تک یہاں بھی آپہنچیں گے...؟...

وہ اپنا کنوارا جسم لیے گھر سے باہر بھاگی___ ابھی تھوڑی ہی دور بھاگ پائی تھی کہ___ وردی میں کھڑے ہٹے کٹے نوجوان کے دونوں ہاتھ اسکے کاندھوں پہ آکر رکے___ کہاں بھاگی جا رہی ہے؟"

پاگل ہو گیا۔ تمھیں معلوم نہیں آج بھی سارے شہر میں کرفیو لگا ہوا ہے آج فساد کا دوسرا دن ہے___ چلو" کنوارا جسم بولا لیکن کہاں؟ کنوارا جسم مجسّم سوال بن گیا۔ جوان نے کہا حفاظتی خیمے میں___ لیکن___ اور وہ بغیر کچھ سنے اس کا بازو پکڑ کر چل دیا___ کچھ دور چلنے کے بعد نوجوان نے کہا۔ تم بہت گھبرا رہی ہو" ہاں" اسکی یہ بات سن کر نوجوان نے اپنی جیب سے ایک گولی نکالی اور اسکی کنواری زبان پر رکھ دی۔ کھالو___ تمھاری گھبراہٹ دور ہو جائیگی۔

کچھ چلنے کے بعد اسکی آنکھیں بند ہونے لگیں کبھی وہ وردی والے جوان کو اپنے چاروں طرف گھومتا دیکھ رہی تھی۔ تو کبھی خود اپنے آپ کو اس کے چاروں طرف___ اور اس کے بعد اس کے لیے سب کچھ تاریکی میں بدل گیا۔ جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپکو خیمے کے اردگرد پڑے کراہتے ہوئے نیم برہنہ اور برہنہ جسموں کے درمیان پڑا پایا۔ ان کے کراہنے کی آواز بھوک کی بے چینی نہیں تھی بلکہ شاید اپنا سب کچھ لٹ جانے کی تھی۔

کلیم جاوید۔ اوجین

مے کشوں نے پی کے توڑے جام سے
ہائے وہ ساغر جو رکھے رہ گئے (آنند نرائن ملّا)

تعارف

رشید امکان
توپ خانہ روڈ اوجین ایم پی

مجھے یاد ہے اس دن تمہارے ڈیڈی ہمیشہ کی طرح اپنے آفس ٹھیک وقت پر چلے گئے تھے۔ اور تمہاری ممی جو اس وقت شہر کے کسی کالج میں لکچرار تھیں۔ تمہیں۔ تمہاری آیا کے حوالے کر کے اپنی ڈیوٹی بجانے چلی گئیں تھیں۔ میں کچن میں اپنے کام کر رہا تھا کہ اچانک تمہارے رونے کی آواز سنائی دی۔ تم روتے روتے کچھ ہی دیر میں چیخیں مارنے لگیں۔ میں نے کچن کی کھڑکی سے تمہیں دیکھا۔ جو ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ تم مسلسل چیخیں مار رہے تھے۔ آیا ہر طرح سے تمہیں بہلانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر تم تھے کہ روتے ہی جا رہے تھے آیا نے پریشان ہو کر تمہیں ایک خوبصورت سے جھولے میں ڈال دیا تھا اور دودھ کی شیشی تمہارے منہ سے لگا کر خود لیٹرن چلی گئی تھی۔ تم نے وہ دودھ کی شیشی زمین پر گرا دی تھی۔ جو گرتے ہی ٹوٹ گئی تھی۔ میں اپنا کام کرتے ہوئے کھڑکی کی ادھ کھلی دراز سے تمہیں دیکھ رہا تھا۔ آیا لیٹرن سے نکلنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ تم برابر چیخیں مار رہے تھے کہ ....

اچانک کملا اپنے برتن مانجنا چھوڑ کر تمہارے پاس آئی اس کے کوئلے سے سنے ہوئے ہاتھ جو کچھ دھلے کچھ نہیں دھلے تھے۔ انھیں ہاتھوں سے اس نے تمہیں اپنی گود میں اٹھا لیا تھا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنی چھاتی کھول کر اپنا آنچل تمہارے منہ سے لگا دیا تھا۔ تم پل کی پل میں چپ ہو گئے تھے۔ میں بھی سہم گیا تھا۔

ہاں یہ وہی کملا تھی جسے تم نے ایک معمولی سی پلیٹ ٹوٹ جانے پر اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا تھا۔

"مہا پروش"

سعید روشن
بانسواڑا راجستھان

ایک اڑتا ہوا کوا جو راہ پر کھڑی آدم قد سفید پوش مورتی کے کاندھے پر سوار ہو جاتا ہے اور گذرتا ہوئے ان راہ گیروں کو دیکھتا ہے۔ جو مورتی کے نزدیک آ کر سراپا خلوص کی تصویر بن جاتے ہیں۔ "کوا" سوچتا ہے شاید یہ کوئی مہا پروش ہیں اور "مہا پروش" سے کچھ سبق حاصل کرنا چاہیے۔ کوا اپنی چونچ مورتی کے کان کے نزدیک لاتا ہے۔ جیسے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔

"آپ کون ہیں"؟

"آپ کو یہاں کس نے کھڑا کیا؟"

مگر مورتی کو بدستور خاموش دیکھ کر غصے کے مارے پیچ و تاب کھانا شروع کر دیتا ہے اور سوچتا ہے کہ اس پر مہا پروش کو ضرور اپنی عظمت پر غرور ہے جس کی سزا اسے ملنی ہی چاہیے۔

چالاک کوا مہا پروش کے سر پر اپنی "بیٹ" چھوڑ کر اڑ جاتا ہے۔

پتوار

زبیر قریشی، منگول پوری نئی دہلی

رات کو جب وہ سارا کام نمٹا کر اپنے گھر جانے لگا تو مالکن کی کرخت آواز نے اس کے قدم روک لیے...... ارے منّن اب تجھ سے پورا کام نہیں ہو رہا ہے تھوڑی ہی دیر میں تھک جاتا ہے۔ لگتا ہے اب مجھے دوسرا انتظام کرنا پڑے گا.... "لیکن میم صاحب میرا کیا ہوگا؟" وہ گھگھیایا۔ اس عمر میں اب مجھے کون سہارا دے گا میں تو ۲۰ برس سے...... یہ میں نہیں جانتی۔ مالکن نے اس کی بات کاٹ دی۔ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ تجھ میں اب وہ پہلی سی بات نہیں رہی تو ہی سوچ نا! کمزور پتوار کے سہارے کشتی کیسے کنارے لگ سکتی ہے۔ ہاں ایک راستہ ہے تیرا ایک نوجوان لڑکا ہے نا جسے تو پچھلی مرتبہ یہاں لے کر آیا تھا آج کل وہ کیا کر رہا ہے؟... مالکن بس آوارہ گردی کرتا رہتا ہے..... اس نے دکھی پن سے کہا... تو فکر مت کر مالکن کی آنکھوں میں ایک تیز چمک لہرائی۔ تو اس کو یہاں لے آ میں اس کو سیدھے راستے پہ لے آؤں گی

جی اچھا کہہ کر وہ چلا گیا

دوسرے دن اس کا جوان لڑکا مالکن کی کشتی کا ناخدا بن گیا۔

بقیہ :- تعلق کا راز .....

کر رہی ہے..... بدن تو دیکھو سنگ مرمر جیسا ہے
.....جوانی تو سالی ناگن کی طرح آئی ہے۔"

"محافظوں کی بے مقصد باتیں سن کر ایک اور فلک شگاف قہقہہ

"پکڑو سالی کو اور ننگا کر دو - .... ہٹ جاؤ پہلے میں اپنی پیاس بجھاؤں گا سالی کتے کی بوٹی لگتی ہے"۔ اور وہ اسے اپنے آپ میں سمانے کی کوشش میں پیاس بجھاتے بجھاتے تھک گیا لیکن وہ بدستور قہقہہ لگاتی رہی۔ اور پھر ایک دو تین چار........ محافظوں کے سہارے لوٹے نے اپنی پیاس بجھائی وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیا زندگی کو سینے سے لگا لیا اور اسے چھوڑ دیا ..... وہ قہقہہ لگاتے ہوئے پھر دوڑنے لگی۔

کرفیو ہٹتے ہی لوگوں نے شہر کی وسیع شاہراہ پر گٹر میں ایک دوشیزہ کی برہنہ لاش دیکھی جس نے

ہزار بار کیا ترک عزم نغاں لیکن
ہزار بار مگر دیکھنا پڑا ہم کو / معین احسن جذبی

ترتیب

مدتوں میں نے ہنسایا اسی دنیا کو سلیم
مدتوں رولائے رہے گی یہی دنیا مجھ کو (سلیم چشتی پونوی)

آنا ہی تھا اکدن سب کی خودنگری کو میری طرف
کس نے اچھالا بھول کے سنگِ دیدہ وری کو میری طرف

میں کیا جانوں اس کا موسم مکو راس نہ آئے گا
اچھا اب لوٹا دو، میری خوش ہنری کو میری طرف

خود اپنی سنجیدہ نگاہی مجھ کو پُر اسرار لگی
آکے ملے گا کیا تیری بالغ نظری کو میری طرف

میں کہ ابھی تک اپنی جگہ تھا دیدۂ بینا کی حُرمت
وقت نے دیدی راہ غبارِ بے بصری کو میری طرف

پتھر پتھر گھومے گی تو دکھ جیون کا سمجھے گی!
تیشہ دے کر بھیجدو اسکی شیشہ گری کو میری طرف

وہ کیا جانے، یہ گمشدگی دانش کا اک حصّہ ہے
اس نے کیا منسوب، شعورِ بے خبری کو میری طرف

کپڑے ہیں تہذیب بدن کی بستی کے لوگ
زیبِ بدن رکھتے ہیں لباس جامہ دری کو میری طرف

شاید میرے کام کچھ آئے، پھینکدیا ہے دنیا نے
اپنی متاعِ بے اثری و بے ثمری کو میری طرف

ایسے کئی دوزخ تو فضاؔ، اس عہد میں اپنا ورثہ ہیں
سہہ نہ سکو، تو کردو عذابِ نکتہ وری کو میری طرف

سب کا سلام، سب کی دعا لے کے جاؤں گا
اس تلک میں کب بغیر حوالے کے جاؤں گا

دریوزہ گر نہیں، ترے ابرِ کرم کا میں
ساون کے پاس اپنی گھٹا لے کے جاؤں گا

اتنا کسی کا آئینہ صیقل شدہ کہاں
لوحِ ہنر پہ داغِ انا لے کے جاؤں گا

اپنا اثاثہ، شمع نہ جگنو، شفق نہ پھول
رخ پر یہی غبارِ نوا لے کے جاؤں گا

مٹھی میں ریت، پلکوں پہ ٹوٹے ہوئے سے خواب
میں اور اس کے شہر سے کیا لے کے جاؤں گا

شرمندہ ہوں کہ پیشِ معانی میں کس طرح
الفاظ کی دریدہ قبا لے کے جاؤں گا

کچھ تو بچائے رکھے گی صحرا کی دھوپ سے
سر سے اُترا کے اُس کی ردا لے کے جاؤں گا

ہوں گی لہو بلا سے روایت کی انگلیاں
ناخن پہ تجربوں کی حنا لے کے جاؤں گا

میراث ہیں مری، یہ ترے خوشبوؤں کے خواب
پلکوں پہ لمسِ دستِ صبا لے کے جاؤں گا

اب اُس کی انجمن میں، قلم کی جگہ فضاؔ
ہاتھوں میں ایک شاخِ صدا لے کے جاؤں گا

فضا ابن فیضی
مئوناتھ بھنجن (یوپی)

میں تختِ نشینِ ادب و شعر ہوں طرفہ — برسوں مجھے یاد اہلِ قلم کرتے رہیں گے (طرفہ قریشی)

اشک میرے ہیں مگر دیدۂ نم ہے اس کا
یہ جو ہونٹوں پہ تبسم ہے، کرم ہے اس کا

ان کہی بات بھلا لکھوں تو لکھوں کیسے؟
سارے کاغذ پہ کوئی راز رقم ہے اس کا

فاصلے ایسے کہ اک عمر میں طے ہو نہ سکیں
قربتیں ایسی کہ خود مجھ میں جنم ہے اس کا

سنگ و آہن کا بنا شہر بھی ویرانہ لگے
یہ جنوں میرا ہے اور دشت ستم ہے اس کا

باقر مہدی

بستیاں، بحر و بر دشت و بن تابہ کے
اے خدا تیرا اعجاز فن تابہ کے

ہڈیوں کی سلاخوں میں جکڑا ہوا
مسکراتا رہے یہ بدن تابہ کے

ہمسفر ہے، نہ منظر، نہ منزل کوئی
ساتھ دے راستے کی تھکن تابہ کے

خوف بنتے رہیں گے مرے ذہن میں
مسئلے مسئلوں کی چبھن تابہ کے

خود گلِ کوزہ، خود کوزہ و کوزہ گر
زندہ رہنے کا یہ بھی چلن، تابہ کے

فضیل جعفری بمبئی

ندا فاضلی

پہلے بھی جیتے تھے مگر جب سے ملی ہے زندگی
الجھی ہوئی، ٹوٹی ہوئی، بکھری ہوئی ہے زندگی

اچھی بھلی تھی دور سے جب پاس آئی کھو گئی
جس میں نہ آئے کچھ نظر وہ روشنی ہے زندگی

جو پائے وہ کھوئے اسے جو کھوئے وہ روئے اسے
یوں تو سبھی کے ساتھ ہے کس کی ہوئی ہے زندگی

ہر راستہ انجان سا ہر فلسفہ ناداں سا
صدیوں پرانی ہے مگر ہر دن نئی ہے زندگی

مٹی ہوا بن کر اڑی، گھومی پھری واپس مڑی
قبروں پہ کتبوں کی طرح لکھی ہوئی ہے زندگی

۱۰۴ امرا اپارٹمنٹ گوان پاڑا
کھار (مغربی) ممبئی ۵۲

لگ جائے گا دربار میں تسبیح چھوڑ کر — دو دن اگر فرشتہ رہیں آدمی کے ساتھ (قدسی مالیگانوی)

علامہ ماجد الباقری

بالمقابل رائس فین
مسلم آباد، گجرات (پاکستان)

لئے پھرتی ہے سر برگ نوا کا
وہی انداز ہے بادِ صبا کا

زبانوں کا غنڈوں میں دب گئی ہیں
نگاہیں بن گئیں کاسہ گدا کا

نکلنے ہی نہیں دیتا گھروں سے
یہ لشکر ہے، جھونکا ہے ہوا کا

کھڑے کرکے مسائل روز و شب کے
مرے دشمن نے مجھ کو گھر میں تاکا

جہاں سایہ کو سایہ کاٹتا ہو
نزول اس شہر میں کیا ہو بلا کا

جسے طاقت خدا نے بخش دی ہو
اسی تک حکم آتا ہے خدا کا

سیاست داں پکڑ کر لے چلے ہیں
نمازی لگتا ہے منکر خدا کا

وہ کوفی یہ حسین ابن علی ہیں
وہی منظر ہے اب تک کربلا کا

کہیں جسکو سبھی اچھا وہ اچھا
یہی معیار ہے صدق و صفا کا

عمل کی روشنی پھیلا رہا ہوں
میں داعی ہوں نظام مصطفےٰ کا!

مجھے ہے یاد ماجد آگرہ بھی
میرے جغرافیے کا شہر ڈھاکا

رونق دکنی سیمابی

وہ نہ جذب راہرو، یا راہبر کے ہاتھ ہے
حاصلِ منزل اسی عزمِ سفر کے ہاتھ ہے

رہگذر پر ہو وہ استادہ کہ ہو جنگل کے بیچ!
انفرادیت کی عظمت ہر شجر کے ہاتھ ہے

لاکھ گھر پاؤں پسارے اس سے کچھ حاصل نہیں
لاج آنگن کی ہمیشہ بام و در کے ہاتھ ہے

یہ فضیلت اور یہ تہ داریٔ عقل و خرد
چشم حق بیں میں تنگ ظرفیٔ شر کے ہاتھ ہے

بربریت کی نمائش، آدمیت کی نمود
جودتِ اظہارِ فطرت ہر بشر کے ہاتھ ہے

یا ڈبو دے یا سمندر پار کر دے شوق کا
شرم اپنی بے بسی کی چشم تر کے ہاتھ ہے

باخبر ہونے کی رونق کیا منائیں خیر ہم
جب عنانِ خیریت اک بے خبر کے ہاتھ ہے

جمشید پور

ڈاکٹر مظفر حنفی

مکاں لامکاں کچھ نہیں، کچھ نہیں
پسِ آسماں کچھ نہیں کچھ نہیں

بدن میں نہ شعلہ نہ گرمی نہ آنچ
دھواں ہے، دھواں کچھ نہیں کچھ نہیں

مزہ سربلندی کی حسرت میں تھا
مگر بعد ازاں، کچھ نہیں کچھ نہیں

کسی طور بازار بھرتے رہو
کہ سود و زیاں کچھ نہیں، کچھ نہیں

نشانہ غلط ہو گیا آنکھ کا!
نہیں مہرباں، کچھ نہیں کچھ نہیں

ستاروں سے آگے جہاں اور ہیں
ہمارا وہاں کچھ نہیں کچھ نہیں

فسانہ طرازوں میں ہوں بے نظیر
مری داستاں کچھ نہیں، کچھ نہیں

یہ ہونا بھی کیا ہے نہ ہونا بھی کیا
گماں در گماں کچھ نہیں، کچھ نہیں

مظفر غزل سے مضامین سے
یہ "داغی زباں"، کچھ نہیں کچھ نہیں

وہ تھکا ہوا مری بانہوں میں ذرا سو گیا تھا، تو کیا ہوا
ابھی میں نے دیکھا ہے چاند بھی کسی شاخ گل پہ جھکا ہوا
وہی خط کہ جس پہ جگہ جگہ دو مہکتے ہونٹوں کے چاند تھے
کسی بھولے بسرے سے طاق پر تہہ گرد ہوگا دبا ہوا
بڑی جان لیوا سی چاہتیں، ترے انتظار کی ساعتیں
مرا دل کہ جیسے کوئی ہرن ہو، شکاریوں میں گھرا ہوا
جسے لے گئی ابھی ہوا وہ ورق تھا دل کی کتاب کا
کہیں آنسوؤں سے مٹا ہوا، کہیں آنسوؤں سے لکھا ہوا
مرے چہرے پڑھنے کے شوق کو اسی آرزو نے ہوائیں دیں
مری چاہتوں کے گلاب پر مرا نام ہوگا لکھا ہوا

بشیر بدر

اس کا تو ذکر کیا ہے آپ جیسے سنگ دل
رو رہے تھے جس کو سن کر وہ مرا افسانہ تھا (زخمی دہلوی)

شاعرِ حیات حضرت ادیب مالیگانوی

خدا کو کیوں نہ وہ مانے بڑے یقین کے ساتھ
جو چاندنی میں رہا ہو کسی حسین کے ساتھ

وہ دے رہے ہیں مرے ضبطِ غم کی داد مجھے
لگاتے جاتے ہیں نشتر بھی آفرین کے ساتھ

سلوک جن کو میسر ہے چشمِ ساقی کا
سنوار لیتے ہیں دنیا بھی اپنی دین کے ساتھ

وہ لوگ تلخیٔ دوراں کا کیا اثر لیں گے
ملا کے زہر جو پیتے ہیں انگبین کے ساتھ!

اس آدمی کو فرشتوں میں جا کے چھوڑ آؤ
جس آدمی کو محبت نہ ہو زمین کے ساتھ

کمالِ دستِ جنوں اب کے فصلِ گل میں کھلا
کہ تار تار ہے دامن بھی آستین کے ساتھ

کسی کا جیسے ہو احسان مند کوئی ادیبؔ
میں اس ادا سے ملا ہوں مخالفین کے ساتھ

احساس کی شدت میں، ایمان کہاں جائے
مارا ہوا نفرت کا، انسان کہاں جائے

طوفان اُٹھایا ہے جن ہاتھوں نے خوش ہو کر
پوچھو انہیں ہاتھوں سے طوفان کہاں جائے

فریاد کریں کس سے گیتا کے ورق جا کر
داغ اپنا دکھانے کو قرآن کہاں جائے

ہر صبح نئی آفت، ہر شام نئی الجھن
ہر کاش ملے کس سے، عثمان کہاں جائے

اوپر کی تباہی بھی ہے صبر شکن، لیکن
خود ہم سے جو ہوتا ہے نقصان کہاں جائے

بے گانے تو کیا جس کو اپنے بھی نہ پہچانیں
وہ شخص بتانے کو پہچان کہاں جائے

وقت آنے پہ کھلتا ہے یہ راز ادیبؔ اکثر
فرعون کہاں ڈوبے، سامان کہاں جائے

شوخی۔ ادا، حجاب، تبسم، خرام، ناز نام اپنے رکھ لیے ہیں قضا نے نئے نئے (ادیبؔ مالیگانوی)

عروج زیدی

دیکھے تو کوئی خوبیِ تقدیر کا عالم
جو خواب کا عالم وہی تعبیر کا عالم

یہ جذبِ رہِ دوست کی تاثیر کا عالم
ہر گام ہے پابستۂ زنجیر کا عالم!

حساس طبیعت کو قیامت ہیں وہ لمحے!
جب چشمِ توجہ میں ہو تاخیر کا عالم

ہر لفظ میں، ہر بات میں نشتر کا عمل ہے
دل جاتا ہے آپ کی تقریر کا عالم

خوش فہمیِ احساسِ محبت کو مبارک
تیور میں نہیں جوہرِ شمشیر کا عالم

اب جانِ تغافل بھی ہے مجبورِ نوازش
اللہ رے اک نادم تقصیر کا عالم

پھولوں پہ چمکتے ہوئے وہ شبنمی قطرے
ہنگامِ سفر چشمِ وفا گیر کا عالم

وہ طرزِ بیاں جیسے کوئی دفترِ معنی!
ہر لفظ ہے خود وسعتِ تفسیر کا عالم

حق بات کے اعلان کی پاداش پہ خوش ہوں
زہراب میں بھی ذائقۂ شیر کا عالم

یہ ان کے تصور کی ہے مجمل سی وضاحت
جیسے کسی ابھری ہوئی تصویر کا عالم

ہم گردشِ دوراں سے پریشاں نہیں ہوتے
ہم پہلوئے تخریب ہے تعمیر کا عالم

ہر شہر میں، ہر سنگ کا رخ میری طرف ہے
شہرت کا یہ عالم ہے کہ تشہیر کا عالم

ہستیِ عروجؔ اپنی جگہ، خواب ہے، وہ خواب
جس خواب میں ہے کثرتِ تعبیر کا عالم

جلوے تری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں (داغ)

عتیق اللہ

برسرِ لب کوئی صدا رکھوں
سارے دروازے اس پہ وا رکھوں

اک کرچ لفظ کا گرایا !
اِک اثر شاملِ نوا رکھوں

ایک اندیشہ کام آئے گا
ایک امکاں بھی زیرِ پا رکھوں

سلسلے توڑ دوں اذیت کے
طاقِ شعلۂ انا رکھوں

پھر وہ صرفِ نگاہ کرتا ہے
دور تک مشعلیں جلا رکھوں

پھر کھلے گا ہنر اس کا
درمیاں ایک فاصلہ رکھوں

شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی دہلی۔

عزیز قیسی

دعا کیا چیز ہے بابِ اثر کیا
قفس میں رہ کے ذکرِ بال و پر کیا

یہ رزمِ خیر کیا ہے بزمِ شر کیا
سمجھتے یہ ازل کے بے خبر کیا

زمیں کیا آسماں کیا بحر و بر کیا
بلند و پست جز وہمِ نظر کیا

حق و باطل فسانہ ہی فسانہ
یہاں نامعتبر کیا معتبر کیا

وہی ویرانیاں دل کا مقدر
کسی کی انجمن کیا اپنا گھر کیا

نہ جانے کب سے ہے سورج گہن میں
سحر کیا شام کیا اور دوپہر کیا

قیامت تک یونہی مرتے رہیں ہم
شبِ غم مر گئی تیری سحر کیا

تمہاری جیب خالی ہے تو قیسی
ادب کیا شعر کیا فن کیا ہنر کیا

اغیار مہر و ماہ سے آگے نکل گئے الجھے ہوئے ہمیں صبح کی پہلی کرن سے ہم (سکندر علی وجد)

۱۸۹
کیا کرے میری مسیحائی بھی کرنے والا
زخم ہی یہ مجھے لگتا نہیں بھرنے والا
زندگی سے کسی سمجھوتے کے باوصف ہمیں
یاد آتا ہے کوئی مارنے مرنے والا
شام ہونے کو ہے اور آنکھ میں اک خواب نہیں
کوئی اس گھر میں نہیں روشنی کرنے والا
دسترس میں ہیں عناصر کے ارادے کس کی
سو بکھر کے ہی رہا کوئی بکھرنے والا
اس کا اندازِ سخن سب سے جدا تھا شاید
بات لگتی ہوئی، لہجہ وہ مکرنے والا
اسی امید پہ ہر شام بجھائے ہیں چراغ
ایک تارہ ہے سرِ بام ابھرنے والا
جو دھوپ میں رہا نہ روانہ سفر پہ تھا
اس کے لیے عذاب کوئی اور گھر پہ تھا
چکر لگا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچے تھے آشیانوں میں، طوفان سر پہ تھا
جس گھر کے بیٹھ جانے دکھ ہے بہت ہمیں
تاریخ کہہ رہی ہے کہ یہ بھی کھنڈر پہ تھا
ہم یاد تو نہ آئیں گے لیکن بچھڑتے وقت
تازہ سا اک خیال تری چشمِ تر پہ تھا
سب رنگ کھل اُٹھے تو بیک رنگ ہوں بہت
باقی یہ قرض ناخنِ دستِ ہنر پہ تھا
یہ کیا کیا کہ گھر کی محبت میں پڑ گئے
آوارگانِ شب کو تو ہونا سفر پہ تھا
پروین شاکر، پاکستان
اشکِ دل خون میں گھر انظر آتا ہے مجھے
آج کیسا نظر آتا ہے مجھے (نظم طباطبائی)

دیرپا نہیں ہوتے اقتدار کے لمحے
دھوپ چھاؤں جیسے ہیں اختیار کے لمحے

اب خزاں نصیبی پہ تلملا رہے ہو کیوں
ہاتھ سے گنوا بیٹھے جب بہار کے لمحے

جان کر انہیں نعمت انکی قدر لازم ہے
مشکلوں سے ملتے ہیں اعتبار کے لمحے

وقت جا چکے تو پھر لوٹ کر نہیں آتا
دوستو غنیمت ہیں کاروبار کے لمحے

ہر نفس پہ اک تازہ حشر ہوتا ہے برپا
کیا بتائیں کیا شئے ہیں انتظار کے لمحے

حاصلِ تمنا ہیں چند یاد کی گھڑیاں
عمر حضر پہ بھاری چند پیار کے لمحے

بجلیاں سی نظروں میں کوند جاتی ہیں منشا
جب بھی یاد آتے ہیں لطفِ یار کے لمحے

ڈاکٹر منشاءالرحمن خان منشا

نسیم شاہجہانپوری

حال پوچھا مرا بادیدۂ تر لوگوں نے
خوب ہنس ہنس کے کہا سب سے مگر لوگوں نے

جشن پر جشن کیے شام و سحر لوگوں نے
جب سنی میری تباہی کی خبر لوگوں نے

جب کبھی حال مرا رحم کے قابل دیکھا
پھیر لی دیدۂ و دانستہ نظر لوگوں نے

اپنے عیبوں کو چھپانے کے لیے دنیا سے
کتنے الزام لگائے مرے سر لوگوں نے

جس نے خودداری و ایمان کا نہ چھوڑا دامن
اس کو جینے نہ دیا تنگ نظر لوگوں نے

جس کو اک بار بھی دیکھا ہے مرے ساتھ نسیم
اس پہ کیا کیا نہیں ڈالے ہیں اثر لوگوں نے

نارین جلال نگر شاہجہانپور

دیکھنے والے جو عرفانِ نظر پیدا کریں!
ہر حجابِ لالہ و گل میں اسے دیکھا کریں!

سوچتے ہیں زندگی دو دن کی ہے کیا کیا کریں
ماتمِ امروز کرلیں یا غمِ فردا کریں

کوئی حد بھی تو ہو آخر انتظارِ دوست کی
کیا قیامت تک کسی کا راستہ دیکھا کریں

دیر و کعبہ ابتدائے عشق کی ہیں منزلیں
ہو جہاں نقشِ قدم ان کا وہاں سجدہ کریں

ہم اگر حسنِ تصور سے ذرا بھی کام لیں
اپنی آغوشِ تمنا میں اسے دیکھا کریں

ان کو اے راحت اگر ہے حشر آرائی کا شوق
کر کے روحوں کو مجسم حشر وہ برپا کریں

راحت کوٹی کیانی، الہ آباد یوپی

اس پرسشِ کرم پہ تو آنسو نکل پڑے کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی (فراق)

فرحت قادری

کاہکشاں سے بھی پرے پہنچا ہے راہنمائے شوق
ذرۂ بے وقار کی، دیکھے کوئی ادائے شوق

جلوہ نہیں دلِ حزیں! پردۂ حسن یار ہے
پردۂ حسنِ یار سے آگے ہے منتہائے شوق

تیری طلب میں جانِ جاں! پہنچے قدم کہاں کہاں
مہر و مہ و نجوم ہیں شوخیٔ نقشِ پائے شوق

حلقۂ شش جہات میں گردشِ کائنات میں
چاروں طرف لئے پھری مجھ کو مری ہوائے شوق

شوق ہی ہے مری حیات، شوق ہی میری کائنات
میرے دلِ حزیں میں اب کچھ بھی نہیں سوا شوق

کاندھے پہ ہے صلیبِ شوق حلقۂ شوق پاؤں میں
جائے تو جائے اب کہاں، فرحتِ آشنائے شوق

معروف گنج گیا، بہار

شارق جمال

ہاتھ میں کاغذ، نظر میں چہرۂ محبوب تھا
سامنے تھا آئینہ جو صورتِ مکتوب تھا

اقتدا میں نہ کی راہِ وفا میں قیس کی
منفرد دنیائے الفت میں مرا اسلوب تھا

کیوں نہ گم ہوتے خرد کے ہوش مجھکو دیکھکر
میں بہ اندازِ جنوں اک بندۂ مجذوب تھا

کب تھا میرا مقصدِ دل، زندگی کی سرخوشی
تیرا طالب تھا، ترا ہی غم مجھے مطلوب تھا

تھی مرے پیغام سے بھی ایک دنیا منحرف
میں بھی عیسیٰ کی طرح اس شہر میں مصلوب تھا

ہوش ہے مجھکو، خودی تھی مجھ پہ غالب ہر نفس
بیخودی کے جذبۂ ناقص سے کب مغلوب تھا

جانتے ہیں آج بھی اس شہر کے بردہ فروش
حسنِ یوسف ہی علاجِ دیدۂ یعقوب تھا

آج تک دنیا پہ اے شارق نہ یہ عقدہ کھلا
میں اسے محبوب تھا یا وہ مرا محبوب تھا

عظیم بکر اسٹورس مومن پورہ ناگپور

حکیم حافظ عاقل، منماڑی

وقت کے ساتھ کبھی وقت سے ہٹ کر کاٹے
ان گنت ہم نے ترے شہر کے چکر کاٹے

صبح کے نور کی امید و تمنا لیکر
میری آنکھوں نے سدا شام کے منظر کاٹے

کون کہتا ہے کہ حالات سے مجبور ہوئے
ہم نے دن غم کے کاٹے بھی تو ہنس کر کاٹے

دل کے جذبات تو قابو میں نہیں کر سکتے
کاٹنے دو مرے ظالم نے اگر پر کاٹے

اپنی آنکھوں سے بھی ہو سکتے ہیں بادل پیدا
چند قطروں کے لئے کون سمندر کاٹے

وہ زمانے کے مقدر کو بدل سکتا ہے
وقت کے ساتھ نگاہوں سے جو پتھر کاٹے

کیا سمجھتی ہے سمندر کی جنوں خیز ہوا
ہم نے طوفانوں میں گرداب کے چکر کاٹے

اس کے خوابوں کو حقیقت سے بدلنا ہو گا
جس کو آرام کی راتوں میں بھی بستر کاٹے

ایسے ماحول سے دامن کو بچا نا عاقل
اک سخنور کی جہاں بات سخنور کاٹے

احمد آباد

خار و گل دونوں کو اپنے بانکپن پر ناز ہے دیکھئے رہتا ہے کس کے ہاتھ میدانِ بہار (یگانہ چنگیزی)

عقیل شاداب۔ برج راج پور، کوٹہ، راجستھان

میرے امکان میں کیا اور میری حد کیا ہے
سوچتا ہوں کہ مرے جینے کا مقصد کیا ہے

قربتوں میں یہ جدائی کی سی لذت کیوں ہے
درمیاں تیرے مرے ذات کی سرحد کیا ہے

روح تک اس کی جڑیں پھیل چکی ہیں شاید
میرے اندر یہ روایات کا برگد کیا ہے

تیری نظروں میں ہی رہنا ہے جہاں رہنا ہے
محو حیرت ہوں نشانے کی تہ ِ زد کیا ہے

پیرہن روح کا ہے جسم ہمارا تو پھر
جسم کے باب میں یہ نیک ہے کیا بد کیا ہے

زیست جب سلسلۂ اہرمن و یزداں ہے
پھر یہ آماجگہِ مومن و مرتد کیا ہے

جب خموشی ہی ما حصل ہے سخن کا شاداب
پھر یہ اظہار، یہ ابلاغ، یہ ابجد کیا ہے

ظفر غوری، کوٹا، راجستھان

لوحِ دل پر میں تو قسمت کا لکھا پڑھتا رہا
جانے کیا رُخ پر مرے وہ بے وفا پڑھتا رہا

حسنِ خوش فہمی سے وہ مجھکو غلط سمجھا کیا
شوقِ بیجد میں اسے میں کیا سے کیا پڑھتا رہا

زخمِ بے صوت و صدا سے تا صلیبِ فکروفن
دل کسی حرفِ جنوں کا ماجرا پڑھتا رہا

تھی رقم جس پر مرے زخمِ سفر کی داستاں
زرد سورج دیر تک وہ راستہ پڑھتا رہا

سر جھکائے سارے طائر سب شجر سنتے رہے
کن رتوں کا مرثیہ اک خوشنوا پڑھتا رہا

شبنمیں کلیوں کے لب سے آئی آمیں کی صدا
کیا دعائیں زیرِ لب، برگِ صبا پڑھتا رہا

رقصِ موجِ شام نے یادوں کے منظر لکھ دیے
میں سمندر کے ورق پر جانے کیا پڑھتا رہا

اسکی برجستہ بلاغت کا لب و لہجہ نہ پوچھ
مختصر سا اس کا خط میں بار بار پڑھتا رہا

زندگی بھر کی عبادت اسکو سمجھا میں ظفر
میں وہ اسمِ خوش لقب مثلِ دعا پڑھتا رہا

ماہر انصاری، محلہ یا عیم، مئوناتھ بھنجن یوپی

کھو گئے یوں کارخانے یا کسی دفتر میں ہم
چھٹیوں میں اجنبی لگتے ہیں اپنے گھر میں ہم

فاصلے سے دیکھنے والا ہمیں سمجھے گا کیا
پیاس کا صحرا ہیں دریاؤں کے پس منظر میں ہم

رات کو سونے سے پہلے کیا کریں اس کا حساب
کتنے سایوں کا تعاقب کر سکے دن بھر میں ہم

بس ہمیں ہم ہیں جہاں تک کام کرتی ہے نگاہ
ایک قطرہ ہیں مگر پھیلے ہیں بحر و بر میں ہم

دوسری جانب اندھیرا ہے تو کس امید پر
جاگتی آنکھوں کو رکھ آئے شگافِ در میں ہم

مختلف رنگوں میں چھینٹوں کی طرح تقسیم ہیں
کیا ابھر کر سامنے آئیں کسی منظر میں ہم

ہے یہ مجبوری کہ آنچ آتی ہے چاروں سمت سے
ورنہ سوچا تھا جئیں گے موم کے پیکر میں ہم

ہاتھ جس شئے کی طرف لپکے وہ غائب ہو گئی
پھنس گئے ماہر یہ کس آسیب کے چکر میں ہم

اس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے (فراق)

نشتر، ناگپور

خیر خواہی میں جمع خرچ زبانی ہوگی
پھر مجھے صحبتِ ناجنس اٹھانی ہوگی

ہائے کیا طرفہ تماشا ہے بجھا جاتا ہوں
کیا خبر تھی کہ یہ جبٹان بھی پانی ہوگی!

اب زباں گھستے ہیں جا جا کے اسی چوکھٹ پر
ہم نے بھی دل میں کوئی بات تو ٹھانی ہوگی

عمرو عیار کی زنبیل سے کیا نکلے گا؟
نہ سہی کچھ، ہرے باغوں کی کہانی ہوگی

تیز کر لیجئے دانتوں کو بدن تازہ ہے
یہ ضروری بھی نہیں خوں میں روانی ہوگی

ناؤ بستی میں بناتا ہوں عجب ناداں ہوں
اب کہاں تازہ، روایت وہ پرانی ہوگی

پیر کی شیریں کلامی کا جہاں قائل ہو
دور کے ڈھول کی آواز سہانی ہوگی

ان پہ تہمت نہ لگا شانِ مریدی رکھے
اگلے وقتوں کے بزرگوں کی نشانی ہوگی

نیم کے پات چباتے ہیں مگن رہتے ہیں
خاکساروں سے بھلا شیریں بیانی ہوگی؟

شاہد کبیر

کتنی صدیوں کے تراشے ہوئے پیکر اپنے
ڈھونڈتے پھرتے ہیں کھوئے ہوئے پتھر اپنے

کاٹ دی اپنے بدن میں قد و قامت کی سزا
خود کو سمجھا نہ کبھی میں نے برابر اپنے!

اب بتا تجھ سے بچھڑ کر میں کہاں جاؤں گا
تجھ کو پایا تھا قبیلے سے بچھڑ کر اپنے

چاند نکلے گا تو شرما کے پلٹ جائے گا
رات میں ایسے اترتے نہیں چھت پر اپنے

ٹھوکریں کھاتے ہیں ہر گام پہ ہم یوں شاہد
کچھ تو حرکت میں رہیں راہ کے پتھر اپنے

محمد غلام رسول اشرف
مومن پورہ ناگپور

کھو جائیگا وجود بکھر کر فضاؤں میں
کب تک اڑے گا زخمی پرندہ ہواؤں میں

شہروں کی بھیڑ بھاڑ میں کچھ سوجھتا نہیں
تصویر اپنی دیکھیں گے چل کر گپھاؤں میں

فکروں کے دائروں سے نکلنا محال ہے
جاؤ! بساؤ شوق سے دنیا خلاؤں میں

ایسی گھٹن تو پہلے کبھی بھی نہ تھی یہاں
یہ کس نے زہر گھول دیا ہے ہواؤں میں

کوئی تو ہو سفر کی جو ترغیب دے مجھے
بیٹھا ہوا ہوں دیر سے برگد کی چھاؤں میں

اس نے اپنا بنا کے چھوڑ دیا
کیا اسیری ہے کیا رہائی ہے (جگر)

محترم مظفر حنفی صاحب کی نذر:

محبوب راہی

بارسی ٹاکلی، اکولہ، مہاراشٹر

زخمی، تلخ، کٹیلا، تیکھا، تیر و نشتر والا لہجہ
جی میں آتا ہے اپناؤں وہی مظفر والا لہجہ

میٹھی میٹھی باتیں کرکے فنکاری دکھلاتے ہیں
لوگ چھپا جاتے ہیں کس خوبی سے اندر والا لہجہ

کانچ گھروں میں رہنے والو تم آخر سہہ بھی پاؤ گے
کانٹوں جیسی چبھتی باتیں کنکر پتھر والا لہجہ

کب تک کام چلاؤں آخر میں چکنی چپڑی باتوں سے
کب تک اور دبائے رکھوں اپنے اندر والا لہجہ

آپس میں سمجھوتہ کرلیں اب دونوں باہم اپنا لیں
شوہر بیوی والے غمزے، بیوی شوہر والا لہجہ

بھولے بھالے لوگ بچارے جن سے دھوکا کھا جاتے ہیں
ہر شیطاں اپنائے ہوئے ہیں پیر و پیمبر والا لہجہ

دس پشتوں کی عادت ٹھہری کیسے آخر چھوٹ سکے گی
بدل نہیں پائیں گے صاحب آپ گداگر والا لہجہ

بنتے کام بگڑ جاتے ہیں اکثر سادہ سی باتوں سے
بگڑے کام بنا دیتا ہے مست قلندر والا لہجہ

پڑھتے پڑھتے لکھتے لکھتے داڑھی والا ہم بھی ادب کے تھے
ہر اک غزل میں وہی غٹرغوں دی کبوتر والا لہجہ

شاہد میر خان، راجستھان

بکھنا ہے کچھ ہمیں ہی بھرم اپنی بات کا
پانی تو مہرباں ہے اب بھی فرات کا

دل خوف سے لرزنے لگا پات پات کا
جنگل میں پھر نزول ہوا سرد رات کا

دریا و کوہ و بن کے حوالے بھی آچکے
قصہ مگر بیاں نہ ہوا اپنی ذات کا

انصاف کی نگاہ میں معصوم بھی ہے وہ
تلوار پر بنا ہے نشاں جس کے ہات کا

ہمیں نہ مل سکیں گے حوالے "نجوم" کے
ہر شعر اقتباس ہے اب "ارضیات" کا

بے سمت سی نگاہ اٹھی جب مری طرف
شاہد مجھے سراغ ملا شش جہات کا

فضا کوثری

وفا کا قتل ہوا ہے نہ پیار زخمی ہے
تری نظر میں مرا اعتبار زخمی ہے

خزاں کے ہاتھ میں شمشیرِ بے نیام ہے کیا
صبا کراہ رہی ہے، بہار زخمی ہے

یہ کیسا حادثہ گذرا ہے شہرِ دل پہ مرے
تصورات کا ہر خوابِ زار زخمی ہے

غموں کی دھوپ میں جھلسی نہیں ہے شخصیت
خوشی کے قتل پہ دل کا قرار زخمی ہے

تمام بکھرے سے لگتے ہیں کانچ کے ٹکڑے
رہِ وفا میں ہر ایک وضع دار زخمی ہے

مرے بدن کا لہو گھل گیا ہواؤں میں
کہ میرے ساتھ ہی گرد و غبار زخمی ہے

ہمارے دور میں فن کی ہے یہ شناخت فضا
تھکا تھکا سا ہے لہجہ پکار زخمی ہے

ڈور نمبر ۱۴۹ سید احمد روڈ نیو ٹون
بنگار اپیٹ (کرناٹک) ۱۱۳۴۶۴

چیخیں دبی ہوئی ہیں سوالات مت کرو
مجھ سے مرے وطن کی کوئی بات مت کرو

حل وہ کریں گے جن کا سیاسی مزاج ہے
میں آدمی ہوں مجھ سے سوالات مت کرو

بچے ہو کھیلنے کی ادا بھول جاؤ گے
اخبار دیکھنے کی شروعات مت کرو

کیسا سماج، کیسا پریوار، کس کا گھر
مجھ سے مرے خلاف کوئی بات مت کرو

تم یہ کرو کہ جسم کے کپڑے اتار لو!
اتنا نہ کر سکو تو ملاقات مت کرو!

احمد کمال پروازی

اوجین

چھوٹی سی ایک بات پہ منظر بدل گئے
دامن پھٹا تو ہاتھ سے رشتے نکل گئے

صد شکر بے سبیل اندھیرے نکل گئے
چھت اڑ گئی تو گھر کے مقدر بدل گئے

اک روز تم سے ہاتھ ملانے کی آرزو
اتنی شدید تھی کہ مرے ہاتھ جل گئے

میری طرح ٹرین بھی سنسان ہو گئی
اک ایک کر کے سارے مسافر نکل گئے

یہ ان دنوں کی بات ہے جب درد، درد تھا
اب تو ہمارے زخم بھی سونے میں ڈھل گئے

کچھ لوگ مرا نام و نسب پوچھ رہے ہیں
یوں میری تباہی کا سبب پوچھ رہے ہیں (رئیس مینائی)

مہدی پرتاپگڈھی

ورطۂ فکر میں بے صوت و صدا تھا وہ بھی
جانے کس درد کے طوفاں میں گھرا تھا وہ بھی

تھی مری روح شگوفے کی طرح نکھری ہوئی
چمنِ دہر میں مانندِ صبا تھا وہ بھی

زیبِ تن میں نے بھی کر رکھا تھا ملبوسِ سکوت
بند آنکھیں تھیں مگر جاگ رہا تھا وہ بھی

تھی مرے ذہن میں گذرے ہوئے لمحوں کی کسک
غارِ ماضی میں کہیں جھانک رہا تھا وہ بھی

منفرد تھا مرے اظہار کا انداز مگر!
رنگ میں اپنے زمانے سے جدا تھا وہ بھی

آگے بڑھنے نہ دیا مجھ کو مری فطرت نے
اپنی ہی راہ میں دیوار بنا تھا وہ بھی

جستجو اس کی پھراتی رہی مجھ کو در در!
لوگ کہتے ہیں مجھے ڈھونڈ رہا تھا وہ بھی

مہدی تنہا نہ تھا موضوعِ سخن مرا جنوں
وہ بھی تھا خاک بسر چاکِ قبا تھا وہ بھی

ظفر کلیم، مومن پورہ ناگپور

طرف طرف ہے زمانہ کرفت لہجے کا
ابھی نہ چھیڑ کہ موسم ہے سخت لہجے کا

سنے گا کون یہاں درد کے فسانے کو
پکارتا ہے کسے لخت لخت لہجے کا

وہاں بھی دھوپ ملی نفرتوں کی کیا کیجے
بہت گھنا تھا جہاں اک درخت لہجے کا

وہ شاہ بخت کوئی اور ہے غزل والو
ہمیں نصیب کہاں تاج و تخت لہجے کا

لٹانے مہرِ سخن کی کرن کرن کے لیے
ترس رہا ہے کوئی تیرہ بخت لہجے کا

سفر ہے شہرِ غزل کا ظفر کلیم مگر
ہمارے ساتھ نہیں سازو رخت لہجے کا

سنا نہ جاؤ گے اپنی سکون گاہ نہ دو
نکال دو مجھے گھر سے مگر پناہ نہ دو

نظر کوئی بھی ہو خنجر کا کام کرتی ہے
دکھا کے پیٹھ اسے زحمتِ نگاہ نہ دو

تمہاری قوم ہی تم پر الٹ نہ جائے کہیں
یہ مشورہ ہے مرا تم مجھے پناہ نہ دو

مٹے نہیں ابھی چہرے سے انگلیوں کے نشاں
گنہ گار کو پھر دعوتِ گناہ نہ دو

بغل میں رکھ کو زمیں کو پیٹ کر اپنی
میں لوٹ جاؤں گا اب دیتے ہو تو راہ نہ دو

رشید امکان، گوشۂ تخلیق

۲/۵ توپ خانہ روڈ اوجین، ایم پی

پروفیسر غلام دستگیر صاحب، شہاب

سابق صدر شعبۂ اردو، فارسی پونہ یونیورسیٹی

جس کو نگاہِ لطف کہیں، وہ زہر میں ڈوبا تیر بنے
شاخِ گلِ تر جسکو سمجھیں، وہ قاتل شمشیر بنے

خونِ جگر ہو، دردو الم ہوں، تب دیوانِ میر بنے
خون نہ ہو فرہاد کا جبتک کیونکر جوئے شیر بنے

ہم سے دیوانوں کی خاطر کوئی تو تدبیر بنے
حلقۂ دار ہی طوق بنے یا زلفِ صنم زنجیر بنے

رنگ جدا ہے، ڈھنگ جدا ہے جدا جدا اندازِ نظر
اتنے سارے ہاتھوں سے اب جانے کیا تصویر بنے

خوش اقبال بتا ہے لیکر چرخ نیا تعمیر کیا
خواب تو دیکھا یوسف جیسا دیکھیں کیا تعبیر بنے

وہ تو ایک چھلاوہ ٹھہرا چنچل جھونکا موج رواں
اور دلِ ناداں کی ضد ہے، پانی پر تحریر بنے

ہم تو شہاب اک مدت سے یہ آس لگائے بیٹھے ہیں
وہ جو لگا لیں سینے سے تو خاکِ بدن اکسیر بنے

ڈاکٹر امانت

ایم اے پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو فارسی
پونہ یونیورسیٹی

انکار کے آہوئے حسیں رام کیے ہیں!
صحرا میں تخیل کے بہت گھوم لیے ہیں!

روٹھے ہیں کبھی ان سے تو سجدے بھی کیے ہیں
اصنامِ خیالی کے سہارے ہی جیے ہیں

ہر گام پہ سو ناز اٹھائے ہیں جنوں کے
سو بار گریباں کے بھی سب چاک سیے ہیں

وارفتگیٔ شوق بڑھی جب بھی ہماری
بیساختہ پیمانے کے لب چوم لیے ہیں

کچھ دل نے بھی بیباک اشاروں سے لیا کام
کچھ انکی نگاہوں نے بھی پیغام دیے ہیں

اب اور زمانے کو ہے کیا جانے شکایت
الزام تو سب اپنے ہی سر ہم نے لیے ہیں

دل جنکی سزاؤں میں گرفتار ہے اب بھی
کچھ ایسے نگاہوں نے مری جرم کیے ہیں!

اس "ناولِ رنگیں" کی ضخامت تو بہت ہے
دو باب محبت کے ابھی ختم کیے ہیں!!

خدشاتِ مسلسل میں دلِ زار پھنسا تھا
نازک سے جو رشتے تھے سبھی توڑ دیے ہیں

اللہ رے اعجازِ تصور یہ امانت
خلوت میں بھی ہم ساغر و پیمانہ لیے ہیں

آہ بتا کر ... سے اٹھتے ہیں سوال — ہم [illegible] (پروفیسر شہاب)

وہ میرے مقابل کبھی چہرا نہیں کرتے
آئینہ صفت، آئینہ دیکھا نہیں کرتے

یہ ایک حقیقت ہے کجا ضبط، کجا شوق
پتھر کے عوض شیشے کا سودا نہیں کرتے

یادوں کی تگ و دو ہے فریبوں کا کرشمہ
بیتے ہوئے لمحے کبھی لوٹا نہیں کرتے

اس کاوشِ گفتار کا انجام بھی سن لو
بادل جو گرجتے ہیں وہ برسا نہیں کرتے

تدبیر بھلا، راہ کا پتھر ہی بنی ہے
کیوں لوگ مقدر پہ بھروسا نہیں کرتے

بہتر ہے کہ ہٹ جاؤ مری راہ گزر سے
دیوانہ ہوں، دیوانے سے الجھا نہیں کرتے

بڑھ جاتا ہے اس ربط سے کچھ اور تعلق
اس لاگ کا ہر ایک سے چرچا نہیں کرتے

فطرت ہی کے آوردہ ہیں، حالات بھی رازیؔ
یہ ایسے مسائل ہیں جو سلجھا نہیں کرتے

جس شخصیت میں پہلے چمن کا رچاؤ تھا
چہرے پہ آج اُس کے کھنڈر کا پڑاؤ تھا

حال اُس کا پوچھنے کی نہ زحمت کسی نے کی
جس ناتواں کے سینے میں صدیوں کا گھاؤ تھا

ناقدریوں کی نذر ہوئیں جو نگارشیں
رات اپنے گھر کے پاس اُنہی کا الاؤ تھا

کشتی حواس و ہوش کی کیوں کر نہ ڈوبتی
جذبات کی ندی میں غضب کا بہاؤ تھا

کچھ دور، راہزن بھی وہاں خیمہ زن رہے
جن جنگلوں کے بیچ ہمارا پڑاؤ تھا

سب کو یقین تھا کہ وہ ہے سنگدل بہت
پھر بھی اسی کی سمت ہر اک کا جھکاؤ تھا

دیوار کا ہے رنج، نہ چھت کا ملال ہے
بارش سے کچھ نہ کچھ تو ہمارا لگاؤ تھا

رازیؔ کی ساری عمر، اسی بازار میں گئی
پھولوں کا، پتھروں کا جہاں ایک بھاؤ تھا

حکیم رازیؔ ادیبؔ پونا

امداد آکاش

گو زخم زخم بدن بھی تھا خوف جان کا تھا
شکستہ پر بھی سمایا جنوں اڑان کا تھا

جو ٹوٹ ٹوٹ کے گرتا رہا پگھل نہ سکا
وہ آدمی تھا کہ پیکر کسی چٹان کا تھا

بلندیوں سے گرا جسم تار تار ہوا
ہر ایک سنگ لہو سے بھرا ڈھلان کا تھا

سکوت، وحشت و تنہائی، تیرگی رقصاں
تمہارے بعد یہ منظر مرے مکان کا تھا

زمیں پہ ٹوٹ کے گرتا ہوا نہ دیکھ مجھے
کبھی تو میں بھی ستارہ تھا آسمان کا تھا

ارم لمیٹڈ، ۶-بی، سپر مارکیٹ
اسلام آباد (پاکستان)

اسلم کولسری

جب بھی ہنسی کی گرد میں چہرہ چھپا لیا
بے لوث دوستی کا بڑا ہی مزا لیا

کچھ بھی نہ تھے تو شہر میں عزت بنی رہی
شاعر ہوئے تو سارا بھرم ہی گنوا لیا

سارے مسافروں سے تعلق نکل پڑا!!
گاڑی میں ایک شخص نے اخبار کیا لیا

درپیش ہو سفر تو شریکِ سفر بہت
نیند آئی تو زمین پہ سایہ بچھا لیا

اک لمحۂ سکوں تو ملا تھا نصیب سے
لیکن کسی شریر صدی نے چرا لیا

کانٹے سے بھی نچوڑلی غیروں نے بوئے گُل
یاروں نے بوئے گُل سے بھی کانٹا بنا لیا

اسلم بڑے وقار سے ڈگری وصول کی
اور اس کے بعد شہر میں خوانچہ لگا لیا

فرحت نواز

بیٹھے بیٹھے یونہی کچھ یادیں پرانی سوچنا
اس کی خاموشی کے بھی کیا کیا معانی سوچنا

کہکشاؤں کی تمنا، چاند سورج کی طلب
رہ کے اس دھرتی پہ، چیزیں آسمانی سوچنا

خواب جو اپنے لئے اب ہیں سرابوں کی طرح
اپنی آنکھوں میں انہیں بھر بھر کے پانی سوچنا

اس کے افسانوں میں اپنی شاعری کو دیکھنا
اپنے شعروں میں کبھی اس کی کہانی سوچنا

دکھ سمندر ہی مرا اب ہمسفر فرحت ہوا
جب اتر آئے تو پھر کیا بے کرانی سوچنا

پھول نازک ہے نہ شیشہ، اشک نازک ہے نہ دل — اِن دنوں سب سے زیادہ وقت نازک ہے جناب (فرحت عباس)

ملکہ نسیم

کچھ وہ چہرے ہیں کہ آئینے سنور جاتے ہیں
آئینہ دیکھ کے کچھ چہرے اتر جاتے ہیں

سمتِ منزل قدم اٹھتے ہیں ٹھہر جاتے ہیں
حوصلے کانچ کی مانند بکھر جاتے ہیں

ہم جہاں رکھتے ہیں بنیاد مکاں کی اپنے
برق وطوفاں انھیں راہوں سے گذر جاتے ہیں

پاس تم تھے تو زمانے کا کوئی خوف نہ تھا
اب یہ عالم ہے کہ آہٹ پہ بھی ڈر جاتے ہیں

شدتِ غم میں تری یاد نہیں آپاتی!
کھولتے پانی میں سب عکس بکھر جاتے ہیں

لوگ جو بیچ دیا کرتے ہیں خود اپنا ضمیر
سلسلہ سانسوں کا رہتے ہوئے مر جاتے ہیں

سر اٹھاتا ہے اگر ظلم تو ہے وقت گواہ
اس سے ملنے کے لئے نیزوں پہ سر جاتے ہیں

حق کی آواز پہ لبیک جو کہتے ہیں نسیم
اپنے دامن پہ لہو لیکے وہ گھر جاتے ہیں

، گنی گراؤنڈ اہوشنگ آباد (ایم۔پی)

پروفیسر ابراہیم فیضؔ، پونہ

نہ پوچھ کس مقام تک نگاہِ جستجو گئی
زمیں سے ہو کے آسماں کی رفعتوں کو چھو گئی

مری قبائے چاک ہی سے کچھ نہیں اٹھا دھواں
تمہارے پیرہن سے بھی روایتوں کی بو گئی

غبارِ چشمِ زندگی، بہارِ دیدۂ حیات
اس آرزو کو کیا کہوں، رلا کے جو لہو گئی

مچل رہی ہے تشنگی لبِ حیات پر ابھی
نظامِ میکدہ درست، عظمتِ سبو گئی

بدل گیا مزاجِ گل، نظامِ گلستاں کیساتھ
مذاقِ باغباں کی خیر، قدرِ رنگ و بو گئی

عداوتوں کی آگ میں جھلس گئے جو خار و گل
چمن پرست دوستو! چمن کی آبرو گئی

چراغِ فکر و فن کے فیضؔ انجمن میں جل اٹھے
کسی کے حسن کی کرن جو میرے دل کو چھو گئی

دل نہ ہوتا تو محبت کے نہ منظر ہوتے
سارے انسان تراشے ہوئے پتھر ہوتے

ہم نے سیکھا ہی نہیں نقشِ قدم پر چلنا
ہم جو فنکار نہ ہوتے تو پیمبر ہوتے

اپنے ہاتھوں سے بنا لیتے صلیبیں اپنی
آج اس دور میں جتنے بھی پیمبر ہوتے

نام سے تیرے ہی منسوب زمانہ کرتا
پھول ہوتے مرے دامن میں کہ پتھر ہوتے

تیری آنکھوں میں اگر پیاس مجسم ہو جائے
دیر کیا لگتی ہے صحرا کو سمندر ہوتے

مجھ کو اندازہ نہیں ہے مری محرومی کا
تو نے دیکھا ہی نہیں پھول کو نشتر ہوتے

ڈھل گیا سر سے چمکتا ہوا سورج ورنہ
سایۂ زیرِ قدم میرے برابر ہوتے

حنیف ساغرؔ، ۱۱۰۲، رولوار پیٹھ پونہ ۲

ہمارا درد نہ بانٹوں مگر گزارش ہے … درد کو محسوس کر لیا جائے (حنیف ساغر)

زاہد کمال

نئے رقاص جگانے نئے جادو آئے
باندھ کر کہنہ روایات کے گھنگھرو آئے

غنچے غنچے سے ترے حسن کی رنگت بوئے
ڈالی ڈالی سے ترے لمس کی خوشبو آئے

علم کے شہر کی جاں کیسے حفاظت کیجے
پھر نئے روپ میں چنگیز و ہلاکو آئے

کس لئے زرد ہوا جاتا ہے خیاِ سحر
رات کی آنکھوں میں کس خوف سے آنسو آئے

امتحاں دونوں طرح اس نے لیا ہے میرا
راہ میں دار و رسن اور قد و گیسو آئے

وہ محبت وہ خلوص اب کہاں پائے یارب
میرے احباب سمیٹے ہوئے بازو آئے

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا زاہد
کاش ان پلکوں سے اڑ کر کوئی جگنو آئے

کچھ کیف خود سپردگی آئے حیات میں
میں اپنا ہاتھ دے ہی دوں قاتل کے ہاتھ میں

جیسے غمِ حیات سے مل جائے گی نجات
یوں مطمئن سا ہوں میں غزل کہہ کے رات میں

ذروں کی آب و تاب سے صحرا کا حسن ہے
ہر چیز کا مقام ہے اس کائنات میں

دشتِ تصورات میں اڑنے لگی ہے دھول
روپوش ہو گیا ہے کوئی اپنی ذات میں

دل خوب جانتا ہے تری مہربانیاں
طوفاں چھپے ہوئے ہیں ترے التفات میں

ہونے لگا ہے تنگ اجل کا محاصرہ
رخنے پڑے ہوئے ہیں فصیلِ حیات میں

زاہد کمال عیب نکالے ہیں نت نئے
دنیا کی مصلحت نے محبت کی بات میں

احمدی اپارٹمینٹ، گروار پیٹھ - پونا۔

اے جانِ فراز اب تو عجب حال ہے دل کا
مجھ کو تو ہر اک سانس میں لگتا ہے کہ تم ہو (احمد فراز)

قاضی حسن رضا
قاضی پورہ کھنڈوہ۔

منتظر ہوں تمہارے شب اُترے
میرے آنگن میں دھوپ اب اُترے

تیرگی، دھوپ، آندھیاں، گرداب
رفتہ رفتہ بدن میں سب اُترے

ہے سمندر سی قوتِ برداشت
مجھ پہ طوفان روز و شب اُترے

کتنا گہرا ہے آج سناٹا
دشتِ احساس میں یہ کب اُترے

ڈس لیا تیرگی نے مجھ کو رضا
زہر ناگن کا جانے کب اُترے

صابر زاہد
۳۰۲ پشنی پیٹھ، جلگاؤں، مہاراشٹر

ولیت رابطہ کی قبائیں بانٹتی ہے
آرزو، چپ چاپ ہیرا چاٹتی ہے

اژدھا باہر نکل جاتا ہے مجھ کو
گھر میں تنہائی اسے سنّاٹتی ہے

چاند کے پہلو میں جگنو سو رہا ہے
لمس کی خوشبو، خلیجیں، پاٹتی ہے

کیا بھروسہ کب بدل جائے ہوا پھر
باؤلی کُتیا ہے سب کو کاٹتی ہے

دھول ہے سوکھے درختوں کا مقدر
سبز پتے ہوں تو دیمک چاٹتی ہے

بھیڑ بازاروں کی یا سونی گلی ہو!
زندگی ہر موڑ پر اب ڈانٹتی ہے

تجربہ پارس ہے لیکن عمر ذاھد
تار چاندی کے ہیں، کتنے چھانٹتی ہے

واجد قریشی

تحریر پانیوں پہ بہت خوشنما سی تھی
آنکھوں میں کوئی نقش بھی پہچان کا نہ تھا

ہر پل نیا لباس بدلتی ہے زندگی
مصروفِ ذات کتنی ہے چہرے کی آگہی!

اک لمحہ بھی نہ اپنی دروبست کر سکے
یہ زندگا ملی بھی تو بے دست و پا ملی

اب تو بھی اپنے پاؤں کی زنجیریں توڑ دے
میں بھی اُلانگ آیا ہوں دیوار چین کی

چھونے کو اس کے ہاتھ بڑھایا تو اُڑ گئی
تھے وہ بھی اپنے لوگ، مگر کتنے اجنبی

اب ان رگوں میں خون کی گردش کہاں سے آئے
بجلی کے ننگے تاروں پہ گذری ہے زندگی

گورنمنٹ ہنو گرلس ڈگری کالج اندور (م۔پ)

ہر اک زخم مرے دل کا لالہ زار سا ہے
یہی سبب ہے جو چہرے پہ اک نکھار سا ہے

بجھے بجھے سے ہیں ہم دل بھی بیقرار سا ہے
اور اسکے بعد بھی ماحول خوشگوار سا ہے

ابھی تلک تری قربت کا لمس باقی ہے
ابھی تلک مری آنکھوں میں اک خمار سا ہے

کہاں بٹھاؤں میں احساس کے پرندے کو
ابھی تو شاخ تخیل پہ اک غبار سا ہے

کوئی تو زخم ہے جو رس رہا ہے مدت سے
کوئی تو تیر ہے جو دل کے آر پار سا ہے

وہ خار جنگی چبھن وجہ کرب ہے، اک دن
خوشی کے پھول کھلائیں گے اعتبار سا ہے

ترا خیال بڑا غمگسار ہے - ورنہ
ہمارے گرد عذابوں کا اک حصار سا ہے

تم آ بھی جاؤ تو دلدار سونپ دیں تم کو
ہماری پلکوں پہ خوابوں کا اک جو بار سا ہے

دِلدار ہاشمی

۶۴، ایروڈا، پونہ - ۶

زندگی کے حسن کا غزل میں بانکپن دکھا
اہلِ فن بھی جھوم جائیں وہ کمالِ فن دکھا

بے بسی کی آگ راکھ کر گئی کیسے کیسے
رہبرانِ قوم کو جلے بجھے کفن دکھا

کس لئے کلی کلی بہاریں اداس ہے
باغباں کو تو جگا کے حالتِ چمن دکھا

فتنہ پروروں کی سازشوں کو بے نقاب کر
تو وطن پرست ہے تو جذبۂ وطن دکھا

اپنی پاک دامنی کا تذکرہ فضول ہے
اتنا داغدار ہے یہ کس پیرہن دِکھا

قاسم قریشی، بزم فکر و فن، عمران

مکند اپارٹمنٹ کاما روڈ اندھیری (ویسٹ) بمبئی

تیرے کرم کا صدقہ ہم جاں نثار مانگیں
سوکھی پڑی ہے کھیتی ابرِ بہار مانگیں

اب اس مقام پر ہیں محرومیاں ہماری
پھولوں بھرے چمن سے کانٹوں کے ہار مانگیں

شعلے بھڑک رہے ہیں ہر سمت نفرتوں کے
اس دورِ بے حسی میں کس سے قرار مانگیں

اپنی قلندری میں آئے گا فرق یارو
کیا دستِ خونچکاں سے دامن کے تار مانگیں

آنے کا آج قاسم وعدہ وہ کر گئے ہیں
آتی ہوئی سحر سے ہم انتظار مانگیں

عاصی رامپوری

مذہب کو اخوت کو گرامر سے نکالیں
فرسودہ ہیں الفاظ انھیں گھر سے نکالیں

کیوں نادرو شہکار ہے آزر کا نمونہ
یہ بات ذرا سوچ کے پتھر سے نکالیں

اسلاف کے کردار جو جھومر میں سجے ہیں!
زنہار نہ وہ زیست کے زیور سے نکالیں

وہ سیف جو ہو قہرِ خداوندِ دو عالم
وہ سیف سلحہ خانۂ خیبر سے نکالیں

میدانِ وغا کانپتا تھا نام سے جس کے
جی چاہتا ہے پھر وہی ہر گھر سے نکالیں

ہے سوکھی ہوئی کھال بھی صیاد پہ بھاری
ہم حوصلہ کیا کترے ہوئے پر سے نکالیں

عاصی جو خدا چاہے گا وہ ہو کے رہیگا
مایوسی کے الفاظ مقدر سے نکالیں

رشید عشقی

نکل کے دیکھئے باہر ذرا سرابوں سے
حیات کیا ہے سمجھ لیجئے حبابوں سے

جو ہر نگاہ میں ہیں وجہِ نازشِ گلشن
لہو نچوڑ رے سورج نہ اِن گلابوں سے

میں خود بھی کھوکھلے پیڑوں سا گر گیا ہوتا
بندھا نہ ہوتا غموں کی اگر طنابوں سے

اسے بھی تھوپ دیا کہہ کے لازمی ہم پر
وہ اک کتاب جو خارج رہی نصابوں سے

ہمارے پیٹ کے دوزخ کو دیجئے ایندھن
ہمارے دل کو نہ بہلائیے خطابوں سے

سنا ہوا ہے ہر اک ہاتھ آج کیچڑ میں
غبار کیسے اڑاتا کوئی کتابوں سے

جو اک سوال ہے روٹی ہے مسلکِ عشقی
اسے بھی حل نہ وہ کر دیں کہیں جوابوں سے

۳۲۹۷ بشنو بھارام مارگ بمبئی

امین حزیں

بھڑکی ہوئی ہے شمع شبستانِ زندگی
شعلہ نہ چوم لے کہیں دامانِ زندگی

مرنے کے بعد پھولوں سے تربت نوازی
ہوتا ہے کون زیست میں پرسانِ زندگی

تیری ہی جستجو ہے مرا مقصدِ حیات
تیری ہی یاد ہے میرا ایمانِ زندگی

عیش و خوشی نشاط و طرب راحت و سکوں
ہیں ان سے بڑھ کے کون حریفانِ زندگی

بارِ الم اٹھانے کے قابل بنا دیا
کیا کم ہوا ہے مجھ پہ یہ احسانِ زندگی

ہم بھولتے اگر نہ رہِ مستقیم زیست
ہوتا نہ تار تار گریبانِ زندگی

آغازِ باب نو ہے میری موت اے امین
تبدیل کر رہا ہوں میں عنوانِ زندگی!

۱۰۸۳، رولوار سیٹھ پونہ ۲

امان اختر

راستہ جو بڑی رونقیں دکھائے ہے
یہی تو شہر کو جنگل سے بھی ملائے ہے

سنو ہوا ہمیں خطرے سے ہے کرے آگاہ
کوئی بگولہ ہماری طرف ہی آئے ہے

زمین پاؤں میں پہنا چکی ہے زنجیریں!
اب آسمان مجھے کس لیے بلائے ہے

اندھیرے میں تری سرگوشیاں چمکتی ہیں
ترا فراق بھی کیا معجزے دکھائے ہے

ترے بچھڑتے ہی آیا تھا موسم برسات
پتہ چلا کہ سسکنے میں لطف آئے ہے

میں اک فقیر کہ کشکول جس کا جسم تمام
تو وہ امیر کہ بس زخم دیتا جائے ہے

P.A.O (OR) BEG.
کھڑکی پونہ - ۴۱۱۰۰۳

کس درجہ خود فریب ہیں اربابِ عقل و ہوش
سمجھے نہ جس کی بات اسے دیوانہ کہہ دیا (کوثر فاروقی)

رئیس الدین رئیس

کرب زادوں کے لبوں پر پھر دعائیں آئینگی
جب تعاقب میں مرے میری صدائیں آئینگی

موسمِ یخ بستہ تھا حاصل دعاؤں کا مگر
کیا خبر تھی آگ برساتی ہوائیں آئینگی

جب گذر جائیگا حد سے خود پسندی کا جنوں
رقص کرنے خود مرے گھر میں بلائیں آئینگی

اے غریبِ شہر تو فٹ پاتھ پر تنہا نہیں
شام کی شاخوں سے اڑکر فاختائیں آئینگی

جب زمیں مہنگائیوں کی فصل اگلے گی ہمیں
زندگی جینے کی سب سستی ادائیں آئینگی

کیا خبر تھی آس کا پھل شاخ پر پکنے کے بعد
کرب کا طوفان اور غم کی گھٹائیں آئینگی

آج زندہ ہیں تو ہم بے پیرہن مشہور ہیں
کل ہمارے واسطے کتنی قبائیں آئیں گی

جادۂ ادراکِ ہستی کے سفر میں اے رئیس
پہلے کچھ چٹیل زمینیں پھر گپھائیں آئیں گی

۱۰/۱۴۲۵، اردو گیٹ علیگڈھ

شبیر رسول

۵

سکوتِ شام! یہ کیسے خیال میں گم ہے
کہ شکل شکل ہی گردِ ملال میں گم ہے

ہم آنے والے زمانے کی سمت کیا سوچیں
ہمارے شہر کا ماضی بھی حال میں گم ہے

وہ منتظر تھا جوابِ جواب دینے کا
عجب کہ سارا زمانہ سوال میں گم ہے

ہجوم آبلہ پایاں بھی حدِ ضبط پہ ہے
امیرِ وقت بھی ان دیکھی چال میں گم ہے

میں سخت جان ابھی مشّاق ظلم سہنے میں
مرا غنیم بھی اپنے کمال میں گم ہے

حروفِ قلب کی تاثیر کیا ہوئی یا رب
صدائے درد بھی لحن شغال میں گم ہے

شجر کے سائے میں شعلوں کا رقص ہے شبیر
فضائے باغِ غزالاں وبال میں گم ہے

۹۳، ضیاء الرحمٰن ایم۔ ایم۔ ہال
علیگڈھ یونیورسٹی۔ علیگڈھ۔

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہِ ناز ہے دنیا
ہزاروں اٹھ گئے کثرت وہی باقی ہے محفل کی لا استیہ

امین صدیقی

نیاپورہ مالیگاؤں

مست پون کے سنگ لہرائے پتا پتا ڈالی کا !
دہقانوں کے خواب سجائے رنگ سنہرا بالی کا !

سبز لبادہ اوڑھ رہے ہیں سوکھے پیڑ بھی ساون میں
رم جھم رم جھم برکھا برسے موسم ہے ہریالی کا !

نرم جیب نے خواب ادھورے گنگ زبانیں کاغذ کورے
کتنا دہشتناک لگے ہے یہ منظر خوشحالی کا !

لوگوں سے آکاش کہے ہے ایک پہیلی بوجھو تو
سورج سے پہلے کیوں چھایا رنگ افق پر لالی کا

تیز بہت ہے وقت کا دھارا بات امین کی مانو جی
جم جاؤ چٹان کی صورت کھیل نہ کھیلو تھالی کا !

اکبر مرزا، مالیگاؤں

خوب ناخوب، کتابت میں ہنر اپنا ہے
ہم نے جیسے بھی تراشا یہ گہر اپنا ہے

روشنی پی گئے سب اسکی اندھیرے لیکن
ہم کو پیارا ہے بہت کیوں کہ نگر اپنا ہے

فن کی تخلیق میں جو ہاتھ کٹے اپنے تھے
ظلم کی زد میں ہے جو آج وہ سر اپنا ہے

سانس چلتی ہے کہ دم ٹوٹ رہا ہو جیسے
آج زہریلی ہواؤں میں گزر اپنا ہے

ہر گھڑی ہم کو درندوں کا ہے کھٹکا مرزا
کوئی جنگل نہیں بستی ہی میں گھر اپنا ہے

صالح ابن تابش مالیگانوی

۲۷۸/۹ نیاپورہ، ساتویں گلی، مالیگاؤں

حریفِ وہم گماں ایک ایک چہرہ ہے
خیال و خواب کا ہر آئینہ شکستہ ہے

ہوا ایسا کوئی تو اہلِ نظر جو ان کو پڑھے
بشر بشر کسی اخبار کا تراشا ہے

ہے لو کے جھونکوں میں یہ کیسے سرخ زہر کی بو
کہ جسم جسم سے وحشت کا ناگ لپٹا ہے

مرے سوا نظر آیا نہ کوئی سینہ سپر
زمین والوں پہ جب آسمان ٹوٹا ہے

اندھیری وادی میں ہر روز ڈوب کر سورج
نئی سحر لیے پھر نو بہ نو ابھرتا ہے

بچھڑ کے پھول سے خوشبو رہی پریشاں ہی
یہ کیسا نکہت و گل کا اٹوٹ رشتہ ہے

بندھی ہیں آنکھوں پہ خوش رنگ پٹیاں صالح
لباس ہو کے بھی ہر اک بدن برہنہ ہے

سچ مچ وہ شعلہ بن گئے کیفِ شراب میں
ساقی نے اور آگ لگا دی شباب میں (ریان میرٹھی)

نظام الدین نظام

حسنِ سلیقہ کھو بیٹھے گا، چہرے آنکھ چرائیں گے
ٹیڑھے میڑھے سب آئینے شائستہ کہلائیں گے

کچی مٹی کے دیمک کی سازش رنگ دکھائے گی
چاند گھٹاؤں میں ڈوبے گا تارے بجھتے جائیں گے

شوہر سے بیوی کا رشتہ مہمانوں کی خاطر ہے
گھر کی دیواروں پر ننگی تصویریں لٹکائیں گے

لیکن میرے بھائی، تمہیں بھی جادو کا عرفان کہاں
میں بھی ناواقف تھا مڑ کر دیکھا تو پتھرائیں گے

شعر، ہنر، تصویریں تعارف، دھول کہانی موسم آگ
بستی بستی گھوم کے سادھو جھولی بھر لائیں گے

یار نظام الدین ہمیشہ اس کی باتیں کرتا تھا
ہم بھی اپنے ہونٹوں کو اس ناگن سے ڈسوائیں گے

سحر سعیدی

موسم کا لہو جاگتے منظر میں نہیں تھا
خوشبو کا نشہ بھی تو گلِ تر میں نہیں تھا

خورشید چھپا بیٹھا ہے بادل کی ردا میں
مہتاب بھی کل رات سمندر میں نہیں تھا

کردار الگ بات ہے تسخیر کا جذبہ
پورس میں نہیں تھا کہ سکندر میں نہیں تھا

کس حال میں رہتا ہوں کبھی پوچھ ہی لیتا
یہ شیوۂ اخلاق ستمگر میں نہیں تھا

وحشت بھی کہیں خاک اڑاتی نہیں دل میں
سودا بھی کوئی اب کے مرے سر میں نہیں تھا

چاہا تھا اسے دل کا نگہبان بناؤں
یہ سوچ کے چپ تھا کہ مقدر میں نہیں تھا

میں کس کی خبر لیتا کسے اپنی سناتا!
اک فرد بھی تو گھر کا سحرؔ گھر میں نہیں تھا

ٹوٹی کی مسجد جیسی پورہ اورنگ آباد

عبد الحی انجم

جب رات میں سورج نکال دینا تھا
جو کچھ نہیں تو سر اپنا اچھال دینا تھا

مجھے قبول میں حاتم نہیں مگر مجھ کو
بساطِ غیر سے بڑھ کر سوال دینا تھا

کٹائے ہم نے سر اپنے کہ اپنے بچوں کو
نوائے زخم سے چونکے وہ حال دینا تھا

تری عطا مرے دامن کے تذکرے ہوتے
دیا تھا غم تو غمِ لازوال دینا تھا

یہی خراج مری سلطنت بچا لیتا
مرے عروج کو خوفِ زوال دینا تھا

مری طلب کا نہیں تھا اگر جواب تو پھر
کوئی سوال ہی جھولی میں ڈال دینا تھا

مرے وجود کی افشاں سے آسماں سجتا
بدن کی قید سے مجھ کو نکال دینا تھا

چلی ہزار ہوا لاکھ آندھیاں آئیں — تری گلی سے مری خاکِ ناتواں نہ اٹھی (اسیر)

حقیر نوری

دھنوں کے انتشار کو پہنے ہوئے ہیں لوگ
رنگوں میں ڈوب ڈوب کے بکھرے ہوئے ہیں لوگ

ہر اک کا ہاتھ ہاتھ سے باندھے ہوئے ہیں لوگ
ساحل پہ جانے کس لئے پھیلے ہوئے ہیں لوگ

قربانیوں کے بعد ہی ملتی ہیں منزلیں
اس راستی کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں لوگ

موصول ہو رہے ہیں محبت بھرے خطوط
مجھکو مرا نمائندہ سمجھے ہوئے ہیں لوگ

سوچا ہے اپنی رائے میں ترمیم میں کروں
نافہمیوں کا دور ہے الجھے ہوئے ہیں لوگ

کس خطۂ زمین کے لئے کام میں کروں؟
حلقوں میں لاشعور کے اٹکے ہوئے ہیں لوگ

امید کے فلک پہ نظر آتا ہے حقیر
کشتی میں اپنی چاند کے بیٹھے ہوئے ہیں لوگ

۲/۸ ، ایف جوائنٹ کوارٹر محمد پور ڈھاکہ

احمد تمثیل

ہستیٔ دل کو راہ وفا میں مٹا کے دیکھ
اپنا عروج اپنی ہی پستی میں آ کے دیکھ

تیرا مقام دیدہ و دل میں ہے کس جگہ
میرے تصورات کی دنیا میں آ کے دیکھ

یہ کائنات قدموں میں جھک جائیگی ترے!
اک دن خلوص دل سے ذرا سر جھکا کے دیکھ

ہنسنے کا لطف اصل میں رونے کا وقت ہے
غم کی گھٹائیں چھائیں ہوں جب مسکرا کے دیکھ

اندازہ ہو سکے گا نہ گلشن میں باغباں
وحشت زدوں کا حال تو صحرا میں آ کے دیکھ

تمثیل دیکھنے کا مزا تو اسی میں ہے
انکو خود انکی مست نظر سے بچا کے دیکھ

• بلاک ۱۲۴/S ، ۱۵۶ ، کوئنس گارڈن
پونہ - ۴۱۱۰۰۱

دیکھو تو اجالوں کی سچائی کہاں تک ہے
بستی میں اندھیروں کی گہرائی کہاں تک ہے

نفرت کی ہوا نے لی انگڑائی کہاں تک ہے
چنگاری ہواؤں میں لہرائی کہاں تک ہے

کتنے ہی عزیزوں کو زندہ ہی جلا ڈالا
پیغام اخوت کی رسوائی کہاں تک ہے

کیوں لوگ محبت کو معیوب سمجھتے ہیں
اس بات کے پیچھے بھی چترائی کہاں تک ہے

اب بھی نہیں کوئی آواز جسے دیں ہم
اک شہر میں رہ کر بھی تنہائی کہاں تک ہے

پوچھے بھی جلیل آخر تجھ سے یہ کوئی کیونکر
محروم وطن ہو کر صحرائی کہاں تک ہے

اخفائے راز عشق نہ ہو آب اشک سے — یہ آگ وہ نہیں جسے پانی بجھا سکے (میر درد)

اگرچہ طرزِ عمل اس کا ناگوار بھی تھا
مگر وہ میرے تصوّر کا شاہکار بھی تھا

ہم ایسے گم تھے مسائل میں دھیان ہی نہ رہا
وہ آ گیا تو لگا اس کا انتظار بھی تھا

وہ کون شخص تھا کل رات بزمِ یاراں میں
جو قہقہوں میں مِس شامل تھا سوگوار بھی تھا

دمِ وداع تبسم تھا اس کے ہونٹوں پر
وہ اہلِ ظرف بھی تھا اور وفاشعار بھی تھا

وہ بے وفا مجھے تنہا فریب کیا دیتا
قصوروار مرا اپنا اعتبار بھی تھا

سیدہ شانِ معراج، ایم اے
شاہجہاں پور۔

احمدی تبسم، معرفت اسباق،
۵۷۲ راساچا پیر اسٹریٹ پونہ

گل جاتی ہے فولاد کی زنجیر لہو سے
دیوانے بدل دیتے ہیں تقدیر لہو سے

بنتی ہے ہر ایک پھول کی تصویر لہو سے
گلشن کی ہوا کرتی ہے تعمیر لہو سے

مقصود ہے گر فصلِ بہاراں کا تزئین
آدابِ چمن کیجئے تحریر لہو سے

اے اہلِ جنوں خونِ جگر اتنا بچا دو
منہ پھیر کے چلنے لگے شمشیر لہو سے

ہو جائے گھنی چھاؤں سرِ دار تبسم
کر۔ وقت کی تر۔ زلفِ گرہ گیر لہو سے

وقت کی طرح آ کے تم بھی گئے
اب جئیں تو بتاؤ کس کے لئے

ہے فسانہ مرا فقط اتنا!!
خواب ہی خواب، اور بکھرے ہوئے

ایک ہم ہی نہیں زمانے میں
لوگ جتنے ملے، وہ ٹوٹے ہوئے

چاندنی میں ہمارے دامن پر
کتنے بھیگے ہوئے ستارے گرے

روز و شب کی اداسیوں کی قسم
زندگی بوجھ ہے ہمارے لئے

چھپنے والے ابھی تو چھپ کے ہی دیکھا
کس طرح ہم اکیلے ضائع ہوئے

فریدہ ترنم
چوہدری منزل شہید گنج، سرینگر کشمیر ۱۹۰۰۰۹

ہاتھ رکھ کر مرے سینے پہ جگر تھام لیا
تم نے اس وقت تو گرتا ہوا گھر تھام لیا (امیر مینائی)

مسعود اختر ناروی

دردجاگا اور پرانا زخم پھر تازہ ہوا
موسمِ گل جب قریب آیا تو اندازہ ہوا

ہاتھ جیسے قصولِ بیٹھے دستکیں دینے کا فن
مُنتقل جب بند مجھ پر اس کا دروازہ ہوا

قطرہ قطرۂ آرزو کے خون سے اک دل بنا
لمحہ لمحہ منتشر زخموں کا شیرازہ ہوا

حُسنِ خوابیدہ یہ شب میں اور بھی آیا نکھار
چاندنی کا عکس عارض کے لئے غازہ ہوا

روٹھ کر اختر سے اپنے کیوں کنارہ کش ہوئے
کن خطاؤں کا بتاؤ تو یہ خمیازہ ہوا

ریاض اختر ادیبی کندرکوی

عہدِ ماضی پہ جو بھرپور نظر رکھتے ہیں!
اپنی تاریخ کو زندہ وہ بشر رکھتے ہیں

وہ جنھیں پاکیٔ داماں کی حکایت ہے پسند
میرے دامن پہ وہی لوگ نظر رکھتے ہیں

اُن چراغوں کے ارادوں سے لرزتی ہیں شبیں
جن چراغوں کو سرِ راہ گزر رکھتے ہیں

یہ بھی سوچا ہے کبھی تم نے نشیمن والو!
یہ گلِ تر بھی تو شعلوں کا اثر رکھتے ہیں

جن کی آنکھوں میں نہیں آس کے جلووں کا نشاں
بس وہی یاس کی دہلیز پہ سر رکھتے ہیں

کتنے معصوم ہیں یہ عہدِ جواں کے مختار
تہمتیں سب کسی مجبور کے سر رکھتے ہیں

اک روایت ہے فقط انکے لئے شامِ حیات
جو نظر میں ترے جلووں کی سحر رکھتے ہیں

اپنی منزل کا جسے ہوش نہیں ہے اختر
اس مسافر کی طرح ذوقِ سفر رکھتے ہیں

مقام و ڈاک خانہ کندرکی ۲۰۲۴۱۳، مرادآباد

ش، م، عارف، ماہر اروی

عالمِ وارفتگی میں کچھ تو مدہوشی بھی تھی
اس لئے محفل میں کل ہلکی سی سرگوشی بھی تھی

آشنا نا آشنا تھے سب کے سب شکوہ بہ لب
وجہ کچھ سنگِ ملامت خود فراموشی بھی تھی

تربتر تھے لوگ آوازوں کی بارش میں مگر
بھیڑ میں تنہا ہماری اپنی خاموشی بھی تھی

راہ چلتے کچھ نہ کچھ تو آشنا چہرے ملے
تھا تجاہلِ عارفانہ اور روپوشی بھی تھی

پتھروں کے دور میں تھا آدمی ننگا مگر
اس برہنہ پن میں لیکن کچھ ستر پوشی بھی تھی

۵،۶ ہائی کورٹ فلیٹس
شاستری نگر، پٹنہ ۲۳ بہار

ے کدے میں کبھی توبہ کو جو آتے اکثر — ایک دیوار کھڑی ہم نے پا اُن کی (فوتح ناروی)

ارشد نظر

جھوٹ ہی ایک دن ہنر ہوگا — ایسے اک عہد سے گزر ہوگا

ایک موہوم سی امید تو ہے — کوئی جگنو تو ہمسفر ہوگا

موم سے جسم دھوپ کھائینگے — دن کے صحرا سے جب سفر ہوگا

کس سے جاکر کریں گے دل کی بات — دشت سا جب ہمارا گھر ہوگا

آج تو کچھ نہیں ہمارے پاس — بیج ہی سے مگر شجر ہوگا!

بجھ رہے گا چراغ ہستی کا — زندگی پھر نہ تیرا ڈر ہوگا

شاعری کی انوکھی رت ہے نظر — اب تو لہجہ بھی معتبر ہوگا

سبحان انجم

حق منزل، جونا فیل
کھام گاؤں۔

کوئی پیاسا نہ رہے آج وہ کہہ کر نکلا
ابر بن کر مری بستی سے سمندر نکلا

لوگ بادل کی طرح راہ میں آئے ورنہ
میں تو سورج کی طرح گھر سے برابر نکلا

جس نے چومے تھے مرے پاؤں بڑا پیاسا تھا
خواب ٹوٹا تو وہی آگ کا بستر نکلا!

عمر بھر ریت کے ساگر میں چلائی کشتی
اور ڈوبا تو خلاؤں کے بھی اوپر نکلا

کیا تعلق تھا کسی شہر کے لوگوں سے مگر
جو بھی انجم سے ملا آج وہ رو کر نکلا

قاسم امام

چمکتی برف سورج کی حرارت دیکھ لی ہم نے
تمہارے بعد موسم کی شرارت دیکھ لی ہم نے

کہو کیا رات تم نے خواب میں کچھ بھی نہیں دیکھا
یہاں دلدل پہ مرمر کی عمارت دیکھ لی ہم نے!

ہوئے دیوار پہ چسپاں مگر نظروں میں رہتے ہیں
تمہارے سانولے پن کی شرارت دیکھ لی ہم نے!

تم ہی نے تو کہا تھا تم جہاں جاؤگے ہم ہونگے
ہمارے گھر نہیں آئے جسارت دیکھ لی ہم نے!

امام اس کے بدن سے پھوٹتی ہیں نور کی کرنیں!
مصور کو نہیں دیکھا مہارت دیکھ لی ہم نے

ذکر تھا پھولوں کی نزاکت کا — باتوں باتوں میں چل گئے چاقو ۔ محبوب راہی

بے وقعت سمجھے نہ زمانہ وقت پہ کام آجاتے ہیں
گمراہوں کے نقشِ کفِ پا منزل تک پہنچاتے ہیں

جینا بھی اک فن ہے لیکن اسکو پانا سہل نہیں
جینے کے آداب تو صاحب آتے آتے آتے ہیں

تیشہ دستِ عمل میں لیکر ہم سے جیالے جیتے لوگ
توڑ کے پتھریلی چٹانیں دودھ کی نہر بہاتے ہیں

روز ابھرتے سورج سے ملتی ہے نئی تحریکِ سفر
روز غمِ ہستی کے مارے مر مر کے جی جاتے ہیں

جاتے جاتے کر جاتا ہے موسم قحط زدہ سب کو
جیسے ہم اپنے کھیتوں میں بھوک کی فصل اگاتے ہیں

ابتو اکثر اہلِ سیاست یوں لڑتے ہیں آپس میں
جیسے شہر کے چوراہے پر بچے شور مچاتے ہیں

بند ہوں آنکھیں تو ملکر سب مٹی میں دبا دینگے
جیتے جی کے بکھیڑے ہیں یہ جتنے رشتے ناتے ہیں

کوئی اسے مانے کہ نہ مانے سیفؔ یہ اپنی فطرت ہے
ہم تو طوفانوں کی زد پہ اپنا دیپ جلاتے ہیں

سیفؔ بھساولی

اسحاق اثرؔ

نارائن پورہ، اندور۔ ایم پی

ایک دریا حسرتوں کا موجزن میرے لیے
دے گئے کتنے مصائب کی تھکن میرے لیے

اب کے شبنم نے کیے ہیں چاک پھولوں کے لباس
ہیں یہ احساسات کانٹوں کی چبھن میرے لیے

اب میں چہروں کی پرکھ کا کر رہا ہوں کاروبار
اب کوئی کیتا نہیں آئینہ پن میرے لیے

چھاؤں سے دامن چھڑا کر جب چلونگا دوستو
جلجلاتی دھوپ دیگی پیرہن میرے لیے

کب بہا لے گا میرے ہاتھوں کے چھالوں کا لہو
کب گراں ہوگی یہ ماتھے کی شکن میرے لیے

جب بیاباں دیکھکر لوٹی تمنائے بہار
لے کے آئی خشک پتوں کا کفن میرے لیے

عطّا مہر ذوالنہری

اب ہونٹوں کو زندہ کر لے لہجوں میں الفاظ جگا
پھر احساسوں کے جنگلے سے پھولوں کی بوباس جگا

صبحِ تازہ ہاتھوں میں رکھ، لوٹے قدموں پر مشرق
نوکِ خامہ اگلے سورج، کرنوں سے قرطاس جگا

حائل گر ہوں رسم نو درو، تقلیدی پگڈنڈی پر
تہذیبِ نو کے چشمے سے بیداری کی پیاس جگا

برفی تودوں میں پیدا کر میٹھے میٹھے سے شعلے
خاکی پتلوں کو ٹھہرا کر، بے آسوں کی آس جگا

مدفن ہے ارماں کی بستی، ڈھائی قسمت نے دیوار
پھر امیدوں کے ملبے سے، چمکیلے احساس جگا

غم کے سوتی دھاگوں سے اپنی آسوں کے پربت باندھ
غزلوں کے جامِ جم سے ہر اجلی اجلی پیاس جگا

سونے کے نوالے کی نہیں کس کو تمنا
میں اس لیے ڈرتا ہوں کہ دور وقت بڑا ہے (رفعت سروش)

عبدالمجید گوہر

ہر ایک سمت ہے دنیا کہیں خدا رکھوں
کسی طرف تو نکلنے کا راستہ رکھوں

کسی سے جھوٹ نہ بولوں کسی سے سچ نہ کہوں
کسی کے عیب جو دیکھوں انہیں چھپا رکھوں

وہ میرے جسم سے پھوٹے گا کونپلوں جیسا
میں اس کے واسطے خود کو ہرا بھرا رکھوں

پھٹی پرانی چٹائی بھی اسکو روشن ہو
کھلی کتاب کے جیسا ہی گھر کھلا رکھوں

کھلونے پیٹ سے باندھے نکل پڑوں گھر سے
اور اپنی ایڑیاں بازار میں اٹھا رکھوں

سیہور ہوٹل چوک بازار اوجین ایم پی

ایوب اثر ، شاہجہانپوری

وفا پرست ہوں میں بے وفا زمانہ ہے
ہوا خلاف ہے اور دور مجھ کو جانا ہے

اب اس مقام پہ لے آئی مصلحت مجھکو
کہ غم سے چور ہے دل اور مسکرانا ہے

یہ کہہ کے خود کو میں بہلا رہا ہوں مدت سے
بس اسکے بعد کا منظر بڑا سہانا ہے

سبھی کو جینے کا حق ہو یہ چاہتا ہوں میں
تمہیں بتاؤ ! یہ احساس مجرمانہ ہے۔

جو درد مجھکو دیے ہیں مرے رفیقوں نے
انھیں کو باعثِ تسکینِ جاں بنانا ہے

میں جانتا ہوں کہ پھل پتھروں کے پاؤنگا
مگر درخت محبت کا اک لگانا ہے

شکست دل سے اثر اس قدر اداس نہ ہو
دلِ بشر تو حوادث کا کارخانہ ہے

محمد مستقیم شعلہ

دوستو جذبۂ تخلیق دکھانا ہوگا
پھول پتھر کی چٹانوں پہ اگانا ہوگا

لوٹ جائیگی زمانے کی ہر اک رسم کہن
شرط یہ ہے کہ نیا گیت سنانا ہوگا !

میری جھنکار بھی گونجیں گی کبھی گلشن میں
میرے لب پر بھی کبھی شوخ ترانا ہوگا

ایک مدت سے ہے خاموش چراغِ نکہت
اپنی مہکی ہوئی سانسوں سے جلانا ہوگا

نیکیاں ساتھ نبھائینگی جناب شعلہ
پھل کی امید پہ اشجار لگانا ہوگا

گوندھنا پوری، کھامگاؤں
بلڈانہ

ترکیب و تکلف لاکھ کرو فطرت کہیں چھپتی ہو اکبر جو ملا ہے وہ ملتی ہے جو سونا ہے وہ سونا ہے (اکبر الہ آبادی)

حیدر علی حیدر

ان کی آنکھوں سے عیاں مے کا نشہ ہو جیسے
زلف لہراتی ہوئی کالی گھٹا ہو جیسے

روزنِ زلف سے چھپتا ہوا چہرہ تیرا
ابر کی اوٹ میں مہتاب چھپا ہو جیسے

زیست اک دردِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ وہ زنجیر ہے جس کا نہ سرا ہو جیسے

مضطرب کرتی ہے اس طرح مجھے سوزِ حیات
جسمِ خاکی میں شرارہ بھی ملا ہو جیسے

وہ سمجھتے ہیں سکوں دل کو میسّر ہو گا!
اس جزیرے کا کوئی اور خدا ہو جیسے

اس کو دیکھا ہے سرِ بام پریشاں اکثر
اس کا محبوب کہیں دور گیا ہو جیسے

بزمِ خوباں میں پہنچ جائے گا خوشبو کی طرح
شعرِ حیدرؔ کا کوئی موجِ صبا ہو جیسے

جمیل، نظام آبادی

کرنے دو دوستوں کو سوالات چپ رہو
محفوظ رکھو اپنے جوابات چپ رہو

چھیڑو نہ اب خوشی کی کوئی بات چپ رہو
آئے ہیں دردِ ہجر ملاقات چپ رہو

وہ آج سُن رہے ہیں میری بات غور سے
اُٹھتے ہیں درمیاں سے حجابات چپ رہو

لگتی ہے سچی بات ہمیشہ بری اُنہیں
ان سے کہو نہ دل کی کوئی بات چپ رہو

پوچھو نہ حال مجھ سے مرے درد و کرب کا
مجھ پہ ہیں ان کے لطف و عنایات چپ رہو

وقتِ دعا ہے آؤ اٹھائیں دعا کو ہاتھ
ہوں گی قبول آج مناجات چپ رہو

تعمیر کرنا ہے مجھے بیت الغزل جمیلؔ
میں جمع کر رہا ہوں خیالات چپ رہو

جلیل عشرت جلیل

چاند نکلا بھی شبِ غم تو کشیدہ نکلا
اپنے ہی حسن کے جلوے سے تپیدہ نکلا

شب گزیدہ اگر ہوتا تو کوئی بات نہ تھی
اپنا پیکر تو سدا صبح گزیدہ نکلا

کل سیا کرتا تھا اوروں کا جو پیراہنِ دل
آج اپنا ہی وہ دل لیکے دریدہ نکلا

برق لہرائی تو ہر شاخِ ثمر سبز ہوئی
فصلِ گل آئی تو گل خاک رسیدہ نکلا

یہ بھی طرفہ تیرا اعجازِ مسیحائی ہے
جو بھی نکلا تیرے کوچے سے رسیدہ نکلا

مزرعۂ گردشِ دوراں میں جہاں بھی جاکر
ہاتھ جس پھل کو لگایا وہ چشیدہ نکلا

باغِ دنیا کا ہر ایک پیڑ ثمر ور عشرتؔ
بے نیازِ حسِ پندار خمیدہ نکلا

نذیر فتح پوری

اتنا مشہور مرے خوں کا قصہ ہوئے
سوئی انگلی میں چبھے شہر میں چرچا ہوئے

وہ ہی جانے ہے کہ کیا ہوئے ہے قیمت دل کی
جس نے یہ بیش بہا لعل خریدا ہوئے

نیند کی گود میں جھولے تو لگے سب اپنا
آنکھ کھل جائے تو ہر خواب پرایا ہوئے

دھیان سمتوں سے ہے راہ سے ہٹ جائیں ہم
آنکھ منظر میں الجھ جائے تو کیا کیا ہوئے

اس کو محسوس بھی کر لوں تو یہ ہوئے انجام
درد سینے میں اٹھے دکھ میں اضافہ ہوئے

دل کے روزن سے در آئے تری یادوں کی کرن
اس کھنڈر میں بھی کسی دن تو اجالا ہوئے

اوڑھ کر اپنے ہی احساس کو بس جائیں جہاں
کوئی بستی سے پرے ایسا جزیرہ ہوئے

پیاس نے چھین لی گھٹنوں کی توانائی نذیرؔ
کوئی دریا جو ملے راستہ ہلکا ہوئے

رشید اعجاز

گہری میٹھی نیند کا دفتر کھولیں
وش کنیا سے ہونٹ ملا کر بولیں

کیا بستر کیا جاگ مرے کو ارتھی!
جس کروٹ بھی چین سُہائے سولیں

ٹوٹے جگ میں کون ملے اَن ٹوٹا!!
کس کو ڈھونڈیں کھوج میں کس کی ڈولیں

سنّاٹے کا بوجھ بڑا ہے لیکن
سُر منڈل کی کون سی کھڑکی کھولیں

وہ بھی لو آواز کا صحرا نکلا!!
اُس سے کیونکر بات کریں کیا بولیں

ہر بیتا پل یاد کہاں آتا ہے،
کچھ کھونے کا ہاتھ ہے حیلہ، رولیں

لفظوں میں اعجازؔ نہیں ملنے کا!!
اَن برتے احساس کے موتی رولیں

سیّد آصف

مدّ ابوں کے شکست جنوں کے ہمرازوں کی بات کریں
بر سر محفل ٹوٹ گئے جو ان سازوں کی بات کریں

حسنِ معانی لہجے کی رنگت کا کب محتاج رہا
خاموشی کا گہنہ پہنے آوازوں کی بات کریں

ہونٹوں کی پہرے داری جذبوں کی محافظ کیا ہوگی
سینہ جن کا دفینہ ہو ہم ان رازوں کی بات کریں

سوداگر دنیا میں کس دن ہاتھ لپیٹا ریشم کا
سوانگ رچائیں، دھونی رمائیں، اعجازوں کی بات کریں

آ کاشوں میں ہوڑ لگی ہے سالم دست و بازو کی
آؤ اپنے شکستہ پروں کے پروازوں کی بات کریں

ظلم نے اپنی حد توڑی ہے صبر بھی اپنی حد توڑیں
جنگوں کے افسانے گائیں، جانبازوں کی بات کریں

معرفت اُسیاق پونہ

آزاد غزل

آزاد غزلیں

مری دیوانگی جاکر اسیروں میں پکار آئی ۔ قفس کو توڑ ڈالو تم تو ہمیں بہار آئی ۔ محوی صدیقی

آزاد غزل پر آزاد خیالات

ان دنوں آزاد غزل ہندوستان اور پاکستان میں زیر بحث ہے۔ ادبی رسائل، روزناموں کے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن، ریڈیو، ٹیلی ویژن ـــــ سب ہی آزاد غزل کی ماہیت اور اس کے مستقبل کی بابت زوردار گفتگو کر رہے ہیں۔ گذشتہ دنوں اس صنف کے موجد مظہر امام کا ایک مقالہ "آزاد غزل پر ایک نوٹ" "شب خون" (۱۲۱ جولائی اگست ۱۹۸۱ء) میں شائع ہوا۔ جسے "سالار" بنگلور نے بھی اپنے ہفتہ وار ادبی ایڈیشن میں قسط وار چھاپا ہے۔ اس مضمون نے ادبی حلقوں میں اچھی خاصی ہلچل پیدا کی ہے۔ اور اس کے تعلق سے خطوط اور مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری ہے۔ ذیل میں ہم ڈاکٹر وزیر آغا، حکیم منظور اور سلیم شہزاد کے خطوط شامل کر رہے ہیں۔ جو براہ راست مظہر امام کو موصول ہوئے ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ اس صنف پر اظہار خیال میں لوگ کسی تکلف سے کام نہ لیں۔

(مدیر "فنون" پور)

ڈاکٹر وزیر آغا (پاکستان)

آزاد غزل پر آپ کا مضمون خاصا [illegible] ہے۔ لوگ، بالکل آزاد غزل کے قریبی [illegible] نظم سے اقرب سے بلا وجہ ہی منسلک کرتے ہیں۔ نثری نظم پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ یہ شاعری نہیں بلا نثر ہے۔ جب کہ آزاد غزل پر ایسا کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ پہلا موقع ہے کہ غزل کی ہیئت میں ایک تجربہ ہوا ہے۔ اگر یہ تجربہ کامیاب ہوگیا تو بڑی بات ہوگی۔ اور اس کا سارا CREDIT یقیناً آپ ہی کو ملے گا۔ مگر آزاد غزل لکھنے والوں کو ایک بات ہمیشہ ملحوظ رکھنا ہوگی وہ یہ کہ غزل کا شعر سیڑھی کے قدم کی صورت میں ابھرے تو وہ غزل کا شعر ہے ورنہ کچھ اور۔ مراد یہ کہ غزل کے شعر کا ایک مصرعہ (یا خیال) دوسرے مصرعے یا خیال کو اوپر اٹھاتا ہے۔ بعینہٖ جیسے سیڑھی پر چڑھتے ہوئے دوسرا قدم پہلے قدم سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ جب تک غزل کے شعر میں یہ کیفیت پیدا نہ ہو وہ محض ایک STATEMANT یا کسی موضوع کا محض ایک حصہ ہی رہے گا۔ اپنی منفرد حیثیت کا (اپنی اکائی کا) احساس نہ دلا سکے گا۔ اکثر آزاد غزلوں کے اشعار نظم کے اشعار بن گئے ہیں جو بری بات ہے۔ مگر آزاد غزل میں نہایت عمدہ غزلیہ اشعار بھی وجود میں آئے ہیں۔ آپکی آزاد غزلوں میں بالخصوص بات بہت نمایاں ہے۔ امید ہے آزاد غزل لکھنے والے بہت سے دوسرے شعراء اس سلسلے میں آپ کی غزل سے روشنی حاصل کریں گے۔

حکیم منظور (جموں)

خط لکھنے کا محرک آزاد غزل سے متعلق آپ کا وہ مضمون ہے، جو ماہنامہ "شب خون" کے جولائی اگست ۱۹۸۱ء کے مشترکہ شمارے میں چھپا ہے۔ مضمون بے حد دلچسپ اور آپ کی ذہانت کا آئینہ دار۔

آپ نے آزاد غزل کا وجود منوانے کے لیے تمام داؤ پیچ کھیلے ہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ آپ اپنی وکالت سے مطمئن ہوں تو ہوں، مگر مقدمہ کی بے حقیقتی آپ کی نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوگی۔ آپ شاید بحث میں جیت جائیں مگر مقدمہ آپ بہرحال ہار جائیں گے۔

آزاد غزل کے متعلق میں نے اس وقت سنجیدگی سے غور کیا جب علیم صبا نویدی صاحب نے اپنا مجموعۂ کلام "رنگ کف" مجھے عنایت فرمایا۔ میں نے کئی دنوں کے بعد صبا صاحب کو اپنی اس پُرخلوص رائے سے آگاہ کیا کہ میرے نزدیک آزاد غزل ذہنی عمل کا نہیں بلکہ بچکانہ کاوش کا نتیجہ ہے۔ شاید صبا صاحب ناراض ہوگئے، جبھی آج تک ان سے نامہ و پیام کا سلسلہ منقطع ہے۔ ڈر رہا ہوں کہ اس خط کے بعد کہیں آپ بھی ناراض نہ ہو جائیں۔ مگر "عشق کو فریاد کرنا لازم ہے اور میں مجبور!

آپ نے اپنے مضمون میں اس بنیادی بات سے ارادتاً صرف نظر کیا ہے کہ آزاد غزل کے ہوتے غزل ہوتے ہوئے جواز کیا ہے؟ آزاد نظم کی طرف رجوع، میری ناقص رائے میں اس لیے ہوا تھا کہ ردیف، قافیہ اور بحور و اوزان کی مصیبتوں سے نجات حاصل ہو۔ اور چونکہ نظم ہیئت کے اعتبار سے بالکل الگ پہچان کی حامل ہے اس لیے اس کا وجود اپنی ہیئت کے سبب سے ہی ثابت ہے۔ اگر کسی اور طرح نہیں۔ آزاد غزل کی یہ صورت نہیں۔ یہ بہرحال ردیف اور قافیہ اور ایک مخصوص بحر/ وزن کی پابند ہے اس کی صرف اتنی سی پہچان ہے کہ اس کے مصرعے وزن کے ارکان کو گھٹا بڑھا کر لکھتے (لکھے نہیں) جاتے ہیں۔ یہ صورت "مستزاد" پر مستزاد ہے۔ مگر غزل کے مزاج، اس کی ہیئت اور اس کے رکھ رکھاؤ پر قطعاً بار گراں جیسے کئی ہندی نواز اخبارات اردو میں شائع ہوتے ہیں اور اردو میں ہی اردو کی مخالفت کرتے ہیں۔ اسی طرح آزاد غزل کے دراصل غزل کی حرمت اور پاکیزگی پر آزاد غزل کو غزل کہہ کر آپ لوگ یقیناً کوئی مستحسن کام نہیں کر رہے ہیں۔ یہ نہیں ہے کہ غزل کا وجود آزاد غزل کے سبب خطرے میں پڑ گیا ہے۔ یا پڑ جائے گا۔ ہاں نئے اذہان کے لیے یہ کنفیوژن بہ ہمہ وجوہ سودمند ثابت نہیں ہوگا۔

آپ نے کمار پاشی کے دو اشعار سے کچھ الفاظ کو گھٹا کر یہ ثابت کیا ہے کہ آزاد غزل زوائد کے عیب سے بری ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے اپنے ایک شعر کی مثال بھی دی ہے۔ حشو و زائد کو بھی شاعری میں مستحسن قرار نہیں دیا گیا ہے۔ اگر کوئی شاعر محض وزن پورا کرنے کے لیے زائد الفاظ کا استعمال کرتا ہے تو اس کی نااہلیت کی دلیل ہے مگر غزل کا اس سے کوئی قصور ثابت نہیں ہوتا اور آزاد غزل کے وجود کے لیے یہ کوئی جواز فراہم نہیں کرتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ خود آزاد غزل بھی اس عیب سے بری نہیں۔ مثال کے طور پر صبا کے مصرعے "مجھ کو الزام نہ دو جامہ دری کا ہرگز" میں "ہرگز" اور ایک اور مصرعے "عملوں کو جس سے شکایت رہی اس کٹیا میں" میں "اس" کا کیا مطلب اور کیا جواز ہے؟ ان دونوں مصرعوں میں یہ زائد الفاظ نہ معنی میں کوئی اضافہ کرتے ہیں نہ مصرعوں کے حسن کو۔ اسی طرح اس مصرع میں "ہوئی تو سینے کی مدھم اتنی" میں یہ فرض کر لیا گیا کہ سینہ جل رہا ہے۔ اگر شاعری میں یہی صورت جائز

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی (فانی)

جو اب اوقات جائز ہو بھی سکتی ہے تو پھر دوسرے مصرعے میں حبیب کے اجالے سے چہرہ روشن نہ ہونے کی کیا بات ہوئی؟

آزاد غزل کے ایک اور "حسن" کی آپ نے یہ کہہ کر نشاندہی کی ہے کہ اس کے مصرعے مربوط ہونے میں اور معنی کے لحاظ سے زیادہ "جاندار اور شاندار" ہوتے ہیں۔ میں پھر صبا ہی کی غزل کو مثال کے طور پر پیش کرکے جاننا چاہوں گا کہ آوازوں کے سائے ہوا کے دوش پر ہیں اور رنگ فضا کے دوش پر تو یہ دو الگ الگ باتیں ہوئیں۔ ان میں ربط باہم کیا ہے؟ آواز کے سائے "کا رنگوں سے کیا تعلق، جب کہ دونوں الگ الگ دنیا میں محوِ سفر ہیں۔؟

صبا صاحب کی ایک پوری غزل آپ نے حوالہ کے طور پر نقل فرمائی ہے۔ اس غزل میں یہی ہوا ہے نا کہ ایک رکن" فاعلاتن " مختلف مصرعوں میں گھٹا دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل شعوری کاوش کا نتیجہ ہے اور جہاں اس طرح کی کاوش در آتی ہے، ظاہر ہے کہ یہ عمل نجاری کا عمل شروع ہوجاتا ہے۔ شعر کی تراش خراش کرنا شعر کی نجاری کرنے سے بالکل ہی ایک الگ اور جداگانہ عمل ہے۔ لیجیے یہی غزل" فاعلاتن" کی مستقل تخفیف کے ساتھ یا پورے ارکان کے ساتھ اس طرح لکھی جا سکتی ہے۔

("فاعلاتن" کی تخفیف کے ساتھ)

کتنے سائے ہیں ہوا کے دوش پر
رنگ کتنے ہیں فضا کے دوش پر
میرے اندر کی سلگتی کائنات
ٹوٹ کر بکھرے خلا کے دوش پر
کیسے پہچانو، ہیں کتنے میرے روپ
اڑ رہا ہوں میں صدا کے دوش پر
یہ افق اور یہ سپہر نیلگوں
کیا ابھی تک ہیں خدا کے دوش پر
تم نے سمجھا میں ہوں حرف ابتدا
ہوں صبا میں انتہا کے دوش پر

("فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن/ فاعلات)

کتنی آوازوں کے سائے ہیں ہوا کے دوش پر
(میں کہوں کیا) رنگ کتنے ہیں فضا دوش پر
(سوچیے جب) میرے اندر کی سلگتی کائنات
(ٹوٹ کر اک دن بکھر جائے خلا کے دوش پر
مجھ کو پہچانوگے کیسے ان گنت ہیں میرے روپ
اڑ رہا ہوں میں (ازل ہی سے) صدا کے دوش پر
(کس سے پوچھوں) یہ افق اور یہ سپہر نیلگوں
کیا ابھی تک سانس لیتے ہیں خدا کے دوش پر
(سچ نہیں کیا) تم نے سمجھا میں ہوں حرف ابتدا؟
اے صبا صاحب! ہوں لیکن انتہا کی دوش پہ

آپ بہتر فیصلہ کرسکتے ہیں کہ معنی کی سطح پر غزل کی یہ دونوں صورتیں بہتر اور زیادہ پرکشش ہیں کہ نہیں؟ پہلے شعر میں (میں کہوں کیا یا کیا کہوں میں) دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں (سوچیے جب) تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے میں" ازل ہی سے" اور چوتھے شعر کے پہلے مصرعے میں "کس سے پوچھوں" سے ان اشعار کی کیفیت، میرے نزدیک کیا بہ لحاظِ معنی اور کیا بہ لحاظِ حسن، دوچند ہوگئی ہے۔ میرے نزدیک اس مثال کے پیش نظر آزاد غزل" محض ایک تماشا بن کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح آپ کی ایک خوبصورت غزل کو بھلے آزاد غزل میں اس طرح تبدیل کرنے کی کوشش کی ہے کہ معنی کی سطح پر یا کسی اور طرح آپ کے خیالات سے الگ نہ معلوم ہو، مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ بات کچھ بگڑ ہی جاتی ہے۔

نہ جانے دل پہ کیا گزری، مگر باہر نہیں بدلا
تمہارے بعد بھی منظر نہیں بدلا..... (ایک رکن کی تخفیف)
بدلتے منظر و! خوش ہوں کہ پس منظر تو باقی ہے
ابھی وہ آئینہ پیکر نہیں بدلا۔ (دو ارکان کی تخفیف)
رتوں کیساتھ دلداری بدلتی ہے..... (ایک رکن کی تخفیف)
وہ ہر موسم سے گزرا ہے مگر اکثر نہیں بدلا
مرے سب خواب تاروں کی طرح ٹوٹے (ایک رکن کی تخفیف)
گلوں کی اوس میں بھیگا ہوا پیکر نہیں بدلا
وہ اب بھی چین ہی کی نیند سوتا ہے.........
(ایک رکن کی تخفیف)
وہ پیکر رنجگوں کے پاس بھی آکر نہیں بدلا

جاننا چاہوں گا کہ آپ کی مندرجہ بالا پابند غزل میں "زائد الفاظ" ہونے کے باوجود آپ نے اسے آزاد غزل کے طور پر کیوں نہیں لکھا؟

میں آپ سے متفق ہوں کہ آزاد غزل فنی اور فکری پابندی سے فرار کا نتیجہ ہے۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا ہے۔ صرف" فن" اور" فکر" کی نئی تشریح کرنا پڑے گی۔ اس میں" فن" یہ ہے کہ مصرعوں کو گھٹانے بڑھانے میں مہارت درکار ہے۔ اور" فکر" یہ ہے کہ دو مصرعوں کو مربوط رکھنے اور ابہام کو دور کرنے کے لیے کافی سوچ بچار کرنا پڑتا ہے۔ میں یہ پھر دہراؤں گا کہ یہ عمل نجارانہ ہے اور کسی کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے کہ ؎

غضب تو یہ ہے انہیں بھی ہے زعم فن کاری
وہ لوگ صدیوں سے پیشہ ہے جن کا نجاری

سلیم شہزاد (مالیگاؤں)

آزاد غزل پر آپ کا "مضمون" شب خون" میں دیکھا جو اپنے دلائل اور حوالہ جات کی روشنی میں مبسوط اور قابلِ قدر ہے۔ دوستوں سے اس پر بحث بھی ہوئی، جو اس اتفاق پر ختم ہوئی کہ آزاد غزل کا شعری PHENOMENON اب تک اپنے تجرباتی دور میں ہے۔ اور اسے صنفِ شعر کی آزادانہ حیثیت اور روایت کے طور پر قبول کرنے میں خاصہ وقت لگے گا۔ اس تعلق سے جانبدارانہ اور دہائی دینے والے خیالات کا اظہار قبل از وقت اور غیر تخلیقی ہوگا۔ آزاد نظم کو اس حیثیت سے قبول کرنے میں آپ جانتے ہیں کتنی مدت لگی۔ آزاد غزل کے لیے تو ابھی اس کا دسواں حصہ بھی نہیں گزرا۔ اسی قسم کی جلد بازی، نثری نظم کو لادنے میں بھی کی گئی ہے۔ کیا آپ اسے درست خیال کرتے ہیں کہ نقاد حضرات کسی صنفی تجربے پر طبع آزمائی کرنا شروع کردیں اور خود ہی اس کے اصول و ضوابط بھی ترتیب دینے لگیں۔ تخلیق بہرحال مقدم رہے گی۔ تنقیدی عمل تو بعد میں آئے گا۔

میں اسے قطعی نامناسب سمجھتا ہوں کہ کوئی تجربہ ادب میں کیا جائے اور پھر اس کی پیش کش کے ساتھ ہی اسے قبول کرنے کے لیے واویلا بھی مچایا جائے۔ آزاد غزل کے سلسلے میں، میں اب تک NEYTRAL ہوں۔ اس تجربے کو (آزاد غزل ہی کو کیا، کسی بھی تجربے کو) میں تجربے کی حیثیت سے قبول کرتا ہوں۔ لیکن ایک تجربہ صرف تجربہ ہی رہے۔ یہ مناسب نہیں۔ ادبی روایات کے پس منظر میں اور عصری تقاضوں کے بموجب اس کی رگوں میں نیا خون INJECT کیا جانا ضروری ہے۔ گذشتہ آٹھ دس برسوں کا میرا مشاہدہ ہے کہ آزاد غزل وہ پر نہیں نکال سکی ہے جو مثلاً نثری نظم نے نکالے ہیں۔ آزاد غزلوں پر رسالے کے نمبر نکال دینا یا کسی ایک شاعر کا مجموعہ

شائع ہو جانے سے تو اس کی ہمہ گیریت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ بے شمار شعرا ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص نمبر کا اعلان ہوتے ہی اس قسم کی چیزیں صرف اپنا نام چھپا ہوا دیکھنے کے لیے قلم بند کر کے بھیج جاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ تجربے کے لیے مخلص نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کی حد دیکھ کر تجربہ کی آفاقیت کو مانا نہیں جا سکتا۔ اور آزاد غزل لکھنے والوں کی بس یہیں کا شمار ہو رہی ہے۔

آزاد غزل میری نظر میں[1]

ڈاکٹر مظفر حنفی

آزاد غزل پر تبصرہ ازیں دو ایک مقامات پر اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کرنے میں مظہر امام جیسے مخلص دوستوں کو ناراض کر چکا ہوں لیکن کیا کروں کہ دل میں اترنے کی بات تو دور۔ یہ میرے حلق سے ہی نہیں اترتی۔ تجربات کے دروازے ادب میں ہمیشہ کھلے رکھے گئے ہیں۔ لیکن ناکام تجربوں کو فن پارے کی حیثیت دلانے پر اصرار کی روش غیر مستحسن ہے۔

لیکن تجربے نے آزادی غزل کے نام پر دو ایک تجربے کیے۔ اور ان کی ناکامی کا کھلے دل سے اعتراف کر کے دوسری راہ پر ہو لیے۔ لیکن مظہر امام اور ان کے ساتھ کچھ مبتدی شاعر اب تک نئی غزل کو ایک صنف سخن تسلیم کرانے پر مُصر ہیں۔ ایمان کی پوچھیے تو ان نام نہاد آزاد غزل لکھنے والوں میں سے کوئی بھی معتبر فن کار شامل نہیں ہے۔ ہند و پاک میں راغب احسن نعیم، رشید افضل، منشا، محمود سعیدی، سلطان اختر، ندا فاضلی، ظفر اقبال، ناصر کاظمی، شہزاد احمد، احمد مشتاق اور اس صنف کے کسی بھی اہم شاعر کا نام بتا دیجیے جس نے اسے حیثیت صنف سخن اپنے اظہار کا وسیلہ بنایا ہو۔ یہی حال مستند اور صف اول کے ناقدین کا ہے تمام جدید تجربات کو لبیک کہنے والے نقادوں میں ہندوستان کے شمس الرحمان فاروقی اور پاکستان کے وزیر آغا سر فہرست ہیں اور یہ دونوں حضرات شاعر بھی ہیں۔ لیکن یہ حضرات آزاد غزل کے تجربے کی مہملیت پر مہر تصدیق ثبت کر چکے ہیں۔ دراصل غزل ردیف و قافیے کی پابندی کے ساتھ ایک ہی وزن میں کہے گئے اشعار کا مطالبہ کرتی ہے۔ اسکی شناخت ہی اسکی مخصوص ہیئت ہے۔ ہمارے ہاں آزاد نظم کا تجربہ اس لیے کامیاب ہو سکا کہ اسکی کوئی مخصوص ہیئت ابتدا سے ہی متعین نہ تھی اور مغربی ممالک میں فری ورس کی مستحکم شعری روایت اسے سہارا دینے کے لیے موجود تھی۔ غزل کا ہر شعر اپنی جگہ ایک اکائی ہوتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے جذبات سے معمور خیالات کو

میں ردیف و قوافی سے نظم کرنا ایسا دشوار

میں ایک اچھی خاصی شکل کو

پھر کہوں گا کہ بقول خود مظہر امام نے ۱۹۴۲ء میں تیرہ چودہ سال کی عمر میں غزل لکھتے ہوئے جو خارج از بحر اشعار کہے تھے انھیں تجربہ نہیں ایک مبتدی کی اغلاط پر محمول کیا جائے گا کہنہ مشق اور مشہور ہو جانے کا مطلب یہ نہیں کہ ہر اپنی بچکانہ حرکتوں کو فن کا درجہ دے کر تعبیر کرنے لگیں خیر سے آزاد غزل کو کچھ ناقدین بھی مل گئے ہیں لیکن ان میں سے کسی کو تا حال پایہ استناد حاصل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں کم از کم میں اسے ایک ناکام تجربہ ہی کہوں گا خواہ میرے کچھ دوستوں کو یہ بات کتنی ہی بری کیوں نہ لگے۔

[1] ڈاکٹر مظفر حنفی کا یہ خط براہ راست مدیر اسباق کو موصول ہوا ہے۔ (ادارہ)

امیر جاتے ہو بت خانے کی زیارت کو
پڑے جو راہ میں کعبہ سلام کر لینا (امیر مینائی)

آزاد غزل : ایک تجزیہ

ڈاکٹر عنوان چشتی

جامعہ شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ نئی دہلی

اردو میں شعری آہنگ کی مخصوص اور متعین صورت کا نام بحر ہے۔ اردو کی بنیاد رکن پر ہے۔ رکن کے معنی ستون ہیں جس طرح مکان کی بنیاد ستون پر ہوتی ہے۔ اسی طرح بحر کی بنیاد رکن پر ہوتی ہے ہر ایک رکن کا ایک مخصوص وزن ہے۔ عروضی اصطلاح میں دو کلموں کے " حرکت و سکون " کے مساوی ہونے کو وزن کہا جاتا ہے۔ ارکان کی تعداد دس ہے۔ انھیں کے الٹ پھیر اور زحافات کے عمل سے نئے ارکان بنتے ہیں اور ارکان کی مختلف تعداد اور ترتیب سے نئے اوزان وجود میں آتے ہیں۔ زحافات کا عمل چار صورتوں میں ہوتا ہے۔ (الف) کسی حرف کو بڑھا کر، (ب) کسی حرف کو ساقط کر کے، (ج) کسی حرف کو متحرک کر کے (د) کسی حرف کو ساکن کر کے۔ زحافات کے عمل سے بحروں کے دائرے میں لچک اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ عروض کے روایتی سانچے میں بعض استثنا بھی ہیں۔ مثلاً ایک بحر کے دو اوزان کا اجتماع جائز ہے۔ یعنی ایک ہی شعر میں ایک بحر کے سالم اور محذوف ارکان کو لایا جا سکتا ہے لیکن ہر بحر میں ارکان کی تعداد مساوی ہوتی ہے بحر اور اس کے اوزان کا یہ بنیادی اور مسلمہ اصول ہے۔

اس مسئلہ پر ایک اور رخ سے غور کر لینا چاہئے۔ اور وہ ہے آہنگ کا تدریجی مطالعہ۔ اردو شاعروں نے عربی و فارسی سے اوزان و بحور کا نظام حاصل کیا۔ مگر اردو میں وہ ساری بحریں مقبول نہ ہو سکیں جو عربی و فارسی میں رواج پذیر رہی ہیں۔ ہمارے شاعروں نے جن بحروں کو اپنی زبان کی ساخت اور قومی موسیقی کے مزاج سے قریب پایا، انھیں قبول کر لیا اور جنھیں اس کے مطابق نہیں پایا، انھیں برتا یا بالکل نظر انداز کر دیا اس لیے اردو شاعروں کے یہاں بعض بحریں بالکل نہیں ملتیں یا تکلفاً ملتی ہیں۔ اردو شاعروں نے اپنی زبان کی ساخت اور قومی موسیقی کے مزاج کا یہاں تک احترام کیا کہ دوسری زبانوں سے آنے والی ہیئتوں اور ان کے آہنگوں کو بھی اپنے مخصوص سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اردو میں ۱۸۵۷ء کے بعد معرا نظم سانیٹ آزاد نظم اور ہائیکو وغیرہ کئی ہیئتیں آئیں۔ ان کی ساخت اور آہنگ کے اپنے مخصوص اصول ہیں اردو شاعروں نے انھیں جوں کا توں قبول نہیں کیا بلکہ اپنے مزاج زبان و آہنگ کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ مثلاً انگریزی میں بلینک ورس کے لیے آئمبک پنٹا میٹر مخصوص بحر ہے مگر اردو میں معرا نظم کے لیے کوئی بحر مخصوص نہیں ہے۔ انگریزی میں سانیٹوں کی تینوں قسمیں (شیکسپیر، پٹرارکی اور اسپنسری) کے لیے بھی "آئمبک پنٹا میٹر" مخصوص بحر ہے۔ مگر اردو میں ان کے لیے بھی کوئی بحر مخصوص نہیں ہے۔ ہائیکو جاپانی شاعری کی ایسی صنف ہے جس میں تین مصرعے ہوتے ہیں۔ پہلے مصرع میں آہنگ کے نقطۂ نظر سے پانچ، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ ارکان ہوتے ہیں۔ اردو ہائیکو میں آہنگ و بحر کی یہ ترتیب باقی نہیں ہے۔ اس مختصر پس منظر کا حاصل یہ ہے کہ اردو میں اوزان و بحور کا سنگِ بنیاد رکن ہے۔ روایتی بحروں میں ہر مصرع میں ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ دوسری زبانوں سے اردو میں آنے والے آہنگ اسی بنیادی اصول کے تابع ہیں۔ اردو شاعری کے آہنگ کے پس منظر میں ہی

اردو غزل میں عروضی تجربوں کا جائزہ لینے سے دو رجحان واضح طور پر ملتے ہیں۔ پہلا توسیعِ روایت کا رجحان جس پر اردو زبان کی ساخت روایتی عروض اور قومی موسیقی کا اثر ہے۔ اس کے دائرے میں ایسے تمام عروضی تجربے شامل ہیں جو آہنگ کے سلسلے میں "رکن" کے اصول کو بنیاد بناتے ہیں اور ارکان کی تعداد اور ترتیب سے ابھرتے ہیں جس میں خاص طور پر غیر روایتی بحریں اور ہندی چھند شامل ہیں۔ دوسرا روایت شکنی کا رجحان جس میں "رکن" کے آہنگ سے بغاوت کی گئی ہے نثری غزل کا تجربہ ایسا ہی تجربہ ہے۔ توسیعِ روایت کے رجحان کو دو حصوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے (الف) غیر روایتی بحریں جیسے آزاد غزل کا تجربہ (ب) چھند مثلاً سرسی، سمانہ، ہم گنگا، دوہا وغیرہ۔

آزاد غزل کا خیال 'آزاد نظم' سے ماخوذ ہے۔ انگریزی میں فری ورس نے کلاسیکی اصولوں یا پابند عروض کے مسلمات کو یکسر خیرباد کہا تھا۔ اور ایک نئے آہنگ کی تخلیق کی تھی جس کی بنیاد "لسانی آہنگ" پر تھی۔ انگریزی عروض کی تاکیدی بحر ACCENTED METTER (لہجے کی تاکیدوں) اجزائی بحر SYLLABIE METTER میں ارکان کی تعداد، اور تاکیدی امتزاجی بحر میں (ACCENTED SYLLABIC METTER) ارکان اور لہجے کی تاکیدوں کی گنتی ہوتی ہے "فری ورس" نے نہ صرف یہ کہ عروضی مسلمات کو پیچھے چھوڑا بلکہ جذبے یا خیال کے بہاؤ اور دباؤ کے تحت مصرعوں

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور

نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی (گستاخ رامپوری)

کے قید سے مبرا ہونے کے اصول کو اپنایا۔ عروضی شاعری کا آہنگ متعین ہوتا ہے اس کا انحصار بحر کی تاکید، الفاظ کے وقفوں اور ارکان کی تعداد پر تھا۔ جبکہ نثری نظم کے آہنگ کا انحصار بول چال کی زبان کے فطری اتار چڑھاؤ اور جملے کی نثری ترتیب پر ہے۔ اردو میں آزاد نظم نے بحر کے روایتی اصول یعنی "مساوی الارکان" تصورِ وزن سے انحراف کیا۔ مگر "رکن" کے آہنگ کو خیرباد نہیں کہا بلکہ محض ارکان کی تعداد کے تغیر و تبدل پر اکتفا نہ کیا۔ اردو کی تمام آزاد نظمیں "رکن" پر تقطیع کی جا سکتی ہیں۔ آزاد غزل نے اردو کی آزاد نظم کے اصول کو اپنایا۔ مثلاً

جن کے دل میں درخشندہ ہیں الہامی آیات
فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

وقت نے جان نشانوں پردہ اٹھا نہیں اپنا ہاتھ
فعل فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

صبح کا تارا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے لفظوں سے رنگ
فعل فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

جاگ کے مجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات
فعل فعولن فعلن فعلن فعلن فعلن فاع

پھول ہوں زہر میں ڈوبا ہوا پتھر نہ سہی
فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

دوستو میرا بھی کچھ حق تو ہے تعبیر کرو، کھلکر نہ سہی
فاعلاتن، فعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

یوں بھی تکلیف ہیں جینے والے
فاعلاتن فعلاتن فعلن

کوئی تصویر سہی، آپ کا پیکر نہ سہی
فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

منظر امام

گرچہ آشوبِ زمانہ کے اثر سے مجھ گئی دل کی امنگ
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

یہ نہ سوچو حوصلوں کا دامن رنگیں ہے تنگ
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

جم گئی احساس کی مٹی پہ ایسی کائیاں
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

جس سے دل کو دل میں دھنسی جاتی ہے جینے کی امنگ
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(کرامت علی کرامت)

خالوں میں تنہائی کے بٹنے کا مجھ کو غم نہیں ہے اس لیے
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

میں مرا تنہا نہ تھا
فاعلاتن فاعلن

(یوسف جمال)

تجربوں کی ان گنت شکلیں ہیں ماتھے پر اگی
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

کتنے سربستہ فسانوں کی حقیقت کھولتی ہے یہ لکیر
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(مسعود شمس)

اجنبی بن کے یہاں آیا تھا
فاعلاتن فعلاتن فعلن

ایسی بستی میں تعجب ہے مرا گھر نکلا
فاعلاتن فعلاتن فعلاتن فعلن

(بدیع الزماں خاور)

کرب کی لہریں تموج زہر کا بن کر رگ و پے میں سرایت کر گئیں
فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

درد کا ساغر چھلکتا جا رہا ہے
فاعلاتن فاعلاتن فاعلن

(زرینہ ثانی)

آزاد غزلوں کے جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان کی تقطیع سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آزاد غزل کے تجربہ کا خیال آزاد نظم کے تجربے سے ماخوذ ہے۔ آزاد نظم کی طرح، آزاد غزل کے دونوں مصرعوں کے ارکان کی تعداد مختلف ہے جس کی تین واضح صورتیں ہیں (۱) شعر میں تعدادِ ارکان برابر ہے۔ یہ غزل کے روایتی تصورِ آہنگ کے مطابق ہے (۲) پہلے مصرع کے ارکان کی تعداد زیادہ ہے اور دوسرے مصرع کے ارکان کی تعداد کم ہے (۳) پہلے مصرع کے ارکان کی تعداد کم اور دوسرے مصرع کی زیادہ ہے۔ آزاد غزل میں بحر کے بنیادی اصول (مساوی الارکان) سے انحراف کا وہی جواز ہے جو آزاد نظم کے لیے ہے۔ یعنی کسی خیال یا جذبے کو بحر اور ارکان بحر کی تعداد کا پابند نہ بنایا جائے بلکہ بحر اور وزن کو خیال اور جذبے کے دباؤ اور بہاؤ کا پابند رکھا جائے۔ ایک خیال کو اس طرح دو مصرعوں پر پھیلایا جائے جس سے اس کا فطری بہاؤ قائم رہے اور زبان کے نحوی تقاضے بھی پورے ہو جائیں۔ آزاد نظم کی طرح آزاد غزل میں بھی خیال کے غیر ضروری اجزاء اور غیر ضروری الفاظ اس کے تاثر اور تنظیم کو مجروح کرتے ہیں۔ ہاں ایسے ذیلی اور ضمنی اجزائے خیال اور الفاظ (قوسین کے اندر) شامل کیا جا سکتا ہے جو بنیادی تجربے کی ترسیل اور تاثر میں اضافہ کرتے ہوں۔ ابھی آزاد غزل' تجربے کے ابتدائی دور سے گزر رہی ہے۔ چونکہ غزل کا ہر شعر اپنی مخصوص ہیئتی جمالیات کا پابند ہے۔ اس لیے سر دست نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تجربہ کس حد تک کامیاب ہوگا؟

ظہیر غازی پوری نے آزاد غزل میں تجربے کی ایک اور جہت سے روشناس کرایا ہے۔ اب تک یہ صورت نظر آتی تھی کہ ایک شعر کے دونوں مصرعوں کے ارکان کی تعداد مختلف ہوتی تھی۔ ظہیر غازی پوری نے اپنی آزاد غزل میں اس اصول کو مختلف اشعار میں برتا یعنی ان کی غزل کے ہر شعر کے دونوں مصرعوں کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ لیکن ہر شعر کے ارکان کی تعداد الگ الگ ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر یہ غزل پڑھیے۔

ہمن سے گزرو تو آنگن آئے گا
روشنی کا ایک مسکن آئے گا

قتلِ احساسات کا الزام مجھ کو دیں مگر
تذکرہ تو آپ کا بھی اخرامن آئے گا

فلک کی ہر راہ میں
مقتلِ فن آئے گا

دھوپ اڑ جائے گی ہر دہلیز سے
آنکھیں برسیں گی تو ساون آئے گا

آج پھر چھپر پہ بیٹھا کالا کوا کہہ گیا
سال گزرا چھٹیاں اب ہوں گی ساون آئے گا

سوچتا ہوں خود کو پہچانوں گا میں
سامنے جب میرے درپن آئے گا

عقل کو بن باس دینی جائے گی جب زندگی
توڑ کر ہر حدِ فاصل روز راون آئے گا

ظہیر غازی پوری

اس غزل کے عروضی تجزیے سے معلوم ہوتا ہے کہ مطلع میں دونوں مصرعوں میں ۳، ۳ ارکان ہیں دوسرے شعر میں ۴، ۴ تیسرے میں ۲، ۲ ارکان ہیں۔ اسی طرح دوسرے اشعار میں ہر شعر کے دونوں مصرعوں میں ارکان کی تعداد برابر ہے۔ لیکن غزل

(باقی صفحہ ۲۳۰)

آزاد غزل، ایک مختصر جائزہ

علیم صبا نویدی بی اے (علیگ)

اردو غزل ہیت و اسلوب کی اپنی ایک الگ تاریخ رکھتی ہے کئی ادوار کی بدلتی ہوئی قدروں کے باوجود غالباً ۱۹۵۱ء تک اس کی ہیئت میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا اور یہ ہر دور میں روایاتی حسن سرخ و سفید تجربات و عوامل کے ساتھ ہمیشہ مقبول رہی۔ پروفیسر کلیم الدین احمد اور شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی (مرحوم) کی مخالفت رستخیز- نے اس کے خلاف ہنگامہ ہی نہیں بلکہ منظم طور پر ایک محاذ ہی قائم کیا لیکن اردو غزل ایک ایسی سخت جان صنف سخن ہے کہ اس کے چہرے کو غبار اور گرد کی دھند نے بھی نکھارا ہے اور خود گرجتے برستے طوفانوں نے بھی اس شاہد رعنا کا حوصلہ بڑھایا ہے۔ اب رہی غزل کی مقبولیت، سالمیت، پھیلاؤ، اپیل اور دلپذیری کی بات ــــ بعض خسروان مملکت ادب نے غزل کی عالمگیر مقبولیت کے سلسلے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے ـــــ "غزل کے اشعار زبان زد عام ہوتے ہیں اس لیے مقبول ہے"ـــــ "غزل کو موسیقی کی فنی مہارت کے ساتھ بیگم اختر اور مہدی حسن نے اپنی آوازوں کے سہارے بہت اونچا اٹھایا ہے اور یہ قوالوں اور موسیقاروں کے ذریعہ درباروں تک رسائی حاصل کر چکی ہے اس لیے مقبول ہے"ـــــ "غزل امراء سے لے کر نچلے طبقے کے عوام تک پسند کرتے ہیں یہ بھی غزل کی مقبولیت کا ایک موثر جواز ہے ـــ" "غزل کی افادیت حیثیت اس کی ہیت سے وابستہ ہے جہاں اس کی ہیئت و اسلوب میں کسی قسم کا تغیر پیدا ہوا غزل مقبولیت کے دائرے سے دور گمنام خلاؤں میں گم ہو جاتی ہے"ـــــ

یہ آراء عوام کی نہیں بلکہ ان ناقدین سخن کی ہے جن کے فہم و ادراک، فراست و بصیرت، تبحر و تعلیم تسلیم شدہ ہیں جو زبان و بیان کی باریکی اور شعر کے مبادیات اور اساسی پہلوؤں سے واقف ہیں۔ یہ حقیقت بھی ہے اور تاریخ کے اوراق اس بات کے شاہد بھی ہیں کہ غزل موسیقی کے زیر و بم کے سہارے ہمیشہ محفلوں کو گرماتی رہی ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ اس کے اشعار زبان زد عام ہوتے ہیں۔ عوام، موسیقاروں اور قوالوں کے توسط سے جس قدر غزل کے قریب ہوئے کسی اور دوسری صنف سخن نے یہ مقام حاصل نہیں کیا ــــ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کسی شاعر کی ساری غزلیں مقبول ہوتی ہیں یا ہو سکتی ہیں؟ مثلاً غالب جیسے عظیم شاعر کی چند ہی غزلوں نے عوام میں مقبولیت حاصل کی جو عام فہم اور سیدھی سادھی ہیں۔ میں نے آج تک کسی قوال کو غالب کی یہ غزل گاتے ہوئے

شمار سبحہ، مرغوب بت مشکل پسند آیا
تماشائے بہ یک کف بردن صد دل پسند آیا

اس غزل کی نامقبولیت کے متعلق یہ جواز پیش کیا جا سکتا ہے کہ اس غزل کی فارسی تراکیب، الفاظ کی بندش اور آہنگ کی تلخ نوائی عام فہم نہیں ہے۔ کچھ بھی سہی غزل کے ہجو کہنے میں متذکرۂ بالا عناصر ضرور کار فرما ہیں ــــ لیکن ۱۹۶۲ء میں مظہر امام نے آزاد غزل کی بنیاد ڈالی تو غزل کے تعلق سے ایک بڑا ہنگامہ پیدا ہوا۔ ہنگامہ پیدا کرنے والوں نے یہی اسباب پیش کیے کہ "غزل کی مروجہ ہیت سے انحراف ایک باغیانہ عمل ہے"ـــ "آزاد غزل نہ گائی جا سکتی ہے نہ اس کے اشعار زبان زد عام ہو سکتے ہیں"ـــ مظہر امام نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مخدوم محی الدین نے اپنی آزاد نظموں کو بھی ترنم میں پیش کیا ہے اور خود اس بات کے شاہد ہیں کہ آزاد نظمیں جب گائی جا سکتی ہیں تو آزاد غزل کے خلاف یہ بات کیوں کہی جاتی ہے کہ اس کو گا نہیں سکتے ـــــ

پہلی بات یہ ہے کہ کسی صنف سخن کا گایا جانا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ وہ صنف سخن عظیم ہے ــ خواہ کوئی بھی صنف سخن کیوں نہ ہو اس میں شعوری یا لاشعوری طور پر غنائیت کے عناصر از خود در آئیں۔ یہ اور بات ہے۔ غزل یا آزاد غزل کا گایا جانا کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے ـــ سنا ہے کہ فلمی گیت موسیقاروں کی دی ہوئی دھنوں پر لکھے جاتے ہیں جن میں نہ زبان و بیان کا خیال رکھا جاتا ہے نہ بحر اور تقطیع کا ـــ اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ اس طرح دھنوں پر لکھے ہوئے گیت غزل سے زیادہ موثر اور کیف آور ثابت ہوئے ہیں۔ الغرض یہ کہنا مقصود ہے کہ یہاں یہ بحث ہی بے کار، لغو اور تضیع اوقات کے موجب ہے کہ غزل یا آزاد غزل گائی جا سکتی ہے یا نہیں ـــــ یا گایا جانا ان اصناف کے لیے ناگزیر ہے ـــــ ہمیں تو یہ دیکھنا ہے کہ شاعر نے غزل یا آزاد غزل میں فنی اور فکری اعتبار سے اپنے خلوص اور دیانت داری کا کتنا ثبوت دیا ہے ـــ غزل کی ہیئت کے فطری تغیر سے اشتعال کی جو فضا پیدا کی ہے اس میں کہاں تک دم خم ہے ـــ

آئے دن اس سلسلے میں جو پیشین گوئیاں دیکھنے میں آئی ہیں وہ یہ ہیں کہ "آزاد غزل آگے نہیں بڑھے گی اور یہ بہت جلد ختم ہو جائے گی"ـــ یہ آزاد غزل کے مخالفین کی انتہا پسندی ہے ـــ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جس طرح غزل مختلف بحروں میں کہی جاتی ہے من و عن آزاد غزل بھی انہی بحروں میں کہنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آزاد غزلوں میں بھی قوافی اور ردیف کا التزام رکھا جاتا ہے اور آزاد غزل کے ہر شعر کی اکائی ان ہی قدروں سے وابستہ ہیں جن کا تعلق غزل سے ہے ـــ

ان دنوں مظہر امام کی بنائی ہوئی آزاد غزل کی

زنداں میں تو ڈال دیا اے حاکم زنداں تو نے مگر
پرواز جو میری روک سکے ایسی بھی کوئی دیوار اٹھا (جگر)

نئی سڑک پر کرامت علی کرامت، زبیدہ ثانی یوسف جمال، مناظر عاشق ہرگانوی، حرمت الاکرام علی منیر، فرحت قادری، خالد رحیم، فیض احمد فیض ظفر اقبال، کرشن موہن، سلیم شہزاد، کرشن کمار طور پرویز رحمانی، اور بدیع الزماں خاور جیسی نیک نامی سے محوِ سفر ہیں۔ خصوصاً ان نامور میں راقم الحروف کے ہمراہ آزاد غزل کی صف میں شریک ہونے میں حسن فیاض اور کاظم نائطی اور کرناٹک میں سردار ایاغ کے نام اس لیے بھی قابلِ ذکر ہیں کہ منذکرہ بالا شعراء نے راقم الحروف کے اس نظریہ کو بھرپور خلوص کے ساتھ اپنایا ہے جس کا اظہار میں نے میرے آزاد غزل کے مجموعے "رد کفر" کے دیباچے میں کیا ہے ــــــ

آزاد غزل کے تعلق سے راقم الحروف کا ہمیشہ یہ نظریہ رہا ہے کہ آزاد غزل میں جس قدر فضا آفرینی کے خفائص پیدا ہونگے اسی قدر آزاد غزل کامیاب ہو سکتی ہے۔ ورنہ غزل اور آزاد غزل کے درمیان حدِ فاصل قائم کرنا دشوار ہو جائے گا ــــ

خوشی اس بات کی ہے کہ آجکل کئی باشعور ذہنوں کی ایک کھیپ آزاد غزل کی ترقی اور بقا کے لیے بڑی عرق ریزی، محنت و مزاولت اور نیک لگن سے کام کر رہی ہے۔ ان بے پناہ کوششوں کے باوجود بعض نقادوں کا یہ خیال ہے کہ "آزاد غزل ابھی تجربے کے حصار سے باہر نہیں نکلی ہے اور یہ ابھی تجربات کے ابتدائی مرحلوں کو طے کر رہی ہے" ــــــ

یہ بے جا اطلاق صرف آزاد غزل پر ہی کیوں ہو جب کہ آزاد نظم جس کو ظہور میں آئے ہوئے پچاس سال گذر چکے ہیں ہنوز تجربات ہی کی بھٹی میں تپ رہی ہے اور کئی دشواروں اور سمتوں کا سفر اختیار کرنے کے بعد بھی اپنے محور سے نہیں ہٹی ہے ــــ

آزاد غزل کے تعلق سے اتنی بات ضرور کہی جا سکتی ہے کہ غزل کی طرح اس کا کوئی ضابطہ حیات نہیں ہے۔ اور اس کی ہیئت، تجربے اور ترسیل میں بھی کچھ خامیاں باقی رہ گئی ہیں۔ یقین ہے کہ آزاد غزل بھی دوسری اصنافِ سخن کی طرح ایک نہ ایک دن اپنی خامیوں سے مبرا ہو کر اردو ادب کی بارگاہ میں اپنے روشن اور نمایاں مقام کے ساتھ ساتھ اپنی ایک عہد آفریں فضا بھی ضرور پیدا کرلے گی

بقیہ:ــ آزاد غزل ایک تجزیہ

کے تمام اشعار میں ارکان کی تعداد مساوی نہیں ہے۔

آزاد غزل لکھنے والوں کا اب ایک قافلہ بن گیا ہے۔ علیم صبا نویدی نے آزاد غزلوں کا ایک مجموعہ "رد کفر" کے نام سے شائع کر دیا ہے۔ پاکستان اور ہندوستان میں بہت سے نئے شاعر اس طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ لیکن اس مرحلہ پر میں ایک بات ضرور کہوں گا وہ یہ کہ آزاد غزل کا معاملہ محض ارکان کی کمی و بیشی کا نہیں ہے۔ ارکان کی کمی و بیشی کو خیال کے بہاؤ اور دباؤ کا تابع ہونا چاہیئے اور اسی کے ساتھ غزل کی دوسری کی داخلی اور ہیئتی خصوصیات کا بھی ہونی چاہئیں جن میں غزل کی تمام فنی، جمالیاتی اور داخلی قدریں بھی شامل ہیں۔ اس میدان میں جو شعراء انگلی کٹا کر شہیدوں کی صف میں داخل ہونے کی کوشش کریں گے، انھیں آخر میں ندامت ہو گی۔ آزاد غزل لکھنے کے لیے شدید تخلیقی قوت کی ضرورت ہے۔ اور یہ سعادت بزورِ بازو نیست ــ

شرم و حیا کے ساتھ لپپائی، بے شرمی کیساتھ کامیابی سے بدرجہا بہتر ہے ـــــ خلیل جبران

لطف پر اس کے ہم نشیں مت جا ۔۔۔ کبھی ہم پر یہ بھی مہربانی تھی (میر)

مظہر امام اور آزاد غزل

پریمی رومانی
معرفت ڈاکٹر برج کشن ایمہ
شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی
حضرت بل، سری نگر (کشمیر)

مظہر امام اور آزاد غزل کے تعلق سے کرامت علی کرامت کے یہ دو بیانات توجہ طلب ہیں ۔

" شعر کی خارجی ہیئت کے سلسلے کے تمام تجربوں میں سے میری رائے میں صرف ایک تجربہ ہے ۔ آزاد غزل کا ، جس کے وسیع امکانات اب بھی عام لوگوں کی نظر سے اوجھل ہیں ۔ اس صنف کے موجود مظہر امام ہیں "

(جدید شاعری میں وزن و آہنگ کے مسائل ۱۹۷۵ء 'اضافی تنقید' ص ۱۷۹)

مظہر امام نے پندرہ سال کی عمر میں آزاد غزل جیسی صنف سخن ایجاد کی ۔ حالانکہ یہ صنف فوری طور پر ادب کے سجادہ نشینیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا نہ سکی ، لیکن چوتھائی صدی گذرنے کے بعد اب یہ صنف ہمارے ادب میں قدم جما چکی ہے "۔

(مظہر امام کا ذہنی سفر ، اضافی تنقید ، ص ۲۱۹ ۱۹۷۵ء)

ڈاکٹر محمد حسن نے ساتویں دہائی کی غزل کا جائزہ لیتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں لکھا :

" ہیئت کے سلسلے میں ..... شاید ایک ہی تجربہ قابلِ ذکر ہے وہ مظہر امام کی آزاد غزل کا ہے "۔ (عصری ادب ۔ دہلی ۱۹۸۱ء)

شمس الرحمٰن فاروقی نے ۱۹۸۱ء ہی میں اپنے مضمون " نظم اور غزل کا امتیاز " میں تحریر فرمایا :

" ہمارے عہد میں مظہر امام نے غزل کے مصرع چھوٹے بڑے کرنے کی کوشش کی ہے "

(شعر ، غیر شعر ، نثر)

ظہیر غازی پوری نے اپنے خیال انگیز مضمون " آزاد غزل ایک تجربہ " ۱۹۸۳ء میں لکھا :

اس صنف کے موجد مظہر امام کے لفظوں میں ۔ غزل میں ارکان کی کمی بیشی پہلی دفعہ ہوئی ہے ۔۔

(ماہنامہ شاعر ' بمبئی ۱۹۷۳ء)

یوسف جمال نے زیادہ واضح انداز میں قطعیت کے ساتھ کہا ہے :

" مظہر امام ادب میں ہیئت اور گوناگوں صالح تغیرات و تجربات کے قائل ہی نہیں ہیں بلکہ عمل پیرا بھی ہیں ۔ انہوں نے آزاد غزل کا تجربہ کرکے تجربگاہِ ادب میں ایک اہم موجد کی حیثیت سے ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے "۔

(ہفتہ وار ' مورچہ ' گیا ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۱ء)
(مظہر امام : ایک قابلِ قدر فن کار ۔۔)

علیم صبا نویدی نے اپنی آزاد غزلوں کے مجموعے " ردِ کفر " کے دیباچے میں اس صنف کے موجد کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کیا ہے :

" مظہر امام نے نہ جانے کن محرکات و عوامل کے پیشِ نظر ایک نئی لگن کے ساتھ آزاد غزل کی طرف اپنے تخلیقی سفر کو نیا موڑ دیا "۔

اس سلسلے میں کچھ اور بیانات قابلِ توجہ ہیں :

..... اور حقیقت یہ ہے کہ غزل کے فارم میں تجربہ آزاد غزل کی شکل میں مظہر امام کر چکے ہیں "۔

(راز امتیاز ، سالار بنگلور ۱۳ اکتوبر ۱۹۸۰ء)

" اردو میں آزاد غزل کی روایت (میری موجود معلومات کی حد تک) مظہر امام سے شروع ہوتی ہے "۔

(عنوان چشتی ' کوہسار ' ہزاری باغ
۳۰ ، ۲۴ اگست ، ستمبر ۱۹۷۹ء)

" ۱۹۴۵ء میں مظہر امام نے آزاد غزل کی ابتدا کی ۔ یہیں سے یہ روایت شروع ہوئی "

(ڈاکٹر زینت ثانی ' کوہسار ' ہزاری باغ
۵، ۶ مارچ ، اپریل ۱۹۸۰ء)

" ان تمام شعراء میں تنوع کی شعوری کوشش کے لحاظ سے مظہر امام اس لیے بھی منفرد ہیں کہ انہوں نے آزاد غزل کو روشناس کرایا ۔ اور اسے رواج دیا "۔

(مناظر عاشق ہرگانوی ' روشن ادب ' دہلی ۸۰)

" آزاد غزل کا تجربہ کچھ عرصہ قبل مظہر امام نے بڑی وجاہت اور احتشام سے سرانجام دیا تھا "۔

(انور سدید ' اوراق ' لاہور سالنامہ ۸۰ء ص ۴۰۹)

" غزل کی ہیئت میں تبدیلی ممکن نہیں ، ویسے ایک ہندوستانی شاعر مظہر امام نے غزل کی ہیئت کو بھی بدل ڈالنے کی کوشش کی ہے جس کا نام انہوں نے آزاد غزل رکھا ہے "۔

(' تخلیقی ادب ' کراچی شمارہ ۲)
پروفیسر نظیر صدیقی

ان ساری شخصیتوں کے بیانات نقل کرنے کا مقصد ایک ہی ہے ۔ اس امر کی تصدیق کرنا کہ آزاد غزل کے موجد اور بانی مظہر امام ہیں ۔ ان گواہیوں کی ضرورت نہ ہوتی ۔ اگر ایک دو بیانات گمراہ کن نہ ہوتے ۔ پریم وار برٹنی نے (شاعر بمبئی اگست ۱۹۷۸ء) ایک انٹرویو کے دوران شاید علم سرمستی میں آزاد غزل کی ایجاد کو بشیر بدر سے منسوب کیا ۔ غالباً اسی فکری انتشار کا نتیجہ تھا کہ جگن ناتھ آزاد نے آزاد غزل کی ایجاد کا سہرا باندھنے کے لئے بشیر بدر اور کرشن موہن کے سروں کی جانب بھی نگاہ دوڑائی ۔ بشیر بدر تو مصلحتاً خاموش رہے اور کرشن موہن نے بے تکلفی سے اعلان کیا کہ انہوں نے کبھی آزاد غزل نہیں لکھی "۔

(کوہسار ' ہزاری باغ مارچ ، اپریل ۱۹۷۹ء)

گستاخ بہت ۔۔۔ روز بہار

۔۔۔ دیوانہ ہوا ہے (آتش)

اس لیے وہ "انجار بندہ" کے دعویدار کس طرح ہو سکتے ہیں۔ (اب کرشن موہن نے آزاد غزلیں لکھنی شروع کر دیا ہے۔)

مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ پہلی بار ۱۹۴۵ء میں کیا۔ لیکن وہ اس تجربے کی پذیرائی کے بارے میں مشکوک تھے۔ اس لیے مظہر امام نے خود اس تجربے کو ایک عرصہ تک خاص اہمیت نہیں دی اور نہ اپنی آزاد غزل کہیں شائع کروائی۔ "زخم تمنا" کی ترتیب کے دوران انہیں اشاعت کا خیال آیا، اور یہ آزاد غزل پہلی بار "رفتار نو" دربھنگہ کے خاص نمبر ۷۷ء میں شائع ہوئی۔ پھر اسی سال "زخم تمنا" میں بھی شامل ہوئی۔ زخم تمنا کی مقبولیت اور پذیرائی نے مظہر امام کی شعری حیثیت کو استحکام بخشا لیکن آزاد غزل کا تجربہ یا تو نظر انداز کیا گیا یا پھر اس کی بابت ردعمل ناموافق رہا۔ لیکن جب ۱۹۷۸ء میں ان کی دوسری آزاد غزل "شب خون" میں شائع ہوئی تو اہل نظر کی نگاہیں اس جانب اٹھیں اور اعتراف نے اس نئی صنف کے امکانات کا اندازہ لگا لیا۔ تجربے کیا۔ اور آہستہ آہستہ مختلف شعراء اس صنف میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ ایسے شعراء میں کرامت علی کرامت، ظفر اقبال، زبیر شفائی، یوسف جمال، بدیع الزماں خاور، علیم صبا نویدی اور سلیم شہزاد کو اولیت حاصل ہے۔ اور اب یہ صنف اتنی مقبول ہو گئی ہے کہ بہت مشتق شعراء اسے اپنے جذبات و محسوسات کے اظہار کا وسیلہ بنا رہے ہیں۔ اس فہرست میں فیض احمد فیض، حرمت الاکرام، کرشن موہن، کرشن کمار طور، مناظر عاشق ہرگانوی، مہدی جعفر، مظفر ابرج، فاروق ناز جیسے نئے پرانے شعراء شامل ہیں۔

مظہر امام نے آزاد غزل کا تجربہ محض تجربے کی خاطر نہیں کیا۔ آزاد غزل ان کی مجبوری بھی نہیں تھی۔ ان کا شمار جدید اردو غزل کے معماروں میں ہوتا ہے اور وہ نظم کے ساتھ ساتھ غزل کی ایک مستحکم اور توانا آواز ہیں۔ انہوں نے اردو غزل کو نیا مزاج، نئی آرزو مندی، نئی جہت اور نیا ساز و آہنگ عطا کیا ہے۔ فن عروض پر ان کی گہری نگاہ ہے اور وہ غزل کے مزاج سے کما حقہ آگاہ ہیں۔ زبان پر بھی ان کی گرفت مضبوط ہے اور وہ شعری اظہار پر قادر ہیں۔ اردو غزل میں مظہر امام کا لہجہ دھیما، آہستہ آہستہ کھلنے والا ہے۔ جو انفرادی خصوصیت عطا کرتا ہے۔ مظہر امام کی انفرادیت اس میں ہے کہ انہوں نے جدید حسیت کو برتنے کے لیے مناسب ترین پیرایۂ اظہار تلاش کیا ہے۔ یعنی وہ پیرایۂ اظہار جو صرف انہی سے مخصوص ہے۔ آزاد غزل بھی ان کا ایک پیرایۂ اظہار ہے۔

مظہر امام مخصوص اسلوب اور منفرد لہجے کے شاعر ہیں۔ الفاظ ان کی صحبت میں تازگی اور درخشندگی سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ان کی پوری شاعری میں ایک جذباتی سلیقہ اور ایک فکری لطافت ہے۔ ان کی غزلیں زندگی کی قوس قزح کو اپنے دامن میں سمیٹ کر اشعار کو خاص رنگارنگی عطا کرتی ہے۔ انہیں یہ اعتبار اس لیے حاصل ہے کہ ان کی فکر، ان کا جذبہ اور ان کا احساس ان کے اپنے ہیں اور وہ انہیں حسن و کیف کے ساتھ شعری جامہ پہنانے کی پوری اہلیت رکھتے ہیں۔

مظہر امام کے نزدیک آزاد غزل کی صنف کا پہلا جواز یہ ہے کہ یہ شاعر کو غیر ضروری الفاظ کے استعمال سے محفوظ اور شعر کو حشو و زوائد سے پاک رکھتی ہے۔ انہوں نے ایک شعر اس طرح کہا تھا۔

یوں بھی جی لیتے ہیں اس دہر میں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی!

پھر انہیں احساس ہوا کہ اس شعر میں "اس دہر میں" کا ٹکڑا تلمیح غیر ضروری اور فاضل ہے۔ لہٰذا انہوں نے اسے آزاد غزل کا شعر بنا دیا:

یوں بھی جی لیتے ہیں جینے والے
کوئی تصویر سہی آپ کا پیکر نہ سہی

مظہر امام آزاد غزل کے شعر کو تکمیل خیال کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ایک غزل گو بھی کبھی صنفی مجبوری کے تحت اپنے مافی الضمیر کو پوری طرح ادا نہیں کر سکتا کیونکہ وہ ارکان کی قید میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے خطوں کے سب رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات ــــ!!

اسے اگر پابند شعر بنایا جائے تو اس طرح ہو سکتا ہے ؎

صبح کا تڑکا ہوتے ہوتے اڑ جاتے تھے رنگ
جاگ کے تجھ کو خط لکھتے تھے آدھی آدھی رات

ظاہر ہے کہ یہاں "لفظوں کے سب" فاضل نہیں بلکہ قطعی ضروری ٹکڑا ہے اور اس کے بغیر نہ صرف یہ کہ مفہوم صحیح طور پر متعین نہیں ہوتا بلکہ مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔

مظہر امام اپنی پابند غزلوں کی طرح اپنی آزاد غزلوں میں بھی "جدید حسیت" کے پیکری اظہار کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کی پیکر تراشی اپنی ایک علاحدہ شان رکھتی ہے۔ وہ فضا سازی کا فن جانتے ہیں اور اس کی بنا پر اپنے قاری کو مسحور کر لیتے ہیں ؎

آہ رے جسم تک آ، ابر طرح دار کی طرح
یہ تو معلوم ہے تو چھانک نہ پائے گا مری روح کے اندر نہ سہی

بیچ سڑک کے ہونے والے کھیتی میں مصروف
اچھے جانے کتنے پہر سے زخموں کی برسات!
وہ کیا انکی نار کریں اب چہرے پر آنکھیں ہی نہیں
پہلے دے کے خوش ہوتے تھے اشکوں کی سوغات!

شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا یہیں رہتا تھا

مظہر امام ایک مخصوص معنی میں علامتی شاعر نہیں ہیں۔ ان کے یہاں وہ علامتیں نہیں ملیں گی جو کثرت استعمال سے گھس گئی ہیں اور اب ان پر کلیشے کا (ئے اسے اے) اطلاق ہوتا ہے۔ ان کی علامتیں اپنی سادگی کے باوجود ایک خاص نوع کی صلاحیت رکھتی ہیں ؎

پھول ہوں زہر میں ڈوبا ہوا پتھر نہ سہی
دوستو میرا بھی کچھ حق تو ہے چھپ کر سہی کھل کر نہ سہی
پھر سوال آج یہی ہے کہ ملے بودھ کو کیسے نروان
مسئلہ زندگی و موت کا چکر نہ سہی

ان کے دل میں رخشندہ ہیں الہامی آیات
وقت کے بھاری شانوں پر وہ رکھ کر دیکھیں اپنا ہات
خاک اڑتی ہوئی دیکھی تو دلوں کی یاد آئی
کیا یہاں کوئی حسیں رہتا تھا

مظہر امام کی آزاد غزلوں کے بعض اشعار میں ڈرامائی کیفیت ہے حرکت و عمل کے اظہار کو جز اس اس شعر میں بھی ہوتا ہے ؎

کتنا گرم لہو ہے اپنا، دنیا کو بھی دیکھنے دیں
رکھنا ہونٹ پہ ہونٹ اور دینا ہات میں ہات

لیکن باقاعدہ ڈرامائی صورتحال ' مکالمہ' حرکت و عمل وغیرہ کو غزل کا شعر کس طرح بنایا جا سکتا ہے یہ دیکھنا ہو تو مظہر امام کی پہلی آزاد غزل کا یہ شعر دیکھیے م

ہائے وہ ایفائے وعدہ کی تجز غیر یاں
انکی آہٹ پر ہی گھر کا کونہ چیخ اٹھا تھا کہ " اچھا آپ ہیں "

اس سے بہتر' اس سے زیادہ خوبصورت مثال اس شعر کی ہے سہ

" آج ہوا سو ہوا تھا (میں اپنے گھر کی بیٹی ہوں)
دیکھو پھر مت کرنا ایسی ویسی بات! "

یہ ایک مکمل نظم ہے' ایک ڈرامہ' ایک منظوم افسانہ!

مظہر امام کی آزاد غزلوں میں جہاں منفرد احساس و جذبہ اور تازہ فکر و خیال کی جھلکیاں ملتی ہیں ۔ وہاں یہ غزلیں اپنی سادگی و پرکاری کے اعتبار سے بھی متوجہ کرتی ہیں ۔ مظہر امام کی زبان شستہ اور سادہ ہونے کے باوجود پُر وقار ہے ۔ ان کے یہاں زبان کی ظاہری آرائش پر زور نہیں ہے ۔ وہ دور از کار، فارسی ترکیبوں' بے معنی استعاروں اور غیر ضروری صفات (ADJECTIVES) کے استعمال سے اجتناب کرتے ہیں' اس کے باوجود ان کے اشعار میں ایک ساحرانہ قوت ہوتی ہے' جو قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے سہ

سانس لینا ہی اگر زیست کا معیار بنے
یہ بہت ہے کہ فلک سر پہ رہے ورنہ سبھی گھر نہ سہی
تو جو مائل بہ کرم تھا تو زمانے کا مجھے ہوش نہیں رہتا تھا
میں کہ خود سر تھا' تیرے زیر نگیں رہتا تھا
دل سے بے ساختہ بہتے ہوئے آنسو کا سفر جانے کس منزل پہ ختم ہوا
کون ویران مکاں دیکھ کے پوچھے کہ یہاں کون مکیں رہتا تھا

مظہر امام نادیدہ ساحلوں کے کہر میں اپنے آپ کو گم نہیں کر دیتے بلکہ وہ تیز رو موجوں میں اپنی امیدوں کا بادبان کھو لینے کی سعی بھی کرتے ہیں سہ

آرزوں کی اندھیری رات میں
میرے خوابوں کے افق پر جگمگایا جو ستارا ' آپ ہیں

مظہر امام کی غزلیں آزاد ہونے کے باوجود نغمگی غنائیت اور مٹھاس سے لبریز ہیں یہی نغمگی اور غنائیت دلوں کو متاثر اور مسحور کرتی ہے ۔ مظہر امام نے آزاد غزلوں میں بھی اپنی پابند غزلوں کا سارا اسلوب اور آہنگ برتا ہے ۔ وہ الفاظ کے بلیغ استعمال کا گر جانتے ہیں ۔ اور روایت کی رعنائیوں کو بھی جذب کرنے کے ہنر سے واقف ہیں ۔ جمیل مظہری نے لکھا ہے

" مظہر امام ندرت بیان کی تلاش میں ہماری خانگاہ سے آگے جانے کی کوشش تو کرتے ہیں لیکن پیچھے مڑ مڑ کے دیکھتے بھی جاتے ہیں ۔ وہ شاعر حال نہیں بلکہ شاعر مستقبل ہیں لیکن ماضی کے قدیم اقدار بیان و زبان کی طرف سے انہوں نے اپنی آنکھیں کہیں نہیں موندی ہیں ۔"

اس بیان کی صداقت کا ثبوت مظہر امام کی پابند اور آزاد دونوں طرح کی غزلوں سے ملتا ہے وہ اپنی آزاد غزلوں میں وسعت' برجستگی اور متانت کے ساتھ ساتھ کلاسیکی رچاؤ بھی پیدا کرتے ہیں ۔ وہ بنیادی طور پر جذبے کی گداختگی کے شاعر ہیں ۔ جو ان کے لطیف احساس جمال کا پروردہ ہے ۔ ان کا عشق ان کی قوت ہے جو ان کے زخموں کو بھی کیف آفریں بناتا ہے سہ

وہ دور سے دیکھ ابلتا ہوا ناکام امیدوں کا دھواں
وہ آسی جلتے ہوئے گاؤں کا شہری تھا' یہیں رہتا تھا

آزاد غزل کی بقا، فروغ اور ترسیل کے سلسلے میں حضرت عتیق احمد عتیق نے بھی کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں ۔ "قلم" اور "اسباق" میں موصوف کی متعدد آزاد غزلیں شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں ۔

جمشید پور میں ظفر ہاشمی بھی آزاد غزل کی بھرپور نمائندگی کر رہے ہیں ۔ ظفر صاحب نے اس فن کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رکھا ہے بلکہ اپنے تلامذہ کو بھی اس صنف سخن پر طبع آزمائی کی ترغیب دے رہے ہیں ۔

نیز پونہ میں رشید اعجاز ' طاہر اور نذیر فتح پوری بھی آزاد غزل پر طبع آزمائی کر رہے ہیں ۔ (ادارہ)

گلشن بہار پہ تھا ستم بنا لیا   میں کیوں ہوا اسیر مرا کیا قصور تھا (ثاقب)

تو جو مائل بہ کرم تھا، تو زمانے کا مجھے ہوش نہیں رہتا تھا
میں کہ خود سر تھا، ترے زیرِ نگیں رہتا تھا

شاخ در شاخ گلابوں کی دھنک پھوٹی ہے
اک پرندہ تھا، یہیں رہتا تھا

دل سے بے ساختہ بہتے ہوئے آنسو کا سفر آنکھ کی منزل سے پرے ختم ہوا
کون ویران مکاں دیکھ کے پوچھے کہ: "یہاں کوئی مکیں رہتا تھا؟"

خاک اُڑتی ہوئی دیکھیں تو دلوں کی یاد آئی
کیا یہاں کوئی حسیں رہتا تھا؟

رات آنکھوں میں جیالے کے گذر جاتی تھی
نشۂ شوق بہت چیں بہ جبیں رہتا تھا

دور سے دیکھو اٹھتا ہوا ناکام امیدوں کا دھواں
وہ اسی جلتے ہوئے شہر کی گلیوں میں کہیں رہتا تھا

مظہر امام

سایہ پھیلے تو اسے دھوپ کی چادر کہئے
چڑھتے سورج کو پھر اک ڈوبتا منظر کہئے

بات تو جب ہے کہ رنگوں بھرے ہر خاکے کو بے رنگ سا پیکر کہئے
سادہ اوراق کو "اوراقِ مصور" کہئے

زہرِ لب کو ترے کیوں قندِ مکرر کہئے
اور اپنے لبِ احساس کو پتھر کہئے

اپنی دھرتی کو کبھی پیار سے امبر کہئے
کبھی آکاش سے بڑھ کر کہئے

خود کو روتے ہوئے کانٹوں سے ملا کر نظریں
کیوں نہ اے دل ترے ہنستے ہوئے زخموں کو گلِ تر کہئے

دشتِ امکاں کو بیک جست جو پھاند آتی ہوں
ان تمناؤں کو کس منہ سے پس افتادہ سا لشکر کہئے

اس سے پہلے کہ ملیں فکر کے بونوں سے عتیق
کیوں نہ اپنے ادبی قد کو قد آور کہئے

نیا پورہ،
مالیگاؤں
ناسک۔
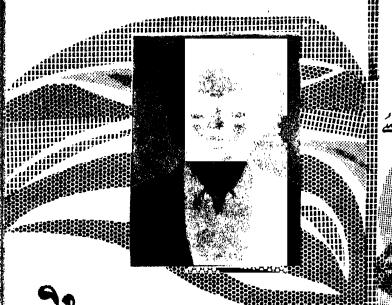
جو تم خود کو سمجھ لیتے
تو دنیا کو بہ آسانی پرکھ لیتے

ہم اپنے لب جو تیرے لب سے متھ لیتے
تری آواز کی لذت بھی چکھ لیتے

نہ بجھتی پیاس اگر ان برف سی دھوپوں کو پی کر بھی
تو ہم چپکے سے اپنے منہ میں انگارہ ہی رکھ لیتے

چرا لیتے وہ اپنا آئینہ ایسا بدن، اس سے تو بہتر تھا
مجھے پتھر سمجھ لیتے

وہ سورج کے سفر میں کاش اپنا ہمسفر ہوتا
تو ہم اس کے لئے بھی اک دھنک سا چاند رکھ لیتے

حریف اپنا یہاں پھر کون رہ جاتا
جو ہم خود سے الجھ لیتے

وہ جس کے اُجلے اُجلے بازوؤں میں جھول آئے ہو
عتیق اپنی نظر میں اس کی پرچھائیں تو رکھ لیتے

اک پرتو دلکش ہے خیالوں کے اثر کا — خود حسن حقیقت نہیں دھوکا ہے نظر کا۔ (وجد)

دبدھا خلیج پاٹ
تیرہ مہیب فاصلے ذہنی سفت کاٹ
لیا ہے جسی محیط ہوئی عہدِ شیب میں
نیندیں ہوئیں اُچاٹ
یونہی تو پختگی نہیں آئی شعور میں
گھومے ہیں گھاٹ گھاٹ
لطفِ سخن ہے درخورِ اہلِ دل و نظر
سمجھیں گے کیا غوامضِ فن کو گنوار جاٹ
سامانِ عیش کل تھا میسر جہاں وہاں
سناٹا چھا گیا ہے اور اوندھی پڑی ہے کھاٹ

کرشن موہن

پابندِ غزل، آزادِ غزل
دکھتے دل کی فریادِ غزل
دل صید اِس کا
صیادِ غزل، ہے شوخ ستم ایجادِ غزل
تخئیل اِس گھڑی جیوتی ہے، رس موتی ہے، احساس کے باعث ہوتی ہے
آبادِ غزل
ہے گرمئ دل کا گنجینہ، یہ عشق و ہوس کا آئینہ
تقوے کا اِستردادِ غزل
جذبوں کی مدھم موسیقی سے
کرتی ہے دل کو شادِ غزل
ہے میری انیسِ تنہائی
زندہ، تابندہ بادِ غزل!
لمحے کو عطا کرتی ہے دوام
گاہے حسرت، گاہے حیرت، گاہے عشرت اور مستی کی بنیادِ غزل
ہر صیدِ خرد کرشنا موہن
اور عہدِ جنونِ رفتہ کی ہے یادِ غزل

احساس کے تپتے ہوئے صحرا کی دعا ہے
وہ پیڑ جو مسمار شدہ شہر کے ملبے پہ اُگا ہے

اللہ کرے تجھ کو سکوں راس نہ آئے
بہتا ہوا دریا ہی سمندر سے ملا ہے

میں تجھ سے خفا تو نہیں مغموم ہوں لیکن تری ناکامی پر
خاموش نگاہوں کو پڑھے تو تو تسلی کی صدا ہے۔

کیا ضبط محبت کی مرے داد نہ دو گے
چہرے پہ سکوں، بزم میں بیگانگی اور دل میں تلاطم سا مچا ہے

ہم ذات کے قیدی ہوں تو کچھ کر نہ سکیں گے
دم گھٹتا ہے اندر، چلو باہر، بڑی شاداب فضا ہے

تحلیل مشینوں کے دھوئیں میں ابھی ہو جائے گی ثانی
بکھرے ہوئے انسان کے ہونٹوں کی صدا ہے۔

مرحومہ زرینہ ثانی

منزلوں تک رسائی سے محروم تھے، آرزوؤں کے کتنے حسیں قافلے
یا خدا خیر ہو، پھر وہی راستے پھر وہی مرحلے

قیس و وامق سے کہہ دو کہ آباد ہیں اب بھی وہ راستے
سرنگوں دل سے صحرا میں پھر گل کھلے

ہم نے سوچا تھا، انکے تغافل کا بدلہ تغافل سے لیں
اس غلط زعم میں دن بدن بڑھ گئے فاصلے

موت کے آئینے میں رخِ یار کی اک جھلک دیکھ لیں!
اس تمنا میں مرتے رہے دل جلے
تم بھی اقدار کہنہ کو جانے دو، روحانیت پر پڑھو فاتحہ
ثانی اخلاق کو بھی مشینوں سے ناپیں گے اس دور کے منچلے

تنظیم رنگوں کی کہتا ہے اشارے میں وہ باتیں   ہے لطف خموشی میں تکلم سے زیادہ (ثانی)

علیم صبا نویدی

سامنے ہوگا مقدر کا لکھا
مٹ نہیں سکتا مٹائے سے وہ پتھر کا لکھا

میرے فکری زاویوں کی ہر کرن مدھم سہی
رنگ لائے گا مرے سر کا لکھا

وقت ہی بتلائے گا
کس قدر منحوس تھا اس زرفشاں گھر کا لکھا

گو مرے ماحول سے قائم مرا رشتہ نہیں ہے دوستو
کتنی صدیوں پر ہے روشن میرے اندر کا لکھا

کوہساروں کو نگلتے بادلوں میں
تھا نمایاں کس قدر طوفاں کے تیور کا لکھا

چھت کے سوراخوں سے سورج نے بھی دیکھا رات بھر
جل رہا تھا سبز بستر کا لکھا

آرزو دشت کی صورت ہی مرے گھر پھیلی
اور کبھی بن کے مقدر پھیلی

زہر آلودہ سسکتی اِک نوا
کھوکھلے جسم کے اندر پھیلی

بن گئی ارض و سماوات کا غم آہستہ
جو کرن شام کے لب پر پھیلی

تیرے بیمار تبسم کی سبک تر خوشبو
کیوں سرِ بستر پھیلی

حدِ آفاق تلک آج صبا
بھاگ کی روشنی مانند سمندر پھیلی

۲۶ امیر النسا بیگم اسٹریٹ، مدراس ۲

بدیع الزماں خاور

لاکھ میرا جنوں مجھ کو لے جائے عرشِ بریں کی طرف
لوٹ آؤں گا میں پھر زمیں کی طرف

روشنی جو بھی ہے میرے سینے میں ہے میرے سجدوں کا انکو نشاں کیا ملے؟
جن کی نظریں ہیں میری جبیں کی طرف

اے غمِ زندگی! اے غمِ زندگی! نام تیرا زمانے میں اونچا رہے
اور اک وار قلبِ حزیں کی طرف

تر نظر آئے گی [آنسوؤں سے ہو یا خون سے]
آنکھ اٹھاؤ کسی آستیں کی طرف

اب کریں بھی تو فریاد ہم کیا کریں، یہ سماں ہے عدالت میں پیش نظر
ہم ہیں جنکی جفاؤں کے مارے ہوئے سب کے سب لوگ ہیں اس حسیں کی طرف

کیا بتاؤں میں کیسے ہیں دیوار و در! کوئی مجھکو نہیں ہے مکاں کی خبر
دھیان جب سے گیا ہے مکیں کی طرف

میری قسمت سے خاور کسی دن جو آقا بلالیں مجھے
سر کے بل جاؤں گا ارضِ کوکن سے میں مصطفٰے کے دیارِ حسیں کی طرف

مناظر عاشق ہرگانوی

روبرو ہے میرے مجھے کچھ خبر نہیں ہے
ابھی معتبر نہیں ہے

میرا دل تو رو رہا ہے یہ کمالِ ضبطِ غم ہے کہ سلیقۂ محبت
مگر آنکھ تر نہیں ہے
بہت آفتاب چمکے
ابھی تک سحر نہیں ہے
غمِ جستجو کے صدقے وہ مقامِ دل بھی آیا
بجز خیالِ جاناں کوئی ہمسفر نہیں ہے

کوئی ان سے کہہ دے عاشق
منزل کا ڈر نہیں ہے

مارواڑی کالج،
بھاگلپور۔ بہار۔

یوسف جمالؔ، راج گانگ پور، اڑیسہ ۱۷۔۔۔

وہ تجھے موت کا خوں آفریں فرمان سنا ہی دیگا
رحم کھا کر تو جسے منصب شاہی دیگا
ادب، محرومی، گھٹن، خوف، تباہی دیگا
جملہ سرمایہ مرا عہد ہراک فرد کے ہاتھوں میں تھما ہی دیگا
جنگ، افلاس، اجل، قتل، جراحت، ظلمت
یہی سوغات تجھے ایک سپاہی دیگا
سبز رنگوں کا جو اک شہر سکوں کے لئے آباد کیا تھا میں نے
کیا پتہ تھا کہ وہ اک سیاہی دیگا
تو نے جس ذرے کو چمکایا تھا، احسان کیا تھا جس پہ
کیسکو معلوم تھا، اک دن تجھے پھانسی پہ چڑھا ہی دیگا
خواب کے ریت پہ نیندوں کے سرابوں سے میں کھیلوں گا جو کھیل
وہ فقط ایک غم لامتناہی دیگا
دھوپ کی باہوں میں یہ سوچ کے میں پڑا رہتا ہوں جمالؔ
چھاؤں میں ان کی جو بیٹھے گا، دغا ہی دیگا

بارشوں سے مرے گھر کی دیوار ہلنے لگی
ذہن پر موت کی کالی تلوار ہلنے لگی
زندگی کی شکستہ سی کشتی میں بیٹھا ہی تھا میں کہ طوفان میں گھر گیا
درد کی گونگی موجوں کے تیور بگڑنے لگے، اکھڑی سانسوں کی پتوار ہلنے لگی!
آخرش کربِ تخلیق کے زہر کا ذائقہ چکھ کے مر تو گیا وہ مگر
نامکمل سی جو ایک تخلیق تھی، دفعتہً بن کے شہکار ہلنے لگی!
بات اتنی سی ہے، سر کے اوپر جو تلوار ہے خندہ زن
کب گرے اور قصہ کرے پاک وہ، جو ہواؤں سے ہر بار ہلنے لگی!
کون آیا یہاں جو کہ آئے گا اب؟
ہے ہواؤں کی دستک کا مجھ کو پتہ، گھر کی زنجیر بیکار ہلنے لگی
راکھ کے نیچے دبکی سی چنگاریاں، بن نہ جائیں کہیں شعلہ یہ دیکھا
خوف سے بوڑھی سرکار ہلنے لگی۔

گھر کے وہ بے رحمی حالات کے چنگل میں ایسا ہو گیا
محفلوں کے شور میں گم ہو گیا، تنہائیوں میں کھو گیا
کیا خبر تھی، مبتلا اس کو عذابِ دردمیں کرے گا یہ ظالم قلم
مرثیئے لکھ لکھ کے اوروں کے، وہ اپنی جان کو خود رو گیا
خواب کی تعبیر کب تک ڈھونڈتا
درد کی باہوں میں باہیں ڈال کر وہ سو گیا
اوّل اوّل گامزن تھا خوشبوؤں کی راہ پر موسم کا بے پرواہ سفیر
اور پھر کانٹوں کے کمرے میں مقید ہو گیا
آکے ٹھہرا ہے ہوا کی پیٹھ پر خونی چٹان
گر پڑے گی اس کے اوپر، بیج اس کے جو گیا
روز کی مانند آکے رات، ساری فصل دن کی چر گئی
اور سویرا ہوتے ہی سورج نکل کر جسم کی دھرتی پہ سایہ کالا کالا بو گیا
جینے جی کیا پوچھتا کوئی مگر کرنے لگے کن کن طرح کے تبصرے
ریل کی پٹری پہ سو کر زندگی سے ہاتھ جب وہ دھو گیا
گھر کے اندر سانس بھی لینا ہوا مجھ کو محال
کرب کے زہریلے کیڑے پھینک کر وہ تو گیا

آلفت بھی عجیب شے ہے جو درد وہی دیتی / یاں نہیں گر جلتا ہوا پروانہ (آرزو)

ظفر ہاشمی

فرازِ ہستی کے سلسلے میں زمین ایسے اڑان میں تھی
نہ جسم اپنے حصار میں تھا نہ روح اپنے مکان میں تھی
تمہارے گھر سے میں جب چلا تھا
نہ راستے میں سواریاں تھیں نہ بھیڑ کوئی دکان میں تھی
وہ ایسی سرحد پہ رہ رہا تھا
کسی کا گھر آسمان میں تھا کسی کی بستی ڈھلان میں تھی
ہزار گوشے ابھر رہے تھے، ہزار گوشوں پہ غور کرنے کی دعوتیں تھیں
غزل ہی ایسی علامتوں کی زبان میں تھی
نہ لمسِ پہلو، نہ رنگ جگنو، نہ پھول خوشبو
وہ زندگی بھی چٹان میں تھی
وہ روشنی کا بدن تھا ایسا فصیلِ شب بھی شکستہ پا تھی
سحر کی رنگین وادیوں میں ہیولۓ لذت بھی رقص کرکے تکان میں تھی
وہ سنگِ مرمر کی لاش تھا اک
کہ ریزہ ریزہ بھی خواب تھا پر رمق بھی کوئی نہ جان میں تھی
نہ عکس کوئی، نہ آئینہ ہی، نہ پیکرِ گل
صعوبتوں کے سفر میں لیکن ظفرؔ بھی منزل نہ نقشِ پا کے امان میں تھی

گھر سے باہر جاتی ہے جب وہ بھی کوئی دوشیزہ
راہوں کا شہزادہ اس کا بکھرا دیتا ہے شیرازہ
تم اس کی کراہیں کیا سمجھو، تم اس کی چیخیں کیا جانو
باہر باہر چٹان ہو جو، اندر اندر ریزہ ریزہ
حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہے جب بھی گھٹن
کھولنے والا کھول ہی لیتا ہے کمرے کا دروازہ
ایک کنارہ ہوتا تو کچھ بات نہیں، کتنے کنارے ڈوب گئے
جوش میں آئے دریا کا تم کر سکتے ہو اندازہ
وہ حسن ہے تیرے جیسا سادہ، پیار میں جس سے کرتا ہوں
زلف میں اس کے پھول نہیں، چہرے پر نہ کوئی غازہ
جسم کا منظر دھانی دھانی، آنکھ نشیلی، ہونٹ گلابی
آج کے دن تو کھڑکی کھولو کھالو ہوا کچھ تازہ تازہ
عمرِ رواں سرمائے، کرب، کراہیں، چیخ، گھٹن
آج بھگتنا پڑتا ہے جینے کا خمیازہ

قفس میں دیتے ہو کیا طعنِ پست پروازی فضا کھلی ہوئی تھی تو امتحاں ہوتا (اقبال ساجد)

کرشن کمار طور

تماشہ دیکھوں کہ عکسِ تہہ آب لکھوں
حالِ دلِ خراب لکھوں
جہاں کو ضد ہے کہ زیست ہے پیلاہٹ سرسوں کی
میری خواہش کہ رنگِ رخِ گلاب لکھوں

دونوں کا ایک ہی حاصل
آنکھیں بند کروں یا عکسِ سراب لکھوں

ظاہر کو بے وجہ سمجھوں عدم وجود
اس کے لطف کرم کو کیا سوچ کے رنگِ عتاب لکھوں

طورؔ اس سنگلاخ زمیں کو کب تک موم کروں
حیات کو آخر کب تک حساب لکھوں

حصیر نوری

جنرل سیکریٹری حلقۂ فکر و دانش، بنگلہ دیش

تمہاری یادوں کے ٹمٹماتے ستارے پلکوں پہ جل رہے ہیں
انہیں ستاروں سے ہم بھی لیکن بہل رہے ہیں

سحر سے بھولا ہوا ہے سورج کو آج دن
چراغ اجالے اگل رہے ہیں

مری حقیقت نہ مجھ سے پوچھو
تمہارے چہروں پہ نفرتوں کے حقیر سائے مچل رہے تھے مچل رہے ہیں

ہر ایک صحرائے خاک و خوں سے شکستہ خاک کے
نشاں وجودِ خودی کا لیکر نکل رہے ہیں

مصیبتوں نے افق سے سورج اتار لاؤں میں کیسے جاکر
زمیں کے نقشے بدل رہے ہیں
جدید میخانہ کھل گیا ہے
ابھی نئے ساغروں کے سانچے میں کہنہ خم خود ہی ڈھل رہے ہیں

حصیرؔ احساس کی بلندی سے گرنیوالے
سنبھل رہے ہیں!

سردار ایاغ

۲۲۷ جین ٹمپل روڈ بنگلور ۵۶۰۰۵
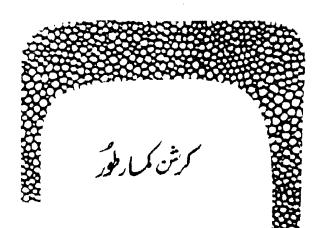
لوگ کیوں آج کے فن کاروں سے
گفتگو کرتے ہیں تنقید کی تلواروں سے

کون یہ ڈھال بنا شعلہ و شبنم کے بیچ
دشمنی مول لی انگاروں سے

سرخیاں پھیلی ہیں ہر چہرے پر
حظ اٹھانے کی ضرورت نہیں اخباروں سے

ان پرندوں کو سزا دی جائے
بوسے لیتے ہیں کھلے عام جو منقاروں سے

دیپ روشن کرو آندھی کی ہتھیلی پہ ایاغ
تاکہ تلوے نہ چھلیں خاروں سے

کاظم نائطی

بڑی وحشتیں تھیں، صدائیں بہت تھیں
مرے گرد و پیش ایسی ہنگامہ آرا فضائیں بہت تھیں

بُرے لفظ نوکِ زباں پر جو لاتے تامل تھا ہم کو
مجھے کو سنے کو دعائیں بہت تھیں

نگاہوں کی پوروں پہ آبی بدن کی جو لاشیں پڑی ہیں
انہیں بس کسی کی دکھتی نظر کی چتائیں بہت تھیں

میں شرمندہ اپنے کئے پر بہت تھا
مری نیکیوں کی جگہ گھیرنے کو خطائیں بہت تھیں

مخاطب کئی لوگ تھے ہم سے کاظم
مگر گفتگو میں انائیں بہت تھیں

حسن فیاض

اس کی جانب ہی سے پہلا وار تھا
وہ تو میرا یار تھا

سوئے منزل جو نظر اٹھتی تھی وہ حیران تھی
مصلحت کی طوق پہنے ایک قیدی، جانا پہچانا نحیف و نزار تھا

زخم ہائے دل، چراغ جادۂ منزل نما تھے ضو فگن
سوچ کا چہرہ انہیں کے دم سے تو گلنار تھا

لفظ و معنی سے پرے منزل جو تھی پہنچا وہاں تو یہ لگا
عمر بھر میں نے اثاثہ جمع کر رکھا تھا جو بے کار تھا

پرورش پاتا رہا تیرہ شبوں کی گود میں جو طفلِ ذات
میرے اندر جو اُجالا ہے اسی سے برسرِ پیکار تھا

ساتھ اپنے مہرباں کوئی نہ تھا ورنہ حسن
راستہ ہم نے جو کاٹا تھا بہت دشوار تھا

ہم سے کیا ہو سکا محبت میں　　تو نے تو خیر بے وفائی کی (فراق)

غلام مصطفےٰ تبسم، جمشید پور

آج ہماری دھڑکنوں کو جب بھی کوئی محسوس کریگا
ہاتھ رکھیگا دل پہ وہ اپنے خود ہی انہیں محسوس کریگا!

مل نہ سکے گی تھاہ اسے بھی
خود کو سمندر سے نہ کبھی مانوس کریگا

شام کی رونق رکھ کر گھروں میں
کل کا سویرا اور تمہیں مایوس کریگا

گرم ہوائیں چلنے لگی ہوں خوف سے جنگل کانپ رہا ہو
کیسے کبھی پھر رقص کوئی طاؤس کریگا

شمع محبت جانتی کیا تھی
خود ہی محل میں آگ لگا کر جشن کبھی فانوس کریگا

آج کی ہی یہ بات نہیں ہے
کل بھی تبسم خون سے لب ملبوس کریگا

انجان علیم، جمشید پور

تجربے کی وہ کرن در آگئی ہے آئینہ در آئینہ
ہر تمازت زندگی پینے لگی ہے آئینہ در آئینہ

غیر کی چوکھٹ پہ سجدے دیکھ کر
شرمگیں انسانیت کی روشنی ہے آئینہ در آئینہ

ہیں گلِ رعنا کی باتیں سنگ سنگ
بے بسی ہی بے بسی ہے آئینہ در آئینہ

رات کے پچھلے پہر جب عکس کوئی مل گیا
کرچیاں خوابوں کی دنیا دیکھتی ہے آئینہ در آئینہ

ڈوبتا سورج نیا دیتا ہے پھر اس صبح کا
جو نئے انداز سے کل آرہی ہے آئینہ در آئینہ

وہ ادائے زندگی بھی جو نظر سے دور تھی
آج عریاں ہو رہی ہے آئینہ در آئینہ

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں (اقبال)
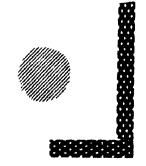
تم نہیں تھے تو چپہ شاخِ احساس پر چہچہاتا ہوا طائرِ خوش گلو کون تھا
نغمہ جو کون تھا
غم اٹھاتا ہوا، درد سہتا ہوا
وقت و حالات کی آندھیوں میں گھرا، میں کہ تو، کون تھا
جو ہواؤں سے لڑتا رہا عمر بھر
کارزارِ حقیقت میں اس سے بڑا جنگ جو کون تھا
کون سمٹا ہوا تھا مرے دل کے گوشے میں تیرے سوا
اور پھیلا ہوا چار سو کون تھا
تو نہیں تھا تو پھر اپنے ہونے کا اعلان کرتا ہوا
انجمن انجمن کُو بہ کُو کون تھا
دل کی انگنائی سرسبز و شاداب تھی کس لئے
کشتِ جاں میں مہکتا ہوا وہ گلِ رنگ و بو کون تھا
میرے اپنے سوا
میرا اپنا عدو کون تھا
سب کے ہونٹوں پہ تھیں تشنگی کی لکیریں نذیر
کیا بتاؤں کہ رنگِ سبو کون تھا

لہو کی گرمی سے زندگی کی علامتوں کے پیام جاگے
بنامِ طرزِ کلام جاگے
ہمارے جیسے کہاں ہیں جن کے
دلوں کو دردیلی صبح دیکر لبوں پہ آہوں کی شام جاگے
وہ بند کمرے میں سو رہا ہے حسین خوابوں کی چاہتوں میں
مگر ہیں اس کے مکانِ دل کے تمام سقف او ربام جاگے
یہ کیا کہ سوئی ہوئی تمنائیں میرے دل کے کھنڈر میں انگڑائی لیکے اٹھیں
زباں پہ جب تیرا نام جاگے
تمہیں علامت ہو زندگی کی
تمہارے ہنسنے سے دھوپ پھیلے تو مسکرانے سے شام جاگے
یہ کیسی نیندوں کی رت ہے جس کی خنک فضا میں
رفاقتوں کے امام سوئے رقابتوں کے غلام جاگے
قدم سے بچھڑے قدم کے سلسلے
دلوں کی پگڈنڈیوں پہ آکر نہ جانے کیا کیا مقام جاگے

یہ حالت ہو گئی ہے ایک ساقی کے نہ ہونے سے — خم کے خم بھرے ہیں مئے سے اور میخانہ خالی ہے (انور عظیم)

رشید اعجاز

۹۸۴، بھوانی پیٹھ پونا ۲۔

دائرے، نقطے، لکیریں، بہ بیئے پرچھائیاں
کچھ نہیں ہیں سوچ بن کی لکھائیاں
مجھ سے ہے ناموس قرطاس و قلم
میں نے کاغذ پر اتاری روح کی گہرائیاں
کاٹ لفظوں کی اگر پڑ کاؤں تو کھل جائیں گی
سب کی سب گہرائیاں گیرائیاں
اپنی خاطر لفظ لا
میری خاطر آسماں پہنائیاں
تیرے نبضیں ہی نہیں پھر کیا سوال
میں تو زندہ ہوں، مرا حق نیند کی رعنائیاں

عطار مہر ذوالبہرق

رشوتوں کی آگ میں سوکھی نظر جل جائے ہے
نفس کیا آزاریاں دکھلائے ہے

خون کی نہروں پہ ہے شداد وقت
نبض کی آزادیاں مرجھائے ہے

جب ہوس کی رگ میں بہتا ہو لہو زہر آب سا
کون کس کو کس طرح سمجھائے ہے

شبنمی موتی ڈھلے اور سوکھے دامن کی کئی تنہائیاں گویا ہوئیں
درد دل کا راز کھلتا جائے ہے

سچ تو یہ ہے دائروں پہ دائرے بنتے چلے
کنکری کے ساتھ دریا سے کہ ڈوبا جائے ہے

"آئینہ گر" آئینہ میں دیکھ لے خود مہر اپنے داغ کو
عکس بھی انسان بنتا جائے ہے

اردو جونیئر کالج آف ایجوکیشن
پونہ کیمپ

محفل مے میں ہیں زاہد کے فرشتے بھی شریک · یہ تکلف تو نہ تھے بزم میں ہم سے پہلے (ریاض خیرآبادی)

باب ۸

ترتیب

میں نے کہا تھا اس سے جلانے کو اک چراغ   اس نے اسی بہانے مرا گھر جلا دیا   (ساغر اعظمی)

نئی فارسی شاعری اور شعراء[1]

ڈاکٹر رضیہ اکبر

ترجمہ: خ، زمان انصاری
ڈپارٹمنٹ فارن لینگویجیز این ڈی اے
کھڑک واسلہ، پونہ

ہم بخوبی واقف ہیں کہ اس آخری صدی میں سیاسی نشیب و فراز، اجتماعی اور اقتصادی تبدیلیوں کے باعث تمام دنیا میں، تمام دنیا کے ادب میں ایک عظیم علمی و ادبی انقلاب واقع ہوا ہے۔ ان تبدیلیوں کا لازمی اثر فارسی علم و ادب پر بھی پڑا ہے جس کے گہرے تاثرات فارسی ادب پر بہترین نتائج کے حامل ہیں۔

تغیر و تبدل، مختلف تحریکوں، ایک جیسی فضا اور مختلف النوع محرکات کے باعث بیشتر نئے شعراء اور ادیب آج دنیا کے دور دراز ممالک اور دنیا کی مختلف قوموں سے بہت زیادہ قریب آچکے ہیں۔ اسی قربت اور نزدیکی تعلقات کے سبب اس عہد کے اکثر ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تحریروں میں نئے زاویہ نگاہ، تازہ اثرات اور اچھوتے تجربات کو جگہ دی ہے۔ اور ایک نئے عہد کی جستجو اور جدیدترین دور کے لیے راہیں ہموار کی ہیں۔

آج کی اجتماعی، علمی و ادبی زندگی کے لحاظ سے عصر حاضر قدیم سے بہت زیادہ مختلف ہے اور نیا شاعر یقینی طور پر نئی طرز فکر، انداز بیان اور اظہار کے وسیلوں کی سطح پر سابقہ عہد کے مقابلے میں ایک نئی تازگی اور شگفتگی کی نشان دہی کر رہا ہے۔ نیا شاعر ان مسائل سے جنھوں نے اس کے جدید عہد کو اپنے دائرہ تصرف میں لے لیا ہے۔ نا آشنا اور بیگانہ نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ رہ سکتا ہے، دوسرے الفاظ میں ماضی کے برعکس زمانہ حال کا ہر معاملہ ایک عوامی اور اجتماعی حیثیت کا حامل ہے، جس کے تاثرات

فہم و ادراک پر پڑتے ہوئے کے ساتھ ساتھ اس کی علمی و اجتماعی زندگی سے بھی وابستہ ہیں۔ تنہا کار کو اس کی عملی زندگی کا تجزیہ و بیان کی سطح پر تعاون کر رہا ہے اور وہ شاعر جو اجتماعی شعور اور احساسات کی شدت سے بہرہ مند ہوتا ہے۔ لازماً ان تجربات و حادثات کا اثر اندرونی طور پر پہلے قبول کرتا ہے اور بعد ازاں دانستہ یا غیر دانستہ ان تجربات کو اپنی ژرف بینی اور محسوسات کے زیر اثر تخلیقی قوت کا جزو شامل کر کے ایک بہتر اسلوب، عمدہ پیرائے اور نئی شکل میں تمام کیفیات کے ساتھ منعکس کرتا ہے۔ آج کے بیشتر شعرا دنیا کی آشفتگی کو خوف و ہراس انگیزی کے ساتھ آج کے تغیر اور ترقی پذیری کا ذکر کرتے ہوئے اندرونی ابتدیات اور جدید حسیت کو نئے پیراؤں میں نمایاں کر رہے ہیں۔

جدید فارسی شاعری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ معنوی تہ داری کے اعتبار سے ایسی قدرت و فصاحت اور کثرت رنگی اور زور بیان کی حامل ہے کہ اس سے قبل کے کسی زمانے میں فارسی شاعری کی یہ وسعت نظر اور رسائی دیکھنے میں نہیں آتی تھی جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ عہد جدید کے شعراء محدود و معین کہنہ روایات شعری سے برگشتہ ہیں۔ کہن سال اسلوب و تراکیب کو ترک کرنے کے بعد نسبتاً زیادہ آزاد اور تازہ ہوا میں سانس لے رہے ہیں، چنانچہ نئے شعرا کے لیے عروض و آہنگ کا وزن کا مسئلہ ایک جستی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ان کا عقیدہ ہے کہ وزن ان کی فکر کے تابع نہیں اس میں نیاپن ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں انھوں نے مفید اور تازہ اقدامات کئے ہیں اور قدیم

طرز و جامد قیود سے خود کو آزاد کیا ہے اور وزن و آہنگ پر اپنے نئے تسلط کی نشان دہی کی ہے دوسرے یہ کہ انفرادی طور پر آج کا فارسی شاعر صرف باغ سبز کے تخیل، غنودگی اور تن آسانی میں زندگی نہیں بسر کر رہا ہے بلکہ مختلف اجتماعی اور علمی روابط کے درمیان نشو و نما پاتے ہوئے اپنے تمام تر مسائل اور ان کا حل تلاش کرنے میں بذات خود شریک ہے اور اس کا اعتقاد یہ ہے کہ شاعر کی زندگی کے کسب فیض سے وجود میں آتی ہے اس لیے اجتماعی زندگی کی رد و قدح اس کے لیے ناگزیر ہے۔

نئے شعراء کی ریاضت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ آج کی جدیدیت میں شامل ہو کر عام انسانوں کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے کس حد تک روح عصر کی نمائندگی کرتے ہوئے تمام تر انسانی سنجیدگی اور فنی حقیقت کی پاس داری کے آئینہ دار ہیں۔

ادبیات ایران میں جدیدترین کا یہ سفر، بیسویں صدی کے وسط سے شروع ہوتا ہے پچھلے پچاس سال کا زمانہ اپنی امتیازی خصوصیت کے باعث ادبی سطح پر کافی قیامت خیز رہا۔ اس دور کے تمام تر شعرا نے اپنی شاعری کے آئینہ میں کم و بیش تازہ افکار اور نئے مضامین کو نئی لفظیات، استعارات اور نئی تعبیرات کے وسیلے سے بیان کیا ہے۔ اسی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حقیقتاً آج کی فارسی شاعری روح عصر کی حامل اپنے عصر کی نمائندہ ہے۔

چنانچہ نادر پور کا یہ دعویٰ غلط نہیں ہے۔

"من اگر خوبم اگر بد ہر کہ ہستم و ہر چہ ہستم
شاعر نسل روزگار خویشم"

(میں اگر اچھا ہوں، برا ہوں، جو بھی ہوں، اور جو کچھ بھی ہوں، اپنے زمانے کا (نئی) نسل کا شاعر ہوں)

آج کے نئے شعراء کی زندگی جن حالات سے دوچار ہے۔ جیسی زندگی وہ گذار رہے ہیں، وہ واقعات و حادثات جو ان کا احاطہ کئے ہوئے ہیں عصر نو کے شعراء اپنے اطراف کے تمام حالات و محرکات کا جائزہ لے رہے ہیں اور اپنے جملہ تاثرات و تجربات کو اپنے پر اثر الفاظ میں بیان کر رہے ہیں ایک نئی دنیا کی تخلیق اور درک میں مصروف نظر آتے ہیں

[1] "بیاض" سہ ماہی، مارچ جلد: ۱ شمارہ ۴ انجمن فارسی، دہلی

جنوں کو خاک بسر دیکھنا ہی پڑتا ہے
ستم گروں کا ہنر دیکھنا ہی پڑتا ہے (صفدر سلیم)

دوسری طرف ہم عصر فارسی شعرا کے یہاں "موت کا خوف"، "ناامیدی" اور "اندوہ ناک تنہائی" وغیرہ جیسے مضامین پائے جاتے ہیں۔ بعض نئے شعرا نے تو موت کے خوف اور ایک قسم کی اندوہ ناک تنہائی کو اپنی شاعری کا اصل محور قرار دیا ہے۔ مثلاً ایک شاعر تنہائی اور اسکی اندوہ ناکی سے گلہ کرتے ہوئے اس طرح افسوس کا اظہار کرتا ہے ؎

همه شب تنهائی و تنهائی و دوری
هیچ سر همرهی و همدردی نیست
در خرابات کهنه خانه حافظ!
آوخ، امروز فروغ کهنی نیست

[تمام رات تنہائی، تنہائی اور دوری، کوئی ہمراہ نہیں، کوئی ہمسر نہیں، حافظ کے کہنہ خانہ خرابات میں اف! فروغ کبھی بھی نہیں]

فروغ فرخ زاد وحشت تنہائی میں فریاد کرتا ہے ؎

چون نهالی سست می لرزد
روحم از سرمای تنهائی!
می خزد در ظلمت قلبم
وحشت دنیا ــــ تنهائی

[تنہائی کی سردی سے میری روح ایک کمزور بچے کی مانند لرز رہی ہے (اور) میرے قلب کی تاریکی میں (موج بنکر) اٹھتی ہے وحشت دنیا (اور) تنہائی]

نئی شاعری میں زندگی سے یہ خوف، ہراس، غم تنہائی اور اپنے ہی انتظار کا ستم اس وجہ سے ہے کہ نو فکر شعرا اپنی ذات میں محدود دنیا سے اپنا راستہ ہموار نہ کر سکتے نیز مقررہ معیاری مقام پر پہنچ نہ پانے اور زندگی کے سرچشمہ سے دور رہ جانے کے سبب اسی نئی دنیا میں اپنی منزل کو ابھی پہنچ نہیں پائے ہیں، دوسرے یہ کہ صنعتی انقلاب اور آج کی مشینی زندگی نے شاعر کی نگاہ اور اس کی حساس روح کو، آج کے انسانی اقدار اور انسانیت کے ہیولے یا تقاضے کو بے وقعت کرکے اسے اپنے گنبد بے در میں قید کرلیا ہے جہاں شائستگی و دل بستگی کا نام ونشان بھی نہیں ہے، شب و روز کی یک رنگی زندگی میں کونسی دلکشی کوئی لطف کوئی معنی خیزی نہیں، علاوہ ازیں عارفانہ جذبے سے عاری ذات کے کرب میں مبتلا اپنے آپ کو پہچاننے کے احساس سے معری ہیں۔ اور بقول شخصے، وہ دیکھتے ہیں، ہم بے اعتبار لمحوں کے درمیان زندگی گذارتے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے رواں گذرتے چلے جاتے ہیں۔ ایک بے معنی اور بدہیئت دنیا نظروں کے سامنے کھڑی ہے، گویا آج انسان کی روح ذوق حیات سے بے بہرہ ہوگئی ہے۔ اوران کی اصل فکر اور ان کا غم جن سے وہ ملول ہیں وہ یہ ہے کہ وہ: عدم مرکزیت اور پریشان حالی کے عالم میں ایک ویران اور تاریک صحرا میں سفر کر رہے ہیں اور "آج"، جس کا کوئی مستقبل نظر نہیں آیا انھیں بدحال کئے ہوئے ہے۔ جس سے ان کی نجات نظر نہیں آتی۔ نیز ان کی پاس وہ جرأت رندانہ بھی نہیں ہے کہ وہ آج کی پُر ہراس اور آشفتہ زندگی کے مقابلے میں کھڑے رہ سکیں اور اس پر غلبہ پا سکیں یہی وجہ ہے کہ نیا شاعر مجمع میں بھی خود کو تنہا پاتا ہے، اس کی تسکین نہیں ہو پاتی اور اس کو یوں نظر آنے لگتا ہے گویا ہمیشہ اس کی روح ایسے ہی رنج والم سے تنہا ہے اور تنہا رہے گا۔

یقیناً نئی فارسی شاعری زمانے کی تمام تر تلخ و جان لیوا حقیقتوں کا اظہار کر رہی ہے، روح کی موت کے درد کو اس سے پیدا شدہ ہراس کو اپنے زندہ جسم میں آشکار کر رہی ہے اور حقیقتاً اپنی تمام تر دردمندیوں کے ساتھ اس ستم زدگی اور ظلم کی طرف اشارہ کرتی ہے اور ایک نئے قسم کے فلسفہ فکر کے لیے راہ ہموار کر رہی ہے۔

غور کرنے سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ اکثر نئے شعرا کے یہاں خوابوں کے بکھرنے کا کرب، بدحالی کا احساس، خفگی اور پریشان حالی کی ساری کیفیات ایک جیسی ہیں اور ایک جیسی نظر و فکر کی غمازی کرتی ہیں، دیکھا جائے تو انسان کا تعلق آج کے اس دور میں زندگی سے پیچیدہ تر اور مبہم ہوگیا ہے۔ اس لیے نئی شاعری کی بیشتر تصویروں Images اور اس کے پس منظر بھی قدرے پیچیدہ اور مبہم نظر آتے ہیں جو کبھی کبھی ایک لاحاصل ذہنی پراگندگی کی نشاندہی کرتے ہیں۔ لیکن یاس و ناامیدی، ہراس اور خوف تنہائی کے باوجود مجموعی طور پر نئی فارسی شاعری میں کہیں کہیں متحرک اور زندگی سے بھر پور شکلیں، روشن پہلو اور جدت آمیز تصویریں بھی نظر آتی ہیں جس نے فرد کے روشن تجربات سے نئی شکل و صورت اختیار کی ہے اور جو آج کی اجتماعی علمی و ادبی زندگی کو واقعیت اور معروضیت کو آج کی تازہ زبان میں جدید وسیلوں اور نہایت سادہ زبان میں بیان کر رہے ہیں، علاوہ اس کے وہ ایک ایسی آرزو مندی، نوید اور بشارت اپنے اندر پنہاں رکھے ہوئے ہیں جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا ایک وسیع و آزاد علم و ادب کی ترجمان ہے۔

آج کی شاعری اپنے اندر زندگی کی وہ حرارت، تپش اور ذوق و شوق کو سموئے ہوئے ہیں جس کا موثر اظہار ایک شاعر اس طرح کرتا ہے۔

هنوز با لب من حرف می زند تاریخ
هنوز در شب من
خون صبح بیدار لیست
هنوز در تن من تاب زیستن جاری است

[ہنوز تاریخ مرے ہونٹوں سے گفتگو کرتی ہے ہنوز میری راتوں میں ... صبح کا لہو بیدار ہے ہنوز میرے بدن میں زندگی کی توانائی رواں ہے]

زندگی کی یہ توانائی، آج کے شاعر کے جہاں پر امید اور فکری احساس کو بہ خوبی آشکار کرتی ہے، یہی وہ روشن اور سرزندہ شعلہ ہے جو زیادہ تر نئے شعرا کے کلام میں پوشیدہ ہے اور قاری کو متاثر کرتا ہے۔ آج کی شاعری میں یہی تازگی بیان اور نئی جستجو ہے جس کے بارے میں میرا عقیدہ ہے کہ اس دور کے عمدہ فارسی ادب کی قسمت کی تشکیل کرتی ہے اور آج سے زیادہ کل، توجہ کا سبب ہوگی۔

میں اس بات کو دوہراتا ہوں کہ آج کی فارسی شاعری میں بے انتہا تنوع ہے اور یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ کم و بیش تمام نئے خیالات کے حامل شعرا نے اس بے قرار زمانے کی تصویریں اسلوب بیان اور طرز اظہار کے پیرائے میں اتاری ہیں، بہر حال آج کے شعرا کی کاوشیں نیز پاکیزگی اور سلاست قابل توجہ اور لائق تحسین ہے مجھے یقین ہے کہ اس دور کے مشہور شعرا کے نام جدید ایرانی ادب کی تاریخ میں دائمی مقام پانے کے مستحق ہیں۔

●●

کے قافلہ میں ۔ (شاہد نصیر)

تہذیب

تحریر :- میتھیو آرنلڈ
ترجمہ :- معصوم شرقی ایم اے

ادب کا گہرا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ادب کا دوسرے فنون کے ساتھ بڑا تعلق ہے مثال کے طور پر یہ خیال رکھنا کہ ادب جو بلاشبہ دنیا کو فائدہ پہنچانے اور مہذب بنانے کا ایک طاقتور ذریعہ ہے اور اس سے منطقی فوائد اور اس کے اثرات کے علاوہ اور کچھ نہیں حاصل ہو سکتا۔ بلاشبہ ادب ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی کسی حد تک صلاحیت رکھتا ہے اور اپنی راہ آپ متعین کرتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ تو نہیں کر سکتا۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں کہیے کہ ادب تہذیب کا ایک حصّہ ہے۔ یہ خود تہذیب نہیں ہے۔ تہذیب کیا ہے؟ اس کی مکمل اور جامع تشریح ناممکن ہے۔ مختلف لوگوں نے اسے مختلف انداز میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے لیکن حقیقتاً یہ سوال اتنا پیچیدہ اور اہم ہے کہ ادب جیسی روحانی طاقتوں کا حامل بھی اس کا ایک حصّہ ہے ایک چھوٹا حصّہ ــــ تہذیب سوسائٹی یا سماج کی انسانیت لوازی کا نام ہے۔ انسان اسی وقت مہذب کہا جاتا ہے جبکہ سماج کا ہر فرد انسانیت کے صحیح راستہ پر گامزن ہو جو انسان کی تمام فطری خواہشات اور ولولوں پر مبنی ہو۔

ان مقاصد کی حصولیابی کے بہت سے طریقے ہیں۔ ان سے متعلق معلومات بہم پہنچانا اور انہیں ہمہ دم یاد رکھنا بہت ہی اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں تک محسوس کرنے کا تعلق ہے آسانی کے ساتھ بغیر کسی محنت یا مشکل اظہارِ خیال کے محسوس کیا جا سکتا ہے۔

انسانی تہذیب کی حصولیابی میں سب سے ضروری عنصر "ترقی کی خواہش" یا "بڑھنے کی خواہش" ہے۔ یہ انسانی فطرت کا ایک اہم جز ہے جیسے پیڑ پودوں میں روشنی کی خواہش یا خود انسان میں بڑھنے کی ــــ صلاحیت ــــ زندگی کے وہ تمام لوازمات جن سے انسان مدد لیتا ہے ــــ منزل اور اس کے لوازمات ــــ یہ تمام کے تمام حیات انسانی کی ترقی میں مددگار و معاون کی حیثیت رکھتی ہے جس کا اظہار "ہم آزادی کی نعمت یا ملکیت" جیسے الفاظ سے کرتے ہیں۔

آزادی، حیاتِ انسانی کے لیے فطرت کا عظیم ترین عطیہ ہے۔ اور یہ انسان کی فطری جبلت جیسے مغلوب ہو جانا یا شکست کھا جانا ہی انسان کی ... جبلت کی شکست نہیں ہے بلکہ عام طور سے احساسِ مغلوبیت یا احساسِ محکومیت جو شکست ہے۔

بسمارک (BISMARK) کا قول ہے کہ ــــ بہرحال ایک طاقتور خود مختار حکومت ہی بہترین قسم کی حکومت ہے۔ اس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی جا سکتی ہیں اور ہزاروں صفحے سیاہ کیے جا سکتے ہیں۔ لیکن ایک سخت اعتراض جو اس پر عائد کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسانی فطرت کے خلاف ہے یعنی یہ "انسان کے بڑھنے کی" فطری جبلت کے منافی ہے۔ اور انسان اس جبلت کو فنا کر کے مہذب ہو ہی نہیں سکتا۔ ایسی حالت میں فطری جذبہ خود بخود ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ چکی ہے کہ حکمراں طبقے زیادہ عرصے تک لائقِ اعتبار نہیں رہتے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم باغی ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ یہ طریقہ ہی غیر فطری ہے۔ فی زمانہ انسان سماجی برابری کا زبردست حامی نظر آتا ہے۔ یہ جذبہ آج کی تہذیبی دنیا میں ایک اہم رول ادا کر رہا ہے۔ لیکن دنیا کی بیشتر آبادی ابھی اس سے کم ہی واقف ہے۔ لیکن اس کی اہمیت سے انکار ناممکن ہے۔ حالات اور جائداد کی ناموافقت اس جذبے کی شکست ہے۔ یہ نچلے طبقے کے عوام کو بددل اور بدگمان بنا دیتی ہے۔ عام انسان جیسا کہ ٹوک ویل (ج ... TOCQUEVILLE) نے کہا ہے کہ ایسے ملک میں زیادہ غیر مہذب بن جاتے ہیں۔ نابرابری کی مخالفت میں ہزاروں طریقوں سے بحث کی جا سکتی ہے ایک ... جس پر وار ہوتا ہے وہ وہی ہے جو خود مخالف پر عائد ہوتا ہے۔ یعنی ناہمواری انسان کی فطری جبلت کے خلاف ہے۔ ایک طرف یہ ناہمواری ... میں بھی نقصان پہنچاتی ہے اور دوسری طرف انتہائی بدنی کی حالت میں بھی ــــ کوئی بھی طریقہ جو اس بنیاد پر قائم ہو وہ انسانی فطرت کے خلاف ہے اور کچھ دنوں کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔

انسانی تہذیب میں پہنچنے کی خواہش کو پہلا مقام حاصل ہے کیونکہ انسان کی مہذبانہ کوششوں کا مدار یہی ہے۔ اسی ... جبلت سے عام طور پر تہذیب کی تشریح ہو جاتی ہے۔ جو انسان کی فطرت سے کسی بھی صورت جدا نہیں ہے۔ بنیاد کا پتہ لگ جانے کے بعد ہم لوگ آسانی کے ساتھ اس بنیاد پر انسانی تہذیب کی بنیاد ... سکتے ہیں۔ جو اس طرح ہے ــــ چال چلن۔ علم و فضل۔ خوبصورتی، سماجی زندگی اور رہن سہن کے طور طریقے ــــ ! پڑھنا، چال چلن، علم، خوبصورتی اور طور طریقے یہی سب تہذیب کی بنیاد ہیں۔ انھیں کی روشنی میں انسان تہذیب یافتہ ہو سکتا ہے۔

ہم تمام لوگوں کا مقصد تہذیب کو عام کرنا ہونا چاہیے تاکہ تہذیب اور اس کے لوازمات جن کا اوپر تذکرہ ہوا ہے تمام کے تمام ایک ساتھ خلط ملط ہو جائیں، کہ ان تمام کی ترقی ایک ساتھ ہو۔ اس طرح کہ ایک کی ترقی دوسرے کو نقصان نہ پہنچائے۔ اسی خیال کے تحت یہ مضمون لکھا گیا ہے جس سے ہماری قومی زندگی کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ بلاشبہ یہ مقصد اس زندگی میں جیسے ہم لوگ گزارتے ہیں نہیں ملتا۔ یہ صرف ایک مثالی نمونۂ زندگی ہے پھر بھی مثالی زندگی صحیح معنوں میں انسان کی عام زندگی سے الگ کوئی دوسری چیز نہیں۔

شوقِ منزل نے کسی گام پہ رکنے نہ دیا
راہ میں لاکھ حسین لاکھ بیاباں آئے (شہزاد احمد)

تین نظمیں

(امریکی)

مارک اسٹرینڈ

مناظر عاشق ہرگانوی

"شفا"

موسم میں اکیلا کھڑا تھا
اور سوچتا تھا کاش
میں پتھروں سے ڈھکا ہوتا!
لمبی چادریں، میرے باپ کی ہڈیاں
میدان میں بکھری تھیں!

انتظار کے بعد
سورج کو ڈوبتا دیکھنے کے بعد
رات کی آخری کرن پر چھانے کے بعد
میں پانی کے کنارے جاتا ہوں
اور دیکھتا ہوں ڈاکٹروں کو
ایک کشتی کے ڈیک سے ہاتھ ہلاتے
جو ساحل سے چل رہی تھی
ان کے کھلے بیج اور اوزار
چاندنی میں نشان کی طرح چمکتے
اور یہ اس سے زیادہ نہیں تھا
جو کسی نے بھی پہلے کہا ہوتا

"کمرا"

یہ ایک پرانی کہانی ہے
جس طرح پیش آئی ہے۔
سردیوں میں
کبھی نہیں
سننے والا سو جاتا ہے
اسکی اداسی اور دکھ کے دروازے
کھل جاتے ہیں
اور کمرے میں
بدنصیبی چلی آتی ہے
پو پھٹنے کے وقت موت
رات ڈھلنے کے وقت موت
لکڑی کے پنکھ ہوا کو رگڑتے وقت
ان کی پرچھائیاں
بکھرا ہوا دودھ
دنیا جس پر روتی ہے
ایک ضرورت ہے چیزوں کے اچانک ختم ہونے کی
ہری گھاس جہاں گائیں نیوز پرنٹ کی طرح جلتی ہیں
کچھ بھی جب پیش آتا ہے
کبھی بے شمار مہیب نہیں ہوتا۔

"کپڑے"

چمکتی پہاڑی پر لیٹ جاؤ
اپنے جسم پر چاند کے ہاتھ کے ساتھ
تمہاری کھال تمہارے کپڑے کے
سفید بالوں میں چھپی ہے
اور تم نہیں سنو گے مشغول دل کو
اندھیرے کی لمبائی بڑھاتے
یا لوگوں کو رات کا انتظام کرتے
جو اس کی قسم ہے
یا شاعری کو تمہارے تکیے میں نیلے پنکھ بھرتے!
اگر تم اپنے کپڑوں سے باہر نکل آؤ
اور سایہ میں گھومو
دل نہیں ڈھونڈے گا، تو بھی اور شاعری بھی!
اور تم ایک دوسرے اندھیرے میں جا گروگے
خود کو پاؤ گے اسے بناتے
دوبارہ بناتے
جب تک وہ مکمل نہیں ہو جاتا

(مارک اسٹرینڈ جدید امریکی شاعری میں ایک متنازعہ فیہ نام ہے۔ جزیرہ پرنس ایڈورڈ، کینیڈا میں پیدا ہوئے لیکن عمر کا بیشتر حصہ امریکہ میں گذرا جہاں وہ مختلف کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استاد رہے۔ مجموعۂ کلام میں "سلیپنگ ود ون آئی اوپن" "روزن فار موونگ" "دی اسٹوری آف آور لائف" اور "ڈارکر" بہت مشہور ہوئے۔ "ڈارکر" سے تین نظموں کا ترجمہ حاضر ہے ——— ہرگانوی)

ادھورا سفر

انگریزی:۔ ڈاکٹر ویسلیس وٹما کیمن
ترجمہ:۔ رام پرکاش راہی
3-58 پونڈارا روڈ، نئی دہلی-۳

میں ننگے پاؤں نکلا اوڑھ کر چادر سحابوں کی
چلا شب کے گھنیرے پانیوں پر
ستارہ تا ستارہ
شرارہ تا شرارہ
قرینے سے کہ سر کے بل نہ گر جاؤں
کہیں نیچے
خلائے بے سروپا کے نشیبوں میں
نہایا، خوب، جی بھر کے
خنک آتش کے اُجلے آبشاروں کے سنہرے پرتووں میں
(جو جشنِ ایسٹر کی عارضی اور بے ضرر، معصوم آتش بازیوں
کی بے جلن چنگاریوں کی شوخ بوچھاروں سے ہوتے ہیں)
میں چلتا ہی گیا آکاش کی پگڈنڈیوں پر
جو لے جاتی ہیں
شنگرفی چمکتے آفتابوں سے تلے
معمور نیلی وادیوں میں
میں گزرا اینڈرومیڈا کے اس ماہی نما جھرمٹ ستارے کے جلوے سے
جو اپنے جسم چمکاتے شوخ بچوں کو
نہ بحرِ فلک میں کھوئی دنیاؤں کی ریتی پر
بہت آہستہ حرکت دے رہا تھا
شکنجے ڈالا گیا میں شوخ نیبولے کی باہوں میں
جہاں کی آتشیں برفوں کے تیکھے تند جھکڑ کے لے اڑے مجھ کو
اکھڑی سانس میری
پھینک ڈالا مجھ کو اُن بھوتوں کی ہیبت ناک پرچھائیں کے پیچھے
کہ میں جم کر بجھا لوں نور کی سب پیاس اپنی
کہکشاں کی شوخ ندیا کے کنارے
اُتر آیا میں پھر اس راستے پر
جو چلا جاتا ہے سرخی کے ستارے ایلڈی بیرن تک
اُدھر قطبی ستارے کی طرف دیکھا نہیں میں نے
اسے میں دیکھ کر، کرتا بھی کیا آخر؟

مری سانسوں سے آتی ہے صداقت کی مہک لیکن   یہ دنیا جھوٹ کی ہے میں اسے کب راس آیا ہوں (نقش علیم)

میری بھیڑو!

تمہارا بھلا ہو میری بھیڑو!
جان کو سنبھالے ہوئے پوری احتیاط کے ساتھ چلو راستے سے
بدن سے بدن گھستی، حرارت لیتی چلو
تاکہ تمہاری ٹھٹھری خود تمہارے جی دھیان میں آنے پائے
چلتے چلتے مینگنیوں سے کنڈلیاں رچاؤ تقدیر کی
موتتے موتتے آڑی ترچھی لکیروں سے سجا ڈالو وقت کو
تم ریوڑ بن کر چلو
ایک ساتھ "بھیں بھیں" بولتی ہوئی چلو
تم میں سے کسی نے کی ہوگی کل جنسی مباشرت
یا آپس ہی میں سنگین لڑائیاں
آسودہ بھیڑو! اچھلتی کودتی ہوئی چلو
تمہارے سر اور پیٹھ پر شناخت کے لیے لگائے ہوئے رنگ
جن سے پہچانے جاتے ہیں
تمہارے الگ الگ ریوڑ، الگ الگ مالکوں کے
بھیڑو! تم سرمایہ ہو
بھیڑو! تم منافع ہو
کیونکہ میری بھیڑو! تم بھیڑیں ہو
بھیڑو! قصاب خانہ قریب آگیا میری بھیڑو!
خدا تمہارا بھلا کرے میری بھیڑو!
اجتماعی "بھیں بھیں" کرنے کا یہی موقع ہے میری بھیڑو!
سب کی فکر کرنے والا دہ
تمہاری راہ دیکھ رہا ہے میری بھیڑو!

مراٹھی: منگیش پاڈگاؤنکر
اردو: بدیع الزماں خاور

?

ہوا کے سفید ہاتھ
ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں گھوم کر
کھلتے ہوں گے چوک میں
ننگی ذرا ننگی پہن کر خدا!
ہوا!
پھر بہنے لگے گی سنہرے آکاش میں،
سنہری کشتی کے سنہرے بادبان میں،
سنہری مچھلی کے سنہرے پیٹ میں،
گلی کا گھسا پٹا بدن!!!
دکانوں پر بیٹھے جانے پہچانے چہرے
تب!
چڑھنا چاہیں گے وہ سنہری سیڑھیاں
آسمان کی سمت کون؟

گجراتی - جینت پرمار
اردو: غلام محمد شیخ

یہی جلسے یہی رونق یہی رنگیں فضا ہوگی تیرے اس بزم میں لیکن غزل خواں ہم نہیں ہوں گے (رتن پنڈوری)

ایک زندہ باد نظم!

مراٹھی:۔ منگیش پاڈگاونکر

اُردو:۔ بدیع الزماں خاور

اپنے کان بند کرو
اپنے ہونٹ اچھی طرح بھینچ لو
اپنی آنکھیں بیچ لو
ہوشیار۔ اگلی کے نکڑ پر
ایک بڑا دادا رہتا ہے
بارہ بھٹیوں کا
مالک ہے وہ۔ خون ہو جائے گا
ہوشیار! گردن نیچے
آنکھیں بند۔ کان بند

نیتا آئے۔ نمسکار
زندہ باد۔ جے جے کار
نیتا بڑے سادہ ہوتے ہیں:
ان کے نام کا بینک میں
کوئی کھاتہ تک نہیں ہوتا
نیتا کو ہوتا ہے چندا
چندے کے نیچے ہوتی ہے کرسی
کرسی کے نیچے ہوتا ہے اقتدار
اقتدار کے نیچے ہوتے ہیں غنڈے
غنڈوں کے نیچے ہوتی ہے پولس
پولس کے نیچے ...... خبردار!
پہلے ہونٹ اچھی طرح بھینچ لو
آنکھیں بند۔ کان بند
کل کے اخبار میں
نیتا کا فوٹو آئے گا

مجھے بڑا خوف لگتا ہے
تجھے بڑا خوف لگتا ہے
اِسے بڑا خوف لگتا ہے
اُسے بڑا خوف لگتا ہے
خوف ذرا کم کرنے کے لیے
کیمسٹ کے یہاں گولیاں ملتی ہیں:
گولیاں لیتے ہی نیند آتی ہے
نیند آتے ہی خوف رک جاتا ہے
چھوٹا خوف : دو گولیاں
بڑا خوف : چھ گولیاں
بیس گولیاں لے لو
تو خوف ہمیشہ کے لیے مٹ جاتا ہے
خبردار! ہونٹ بھینچ لو
اس سے پہلے گولیاں نگلو
ہوشیار! گردن نیچے
آنکھیں بند۔ کان بند

اندھیرے کی قطار میں
خاموش کھڑے ہو جاؤ
مگر جناب! ایک بتائیے!

یہ قطار کہاں جاتی ہے؟
خبردار! سوال نہیں
جو سوال پوچھے گا!
فوراً اسکی نوکری چلی جائے گی
آدمی کو بیوی ہوتی ہے
بیوی کو بچے ہوتے ہیں
بچوں کو بھوک لگتی ہے
بھوک کے لیے نوکری چاہیئے
نوکری کے لیے دل کا مردہ چاہیئے

یہ قطار کہاں جاتی ہے؟
یہ قطار کہاں جاتی ہے؟
ہوشیار! گردن نیچے
آنکھیں بند۔ کان بند
پھر بھی یہ قطار کہاں جاتی ہے؟؟

جو اندھیروں کے تھپیڑوں میں بھی نہ ہوں خاموش حریم دل میں کچھ ایسے دیے تلاش کرو (اختر ادیبی)

اعترافِ گناہ

تحریر: وی۔ ایس۔ کھانڈیکر
ترجمہ: سلمان ماہی (ایس ای ایم)
ماہم روڈ، دوسری رابوڑی، تھانہ

چاروں طرف سے اژدہام امڈ پڑا تھا۔ لوگوں کے ریلے کے ریلے مندر کی جانب رواں دواں تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے متعدد ندیاں سمندر کی وسعتوں میں ڈوب جانے کے لیے امڈ پڑیں ہوں۔

آج دیوتا کی مورتی کے طواف کا دن تھا ــــ انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے سمندر کو دیکھ کر اس بھکاری لڑکے کی آنکھوں میں امیدوں کے انگنت دیپ جگمگانے لگے۔ وہ بھی مندر کی جانب چل پڑا مندر کا طلائی کلس ابھرتے سورج کی عکس ریز کرنوں سے یوں جگمگا رہا تھا۔ جیسے کسی ہفت اقلیم کے شہنشاہ کے تاج کا آبدار موتی شعاعیں بکھیر رہا ہو۔

لیکن اس لڑکے نے ایک لمحہ کے لیے بھی اس سمت نہیں دیکھا۔ اس کی نظریں مندر کے داخلی دروازے پر مرکوز تھیں۔ جہاں ایک جم غفیر چونٹیوں کی چال سے اندر کی جانب کھسک رہا تھا "شکر کے بغیر چونٹیوں کا جمنا ناممکن ہے" ایک خیال لڑکے کے ذہن میں لہرایا۔ پھر لاشعوری طور پر اسکے قدم بھی بھیڑ کی جانب اٹھنے لگے۔

نزدیک پہنچ کر اس نے ہر کسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ لیکن نامراد رہا۔ ایک پجاری تیز تیز قدموں سے اس کی جانب آرہا تھا۔ لڑکے کی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہوئی مگر وہ پجاری شلوک کا جاپ کرتے ہوئے اسے رگید کر آگے بڑھ گیا۔ پھر ایک نازک گل اندام حسینہ اسے نظر انداز کرکے آگے بڑھی۔ اس کے پازیب کی جھنکار نے لڑکے کی تمناؤں کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ پھر یکے بعد دیگرے عالم و فاضل، تاجر، کسان، وکیل، ڈاکٹر اسے رگیدتے کچلتے اندر داخل ہوتے گئے۔ عقیدتمندوں کا ایک سمندر تھا۔ جو سیلاب بن کر آیا اور لہروں کی مانند اندر سمو گیا۔ وہ وہیں کا وہیں رہا۔ کسی سوکھے بند کی طرح ــــ آخر میں مہاراج کی سواری آئی۔ لڑکے کی آنکھوں میں امیدوں کے دیپ جل اٹھے۔ لیکن مہاراج کی نظریں مورتی پر مرکوز تھیں۔ وہ گیان دھیان میں مگن۔ آنکھیں موندیں، سیس جھکائے اندر داخل ہوگئے۔

لڑکے کی بھوک لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ اچانک اس کی نظریں ایک بچہ پر پڑیں۔ جو پرساد کا دونا لیے آگے جارہا تھا۔ وہ کسی باز کی طرح دونے پر جھپٹ پڑا اور پرساد چھین کر بھیڑ کے سمندر میں ڈوب گیا۔ اتنے میں اندر شنکھ بجنے لگے۔ لڑکے کا تجسس بیدار ہوگیا۔ پھر وہ بھیڑ کی پرواہ کئے بغیر داخلی دروازہ پار کرکے اندر گھس گیا۔ اور یہاں کیا ہورہا ہے اسکی پرواہ کئے بغیر ایک کونے میں کھڑا ہوگیا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے شہد کی چھتے سے انگنت مکھیاں باہر آکر بھنبھنا رہی ہوں پھر دوبارا شنکھ بجنے لگا۔

بھکتوں کا اژدہام شانت ہوگیا۔ جیسے وسیع سمندر ایک تالاب میں تبدیل ہوگیا ہو۔ بھگوان کی مورتی بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ رتھ میں رکھی گئی۔ حاضرین نے سر جھکا کر جے جے کار کیا۔ رتھ کھینچنے والے بھکتوں نے ایک نعرہ لگا کر زور لگایا۔ لیکن یہ کیا ــــ؟ رتھ اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ کھینچنے والے پریشان اور عقیدت مند حیران تھے۔ پھر اپنی طاقت پر نازاں گبرو نوجوان آگے بڑھے۔ انہوں نے بھی کس کر زور لگایا۔ لیکن رتھ ٹل برابر ہٹنے پر تیار نہیں تھا۔ کرن کے رتھ کی طرح اس کے پہیئے بھی دھرتی نے جام کئے ہوں۔ مکھیوں جیسی بھنبھناہٹ گونجنے لگی۔

پجاری آگے بڑھا اس نے آنکھیں موند کر ہاتھ جوڑے۔ پھر سادھو سنت، رقاصہ، راجہ مہاراجہ، سیٹھ، ساہوکار۔ سبھی ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرنے لگے۔ اس لڑکے نے بھی ہاتھ جوڑ کر پرارتھنا کرنی چاہی۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا؟ بچے سے چھینا ہوا دونا اس کے قمیص کے دامن میں چھپا ہوا تھا اگر ہاتھ جوڑتا ہے تو گرنے کا ڈر تھا ــــ انسانوں کے سمندر کے بیچ یہی واحد لڑکا تھا جو بنا ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ پھر اس ہال میں ایک آواز گونجنے لگی۔ لگتا تھا زمین کی اتھاہ گہرائیوں سے وہ آواز اٹھ رہی ہو۔

" پاپ کے پہاڑ نے راستہ روک دیا ہے کوئی پاپی میرے مقدس مندر میں موجود ہے وہ جب تک اپنا گناہ قبول نہیں کرتا رتھ آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

تمام لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔

مہاراج نے کل ہی مورتی کو ایک قیمتی ہار بھینٹ کیا تھا جس میں کے چند موتی پجاری نے چرا لیے تھے۔ وہ خوف زدہ نظروں سے مورتی کی طرف دیکھنے لگا۔

"صلحنامہ کیا ہے، فرسودہ شرائط کا پلندہ" یہ کہہ کر اپنے کمزور پڑوسی ملک پر آج دوپہر بعد اچانک حملہ کرنیوالا راجہ گھبرا کر مورتی کی طرف تکنے لگا۔

سنیاسی کی نظریں بڑی دیر سے گل اندام

(باقی صفحہ نمبر ۳۹)

مرا وجود ہے نقشِ ابد قرار اخترؔ
مجھے مٹانا زمانے کے بس کا کام نہیں (اخترؔ ادیبی)

سراب

تحریر: وی ۔ ایس کھانڈیکر
ترجمہ: انیس چشتی

سورج سر پر آگیا۔ گرمی کی شدت سے بیلیں اور درخت مرجھا گئے۔ زمین سسکا۔ یاں لینے لگیں۔

ہرنی کے دو بچے پیاس سے بے تاب ہوکر چاروں طرف بے چینی سے دوڑتے پھرتے تھے لیکن پانی تو کہاں، پانی کو چھوکر گذرنے والی ٹھنڈی ہوا کا جھونکا بھی انہیں میسر نہ آسکا۔

انھوں نے آنکھیں تان کر دور دیکھا۔ افق کے قریب کوئی چیز جھلملا رہی تھی۔

پانی ــــ پانی ہی تھا وہ! سورج کی کرنوں سے وہ چمک رہا تھا۔ افق کے قریب اس کا وہ سیمابی رقص ــــ جیسے پریاں ناچ رہی ہوں۔ ہرنوں کے بچے افق کی طرف رخ کر کے دوڑنے لگے۔

پہلا تیر کی تیزی سے دوڑ پڑا۔ اس نے درمیان میں ہی گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ دوسرا بہت دور رہ گیا تھا۔

پہلے نے دوڑتے ہوئے چلا کر کہا۔ 'پاگل اس طرح رینگ مت۔ اس رفتار سے جب تو افق پر پہنچے گا تو وہ روپیلی ندی سوکھ چکی ہوگی! کس قدر آلسی ہے تو۔ اس افق پر جھلملانے والی وہ گنگا۔ بیوقوف وہ بھگوان کی مہربانی ہے۔ وہ غائب ہو جائے گی۔

اس نے غور سے دیکھا دوسری ہرنی نے اپنی رفتار ابھی نہیں بڑھائی تھی۔ پہلے نے اپنی رفتار اور بڑھادی ــــ جیسے خلاؤں میں چمکنے والی بجلی ہو۔

آسمان پر لگی ہوئی گرمی کی آگ آہستہ آہستہ بجھنے لگی۔ راکھ کے ڈھیر کی طرح نظر آنے والے کچھ بادل آہستہ آہستہ غروب کی طرف بڑھنے لگے۔ جنگل کی آگ کی طرح نظر آنے والے کچھ بادل بھی وہاں دکھائی دے رہے تھے۔ البتہ ان میں سے نکلنے والی آگ میں اب وہ شعلہ باری نہ رہی تھی۔

دوسری ہرنی نے سامنے دیکھا ــــ افق [illegible] ہوگیا [illegible] بھٹکتے رہنے سے ایک بہت بڑی غلطی سرزد ہوگئی۔ ایسا اسے محسوس ہوا۔

اتنے میں کسی کے کہنارنے کی درد بھری آواز اس کے کانوں میں پڑی۔ اس نے آگے بڑھ کر دیکھا ــــ تیزی سے دوڑ کر آیا ہوا ہرن زمین پر گرا ہوا تھا اس کے کھلے ہوئے منہ میں سے خون کے قطرے ٹپک رہے تھے اس نے نہایت درد بھری آواز میں کہا!

'پانی، تھوڑا پانی!'

دوسری ہرن کی آنکھیں بھر آئیں۔

پہلے ہرن نے بوجھل آواز میں کہا ــــ 'سن اچھی طرح اسکان لگا کر سن، پانی ــــ' دوسرا ہرن سننے لگا۔ دور کہیں ایک جھرنا گنگنا رہا تھا۔ چٹانوں پر سے چھلانگیں لگاتے ہوئے اس جھرنے کے پیروں میں لگے گھنگرو کتنے مدھر سروں میں بج رہے تھے

اس نے نہایت مسرت سے اپنے دوست کے پاس پہنچ کر کہا، 'یار، اٹھ، کہیں قریب ہی میں پانی ہے۔ چل اٹھ پاگل۔ اتنی دیر ہواؤں کی طرح دوڑا اور اب ــــ'

پہلے ہرن نے کچھ بھی جواب نہ دیا۔ دوسرے نے جھک کر دیکھا۔ پہلے کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ دوسرے ہرن نے بے تاب ہوکر اوپر دیکھا۔ آسمان کے محل میں قدم قدم پر دیپ جل اٹھے تھے۔ اور ان کے استقبال کے لیے وہ جھرنا پہلے کی بہ نسبت زیادہ تیز آواز میں گانے لگا تھا ■

"مال برباد ہو جائے تو پھر سے حاصل ہو سکتا ہے لیکن عزت جا کر پھر حاصل نہیں ہو سکتی" (حضرت حسان بن ثابت)

ابھی تو نے دلِ شوریدہ کا دیکھا کیا ہے　　موج میں آئے تو طوفانوں سے ٹکرانے چلے (احمدالمی)

ہار جیت

تحریر: وی ایس کھانڈیکر
ترجمہ: انیس چشتی
۲۵۴ کیداری روڈ پونہ ۱

ایک عظیم الشان راجہ نے دشمن کی حکومت چھین لی۔ اس راجہ کی راجدھانی میں داخل ہونے کے لیے نہایت شان وشوکت اور ٹھاٹ باٹ سے وہ آیا۔ شہر کے صدر دروازے پر اسے ایک مجسمہ دکھائی دیا۔ اسے دیکھتے ہی بادشاہ حیرت زدہ ہوگیا۔ ایسا لاجواب فن اس نے کبھی دیکھا نہ تھا۔ راجہ مجسمے کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا۔ شاہی جلوس بھی جہاں کا تہاں رک گیا۔

وہ مجسمہ معرکہ آرائی اور فتح مندی کی علامت تھا۔ آسمان کی جانب اٹھتی ہوئی تیز اور مستقل نگاہیں۔ گویا سورگ سے امرت لانے والے شاہین کی نظر تھی وہ ـــ شاہین کے پنجوں سے لپٹا ہوا ناگ باز کے شایانِ شان فن پارہ تھا وہ ـــ

اس فن پارے کو دیکھ کر حیرت زدہ راجہ نے پوچھا! "کس نے بنایا ہے یہ مجسمہ؟"
راجہ کا خیال تھا کہ اطراف کی بھیڑ میں سے کوئی تو آگے آئے گا، اور خود کو مجسمہ ساز کی حیثیت سے پیش کرے گا۔ لیکن کوئی آگے نہیں بڑھا
راجہ نے ذرا کرخت لہجے میں پوچھا "کس کا ہے یہ مجسمہ؟"
آس پاس کی بھیڑ میں سے کسی نے ڈرتے ڈرتے کہا "بلند اقبال مہاراج نے جس بھگوڑے راجہ کو زیر کیا ہے اسی کا ہے یہ پتلا۔"
راجہ فتح مندانہ انداز سے دوبارہ اس مجسمے کی طرف دیکھنے لگا۔ اب اسے وہ مجسمہ اتنا خوبصورت نہ لگتا تھا۔
اس نے سوال کیا "اس مجسمے کو بنانے والا فن کار اسی شہر میں ہے؟"
بھیڑ میں سے کسی نے کہا،
"جی ہاں!"

"پھر وہ ہمارے استقبال کے لیے یہاں کیوں نہیں آیا! جاؤ اسے بھی اسی وقت ہمارے سامنے حاضر کرو۔ اس کی آمد کے بغیر ہم شہر میں داخل نہیں ہوں گے۔"
فوراً ہی سپاہی مجسمہ ساز کو گرفتار کر کے اٹھا لائے۔
راجہ نے اس کی طرف گھورتے ہوئے کہا
"یہ مجسمہ تم نے ہی بنایا ہے؟"
"ہاں"
"کیسے؟"
کیسے؟ اس سلسلے میں میں کیا کہوں! بیل پر کلی کیونکر پیدا ہوتی ہے؟ اور اس سے پھول کیونکر بنتا ہے؟ کیا یہ مہاراج بتا سکتے ہیں؟"
راجہ سٹ پٹا گیا۔ وہ دل ہی دل میں چڑھ رہا تھا۔ لیکن اپنی ناراضگی چھپاتے ہوئے اس نے کہا "یہ مجسمہ کس کا ہے؟"
مجسمہ ساز نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا، "سابق مہاراج کا۔"
راجہ کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا بولا "وہ اب مہاراج نہیں رہا، سادہ راجہ تک نہیں رہا! جنگلوں کے سہارے جینے والا ایک مفرور انسان ہے وہ!
"ہوگا"
"ایسے بھگوڑے بادشاہ کا مجسمہ بنا کر یہ بتانا کہ وہ نہایت ہی بہادر اور عظیم ہے، دراصل دنیا کو دھوکا دینا ہے۔"
"آج آپ جس طرح فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ پہلے یہ مہاراج بھی شہر میں اسی طرح داخل ہوئے تھے! اس فتح کی یادگار کی طور پر میں نے یہ مجسمہ بنایا تھا۔ آج میں نے آپ کا مجسمہ بنایا اور کل کو داخل ہونے والے کسی فاتح نے اس کا قلع قمع کر دیا تو!؟

راجہ نے نہایت ہی خشمگیں نگاہوں سے فن کار کی طرف دیکھا پھر اس نے انتہائی کرخت لہجے میں کہا، "تمہارے ہاتھ! ممکن ہے پتھر میں سے جنت تراش لے! لیکن تمہاری زبان ـــ یہ مت بھولو کہ وہ تمہیں تختِ آخری میں ہی دفنا کے دم لے گی۔"
"فن کار کی زبان اور ہاتھ جدا جدا نہیں ہوتے مہاراج۔ ان کا دماغ اور جگر بھی الگ الگ نہیں ہوتا۔ بلند اقبال مہاراج سیاسی اتھل پتھل میں آپ کے روپ بدلتے ہوں گے، لیکن فن کاروں کے اخلاق بڑے باعظمت ہوتے ہیں۔ کیونکہ انھیں معلوم ہے کہ زندگی میں صرف ایک ہی آخری سچائی ہے۔ وہ سچائی یعنی اپنی روح کے نور میں ارتقا کی منزلیں طے کرنا۔
جیسے کوئی آتش فشاں دہکنے لگے بالکل اسی طرح فن کار کے ایک ایک لفظ پر بادشاہ جلال میں آ رہا تھا۔ اب وہ آتش فشاں یکایک پھٹ پڑا! وہ انتہائی کرخت آواز میں ابل پڑا!
"اگر تم کوئی عام انسان ہوتے تو تمہاری اس زبان درازی کی سزا میں، میں تمہارا سر کچلوا دیتا مگر ـــ"
بادشاہ کا چہرہ یکایک خوشگوار ہوگیا۔ فن کار کے لیے، ایک بالکل نئی اور انوکھی سزا اسے سجھائی دی تھی۔ اس نے نہایت اطمینان سے کہا
"تمہیں میں بالکل چھوٹی سی سزا دینا چاہتا ہوں۔ میرا حکم ہے کہ ان تمام لوگوں کے سامنے تم اس مجسمے کو توڑ دو۔"
لوگوں میں گڑبڑ مچ گئی۔ ہر طرف سرگوشیاں ہونے لگیں۔
لیکن شہر کے صدر دروازے پر تین مورتیاں خاموش کھڑی تھیں... بادشاہ، فن کار اور فن کار کا بنایا ہوا مجسمہ!
ایک ایک لمحہ صدیوں کی طرح محسوس ہو رہا تھا اسی طرح کتنا ہی زمانہ بیت گیا، سو، دو سو، دو سو ـــ
بادشاہ نے سوال کیا: میرا حکم منظور ہے؟
"نہیں"
"اپنا سر کچلوانے کے لیے تیار ہو جایئے"۔
فن کار نے ہنستے ہوئے جواب دیا "کیوں کھو دینے

آتی ہے دل کی آہ سے آواز یہ مجھے
حسنِ یقیں نہیں ہے تو سجدہ نہ کیجیے (راحت کاظمی)

کی بہ نسبت سر گنوا دینا کہیں زیادہ بہتر ہے
بادشاہ جلال میں آ گیا۔ فن کار کو منطق کی قینچی میں پکڑنے کے لیے اس نے سوال کیا۔
"کیا تم نے اب تک اپنا بنایا ہوا ایک بھی مجسمہ نہیں ڈھایا؟"
"ایک ہی کیوں؟ میرے کئی ایک مجسموں کا میں نے ان ہاتھوں ناس کیا ہے۔"
"وہ کیوں؟"
اس لیے کہ اس میں میرے فن کا اظہار نہ ہو سکا تھا۔ ان مجسموں میں میری روح کا عکس نظر نہیں آیا تھا۔ اس لیے۔ اس مجسمے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ یہ میرا پسندیدہ فن پارہ ہے۔ پیٹ کی اولاد سے زیادہ اس پر میرا پیار ہے۔ میرا کام دنیا میں حسن پیدا کرنا ہے حسن کا ناس کرنا نہیں اس کام کے لیے پرمیشور نے راجے مہاراجے پیدا کیے ہیں۔"
فن کار کے یہ الفاظ سنتے ہی آس پاس پھیلے ہوئے انسانی سمندر کے ضمیر میں ایک زبردست بے قابو لہر دوڑ گئی۔ فاتح بادشاہ کو اس طرح بے عزت کرنے والا انسان اب ایک لمحہ بھر بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ یہ صاف ظاہر تھا۔
لیکن بادشاہ نے اپنی گردن جھکالی تھی۔
کتنی ہی دیر وہ یوں کھڑا رہا۔ آخر میں گردن اونچی کر کے اس نے کہا۔ فن کار، تمہارے اس بادشاہ کو میں نے فتح کیا۔ لیکن اس کے اس مجسمے نے آج مجھے ہرا دیا ہے۔ جنگ کی جیت آخری جیت نہیں ہو سکتی۔ یہ بات آج ہی مجھے معلوم ہوئی۔"

قولِ حکیمانہ

انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ جسمانی اور ذہنی اعتبار سے اپنے آپ کو بلند سطح پر رکھے۔ نہیں تو وہ دنیا کو وہ پیغام نہیں دے سکے گا جس کے لئے وہ دنیا میں آیا ہے۔

(ڈاکٹر ماڈرن)

بقیہ :- اعترافِ گناہ .....

رقاصہ کے صبیح چہرے پر مرکوز تھیں۔ اس نے خاموشی سے آنکھیں نیچی کر لیں۔
دیوتا کی مورتی کے سامنے اپنے رقص کا خراج پیش کرنے کی نیت سے آنیوالی رقاصہ اطراف کے نوجوانوں کو رجھانے میں مصروف تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں موندلیں۔ دھارمک گرنتھوں میں اپنے من چاہے اشلوک گھسیڑنے والے پنڈت غریبوں کا خون چوسنے والے ساہوکار سونے میں ملاوٹ کرنے والے سنار! سب کے سب حیران تھے۔ ہر کوئی چور نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ ہر کسی کی خواہش یہی تھی کہ آگے آئے اور اپنے گناہ کا اعتراف کرے تاکہ رتھ کا راستہ صاف ہو جائے
لیکن کوئی بھی آگے بڑھنے کے لیے تیار نہیں تھا ——— راجہ سے لے کر رقاصہ تک سنیاسی سے لے کر ساہوکار تک ہر کوئی خوفزدہ تھا۔
اب ماحول میں دوبارہ بھنبھناہٹ شروع ہوئی۔

بھکتوں نے زور زور سے پرارتھنا کی اور ہاتھ جوڑ دیے ——— انسانوں کے سمندر کے بیچ اگر ہاتھ جوڑے بنا کوئی کھڑا تھا تو وہ لڑکا جس کے ماں باپ بھی بھکاری تھے۔
بادلوں بھرے آسمان میں جیسے بجلی کڑکتی ہے ویسے رتھ سے آواز ابھری "رتھ کا نہ ہلنا بدشگونی کی علامت ہے۔ اگر آج رتھ نہیں ہل سکا تو کل برسات نہیں ہوگی۔ پھر بھیانک قحط پڑے گا۔ لاکھوں افراد بھکمری کے شکار ہوں گے۔ تم لوگوں میں جو بھی پاپی ہے آگے بڑھ کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے۔ بغیر اعتراف گناہ کے رتھ تل برابر بھی ہل نہیں سکتا۔"
اچانک وہ لڑکا اپنی جگہ سے تیر کی طرح نکلا اور دوڑ کر رتھ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنا دامن الٹ کر مورتی کے سامنے کیا اور ہلکی آواز میں کہنے لگا۔
"ہے بھگوان! پرساد کا یہ دونا میں نے چرایا تھا۔ صبح سے بھوکا ہوں اس لیے، یہ پاپ کرنا پڑا۔ میں پاپی ہوں بھگوان مجھے شما کر"۔
دوسرے ہی لمحہ رتھ آگے سرکنے لگا۔ عقیدت مندوں کے چہرے خوشی سے دمکنے لگے۔ پورے ماحول میں مسرت کی لہر دوڑ گئی ——— لیکن ——— مورتی کی آنکھ سے آنسو بہہ رہے تھے۔ لوگ مدہوش کن انداز میں چلائے۔
"بھگوان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو"
پھر تمام لوگ یہ آنسو حاصل کرنے کے لیے مورتی پر ٹوٹ پڑے۔
——— انسانوں کے اس سمندر میں صرف وہی لڑکا اداس تھا۔ وہ ایک ٹک مورتی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مورتی کو کون غم کھائے جا رہا ہے جو آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔

* * * * *

سچ یہ ہے محبت کبھی رسوا نہیں ہوتی — جب تک کہ زمانے میں وہ رسوا نہیں ہوتی (رتن پنڈوری)

شاعر

تحریر: وی ایس کھانڈیکر
ترجمہ: ایس چشتی
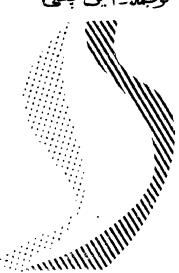
حسن کی تلاش میں سرگرداں ایک شاعر ایک دیہات کے قریب پہنچ گیا۔ گاؤں میں قدم رکھتے ہی اس کے دل نے ایک ہچکی لی۔ راستوں پر قد آدم گڑھے پڑے تھے۔ مندر کی جھکی ہوئی دیوار کسی خمیدہ بڑھیا کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اور دھول سے اٹی ہوئی کویلوں کے پستہ قد مکان، غلاظت کے ڈھیر پر لوٹ آئے گندے کتے کے پلوں کی طرح دکھائی دیتے تھے۔

اس نے دوری پر دیکھا۔ خوش گوار افق کے پس منظر میں ایک سرسبز و شاداب ٹیلہ مسکرا رہا تھا جیسے پردیس گئے ہوئے محبوب کی یاد میں منڈیر پر خاموش بیٹھی ہوئی جوان لڑکی!

گاؤں پر ایک قہر آلود نظر ڈال کر وہ اس ٹیلے کی جانب چھپاٹے سے چل پڑا۔ ہانپتا ہوا آخر وہ اس کے ملقے پر پہنچ ہی گیا۔ آرام کی خاطر ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ خود کی آنکھوں پر اسے یقین نہ آیا۔ ٹیڑھی میڑھی، اوبڑ کھابڑ چٹانیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ حادثہ کا شکار ہو کر پارہ پارہ شدہ لاش کی طرح وہ اسے محسوس ہوا۔ پیلی پیلی اور بے رنگ گھاس صرف ان بے ڈھب چٹانوں کی ساتھی تھی۔ دوری پر چاروں طرف چھوٹے چھوٹے پیڑ پاگلوں کی طرح پنکھا جھل رہے تھے۔

بے چین ہو کر پتھریلی چٹان پر سے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ چل کر آئے ہوئے راستے پر اس نے حیرت سے دیکھا۔ وہ ناچتی ہوئی نیچے جا رہی تھی۔ ایک ہرے بھرے اور شاداب ماحول میں وہ کھو گئی تھی۔

اس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا۔ یہ وہی گاؤں تھا۔ ماں کا پلو پکڑے شریر بچے جس طرح کھیلتے رہے اسی طرح وہ گاؤں ہری بھری جھاڑیوں میں سے مسکرا رہا تھا۔ اور آشیرواد کے لیے کسی تپسوی کے بلند کئے ہوئے ہاتھ کی طرح نظر آنے والا وہ مندر کا کلس . . . . . .

اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ لیکن اس کے قدم خاموشی سے اس ناچتی گاتی نیچے جانے والی پگڈنڈی کی طرف مڑ گئے۔

محفل بھی تو ہار ہے ساقی بھی ... پروین ... ہے گیا (کالیداس گپتا رضا)

ڈاکٹر مہدی حسن بی۔ ایم۔ پی

(ختنہ اسپیشلسٹ)

پرانی کوئلہ گلی، مارکیٹ کے قریب ۱۹۴۴ ڈوائرلین۔ پونہ ۱۱۰۰۱ء

فون: 23845/26374

ماہنامہ اسباق کے سالِ اوّلین نمبر کیلیے

نیک خواہشات

غلام مصطفےٰ علیم خان پڑھیار

پتے: (۱) معرفت: این۔ اے۔ خان پڑھیار۔ جی۔ سی۔ سی۔ کیمپ

دوخان۔ قطر۔ (عربین گلف)

(۲) خان جی کی حویلی کے پاس۔ فتحپور شیخاواٹی۔ ضلع سیکر (راجستھان)

باب ۹
فن اور شخصیت

ترتیب

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی (غالب)

میں اور میرا فن

باقر مہدی

۱۰۸، موتی شاہ لین، مجگاؤں، ممبئی ۔ ۴۰۰۰۱۰

اپنے بارے میں چند جملے لکھنا بھی کتنا دشوار ہے۔ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو جانتے ہیں کہ زندگی ناقابلِ برداشت "پل صراط" سے گذر رہی ہے۔ اور سب فنکاروں نے اپنی اپنی قیمتیں اپنے اپنے گلے میں "پنہاں طوق" کی طرح لٹکا رکھی ہیں۔ اور جتنا بڑا نام ہے اتنی بڑی قیمت ہے۔ فنکاروں کی خرید و فروخت ہر دور میں ہوتی رہی ہے مگر آج کا دور سب سے سبقت لے جا چکا ہے۔ ایسے ماحول میں ہم متوسط طبقے کے سرکش ادیب اور شاعر فن کاری کی باتیں کیا کریں؟ میں نے نوجوانی میں ایک شعر کہا تھا ؎

ہر شخص کی قیمت ہے بکے جاتے ہیں کتنے!
دیکھیے سرِ محفل یہ تماشا کوئی کب تک؟

لیکن میں ابھی تک یہ تماشا دیکھ رہا ہوں۔ میرا تین برس پرانا شعر ہے ؎

کل بغاوت کا بھی نیلام اٹھا
"بوڑھے کرسی" کا نشاں ڈوب گیا

پھر جب اتنا گھور اندھیرا ہو تو ۔۔۔ تو میں نئے لکھنے والوں سے ملتا ہوں اور فن کاری کی باتیں کرتا ہوں۔ کیونکہ میرے لیے فرار یا تسکین کا یہی راستہ بچا ہے۔ ان سے آزاد نظم کی بغاوت اور اس کی ناکامی پھر چند برسوں بعد اسکی مقبولیت کی وجوہ بتاتا ہوں یہی کہ میراجی اور راشد کا آہستہ آہستہ مگر دیرپا اثر ہوا۔ اور شاعری کا سارا لب و لہجہ ہی بدل گیا۔ اور اب نثری نظموں کا دور آگیا۔

میرے لیے شاعری زندگی کی قدم بقدم کروٹیں لیتی برقی رو کا نام ہے۔ میں اسی لیے خود کو ایک سیاسی شاعر کہتا ہوں۔ اس کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ "مظلوم ادارے" لکھتا رہتا ہوں۔ اس سے صرف اس قدر مراد ہے کہ شہروں میں جتنی تیز طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے اتنی چھوٹے قصبوں میں نہیں اور نئی شاعری اسی "من سوز" ماحول میں پروان چڑھی ہے۔ اور چڑھے گی۔ آہستہ آہستہ نکر زہر کی طرح اپنا اثر چھوڑتی جا رہی ہے۔ اور نئے لکھنے والے کم از کم اردو میں لکھنا شروع کرتے ہیں تو اضطراری کیفیت سے مجبور ہو کر ہی لکھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہیں اپنی صلاحیتوں کو پروان چڑھانے کے لیے بڑی ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ مطالعہ اور تجربہ اور جنون کے بغیر شاعری کرنا تقریباً ناممکن ہو گیا ہے۔ علامت کی تخلیق اشعار کا استعمال، الفاظ کی دروبست، جذبے کی شدت اور سب سے بڑھ کر ایک لب و لہجہ کی تشکیل مدتوں بعد شاعر سیکھتا ہے۔ اور پھر جیسے جیسے عمر بڑھتی جاتی ہے جذبہ کم، فکر کی ندرت غائب، اور زندگی کا یورژم نہایت خاموشی سے رگ رگ سے ہوتا ہوا اشعار اور نظموں میں داخل ہوتا جاتا ہے۔

کیا سب کا یہی انجام ہے؟

شاید۔

مری نسل کے شاعروں کا شعار ترقی پسند ادبی نظریے سے تصادم تھا! ۔۔۔ اس لیے کہ وہ "دقیانوسیت" میں پناہ ڈھونڈ چکے تھے اور "مقبولیت" کی سند کو حاصلِ شاعری سمجھ بیٹھے تھے۔ آج میں اپنے ہم عصروں کا کلام پڑھتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ ان کا شعری سرمایہ کتنا کم ہے اور میرا۔ میرا تو ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں نام بھی آنا مشکل ہے۔ اس لیے کہ میں نے "فنکاری" سے زیادہ سرکشی کو مقدم سمجھا تھا۔ اسی لیے میں خود اپنے "مذاق کرب آگیں" کا شکار ہو گیا اور اب یہ کہتا پھرتا ہوں ؎

مرے دوست دشمن سبھی بک گئے
مرا مول اٹھا، آدمی بیچ دے

میرے تین شعری مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ جنھیں میں نے خود شائع کیا تھا۔ اور اب جو چوتھا شعری مجموعہ شائع کرنا چاہتا ہوں مجھے کوئی ناشر کیسے ملے گا؟ میں صاحبِ اقتدار لوگوں سے مراسم ہی نہیں رکھتا۔ اتنے بڑے شہر بمبئی میں میرے "نامور شعراء" سے برائے نام مراسم بھی نہیں ہیں۔ ہاں اردو، مراٹھی، ہندی اور انگریزی کے نوجوان شعراء سے میرے خاصے اچھے مراسم ہیں۔

میں نے اپنے پہلے شعری مجموعہ "شہرِ آرزو" کے بعد دو سال خاموشی اختیار رکھی، پھر نئے انداز سے شعر کہنے کی کوشش کی تھی۔ میرا دوسرا مجموعہ "کالے کاغذ کی نظمیں" ۱۹۶۷ء میں شائع ہوا تھا اس کے شروع میں ایک نظم دیباچے کے طور پر رکھی تھی۔ اس کی چند سطریں ہیں ؎

اب میں ان کاغذوں کے ٹکڑوں کو گھور کر دیکھتا رہتا ہوں
ایک ایک مصرعے سے یونہی الجھتا رہتا ہوں
ایسا کیوں ہے ...... ایسا کیوں ہے
میں نے انکو بار بار کر اور بھی الجھا ڈالا ہے
من کا نغمہ چیخ بنا۔ اور پھر سناٹے میں کھو سا گیا
کتنے مصرعے کاٹ کے میں نے نئے لکھے لیکن
بات نہیں بنتی یارو!
بات بنے گی کیسے ۔۔۔؟
جب ہر پہلو میں ایک نوکیلا کانٹا ہو
ہر کانٹے میں پھولوں کی ہلکی ہلکی خوشبو ہو
ہر خوشبو میں زہر چھپا ہو
میں نے خود سے پوچھا ہے
کیوں لکھتا ہوں کیوں ۔۔۔؟
یہ اظہار کی بہیلم خواہش
جینے کی بے معنی ہوس
کب تک میرے ساتھ رہیگی
میرے اس سوالوں کے تیز نوکیلے نشتر ہیں
اور بھلا کیا ہے!
ہر لمحہ یہ ۔۔۔ مجھ میں چھپ کر
مرے ساتھ رہا کرتا ہے
میری نظمیں، عکس ہیں اس کا
لرزاں، لرزاں، دھندلا، دھندلا
شاید کچھ کچھ بے معنی سا!"

(باقی صفحہ ۲۷۸)

رات دن غافل! بدوں سے بھی کیا کر نیکیاں   کیا برا ہے اس میں کچھ تیرا بھلا ہو جائیگا (ناسخ)

شاد عارفی کی شاعری کا انفرادی پہلو

مظہر امام

ہماری تنقید عموماً دو ٹوک اور فیصلہ کن بات کرنے سے کتراتی رہتی ہے۔ اکثر ہمارے ناقدین ہاں اور نہیں کے درمیان چکر لگاتے ہیں۔ وہ ادھر بھی رہنا چاہتے ہیں اور اُدھر بھی۔ آپ نے وہ لطیفہ تو سنا ہوگا۔ کسی عالم قسم کے شخص نے اپنے کسی دوست سے پوچھا: "بتاؤ کالے رنگ کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے؟"

بے چارہ سیدھا سادہ تھا۔ اس نے اپنی عدم واقفیت کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے "عالم" دوست سے درخواست کی کہ وہ کالے رنگ کی خصوصیت بتا کر اسے شکریہ کا موقع دے۔

عالم دوست نے انداز تفاخر سے اپنے سر کو جھٹکا دیا اور اپنی ہمہ دانی کا سکہ جماتے ہوئے بولا: "یہی کہ وہ سفید نہیں ہے۔"

اب یہ لطیفہ ہے تو لطیفہ ہی سہی، لیکن اگر آپ اپنی محبوب زبان کے محبوب ناقدین کی تحریریں پڑھیں تو ان کے تنقیدی تجزیوں کو اسی سیاہ و سفید کے دائرے میں محصور پائیں گے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ شاد عارفی کو ہمارے عزیز تنقید نویسوں کے یہاں وہ درجۂ اعتبار نہیں ملا جس کے وہ مستحق تھے۔ شاد عارفی کی شاعری کو نہ تو رنگوں کی مناسبت سے سمجھا جا سکتا ہے اور نہ انہیں کسی خانے میں فٹ کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ انھوں نے اپنے زمانے کے مروجہ اور پسندیدہ اسلوب سے روگردانی کر کے اپنی آواز کو ایک نئی شان عطا کرنے کی کوشش کی۔

شاد مجھے یہ دھن رہتی ہے
اپنا نغمہ، اپنی لے ہو

ایسا نہیں ہے کہ یہ توفیق ان کے علاوہ کسی اور کو حاصل نہ ہوئی ہو۔ لیکن شاد عارفی نے کئی اور بڑے جرم کیے۔ وہ اس کوشش کے پیچھے نہیں دوڑے جس نے اس دور کے کئی شاعروں کو خلعت پسندیدگی عطا کی۔ انھوں نے کئی کمزور لیکن مقبول شعرا کی طرح اپنی شاعری کے زرد چہرے پر تشبیہات و استعارات کا غازہ نہیں ملا۔ وہ نہ کسی تحریک سے براہ راست اور باضابطہ وابستہ ہوئے اور نہ انہوں نے مشاعروں میں نغمہ گری کے یا اداکاری کے جوہر دکھائے۔ شاعری ان کے لیے نہ شہرت اندوزی کا ذریعہ تھی اور نہ تسکین انا کا بہانہ۔ ان کے سوچنے اور کہنے کا ایک خاص ڈھنگ تھا۔ اور انھوں نے وہی کہا اور اسی ڈھنگ سے کہا جو انھوں نے بہتر سمجھا۔ مفتیانِ ادب کی تعریف و تنقید سے بے نیاز وہ اپنے ماحول کی داخلی اور خارجی کیفیات کے مزاج داں تھے۔ انھوں نے فکر و احساس کی روشنی میں سماجی عوامل کی تصویریں بنائیں۔ اپنے ملک کے سیاسی اور معاشرتی نظام کی افراط و تفریط نے ان کے حساس دل پر گہرے زخم لگائے۔ اور انھوں نے تلملا کر اس طنز و ہجو کا حربہ استعمال کیا جس نے شعری پیکروں کو تیز نشتروں میں تبدیل کر دیا۔ ان کے یہاں نہ تو جوش کی سی بلند آہنگی ہے اور نہ فیض کی سی دھیمے سروں میں الاپ۔ شاد عارفی نے نہ رسمی طور پر بغاوت کے نعرے لگائے نہ انقلاب کے نغمے گائے۔ انھوں نے عمل جراحی سے معاشرے کے فاسد مادے کو نکالنا چاہا۔ آنچل کو پرچم بنانے کی تلقین کے پس پردہ وہ نسوانی جسم کے حسین نشیب و فراز کے دیدار کا شوق نہ رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک پرچم ایک ایسے دائمی انقلاب کی علامت تھا جو انسان کی خوش حالی، مساوات اور اخلاقی سربلندی کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ انہیں انقلاب کی دستک اس نظام کے چور دروازے پر سنائی دینے لگی تھی:

یقیں کیجیے انقلاباتِ ہستی
محلات کے سایے سایے کھڑے ہیں

اور اس لیے وہ اربابِ سیاست کو متنبہ کرتے

جھٹ پڑیں نہ کہیں دن میں مشعلیں لیکر
عوام کو یہ سمجھاؤ کہ روشنی کم ہے

شاد عارفی کے طنز کا خاص نشانہ موجودہ سیاست اور سیاست سے متعلق افراد ہیں:

ہر غلط بات پر بھی ہاتھ اٹھاؤ
یہ نمائندگی نہیں ہے، شرماؤ

کہہ رہے ہیں کہ بڑھو پاؤں نگہبانوں کے
آپ ہمدرد ہیں ہم سوختہ سامانوں کے!

جنابِ شیخ سیاست کے پھیر میں پڑ کر
بتانِ دیر کو پروردگار کہتے ہیں!

شاد کے یہاں اس دور کے عام استعاروں شمع، سحر، رہبر، رہزن وغیرہ کا استعمال بے حد وافر ہوا ہے لیکن ان استعاروں کی معنوی تہیں ان کے یہاں عام شاعروں کی بہ نسبت زیادہ ہیں اور یہی وہ وصف ہے جس نے ان استعاروں کو علامتوں کا درجہ دے دیا ہے:

باغباں کو اعتمادِ گلستاں حاصل بھی ہے؟
آپ یہ تحقیق فرمائیں گے؟ آسا دل بھی ہے!

وہاں بہاروں کو باغبانوں سے سازشیں ہا ہو رہی ہونگی
جہاں خزاں نے اٹھا دیا ہو سوال کانٹوں کی آبرو کا

صحنِ گلشن پہ قفس ایجاد دو!
"راستہ بند ہے:" یہ لکھوا دو!!

مطلع کہا ہے، نظمِ وطن کا گلہ نہیں
"پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں"

شاد عارفی کے یہاں عشق و محبت کی والہانہ کیفیات کا اظہار شاذ و نادر ہی ملے گا۔ انھوں نے اپنی کئی نظموں میں عشق کے جنسی پہلو کی طرف اشارے کیے ہیں اور کہیں کہیں جذبۂ عشق پر طنز کے تیر بھی چلائے ہیں۔ افلاطونی محبت کا دخل تو خیر شاد جیسے حقیقت پسند کے یہاں کیا ہوتا لیکن عشق کے [illegible] شستہ اور مہذب احساسات کی نقش گری بھی شاد کے یہاں نہیں ملتی۔ عشق کی تپش و خلش اور سوز و گداز سے ان کا کلام ناآشنا ہے۔ کوچۂ محبوب میں انہیں آبلہ پائی کا

لیتے ہیں ثمر شاخِ ثمر ور کو جھکا کر
جھکتے ہیں سخی وقتِ کرم اور زیادہ (ذوق)

موقع نہیں ملا ۔ یا شاید ان کی افتادِ طبع نے ہی کسی کافر ادا کی بارگاہ میں سرِ تسلیم خم کرنے کی اجازت نہ دی وہ کوچۂ عشق سے گزرے ضرور ہیں ۔ جیسا کہ خود کہتے ہیں :

دو چار برس حضرت حالیؔ کی طرح شادؔ
مجھ کو بھی جنونِ لب و رخسار رہا ہے

لیکن شاید ان کی تشنگیٔ روح کو وصال کی چھلکتی ہوئی گلابی نصیب نہیں ہوئی ۔ حسن ان کی دسترس سے دور ہی رہا ۔ ہو سکتا ہے ان کے لہجے کی تلخی اسی محرومی کی پیدا کردہ ہو ۔ اپنی مشہور نظم " نسبت " میں وہ کہتے ہیں :

وہ چھیتی لباس یہ طرف کہ دیکھ اور ترس
یہ ساریوں یہ رنگ روپ جس پہ کس کو دسترس
" دسترس " کی بات فقط قافیہ ہو گئی
نہیں یہ قافیہ نہیں ، برائے بیت بے اثر
سنیں جو نوحہ خواں رہے ہیں اعتبار حسن پر
یہ کہہ تو دوں کہ میں بھی ان کا ہم خیال ہوں مگر
وہ پھول توڑتے ہوئے مرے قریب آ گئی

شادؔ عارفی کی دلچسپی حسن کے وجود سے اتنی نہیں جتنی چھیتی لباس اور ساریوں سے ہے ۔ اور نظم کا مجموعی تاثر یہی ہے کہ حسن پر ان کی دسترس نہ ہونے کی بات ہی حقیقی ہے ۔ کسی کا پھول توڑتے ہوئے شادؔ کے قریب آ جانا محض ایک لمحاتی سانحہ ہے ورنہ وہ بھی انھیں کے ہم خیال ہیں جو اعتبارِ حسن پر نوحہ خواں رہے ہیں ۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا شادؔ حسن و عشق کے شاعر نہیں ۔ روز مرہ کی زندگی میں نامرادیاں اور حقائق کی تلخیاں اس حد تک سرایت کر گئی ہیں کہ خالی خولی رومان کے لیے زیادہ جگہ باقی نہیں رہ گئی ۔ شادؔ کو بدلے ہوئے حالات کی گراں باری کا عرفان ہے اور وہ اسی گراں باری کے شاعر ہیں :

شادؔ حسن و عشق پر بھی تھی کبھی میری نظر اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے سوچنے کی بات ہے

جی ہاں ، " سوچنے کی بات ہے " ! یہ مستزاد بھرتی کا نہیں ہے ۔ جنونِ لب و رخسار ایک خاص دور میں ہر ایک کو ہوتا ہے ۔ شادؔ کی نظر بھی کبھی حسن و عشق پر تھی ، اب غمِ دوراں نے انھیں اس نگاہ سے محروم کر دیا اب وہ " وابستۂ حالات " ہیں ، لیکن گزرے ہوئے " دو چار برس " کی لطیف یادیں ذہن کے کسی تاریک نہاں خانے میں کسی سہمے ہوئے طائر کی طرح بال فشاں ہوتی ہیں اور انہیں تصورات کی خواب افروز دنیا میں لے جاتی ہے :

آتے ہی اپنے بستر پر
میں ہوتا ہوں اس کے گھر پر

نام نہاد تغزل کی کمی سے قطع نظر کیجیے تو یہ شعر مومنؔ کے مشہور زمانہ شعر سے کسی طرح کمتر نظر نہیں آتا بلکہ شاید اس میں معنوی پیچیدگی زیادہ ہے جو روح کو نئے اہتزاز سے لذت آشنا کرتی ہے اور پھر عاشق کا محبوب کے گھر جانا ، بہ نسبت اس کے کہ محبوب عاشق کے گھر ہمارے ماحول میں زیادہ قرینِ قیاس اور حقیقی معلوم ہوتا ہے ۔

شادؔ نے غزلیں اور نظمیں دونوں ہی کامیابی کے ساتھ لکھی ہیں ۔ دونوں اصنافِ سخن میں ان کا رنگ منفرد اور کئی معنوں میں اکثر شعرا سے ممتاز نظر آتا ہے ۔ ان کے لہجے میں اکھڑپن اور ان کی طرزِ ادا میں ندرت ہے ۔ انھوں نے غزل کی اہمیت کھینچ نرم و نازک ، دھیمے اور مریلے لہجے کی بجائے بے باک کھرا اور واضح لہجہ دیا ہے ۔ وہ غزل کی اہمیت کے قائل ہیں ۔ ان کے خیال میں غزل کی اشاریت سے بھی بڑی بات کے ابلاغ کا کام لیا جا سکتا ہے ۔ وہ حیات و کائنات کے حقائق و معارف کو ، زمانے کی ستم انگیزیوں اور نظامِ حکومت کی چیرہ دستیوں کو غزل میں چابک دستی کے ساتھ سمونے کی اہلیت رکھتے ہیں ۔ اور اس کا دعویٰ بھی کرتے ہیں :

تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
تو لمبی لمبی نظموں سے تو شعر ہمارے کیا کم ہیں

وہ غزل میں صداقت کی تلخیوں کو بیان کی لطافت کے ساتھ پیش کرتے ہیں :

صداقتوں کی تلخیوں کے ساتھ شادؔ عارفی
لطافتِ بیان واقعی غزل کی جان ہے

ہو سکتا ہے ، غزل کے لیے لطافتِ بیان کو وہ لابدی قرار دیتے ہوں ، لیکن خود شادؔ عارفی کے یہاں لطافت کم البتہ ندرت کم و بیش ہر جگہ ہے ۔ ان کی غزل گوئی تقلیدی نہیں جس پر طنز کرتے ہوئے جوشؔ ملیح آبادی نے کہا ہے :

یہ فقط رسمی مقلد وامق و فرہاد کے
مر رہے ہیں آج تک معشوق پر اجداد کے
آج تک غالب ہے ان پر دورِ رقیبِ روسیاہ
کر چکا ہے زندگی جو میرؔ و مومنؔ کی تباہ
پائی ہے ترکے میں ان لوگوں نے پہلے ہی صدا

ان کے لب پر بھی وہی ہے جو وقتی کے لب پہ تھا

شادؔ عارفی اس غزل کے قائل نہیں ، جس میں حسن و عشق کے سطحی اور پست جذبات کا اظہار ہو اور جس کا مقصد محض تفریح یا تفنن طبع ہو : ۔

وہ جو نسنگی ناچتی رہتی ہے بزمِ عیش میں
اس غزل کا شادؔ کیا ، ماحول بھی قائل نہیں

آپ شادؔ عارفی کی کوئی غزل کہیں سے اٹھائیں ، آپ کو لہجے میں جدت اور نیاپن ملے گا ۔ ان کے موضوعات میں خواہ چونکانے والی بات نہ ہو ، لیکن ان کے لہجے میں ہمیشہ ایک چونکانے والی کیفیت ملے گی وہ جادۂ عام پر چلنا بھی اسی طرح کسرِ شان سمجھتے ہیں ، جس طرح آستانِ خواص پر جبہ سائی کو ۔ ان کی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے :

اپنی تقدیر کو پیٹے جو پریشاں ہے کوئی
آپ کے بس میں علاجِ غمِ دوراں ہے کوئی
اپنی مرضی سے تو اُگتے نہیں خود رو پودے
ہم غریبوں کا بہر حال ، نگہباں ہے کوئی
زرد چہروں نے تبسم کو کیا ہے رسوا
ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی
چاپ سن کر جو ہٹا دی تھی ، اٹھا لا ساقی
شیخ صاحب ہیں ، میں سمجھا تھا مسلماں ہے کوئی

شادؔ بھاری بھرکم الفاظ کا سہارا نہیں لیتے لیکن ان کے اشعار کی معنوی سطح شاید ہی کبھی پست ہوتی ہو ۔ وہ سیدھے سادے عام فہم الفاظ میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کے قائل ہیں ۔ اس ان کی غیر معمولی ابلاغی صلاحیت کا ثبوت ملتا ہے ۔ رمزیت اور اشاریت ان کی غزلوں کا خاص وصف ہے لیکن ان میں کہیں ابہام یا پیچیدگی نہیں ۔ ایک اور غزل کے اشعار دیکھیے ، کتنے سادہ لیکن کتنے بلیغ !

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں
سمجھ سکو تو ٹھکانے کی بات کرتا ہوں
سحر کو شمع جلانے کی بات کرتا ہوں
یہ غافلوں کو جگانے کی بات کرتا ہوں
روش روش پہ بچھا دو ببول کے کانٹے
چمن سے لطف اٹھانے کی بات کرتا ہوں
" وہ باغبان جو بو دوں سے بیر رکھتا ہے "
یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں
شرابِ سرخ کی موجوں سے مدعا ہو گا
اگر میں خوں میں نہانے کی بات کرتا ہوں

زندگی نے وفا نہ کی ورنہ میں تماشا وفا کا دکھلاتا (میر حسن)

وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے، اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

نقاب روئے زمانہ نہ اٹھ سکے گی کہ میں
گلوں سے اوس اٹھانے کی بات کرتا ہوں

گھسے ہوؤں کو نئی فکر دے رہا ہوں شاد
سمجھے ہوؤں کو سکھانے کی بات کرتا ہوں

لگے ہاتھوں اس غزل پر قبلہ کلیم الدین احمد کی "عملی تنقید" بھی دیکھ لیجیے :

"" بات کرتا ہوں"، بات کیجیے۔ اس میں چنداں مضائقہ نہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھیے کہ کوئی نئی بات ہے یا کوئی آپ کی بات کو سمجھ نہیں سکتا ہے۔ "سمجھ سکو"، "نئی فکر دے رہا ہوں" ـــــ اپنے منہ میاں مٹھو سے اس قسم کی چیزوں کی وقعت نہیں :

وہ صرف اپنے لیے جام کر رہے ہیں طلب
میں ہر کسی کو پلانے کی بات کرتا ہوں

ہر کسی کو پلانے کی بات کرتے ہیں ـــ اور بھی بہت سے لوگ یہ بات کرتے ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ باتوں کو اس شان سے کہنا مذاق صحیح و لطیف کی کمی کی غمازی کرتا ہے۔"

آپ کو بھی مزہ تو آیا ہوگا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "ہر کسی کو پلانے والا" شعر اپنے اندر کوئی ندرت نہیں رکھتا لیکن صرف ایک شعر کی بنیاد پر "مذاق صحیح و لطیف کی کمی" کا فتوا دے دینا کلیم صاحب جیسے مفتی کا ہی کارنامہ ہو سکتا ہے۔ "سمجھ سکو" اپنے منہ میاں مٹھو قسم کی چیز نہیں اگر صرف یہ کہا جائے کہ

چمن کو آگ لگانے کی بات کرتا ہوں

تو عام آدمی ہی نہیں، شاید کلیم صاحب بھی اسے مجذوب کی بڑ سمجھیں گے اور شاعر کو یہ سمجھانا مقصود ہے کہ یہ ٹھکانے کی بات ہے غالباً شاد عارفی کی نظر سے یہ "عملی تنقید" نہیں گزری ورنہ ممکن تھا وہ اس طرح کا کوئی شعر کہہ ڈالتے :

کبھی تو بات کرو تک کی، جب لکھو تنقید
ارے کلیم! ٹھکانے کی بات کرتا ہوں

شاد عارفی سراپا، اول تا آخر شاعر تھے۔ انھیں اپنے منصب شعری کی آبرو کا لحاظ تھا۔ کئی گرم و سرد آندھیاں چلیں، بڑے بڑوں نے حالات کے آگے جبین نیاز جھکا دی، لیکن شاد کے پائے استقامت میں لغزش نہیں آئی۔ انھوں نے حالات سے سمجھوتا کرنا سیکھا ہی نہ تھا۔ انھیں اس تلخ حقیقت کا شدید احساس تھا کہ موجودہ دور شعر و ادب کے لیے ناسازگار بنتا جا رہا ہے اور صرف تخلیقِ فن کے سہارے زندہ رہنا محال ہو گیا ہے۔ انھیں اس امر کا بھی ادراک تھا کہ شاعری جو کبھی ذہنی انقلاب کا سرچشمہ تھی، اب اپنی اہمیت کھوتی جا رہی ہے۔ وہ طنزاً دل برداشتہ ہو کر کہتے ہیں :

اس نے جب سنو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی ! !

غزل چپکانے سے کیا ہوتا ہے! روئی کے گالوں کی طرح نرم و نازک شاعری سے ظلم کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ جبر و استبداد سے نبرد آزما ہونے کے لیے شاعر کو اپنے کلام میں تلوار کی تیزی اور نیر کی چبھن پیدا کرنی پڑتی ہے۔ شاد عارفی زندگی بھر یہی کوشش کرتے رہے۔

شاد کی شخصیت اور شاعری میں کوئی بُعد نہ تھا وہ اوپر سے کچھ اور، اندر سے کچھ اور نہ تھے۔ دنیاوی جاہ و جلال، آرام و آسائش، عزت و منصب، روس و امریکہ کا سفر ــ ان کے آدرش نہ تھے۔ اور نہ انہیں محفلِ خوباں ہی میں سرخرو ہونے کی ہوس تھی۔ وہ اپنے ماحول اور حالات زمانہ کے نبض شناس تھے۔ اور ایک بہتر، پرسکون، خوش حال زندگی کے نقیب۔ انھیں انسانیت کے ناسوروں کا علم تھا۔ جن کا علاج وہ مرہم سے نہیں، بلکہ نشتر سے کرنا چاہتے تھے، کیونکہ ان ناسوروں میں بھرے ہوئے فاسد مادّے کو خارج کیے بغیر چارہ نہیں۔ انہیں فیض کی طرح علم تھا کہ

نیرے آزار کا چارہ نہیں نشتر کے سوا

لیکن فیض نے یہ کہہ کر اپنی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھا لیا کہ

اور یہ سفاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی روح کے قبضے میں نہیں
ہاں، مگر تیرے سوا، تیرے سوا

شاد عارفی غیر ذمہ دار نہیں، وہ حالات کا جائزہ صبر و استقلال سے لیتے ہیں اور حقائق سے نظر نہیں چراتے وہ ایک ماہر جرّاح کی طرح زخموں پر نشتر زنی کرتے ہیں۔ بظاہر بے رحمی کے ساتھ، لیکن ساری کائنات کا درد اپنے سینۂ مجروح میں چھپائے ہوئے۔

ہلکے پھلکے طنز سے گویا گھٹے گھٹے بفور دیکھا !!
جس نے مجھ کو گھور کے دیکھا، میں نے اس کو ہنس کر دیکھا

ظاہر ہے یہ ہنسی بڑی تحقیر آمیز ہنسی ہے ـ بے حد دل شکن، زہر کی طرح رگ و پے میں سرایت کر جانے والی۔ تحقیر آمیز طنز کی لَے غالب کے یہاں بھی ملتی ہے لیکن جس حد تک شاد عارفی کے یہاں ہے، غالباً اردو کے کسی اور شاعر کے یہاں نہیں۔ اس طنز میں وہ نشتریت ہے جو روح کی گہرائیوں اترتی چلی جاتی ہے :

اصطلاحاً بُرے کو بھلا کہہ دیا
یعنی گالی نہ دی، رہنما کہہ دیا !

شاد عارفی کے لہجے میں ایک طرح کا اکھڑ پن (Roughness) ہے۔ جو بے تکلف بات کہنے (outspokeness) سے پیدا ہوتا ہے۔ ان کے لہجے میں وہ رسمی تہذیب و شائستگی نہیں ملے گی جس کے ڈانڈے ریاکاری سے ملتے ہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں برملا کہتے ہیں۔ نہ کسی سے خوف کھاتے ہیں نہ کسی سے نرمی برتتے ہیں :

ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں
ہم کسی خانہ برانداز سے ڈرتے ہی نہیں

شاد کے اندازِ بیان میں جو تیکھا پن ہے، اس کی مثال موجودہ اردو شاعری میں کم ہی ملے گی۔ ان کے کلام میں صداقت اور برجستگی کے ساتھ خلوص بھی ہے اور جذبے کی گرمی بھی۔ اور اسی لیے وہ بڑی بے باکی سے ڈٹ کر کہتے ہیں :

میں دنیا پر طنز کروں گا
دنیا میرے کیوں در پے ہو

مجھے منصب پیغمبری کی ہوس نہیں، لیکن ادب میں پیشین گوئی کو کچھ اتنا معیوب بھی نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہماری نسل نے جس طرح راندۂ درگاہ سخن یگانہ کو پھر سے کرسیِ منزلت پیش کی، اسی طرح وہ شاد عارفی کو بھی مسندِ عظمت پر لا بٹھلائے گی۔ شاد عارفی کا فن جدید نسل کے احساس اور طرزِ احساس سے زیادہ قریب ہے۔

ـــ × ـــ

مے بھی ہے، مینا بھی ہے، ساغر بھی ہے ساقی نہیں   دل میں آتا ہے لگا دیں آگ میخانے کو ہم (نظیر اکبر آبادی)

سہیل مالیگانوی کی رومانی رباعیاں

ایک مطالعہ

ڈاکٹر امانت، ایم اے، پی ایچ ڈی
صدر شعبۂ اردو فارسی، پونہ یونی ورسٹی
پونہ

اک بوند سی سینے میں مچل جاتی ہے!
دنیا ہی مرے دل کی بدل جاتی ہے!
میں ایسی گلی سے بھی گزرتا ہوں سہیلؔ!
جس میں مری رفتار بدل جاتی ہے

رباعی کی خاص بحر اور اوزان ہوتے ہیں مثنوی اور غزل کی طرح لفظ رباعی بھی عربی زبان سے نکلا ہے مگر ان میں فن رباعی سب سے زیادہ مشکل ہے۔ رباعی کے پہلے دو مصرعے اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ چاروں مصرعوں میں کوئی مصرع بھرتی کا نہیں ہوتا۔ اور چوتھا مصرع تو خصوصاً پہلے تین مصرعوں سے زیادہ زوردار، موثر اور اہم ہوتا ہے۔ اس میں ایک ہلکی سی ڈرامائی کیفیت ہوتی ہے اور قاری یا سامع کے دماغ میں اس کی گونج دیر تک باقی رہتی ہے۔ ضیاء احمد بدایونی فرماتے ہیں:۔

"رباعی چار مصرعوں کی مختصر نظم ہے جس کا وزن خاص ہوتا ہے، اور تین مصرعے (پہلا، دوسرا اور چوتھا) لازماً ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پھر یہ بھی شرط ہے کہ چوتھا مصرع سب سے زیادہ چست، پر زور اور تمام رباعی کا نچوڑ ہو۔ ان قیود کے باوجود اس کی دل آویزی کا یہ حال ہے کہ مشکل سے مشکل خیال کے اظہار کے لیے اس سے بہتر کوئی صنفِ شاعری نہیں سمجھی جاتی۔"

اور راہی معصوم گنوری رباعی کی تعریف یوں بیان کرتے ہیں:۔

"رباعی۔ ایک مخصوص بحر میں دو مسلسل شعر قافیہ یا ردیف، قافیے کی پابندی کے ساتھ کسی خاص بات کے متعلق ہوتے ہیں، جنکی زمین بالکل غزل کی ہوتی ہے یعنی مطلع، ردیف، قافیہ جو غزل کی خصوصیات ہیں ان کو لازمی ہیں۔ رہا نفس مضمون تو فرق اتنا ہے کہ رباعی دو شعر میں ایک چیز پیش کرتی ہے اور غزل اس کو ایک شعر میں۔"

فارسی زبان میں باکمال رباعی گو شعراء میں سلطان ابو سعید، ابو الخیر، باباطاہر، عمر خیام سحابی نجفی اور سرمد سب سے زیادہ مشہور ہیں رباعیات عمر خیام کو یہاں تک حسن قبول حاصل ہے کہ یورپ کی مختلف زبانوں میں ان کا ترجمہ ہو چکا ہے اور ان کے دلکش اور دیدہ زیب مصوّر اور غیر مصوّر اڈیشن منظر عام پر آچکے ہیں۔ راقم الحروف کی نظروں سے ایک نہایت عمدہ امریکی مصوّر اڈیشن بھی گزرا ہے جسے بڑے اہتمام سے زیورِ طبع سے آراستہ کیا گیا ہے۔

عمر خیام کی رباعیات کا ماحصل وہ چند مضامین ہیں جن کو وہ الٹ پھیر کر مختلف پیرایوں میں بیان کرتا ہے۔ مثلاً دنیا کی بے ثباتی، زمانے کی ناقدر شناسی، لاادریت، جبر، شراب و ساقی کی تعریف اور ریاکاری و منافقت کی مذمت۔ تکرار کے باوجود عمر خیام کے اندازِ بیان کی ندرت و لطافت اور طنز و شوخی کی چاشنی سے ہر بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی بالکل نئی بات کہی جا رہی ہے۔

خیام کا حکیمانہ دماغ مسائلِ حیات کو حل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ناکامی کی صورت میں سقراط کی طرح لاادریت کی آغوش میں پناہ لیتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ

"معلوم شد کہ ہیچ معلوم نشد"

خیام کا مشورہ یہ ہے کہ ساغرِ شراب میں رنج و مسرت کے احساسات و جذبات کو غرق کر دیا جائے اور حیاتِ مستعار کو زندہ دلی اور خوش وقتی سے گزار دیا جائے۔

اردو میں یوں تو تقریباً سبھی اساتذہ میرؔ، غالبؔ اقبالؔ، سیمابؔ وغیرہ نے صنفِ رباعی پر طبع آزمائی کی ہے، لیکن انیسؔ و دبیرؔ، مرزا یگانہ چنگیزی، جوشؔ ملیح آبادی، فراقؔ گورکھپوری، شادؔ عظیم آبادی اور امجدؔ حیدر آبادی کے بعد سہیلؔ مالیگانوی رباعی گو کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ سہیلؔ بھی عمر خیام کو یوں نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہیں:

اک چیز نشاپور سے بھیجی ہے مجھے
مے خانۂ معمور سے بھیجی ہے مجھے
رندانِ دکن کا بھی مقدر جاگا
ساقی نے بہت دور سے بھیجی ہے مجھے

"سفینہ" کے دیباچے میں سہیلؔ عرفی کی زبان سے کہتے ہیں:

العطش می زند از تشنہ لبی ہر موئم
کہ قدح ہائے پر از خونِ جگر باختہ ام

(میرا ہر رواں پیاس کے مارے العطش العطش پکار رہا ہے کیونکہ میں نے خونِ جگر سے لبریز جام کے جام لنڈھا دیے ہیں)۔۔۔۔۔۔

خیالات کی ترجمانی کے لیے نظم کی مختلف قسمیں ہیں۔ ان قسموں میں سب سے مختصر قسم قطعہ یا رباعی ہے اردو شعراء نے رباعی کی طرف کم توجہ دی ہے، کہنے کو تو ہر شاعر نے دس بیس رباعیاں کہی ہیں، مگر وہ نہ کہنے کے برابر ہیں، برخلاف اس کے فارسی میں چند شاعروں نے کافی تعداد میں بہترین رباعیاں لکھی ہیں جن میں "خیام" سب سے برتر ہے۔"

(سفینہ ص ٧ و ص ٨)

موصوف نے راقم الحروف کے نام اپنے مکتوبِ گرامی مورخہ ۴ مئی ۱۹۶۰ء میں اپنی شعر گوئی پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:۔

"میری شاعری کا آغاز ۱۹۲۴ء سے ہوا۔ اور سن ۲۳ء میں اس کا اظہار ہوا۔ رباعی کا شوق بہت پہلے سے تھا۔ چنانچہ غزل گوئی سے پہلے میں نے اسی صنف میں مشق کی اور بعد میں معلوم کیا صرف لاحول کے وزن پر رباعی کہنے سے فائدہ نہیں اس کے بعد جو کچھ کہا وہ فنی معلومات حاصل کرنے کے بعد کہا۔

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں — تیری زلفیں جسکے شانوں پر پریشاں ہوگئیں (غالبؔ)

ابھی ابھی مجنوں گورکھپوری نے ایک مقالہ "ہماری زبان" کے سپرد کیا ہے جو ہر لحاظ سے حجت قاطع تھا، مگر جدت پسند حضرات کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔

نشتر جالندھری نے بتایا کہ عروض و ضرب کے بعد ۲۴۰ وزن (کذا) پیدا ہوئے ہیں۔ بابا طاہر کی رباعیات قریب ایسے ہی اوزان میں ہیں، جن میں روانی کم ہے۔ بعد میں سعدی، جامی اور ان کے جیسے شعرا نے رواں اوزان چُنے۔ . . . .

میر سے پہلے جامی، ملا غیاث، جلال لکھنوی اور جلال الدین زینبی الہ آبادی کے نسخے ہیں۔ وہ بھی تھوڑے اختلاف سے ہیں، مگر سب رواں ہیں۔ . . .

میں نے "سفینہ" میں ایسے ہی اوزان کو کھا ہے جو رواں ہیں۔ بعض مصرعے مشکل وزن میں آگئے ہیں۔ ریویو کے لیے جب یہ مختصر کتاب جو حسن کتابت و طباعت سے عاری تھی، لوگوں کے سامنے آئی تو انھوں نے کچھ تعریف اور تنقیص کی۔ نگار نے کہا: "بعض مصرعے خارج از اوزان ہیں۔" میں نے پوچھا کہ کون سے مصرعے ہیں؟ جواب ملا کہ نہیں ملا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ وزن ہوتا تو اچھا تھا۔" . . . .

(ڈاکٹر) ذاکر حسین نے بھی خط میں بڑی تعریف کی۔ آخر میں ایک پُرمعنی جملہ لکھ گئے "اور لکھیے" میں اس کی تحریر سے خوش ہوا۔ خصوصاً "اور لکھیے" سے۔

محترم آثر لکھنوی نے بھی خوب تعریف کی اور بتایا کہ اگر جوش اور یگانہ کی موافقت نہ اختیار کیجیے . . . "

"سفینہ" کے "پرتو" میں آدیب مالیگانوی اس طرح رقم طراز ہیں :-

"میرے عزیز دوست سہیل مالیگانوی بہ اعتبار عمر تو ملک کے نوجوان شعرا ہی میں شامل ہیں، لیکن مشاہدات کی قوت و وسعت اور نشیب و فراز زمانہ سے گہری شناسائی نے انھیں قبل از وقت پیرانِ کہن کی انجمن میں لا بٹھایا۔ شاعرانہ قوت بیان، ذہانت اور فکر و نظر کی بلندی کو دیکھیے تو افسوس ہوتا ہے کہ اس ناآشنا دیس میں وہ کیوں پیدا ہوئے . . . . ."

میں نے سفینہ کی رباعیاں ٹھہر ٹھہر کر مزے لے لے کر پڑھی ہیں۔ کہیں عبرت نے آنکھیں کھول دیں، کہیں دل و دماغ میں بجلی سی لہرانے لگی . . . . ."

ڈاکٹر نصاری نے "دردو داغ" کے مقدمے میں سہیل مالیگانوی کی علمیت، فارسی دانی اور رباعی گوئی کو بے حد سراہا ہے، فرماتے ہیں :-

"عمر بھر فارسی علم و ادب کا ورد کرنے والا، انیس برس بچوں اور لڑکوں لڑکیوں کو مدرسے میں درس دینے والا شفیق استاد، ہمدرد، ہم جماعت، نازک مزاج اور دردمند شہری، دل سے بیدل کا چاہنے والا سہیل اپنے گھر کے گوشے میں داد فریاد سے غنی، اسباب و حالات سے مستغنی، خوش کلام شاعر سہیل گنے چنے لوگوں میں جیتا ہے۔ کسی کو معلوم نہیں کہ فارسی کے کلاسیکی سرمایے پر اس شخص و شاعر کی کیا وسیع اور گہری نظر ہے۔ صرف مالیگاؤں نہیں پورا ہمارا شہر اگر سہیل کی فارسی شناسی پر ناز کرے تو کچھ مبالغہ نہ ہوگا . . . . ."

اور

"وہ سہیل، جو نے نشتر برس پورے کر کے نئی ہمت، نئی جان میں پار رہے ہیں، پیری میں ہوا پانی بنتے نئے قلم کی روانی اور پختگی ہے۔ کلام میں استادانہ شان اول دن سے تھی، اب اس میں زندگی پیدا کرنے کی تجدید کرنے کی آن بھی آگئی ہے۔"

اس وقت "سفینہ" اور "دردو داغ" دونوں ہمارے پیش نظر ہیں اور ہم حضرت سہیل کی رومانی رباعیات کا مختصر جائزہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :

سینے میں گزرتے ہیں جو کوچے سے وہ
کندھا بھی کہاروں کو بدلنے نہیں دیتے

غالب کا محبوب جب ان کے کوچے سے گزرتا ہے تو کہاروں کو تاکید کرتا ہے کہ خبردار! کندھا نہ بدلنا یہ ہمارے عاشق شیفتہ کا کوچہ ہے۔ اس کا ہمیں دیکھ کر عالم جوش جنوں میں کوئی نازیبا و ناگوار حرکت کر بیٹھنا خلاف توقع نہیں ہے۔ بہر حال ایک اضطراری کیفیت محبوب پر طاری ہے اور وہ جتنی جلد ممکن ہو عاشق کے کوچے سے گزر جانا چاہتا ہے۔ اور سہیل کہتے ہیں:

اک ہوک سی سینے میں مچل جاتی ہے
دنیا ہی مرے دل کی بدل جاتی ہے
میں ایسی گلی سے بھی گزرتا ہوں سہیل
جس میں مری رفتار بدل جاتی ہے

یہاں معاملہ برعکس ہے۔ عاشق محبوب کے کوچے سے گزر رہا ہے۔ اس کے سینے میں ایک ہوک سی مچل جاتی ہے۔ دنیائے دل دگرگوں ہو جاتی ہے اور رفتار میں فرق آجاتا ہے۔

اللہ! اللہ! ابتدائے عشق کا عالم! محبوب کے کوچے سے گزرتے ہوئے عاشق کے دل کی کیفیت کی، الفاظ میں اس سے بڑھ کر اور کیا ترجمانی ہو سکتی ہے؟

مست شباب محبوب کی محشر خرامیاں ملاحظہ ہوں کیا تجاہل عارفانہ ہے!:

انسان ہے کہ آفتاب دیکھو تو سہی
اک قہر ہے یا شباب دیکھو تو سہی
رفتار سے اس کی اٹھ رہا ہے طوفان
یا حشر ہے ہم رکاب دیکھو تو سہی

یا بادۂ پُرسرور لہراتا ہے
یا شعلۂ شمع طور لہراتا ہے
اے جانِ سہیل اپنی رفتار تو دیکھ
اک موجۂ رنگ و نور لہراتا ہے

محبوب اپنے پیکر تابناک اور گلابی ملبوس میں سراپا صبح بنارس نظر آتا ہے اور گیسو موجۂ آب گنگ کا منظر پیش کرتے ہیں :

پائی گل خورشید نے تجھ سے ہی نمو
ہیں موجۂ آب گنگ تیرے گیسو
یہ پیکر تابناک و گل گوں ملبوس
گویا ہے تن صبح بنارس ہے تو

تو صبح بنارس ہے کہ شیراز کی صبح
آواز تری ہے پردۂ ساز کی صبح
سنبل کو ملی تیری مہکتی ہوئی رات
پائی ہے چنبیلی نے ترے ناز کی صبح

ارباب بصیرت کے لیے دیدار جمال یار سے بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اور جب محبوب کی دل نواز، حیا پرور ادائیں عاشق کے خرمن دل پر بجلیاں گراتی ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتا ہے:

اندازِ حیا کا آج دیکھا ہے شباب
مینا سے چھلک پڑی ہے جیسے مے ناب
اللہ رے روئے عرق آلود ترا!!
شاداب ہے شبنم کی تراوٹ سے گلاب

کہاں محبوب کی لمبی لمبی پلکیں اور کہاں کانٹے! اور تو اور پھول بھی روئے نگار کی دلکشی و دل آویزی سے قطعاً محروم ہیں۔ ہر بار بڑوس بہار سنور سنور کر آتی ہے تاکہ میرے محبوب کو نیچا دکھائے، لیکن ہر بار

سلہ ۲۴۰ وزن بحوالہ خضر عروض ۳۵۵ و ابوالعروض ۳۵۵

اسے منہ کی کھانی پڑتی ہے:

ہر بار سنور سنور کے آتی ہے بہار
ملتا نہیں اربابِ محبت کو قرار
کانٹوں میں نہیں ہے اشانِ مژگانِ دراز
پھولوں میں کہاں دلکشی روئے نگار

اور ایسے حسین و جمیل محبوب کی محبت نصیب ہو تو عاشق ساری کائنات کو پائے ناز سے ٹھکرا دیتا ہے:

جب عشق کامل گیا سہارا مجھ کو!
جب درد محبت نے ابھارا مجھ کو!
خورشید و قمر سے میں نے دامن جھٹکا
کونین نے گھبرا کے پکارا مجھ کو!

میرا محبوب دلجوئی کر رہا ہے۔ وہ پیہم عیب گری میں مصروف ہے، مگر میرے چاک گریباں کے اندر کیسے کرب ابھرتا ہی چلا جا رہا ہے:

اب دستِ محبت میں ہے داماں میرا
ہے سازِ حیات سوز پنہاں میرا
وہ عیب گری کرتے رہے لیکن اب
بڑھتا ہی گیا چاک گریباں میرا

جس دن سے محبت میں مرا گریبان چاک ہوا ہے۔ ہر پھول متوالا ہوا ہے اور اپنا گریباں چاک کر رہا ہے۔ حسنِ التعلیل کی اس سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے!:

گلشن کا نہ میں ہوں، نہ گلستاں میرا
کانٹوں سے الجھ گیا ہے داماں میرا
ہر پھول ہے کس حال میں دیکھو تو سہی
جس دن سے ہوا چاک گریباں میرا

انتظارِ محبوب کا یہ عالم ہے:

آنکھوں میں سما گئی ہے برسات کی رات
روتے ہی گزرتی ہے مری رات کی رات
بیٹھا ہوں میں کب سے شمعِ امید جلائے
سوئی ہے کہاں تیری ملاقات کی رات

آرزوئے وصل کی شدت رنگ لاتی ہے۔ عاشق کو اپنے ہی تن سے بوئے یار آتی ہے: یعنی من تو شدم، تو من شدی:-

یار اس کی جو بے صبر و قرار آتی ہے
کانوں میں محبت کی پکار آتی ہے
یہ آرزوئے وصل کی شدت یعنی
اب اپنے ہی تن سے بوئے یار آتی ہے

روئے یار مدت سے آنکھوں میں بسا ہوا ہے اور شاعر اپنے "پھول" کی آمد کا منتظر ہے:

پوشیدہ ہے چاند اشکبار آنکھوں میں
مدت سے بسا ہے اک دیار آنکھوں میں
اشکوں میں بھی ہے خونِ جگر کی سرخی
اک پھول کا ہے انتظار آنکھوں میں

یارِ مہرباں آتا ہے تو "سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا" کے مصداق قوتِ گویائی سلب ہو جاتی ہے۔ آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں اور کان سماعت سے محروم ہو جاتے ہیں:

آغوش سے اپنی دور ہوتا ہوں میں
یوں ہجر میں اپنی جان کھوتا ہوں میں
جس وقت وہ یارِ مہرباں آتا ہے
بے چشم و زبان و گوش ہوتا ہوں میں

لیجئے، روٹھا ہوا یار لوٹ آیا۔ اب اس کے خیر مقدم کے لیے کچھ تو اہتمام کرنا ہی ہو گا:

بچھڑی راتوں کو ملانا ہوگا
خاموش چراغوں کو جلانا ہوگا
روٹھا ہوا یار گھر یہ آیا ہے سہیل
اک بار کلیجے سے لگانا ہوگا

لطفِ وصال دیکھیے:

دل دل سے ملا نظر نظر سے مسعود
آغوش در آغوش ہے مستی و سرور
یہ لذتِ ذوق و شوق، یہ لطفِ وصال
آئینہ ہے آئینے کے دیدار سے چور

محبوب کے رخِ رنگیں سے گلستانِ سحر کی رنگت نمودار ہو رہی ہے۔ اس کے سینے میں جوشِ طوفانِ سحر پنہاں ہے اور اس نازنین پیکرِ نور کی ہر بات اور ہر ہر ادا میں روحِ سحر جھلک رہی ہے:

یہ چہرے سے عیاں رنگِ گلستانِ سحر
سینے میں نہاں ہے جوشِ طوفانِ سحر
اس نور کے پتلے کو ذرا دیکھو تو
ہر بات میں، ہر ادا میں ہے جانِ سحر

محبوب کے ابرو کے اشاروں سے شاخِ گل نے لچکنا سیکھا ہے:

پھولوں نے ہوا کھا کے جھکنا سیکھا
بلبل نے مہک پا کے چہکنا سیکھا
جب سے ترے ابرو کا اشارہ پایا!
ہر پھول کی ڈالی نے لچکنا سیکھا

دمِ رخصت اس جانِ تمنا کی آنکھوں میں ڈھلکتے ہوئے آنسو اور الجھے ہوئے گیسوؤں کے نظارے کی دلِ عاشق میں تاب نہیں ہے۔ اس کی رخصت سے سنبل و گل پر بے خودی طاری ہو جاتی ہے۔ نرگس مہر بہ لب ہے تو کلی محجوب سی۔ ہنگامِ سحر جب محبوب رخصت ہوتا ہے تو ایسا لگتا ہے گویا بہار بڑے ہی شرمیلے لجیلے انداز سے پہلو سے اٹھ رہی ہے:

آنکھوں میں ڈھلکتے ہوئے آنسو دیکھے
اس طرز، اس انداز کے جادو دیکھے
اس جانِ تمنا کے بہ ہنگامِ وداع
کیسے کوئی الجھے ہوئے گیسو دیکھے

ہے سنبل و گل پہ بے خودی چھائی ہوئی
نرگس چپ ہے، کلی ہے شرمائی ہوئی
ہنگامِ سحر اس کی جدائی مت پوچھ
پہلو سے اٹھی بہار شرمائی ہوئی

محبوب کے رخصت ہونے کے بعد بھی عاشق کو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ؎

ہر رنگ میں، ہر حال میں ہر صورت میں
لگتا ہے یہی کسی کی آغوش میں ہوں

عاشق نے یادِ محبوب کو سینے سے لگا رکھا ہے اور یادِ یار بھی اس حسنِ سلوک سے بے حد مسرور و شاداں ہے ؎

مسرور ہے یادِ یار میرے دل میں
خوش ہے غمِ روزگار میرے دل میں

سیہ خانۂ دل میں محبوب کی یاد بسی ہوئی ہے اور تصور میں محبوب یوں جلوہ پیرا ہے جیسے کوئی خوش رنگ تتلی گلشن میں تھرکتی اڑ رہی ہو۔ کتنی حسین تشبیہ ہے!:

ہے یاد سیہ خانۂ دل میں تیری
یا رات کی ظلمت میں چمک جگنو کی
اس طرح خیال میں ہے تو جلوہ طراز
گلشن میں تھرک رہی ہو جیسے تتلی

وہ بھی کیا دن تھے:

گل پوش فضا تھی اور نگاہیں تیری
تاروں سے بھری ہوئی تھیں راہیں تیری
میرے دلِ افسردہ کو ہے یاد اب تک
معمور تھیں رنگ و بو سے بانہیں تیری

گویا ←

پھرتا ہے سیلِ حوادث سے، کہیں مردوں کا منہ
شیر سیدھا تیرتا ہے وقتِ رفتن آب میں (ذوق)

؎ خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔
میں نے تو تجھے بھلا دیا ہے لیکن ۔ کیا تو بھی مجھے بھول گیا؟ بندہ نواز!

سیلابِ غمِ ہجر میں بھی امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹتا :۔

پرسش کے لیے کبھی تو یار آئے گا!
تیرے دلِ محزوں کو قرار آئے گا!
مٹی ہو جا سہیل اس کے غم میں
آخر تو کبھی سوئے مزار آئے گا!

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا ؎

کس پھول سے پیار کر لیا ہے میں نے
دامن کانٹوں سے بھر لیا ہے میں نے

حسینانِ جہاں بڑے ہی شقی القلب ہوتے ہیں۔ بے رُخی، کج روی اور تغافل ان کا شعار ہوتا ہے۔ ان کا غرور تکبّر ملاحظہ ہو:

خوبانِ جہاں بنتے سنورتے ہی رہے
دن رات سنگھار اپنا کرتے ہی رہے
دیکھا نہ نظر اُٹھا کے اللہ رے غرور
عشاق کے تابوت گزرتے ہی رہے

ہر بوالہوس نے حسن پرستی اپنا شعار بنا لیا ہے۔ اب آبروئے شیوۂ اہلِ نظر جاتی رہی۔ سمن زاروں میں تسکینِ قلب و جگر ناممکن ہے۔ کیونکہ پھولوں کے چاہنے والوں میں سب ناگ ہی ناگ بھرے ہیں ؎

تسکینِ جگر کہاں سمن زاروں میں
جب سانپ ہوں پھولوں کے پرستاروں میں
ناچار حسرت دل سے کنارہ کش ہو جاتی ہے

شبنم کراہنے لگتی ہے اور دکھ درد کے مارے کلیاں بھی سسکیاں بھرتی ہیں:

دل سے حسرت کنارہ جب کرتی ہے
جب فرطِ الم سے آرزو مرتی ہے
شبنم بھی کراہتی ہے اس وقت سہیل
اور دکھ سے کلی بھی سسکیاں بھرتی ہے

کلی کھل کر جب پھول بن جاتی ہے تو اسے دامنِ ناز میں جگہ ملتی ہے ۔ اور آفتاب شبنم کے موتیوں کو اپنی پلکوں سے چن لیتا ہے لیکن میرے دلِ بے کس و مجبور کا کوئی بھی پرسانِ حال نہیں۔

غنچہ ہنستا ہے پھول بن جاتا ہے
وہ دامنِ ناز میں جگہ پاتا ہے
چن لیتا ہے شبنم کو پلک سے سورج
مجھ کو دلِ بے کس پہ ترس آتا ہے

ترکِ تعلقات کو عرصہ گزر چکا۔ عہدِ محبت کی حسین یادیں سینے میں محفوظ ہیں۔ لیکن اب دنیا جہان میں کہیں اپنا ٹھکانہ نہیں:

ہے یادِ محبت کا زمانہ اپنا
وہ اس کی گلی میں آنا جانا اپنا
مدت ہوئی اس کا آستانہ چھوٹا
دنیا میں کہیں نہیں ٹھکانہ اپنا

اس لیے اے دل! تو:

اظہارِ وفا میں خود کو برباد نہ کر
الفاظ کے پردے میں اسے یاد نہ کر
اور اے سہیل آپ اشکباری سے باز آ جائیے
(شاعر اپنے آپ کو سرزنش آمیز نصیحت کرتا ہے):

کچھ اپنے سفینہ پر ترس کر ظالم
جائے گا کہاں اتنا برس کر ظالم
کیا کہیے ترے دیدۂ گریاں کو سہیل
رونا کوئی برسات ہے، بس کر ظالم

قافلۂ دل، غم کے ہاتھوں کب کا لٹ چکا ہے۔ اب اکھڑی ہوئی سانسوں کے سوا کچھ بھی باقی نہیں رہا:

فریاد! کہ دل کا ساز ٹوٹا کب سے
دامانِ نشاط و عیش چھوٹا کب سے
اب کچھ نہیں اکھڑے ہوئے سانسوں کے سوا
غم نے مرے قافلے کو لوٹا کب سے

مگر......

غم خانہ مرا، بہر خدا باقی ہے
سینے میں محبت کی ضیا باقی ہے
آندھی میں اڑے ہزاروں تختِ طاؤس
اربابِ وفا کا بوریا باقی ہے

اک قصۂ زریں ہے جسے سنتا ہوں
اک ساز کی دھن ہے کہ جسے دھنتا ہوں
امید کا عالم بھی عجب عالم ہے
اک عمر سے سورج کی کرن چنتا ہوں

"لالچ، سکون اور عافیت کا دشمن ہے"
(بزرجمہر)

قارئینِ "اسباق" کی خدمت میں پُرخلوص
عید مبارک

دنیا کا زر و مال کیا جمع تو کیا ذوق — کچھ فائدہ بے دستِ کرم اٹھ نہیں سکتا۔ (ذوق)

طلسمِ حرف
مظفر حنفی کی انفرادیت کا دستاویزی ثبوت

محبوب راہی

گذشتہ تیس برسوں میں مظفر حنفی نے اردو ادب کو اتنا اور ایسا کچھ دیا ہے جس کی مثال اردو کی تاریخ میں کم ملتی ہے۔ تین افسانوی مجموعے، تحقیق و تنقید پر تین ضخیم اور قابل قدر کتابیں، گیارہ ملکی اور غیر ملکی زبانوں کی کتب کے ترجمے، سلسلۂ شاد عارفی کی بہت کتابوں کی ترتیب و تالیف، بچوں کے ادب پر ڈھیروں کتابیں نئے چراغ کھنڈر وہ کے اٹھارہ شمارے اور ان کے اپنے انفرادی لہجے اور اچھوتے اسلوب کے ترجمان سات شعری مجموعے ان کی قوتِ متخیلہ کے غیر معمولی پن تخلیقی ذہن کی زرخیزی و شادابی، فکر و نظر کی وسعت و گہرائی، تبحر علمی اور ان کے جادو نگار قلم کے ہر دم جواں ہر دم رواں ہونے کی قابل تردید اور روشن مثالیں ہیں۔

طلسم حرف ان کا ساتواں اور مواد، معیار و ضخامت کے اعتبار سے سابقہ مجموعوں سے گراں تر شعری مجموعہ ہے۔ جو شب خون کتاب گھر الہ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوا ہے۔ کتاب ساز کے ۲۷۲ صفحات پر ۱۹۸ غزلیں ۴۹ نظمیں اور ۳۴ رباعیات کے علاوہ مصنف کا عکس عال، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا پیش لفظ اور شمس الرحمان فاروقی کا پس لفظ شامل ہیں۔ سرنامے کے طور پر مظفر حنفی نے اپنا یہ قطعہ لکھا ہے ؂

ٹھپہ لگا ہوا ہے مظفر کے نام کا
اس کا کوئی بھی شعر کہیں سے اٹھا کے دیکھ

مظفر حنفی طنزیہ لہجے کے منفرد صاحب طرز شاعر شاد عارفی کے شاگرد ہیں۔ انھیں کے الفاظ میں:

"میں نے شاد عارفی مرحوم سے مشورہ سخن کیا ہے۔ اُن سے عام بول چال کی زبان میں شاعری کرنے اور ہر قسم کے الفاظ کے ساتھ مساویانہ برتاؤ کرنے کا جو سبق مجھے ملا اس کے زیر اثر میرے اشعار میں فعال کھردرا پن بھی پیدا ہوا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف انھوں نے جا بجا اپنے اشعار میں بھی کیا ہے ؂

ہے شاد عارفی سے مظفر کا سلسلہ
اشعار سان چڑھ کے بہت تیز ہو گئے

اوروں سے تقابل اردو ہے مری توہین
ہاں شاد و مظفر ہیں کیا شاد و کسی میں

اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ رقمطراز ہیں:

"انہوں نے شاد عارفی کے رنگ کو نہ صرف برتا بلکہ اس کی توسیع بھی کی ہے۔ شاد عارفی کی واقفیت اور خاصیت مظفر حنفی کے یہاں دقیق سے اور میں بدل گئی ہے۔ اور تجسس اور آگہی کی سان پر چڑھ کر تیز تر ہو گئی ہے۔"

جیسا کہ میں پہلے ہی عرض کر چکا ہوں، مظفر حنفی اپنے منفرد احتجاجی لب و لہجہ اور تیکھے تیکھے انداز بیان کی بنا پر اپنی ایک علاحدہ پہچان رکھتے ہیں۔ وہ روایت کے پیرو نہیں تو اس کے صحت مند اور جاندار عناصر کے مخالف بھی نہیں۔ ترقی پسندوں کی کھوکھلی نعرہ بازی اور بے جا وضاحت سے متنفر ہیں لیکن ان کی بلند آہنگی مقصدیت اور رمزیت و اشاریت کو پسند بھی کرتے ہیں۔ وہ خالصتاً جدیدت کا عزم کرتے ہوئے نام نہاد جدیدیوں کی ابہام اور اہمال پسندی کے کٹر مخالف ہیں۔ علامتی شاعری کے بے تکے پن پر ایک طنزیہ نظم میں بڑی دل چسپ چوٹیں کی ہیں۔ مثال کے لیے دو شعر ؂

سنتے ہیں کل حروف تہجی نے چال کی
بے نے الف کی ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی

سے نے چونچ سے پھاڑ لیا پیٹ جیم کا
بے اوسنے کی جوڑ کھڑی دیکھتی رہی

اور مقطع میں وضاحت کر دی ہے ؂

حیران کیوں ہے لوگ مظفر کی نظم پر
وہ پیش کر رہا ہے علامت کی شاعری

علامتی شاعری میں ابہام اور اہمال کی چٹانیں ترسیل و ابلاغ کی راہ میں حائل ہیں۔ جبکہ حنفی صاحب ترسیل و ابلاغ کے قائل ہیں۔ شعریت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ چند مثالیں ؂

اے مظفر نئی شاعری کے لیے بڑا ابلاغ اٹھ ہی گئی دیکھنا
شعر سے شعریت بھی نہ جاتی رہے نفسیاتی گرہ کھولتے کھولتے

اٹھ گیا شعر سے ابلاغ مظفر حنفی
جب تلک تم سے بنے بات بنائے رکھنا

جہاں شعر گو فلسفی ہو گئے
مظفر غزل گنگناتا رہا

اس کے باوجود انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کی نئی شاعری میں وہ چیز جسے اگلے لوگ تغزل سے عبارت کرتے ہیں عنقا ہے ؂

غزل مظفر کی خوب تھی اس میں شک نہیں
مگر تغزل کے نام پر ایک بات کم تھی

بارِ خاطر ہے تغزل کے پرستاروں پر
ہاں نئی بات کے حامی ہیں مظفر کی طرف

دورانِ فکر و شعر یہ فرصت کہاں کہ ہم
الفاظ لائیں شہد و شکر میں گھلے ہوئے

وہ اپنے تخیل کو بلند پرواز اور فلک پیما شہبازوں کے پروں پر خلاؤں میں اڑنے کی بجائے نسیم سبک خرام کی مانند زمینی حدود میں روایت کی زرخیز مٹی سے جدت فکر و نظر کے تر و تازہ اور سرسبز و شاداب تخلیقات کے پودے اگا کر ان کی ڈالیوں میں زنگا رنگ اور معطر اشعار کے گل بوٹے کھلاتے ہیں جن میں زمین کی سوندھی مہکار بسی ہوئی ہے ؂

یہ دیکھی تو ہی اندھیروں کو راس آتی ہے
بنا کے شمس و قمر شمعِ دل جلاتے چلو (کالیداس گپتا رضا)
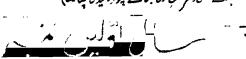
رات جس شئی پہ سویا تھا مجھے آرام سے
روز روشن میں وہی بھر ولانے چٹان ہے

روز آتا ہوں یہاں میں کہ صبا داسل جائے
پیر اکھڑ یا ہوا چین اُنھیں آمول کے تلے

پہاڑوں کی ندی تو میں سمندر
ہمارا ساتھ برساتوں میں ہوگا

مومن کی طرح مظفر حنفی اپنے مقطعوں میں اپنے نظریات اور رجحانات کی تبلیغ انتہائی صاف گوئی بے باکی اور شدت خلوص کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنے بیشتر مقطعوں میں انہوں نے ناقدین سے چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ ان کے جانبدارانہ، غیر منصفانہ رویہ ابن الوقتی، چاپلوسی اور عدم صلاحیت پر بھرپور چوٹیں کی ہیں۔ شدید احتجاج کیا ہے کیسے تیکھے زہر قند کے ساتھ بے خطا وار کرتے ہیں ۔

یار مظفر اتنا کھل کر کہنے پر بھی
ناقد میری بات نہ جانے دیکھا تم نے

چشم تنقید لپیٹ، قامت ہے
ورنہ اتنا بڑا نہیں ہے وہ ! !

میں مظفر کو کیوں کروں تسلیم
اس نے کوئی غزل کہی نجد پر ؟

نئی غزل پہ مظفر یہ تیغ تنقیدیں
سخن کے تخت پہ چنگیز خان بیٹھ گیا

اس کے باوجود وہ شہرت سے بے نیاز، رسوائی سے بے خوف، عام روش سے ہٹ کر تنقید کے مزاج اور معیار سے بے پرواہ اپنی راہ آپ بناتے ہیں ۔

یہ راہ میں نے بنائی ہے اس پہ حق ہے مرا
کسی کے ساتھ چلوں گا نہ راستہ دوں گا

شاہ راہوں پہ توجمع ہے مظفر صاحب
شعر کہنے کے کئی اور بھی رستے ہوں گے

اے مظفر ہمیں تنقید کے معیار سے کیا
بھیڑ سے ہٹ کے غزل ہے تو ہماری ہوگی

جدید غزل کے مروجہ الفاظ اور تراکیب جو کثرت استعمال سے گھس پٹ کر اپنی چمک دمک، پہلو داری، اور معنویت کھو چکے ہیں۔ حنفی صاحب ان کے استعمال سے گریز کرتے ہیں۔ نئی نئی لفظیات اور جدید تراکیب سے اپنے اشعار کو پہلو داری، معنویت اور ندرت عطا کرتے ہیں ہوا، غبار، بگولا، کوہ ندا، یا اخی، ساقی، موج، بصارت محدود، دبوا جسم، فرطِ احتیاط، دیدۂ بے خواب کا ہو خلیج فنا، حیات بے حصار، لمس کی فردوس، قامت نگاہ وغیرہ الفاظ اور تراکیب ان کی شاعری میں نئے مفہوم کے پیکروں میں اجاگر ہوتے ہیں۔ طلسم حرف سے چند مثالیں ۔

اس کا بدن تو لمس کی فردوس بن گیا
اب میری انگلیوں کو ضرورت زباں کی ہے
رات چیختا ہے جنس زدہ چیل کی طرح
پر مارتی ہے رات ابابیل کی طرح
ٹھونک دے لاش کے ماتھے پہ اے قصر ایک
آخری کیل کو تابوت میں جڑنا کیا ہے

کہاں تک مثالیں گنوائیے کہ طلسم حرف کا ہر شعر انفرادیت جدت، اور ندرت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے مظفر حنفی کا ایک اور نمایاں وصف یہ ہے کہ ان کی کسی غزل میں کوئی قافیہ دہرایا نہیں جاتا۔ کسی خیال کی تکرار نہیں ملتی ۔ ایک اور خوبی جس کی نشاندہی نارنگ صاحب نے کی ہے وہ ہے ان کا زبان کا زمینی استعمال اور بول ٹھولی اور گفتگو کے سیدھے سیچے بات چیتی اور مکالماتی انداز جو غزل کی لفظیات میں نئی جہتوں کی نشاندہی کرتا ہے ۔ ملاحظہ ہو ۔

تھا جن کو بڑائی پہ بڑا ناز مظفر
نزدیک سے دیکھا تو بڑے ہیں نہ وڑے ہیں
منزل و نزل ہم کیا جانیں چلنا ہے سو چلتے ہیں
ہمت پورا ٹھگرا نچائی ڈگ مگ پاؤں چھیتی ہے

حنفی صاحب نے حصہ نظم کی ابتدا کرتے ہوئے سرنامے کے طور پر یہ شعر درج کیا ہے ۔

تہ در تہ ابہام کی پرتیں توڑیں تو جانوں
معنی بھاگ تو نکلے ہیں لفظوں کی کڑیوں سے

لیکن یہ بات ان عام نظموں پر صادق آتی ہے جن میں غیر مانوس اور اجنبی علامتوں کا استعمال ابہام کی پرتوں کو کچھ ایسا سخت اور دبیز بنا دیتا ہے کہ انہیں توڑ کر مفہوم کی تہوں تک پہنچ جانا کار سے ندارد ۔ مظفر حنفی کی جدید نظموں میں ابہام کی پرتیں اس قدر مہین اور شفاف ہیں کہ نگاہ ذرا گہری نگاہ ہو) فوراً مفہوم تک پہنچ جاتی ہے ۔ اور لفظوں کی کڑیاں سے معنی از خود وابستہ ہو جاتے ہیں ۔ ان نظموں کی ایک واضح خصوصیت ان کے عنوانات ہیں ۔ بقول ندا فاضلی "انکی بیشتر نظمیں عنوانات کی بیساکھیوں پر کھڑی ہیں ۔ اگر عنوان ہٹا دیا جائے تو نظم کا مفہوم خبط ہو کر رہ جائے گا" ان نظموں میں انسانویت کی فضا پائی جاتی ہے ۔ بزدلی، وصیت، نیچے کی اور، اور مشرقی بیجیں میں انکی گھریلو زندگی اور ذاتی حالات کی جھلکیاں ملتی ہیں۔

مظفر حنفی کے یہاں آزاد نظم اک اکائی ہوتی ہے جو بحر پہلے مصرعے میں متعین کر لی گئی ہے تمام نظم اسی بحر میں مکمل ہوتی ہے ۔ مصرعے بھلے ہی ٹوٹ جائیں بحر ٹوٹنے نہیں پاتی جبکہ دیگر شعراء کے یہاں عام اسکی ضد ہوتا ہے ۔ ان نظموں میں "بزدلی" کے عنوان سے نشاد عارفی کی موت پر مرثیہ کے بارے میں اکبر علی خاں (عرشی زادہ) نے لکھا ہے ۔

" مظفر حنفی نے "بزدلی" کے عنوان سے شاد عارفی کے نام کا مرثیہ کیا لکھا ہے، ہمارے عہد کا مرثیہ لکھا ہے ۔ حالی کے مرثیہ کے بعد یہ دوسرا مرثیہ ہے جس میں دل کو زبان مل گئی ہے ۔ میں نے جب جب پڑھا مجھ پر رقت طاری ہوگئی اس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں طنز یہ انداز بیاں اختیار کرنے کے باوجود مرثیے کا تاثر موجود ہے ۔"

اسی موضوع پر ایک نظم "وصیت" میں اپنے بیٹے گڈو (عرفی) کے نام شاد عارفی کی سوانح، حق گوئی کی پاداش میں "گڈو میرے پیارے بیٹے .... میرے راج دلارے بیٹے ...... دیکھو تم غزلیں مت کہنا .. بیٹے تم نظمیں مت کہنا ..... لکھنا ہی پڑ جائے تو پھر سچ مت لکھنا ! دیکھو بیٹا سچ مت لکھنا !! سچ مت لکھنا !!! "

انکے علاوہ پاکیزگی کا سولہواں سال، اندھے آئینے کا قتل، فصیل جسم کے زندانیوں سے، انکی نمائندہ نظمیں ہیں ۔ تمام اصناف شاعری میں رباعی ایک ایسی صنف ہے جس پر بوجہ اس کی دقت طلبی اور مشکل پسندی بہت کم شعرا نے توجہ کی ہے ۔ مظفر حنفی یہاں بھی اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے اس ریگ زار سے فکر و تخیل کے گلہائے عقیدت زنگا رنگ کھلا کر کامیابی اور سرخ روئی کے ساتھ گزر گئے ہیں ۔ تنگئ داماں کے پیش نظر صرف دو رباعیاں پیش خدمت ہیں ۔

←

بقیہ :- میں اور میرا فن

گھیرے میں لیے ہوں تجھے ہالاہن کر
لپٹا ہوں تجھ سے یادوں کے جالا بن کر
اے روشنی طبع تو جھلکی کیوں ہے
ظلمت ہوں مجھے سوٹ آ جالا بن کر

احساس کی مت پوچھ عجب شے ہے یہ
ہر سانس پہ مبنی ہوتی اک لے ہے یہ
خنجر سے خیالات نہیں کٹ سکتے
احساس ہی مارے گا مجھے طے ہے یہ

آخری صفحہ پر شمس الرحمان فاروقی نے نہایت دلچسپ انداز میں مظفر حنفی کی غزل گوئی پر اظہار خیال کیا ہے لکھتے ہیں:

"غزل میں وہ تمام مزے لے لطف برتتے ہیں جن سے ان لوگوں کو گھبراہٹ لگتی ہے۔ جو غزل کو گھر بیٹھنے والی کنواری کی طرح منہ پر موٹی اوڑھنی ڈالے ہوئے پند و مواعظت کا مصالحہ یا عشق و محبت کی چٹنی پیستے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان سب بے باکیوں کے باوجود مظفر حنفی اینٹی غزل کے شاعر نہیں بلکہ غزل ہی کے شاعر بنے ہیں"

مظفر بیرل جدید شاعری کا نمائندہ، فکر و فن کے نایاب، لازوال، اور گراں بہا لعل و گہر کا خزینہ یہ ضخیم شعری مجموعہ مظفر حنفی کی انفرادیت کا ایک دستاویزی ثبوت ہے۔

یہ نظم آج سے چودہ برس پہلے لکھی تھی۔ اور آج جبکہ میں "بیماریوں کے بھنور" میں گھر گیا ہوں کہ تیز زندگی گذارنے کا یہی انجام ہوتا ہے تو اپنی زندگی کے سورج کو ڈوبتے ہوئے دیکھتا ہوں
اور سوچتا ہوں
"میری نظمیں ـــــ خود فریبی سے آگے نکل گئی ہیں
اور میں ـــــ ایک کرم کتابی
تیز آندھی کی ٹوٹی شاخ لیے
اپنی کمزور نظموں کی شاخوں سے لپٹا ہوا
ـــــ زرد پتوں کو اڑتا ہوا دیکھتا ہوں

●

مُبارکباد

پونہ :- عالی جناب الحاج احمد عمر سیٹھ (ایم۔ایل۔اے) کی پوتی و عالی جناب عبدالستار صاحب (ڈائرکٹر) سیکریٹری ریٹیننگ بورڈ، عبدالواحد و مولبیدیہ مدارس (پونہ) کی دختر "لبنیٰ" کی نسبت عالی جناب ہاشم آزاد صاحب کے فرزند "مزمل" (مقیم کراچی) کے ساتھ بروز جمعرات بتاریخ ۲۰ مئی ۱۹۸۲ء طے ہوگئی۔

ادارہ "اسباق" تمام متعلقین کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔

انسان جب حیوان بن جاتا ہے اس وقت وہ حیوان سے بدتر ہو جاتا ہے۔
ـــــ شیکسپیئر

●

اگست ۱۹۸۲ء میں منظر عام پر آ رہا ہے
ماہنامہ

آس

سرپرست و نگراں: شارق جمال
مدیر اعلیٰ: ظفر کلیم
مدیر: محمد امین الدین
پتہ
عظیم بنکر اسٹور، مومن پورہ، ناگپور

مال برباد ہو جائے تو پھر حاصل ہو سکتا ہے لیکن عزت جا کر حاصل نہیں ہو سکتی۔ (حضرت حسان بن ثابت رض)

جس کو اللہ کی بندگی میں مصروف پاؤ اس سے ضرور محبت کرو (اس طرح) گویا تم اللہ سے محبت کر رہے ہو۔ (امام حسن بصری رح)

ہوس نہ ہو تو دولت مندی نقصان دہ نہیں (حضرت جنید بغدادی رح)

فکر قلب کا چراغ ہے۔ جب وہ نہ رہیگا تو قلب کی روشنی بھی جاتی رہے گی (شیخ علی متقی رح)

کوشش کرنے والے انسان کے لیے کوئی کام ناممکن نہیں (سکندر اعظم)

شرم و حیا کے ساتھ پسپائی، بے شرمی کے ساتھ کامیابی سے بدرجہا بہتر ہے۔ (خلیل جبران)

نیک اونٹ، بدکردار آدمی سے بہتر ہے۔ (فارسی کہاوت)

منجانب: مرزا مہدی حسن، مونت۔ بھارت مولڈس (ڈائی میکرس)، پلاٹ نمبر ۲۹ پونہ ستارہ روڈ پونہ ۴۱۱۰۰۹

زندگی آ تجھے قاتل کے حوالے کر دوں ـ مجھ سے اب خون تمنا نہیں دیکھا جاتا۔ (شکیل)

منٹو کے افسانوں میں جنسی مسائل اور معاشی بحران

ایاز احمد قریشی
مہو - ایم پی -

اردو ادب میں ایک نام شیطان کی طرح مشہور ہے اور وہ ہے منٹو! منٹو اور شیطان، شیطان اور منٹو! دونوں میں بہت ہی مناسبت ہے۔ بس یوں کہہ لیجئے۔ کہ ایک تصویر کے دو رخ تھے۔ ادھر سے دیکھیے تو منٹو اور اُدھر سے دیکھیے تو شیطان! بلا شبہ آپ نے منٹو کی تصویر تو دیکھی ہوگی۔ مگر شیطان کی نہیں۔ مگر ایسی ہی بات ہے تو پھر آپ شیطان کی تصویر دیکھنے کے لیے، جسے میخائل وروبیل نے بنایا ہے، ترتیاکوف میوزیم ماسکو تشریف لے جائیں یا پھر میرے گھر چلے آئیں ایک ہی بات ہے!

بس فرق اتنا ہے کہ شیطان نشتر کاری ایذا دینے کے لیے کرتا ہے اور منٹو شفا کے لیے۔ منٹو کی اس نشتر کاری میں اس کی مسیحائی چھپی ہے، جس نے اسے ایک (ایسی؟) شخصیت کا مالک بنا دیا ہے جو متضاد رنگوں سے مل کر بنی ہے اور جس کے خمیر میں ہی اختلافات پڑے ہوتے ہیں جن سے دو مسلک وجود میں آتے ہیں جن میں سے ایک منٹو کو مسیحا تسلیم کرتا ہے میں ان کے عمیق مطالعے اور ان کی ذہنی سوجھ بوجھ کی داد دیتا ہوں۔ مگر مجھے اس کے ساتھ ہی ان لوگوں کی ذہنیت پر تاسف بھی ہے جو اپنے سطحی مطالعے سے اسے شیطان قرار دیتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں ہمیں جو ننگ نظر آتا ہے وہ منٹو کا ذہنی ننگ نہیں ہے ــــ بلکہ وہ ایک ایسا فد آور آئینہ ہے جس میں ہم اپنے آپ کو ننگا دیکھ کر، اپنے چہروں پر ہوس، طمع اور جنسی بھوک کی جھلکیاں دیکھ کر جھلا جاتے ہیں۔ اور پیچ و تاب کھانے لگتے ہیں۔ اور مثّا اس کھلی حقیقت سے آنکھیں پھیر لیتے ہیں۔ مگر یہ خود فریبی آخر کب تک؟ منٹو کونین کی گولی کو شہد میں لپیٹ کر دینے کا قائل نہیں تھا۔ اسی لیے یہ کڑوی دوا ہمارے حلق سے نیچے نہیں اترتی مگر یہ بات مت بھولیے کہ خالص کونین کی گولیاں بڑی زود اثر ہوتی ہیں۔ اور چاشنی والی گولیاں دیر ہضم اور دیر اثر۔ خود منٹو کے الفاظ میں ــــ

"ــــ جو سمجھتے ہیں کہ نئے ادب نے جنسی مسائل پیدا کیے ہیں غلطی پر ہیں۔ کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ جنسی مسائل نے اس نئے ادب کو پیدا کیا ہے ــــ اس نئے ادب کو جس میں کبھی کبھی ہم اپنا ہی عکس دیکھتے ہیں اور جھنجھلا اٹھتے ہیں ــــ حقیقت خواہ شکر ہی میں لپیٹ کر دی جائے اس کی کڑواہٹ دور نہیں ہوگی۔ ہماری تحریریں آپ کو کڑوی کسیلی لگتی ہیں مگر اب تک جو مٹھاس آپ کو پیش کی جاتی رہی ہیں اس سے انسانیت کو کیا فائدہ ہوا ہے؟ نیم کے پتے کڑوے سہی، مگر خون ضرور صاف کرتے ہیں۔"

منٹو جنسیات پر اس لیے افسانے نہیں لکھتا کہ وہ ذہنی طور پر بیمار اور جنس زدہ تھا بلکہ وہ زندگی کی اس حقیقت کو بے نقاب کرنا چاہتا تھا جس سے کسی بھی صورت فرار ممکن نہیں ہے۔ اس کے افسانوں میں تصنع اور بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ وہ جن جنسی مسائل کو اپنے افسانوں میں پیش کرتا ہے، وہ کسی خاص ماحول اور بناوٹ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور اصلیت سے قرب ان کی خاصیت ہوتی ہے۔ ناقدین اور قارئین کا وہ طبقہ جو منٹو کی تنقیص کرتا ہے اور اس کے افسانوں میں جنسیات کو اس کے بیمار ذہن کی پیداوار سمجھتا ہے کبھی اس غلاظت میں گھسنے کی زحمت گوارا کرے، جس میں منٹو گلے گلے تک دھنسا ہوا تھا۔ جنس زندگی کا ایک اہم حصہ ہے، پھر اس سے آنکھ چرانا کہاں تک درست ہے؟ ــــ اگر منٹو کے افسانوں میں جنسیات کا ذکر ملتا ہے تو اس میں منٹو کا کیا قصور!

مانٹؔ سیلے نے اس ضمن میں درست ہی کہا ہے "اگر انسان کی جنسی خواہش اور ہر اس چیز کو جو ذہنی طور پر اس سے وابسطہ ہے یا اس سے جنم لیتی ہے، ختم کر دیا جائے تو زندگی سے شاعری اور شاید تمام اخلاقی جذبوں کا نام و نشان مٹ جائے گا یہ ہماری زندگی میں حرارت اور حسن پیدا کرتا ہے ــــ اس حقیقت سے انکار خود فریبی ہے۔"

اپنے مضمون "افسانہ نگار اور جنسی مسائل" میں منٹو نے خود اس بات کی تائید ان الفاظ میں کی ہے "...... ہماری تحریروں میں عورت اور مرد کے تعلقات کا ذکر آپ کو زیادہ نظر آئے، تو یہ ایک فطری بات ہے۔ ملک۔ ملک سے سیاسی طور پر جدا کیے جا سکتے ہیں، ایک مذہب کو دوسرے مذہب سے اپنے اپنے اعتقاد کی بنا پر الگ کیا جا سکتا ہے، دو زمینوں کو ایک قانون ایک دوسرے سے بیگانہ کر سکتا ہے۔ لیکن کوئی سیاست، کوئی عقیدہ، کوئی قانون ــ عورت اور مرد کو ایک دوسرے سے دور نہیں کر سکتا۔" اگر منٹو نے ادب میں جنسیات کو اپنا موضوع بنایا، تو یہ اس کی ذاتی اختراع نہیں ہے۔

ہم اس سے پہلے بھی "طلسم ہوش ربا" اور "رمت ساگر" میں جنسیات کا بیان پڑھتے تھے۔ پھر منٹو کے افسانوں میں جنسیات کا ذکر ہمارے ذوقِ سلیم پر کیوں گراں گزرتا ہے ــــ؟ اس کے افسانے سماج میں پائی جانے والی جنسی بے راہ روی اور اس سے نکلنے والے مہلک نتائج سے آگاہ کرتے ہیں، وہ ان داستانوں سے لاکھ درجہ بہتر ہیں۔ جن میں جنسیات کا ذکر فکر و تدبر سے نجات پانے کے لیے اور تفننِ طبع کی خاطر کیا جاتا تھا۔ خود منٹو کہتا ہے کہ "جو لوگ ہمارے

ڈھونڈا کرے گا مجھ کو مرے بعد ہر کوئی
آئندہ نسل کو یہ سزا دے کے جاؤں گا (نذیر فتح پوری)

افسانوں میں لذت حاصل کرنے کے طریقے ڈھونڈنا چاہتے ہیں، "انہیں یقیناً ناامیدی ہوگی" ہم داؤ پیچ بنانے والے خلیفہ نہیں ہیں۔ ہم جب اکھاڑے میں کسی کو گرتا دیکھتے ہیں تو اپنی سمجھ کے مطابق آپ کو یہ سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیوں گرا تھا۔"

آج ہماری ذہنیت بدل گئی ہے، اسی لیے ہم میں سے وہ پاکیزگی اور طہارت کوچ کر گئی جو ایک معصوم بچے میں ہوتی ہے ـــــ جیسے کسی بھی بھلی یا بری بات پوچھنے میں شرم یا جھجک نہیں ہوتی۔ لیکن ہمارے دل میں بات گھر کر گئی ہے کہ جنس بری چیز ہے مگر قدرت کا نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ آپ لاکھ ڈھونگ رچا لیجیے پھر بھی جنس سے دور رہنا ناممکن ہے ـــــ اسی لیے در پردہ ہم اس میں دلچسپی لیتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں میں ہم ان لونڈوں کی طرف تھوک کر تھوکتے ہیں اور ناک بھوں سکیڑتے ہیں جہاں پر رات کو اپنے نفس کی تسکین کی تلاش کرتے ہیں۔ ہم بظاہر صاف کپڑوں میں ملبوس نظر آتے ہیں۔ مگر ذہنیت گندی ہے اور ہمارے دل پر میل کی پرتیں جمی ہوئی ہیں۔ اسی لیے "منٹو ایک طوائف میں، اس کے میلے کپڑوں اور میلے ہوئے جسم میں اس پاکیزگی کو تلاش کرتا ہے جس سے ہم اور ہمارے ویدو حرم کوسوں دور ہیں۔ اسی ضمن میں عصمت چغتائی کہتی ہیں ـــــ وہ دنیا کی گندگی کے گھورے پر پھینکی ہوئی غلاظت میں سے موتی چن کر نکالتا ہے گھورا کریدنے والے شوق ہے اسے دنیا کے سنوارنے والوں پر بھروسہ نہیں۔"

کوئی بھی ادیب اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے اور اس کے ادب میں وہی کچھ نظر آتا ہے، جو اس کے آس پاس کے ماحول میں پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یہ بات منٹو پر حرف بحرف صادق آتی ہے۔ اس کے افسانوں میں طلسم یا پریوں کے قصے نہیں۔ بلکہ اس جیتی جاگتی دنیا کا ذکر ہے جس میں ہم اور آپ جیتے اور سانس لیتے ہیں۔ اس کے افسانوں کے کردار سماج کے گرے ہوئے طبقے کے وہی لوگ ہیں جو امیروں کے ظلم و استبداد کے ساتھ ہی متوسط طبقے کے بھی استحصال کا شکار ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی اور پریم چند کے افسانوں میں صرف متوسط طبقے کا استحصال دکھایا گیا ہے مگر منٹو نے حقائق کی پرتوں میں گھس کر ہمیں سماج کے اس طبقے سے روشناس کرایا ہے امیروں کے ساتھ ہی ساتھ استحصال شدہ لوگوں کے بھی استحصال کا شکار ہے۔ اور یہیں سے ہمیں یہ احساس گزرتا ہے کہ منٹو نے جسے سماج کا سب سے مجبور اور مظلوم طبقہ بتایا ہے، وہ اتنا بے کس اور لاچار نہیں کیونکہ یہ تسلیم کر لینے پر ہم بھی اس ظالم اور جابر طبقے کے رکن ہو جاتے ہیں جس کا دین بے رحمی اور مذہب سفاکی ہے۔ اسی لیے ہم اس کی حقیقت نگاری کو عریاں نگاری سے تعبیر کرتے ہیں اور کچھ کی عزت کی دہائی دیتے ہیں۔

اس سوال کا جواب منٹو نے بڑے تپاک سے دیا ہے ـــــ "زمانے کے جس دور سے ہم گزر رہے ہیں، اگر آپ اس سے واقف نہیں تو میرے افسانے پڑھیے اور اگر آپ ان افسانوں کو برداشت نہیں کر سکتے تو اس کا مطلب ہے زمانہ ناقابل برداشت ہے۔ میری تحریر میں نقص نہیں ہے جس نقص کو میرے نام سے منسوب کیا جاتا ہے، وہ دراصل موجودہ نظام کا نقص ہے میں ہنگامہ پسند نہیں ہوں، نہ لوگوں کے خیالات میں ہیجان پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ میں تہذیب تمدن اور سوسائٹی کی چولی کیا اتاروں گا جو ہے ہی ننگی۔ میں اسے کپڑے پہنانے کی کوشش بھی نہیں کرتا کیوں کہ یہ میرا نہیں درزیوں کا کام ہے۔"

منٹو کے افسانوں کے کردار افسانوی نہیں بلکہ حقیقی کردار ہیں۔ جو معاشی بحران سے پریشان ہیں انہیں دو جون کی روٹی بھی عزت سے نصیب نہیں ہوتی اس کے لیے وہ کیا کچھ نہیں کرتے۔ اسی ضمن میں منٹو کے مضمون "افسانہ نگار اور جنسی مسائل" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے ـــــ دنیا میں جتنی لعنتیں ہیں بھوک ان کی ماں ہے۔ بھوک جرموں پر اکساتی ہے، بھوک عصمت فروشی پر مجبور کرتی ہے، بھوک انتہا پسندی کا سبق دیتی ہے۔ اس کا حملہ بہت شدید اس کا وار بہت بھرپور اور اس کا زخم بہت گہرا ہوتا ہے۔ بھوک دیوانے پیدا کرتی ہے، دیوانگی بھوک نہیں۔"

منٹو کے اس بیان کی روشنی میں اس کی فلم "کشتی" کا ایک منظر ملاحظہ فرمائیے ـــــ

مالی :۔ وہ ـــــ یہاں لیٹی ہوئی تھی۔

منشی :۔ کون؟

مالی :۔ میری بیوی (اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں) آخری سانس تھی ـــــ بچے کی پیدائش کی جتنی خوشی تھی، سب دکھ بن گئی تھی (اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے) یکا یک بچی دودھ کے لیے بلکنے لگی۔ میں نے کہا ـــــ آخری گھونٹ تو بیری بچی کو دیتی جاؤ۔ یہ سن کر اس نے مندی مندی آنکھوں سے پہلے بچی کی طرف دیکھا، پھر میری طرف آنکھ اٹھائی اور یہ بات خوفناک تھی" یہ تمہاری بیٹی نہیں ہے ....!" یہ سارا گوار میری آنکھوں تلے گھوم گیا "یہ کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا ـــــ "بڑے سرکار کی .... گلا گھونٹ دو اس کا ....!" یہ سن کر مجھے ہوش نہ رہا .... مجھے نہیں معلوم اس گنہگار کی کب جان نکل گئی!"

منشی :۔ تم نے گلا کیوں نہیں گھونٹ دیا، اس شیطان کی بچی کا ـــــ؟"

مالی :۔ میں گلا گھونٹنے والا تھا .... لیکن میرے اندر ایک شیطان پیدا ہوا ـــــ اس نے مجھ سے کہا ـــــ نہیں، اسے زندہ رہنے دو ـــــ اس کو پال پوس کر بڑا کرو ـــــ بڑے سرکار کا ایک لڑکا ہے .... جوان ہو کر وہ بھی باپ کی طرح کھیل کھیلے گا ـــــ کیا پتا ہے کہ یہ حرام کی بچی اور وہ ....."

منٹو کے افسانوں میں ہمیں دو چیزیں جو کھل کر نظر آتی ہیں، ان میں پہلا نمبر پیٹ کا ہے اور دوسرا نمبر جنس کا، یا یوں کہہ لیجیے کہ یہ دوسرا نمبر پہلے نمبر ہی کی دین ہے ـــ منٹو کے افسانوں میں بھوک اور جنس اس طرح گڈ مڈ ہو گئے ہیں کہ کسی بھی افسانے کو خالص جنسیاتی یا خالص معاشی کہنا ذرا دشوار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ منٹو کے کردار بھوک سے بلبلا کر عصمت فروشی اور ضمیر فروشی پر مجبور ہوتے ہیں، اس میں کسی جنس کی تفریق نہیں کی گئی ہے، اگر "سوگندھی" اور "سلطانہ" جیسی بے کس لڑکیاں عصمت بیچتی ہیں تو "خوشیا" جیسا غیور انسان مجبور ہو کر ضمیر بیچنے لگتا ہے۔ اسی ضمن میں منٹو نے اپنے مضمون "افسانہ نگار اور جنسی مسائل" میں اس بات کو واضح کیا ہے کہ "روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد ـــــ یہ دو بہت پرانے رشتے ہیں، ازلی اور ابدی، روٹی زیادہ اہم ہے یا پیٹ ـــــ؟ عورت زیادہ ضروری ہے یا مرد ـــــ؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ میرا پیٹ روٹی مانگتا ہے لیکن مجھے یہ معلوم نہیں کہ گیہوں بھی میرے پیٹ کے لیے اتنا ہی ترستا ہے جتنا کہ میرا پیٹ.... پھر بھی جب میں سوچتا ہوں کہ زمین نے گیہوں کے خوشوں کو بے کار جنم نہیں دیا ہوگا، تو مجھے خوشی ہوتی

ہوتی ہے کہ میرے پیٹ ہی کے لیے کھیتوں میں سنہری بالیاں جھومتی ہیں اور پھر ہو سکتا ہے کہ میرا پیٹ پہلے پیدا ہوا ہو اور بالیاں بعد میں ـــــ کچھ بھی ہو لیکن یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ دنیا کا ادب صرف ان دو رشتوں ہی سے تعلق رکھتا ہے۔ الہامی کتابیں بھی، جن کو آسمانی ادب کہنا چاہیے، روٹی اور پیٹ، عورت اور مرد کے تذکروں سے خالی نہیں ہے۔"

منٹو کے افسانے کے کردار بنیادی طور پر ہم اور آپ جیسے لوگ ہیں۔ اور بعض اوقات ہم سے بھی زیادہ اولو العزم نظر آتے ہیں۔ مگر حالات کی گرد نے ان کے عزم و حوصلہ اور عزت و شرافت کے ایوانوں کو اس مٹی اور ریت کے ڈھیر تلے دبا دیا جسے آنے جانے والے شب و روز پامال کرتے رہتے ہیں۔ منٹو کے افسانے "لائسنس" میں افسانے کی ہیروئن نیتی اپنے شوہر تانگے والے کے مرنے پر عزت کی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ جس کے لیے وہ شہر میونسپل کارپوریشن میں تانگا چلانے کے لائسنس کی درخواست دیتی ہے مگر اس کی درخواست یہ کہہ کر نامنظور کر دی جاتی ہے کہ عورت کو تانگا چلانے کا لائسنس نہیں دیا جاتا اور تب مجبور ہو کر وہ اسی میونسپلٹی کے آفس میں بردہ فروشی لائسنس کی درخواست دیتی ہے جو فوراً منظور کر لی جاتی ہے۔ یہ ہے ہمارے سماج کا نظام! ـــــ روئیے، سینہ کوبی کیجیے اور اس کے منہ پر کالک پوت دیجیے۔ یہ اسی لائق ہے۔ اس ضمن میں منٹو کے افسانے "سڑک کے کنارے" کا ایک منظر ملاحظہ ہو، "...... ایک سانپ تھا جو مجھے ڈس کر چلا گیا ـــــ لیکن اب اس کی چھوڑی ہوئی لکیر کیوں میرے پیٹ میں کروٹ لے رہی ہے ـــــ کیا یہ میری تکمیل ہو رہی ہے؟.. یہ میرے اندر دہکتے ہوئے چولھے پر کس مہمان کے لیے دودھ گرم کیا جا رہا ہے ـــــ یہ آسمان بلندی سے اتر کر کیوں میرے پیٹ میں تن گیا ہے میرے سینے کی گولائیوں میں معبدوں کی محرابوں کی ایسی تقدیس کیوں آ رہی ہے ـــ یہ کس کا آنسو میرے سیپ میں موتی بن رہا ہے، یہ کہاں بند رہے گا ـــ؟" اور پھر بھی انتہا کی انتہا دیکھیے کہ سماج کی دودھاری پر قربان ہو کر بھی اپنے اس بچے کو جس نے اس کی زندگی کو جو بنا دیا ہے، بچا لینا چاہتی ہے، مگر سماج کا خطرہ لاحق ہے ـــــ "انگلیاں اٹھیں گی ـــــ جب سیپ کا منہ کھلے گا اور موتی پھسل کر باہر چوراہے پر گر پڑے گا، تو انگلیاں اٹھیں گی۔ سیپی کی طرف بھی اور موتی کی طرف بھی ـــــ اور یہ انگلیاں سنپولیاں بن کر سر دونوں کو ڈس لیں گی۔"

یہ انگلیاں سنپولیاں نہ صرف ان شریف زادیوں کو ڈستی ہیں، بلکہ ان کے زہر سے سماج کا وہ طبقہ بھی محفوظ نہیں، جو بذات خود بسمل بنے۔ اور جس نے سماج کا سارا زہر شیو کی طرح اپنے میں اتر لیا ہے۔ منٹو کے افسانے "کالی شلوار" سے ایک اقتباس دیکھیے ـــ "دھوپ میں لوہے کی پٹریاں چمکتیں تو سلطانہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھتی، جن پر نیلی نیلی رگیں بالکل ان پٹریوں کی طرح ابھری رہتی تھیں ...... پھر کبھی کبھی جب وہ گاڑیوں کے کسی ڈبے کو جسے انجن نے دھکا دے کر چھوڑ دیا ہو اکیلے پٹریوں پر چلتا دیکھتی تو اسے اپنا خیال آجاتا وہ سوچتی کہ اسے بھی کسی نے زندگی کی پٹری پر دھکا دے کر چھوڑ دیا ہے اور وہ خود بخود چلی جا رہی ہے۔ دوسرے کانٹے بدل رہے ہیں اور وہ چلی جا رہی ہے ـــــ نہ جانے کہاں ـــــ پھر ایک روز ایسا آئے گا جب اس دھکے کا زور آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ اور وہ کہیں رک جائے گی کسی ایسے مقام پر جو اس کا دیکھا بھالا نہ ہوگا .... یوں تو وہ بے مطلب گھنٹوں ریل کی ان ٹیڑھی بانکی پٹریوں اور ٹھہرتے چلتے انجنوں کی طرف دیکھتی رہتی تھی۔ ہر طرح طرح کے خیالات اس کے دماغ میں آتے رہتے تھے۔ انبالہ چھاؤنی میں جب وہ رہتی تھی، تو اسٹیشن کے پاس ہی اس کا مکان تھا۔ مگر وہاں اس نے کبھی ان چیزوں کو ایسی نظروں سے نہیں دیکھا تھا۔ اب تو کبھی کبھی۔ اس کے دماغ میں یہ بھی خیال آتا کہ یہ جو سامنے ریل کی پٹریوں کا جال سا بچھا ہے اور جگہ جگہ سے بھاپ اور دھواں اٹھ رہا ہے، ایک بہت بڑا چکلا ہے۔ بہت سی گاڑیاں ہیں جن کو چند موٹے موٹے انجن ادھر ادھر دھکیلتے رہتے ہیں۔ سلطانہ کو تو بعض اوقات یہ انجن سیٹھ معلوم ہوتے، جو کبھی کبھی انبالے میں اس کے یہاں آیا کرتے تھے۔ پھر کبھی کبھی جب وہ کسی انجن کو آہستہ آہستہ گاڑیوں کی قطار کے پاس سے گزرتا دیکھتی تو اسے ایسا محسوس ہوتا کہ کوئی آدمی چکلے کے کسی بازار میں اوپر کوٹھے کی طرف دیکھتا جا رہا ہے۔"

منٹو نے اپنے مختلف افسانوں میں اس گھناؤنی زندگی کو مختلف زاویوں سے دیکھا اور بڑے دھڑلے کے ساتھ اسے بے نقاب کیا ہے۔ اکثر و بیشتر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کے کردار ایک عظیم کرب اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں۔ اور سب کی رام کہانی ایک ہی ہے۔ منٹو کے افسانے "ہتک" سے ایک اقتباس دیکھیے۔ یہ ایک "سوگندھی" کی ہی نہیں ایک طوائف کی تمام تر زندگی کی کیسی پرسوز تصویر پیش کرتا ہے، "ـــ اس نے اپنے چاروں طرف ایک ہولناک سناٹا دیکھا ایسا سناٹا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اسے لگا ہر شے خالی ہے ـــــ جیسے مسافروں سے لدی ریل گاڑی اسٹیشنوں پر مسافروں کو اتار کر لوہے کے شیڈ میں بالکل اکیلی کھڑی ہے .... یہ خلا جو اچانک سوگندھی کے اندر پیدا ہو گیا تھا، اسے بہت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے کافی دیر تک اس خلا کو بھرنے کی کوشش کی مگر بے سود .... وہ ایک ہی وقت میں بے شمار خیالات اپنے دماغ میں ٹھونستی تھی مگر بالکل چھلنی کا سا حال تھا ـــ ادھر دماغ کو پر کرتی تھی، ادھر خالی ہو جاتا تھا۔"

ابھی تک منٹو کے افسانوں میں ہم نے عورت کے جس روپ کو دیکھا، وہ سرمایہ دارانہ نظام کی پیداوار تھا جس نے پہلے اس کی روٹی چھین لی ـــ پھر روٹی کے عوض اسے عزت اور عصمت بیچنا سکھایا۔ مگر دوسری طرف منٹو کے افسانوں میں مرد کی بالادستی بھی نظر آتی ہے۔ جو بذات خود اس کے لیے اتنی ہی ذمہ دار ہے، جتنا کہ سرمایہ دارانہ نظام۔ مرد اپنی طاقت اور قوت کے بل پر عورت کی عصمت سے لے کر اس کی محنت اور دولت تک کو مالِ غنیمت سمجھ کر لوٹتا ہے اور اسے کبھی بھی ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ منٹو کے افسانے "آمنہ" سے ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ جس میں چندو نامی ایک شخص نے چند روپیوں کے لالچ میں اپنی بیوی آمنہ اور اس کے بچے کو دربدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا اور ایک مالدار لڑکی سے شادی کر لی۔ مگر جب وہ اس سے روٹھ مائیکے جا بیٹھی تو اس

اور کچھ روز ابھی ظلم روا رکھنا تھا
حوصلے تم نے ابھی دل والے نکالے کتنے (عتیق احمد عتیق)

کو آمنہ کی یاد کیوں نہ آتی ــــ؟" ـــ چند برس پہلے مدیحے اتنے مصائب کہ اس کی ساری دولت اجڑ گئی ــــ وہ اس سے ملنے گیا۔ اس کا بیٹا جمیل پڑھ لکھ کر ڈاکٹر اس کے گھر کے باہر ملا۔ اس نے اس کو پیار کیا اور آمنہ کے متعلق پوچھا کہ ــــ وہ کہاں ہے؟ جمیل نے اس سے کہا ــــ "آؤ میں بتاتا ہوں، میری ماں آج کل کہاں رہتی ہے" ـ وہ اسے دور لے گیا اور ایک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا ــــ "یہاں ... ہے آمنہ اماں" ـــ مردلی بالا بستی کی ایک اور مثال دیکھیے ــــ اقتباس منٹو کی کہانی "بائی ـ بائی" سے ماخوذ ہے ـ

ـــــ "نظیر نے فوراً جاتو کو ٹھہرایا اور اپنے دوست ... سے کہا" یار! اس کے تین چار اچھے پوز لے لو، میرا خیال ہے سپاہی لوٹ جا رہے ہو وہاں سے ڈیولپ اور پرنٹ کرا کے مجھے دو ـ دو کاپیاں بھارت کے ڈاک خانے کی معرفت بھجوا دینا" ـ رنبیر نے بڑے غور اور دلچسپی کے ساتھ جاتو کو دیکھا ـ اس کے اثر میں ڈوگرہ فوج کے تین چار سپاہی تھے، جن کے ہاتھوں کی بندوقیں لیے بیٹھے تھے ـ رنبیر جو مقام فوٹو کے لیے پسند کرتا، یہ مسلح فوجی اس کے پیچھے ہو لیتے ـ نظیر ان کے ہمراہ ہونا چاہتا تو یہ ڈوگرے اسے روک دیتے ـــ کشمیر میں ہلڑ مچ رہا تھا۔ اس کے متعلق رنبیر کو اچھی طرح معلوم تھا کہ ہندوستان قابض ہونا چاہتا ہے، اور پاکستانی اپنی مدافعت کر رہے ہیں ـ فوٹو کے بعد جب نظیر دوست ـــ رنبیر موٹر کے پاس آیا تو اس نے نظیر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ...... جاتو ڈوگرے سپاہیوں کی گرفت میں تھی، انہوں نے اسے زبردستی موٹر کے اندر ڈالا .... وہ چیخی چلائی ..... نظیر کو مدد کے لیے پکارا مگر وہ مجبور تھا، ڈوگرے فوجی سنگینیں تانے کھڑے تھے ـ جب موٹر اسٹارٹ ہوئی تو نظیر نے اپنے دوست رنبیر سے بڑے عاجزانہ لہجے میں کہا، "یار رنبیر! یہ کیا ہو رہا ہے؟" رنبیر سنگھ نے جو موٹر چلا رہا تھا صرف اتنا کہا ــــ "بائی بائی"

اب تک ہم نے منٹو کے افسانوں میں جنسی مسائل کو سماجی پس منظر میں دیکھا، جس میں کہیں عورت کے استحصال کے لیے سرمایہ دارانہ نظام ذمہ دار تھا اور کہیں سماج کا پدری نظام، مگر منٹو کے افسانوں میں ہمیں جنسی مسائل کا ایک تیسرا رخ بھی نظر آتا ہے جسے ہم جنسی مسائل کا نفسیاتی پہلو (PSYCHOLOGICAL VIEW) کہہ سکتے ہیں۔ منٹو کے افسانوں کے اس تیسرے رخ کو واضح کرنے کے لیے "ٹھنڈا گوشت" سے یہ منظر ملاحظہ فرمائیے ــــ "کلونت کور نے جس کے بدن کے سارے تار تن کر خود بخود بج رہے تھے، غیر ضروری چھیڑ چھاڑ سے تنگ آ کر کہا" ... ایشر سیاں کافی پھینٹ چکا، اب پتا پھینک! ــــ یہ ایشر سیاں کے ہاتھ سے جیسے تاش کی ساری گڈی نیچے پھسل گئی۔ ہانپتا ہوا وہ کلونت کور کے پہلو میں لیٹ گیا اور اس کے ماتھے پر سرد پسینے کے لیپ ہونے لگے۔... کلونت کور نے اس کو گرمانے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہی ..... اب تک سب کچھ منہ سے کہے بغیر ہوتا رہا۔ لیکن جب کلونت کور کے منتظر بہ عمل اعضا کو سخت ناامیدی ہوئی تو وہ جھلا کر پلنگ سے اتر گئی ... سامنے کھونٹی پر چادر پڑی تھی، اس کو اتار کر اس نے جلدی جلدی اوڑھ کر اور نتھنے پھلا کر بپھرے ہوئے لہجے میں کہا، "ایشر سیاں! وہ کون حرامزادی ہے جس کے پاس تو اتنے دن رہ کر آیا ہے اور جس نے تجھے نچوڑ ڈالا ہے ـ؟" ایشر سنگھ پلنگ پر لیٹا ہانپتا رہا اور اس نے کوئی جواب نہ دیا ــــ کلونت کور غصے سے ابلنے لگی "میں پوچھتی ہوں، وہ کون ہے چڈو؟ کون ہے الفتی؟ کون ہے وہ چور پتا؟" ایشر سنگھ نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا "کوئی بھی نہیں کلونت، کوئی بھی نہیں" کلونت کور نے اپنے بھرے ہوئے کولھوں پر ہاتھ رکھ کر ایک عزم کے ساتھ کہا "ــــ ایشر سیاں! میں آج جھوٹ سچ جان کر رہوں گی ... کھا واہگورو جی کی قسم! اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں ہے؟" ــــ ایشر سنگھ نے کچھ کہنا چاہا مگر کلونت کور نے اس کی اجازت نہ دی۔ "قسم کھانے سے پہلے سوچ لے، میں بھی سردار نہال سنگھ کی بیٹی ہوں ــــ تکا بوٹی کر دوں گی، اگر تو نے جھوٹ بولا ـ لے اب کھا واہگورو جی کی قسم..... کیا اس کی تہہ میں کوئی عورت نہیں ہے؟" ــــ ایشر سنگھ نے دکھ کے ساتھ اثبات میں اپنا سر ہلایا۔ کلونت کور بالکل دیوانی ہو گئی۔ لپک کر کونے میں سے کرپان اٹھائی۔ میان کو کیلے کے چھلکے کی طرح اتار کر ایک طرف پھینکا اور ایشر سنگھ پر وار کر دیا ــــ آن کی آن میں لہو کے فوارے چھوٹ پڑے کلونت کور کو اس سے بھی تسلی نہ ہوئی تو اس نے وحشی بلیوں کی طرح ایشر سنگھ کے کیس نوچنے شروع کر دیے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی نامعلوم سوت کو موٹی موٹی گالیاں دیتی رہی۔ ایشر سنگھ نے تھوڑی دیر بعد نقاہت بھری آواز میں التجا کی ــــ "جانے دے اب کلونت جانے دے!" آواز میں بلا کا درد تھا۔ کلونت کور پیچھے ہٹ گئی۔ خون ایشر سنگھ کے گلے سے اڑ اڑ کر اس کی مونچھوں پر گر رہا تھا۔ اس نے اپنے لرزاں ہونٹ کھولے اور کلونت کی طرف شکریے اور گلے کی ملی جلی نگاہوں سے دیکھا ــــ "میری جان! تم نے بہت جلدی کی ــــ لیکن جو ہوا ٹھیک ہے ـ" کلونت کور کا حسد پھر بھڑکا ــــ مگر وہ کون ہے تمہاری ماں؟"

اوپر کے اقتباس میں آپ نے جنسی مسائل میں عورت کی نفسیات کو ملاحظہ کیا۔ "ٹھنڈا گوشت" سے ایک اور اقتباس ملاحظہ فرمائیے جو کلونت کور کے سوال کا جواب بھی ہے اور اس بات کی ضامن بھی ہے کہ شیطان میں بھی کہیں نہ کہیں اور کسی نہ کسی روپ میں انسان موجود رہتا ہے .... ایشر سنگھ نے مونچھوں پر جمے ہوئے لہو کو پھونک کر اڑاتے ہوئے کہا "جس مکان پر میں نے دھاوا بولا تھا۔ اس میں سات ــــ اس میں سات آدمی تھے .... چھ میں نے قتل کر دیے۔ اسی کرپان سے، جس سے تو نے مجھے ــــ چھوڑ اسے سن ــــ ایک لڑکی تھی، بڑی سُندر ــ اس کو اٹھا کر میں اپنے ساتھ لے آیا" کلونت کور خاموش سنتی رہی ایشر سنگھ نے پھر ایک بار پھونک مار کر مونچھوں پر سے خون ہوا اڑایا ــــ کلونت جانی میں تم سے کیا کہوں، کتنی سندر تھی ــــ میں اسے بھی مار ڈالتا، پر میں نے کہا " ایشر سیاں! کلونت کور کے تو روز مزے لیتا ہے ــــ یہ میوہ بھی چکھ دیکھ" کلونت کور نے صرف اس قدر کہا "ہوں" ــــ اور میں اسے کاندھے پر ڈال کر چل دیا ـ راستے میں ــــ کیا کہہ رہا تھا میں ــــ ہاں راستے میں ــــ نہر کی پٹڑی کے پاس، تھوہڑ کی جھاڑیوں تلے میں نے اسے لٹا دیا ــــ پہلے سوچا کہ پھینٹوں لیکن پھر خیال آیا کہ نہیں" ــــ یہ کہتے کہتے ایشر سنگھ کی زبان سوکھ گئی ــ کلونت کور نے تھوک نگل کر اپنا حلق تر کیا اور پوچھا، "پھر کیا ہوا ــ؟" ــــ ایشر سنگھ کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے "میں نے ــــ پتا پھینکا ــ لیکن ــــ لیکن ــــ" اس کی آواز ڈوب گئی ــــ کلونت کور نے اسے جھنجھوڑا ــــ "پھر کیا ہوا" ایشر سنگھ نے اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھولیں اور پھر کلونت کور کے جسم کی طرف دیکھا، جس کی بوٹی بوٹی تھرک رہی تھی" ــــ وہ مری ہوئی لاش تھی ــــ بالکل ٹھنڈا گوشت"

اس کہانی میں منٹو نے جنس اور نفسیات کے

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے ۔ یہ شاخِ گل بھی ہے تلوار بھی ہے (جگر)

جس قربی اور اٹوٹ رشتے سے قارئین کو روشناس کرایا ہے وہ اصل میں ایک عظیم کارنامہ ہے۔ میں اس افسانے کو منٹو کا نمائندہ افسانہ مانتا ہوں۔ اور یہ بھی کہ منٹو کی یہی ایک شاہکار تخلیق اسے زندہ جاوید بنا دینے کے لیے کافی ہے۔ مگر سماج کے ٹھیکے داروں کا مسند ذرا میں ڈانوا ڈول ہونے لگتا ہے، پھر اتنے بڑے نفسیاتی تجزیے پر وہ کیوں کر خاموش رہتے؟" لاہور کی عدالت نے منٹو پر فحش گوئی کا مقدمہ لگا دیا۔ منٹو نے عدالت میں جو بیان دیا اس کا ایک منظر ملاحظہ فرمایئے ــــــ

"میں کہانی "ٹھنڈا گوشت" شائع ماہنامہ "جاوید" کا مصنف ہوں، جو استغاثے کے نزدیک فحش ہے۔ میں اس کی مخالفت کرتا ہوں۔ یہ کہانی کسی بھی زاویہ سے ایسی نہیں ہے۔ . . . . . اس سے پہلے بھی تین بار کچھ کہانیوں کے بارے میں شک ہوا تھا کہ وہ فحش ہیں۔ اس لیے مجھ پر مقدمے چلے، سزائیں ہوئیں۔ لیکن اپیل کرنے پر ہر ایک بار کورٹ میں مجھے اور میری کہانیوں کو فحشیات کے الزام سے بری کیا گیا ــــــ

کہانی میں دو کردار ہیں۔ ایشر سنگھ اور اس کی رکھیل یا بیوی کلونت کور! دونوں ہی ٹھیٹھ قسم کے گنوار سکھ ہیں دونوں ہی جنسی طور پر بہت صحت مند ہیں۔ کہنا چاہیے کہ ایشر سنگھ کی جنسی تسکین صرف کلونت کور جیسی عورت سے ہی اور کلونت کور کو جنسی تسکین صرف ایشر سنگھ جیسے مضبوط اور تندرست مرد سے ہی مل سکتی تھی۔ دونوں کی جنسی زندگی آسودہ اور خوشحال تھی۔ لیکن ایک وقت ایسا آجاتا ہے جب کلونت کور محسوس کرتی ہے کہ ایشر سنگھ بدل گیا ہے، اسکی جنسی محبت میں اب وہ پہلی سی طاقت نہیں رہی۔ وہ اس سے بے رخی برت رہا ہے کسی اور عورت سے اس نے ناتا جوڑ لیا ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ سردار ایشر سنگھ زبردست دماغی الجھن کا شکار تھا جس کی وجہ سے اس کی جنسی قوت کو لقوہ مار گیا تھا۔ وہ لوٹ مار میں کئی قتل کرنے کے بعد ایک نوجوان لڑکی کو اٹھا لایا تھا جس سے اپنی جنسی بھوک مٹانا چاہتا تھا۔ لیکن جب اس نے ایسا کرنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ ــــ لڑکی مارے ڈر کے اس کے کاندھوں پر ہی مر چکی تھی اور اس کے سامنے ایک ٹھنڈی لاش پڑی تھی۔ اس حادثے کا ایشر سنگھ پر ایسا خطرناک اثر پڑا کہ وہ نامرد ہو گیا۔

ایک بات یہاں قابل غور ہے کہ قتل اور لوٹ سے ایشر سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے کئی انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مگر اس کے ضمیر پر ایک ہلکی سی خراش بھی نہیں آئی۔ مگر جب وہ لڑکی کی ٹھنڈی نعش پر جھکا تو اس کی مردانگی غائب ہو گئی ــــ مجھے افسوس ہے کہ وہ تحریر جو انسان کو بتاتی ہے کہ وہ انسان سے حیوان بن کر بھی انسانیت سے الگ نہیں ہو سکتے فحش سمجھی جا رہی ہے"۔

منٹو کے افسانوں میں ہمیں جو بات سب سے زیادہ کھل کر دکھائی دیتی ہے، وہ اس کی انسان دوستی اور عورت کی تقدیس ہے، جہاں بھی انسانیت دم توڑتی نظر آتی ہے اور عورت کے تقدس پر آنچ آتی دکھائی دیتی ہے، وہ آگ کے شعلوں سے اسے بچانے کے لیے کود پڑتا ہے۔ جنسیات اور معاشیات پر جو نظریہ منٹو نے پیش کیا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آج ساری دنیا اسی کے پیچھے دوڑ رہی ہے۔ منٹو نے اپنے اس مشن کی کامیابی کے لیے اپنی زندگی کو داؤ پر لگا دیا اور اسی لیے میں کرشن چندر کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں جس کا اظہار انھوں نے اپنے مضمون "سعادت حسن منٹو" میں کچھ اس طرح کیا ہے۔ "ــــ منٹو نے پہلے تو شرم اور شرم کے خول اکھاڑے پھر گندگی کی تہوں کو صاف کیا اور پھر اصل مضمون کو صابن سے دھو کر اتنا چمکایا کہ آج ہم میں سے ہر شخص جنسی مسائل کی اہمیت، اس کی پیچیدگیوں اور مختلف اثرات سے واقف نظر آتا ہے۔ اس جنسی تعلیم کے لیے ہم بڑی حد تک منٹو کے شکر گزار ہیں۔ یہ تعلیم اس نے اپنی جوانی اور صحت کھو کر ہمیں دی ہے۔ بمبئی کی چالیں، بمبئی کی گلیاں، بمبئی کے شراب خانے، بمبئی کے جوئے خانے بمبئی کے چکلے غرض یہ کہ بمبئی کے تمام جرموں کی دنیا کا منٹو نے بڑی گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ سچائی کی تلاش میں وہ گھٹنوں گھٹنوں دھنس گیا۔ اس کے کپڑے ضرور گندے ہو گئے، مگر اس کی روح کبھی میلی نہیں ہوئی۔

• اس کے افسانوں میں چھپا ہوا انسانی کرب اس بات کا ضامن ہے۔ وہ عورت کی عزت کا، اس کی تقدیس کا اور اس کے گھریلو پن کا جتنا قائل ہے کوئی دوسرا مشکل سے ہوگا۔

اس لیے جب وہ عورت کی عزت جاتے ہوئے دیکھتا ہے، اسے اپنی تقدیس کھوتے ہوئے دیکھتا ہے، اس کے گھریلو پن کو مٹتے ہوئے دیکھتا ہے تو وہ بے قرار ہو جاتا ہے۔ اور بے تاب ہو کر جاننا چاہتا ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اور جب وہ ہر بار اپنے مشاہدے کو کام میں لا کر ایک ہی سلسلے اور سماج کے ایک ہی نظام کو دیکھتا ہے تو غصے میں آکر اسے تھپڑ مارنا چاہتا ہے۔ منٹو اپیل کا قائل نہیں، وہ ڈانٹنے اور تھپڑ مارنے کا قائل ہے۔ اس کی ہر کہانی کے آخر میں ایک طمانچہ ہوتا ہے، جو قاری کے منہ پر اس بری طرح پڑتا ہے کہ وہ تلملا کر رہ جاتا ہے اور منٹو کو برا بھلا کہنے لگتا ہے۔"

ـــــــــ ٥ ـــــ ٥ ـــــــــ

کوئی قوم اس وقت تک ترقی کی منازل طے نہیں کرسکتی جب تک وہ یہ نہ سمجھ لے کہ کھیت جوتنا بھی اسی قدر اہم ہے جس قدر شعر کہنا۔ (بکر ٹی - واشنگٹن)

"مشہور افسانہ نگار قاضی عبدالستار لکھتے ہیں: "اردو شریف زبان ہے ۱۸۸۰ء میں ہندستان کے بڑے بڑے شہر اردو کے معشوق ہے یا اردو کا مرکز کہلاتے۔ دہلی ہو کہ لکھنؤ، لاہور ہو کہ حیدرآباد، رام پور ہو یا عظیم آباد سب اردو بولتے تھے۔ لیکن ان شہروں میں آج اگر آپ چلے جائیے تو اردو زبان کے بیٹے اپنے تمام روزمرہ کی ضرورت برج، اودھی یا پنجابی بولیوں کو پورا کرتے ہوئے ملتے ہیں۔""

اردو ادب میں مشترکہ اقدار کا ... سہ ماہی

اکائی

مرتب :- سردار احمد (علیگ)
صفحات ۹۶، فی پرچہ تین روپے
سالانہ دس روپے۔
پتا :- سیڑھی والا گھر، کٹہرہ شہاب خان
اٹاوہ۔ یو۔ پی۔ ۲۰۶۰۰۱

حضرت طرفہ قریشی بہ حیثیت نظم نگار

محمد امین الدین، مومن پورہ ناگپور (مہاراشٹر)

ناگپور کو کئی طرح سے اہمیت حاصل ہے ناگپور جو کہ ادبی، سیاسی اور دوسری اہم تحریکات کا مرکز رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے مولوی عبدالحق (بابائے اردو) نے اسے جاگ پور کہا تھا۔ شعرائے ناگپور کا تذکرہ جسے شرف الدین ساحل مرتب کر رہے ہیں۔ کئی نام ایسے سامنے آتے ہیں جنھوں نے ادبی تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لیکن آج ان کی یاد کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ ان اسمائے گرامی کو چھوڑ کر بیسویں صدی کے شعرا میں چند نام ایسے ہیں جنھیں ادبی دنیا اچھی طرح جانتی ہے۔ حضرت طرفہ قریشی بھی ان میں سے ایک تھے۔

حضرت طرفہ ۲ مارچ ۱۹۱۳ء کو ایک معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ والدین نے ان کا نام عبدالوحید رکھا۔ آبائی پیشہ و خاندانی نسبت سے قریشی کہلائے دن گزرتے رہے۔ چند سال گزر جانے کے بعد ان کے والدین کو حضرت کی تعلیم کی فکر ہوئی۔ اور روایت کے مطابق انھیں مکتب میں داخل کر دیا گیا۔ جہاں انھوں نے عربی و فارسی کی تعلیم پائی۔ عمر کے ساتھ ساتھ حضرت کا ذہنی ارتقا بھی ہوتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں حضرت نے شعر موزوں کرنا شروع کیا اور تخلص کی تلاش ہوئی۔ بہت سوچنے سمجھنے کے بعد ذہن نے اس بات کو قبول کیا کہ اپنے ہی نام کے ایک جزو یعنی وحید کو تخلص رکھا جائے اور حضرت طرفہ شروع میں عبدالوحید وحید ہوئے لیکن بعد میں وحید سے طرفہ کہلائے۔ شروعات میں اپنے کلام کو اصلاح کے لیے حضرت انور کامٹی کو دکھاتے رہے۔ انور کامٹوی کی اصلاح سے ان کی شعری صلاحیتیں نکھریں۔ لیکن ۱۹۳۹ء میں انھوں نے حضرت علامہ سیماب اکبرآبادی کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ اور یہ سلسلہ تقریباً چھے سال تک چلتا رہا۔ اس چھے سال کے عرصے میں علامہ سیماب نے انھیں دلچسپ مسائل پر کافی اور جب اطمینان ہو گیا تو انھیں فارغ الاصلاح قرار دے دیا۔ حضرت سیماب کے طریقۂ اصلاح سے طرفہ صاحب بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

۱۹۴۳ء حضرت طرفہ کے لیے مبارک ثابت ہوا۔ اور ان کے کندھوں پر رشتۂ ازدواج کا بوجھ ڈالا گیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ چار سال کی قلیل مدت میں ہی فرشتۂ اجل ان کی اہلیہ کے لیے موت کا پیغام لے آیا۔ اور ان کی بیوی انھیں داغِ مفارقت دے گئیں۔ اہلیہ کی وفات کے بعد چند سال پریشانی میں گزرے۔ اور ۱۹۵۲ء میں حضرت دوبارہ رشتۂ ازدواج کے اٹوٹ بندھن میں بندھ گئے۔ ان کی دوسری اہلیہ ابھی بقیدِ حیات ہیں۔ جن سے کئی بچے ہیں۔ ایک بیٹا محسن جو ملازمت میں ہے اور اسی کے کاندھوں پر گھر کا بار ہے۔ ایک بیٹی جو کارپوریشن میں پرائمری اسکول میں معلمہ کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔ شادی شدہ ہے اور اپنے گھر رہتی ہے۔

حضرت طرفہ نے شاعری کو کبھی ذریعۂ معاش نہیں بنایا۔ انھیں ہمیشہ تلاشِ معاش کی جستجو رہی۔ یہ مشکل ان کی اس وقت حل ہوئی جب انھیں مولانا ابوالکلام آزاد پرائمری اسکول میں ملازمت مل گئی۔ اسی ملازمت سے ریٹائر ہوئے۔

ناگپور اور کلکتہ ریلوے لائن کے قریب ایک مقام ہے۔ جسے بھنڈارہ کہا جاتا ہے اور یہ پیتل کے برتن کے لیے مشہور جگہ ہے۔ حضرت کا وطنِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن عمر کا طویل حصہ ناگپور میں گزرا۔ ناگپور میں ہی ان کی شاعری کو جلا ملی۔ ملازمت یہیں رہی۔ اور بہ حیثیت شاعر بھی مقبولیت نے قدم چوما۔ بہ حیثیت شاعر حضرت طرفہ ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ فنِ عروض پر انھیں اچھی خاصی دسترس حاصل تھی تلامذہ کی طویل فہرست سے ان کے مسلم الثبوت ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ عمر کے آخری حصے میں جب حضرت کے سامنے جانشینی کا مسئلہ آیا تو انھوں نے جانشینی کے لیے تین نام رکھے۔ وہ نام ہیں اشارق جمال، جلیل ساز، اور فرید خاں تنویر۔ اور اس طرح اول الذکر نام کو جانشینی کا اعزاز ملا۔ بہ حیثیت انسان حضرت طرفہ ایک خاموش طبع انسان تھے۔ اگر کسی کو فائدہ نہیں پہنچا تو نقصان بھی نہیں پہنچائے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کی موت کے بعد بھی لوگ انھیں یاد رکھے ہوئے ہیں۔

حضرت طرفہ نے تقریباً تمام اصنافِ سخن پر طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے دو مجموعۂ کلام "پہلی کرن" (۱۹۵۲ء) اور "نصف النہار" (۱۹۸۲ء) شائع ہو کر قارئین سے دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ابتدا میں ان کا لب و لہجہ روایتی انداز کا رہا۔ لیکن شاعری میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں ان پر اچھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ اور آخر زمانے میں چند غزلیں انھوں نے نئے انداز سے بھی کہی ہیں۔ پہلی کرن کی ان نظموں کو دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے کہ حضرت نے جو نظمیں کہی ہیں وہ بہت ہی سوجھ بوجھ سے کہی ہیں۔ اور ان لوازمات کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔ جو ایک نظم نگار کو نظم میں رکھنا چاہیے۔ نظم کے لیے تخیل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اسی تخیل سے نظم نگار نظم کا اعلیٰ مقصد حاصل کر سکتا ہے۔ نظم میں موزونیت ایک اہم جز ہے۔ نظم کا زندگی سے گہرا رابطہ ہے۔ اگر نظم نگار اپنے خیالات کو صحیح طور سے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو وہ مصلحِ قوم و بنی نوع

بات ساری نظر پہ ہے موقوف
ورنہ کانٹے بھی پھول ہوتے ہیں (حکیم رازی)
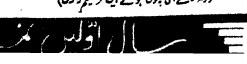
انسان کا پرستار اور انسان کی عظمت کا صحیح نقیب ہے۔ وہ اپنی نظم نگاری سے قوم کے اخلاق کو سنوار سکتا ہے۔ حب الوطنی کے صور پھونک سکتا ہے۔ لوگوں کے دلوں کو اپنی نظموں سے منور کر سکتا ہے۔ ان تمام باتوں کی تصدیق حضرت طرفہ کی نظموں، نعرۂ جمہوریت دوشیزۂ سیاست، لیڈر، عالمِ نو، قائدِ اعظم کے دشمنوں سے، غمِ دوراں (گاندھی کے قاتل سے) اور زندگی کے مطالعہ سے ہوتی ہے۔ ہر صنفِ سخن میں ان کی استادانہ صلاحیتوں کی بھرپور تصدیق ہوتی ہے۔

نظم میں ہیئت اور اسلوب کے لیے نظم نگار کو مشق اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن خیالات اور مرضی اس کی اپنی شخصیت میں پوشیدہ ہوتے ہیں۔ اس لیے نظم نگار کا فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے نقطۂ نظر کی وضاحت میں خلوص اور دیانت داری سے کام لے۔ اگر نظم نگار کی شخصیت اعلا و ارفع ہو تو اس کے خیالات میں توانائی اور زندگی کی جھلکیاں ملیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ نظم میں نظم نگار کی انفرادیت جھلکتی ہے۔ ان تمام باتوں کی تصدیق حضرت طرفہ کی ان نظموں کے عنوانات آرزو۔ صلۂ وفا۔ تجزیہ۔ مقصودِ نظر، نغمۂ عمل، قوتِ عمل، اور عرفانِ خودی سے ہوتی ہے۔ نیز ان اشعار کو ثبوت کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ نظم آرزو میں اپنی آرزو اس طرح بیان کرتے ہیں

میرے شاگرد میرے نام کو زندہ رکھیں
میری اور محترم استاد کی تقلید کریں!
کشورِ علم کا سب ان کو شہنشاہ کہیں!
آسمانِ ادب و شعر کے سیار بنیں!
عظمتِ چرخِ صفامت کو دوبالا کر دوں
خاک کے ذروں کو ہم دوشِ ثریا کر دوں

مقصودِ نظر کے ان اشعار کو دیکھیے۔ جس سے ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ہوتی ہے۔

اخلاق حسیں ہو تو مرے ہم پہ زمانہ
کردار میں ہو حسن تو دے جان خدائی
غیبت سے کسی کی ہے یہ اچھا کہ سر لو
انسان کرے بیٹھ کے خود اپنی برائی!!
حفظانِ ادب کی کوئی ترکیب نکالو
ماحول میں پھیلے ہیں جراثیم وبائی!!

نظامِ نو کے یہ اشعار ملاحظہ فرمایے، جن میں ان برائیوں کی نشاندہی کی ہے جو معاشرہ میں سرایت کر گئی ہیں:

ہر بات پہ کھاتا ہے ملّا ایمان قسمیں جھک جھک کر
مومن کی جگہ قرآن یہاں ابلیس کو سونپا جاتا ہے
مزدور کے آنکھوں کے حلقے بنتے ہیں امیر ظل کی جھک
احساس کے پردوں پر یہ کھیل بھی کھیلا جاتا ہے
بیوہ و یتامیٰ پر طعنہ و تشنیع کی ہوتی ہے بارش
جب مرتے نہیں یہ فاقوں سے باتوں سے مارا جاتا ہے

یہ جبر و تشدد کچھ نہ رہے یہ ظلم و ستم سب مٹ جائیں
اک ایسا نظام تو بزمِ عالم میں مرتب کرنا ہے

تمام مذاہب میں مذہبِ اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جہاں مساوات کی تعلیم نظر آتی ہے۔ اور مرد و زن کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ لیکن انسان آج ان تعلیمات کو بھلا بیٹھا ہے۔ اور عورتوں کے ساتھ جو ظلم و بربریت کا برتاؤ ہو رہا ہے۔ کھلے عام انھیں اپنی ہوس کا شکار بنایا جا رہا ہے۔ حضرت نے بھی اُن کو محسوس کیا اور ایک نظم "مرد و عورت" میں اس کا اظہار کیا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

مرد کو ہر جرم پر ہے اختیارِ عذرِ سہو
اور عورت اک سبک لغزش پہ بھی خاموش کار
مرد جب چاہے کرے عورت سے اظہارِ ہوس
اور عورت ضبطِ ذوق و شوق سے سینہ فگار
آہ یہ اندھیر، یہ بیداد، یہ حق تلفیاں
آخران دکھیاروں کا ہے کوئی پروردگار؟

پہلی جنگِ عظیم کے حالات اپنے بزرگوں سے سُنتے۔ دوسری جنگِ عظیم کے حالات حضرت کی پختہ عمر میں رونما ہوئے انگریزوں کا دورِ حکومت دیکھا۔ اور ان آزادی کے متوالوں کی کارگزاریاں بھی دیکھیں جو دن رات آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ لیکن آزادی ملنے کے فوراً بعد ہی جو خون کی ہولیاں کھیلی گئیں، اور ندیاں بہیں اس سے وہ کیوں نہ متاثر ہوتے ان کے سینے میں بھی ایک حساس دل دھڑک رہا تھا۔ "نظم آزادی ملنے کے بعد" میں انھوں نے ان خیالات کو بھی عملی جامہ پہنایا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

بہہ رہا ہے ہر طرف کیوں بے گناہوں کا لہو
غیرتِ انسانیت وہ تیرا دم خم کیا ہوا؟
کن منظم سازشوں کا ہو گئی دنیا شکار!
ہو گیا کیسا نظامِ ہند یہ ہم کیا ہوا؟
صبح سے تا شام طرفہ بس اسی کا ہے ملال
ہم نے کیا سوچا تھا اور یہ نظمِ عالم کیا ہوا؟

اسی طرح کے تاثرات انھوں نے ایک نظم "آزادی" میں نظم کیے ہیں:

قتل و غارت، کشت و خوں کی جنبش ہو بہ ہمت معلوم
گھیرے جا کر ٹرینوں کو لٹیروں کا ہجوم!!!
عورتوں پہ ہاتھ جس میں سورماؤں کا اُٹھے!
بے گناہوں کے لہو سے پیاس خنجر کی بجھے!
ایسی آزادی وطن کو راس آ سکتی نہیں!
ملک کو اپنے تباہی سے بچا سکتی نہیں!

حضرت طرفہ ایک طویل مدت تک بسترِ علالت پر رہے۔ کینسر سے موذی مرض میں مبتلا رہے آخر یہ مرض ان کی زندگی کے ساتھ ہی گیا۔ اور بالآخر ۷ جولائی کی صبح اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔

حضرت کے انتقال سے ادبی دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ اور اسی کے ساتھ حلقۂ سیماب کی ایک شمع اور بجھ گئی۔

~~~~

مبارکبادیاں

حکومت مہاراشٹر کی جانب سے اردو کے جن ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے لیے انعامات دیے گئے ہیں انکے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں:

ڈاکٹر عصمت جاوید	ظفر کلیم
ڈاکٹر امانت	شرف الدین ساحل
یوسف ناظم	شیخ رحمان اکولوی
بدیع الزماں خاور	احمد عثمانی
رفیعہ شبنم عابدی	سلام بن رزاق
قمر اقبال	عبدالوہاب
ساجد رشید	شری رام گپتا
علی امام نقوی	جگدمبا پرشاد
سلیم شہزاد	ذکیہ خطیب
نظام الدین نظام	مولانا ابراہیم عمادی
ارتضیٰ نشاط	ڈاکٹر صادق
ڈاکٹر مخمر	نور پرکار

ادارہ 'اسباق' ان تمام انعام یافتہ حضرات کی خدمت میں پُر خلوص مبارکباد پیش کرتا ہے

(ادارہ)
~~~~

علی امام نقوی کی افسانہ نگاری

سید حسن عباس گوپال پوری
بہار یونی ورسٹی مظفر پور۔ بہار

جس طرح مابعد دور نے ہر شعبۂ حیات کو متاثر کیا ہے اسی طرح ادب و شعر بھی کوئی صنف ایسی نہیں بچی جہاں اس نے اپنا اثر نہ ڈالا ہو۔ آج افسانے کی وہ تعریف قابل قبول نہیں جو ایڈ گرایلن پو نے دی تھی کیونکہ پو کی وہ تعریف اس کے اپنے عہد کے مطابق درست کہی جا سکتی ہے۔ زندگی اثر پذیر ہے اور چونکہ ادب میں زندگی کے عناصر کی پیش کش ہوتی ہے لہٰذا ادب بھی اثر پذیر ہوا۔ آج کے افسانہ نگار تفصیل سے بحث نہیں کرتے بلکہ استعاروں اور کنایوں کی مدد سے اپنی باتیں کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ آج علامتی اور تجریدی افسانوں کی گہما گہمی ہے۔ افسانہ نگاروں کا ایک بڑا حلقہ علامتی اظہار بیان کو بہتر سمجھتا ہے۔ وہ تفصیل و توضیح کو اپنا نا احمقانہ عمل گردانتا ہے۔ علامتی فن کار الفاظ اور آوازوں کی مدد سے معنی کی ترسیل و ابلاغ میں گم ہیں۔ بسا اوقات وہ ایسی علامتیں وضع کرتا اور استعمال کرتا ہے جس کا سمجھنا کار دارد ہے ایسے فن کار اور فن پارے خیالات میں ہم آہنگی نہیں پیدا کر پاتے۔ اور فن کار کی کوشش زائل ہو جاتی ہے وہ داخلی کرب تخلیق اور احساسات کی مرکزیت کو جھیلنے میں علامتیں بھی تراشتا ہے جس سے پیش کش کا خیر زیادہ نہیں اٹھ پاتا۔ وہ اپنے طور پر حقیقتوں کو شدت سے محسوس کرتا ہے اور ان حقیقتوں کے ذاتی اور داخلی تجربوں میں اپنے طرز معاشرت کی حقیقتوں کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اسی وجہ سے وہ غیر ضروری تفصیلات سے اجتناب کرنے کی سعی بھی کرتا ہے۔

آج کے جدید افسانہ نگاروں کی یہ روش اور اپنے تجربے وقت کے اسیر اور اسی کے پیدا کردہ ہیں۔ یونگ نے کہا تھا کہ جدید وہ ہے جو اپنے حال کا مکمل شعور رکھتا ہے' اس طرح ہر فن کار اپنے زمانے اور وقت کا 'جدید' فن کار کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے اپنے زمانے اور عہد کی نمائندگی کی ہے۔ جدید فن کاروں کے بڑے پیچیدہ اسلوب اور پر اسرار طرز بیان نے علامتی اور تجریدی اور ابہامی فن پاروں کی تشکیل کی ہے۔ جدید فن کار اپنے حال کا مکمل شعور رکھتے ہیں۔ وہ لوٹ کھسوٹ اور بے جا استحصال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اس طرح واقعات قدیم اور جدید دونوں طرح کے فن کاروں کے پیش نظر رہے ہیں۔

علی امام نقوی جدید افسانہ نگاروں میں اپنا ایک منفرد رنگ اور آہنگ رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ "نئی مکان کی دیمک" ان کے عصری حسیت اور علامتی و تجریدی اظہار بیان کی خوبصورت مثال ہے۔

ان کے افسانوں میں سماج اور فرد کے مابین نامعقولیت اور ناموافقت کی فضا پوری طرح حاوی ہے۔ ان کے خیالات منجمد نہیں بلکہ رواں دواں ہیں۔ انہوں نے اپنے حال کے ساتھ ہی ساتھ اپنے گرد و پیش یعنی رجحل جذبات کی عکاسی بڑے ہی بہترین پیرایے میں کی ہے۔ انہوں نے سماج کے ان الجھے بالوں کو کھولنے کی سعی کی ہے جن کو سلجھائے بغیر ایک صالح اقدار سماج کی تشکیل ممکن نہیں۔

مختصر افسانوں کی اپنی ایک روایت رہی ہے علی امام نقوی کے یہ مختصر افسانے روایت کی پابندی کا مکمل نمونہ ہیں۔ انھوں نے اپنے افسانہ 'رام بچارہ' میں نفسیاتی جذبے کی بہترین عکاسی کی ہے۔

'جنس' ہمارے افسانوی ادب کا مخصوص موضوع رہا ہے شاید ہی کوئی قدیم یا جدید فن کار ایسا ہو جس نے 'جنسیات' کی پیش کش کسی نہ کسی طور پر نہ کی ہو۔ منٹو اور عصمت چغتائی تو اس سلسلے میں بدنامی کی حد تک مشہور رہیں۔ "کچے پکے دھاگے" علی امام نقوی کا ایک ایسا ہی افسانہ ہے جس میں انھوں نے دولت مندوں کی 'ضرورتوں' کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھا ہے۔

"باپ کی طرح بیٹوں نے بھی صرف روپے کے حصول ہی کو اپنا نصب العین بنا رکھا تھا کسی کو اتنا ہوش نہ تھا کہ اپنے اپنے برتن کھنگال کر انہیں چمکا کر احتیاط سے ان کی جگہ رکھتے۔ البتہ پربھو نے ان برتنوں کا ضرور خیال رکھا تھا۔ پرانا نمک خوار تھا اور اس کا نمک پربھو کے سلب سے ہوتا ہوا دو مرتبہ حکم چند کی بیوی کے رحم میں گھوم کر آج کل مرسڈیز میں گھوما کرتا ہے اپنی بہو کی غیر حاضری میں کئی مرتبہ اس نے دھیان چند کی بیوی کا بھی دھیان رکھا تھا لیکن وہ بہت سمجھدار تھی۔ اپنی ضرورت پر بڑے چاؤ سے نمک چکھتی لعاب کو منہ ہی منہ میں گھما کر لطف اندوز ہوتی اور جب منہ بھرنے کا احساس ہوتا پچاک سے تھوک کر ممنونیت بھری نظروں سے پربھو کو دیکھا کرتی۔ بجھلی والی البتہ ان چکروں سے دور تھی اور اس لیے بھی کہ اس کے چکر گھر سے باہر چلا کرتے تھے' اپنی پتنی کی لٹو لوٹا کی طرح ...."

'کھلتے ہوئے بل' پڑھنے کے بعد قاری کا ذہن فوراً منٹو، عصمت چغتائی، نیاز فتح پوری اور سجاد حیدر یلدرم کے افسانوں کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے — جہاں تخئیلیت اور شعلگیٔ جذبات نے افسانوی اسلوب کو رومانی سرشاری اور مسرت فراہم کی۔ ان کے یہاں جمالیاتی خیرہ کر دینے والی روشنی ملتی ہے۔ مگر علی امام نقوی نے جس دوشیزہ کے بل کھولنے کی کوشش کی ہے وہ پہلے ہی کیچل سے نکل چکی تھی جہاں نقوی صاحب کو شاید مایوسی ہی ہاتھ آئی ہو۔

جیب و بازار کے مابین تنے ہیں نیزے — اور یہ جنگ کوئی دیکھ رہا ہے مجھ میں (رشید اعجاز)

"آج سے محض تین روز بعد مس شمیم مسز خان کہلائیں گی"۔

"اوں، ہونھ"۔

"پھر ـــ"

"تین روز بعد مسٹر خان شمیم کے ہز بنڈ کہلائیں گے"

کیابات ہوئی ــــ ؟

فرسودگی کا چولا آخر ہم کب اتاریں گے؟ زمانہ قیامت کی چال چل رہا ہے اور ہم آج بھی اپنی شناخت کی خاطر ان مُردوں کے محتاج ہیں"۔

"اری ہٹا بھی اس موضوع کو اور اپنی شمن کو شب وصل کے نشیب و فراز سمجھا"۔

"بکواس بند کرو" شمن دہاڑی۔ تم مجھے کیا سمجھاؤگی ہوتا ہی کیا ہے اس رات"۔

"کچھ نہیں ہوتا؟

کیا ہوتا ہے؟

بہت کچھ ہوتا ہے"۔

جو بھی ہوتا ہے میں سب جانتی ہوں شمن نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا"۔

کمپیوٹر، خود شناسی کی بہترین مثال کہا جاسکتا ہے جدید آلات کی تمثیل سے علی امام نقوی نے اپنے حال کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ماحول سے الگ تھلگ حساس ذہن کا رہنا ممکن نہیں۔ نقوی نے اپنے گردو پیش کے قبول کیے ہوئے اثرات کو 'کمپیوٹر' کی مدد سے پیش کیا ہے۔ جو دوسروں کی گتھی سلجھا تو سکتا ہے مگر اپنے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔

'نئے مکان کی دیمک' جیسا کہ نام ہی سے واضح ہے کہ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ مگر افسانہ نگار نے اس افسانے میں جس عمل کی پیش کش کی ہے وہ بڑا ہی متاثر کن ہے۔ "ہر کام کا وقت معین کردیا گیا ہے اور وقت سے پہلے ایک پتا بھی اپنے مقام سے ہل نہیں سکتا"۔ اس افسانے کا مرکزی خیال ہے جیسا کہ افسانے کے اختتام میں اس امر کی وضاحت ہوتی ہے۔ عالم بالا میں ایک بن بلائے مہمان کی آمد سے خلفشار مچ جاتا ہے۔ مہمان ایک لڑکی ہے جو حالات کی ستم ظریفی سے وقت سے پہلے اس مقام تک پہنچتی ہے۔ سارے چہرے جانے پہچانے ہونے کے باوجود کوئی اسے پہچان نہیں پاتا۔ اور نہ ہی کوئی اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ بھوک سے بے چین ہوتی ہے تو انگور کے خوشوں کی طرف ہاتھ بڑھاتی ہے۔

"ہش" ـــ

ایک خوبصورت نوجوان نے اسے ٹوکا۔

"یہ کیا کررہی ہو؟"

"مجھے انگور کھانے ہیں"

"کیوں؟"

"لیکن یہاں ایسا دستور نہیں ہے"۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا ہوگا۔ کیا آپ بھوک محسوس نہیں کرتے؟

"کرتے ہیں . . . . اور ہم صرف سوچ لیتے ہیں کہ ہمیں انگور کھانے ہیں ہمارا پیٹ انگوروں سے بھر جاتا ہے"۔

"یہ کیسے ممکن ہے . . .؟ وہ حیرت سے دریافت کرتی ہے،

"یہی تو یہاں ممکن ہے . . . ."

وہ حیرت و استعجاب میں کھڑی تھی کہ عین اسی وقت دو وجیہہ نوجوان ادھر سے گزرتے ہیں جن کے ہاتھوں میں ضخیم کتابیں ہیں وہ اپنی اپنی کتاب کی ورق گردانی کے بعد کہتے ہیں۔

"تم اپنے وقت سے پہلے آگئی ہو"۔

تمہیں وہیں جانا ہوگا۔ مزید کچھ عرصہ اسی جگہ رہنا ہوگا۔ اسی بیمار اور مدقوق پنجرے میں، جہاں پچھلے اٹھائیس برسوں سے قید تھی۔

افسانے کا اختتام بڑے ہی متاثر کن موڑ پر ہوتا ہے۔ افسانہ نگار اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ وقت سے پہلے مرنا باعث خرابی ہے روح بھٹکتی ہے دین و دنیا میں کہیں پناہ نہیں ملتی۔

"دانتوں میں گھری زبان" تقسیم کے واقعات سے متاثر ہوکر معرض تحریر میں لایا گیا ہے۔ تقسیم وطن نے افسانوی شعور کو موضوعات و اسالیب کے رنگا رنگ پیمانوں سے لبریز کردیا۔ تقسیم وطن نے جہاں اور دنیا بھر کی برائیاں پیدا کیں وہاں انسان کا انسان سے اعتماد بھی اٹھادیا۔ اب بھائی کو بھائی پر اعتماد نہیں رہا۔ تحفظ اور آزادی کے جذبات مجروح ہوکر رہ گئے۔ تقسیم وطن نے 'ہم' اور 'ہیں' کو بھی تقسیم کردیا۔ 'دانتوں میں گھری زبان' اس عظیم حادثے کی بہترین عکاسی ہے۔

حالیہ فسادات نے جس طرح پورے ملک بلکہ دنیا کو اپنی آمریت اور بربریت کی وجہ سے متاثر کیا ہے شاید ہی کوئی سخت دل ان سے متاثر نہ ہوا ہو۔ علی امام نقوی رنگین جذبات کی عکاسی میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کا دل ملکی اور قومی جذبے سے سرشار ہے۔ تو دوسری طرف ان کی دوربیں آنکھیں ان فسادات کے پیدا کردہ معذوروں اور اپاہجوں کو بھی دیکھ رہی ہیں جو غیر صالح اور مریض سماج کی وجہ سے رونما ہوتے ہیں۔ 'بستی' 'عضو بریدہ لوگوں کی' ان کے رنگین جذبات کی بہترین مظہر ہے۔

تہہ در تہہ، سرینڈر کانفرنس، دلدل میں دھنسے لوگ امین، پرتوے فرد اور سماج کی جبرو دستیوں کی بہترین مثال ہیں۔ جن میں جدید مسئلوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔

علی امام نقوی کے افسانوں میں علامت، تجرید اور ابہام موجود ہے۔ بعض افسانے اتنے مبہم ہوگئے ہیں کہ عام قاری ان تہوں تک پہنچنے میں دشواری محسوس کرے گا جہاں تک افسانہ نگار کا ذہن پہنچا ہے اس طرح ان افسانوں میں خشکی سی آگئی ہے مگر ان کا دلکش اور تروتازہ اسلوب اس خشکی کے احساس کو دبا دیتا ہے۔

جدید افسانہ نگاروں کی جس صف میں سریندر پرکاش بلراج مینرا، انور سجاد، کمار پاشی، ظفر اوگانوی کا شمار ہوتا ہے، علی امام نقوی انہیں تسلسل سے شامل کیے جاسکتے ہیں۔ کیوں کہ ان افسانہ نگاروں کی اہم خصوصیت روایت سے بغاوت ہے۔ اور علی امام نقوی روایت کو گلے لگائے نظر آتے ہیں۔

ماہنامہ اسباق کے سالِ اولین نمبر کیلیے
نیک خواہشات
غیر شرعی رسوم سے احتراز کیجیے
قومی یکجہتی کو فروغ دیجیے
ہر فرد کا سرمایہ قومی سرمایہ ہوتا ہے
قومی سرمایہ کو صحیح اور شرعی طور پر استعمال کیجیے
ایک خادم قوم
خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے ؟ خدا کیا ہے ؟ خدا ہے اور کیا ہے (اکبر الہ آبادی)

اردو کی بقا کیلیے

ماہنامہ اسباق کے سالِ اوّلیں نمبر کی

اشاعت کے موقع پر دعاؤں اور نیک خواہشات کے ساتھ

قوی اور بہادر وہ ہے جو اپنے نفس کو مغلوب کرے نہ کہ وہ جو دوسروں کو پچھاڑ دے ـــــــــــــــــ (حضرت محمد صلعم)

علم کی بدولت کسی نے خدائی دعویٰ نہیں کیا۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ کیا مال و دولت کی وجہ سے کیا۔ ـــــــــــــــــ (حضرت ابوبکر صدیق رضؓ)

قناعت ہی سب سے بڑی دولت ہے۔ ـــــــــ (حضرت عمر فاروق رضؓ)

تعجب اس پر ہے جو تقدیر کو پہچانتا ہے اور پھر جانے والی چیز کا غم کرتا ہے۔ (حضرت عثمان رضؓ)

دنیا کی مثال سانپ جیسی ہے کہ جس کی جلد تو نرم ہوتی ہے مگر اس کا زہر جان لے لیتا ہے۔ ـــــــــــــــــ (حضرت علی رضؓ)

منجانب: مسز شمیم کمال ـــــــــــــــــ

فلاور بلوم 62 .A ویرا ڈیسائی۔ اندھیری (ویسٹ) بمبئی ۴۰۰۰۵۸

غرور انہیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا (اکبر الہ آبادی)

اسباق کے

سالِ اوّلیں نمبر کیلیے نیک خواہشات

آزمائش

یہ وہ وقت ہوگا جب تم ابتلاء و آزمائش کے دور میں داخل ہونگے۔ تمھاری گرفتاریاں عمل میں آئیں گی، تمھارے تبادلے کیے جائیں گے۔ تم دور دراز کے علاقوں میں پھینک دیے جاؤگے، تمھارے گھروں کی تلاشیاں لی جائیں گی اور ممکن ہے کہ یہ ابتلاء و آزمائش کی مدت کافی طویل ہو، دعوتِ حق کے علمبرداروں کی راہ میں اس منزل کا آنا ناگزیر ہے۔ اس سے ہوکر انھیں ہمیشہ گزرنا پڑتا ہے۔

مجاہدین اور انبیاءؑ سابقین کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔

لیکن!

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ وہ بالآخر مجاہدین کی ہی مدد فرمائے گا

(حسن البنا شہیدؒ)

منجانب:۔ بزمِ نوجوانانِ مدینۃ العلوم۔ ایروڈا۔ پونہ ۶

ہے دلدلوں میں دھنسی نسل [illegible] یہاں نجات دلانے [illegible] آئے گا (نذیر [illegible])

باب ۱۰
رباعی
قطعہ
ثلیث
فع
فاع
فعول
فعل
فعول
فع
فاع
فعل
مفعولن
مفعول
مفاعیل
مفاعیلن
فاع
مفعول
فع
مفاعیلن
مفاعیلن
مفاعلن
فعولن
مفاعیل
مفاعیل
مفعول
فعل

ترتیب

حدیثِ قدسی

اقوالِ باری تعالیٰ

میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے لوگ ان کے علاوہ تلاش کرتے ہیں — بھلاوہ کیسے پائیں گے

۱۔ میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں۔ — بھلاوہ کیسے پائیں گے

۲۔ میں نے علم و حکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے لوگ اسے سیری میں تلاش کرتے ہیں — بھلاوہ کیسے پائیں گے

۳۔ میں نے تونگری کو قناعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے مال میں تلاش کرتے ہیں — بھلاوہ کیسے پائیں گے

۴۔ میں نے عزت کو اطاعت میں رکھ دیا ہے لوگ اسے بادشاہوں کے دروازوں پر تلاش کرتے ہیں — بھلاوہ کیسے پائیں گے

۵۔ میں نے اپنی رضا کو مخالفِ نفس میں رکھ دیا ہے لوگ اسے موافقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں — بھلاوہ کیسے پائیں گے

منجانب:۔ محمد ہارون عطار، کلائمکس مینس ویئر، چنچوڑ۔ پونہ ۱۹-۱۱-۹۴

جشن مناؤ تم لاشوں پر یہ کیسی تہذیبِ حیات — ہم کو ادب انکار نہیں ہے کشمکش انسانی سے (ادب نیگھر)

رباعی کے اوزان

ڈاکٹر عصمت جاوید

میں اس مختصر سے مضمون میں نہ تو رباعی کی تاریخ بیان کرنا چاہتا ہوں اور نہ اس کے موضوعات سے بحث کرنے کا ارادہ ہے۔ صرف رباعی کے اوزان پر گفتگو مقصود ہے۔

رباعی کی خارجی شناخت یہ ہے کہ وہ چار مصرعوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اور اس کے پہلے، دوسرے اور چوتھے مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں۔ دوسری اصناف کی طرح اس میں بھی ردیف کا التزام شاعر کی مرضی پر ہے۔ بعض رباعی گو شعرا چاروں مصرعوں میں بھی یہ التزام کرتے ہیں۔ بالعموم چوتھے مصرعے میں نقطۂ عروج ہوتا ہے۔ اکثر رباعیوں میں شروع کے دو مصرعے بھرتی کے ہوتے ہیں۔ لیکن کامیاب رباعی کی پہچان یہ ہے کہ اس کے چاروں مصرعے معنوی اعتبار سے مربوط ہوں۔ یہ رباعی کی صرف ظاہری شناخت ہے۔ دو شعری قطعہ میں ان تمام خصوصیات کا ہونا لازمی تو نہیں لیکن پائی جاسکتی ہیں۔ مثلاً گرچہ دو شعری قطعے میں دوسرے اور چوتھے مصرعے کا ہم قافیہ ہونا لازمی ہے لیکن شاعر اگر چاہے تو اس خصوصیت میں پہلے مصرعے کو بھی شامل کرسکتا ہے۔ جیسا کہ اقبال نے کیا ہے۔ کامیاب قطعے کی بھی پہچان یہ ہے کہ اس کے چاروں مصرعے معنوی اعتبار سے مربوط ہوں۔ اور آخری مصرعے میں لپٹی ہوئی بجلیاں بھری ہوں لیکن ظاہر کی اس مماثلت کے باوجود دو شعری قطعہ رباعی نہیں بن جاتا۔

دو شعری قطعے اور رباعی میں مابہ الامتیاز خصوصیت یہ ہے کہ دو شعری قطعات کے لیے دوسری اصناف سخن کی طرح کسی مخصوص بحر یا اوزان کی کوئی قید نہیں ہوتی جبکہ رباعی کے مخصوص اوزان ہوتے ہیں۔ اور یہی باطنی خصوصیت اسے دیگر اصناف سخن سے ممتاز کرتی ہے۔ یوں تو مثنوی کے لیے بھی اساتذہ نے کچھ بحریں مختص کر دی تھیں لیکن اس پابندی کو توڑنے کی متعدد مثالیں بھی ملتی ہیں اور محض اس انحراف کی بنیاد پر کسی نقاد نے مثنوی کو مثنوی نہ ماننے پر اصرار بھی نہیں کیا ہے۔ اس کی نمایاں ترین مثال حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام ہے جس میں مثنوی کی مروجہ بحروں کا التزام قائم نہیں رکھا گیا ہے لیکن رباعی کے لیے جو اوزان مخصوص کر دیے گئے ہیں ان سے انحراف رباعی کو رباعی رہنے نہیں دیتا۔ جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے بتایا جائے گا، رباعی کے مقررہ اوزان مفاعیلن اور اس کے زحافات ہیں۔ جن کا تعلق بحر ہزج سے ہے رباعی کے ہر مصرعے میں چار ارکان لازمی طور پر آتے ہیں۔ اس لیے اقبال اور ان کے ہم خیال نقادوں کا اقبال کے دو شعری قطعات کو رباعی کہنے پر اصرار کرنا۔ اور بابا طاہر کے حوالے سے اپنے دعوی کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرنا مناسب نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اگرچہ اقبال نے اپنے دو شعری قطعات بحر ہزج ہی میں کہے ہیں لیکن چونکہ بحر ہزج مسدس میں ہیں اوزان میں مفاعیلن کے مخصوص زحافات کا التزام نہیں ہے اس لیے یہ رباعی نہیں کہلائے جاسکتے۔ اس کی وجہ صرف تکنیکی یا فنی نہیں ہے۔ بلکہ میرے خیال میں رباعی کا سارا باطنی حسن اس کے اوزان سے بنیادی طور پر وابستہ ہے۔ ان اوزان کو بدل ڈالیے اور رباعی کا حسن اسی طرح غارت ہوجائے گا جس طرح کسی مصرع موزوں میں الفاظ کی ترتیب آگے پیچھے کر دینے سے وہ مصرع غیر موزوں ہو جائے گا۔ اور الفاظ کا سارا باطنی حسن اور اس کی غنائیت برباد ہو جائے گی۔

عام قاری کی سہولت کے لیے اس مضمون کی ابتدا میں ان بعض اصطلاحوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے جو میں آگے چل کر اسی مضمون میں رباعی کے اوزان کے سلسلے میں استعمال کی ہیں۔

'وزن' اصطلاح میں ہم عدد کلمات میں حرکت و سکون کی مطابقت کو کہتے ہیں۔ مثلاً تم، گل، بل، مل وغیرہ دو حرفی کلمات ہیں۔ ان کی مشترکہ خصوصیات صرف یہی نہیں کہ دو حرفی ہیں بلکہ ان الفاظ کا پہلا حرف متحرک ہے۔ یعنی ان پر زبر، زیر یا پیش ہے اور دوسرا حرف ساکن ہے یعنی اس پر جزم ہے اس لیے یہ تمام کلمات ہم وزن کہلاتے ہیں۔ پہلے لفظ کے پہلے حرف پر زبر ہو اور دوسرے لفظ کے پہلے حرف پر پیش ہو تو اس سے وزن میں فرق نہیں پڑتا۔ گل اور آب ہم وزن ہی کہلائینگے۔ صرف پہلے حرف کا متحرک ہونا ضروری ہے۔ الفاظ دو حرفی بھی ہوتے ہیں سہ حرفی بھی، چہار حرفی بھی اور پنج حرفی بھی۔ لیکن چہار حرفی اور پنج حرفی الفاظ کی اتنی اہمیت نہیں کیونکہ چہار حرفی لفظ کو دو حرفی + دو حرفی اور پنج حرفی لفظ کو ۲+۳ یا ۳+۲ حرفی الفاظ میں منقسم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اگرچہ چہار حرفی اور پنج حرفی الفاظ کے لیے عروض میں جداگانہ اصطلاحیں استعمال ہوتی ہیں لیکن اس مضمون میں میں ان سے عمداً گریز کرونگا۔

دو حرفی کلمے کو عروض کی اصطلاح میں 'سبب' کہتے ہیں۔ اگر دو حرفی کلمات ایسے ہوں کہ پہلا حرف متحرک اور دوسرا ساکن ہو (جیسے اصطلاح میں ساکن الآخر کہتے ہیں) تو ایسے الفاظ سبب خفیف کہلاتے ہیں۔ جیسے بس، تم، کل وغیرہ لیکن اگر دو حرفی کلمے کا دوسرا حرف بھی متحرک ہو جیسے گلِ نغمہ میں 'گلِ' تو اسے سبب ثقیل کہتے ہیں۔ اسی طرح سہ حرفی کلمے کو وتد کہتے ہیں۔ اگر سہ حرفی کلمے کے پہلے دو حرف متحرک اور آخری ساکن ہو تو اسے وتد مجموع کہتے ہیں۔ جیسے کرم، خدا، طبیب وغیرہ۔ لیکن اگر سہ حرفی کلمے کا آخری حرف بھی متحرک ہو تو اسے وتد مفروق کہتے ہیں۔ جیسے کرمِ خدا میں 'کرمِ' چونکہ اردو میں سبب ثقیل اور وتد مفروق صرف فارسی کسرۂ اضافت کے ساتھ ہی آتے ہیں۔ اس لیے جب تک وضاحت مقصود نہ ہو صرف سبب کہہ کر سبب خفیف اور وتد کہہ کر وتد مجموع مراد لیتے ہیں۔

عربی عروض میں شعر کے وزن کے تعین کے لیے کچھ پیمانے مقرر ہیں جیسے فعولن، فاعلن، مفاعیلن وغیرہ انہیں ارکان کہتے ہیں۔ جن کا واحد رکن ہے۔ یہ تعداد

کانٹوں سے الجھنے والے تو دامن کو چھڑا بھی سکتے ہیں   اے دوست مگر دامن اپنا پھولوں سے چھڑانا مشکل ہے (اقبال)

ہیں دس ہیں۔ اس کی تفصیل عروض کی کتابوں میں مل جائے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہر رکن سبب اور وتد سے بنتا ہے۔ کسی رکن میں سبب پہلے اور وتد بعد میں کسی میں وتد پہلے تو سبب بعد میں اور کسی میں دو سبب پہلے اور ایک وتد بعد میں اور کسی رکن میں ایک وتد پہلے تو دو سبب بعد میں آتے ہیں مثلاً فاعلن میں فا سبب ہے اور علن وتد اور اس کی ترتیب ہے ۲ + ۳ اسی طرح فعولن میں فعو سہ حرفی کلمہ ہے اس لیے وتد ہے اور لن دو حرفی اس لیے سبب اس کی ترتیب ہے ۳ + ۲ اسی طرح رکن مفاعیلن میں مفا + عی + لن کلمات ہیں۔ یعنی وتد + سبب + سبب۔ انھیں ارکان کے الٹ پھیر سے بحریں بنتی ہیں۔ اس صورت میں بحر کی رعایت سے انھیں اوزان بحور کہا جاتا ہے۔

مصرع اولیٰ کے پہلے رکن کو اصطلاح میں 'صدر' اور آخری رکن کو 'عروض' کہتے ہیں۔ اسی طرح مصرع ثانی کے پہلے رکن کو 'ابتدا' اور آخری رکن کو 'ضرب' کہتے ہیں۔ صدر اور ابتدا میں اگر فرق ہے تو بس اتنا کہ صدر مصرع اولیٰ کا پہلا اور ابتدا مصرع ثانی کا پہلا رکن ہے۔ یہی اصطلاحی فرق عروض و ضرب میں ہے۔ یہ دونوں مصرعے کے آخری رکن ہیں۔ مصرع اولیٰ کا آخری رکن عروض اور مصرع ثانی کا ضرب ہے۔ بحر میں صدر و عروض اور ابتدا و ضرب کے درمیان جو ارکان آتے ہیں انھیں اصطلاح میں 'حشو' کہا جاتا ہے۔ مندرجہ ذیل خاکے کی مدد سے یہ اصطلاحیں ذہن نشین ہو سکتی ہیں۔

	مصرع اولیٰ				مصرع ثانی			
بحر:	مفاعیلن	فعلاتن	مفاعلن	فعلن	مفاعلن	فعلاتن	مفاعلن	فعلن
	صدر +	حشو +		عروض	ابتدا +	حشو	+	ضرب

بحروں کے ارکان مخصوص ہوتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے ان کے نام بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً جس بحر میں مفاعیلن اور اس کے 'زحافات' (اس کی تشریح نیچے کی گئی ہے۔) ہوں تو اسے بحرِ ہزج کہتے ہیں۔ جس بحر میں فاعلاتن اور اس کے زحافات ہوں تو اسے بحرِ رمل اور جس میں فعولن اور اس کے زحافات ہوں اسے بحرِ متقارب کہتے ہیں۔ وقس علیٰ ہٰذا۔

اصطلاح 'زحاف'، کسی رکن میں کسی متحرک حرف کو ساکن، ساکن کو متحرک یا ابتدا، آخر یا درمیان میں سے کسی حرف کے کم کرنے سے اگر کوئی نیا رکن بنے تو اس نئے رکن کو زحاف کہتے ہیں۔ مثلاً رکن مفاعیلن کی مثال سامنے رکھیے۔ بلکہ ذہن نشین کر لیجیے کیونکہ رباعی کے اوزان میں صرف اسی رکن کے اوزان استعمال ہوتے ہیں۔

(۱) مفاعیلن سے اگر پانچواں حرف کم کر دیں تو 'مفاعلن' بنتا ہے۔ (اس عمل کو اصطلاح میں 'قبض' کہتے ہیں)

(۲) مفاعیلن سے اگر آخری حرف کم کر دیں تو 'مفاعیل' بنتا ہے۔ (اسے 'کف' کہتے ہیں)

(۳) مفاعیلن سے اگر پہلا حرف گرا دیں تو فاعیلن اور اس کا چوتھا (اور مفاعیلن کا پانچواں) کم کر دیں تو فاعلن رہ جاتا ہے۔ (اسے 'شتر' کہتے ہو)

(۴) اگر مفاعیلن سے پہلا حرف گرا دیں تو 'فاعیلن' رہ جاتا ہے۔ عروض رکن فاعیلن (سبب + سبب + سبب) کی جگہ اس کا ہم وزن رکن 'مفعولن' (سبب + سبب + سبب) استعمال کرتے ہیں (اسے 'خرم' کہتے ہیں)

(۵) مفاعیلن سے اگر پہلا حرف 'م' اور آخری حرف 'ن' گرا دیں تو فاعیل بنتا ہے۔ فاعیل (سبب + وتدِ مفروق) کی جگہ عروضی 'مفعول' (سبب + وتدِ مفروق) استعمال کرتے ہیں (اسے اصطلاح میں 'خرب' کہتے ہیں)

(۶) اگر مفاعیلن سے آخری سبب گرا دیں تو مفاعی رہ جائے گا۔ اس کی بھی آخری ی گرا دیں تو 'مفاع' رہ جائے گا۔ اسے رکن 'فعول' سے بدل دیتے ہیں (اسے 'ہتم' کہتے ہیں)

اسی طرح مفاعیلن میں حروف کی کمی سے 'فعَل' فاع اور فع جیسے زحافات برآمد ہوتے ہیں۔

یہ تمام مفاعیلن کے زحافات ہیں جو تعداد میں نو ہیں، اگر اس میں اصل یا سالم رکن مفاعیلن کو شامل کر لیں تو دس اوزان بن جاتے ہیں۔ اور یہی رباعی کے اوزان ہیں جو یہ ہیں۔

(۱) سالم رکن ۔ مفاعیلن اور اس کے زحافات:

(۲) مفاعلن

(۳) مفاعیل

(۴) فاعلن

(۵) مفعولن

(۶) مفعول

(۷) فعول

(۸) فعَل

(۹) فاع (۱۰) فع

دل ہو گئے خراب کہ زہر اگئی ہوا سوچوں کے آفتاب کو برفا گئی ہوا (رشید آمجان)

مذکورہ بالا رباعی کے ارکان میں سے کچھ ایسے ہیں جو صرف صدر و ابتدا کے لیے مختص ہیں۔ کچھ ایسے ہیں جو صرف عروض و ضرب میں آتے ہیں۔ کچھ حشو میں آتے ہیں اور کچھ صدر و ابتدا والے ارکان حشو میں بھی آتے ہیں۔ اس کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) **مفعولُ یا مفعولن** ـــــ صرف یہی صدر و ابتدا میں آتے ہیں یعنی ہر رباعی کے مصرعے کی ابتدا میں سبب + وتد مفروق یا تین سبب کا آنا لازمی۔ رباعی کا کوئی مصرع وتد سے شروع نہیں ہوتا (اقبال کا ہر دو شعری وتد سے شروع ہوتا ہے)

(۲) **فعولُ یا فعَل** اسی طرح فاع اور فع صرف عروض و ضرب میں آتے ہیں اور کہیں نہیں۔

(۳) حشو میں آنے والے ارکان یہ ہیں (۱) مفاعیلُ (۲) مفاعیلن (۳) مفاعلن اور (۴) فاعلن۔ یعنی یہ ارکان رباعی کے مصرعوں کے نہ تو شروع میں آسکتے ہیں اور نہ آخر میں۔ البتہ رباعی کے وزن ان میں فاعلن حشو میں تیسرے رکن کے طور پر آتا ہے۔

(۴) اگرچہ صدر و ابتدا میں صرف مفعول یا مفعولن آتا ہے لیکن یہ ارکان حشو میں بھی آسکتے ہیں اور آتے ہیں۔ البتہ عروض، ضرب میں نہیں آسکتے۔

رباعی میں نشست ارکان کے سلسلے میں یہ اصول یاد رکھنا چاہیے کہ اگر کسی رکن کے آخر میں سبب ہے تو اس کے بعد وتد آسکتا ہے جس کی ابتدا میں وتد ہو یعنی ارکان میں اس طرح ترتیب ہونی چاہیے کہ سبب کے بعد سبب اور وتد کے بعد وتد آئے۔ رباعی کے ترتیب اوزان کا یہ وہ بنیادی اصول ہے جسے ذہن میں رکھنے سے نشست ارکان بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

ہم بتا چکے ہیں رباعی کے ہر مصرعے کی ابتدا میں مفعولُ آئے گا یا مفعولن پہلے ہم ان صورتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جن میں رباعی کے ہر مصرعے کی ابتدا میں (یا اصطلاح صدر و ابتدا میں) رکن مفعولُ آتا ہے۔ اس کی چار اہم صورتیں ہیں۔ (۱) صورت ـ ایک (۲) صورت ـ دو (۳) صورت ـ تین اور (۴) صورت ـ چار۔

اگر مفعول رکن اول ہو تو دوسرا رکن وہی ہو سکتا ہے جس کی ابتدا میں وتد ہو کیونکہ مفعولُ کے آخر میں وتد مفروق ہے یہاں سبب کے بعد سبب اور وتد کے بعد وتد والے اصول کا اطلاق ہوگا۔ ہم کہہ چکے ہیں کہ حشو میں آنے والے ارکان یہ ہیں۔

(۱) مفعولُ (۲) مفعولن (یہ دونوں صدر و ابتدا میں بھی آتے ہیں) (۳) مفاعیلُ (۴) مفاعلن (۵) مفاعیلن اور (۶) فاعلن۔ ان میں مفعولُ، مفعولن اور فاعلن کی ابتدا سبب سے ہوتی ہے اس لیے مفعولُ کے آخری وتد کے بعد سبب سے شروع ہونے والے یہ ارکان نہیں آسکتے۔ اس لیے مفعولُ کے بعد صرف یہ ارکان آسکتے ہیں۔

(۱) ـــ مفعولُ (۱) مفاعیلُ (۲) .... (۳) .... (۴)

(۲) ـــ مفعولُ (۱) مفاعلن (۲) .... (۳) .... (۴)

(۳) ـــ مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) .... (۳) .... (۴)

اس اعتبار سے مفعولُ کے بعد آنے والے دوسرے رکن کی رعایت سے تین صورتیں ہونگی (۱) مفعولُ مفاعیلُ (۲) مفعولُ مفاعلن اور (۳) مفعول مفاعیلن

پہلی صورت کو ہم صورت ایک، دوسری صورت کو صورت دو اور تیسری صورت کو صورت ـ تین کہیں گے۔

صورت ایک

مفعولُ (۱) مفاعیلُ (۲) .... (۳) .... (۴)

اس صورت میں پہلے یہ دیکھیں گے کہ سبب کے بعد سبب اور وتد کے بعد وتد والے اصول کی رو سے حشو میں تیسرا رکن کون سا آسکتا ہے۔ دوسرے رکن کے آخر میں وتد مفروق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا حشو میں استعمال ہونے والا تیسرا رکن وہی ہو سکتا ہے جس کی ابتدا وتد سے ہو۔ حشو میں واقع ہونے والے ارکان میں مفاعیلُ وتد سے شروع ہوتا ہے اور مفاعیلن بھی وتد سے شروع ہوتا ہے یعنی یہ دونوں ارکان مذکورہ صورت ایک میں تیسرے رکن کی حیثیت آسکتے ہیں یعنی

نمبر ۱ ـ مفعول (۱) مفاعیلُ (۲) مفاعیلُ (۳) .... (۴) اور

نمبر ۲ ـــ مفعول (۱) مفاعیلُ (۲) مفاعیلن (۳) .... (۴)

اگر تیسرا رکن مفاعیلُ ہو۔ جیسا کہ نمبر ۱ میں ہے تو چونکہ اس کے آخر میں عیلُ وتد مفروق ہے اس لیے اس کے بعد عروض و ضرب میں واقع ہونے والے وہی ارکان آسکتے ہیں جن کی ابتدا میں وتد ہو۔ ہم بتا چکے ہیں کہ عروض و ضرب میں صرف یہ ارکان آتے ہیں۔ (۱) فعولُ (۲) فعَل (۳) فاع اور (۴) فع۔ ان میں فعول کی ابتدا میں وتد ہے اور فعَل خود وتد ہے اس لیے نمبر ۱ کے چوتھے رکن میں فعول آئے گا یا فعَل۔

نمبر ۱ کے اوزان اس ترتیب میں ہونگے۔

نمبر ۱ ـ (الف) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولْ

(ب) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعَل

نمبر ۲ میں تیسرا رکن مفاعیلن ہے جس کے آخر میں سبب ہے اس لیے عروض و ضرب میں واقع ہونے والے ارکان میں سے اس کے بعد سبب سے شروع ہونے والا رکن فاع آئے گا یا بذات خود سبب ہے اس طرح

نمبر ۲ ـــ کے اوزان اس ترتیب میں ہونگے۔

سمجھا ہے ہیں کاکل گیتی کے پیچ و خم گو ہم فقیل زلف شکن در شکن بھی ہیں (عتیق احمد عتیق)

نمبر۲ ۔ (الف) مفعولُ (۱) مفاعیلُ (۲) مفاعیلن (۳) فاع (۴)
(ب) مفعولُ (۱) مفاعیلُ (۲) مفاعیلن (۳) فع (۴)

اس طرح صورت ۔ ایک ۔ میں ہمیں رباعی کے مندرجۂ ذیل چار اوزان ملتے ہیں ۔

(۱) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول
(۲) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل
(۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع
(۴) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

اب صورت ۔ دو ملاحظہ ہو جس میں مفعولُ کے بعد مفاعلن دوسرے رکن کی حیثیت سے آتا ہے ۔ اس طرح :۔

(۱) مفعول (۱) مفاعلن (۲) ..... (۳) ..... (۴)

چونکہ دوسرے رکن ۔ مفاعلن کے آخر میں وتد ہے ۔ اس لیے صورت ۔ ایک ۔ کی طرح (جس کے دوسرے رکن مفاعیلُ کے بھی آخر میں وتد ہے) مذکورہ بالا اصول کے تحت دوسرے اور تیسرے رکن وہی ہونگے جو صورت ۔ ایک ۔ میں پائے جاتے جاتے ہیں ۔ اس طرح صورت ۔ ۲ ۔ میں ہمیں رباعی کے مندرجۂ ذیل اوزان ملتے ہیں ۔

(۱) مفعولُ (۱) مفاعلن (۲) مفاعیلُ (۳) فعول (۴)
(۲) مفعولُ (۱) مفاعلن (۲) مفاعیلُ (۳) فعل (۴)
(۳) مفعولُ (۱) مفاعلن (۲) مفاعیلن (۳) فاع (۴)
(۴) مفعولُ (۱) مفاعلن (۲) مفاعیلن (۳) فع (۴)

اب صورت ۔ تین کے ارکان کی ترتیب کا جائزہ لیا جائے گا ۔ صورت ۔ ۳ ۔ میں مفعولُ کے بعد دوسرا رکن مفاعیلن ہے ۔ جس کے آخر میں سبب آتا ہے ۔ اس لیے حشو میں واقع ہونے والا تیسرا رکن وہی ہو سکتا ہے جس کی ابتدا بھی سبب سے ہوتی ہو ۔ حشو میں واقع ہونے والے ارکان میں (۱) مفعولُ (۲) مفعولن (جو صدر و ابتدا میں بھی آتے ہیں) ایسے ہیں جن کی ابتدا میں سبب ہے ۔ (فاعلن کی ابتدا بھی سبب سے ہوتی ہے ۔ لیکن فاعلن تیسرے رکن کے طور پر نہیں آتا) اس لیے صورت ۔ تین ۔ میں دوسرے رکن مفاعیلن کے بعد تیسرا رکن یا تو مفعول ہوگا یا مفعولن یعنی اس طرح :۔

نمبر۱ ۔ مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولُ (۳) ..... (۴)
نمبر۲ ۔ مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولن (۳) ..... (۴)

اب آخری رکن کا تعین کرینگے ۔ جس طرح صورت ۔ ایک ۔ نمبر ۔ ۱ ۔ میں مفاعیلُ کے بعد فعول یا فعل آتا ہے اسی طرح مفعول کے بعد بھی فعول آئے گا یا فعل کیونکہ مفعولُ کے آخر میں بھی وتد ہے ۔ اس طرح صورت ۳ ۔ نمبر ایک الف اور ب کے اوزان اس طرح ہونگے ۔

نمبر۱ ۔ (الف) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولُ (۳) فعول (۴)
(ب) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولُ (۳) فعل (۴)

اب صورت ۔ تین ۔ نمبر ۲ کو لیجیے ۔ اس میں تیسرا رکن مفعولن ہے ۔ جس کے آخر میں سبب ہے اس لیے اس کے آخر میں یا فاع آئیگا یا فع ۔ اس طرح صورت ۔ تین ۔ نمبر ۔ ۲ الف اور ب کے اوزان اس طرح ہونگے ۔

نمبر۲ ۔ الف ۔ مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولن (۳) فاع (۴)
نمبر۲ ۔ ب ۔ مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولن (۳) فع (۴)

اس طرح صورت ۔ ۳ ۔ کے یہ چار اوزان ہوتے ہیں ۔

(۱) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولُ (۳) فعول (۴)
(۲) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولُ (۳) فعل (۴)
(۳) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولن (۳) فاع (۴)
(۴) مفعولُ (۱) مفاعیلن (۲) مفعولن (۳) فع (۴)

اگر ہم مذکورۂ بالا تینوں صورتوں کے اوزان کا میزان کریں تو کل بارہ اوزان ہوتے ہیں جنھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں ۔

صورت ۔ ایک :۔

(۱) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعول
(۲) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل

پلٹ کر آئے گا وہ بھی گئی رتوں کی طرح ۔۔۔ جو ہم سے روٹھ گیا ہے اسے جدا نہ سمجھ (احمد فراز)

(۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع
(۴) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

صورت دو :۔
(۵) مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول
(۶) مفعولُ مفاعلن مفاعیل فعل
(۷) مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع
(۸) مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع

صورت تین :۔
(۹) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعول
(۱۰) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعل
(۱۱) مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاع
(۱۲) مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع

اگر ہم مذکورہ بالا تینوں صورتوں کا تقابلی مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ صورت ۔ ایک اور صورت ۔ دو ۔ میں صرف دوسرا رکن مختلف ہے ۔ باقی ارکان وہی ہیں ۔ اگر صورت تین کا مقابلہ صورت ۔ ایک یا صورت ۔ دو ۔ سے کریں تو پتہ چلے گا کہ اگر صورت ایک یا صورت ۔ دو ۔ میں تیسرے رکن مفاعیلُ کے بعد آخری رکن فعول ہے یا فعل ہے تو صورت تین ۔ میں تیسرے رکن مفعولُ کے بعد عروض و ضرب میں بھی فعول یا فعل ہے ۔ اور مفاعیلن صورت ۔ ایک ۔ اور مفعولن صورت تین کے بعد عروض و ضرب میں فاع یا فع ہے ۔

یہ ہیں وہ بارہ اوزان جن کی صدر و ابتدا میں مفعولُ آتا ہے ۔ لیکن یہ بتایا جا چکا ہے کہ صدر و ابتدا میں مفعولن بھی آسکتا ہے ۔ جب مفعولن صدر و ابتدا میں آئے تو رباعی کے مزید بارہ اوزان بنتے ہیں جس کی تفصیل حسب ذیل ہے ۔

جب مفعولن (بجائے مفعولُ) صدر و ابتدا میں آئے تو اس کی بھی تین اہم صورتیں ہوتی ہیں ۔ انھیں ہم (۱) صورت چار (۲) صورت ۔ پانچ اور (۳) صورت چھ کہہ سکتے ہیں ۔

اگر مفعولن پہلا رکن ہو جس کے آخر میں سبب ہے تو حشو میں واقع ہونے والے ارکان (فعول ، مفعولن ، مفاعیلُ ، فاعلن ، مفاعیلن اور فاعلن) میں صرف مفعولُ ، فاعلن اور مفعولن ایسے ارکان ہیں جو مفعولن کے بعد دوسرے رکن کی حیثیت سے آسکتے ہیں ۔ کیونکہ ان کی ابتدا سبب سے ہوتی ہے (مفاعیلُ ، مفاعلن اور مفاعیلن نہیں آسکتے کیونکہ یہ وتد سے شروع ہونے والے ارکان ہیں) ۔ اس لیے مفعولن کے بعد صرف یہ ارکان دوسرے نمبر پر آسکتے ہیں ۔

صورت چار :۔ مفعولن (۱) مفعولُ (۲) ..... (۳) ...... (۴)
صورت پانچ :۔ مفعولن (۱) فاعلن (۲) ...... (۳) ...... (۴)
صورت چھ :۔ مفعولن (۱) مفعولن (۲) .... (۳) ...... (۴)

صورت چار :۔

صورت ۔ چار میں دوسرا رکن مفعولُ ہے ۔ جس کے آخر میں وتد مفروق ہے ۔ اس لیے اس کے بعد حشو میں واقع ہونے والا وہی رکن آئے گا جس کی ابتدا میں وتد ہو ۔ ایسے ارکان صرف مفاعیلُ اور مفاعیلن ہیں ۔ اس لیے تیسرا رکن مفاعیل ہوگا ۔ یا مفاعیلن یعنی :

نمبر ۱ :۔ مفعولن (۱) مفعولُ (۲) مفاعیلُ (۳) ..... (۴)
نمبر ۲ :۔ مفعولن (۱) مفعولُ (۲) مفاعیلن (۳) .... (۴)

اب ہم نمبر ۔ ۱ ۔ اور نمبر ۔ ۲ ۔ کے چوتھے اور آخری رکن کا تعین کریں گے ۔

ہم مفعولُ (رکن اوّل) کے تحت دیکھ چکے ہیں کہ مفاعیلُ (۳) کے بعد عروض و ضرب میں فعول یا فعل آتا ہے اور مفاعیلن (۳) کے بعد فاع یا فع آتا ہے (دیکھیے صورت ۔ ایک ۔ صورت ۔ دو ۔ اور صورت ۔ تین ۔)

اس لیے صورت ۔ چار کے اوزان یہ ہوں گے ۔
(۱) مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعول
(۲) مفعولن مفعولُ مفاعیلُ فعل
(۳) مفعولن مفعولُ مفاعیلن فاع
(۴) مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع

صورت پانچ :۔

صورت ۔ پانچ میں دوسرا رکن فاعلن ہے ۔ جس کے آخر میں وتد ہے اس لیے حشو میں واقع ہونے والے ارکان میں سے مفاعیلُ ' مفاعیلن ایسے ارکان ہیں جن کے شروع میں وتد ہے (مفاعلن کی ابتدا میں بھی وتد ہے لیکن مفاعلن تیسرے رکن کے طور پر اردو میں مروّج نہیں ہے) اس فاعلن کے بعد تیسرا رکن مفاعیلُ ہوگا مفاعیلن یعنی:

بنرا ۔ مفعولن (۱) فاعلن (۲) مفاعیلُ (۳) ..... (۴)

بنبر۲ ۔ مفعولن (۱) فاعلن (۲) مفاعیلن (۳) ..... (۴)

جہاں تک چوتھے اور آخری رکن کا تعلق ہے ہم دیکھ چکے ہیں کہ مفاعیلُ (۳) کے بعد فعول یا فعل آتا ہے اور مفاعیلن (۳) کے بعد فاع یا فع ۔

اس لیے صورت پانچ کے ارکان ہوں گے :۔

(۱) مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعول
(۲) مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعل
(۳) مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
(۴) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

صورت چھ :۔

صورت چھ میں رکن اوّل مفعولُن کے بعد دوسرا رکن مفعولُن آتا ہے ۔ چونکہ مفعولُن (۲) کے آخر میں سبب ہے ۔ اس لیے حشو میں استعمال ہونے والے ارکان (مفعولُ' مفعولن' فاعلن' مفاعیلُ ' مفاعیلن' مفاعلن) میں سے مفعولُ اور مفعولن ہی تیسرے رکن کی حیثیت سے آسکتے ہیں (فاعلن کو تیسرے رکن کے طور پر استعمال نہیں کیا جاتا ۔) یعنی :

بنرا ۔ مفعولُن (۱) مفعولُن (۲) مفعولُ (۳) ..... (۴)

بنبر۲ ۔ مفعولن (۱) مفعولُن (۲) مفعولن (۳) ..... (۴)

جہاں تک آخری رکن کا تعلق ہے ، ہم صورت ۔ تین میں دیکھ چکے ہیں کہ مفعولُ (۳) کے بعد فعولْ یا فعلْ آتا ہے اور مفعولن (۳) کے بعد فاع یا فع۔

اس طرح صورت چھ کے اوزان ہونگے ۔

(۱) مفعولن مفعولن مفعولُ فعولْ
(۲) مفعولن مفعولن مفعولُ فعل
(۳) مفعولن مفعولن مفعولن فاع
(۴) مفعولن مفعولن مفعولن فع

رباعی کے ان چوبیس اوزان میں جو مفعولُ سے شروع ہوتے ہیں ' اخرب' کہلاتے ہیں (مفاعیلن سے آخری حرف نون کو گرا دینے کا عمل خرب کہلاتا ہے ۔ اس لیے مفعولُ کو اخرب کہتے ہیں)

اور فعولن سے شروع ہونے والے اوزان ' اخرم ' کہلاتے ہیں (اگر مفاعیلن سے پہلا حرف گرا دیا جائے تو اس عمل کو خرم کہتے ہیں ۔ مفاعیلن کی میم کم کرنے سے فاعیلن رہ جاتا ہے ۔ عروضی فاعیلن (سبب + سبب + سبب) کی جگہ مفعولن (سبب + سبب + سبب) کا استعمال کرتے ہیں) ایک رباعی میں اخرب اور اخرم دونوں کا اجتماع جائز ہے ۔ اب ہم رباعی کے وہ چوبیس اوزان درج کریںگے جن کا مذکورہ بالا سطور میں ہو چکا ہے ۔

اخرب

صورت ۔ ایک :۔

(۱) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعولْ
(۲) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلُ فعل
(۳) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فاع
(۴) مفعولُ مفاعیلُ مفاعیلن فع

صورت ۔ دو ۔

(۱) مفعولُ مفاعلن مفاعیلُ فعول

اخرم اخرم

صورت ۔ چار :۔

(۱) مفعولُن مفعولُ مفاعیلُ فعولْ
(۲) مفعولن مفعولُ مفاعیل فعَل
(۳) مفعولن مفعولُ مفاعیلن فاع
(۴) مفعولن مفعولُ مفاعیلن فع

صورت پانچ :۔

(۱) مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعولُ

تم سے نہ جو سے وہ زمانے سے کب سے جو لوگ بھی سے وہ تمھارے سب سے (نظم امام)

(۲) مفعولُ مفاعلن مفاعیل فعل
(۳) مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فاع
(۴) مفعولُ مفاعلن مفاعیلن فع

(۲) مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
(۳) مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
(۴) مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

صورت تین :-

(۱) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعولُ
(۲) مفعولُ مفاعیلن مفعولُ فعلُ
(۳) مفعولُ مفاعیلن مفعولن فاع
(۴) مفعولُ مفاعیلن مفعولن فع

میزان ۱۲

صورت : چھ :-

(۱) مفعولن مفعولن مفعولُ فعولُ
(۲) مفعولن مفعولن مفعولُ فعلُ
(۳) مفعولن مفعولن مفعولن فاع
(۴) مفعولن مفعولن مفعولن فع

میزان = ۱۲

میزان کل ۲۴

اگر صورت ایک اور صورت چار، دو اور پانچ اور تین اور چھ کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو صرف رکن اول و دوم میں تبدیلی نظر آئے گی۔ اور رکن سوم و چہارم میں یکسانیت۔ بہت کم مصرعے مفعولن سے شروع ہوتے ہیں اس لیے اردو رباعی میں طبع آزمائی کرنے والے شعرا مشق کی ابتدائی منزل میں اخرم کے تحت آنے والے اوزان سے بچ سکتے ہیں۔

صورت ایک کے پہلے دو اوزان اردو میں زیادہ مقبول ہیں۔ بالخصوص (۳-۴) مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع۔ اس کی جگہ لَاحَولَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اکثر فن رباعی میں مبتدی حضرات اسی ایک بحر میں رباعی کہتے ہیں۔ اس لیے رباعی کے مصرعوں میں ایک تسلسل (Monotony) پیدا ہوتا ہے لیکن اساتذہ مختلف مصرعوں میں مختلف اوزان استعمال کرتے ہیں جس سے وہ مخصوص آہنگ (Rhythm) پیدا ہوتا ہے جو رباعی کی جان ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مصرع رک رک کر چل رہا ہے، کبھی تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور کبھی لچکتا ہوا۔ جن لوگوں کے کان رباعی کے اوزان سے مانوس نہیں ہیں وہ رباعی کے مصرعوں کو غیر موزوں سمجھ لیتے ہیں۔ اور جہاں حروف علت کو تخفیف کے ساتھ [illegible] پڑھنا ہو نہیں پڑھتے اور اس طرح اپنی قرأت سے موزوں مصرعے کو غیر موزوں کر دیتے ہیں۔ اس میں [illegible] نہ رباعی کے اوزان کا ہے اور نہ رباعی گو کا۔ رباعی کے مصرعے جن اوزان میں ڈھلے ہوتے ہیں انہیں اوزان کو ذہن میں رکھ کر یہ مصرعے پڑھے جائیں تو رباعی کا اصل لطف آتا ہے۔ [illegible] اوزان سے مانوس ذہن رباعی سے گریز کرتے ہیں۔ اردو کے ایک بڑے نقاد نے تو رباعی کی موزونیت کے خلاف فتویٰ بھی صادر کر دیا جس کے جواب میں رباعی ان فاضل نقاد سے صرف اتنا کہہ سکتی ہے ؎ چشمہ آفتاب را چہ گناہ۔

ہے کون جو ہماری طرف سے گواہی دے / باطل کے ہاتھ حق کے طرف دار بک گئے (ایم اے حفیظ)

رُباعی

ابو البلاغت پنڈت رتن پنڈوری

رباعی کی صنفِ لطیف اس امر کی متقاضی ہے کہ اس کے وجود و ارتقاء اور خصائص و محاسن پر روشنی ڈالی جائے۔ عروض و زبان کی مختلف کتب کی ورق گردانی کے بعد مندرجہ ذیل چند امور نذرِ ناظرین کیے جاتے ہیں۔

موجد:- جمہور کی رائے میں رباعی کا موجد ابوالحسن رودکی ہے۔ چناں چہ علامہ محمدؐ بن عیش خوارزمی اس ضمن میں رقم طراز ہیں کہ "ایک دن بہ تقریب عید حضرتِ رودکی چلے جا رہے تھے۔ رستے میں دیکھا چند لڑکے جوا بازی کر رہے ہیں اور ایک جمِ غفیر تماشائیوں کی حیثیت سے وہاں جمع ہے۔ گیارہ سال کے ایک حسین لڑکے نے چند جوز گُچّی میں ڈالے۔ سب جوز گچّی میں جا پڑے صرف ایک رہ گیا اور وہ گچّی کی طرف لڑھک رہا تھا جس کو دیکھ کر لڑکا بے ساختہ بول اٹھا ع غلطاں غلطاں ہمی رود تا بنِ گو۔ رودکی نے اس جملے پر غور کیا تو اس کو عروض کے مطابق موزوں پایا اور چوبیس اوزان بحرِ ہزج سے اس کے لیے استخراج کیے۔ اور دوبیتی پر اس کا نام ترانہ رکھا۔"

علامہ پروفیسر عندلیب شادانی رام پوری مرحوم کا ارشاد ہے کہ "رسالہ رباعی میں مفتی سعداللہ صاحب نے مصرعے مذکور کو اس طرح لکھا ہے۔ ع غلطاں غلطاں ہمی رود تا سرِ گو۔" ان کی رائے کے خلاف دولت شاہ سمرقندی اور دیگر فضلا نے لکھا ہے کہ یعقوب لیث جو اسلام کے بعد ایران کا خود مختار بادشاہ تھا نے اپنے خورد سال بچے کو عید کے روز لڑکوں کے ساتھ جوز بازی کرتے دیکھا۔ فرطِ نشاط میں دیر تک کھیل دیکھتا رہا۔ بچے نے جوز گچّی میں ڈالے۔ سب گچّی میں جا پڑے صرف ایک باہر رہ گیا وہ بھی لڑھکتا ہوا گچّی میں گیا تو بچے نے خوش ہو کر بے ساختہ کہا۔ ع غلطاں غلطاں ہمی رود تا لبِ گو۔ اس پر بادشاہ نے اپنے دربار کے دو مشہور شعرا ابو دلف عجلی اور ثبت الکعب کو بلا کر اس کا وزن دریافت کیا۔ انھوں نے عرض کی۔ جہاں پناہ! اس کی تقطیع یوں ہو سکتی ہے (مفعولن فاعلن مفاعیل فعَل) جو بحرِ ہزج کی ایک شاخ ہے۔ بادشاہ کی فرمائش پر اس پر مصرعے لگائے گئے۔ اور اس کا نام دوبیتی رکھا گیا۔ حاصلِ کلام یہ کہ خواہ اس کا موجد رودکی ہو خواہ یعقوب بن لیث یہ امر متفق ہے کہ رباعی اہلِ عجم کی ایجاد ہے۔

تعریف:- رباعی عربی لفظ رُبع سے مشتق ہے جس کے لغوی معنی چار کے ہیں۔ چوں کہ یہاں چار مصرعوں میں ایک مضمون ادا کیا جاتا ہے۔ اس لیے شاعرانہ اصطلاح میں اس کا نام رباعی ہوا۔ رباعی کے موضوعات کا کوئی تعین نہیں۔ اردو فارسی کے شعرا نے ہر قسم کے خیال کو نظم کیا ہے۔ رباعی کے آخری مصرعوں بالخصوص چوتھے مصرع پر پوری رباعی کے حسن و اثر اور زور کا مدار ہے۔ چناں چہ علمائے ادب اور فصحائے سخن نے ان امور کو ضروری قرار دیا (مخزن الفوائد صفحہ ۱۵۵)

رباعی کی قسمیں اور نام:- عروض کی مختلف کتابوں میں رباعی کے مختلف نام ملتے ہیں۔ رباعی۔ ترانہ۔ دوبیتی۔ چہار مصرعی۔ چہار بیتی۔ خصّی اور غیر خصّی۔ ابتداً رباعی کے مختلف چار مصرعے ہم قافیہ ہوا کرتے تھے۔ بعد ازاں تیسرے مصرعے سے قافیہ حذف کر دیا گیا۔ اور اسے رباعی خصّی کہنے لگے۔ گویا چاروں مصرعے ہم قافیہ ہوں تو رباعی غیر خصّی اور تیسرے مصرعے میں قافیہ نہ ہو تو رباعی خصّی کہیں گے۔ فارسی کی رباعیات سے پتہ چلتا ہے کہ رباعی خصّی ہی مقبول رہی ہے۔ لیکن رباعی کے ابتدائی دور میں غیر خصّی رباعی کہی جاتی تھی۔ چناں چہ عنصری اور فرخی کے یہاں اس کے نمونے ملتے ہیں۔ بعض نے خصّی کو مصرّع اور غیر خصّی کو غیر مصرّع بھی نام دیا ہے۔

وجہِ تسمیہ:- بدائع الافکار کا فاضل مصنف لکھتا ہے کہ رباعی اس لیے کہتے ہیں کہ بحرِ ہزج اشعارِ عرب میں مربع الاجزا ہے۔ عربوں کے خیال کے مطابق ہر وزن دو بیت مربع کی طرح ہے اور مجموعہ چہار بیت ہے۔ مگر اہلِ عجم اس کو دوبیتی کہتے ہیں اور مجموعہ کو دو بیت مانتے ہیں۔

بیہ مجمع الصنائع میں مرقوم ہے کہ رباعی منسوب بہ رباع بہ معنی چار چار ہے اس لیے اس کو رباعی کہتے ہیں اور اسی لیے اس کا نام چہار مصرع اور دوبیتی بھی ہے۔ رسالہ عروض از مولانا جامی اور بدائع الافکار از ملا حسین واعظ کاشفی میں رباعی کو ترانہ بھی لکھا ہے۔ چوں کہ رباعی اکثر گائی جاتی ہے۔ اور اس کا وزن گانے میں خوش آہنگ، موثر اور دلآویز ثابت ہوتا ہے اس لیے اس کا نام ترانہ ہو گیا۔

شمس الدین محمدؐ بن قیس رازی کے حوالے سے صاحب بحر الفصاحت نے بھی یہی توجیہہ بیان کی ہے کہ "ترانہ اس کو اس لیے کہتے ہیں کہ اربابِ موسیقی نے اس وزن پہ اچھے راگ بنائے ہیں۔ عربی میں اشعار کو قول بولتے ہیں۔" (بحر الفصاحت صفحہ ۲۷۲)

حافظ محمود شیرانی لکھتے ہیں کہ "قدیم الایام میں ایران میں ایک خاص قسم کی نظم جس کو چہار بیتی کہا جاتا تھا، رائج تھی۔ اس کے اوزان عربی اوزان سے غالباً ہزج نہیں بلکہ ایران زا اور مقامی معلوم ہوتے ہیں۔ قدما ہزج کی ذیل میں ان کا شمار کرتے ہیں۔ تعداد میں وہ چار شعر ہوتے تھے۔ اور چاروں شعروں میں قافیہ لانا

عجب کیا سیفی چمچہ ہی جائے وہ پلہ ساعتیں ۔ میں اس کے در پہ جو دستک کی کرچیں چھوڑ آیا ہوں (منیر سیفی)

مزدوری سمجھا جاتا تھا۔ متاخرین نے اس میں ترمیم کی کہ اس کے وزن مربع کو مثمن قرار دیا جس کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ ان چار ابیات کی تعداد دو شعروں میں محدود ہو گئی۔ یہ محمود شیرانی کا بیان خواجہ نصیر الدین طوسی کی معیار الاشعار سے ماخوذ ہے۔ ایران کی جدید عروضی کتب سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ڈاکٹر پرویز ناتل لکھتے ہیں کہ:

"اما از قرائن لبسیار میتوان حکم کرد کہ ایں بنا را شخص معینی گذاشتہ بلکہ ایں نوع شعر از مدت ہا قبل در ایران شایع و رائج بود۔" (تحقیق انتقادی در عروض فارسی صفحہ ۹۰ مطبوعہ تہران)۔

چوں کہ یہ مصرع ہے غلطاں غلطاں ہمی رود تا لب گو۔ رباعی کی بنا مانا گیا ہے اور اس کی تقطیع یوں ہو سکتی ہے۔

رباعی کا وزن :-

غلطاں غل	طاں ہمی	رود تا لب	گو
مفعولن	فاعلن	مفاعیل	فعل

لہٰذا اکثر شعرا نے اسی وزن پہ رباعیات کہی ہیں۔ لیکن بعض علما لکھتے ہیں کہ رباعی (لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہ) کے وزن پر ہونی چاہیے۔ صاحب سروری اور شرح نصاب کا قول ہے کہ رباعی بحر ہزج اخرم یا اخرب میں آتی ہے اور اس کا خاص وزن (لاحول ولا قوۃ الا باللہ) ہے۔ جو رباعی اس وزن پر نہ ہو وہ رباعی نہیں۔ لیکن یہ خیال محل نظر ہے صرف اس قدر درست ہے کہ رباعی کے چوبیس اوزان ہیں۔ جو بحر ہزج سے متفرع ہیں ان اوزان کو اخرب اور اخرم دو شجروں میں دکھایا گیا ہے

اخرب

مَفعُولُ مفاعِلُنْ مَفاعیلُ فَعُولُ
مفعول مفاعلن مفاعیلن فاع
مفعول مفاعلن مفاعیل فعل
مفعول مفاعلن مفاعیلن فع

مفعولُ مفاعیلُ مفاعیل فعول
مفعول مفاعیل مفاعیلن فاع
مفعول مفاعیل مفاعیل فعل
مفعول مفاعیل مفاعیلن فع

مفعولُ مفاعیلنْ مفعولُ فعولْ
مفعول مفاعیلن مفعولن فاع
مفعول مفاعیلن مفعول فعل
مفعول مفاعیلن مفعولن فع

اخرم

مفعولن فاعلن مفاعیلُ فعولُ
مفعولن فاعلن مفاعیلن فاع
مفعولن فاعلن مفاعیل فعل
مفعولن فاعلن مفاعیلن فع

مفعولن مفعول مفاعیل فعول
مفعولن مفعول مفاعیلن فاع
مفعولن مفعول مفاعیل فعل
مفعولن مفعول مفاعیلن فع

مفعولن مفعولن مفعول مفعول
مفعولن مفعولن مفعولن فاع
مفعولن مفعولن مفعول فعل
مفعولن مفعولن مفعولن فع

شجروں کے ملاحظہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دس ارکان مقرر و مستعمل ہیں۔ ایک سالم اور نو مزاحف۔ ۱۔ سالم (مفاعیلن) ۲۔ مقبوض (مفاعلن) ۳۔ مکفوف (مفاعیل)

۴۔ اشتر (فاعلن) ۵۔ اخرم (مفعولن) ۶۔ اخرب (مفعول) ۷۔ اثرم (فعول) ۸۔ ازل (فاع) ۹۔ مجبوب (فعل) ۱۰۔ ابتر (فع)

ان دس ارکان کے سوا کوئی رکن رباعی میں نہیں آتا۔ مفاعیلن۔ مفاعیل۔ مفاعیلن۔ فاعلن۔ یہ چار ارکان حشو ہی سے مخصوص ہیں۔ مفعولن۔ مفعول۔ یہ دو رکن صدر و ابتدا میں بھی آتے ہیں۔ او حشو میں بھی لیکن عروض و ضرب میں کبھی نہیں آتے۔ فعول۔ فاع۔ فعل۔ فع۔ یہ چار ارکان حرف عروض و ضرب سے مختص ہیں۔ اور کسی جگہ نہیں آتے۔ ارکان رباعی کی ترکیب کے لیے یہ مصرع یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سبب پے است و تدپے وتد است۔ مطلب یہ کہ ارکان رباعی کی نشست اس طرح ہو کہ جس رکن کے آخر سبب ہو اس کے دوسرے رکن کی ابتدا میں بھی سبب ہونا چاہیے اور جس رکن کے آخر میں وتد ہو اس کے بعد والے رکن کی ابتدا میں وتد ہی ہونا لازم ہے۔ اکثر رباعی میں رکن اول کے سوا باقی ارکان کے حرف اول متحرک کو ساکن کر کے ماقبل کے حرف آخر متحرک سے ملا دیتے ہیں تو نیا رکن پیدا ہو جاتا ہے۔ بہر حال اساتذہ نے مذکورہ بالا دس ارکان رباعی کے لیے مقرر کر دیے ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی رکن کسی بحر کا رباعی میں لانا جائز نہیں۔ اس پابندی کے ساتھ یہ آزادی ہے کہ رباعی کے چار مصرعے اگر مختلف اوزان رباعی پہ ہوں تو ناموزوں نہ ہوں گے۔ گلستان سخن میں مذکور ہے کہ جو رباعی ان اوزان پر نہ ہو گی اس کو اصطلاح میں رباعی نہیں کہہ سکتے۔ عروض سیفی اور مخزن الفوائد میں مذکور ہے کہ رباعی کے اوزان دس ہزار تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور منشی سعد اللہ صاحب نے رسالہ عروض میں بیاسی ہزار نو سو چوراسی اوزان نکالے ہیں۔

رباعی میں قیودِ قوافی:- ملا حسین واعظ کاشفی فرماتے ہیں کہ "اگر رباعی کے چاروں مصرعوں میں قافیہ ہو تو اس کو رباعی مصرّع کہتے ہیں۔ اور اگر تیسرے مصرعے میں قافیہ نہ ہو تو اس کو رباعی خصّی بولتے ہیں۔ اس ضمن میں ملا صاحب موصوف اور صاحب مجمع الفصحا کا قول ہے کہ رباعی کے تیسرے مصرعے میں قافیہ کا ہونا شرط نہیں صرف بیت اول میں تصریع ضروری ہے۔ معیار البلاغت اور مخزن الفوائد کے مصنفین فرماتے ہیں کہ اگر رباعی کے تیسرے مصرع میں بھی قافیہ ہو تو مستحسن ہے۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ متقدمین کے نزدیک رباعی کا مصرّع ہونا لازم تھا۔ چنانچہ عنصری۔ ابوشکور۔ اور فردوسی کی اکثر رباعیات اسی قبیل سے ہیں۔ لیکن متاخرین نے اس شرط کو اڑا دیا اور صرف پہلے۔ دوسرے اور چوتھے مصرع میں قافیہ کو ضروری سمجھا۔

رباعی کے خصائص:- بدائع الافکار میں لکھا ہے کہ "چوں کہ رباعی صرف دو ابیات کا مجموعہ ہے لہذا شاعر کو اس کے اجزا کی ترکیب و ترتیب میں سعی بلیغ لازم ہے تاکہ محاسن و صنائع شعری اس میں پیدا ہو سکیں:

جامع الصنائع میں مذکور ہے کہ اصل وضع رباعی کی اس پر ہے کہ رباعی کی دوسری بیت میں مقصود کسی لطیفہ۔ نکتہ۔ یا مثال کا بیان کرنا ہو اور اس کے سوا اور کچھ نہ بیان کریں اور جمہور کی بھی یہی رائے ہے کہ ایجاز و اختصار کے طور پر کسی مضمون کو ادا کرنے کے لیے رباعی ایک خاص چٹکلا ہوتا ہے۔ چاروں مصرعوں میں لفظی و معنوی ربط لازم ہے۔ چوتھا مصرع جس پر مضمون کا مدار ہے خوب برجستہ ڈھلا ہوا ہو۔ دیگر مصرعے بھی ایک سے ایک بڑھے ہوئے ہوں۔ محاورے۔ مقولے اور ضرب الامثال کا رباعی میں آجانا لطف پیدا کرتا ہے مثلاً غالب ؎

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخن ورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

اسی طرح دیگر ضرب الامثال مثلاً مع "لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل"۔ مع "ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال"۔ مع "مان نہ مان میں ہوں تیرا مہمان" صاحب مخزن الفوائد فرماتے ہیں کہ "رباعی کا دوسرا شعر پہلے سے بلند تر ہونا چاہیے" معلوم ہوتا ہے یہ خیال اوروں کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ چنانچہ مرزا صائب فرماتے ہیں ؎

از رباعی بیتِ آخری زند ناخن بہ دل — خطِ پشتِ لب بچشم ما زابرو خوش تراست

ایک اور شاعر کا قول ہے ؎

اے احتر فیض اضمیرت مطلع — طبع تو عروسان سخن را مجمع
از بسکہ رباعی تو افتاد بلند — ہر مصرعہ بود چہارم مصرع

رباعی کی اہمیت:- رباعی جس قدر آسان نظر آتی ہے اسی قدر مشکل بھی ہے۔ جب تک کوئی شاعر ایک عرصہ کی مشق اور فن عروض کی کامل واقفیت کے بعد اظہار مطالب پر کما حقہٗ ساحرانہ قدرت حاصل نہ کرے رباعی کی منزل میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ بیسیوں نو مشق شعرا اس میدان میں بازی ہار گئے ہیں۔ اس کا بڑا سبب یہ ہے کہ رباعی عروض کی ایک صنف لطیف ہے۔ اگر اس کا ایک مصرع بھی روکھا پھیکا رہ جائے تو ساری رباعی کی لطافت پر پانی پھر جاتا ہے۔ رباعی میں شاعر کی مشاقی۔ قادر الکلامی۔ نکتہ سنجی۔ قدرت زبان۔ عروض دانی۔ اظہار بیان کی خوبی۔ حسن بندش۔ تراوش تراکیب۔ الفاظ کے صحیح استعمال کی قابلیت اور رموز دل گوئی کا بھرم کھل جاتا ہے۔ رباعی میں جب تک کوئی خاص بات نہ پیش کی جائے اس کی غرض و غایت پوری نہیں ہوتی۔ کسی نے کیا ہی خوب کہا ہے کہ "کامیاب رباعی سو نظموں اور پچاس غزلوں پر بھاری ہوتی ہے"۔ یعنی سو نظمیں اور پچاس غزلیں اس قدر پر اثر نہیں ہوتیں جس قدر ایک رباعی۔ چنانچہ نور بائی گائن جس نے محمد شاہ کے تقرب کا درجہ حاصل کر لیا تھا ایک دن نواب روشن الدولہ کے یہاں بیٹھی تھی۔ اتنے میں سید میراں بھیک کی سواری آپہنچی۔ نواب نے فوراً نور بائی کو دوسرے کمرے میں بٹھا کر آگے سے چلمن چھڑوا دی۔ میراں صاحب بہت دیر تک بیٹھے رہے۔ نور بائی اس طویل تنہائی کی تاب نہ لا کر بے باکانہ باہر نکل آئی۔ اور جھک کر آداب بجا لائی اور عرض کی۔ "حکم ہو تو کچھ گائے"۔ میراں صاحب چوں کہ سماع کے عاشق تھے خاموش ہو رہے۔ بائی نے ان کی خاموشی کو اجازت سمجھ کر عمر خیام کی یہ رباعی نہایت سوز و گداز کی لے میں گانی شروع کی ؎

شیخے بہ زن فاحشہ گفتا مستی — کز خیر گسستی و بہ شر پیوستی
زن گفت چناں کہ می نمائم ہستم — تو نیز چناں کہ می نمائی ہستی

شیخ کی حالت اس برمحل رباعی کے سننے سے ایسی متغیر ہو گئی کہ بائی کو اپنی جسارت سے سخت نادم ہونا پڑا۔ باوجود اس کے بائی کو خاموش کر دیا گیا تھا شیخ کی شورش کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ وہ زمین پر مرغ بسمل کی طرح لوٹتے تھے اور دیواروں میں سر دے دے مارتے تھے۔ دیر تک یہی حال رہا۔ بہت مشکل سے ہوش میں آئے یہ رباعی ہی کا سحر سامری تھا کہ سید میراں بھیک ایسے صاحب کرامت بزرگ کو از خود رفتہ کر دیا۔

غرض کہ رباعی فن عروض میں ایک نہایت ضروری اور مفید صنف ہے۔ دو ابیات میں ایسے مضامین کا انکشاف کر دیا جاتا ہے جو دفاتر کے حامل ہوں۔ اس میں عہدہ برآ ہونا کہنہ مشق اور صاحب فن شاعری کا کام ہے۔

اردو رباعی کی ابتدا و ارتقا:- علمائے فن و محققین ادب اس بات پر متفق ہیں کہ رباعی خاص اہل عجم کی ایجاد ہے۔ دوسری اصناف سخن کی طرح یہ بھی فارسی سے اردو میں آئی ہے۔ اردو نظم کے تاریخی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ (۹۸۸ھ تا ۱۰۲۰ھ) کے کلیات میں متعدد رباعیاں موجود ہیں۔ اس لیے اردو شاعری کے اس باوا آدم کو پہلا اردو رباعی گو شاعر سمجھنا چاہیے۔ محی الدین قادری زور نے "اردو شہ پارے" میں محمد قلی قطب شاہ کے ہم عصر ملا وجہی کی بھی تین رباعیاں نقل کی ہیں۔ لیکن انہوں نے وجہی کو پہلا شاعر یا پہلا رباعی گو کہیں نہیں لکھا۔ رباعی کی بتدریج ترقی کو سمجھنے کے لیے اسے چھ حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ۱۔ قلی قطب شاہ سے ولی دکنی تک۔

یہ وہی دھیمی دھیمی روشنی دھوکہ نہ دے کہیں — گھر کا دیا ہے گھر کو جلاتا ہے صاحبو! (راہی قریشی)

۲۔ درد۔ سودا اور میر کا زمانہ۔ ۳۔ لکھنوی شعرا۔ ۴۔ انیس۔ دبیر۔ غالب اور مومن کا زمانہ۔ ۵۔ اکبر اور اسماعیل میرٹھی کا زمانہ۔ ۶۔ دور حاضر۔

پہلا دور:۔ اس دور میں محمد قلی قطب شاہ۔ ملا وجہی۔ سراج اورنگ آبادی اور ولی دکنی قابل ذکر ہیں۔ محمد قلی قطب شاہ کے یہاں حمدیہ۔ نعتیہ اور عشقیہ ہر رنگ کی رباعیاں موجود ہیں۔ ان کی زبان زیادہ تر دکھنی ہے۔ ان کے بعد ملا وجہی کی رباعیاں اردو رباعی کے قدیم ترین نمونوں میں شمار کی جا سکتی ہیں۔ سراج اورنگ آبادی (۱۱۲۶ھ تا ۱۱۷۷ھ) ولی دکنی کے ہم عصر ہیں۔ ان کی رباعیاں صاف ستھری سلیس۔ اور رواں ہیں۔ عشقیہ جذبات کو بڑے سلیقے سے نظم کیا گیا ہے۔ ولی دکنی (۱۰۶۰ھ تا ۱۱۵۵ھ) کے یہاں قابل ذکر رباعیاں ملتی ہیں۔ دیوان ولی دکنی مرتبہ صید ابراہیم سایانی میں صرف چھ رباعیاں ہیں۔ لیکن ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی کے مرتبہ کلیات میں چھبیس رباعیاں ملتی ہیں اور وہ محاسن شعری سے مملو ہیں۔ ان میں حسن پرستی۔ محبوب کی سراپا نگاری۔ عاشقانہ جذبات اور عارفانہ انکشافات کی ترجمانی نظر آتی ہے۔

دوسرا دور:۔ یہ دور جہاں غزل اور قصیدے کی ترقی کے لیے مشہور ہے وہاں رباعی کی آرائش کے لیے بھی قابل ذکر ہے۔ اس میں درد۔ سودا۔ میر حسن۔ میر تقی میر ایسے باکمال رنگ پیدا ہوئے۔ درد کی رباعیاں ان کی غزلوں کی طرح رطب و یابس سے پاک۔ سوز و گداز سے مملو۔ تصوف و اخلاق سے ہم کنار اور دلکش و دلنشیں۔ ایک رباعی سنیے۔ ؎

اے درد یہ درد جی سے کھونا معلوم — جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں میں اب پھولے لیکن — میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

میر تقی میر کے کلیات میں سوا سو کے قریب رباعیاں ہیں۔ ان میں سوز و گداز۔ اثر۔ عشقیہ جذبات اور کہیں کہیں شاعرانہ تعلی نمایاں ہیں۔ ذیل کی رباعی سنیے۔ ؎

کاہے کو کوئی خراب و خواری ہوتا — کاہے کو کسی پہ جان بھاری ہوتا
دل خواہ ملاپ ہوتا تو ملتے — اے کاش کہ عشق اختیاری ہوتا

سودا کے کلیات میں تقریباً اسی رباعیاں ہیں جن کے موضوعات مختلف ہیں۔ مدح۔ ہجو۔ مذہب۔ اخلاق۔ عشق۔ شاعرانہ تعلی۔ اور ذاتی حالات۔ ان کی رباعیوں میں میر درد کا سا اثر اور سوز و گداز نہیں ہے۔ میر حسن نے اپنے تذکرہ "شعرائے اردو" میں اپنی دو رباعیاں نقل کی ہیں۔ دوسرے نسخوں میں بھی کہیں کہیں ملتی ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی رباعیاں عشقیہ شاعری کا قابل قدر سرمایہ ہیں۔ تذکروں اور دیوانوں کی چھان بین سے پتہ چلتا ہے کہ ان حضرات کے علاوہ اس دور میں حسرت۔ مرزا بہادر علی وحشت۔ عبدالحی تاباں۔ احسن اللہ میاں۔ عزیز صفاہانی۔ اور میر محمد سوز نے بھی رباعیاں کہی ہیں۔ یہ دور چونکہ اردو غزل گوئی کا بہترین دور ہے۔ اس میں رباعیوں کا موضوع بھی بالعموم غزل کی طرح عاشقانہ لوازم تک محدود رہا۔

تیسرا دور:۔ اس دور میں قادر الکلامی۔ مبلغ علم۔ رنگین مزاجی۔ اور مصلح زبان کے اعتبار سے ناسخ۔ آتش۔ انشا اور جرأت ایسے شاعر ظہور پذیر ہوئے لیکن ان کے دواوین میں رباعیات بہت کم نظر آتی ہیں۔ یہاں تک کہ آتش و ناسخ ایسے سہہ گو شاعروں کے بھی یہاں رباعی نظر نہیں آتی۔ انشا چونکہ ہر فن مولا تھے۔ اس لیے رباعی میں بھی وہ اپنی شان دکھانے سے باز نہ رہے۔ ان کے دیوان میں کوئی چالیس رباعیاں ہوں گی جو تمام طعن و تشنیع کے سلسلے میں کہی گئی ہیں۔ اس عہد میں صرف جرأت کے یہاں قابل ذکر رباعیاں ملتی ہیں۔ ان کے کلیات میں ایک سو سے زائد رباعیاں ہیں۔ جن میں معاملہ بندی۔ شوخی۔ چلبلا پن۔ نوک جھونک۔ اور سطحی جذبات کی ترجمانی ملتی ہے۔ نظیر اکبرآبادی کے مجموعۂ کلام میں بائیس رباعیاں درج ہیں۔ جن میں اخلاقی مضامین نظم کیے گئے ہیں۔ سیدھی سادی نصیحت آمیز باتیں بیان کی گئی ہیں ایک دو رباعیاں حمد و نعت میں بھی ہیں۔

چوتھا دور:۔ رباعی کی ترقی کے لیے یہ سنہری زمانہ سمجھنا چاہیے۔ اس میں انیس۔ دبیر۔ غالب۔ مومن اور ذوق ایسے باکمال شعرا نے جہاں غزل۔ قصیدہ اور مرثیہ کو بام عروج پر پہنچایا، وہاں رباعی ایسی پس افتادہ صنف سخن کو بھی راہ ترقی پر گامزن کیا۔ دہلی اور لکھنؤ دونوں ادبی مرکزوں میں رباعی کو فروغ نصیب ہوا۔ اہل لکھنؤ نے خاص طور پر رباعی کی طرف توجہ مبذول کی۔ انیس و دبیر کی ہمت و سعی نے رباعی کو اہم اور قابل قدر صنف سخن بنا دیا۔ اس دور میں پہلی مرتبہ اردو رباعی کے مباحث کا تعین ہوا۔ اور عشق و تصوف کے ساتھ ساتھ واقعات کربلا اور ان کے متعلقات کا ذکر ہونے لگا۔ اس طرح رباعی کا دائرہ وسیع ہو گیا اور وہ زندگی کی اخلاقی قدروں کی ترجمان بن گئی۔

انیس و دبیر نے رباعی کو نہ صرف معنوی اعتبار سے وسعت دی بلکہ اس صنف کو عوام سے روشناس بھی کرایا۔ اور اس کو مجلسی مقبولیت عطا کر کے اس کی ترقی کے لیے نئی راہیں کھول دیں اور لکھنؤ کے شعرا کو رباعی کہنے کا شوق دلایا۔

انیس کے مجموعۂ کلام میں تقریباً ساڑھے پانچ سو اور دبیر کے دو سو کے قریب رباعیاں ہیں۔ اکثر رباعیاں مخصوص مذہبی معتقدات۔ شاعرانہ تعلی۔ اظہار اور مجلسی لوازم کے لیے کہی گئی ہیں۔ ان کی رباعیات میں زور۔ اثر۔ برجستگی۔ سلاست اور روانی نمایاں ہے۔

دہلی میں اگرچہ غالب۔ ذوق۔ مومن۔ ظفر۔ اور شیفتہ جیسے باکمال موجود تھے۔ لیکن مومن کے سوا رباعی کی طرف کسی نے بھی کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔ غالب کے دیوان میں پندرہ سولہ رباعیاں ہوں گی۔ کسی میں حمد ہے کسی میں نعت۔ کوئی بہادر شاہ کی شان میں۔ کوئی بیسنی روٹی کی تعریف میں۔ غرض کہ ان کی رباعیوں میں وہ شاعرانہ بلندی جو ان کے کلام کی خصوصیت ہے نہیں پائی جاتی۔ بہادر شاہ ظفر کے پہلے۔ دوسرے اور تیسرے دیوان میں رباعیاں نہیں ہیں۔ چوتھے دیوان میں رباعیات کے عنوان کے تحت مختلف اوزان کے تین قطعے ملتے ہیں۔ دیوان ذوق مرتبہ محمد حسین آزاد میں سولہ رباعیاں ملتی ہیں۔ ان میں روزمرہ اور محاورہ کی زبان کا لطف موجود ہے۔

لایا تھا میں ہی شہر کو صحرا کے بیچ سے — اک صرف مجھ کو چھوڑ کر سیراب سب ہوئے (دلکش اعظمی)

بہ لحاظ مضمون زیادہ تر اہلِ بیت کی تعریف اور حمد و نعت کا رنگ ہے ۔

مومن نے اس دور میں کثرت سے رباعیاں کہی ہیں ۔ تعداد میں کوئی ایک سو چالیس ہیں ۔ تمام کی تمام کسی معنوی خصوصیت کی حامل ہیں ۔ اپنے موضوعات کی ہمہ گیری اور فنی محاسن کے لحاظ سے قابلِ داد ہیں ۔ نازک خیالی ۔ وقت شناسی ۔ خیال آفرینی اور معاملہ بندی جا بجا نمایاں ہے ۔ اس دور میں دہلی شعرا کی بدولت عاشقانہ اور لکھنوی شعرا کی بدولت مسلسل نہ رنگ رباعی میں آگیا اور اس ہمہ رنگی نے رباعی کو ہمہ گیر بنا دیا ۔

پانچواں دور: جب انیس و دبیر کی مقبولیت اور شہرت کو چار چاند لگ گئے تو دوسرے شعرا بھی اس طرف متوجہ ہوئے ۔ رباعی مجلس عزا کے دائرہ سے نکل کر عام ادبی جلسوں اور مشاعروں میں عزت و تکریم پاتی ہوئی اخلاق ۔ تمدنی سیاسی ۔ اور سماجی سدھار کا ذریعہ بن گئی ۔ حالی اور اکبر ایسے ادبا ، لسانی اور قومی معلمین نے رباعی کو اصلاحی اور تعمیری کاموں کے لیے منتخب کر کے اخلاقیات کے لیے وقف کر دیا ۔ حالی کے ادبی ۔ اصلاحی اور اخلاق کارناموں کا جائزہ لیا ہو تو ان کی نظموں کو پہلو بہ پہلو ان کی رباعیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے ۔ انھوں نے زندگی کے بے شمار اخلاقی پہلوؤں ۔ اصلاحی نکتوں اور تعمیری تجویزوں کو رباعی میں جگہ دے کر رباعی کا دامن وسیع تر کر دیا ۔ حالی کی رباعیوں میں قومی و ملکی درد ۔ انسانی مروت و اخلاص سیدھے سادے اور عام فہم انداز بیان میں جا بہ جا ملتا ہے ۔

اکبر کی رباعیاں طنز و ظرافت کے پردے میں پند و موعظت سے لبریز ہیں ۔ حالی نے جو بات سنجیدگی ۔ قناعت اور خاموشی سے کہی یا پیدا کی اکبر نے ہنسی ٹھٹھول کے پردے میں اسے پورا کیا ۔ اکبر نے اپنی فطری خوش طبعی کی مدد سے رباعی میں ایک نیا اسلوب پیدا کر دیا اور رباعی میں حسن و عشق ۔ موعظت ۔ مذہب ۔ اخلاق ۔ تصوف ۔ پند و نصائح ۔ تعمیری طنز اور مفید مزاح نگاری کو جگہ مل گئی ۔

حالی اور اکبر کے بعد اسماعیل میرٹھی بھی ان کے ہم نواؤں میں سے ہیں ۔ ادب کو نئی روشنی پر گام زن کرنے میں ان کا بھی بہت بڑا حصہ ہے ۔ ان کی رباعیوں میں معلمانہ انداز ہے ۔ اس عہد میں امیر مینائی ۔ پیارے صاحب رشید ۔ شاد عظیم آبادی ۔ میر مہدی مجروح نے بھی رباعیاں کہی ہیں ۔ ان میں امیر مینائی کی رباعیات زیادہ تر نعتیہ ہیں ۔ لیکن ان میں ادبی شان اور شاعرانہ لطافت بوجہِ احسن موجود ہے ۔

پیارے صاحب رشید زبان و بیان کے لحاظ سے انیس کے مقلد ہیں لیکن موضوع کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتے ہیں ۔ شاد عظیم آبادی کی رباعیاں متغزلانہ رنگ میں ہیں جن میں زیادہ تر معرفت و تصوف کی ترجمانی کی گئی ہے ۔ میر مہدی مجروح کی رباعیات میں اہلِ بیت کی مدح و ثنا اور واقعات کربلا کا ذکر ہے ۔ چند رباعیاں عشقیہ ہیں اور دہلوی رنگ کی یادگار ہیں ۔

اس دور میں داغ اور عزیز لکھنوی نے بھی چند رباعیاں کہی ہیں ۔ لیکن ان میں کوئی خاص قابلِ ذکر بات نہیں ملتی ۔ حضرت آفاق لکھنوی کی رباعیاں بھی ایک سو کے قریب ملتی ہیں ۔ جن میں اخلاق و تصوف کے علاوہ وطنی اور قومی مضامین ملتے ہیں ۔

دورِ حاضر: اس دور کو رباعی کے عروج و فروغ کا دور کہنا بجا ہے ۔ حالی اور اکبر کا لگایا ہوا پودا بار آور ہوا ۔ چند ہی دنوں میں متعدد شعرا نے رباعیات کے پورے پورے مجموعے منصۂ شہود پر جلوہ گر کر دیے ۔ اس میں امجد حیدر آبادی ۔ جوش ملیح آبادی ۔ جوش ملسیانی ۔ فانی ۔ سیماب ۔ فراق ۔ محروم ۔ رواں ۔ آسی ۔ یگانہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں ۔ حسرت ۔ اصغر اور جگر نے اس طرف توجہ نہیں کی ۔ دل شاہ جہاں پوری ۔ زور عابد ۔ قابلِ ذکر ہیں ۔ کلیاتِ فانی میں دو سو کے قریب رباعیاں ہیں ۔ جو لفظی اور معنوی محاسن سے مالا مال ہیں ۔ درد و اثر ، سوز و گداز ۔ یاس و حسرت کے اعتبار سے ان کی رباعیوں پر بھی غزل کا رنگ چھایا ہوا ہے ۔

تلوک چند محروم اور جوش ۔ ادبی ۔ قومی ، اور اصلاحی تحریک میں اکبر کے ہم نوا معلوم ہوتے ہیں ۔ پاکیزگیِ خیال ۔ سلاست و روانی ۔ جذبات انسانی کی ترجمانی ۔ اخلاقی تلقین اور حسنِ فطرت کی نقاشی ان کی رباعیات کی اہم خصوصیات ہیں ۔ کہیں کہیں یاس و غم کی عکاسی بھی ملتی ہے ۔ مجموعی انداز معلمانہ ہے ۔

جگت موہن لال رواں (۱۸۸۹ء تا ۱۹۳۴ء) ان لوگوں میں سے ہیں ، جنھوں نے شعوری طور پر رباعی کو اپنایا اور اپنے ہم عصروں کی توجہ اس صنف کی طرف مبذول کرائی ۔ رواں کے خیالات چکبست سے ملتے جلتے ہیں ۔ وطنی ۔ قومی ، اور سیاسی تصورات جا بہ جا جھلکتے ہیں ۔ مذہبی روایات ۔ مقامی و فطری مناظر کو اردو رباعی میں داخل کرنے میں ان کی طرح رواں دواں ہیں ۔

مولانا عبدالباری آسی کے مجموعۂ رباعیات میں چھ سو رباعیاں شامل ہیں جن میں درد و غم اور یاس و الم کی کامیاب ترجمانی ملتی ہے ۔ یگانہ چنگیزی رباعی نگاروں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان کے مجموعۂ کلام میں ۱۶۳ رباعیاں شامل ہیں ۔ جن میں وہی تندی تیزی ۔ چنگیزیت ۔ زندگی کی ولولہ خیزی اور زور و اثر ہے جو ان کی غزلوں میں ہے ۔ اختر صہبائی کی رباعیوں کے دو مجموعے "جامِ صہبائی" اور "جامِ طہور" شائع ہو چکے ہیں ۔ لیکن ان میں انفرادیت نظر نہیں آتی ۔ امجد حیدر آبادی کی یہ اہم خصوصیت ہے کہ وہ اول سے آخر تک صرف رباعی گو ہیں ۔ ان کو فنِ رباعی پر غیر معمولی قدرت حاصل ہے ۔ ان کے موضوعات اگرچہ توحید ۔ تصوف ۔ عشقِ حقیقی اور عرفانِ سرمدی تک محدود ہیں لیکن ان میں ایک ایسی رندانہ سرمستی رچی ہوئی ہے جو رباعی میں غزل کا سا کیف بھر دیتی ہے ۔

جوش ملیح آبادی پہلے غزل کی طرف مائل ہوئے پھر نظم کی طرف ۔ اس کے بعد حیدر آباد کے قیام میں رباعی کو اپنا لیا ۔ تسلسلِ فکر وحدتِ خیال ۔ زورِ بیان اور شکوہِ الفاظ کی فطری خصوصیت کے سبب انھوں نے رباعی میں بھی امتیازی جگہ پیدا کر لی ۔ جوش نے تصوف ، فلسفہ ، رموزِ فطرت ، اسرارِ حقیقت ، شراب اور اس کے لوازم ، شباب اور اس کی مقتضیات پر مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے ۔

• فراق گورکھ پوری اپنی فنی بصیرت ۔ اچھوتے اسلوب ، اور موضوع کی ندرت کے سبب صفِ اول کے اردو رباعی نگاروں میں شمار ہوتے ہیں ۔ شدید جمالیاتی احساس

اللہ سے نظریں ملا کے دیکھو تو
یہ جہاں کتنا خوب صورت ہے (باقی صدیقی)

اور عمیق رومانی تفکر ان کی رباعیات کا طرۂ امتیاز ہے۔ خواجہ دلؔ محمد کی رباعیوں کا مجموعہ "صد پارۂ دل" میں پانچ سو رباعیاں شامل ہیں۔ ان میں سائنس، ریاضی، اور دیگر علوم کے مسائل کو شاعرانہ انداز سے رباعی میں کہا گیا ہے۔ دلؔ شاہ جہاں پوری اور عابدؔ شاہ جہاں پوری کی رباعیوں میں اخلاق و تصرف۔ حقائق و معارف اور حمد و نعت کے دریا بہہ رہے ہیں۔

صفیہ نسیم موجودہ رباعی نگاروں میں خاص مقام رکھتی ہے۔ ان کی رباعیات کا محور بہ حیثیت مجموعی صرف عشق ہے۔ جذبات نگاری، محبت کی حسین ترجمانی اور وقت کے تقاضوں کا احساس ان کی رباعیوں کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ دیگر رباعی کہنے والوں میں گوبرلال ادیبؔ لکھنوی، وحشتؔ کلکتوی، فارغ بخاری، ناشرؔ لکھنوی سیف الدین سیفؔ، ماہرؔ القادری، جگن ناتھ آزادؔ، اور راقم الحروف شامل ہیں۔ خاکسار راقم الحروف کے شعری مجموعوں میں دو سو کے قریب رباعیاں ہیں جن میں چند فارسی میں بھی ہیں۔ اخلاق اور تصوف کے علاوہ زندگی کے مختلف مسائل پر بحث کی گئی ہے

جو ڈھونڈنا ہے مجھے ڈھونڈ تو غریبوں میں کسی امیر کے گھر پر مجھے تلاش نہ کر (نذیر فتح پوری)

قطعات تاریخ

نتیجۂ فکر: حکیم رازی ادیبی پونہ

شبیر حسن خان، جوشؔ ملیح آبادی

تیرگی میں گم متاعِ ہوش ہے   علم و فن کی شمع اب خاموش ہے
ہاتفِ غیبی نے رازی یوں کہا   کس غضب کا، سوزِ داغِ جوشؔ ہے

سنہ ۱۴۰۲ھ

رگھوپتی سہائے، فراقؔ گورکھپوری

اٹھ گیا ایک شاعرِ دوراں!   آج بے نور ہے چراغِ فراقؔ
ڈھونڈنے جائیں تو کہاں جائیں   کیا ملے اب کوئی سراغِ فراقؔ
اب کہاں شعراں کا، ناز فن کا   ہوگئے ایک باغ و راغ فراقؔ
سالِ تاریخ کی ہوئی جب فکر
بولے رازی کہ، ہائے داغِ فراقؔ

سنہ ۱۴۰۲ھ

احسان الحق۔ دانشؔ

زندگی کا سوال تھا نہ رہا   موت کا احتمال تھا نہ رہا
سالِ رحلت کہا یہ رازی نے   دانشِ خوشخصال تھا نہ رہا

سنہ ۱۹۸۲ء

زین العابدین، زیڈ عابدؔ شہابی۔ بھیمڑی۔ ضلع تھانہ

ختم قصہ ہوگیا اک شاعرِ مجبور کا   جس کا رشتہ زندگی سے تھا قریبِ دور کا
موت بن کر چھا گئی رازی خزاں یاں دہر پر   ہوگیا تاراج گلشن عابدِ مزدور کا

سنہ ۱۴۰۲ھ

محترمہ ڈاکٹر زرینہ ثانی۔ ناگپور

موت عنواں ہے زندگانی کا   کھل گیا راز اس کہانی کا
اہلِ اردو کے دل میں اے رازی   سوزِ غم ہے زرینہ ثانی کا

سنہ ۱۹۸۲ء

چراغِ قصر و محل کی لکھی گئی تاریخ   کسی شکستہ مزار کے دیے کا ذکر نہیں (سلام سندیلوی)

جوشؔ ملیح آبادی (مرحوم)

ہر زہر کو مثلِ بادہ پی سکتے ہیں
ہر چاک کو مسکرا کے سی سکتے ہیں
یا احمقِ بے پناہ یا مردِ حکیم
یہ دو ہی خوشی کے ساتھ جی سکتے ہیں

ہر وقت سکوں کو اذنِ عشرت جانو
ہر نیم نفس کو ایک دولت جانو
مستقبل و ماضی میں الجھنے والو
اس لمحۂ نقد کو غنیمت جانو

"ڈوبیں کہ ابھر آئیں"؟ نہ پوچھو ہم سے
"ٹھہریں کہ گذر جائیں"؟ نہ پوچھو ہم سے
"آلامِ حیات اٹھائیں اور زندہ رہیں"؟
یا چین سے مر جائیں؟ نہ پوچھو ہم سے

اس سانولی مطربہ کی اللہ ری شان
گھل جاتی ہے چہرے کے نمک میں ہر تان
یوں نغمہ دمک اٹھتا ہے اس کے رخ پر
جس طرح کہ سونے کا کسوٹی پہ نشان

ہر سنگ میں شیشے کے مکاں ملتے ہیں
ہر تخم میں خفتہ بوستاں ملتے ہیں
روندے ہوئے ذروں کے لبوں پر اے جوشؔ
خورشید کے بوسوں کے نشاں ملتے ہیں

قطعات

احسان دانش

استقلال

ہے اگر تو مردِ دامانِ صداقت کو نہ چھوڑ
توڑ سکتی ہی نہیں دنیا ترا سازِ امید

راستی کے روبرو ہر سازش ہو جاتا ہے گنگ
جس طرح اُستاد کے غصّہ سے شاگردِ رشید

دلیری

عمر سے دامن چھڑا لیتا ہے جب دورِ شباب
زندگی کو اس طرح پاتی ہے اک طبعِ غیور

جیسے روشندان کے شیشوں سے ہنگامِ غروب
بند کمرے میں در و دیوار پہ بجھتا سا نور

احتساب

میں جب دن بھر کے ہنگامے کو دہراتا ہوں فرصت میں
تو ہر اک سانس پیغامِ ندامت لیکے آتی ہے

ارادہ نیکیوں کا جس طرح عہدِ جوانی میں
محبت جب ریا کی چوٹ کھا کر بیٹھ جاتی ہے

یاد

جب کسی کی یاد آ کر تلملا جاتا ہے دل
جگمگا اٹھتی ہے کچھ اس شان سے بزمِ دماغ

جیسے ساون کی برستی رات میں اک نازنیں
صحن میں زینے سے اترے ہاتھ میں لیکر چراغ

شاعر کا سینہ

تھا گھاؤ کلہاڑی کا جو کیکر کے تنے پر
ہے گوند اسی زخم کے حلقے سے نمایاں

ہے سینۂ شاعر بھی اسی طرح کہ اس میں
ہر زخم ہے رنگینیٔ اشعار کا ساماں

کم ظرف کی فطرت!

صبح سے تا شام بھونرا لاکھ کلیوں میں رہے
آ نہیں سکتا مگر اس کی سیہ روئی میں فرق

یونہی وہ نیکوں میں رہ کر نیک ہو سکتا نہیں
ہو چکا ہو سر بسر جو ظلمتِ عصیاں میں غرق

مزدور

دن کے چڑھتے ہی پسینہ آ گیا مزدور کو
لگ گئی رستوں کو چپ، تپنے لگا مہرِ منیر

دھوپ کی شدت سے چمکی اسطرح گنگا کی ریت
یورشِ آلام میں جیسے مجاہد کا ضمیر

شام کے بے نور سناٹوں میں آبادی سے دور
جا رہا ہے ایک تنہا نہر میں بہتا ہوا!

جیسے اک مزدور مزدوری سے گھر آتے ہوئے
مشکلوں کی داستاں تقدیر سے کہتا ہوا

یاس اور ناامیدی

سرخ تاریکی ہے مغرب کی طرف چھائی ہوئی
کر رہا ہے زیرِ لب گردوں زمیں سے کچھ سوال

ڈوبتے سورج کے رخ پر ہے وہ مایوسی کا رنگ
جیسے اک مدقوق دوشیزہ بوقتِ انتقال

بے وفائی

احسان جو کل تھے مرے آغوش کی زینت
وہ آج ملاتے بھی نہیں مجھ سے نگاہیں

ویراں ہیں فکر و نظر و قلب و تصوّر
جیسے کہیں طاعون میں اجڑی ہوئی راہیں

توڑتا ہے ناگہاں جب کوئی پیمانِ وفا
ایسا غم محسوس کرتا ہے دلِ راحت پسند

جیسے گرم آنسوؤں کی تھرتھری کے ساتھ ساتھ
پھینکتے ہیں دل کی گہرائی سے آنکھوں میں کمند

مرسلہ: ایم یوسف ایم اے۔ بی ایڈ۔

گلشن گلشن نکہت تیری صحرا صحرا قدرت تیری
دریا دریا رحمت تیری، قطرہ قطرہ جام ترا (جمیل مظہری)

حضرت سہیل مالیگانوی

قطرے قطرے میں جزر و مد ہے ساقی
ذرّے ذرّے میں رد و کد ہے ساقی
سب میں دلِ انساں کی تڑپ ہے منتظر
صرف ایک تری ذات صمد ہے ساقی

احساس سے سب صفات کیا دیکھو گے
آنکھوں سے دلوں کی بات کیا دیکھو گے
ذرّے کو نقاب الٹ کے دیکھا نہ گیا
تم پرتوِ حسنِ ذات کیا دیکھو گے

سودا تو بہت سرِ دکاں ملتا ہے
مشکل سے مگر دلِ تپاں ملتا ہے
بازار میں یوسفؑ تو ملے گا تجھکو
لیکن غمِ یعقوبؑ کہاں ملتا ہے

کل رات یہ کہتا تھا سہیلِ ناداں
کس نوع میں ہوتا ہے شمار انساں
سقراط نے فرمایا کہ اے مردِ حکیم
انسان بھی ہے ایک سیاسی حیواں

احکام کم و بیش جدا رہنے دو
تم اور غمِ انساں کی دوا رہنے دو
کیوں کرتے ہو زندگی کا رستہ مسدود
میخانے کا دروازہ کھلا رہنے دو

میزان میں ہوں لوح و قلم ایک طرف
سرمایۂ ہستی و عدم ایک طرف
قیمت میں گراں کون سی شے ہے ان میں
کر دیجئے انساں کا غم ایک طرف

بزمی میں نسیمِ سحری ہیں ہم لوگ
پھر کیوں سببِ جامہ دری ہیں ہم لوگ
کانٹوں کی خلش دل میں نہ پھولوں کا ہے پیار
اس باغ میں تہمت سے بری ہیں ہم لوگ

روٹی کے ملال سے مرا جاتا ہے
دانوں کے سوال پر مٹا جاتا ہے
انسان نے کی ہے بس ترقی اتنی
دل تنگ ہوا شکم بڑھا جاتا ہے

زاہد کے لیے حرم بھی اک دھوکا ہے
ہندو کی نگاہ میں صنم رسوا ہے
کرتا ہے سہیل اپنے ہی گھر کا طواف
صد شکر کہ دردِ جستجو سچا ہے

میری قسمت کے وہ کے بل ان میں — کس نے گیسو ترے سنوارے ہیں (بیدل ...)

رباعیات

کالی داس گپتا رضا

٣١١

جب میں نے حقیقت کی نظر پائی تھی!!
دکھ درد کا موسم تھا، گھٹا چھائی تھی
دن چڑھنے میں باقی تھے ابھی تو لمحے
اور رات بہت نیچے اتر آئی تھی!!

مدہوش کو جام دینے والا تو کون
مصروف کو کام دینے والا تو کون
دن رات رضا، رضا کی رٹ؟ واہ رے دل
بے نام کو نام دینے والا تو کون

پت جھڑنے جو کوچ ناگہاں بول دیا
پژمردگی زیست میں رس گھول دیا
منہ بند تھا مدت سے اور اب گلشن نے
وہ راگ الاپے ہیں کہ جی کھول دیا

خاموش کہ لفظ و معنی کا جہان
حائل کہ عبودیت کا احساس جوان!!
نازک سے قدم کہ دھڑکنیں گیتوں کی
اے رقصِ ظہورِ صبح، اے سحرِ رواں!

باقی نہ رہے دل میں ہے جو کچھ کہہ جا
لاوا جو ابل رہا ہے اس میں بہہ جا
یا جبت لگا ہوئے صحرا کی طرح
یا ضبط کے چنگل میں تڑپتا رہ جا

جاہل یا صاحبِ خرد کوئی نہیں
بس ہم ہیں اور نیک و بد کوئی نہیں
ہاں یہ ہے کہ عقل کی ہزاروں ہیں حدیں
اور جہل و انانیت کی حد کوئی نہیں

آہن ہے ملائم نہیں ریشم کی طرح
پھٹتے ہی مرتا نہیں شبنم کی طرح
ڈرتا ہے مگر سخت ہے دل آفت میں
آندھی میں لرزتے ہوئے پرچم کی طرح

جو رہ گئی ان سنی، وہ تلقین ہوں میں
تردید میں لپٹا ہوا آئین ہوں میں
اے سب کو غلط رنگ میں رنگنے والے
بے رنگ بھی ہے رنگ تو رنگین ہوں میں

نالہ کبھی ہوتا نہیں، درمانِ درد
شیون سے بھی کچھ بڑھتی نہیں شانِ درد
یہ بادِ سحر نہیں، چلے اور تھم جائے
تھمتے تھمتے تھمے گا طوفانِ درد

جب بھی کسی محفل میں کبھی ہوتا ہوں
میں نام و نمود سے بری ہوتا ہوں
سب ہوتے ہیں منتہی سخن سازی میں
میں کسبِ سخن میں مبتدی ہوتا ہوں

چنری کی آمد آمد ہے — رنگ ابھی سے گھول رہا ہوں (کالی داس گپتا رضا)

بھڑکی ہوئی اک مشعلِ غم رکھتا ہوں
شبنم کی طرح دیدۂ نم رکھتا ہوں

دکھتی ہوئی رگ اپنی چھپائے دنیا
مجبور ہوں کاغذ پہ قلم رکھتا ہوں

تقدیر پہ الزام نہیں دھر سکتے
خاکے میں سیہ رنگ نہیں بھر سکتے

ہر لوح پہ تحریر ہے جینا ہے مدام
آواز لگا دو کہ نہیں مر سکتے

شعلہ ہے، اسے چوم رہا ہوں پھر بھی
خالی ہے سبو، جھوم رہا ہوں پھر بھی

وہ مجھ سے گریزاں ہے ہوا کی مانند
پنکھے کی طرح گھوم رہا ہوں پھر بھی

ہاتھوں میں لیے تیغ و سناں بیٹھا ہے
ہم زاد نہیں، دشمنِ جاں بیٹھا ہے

جس جا بھی متاعِ فکر لے کر بیٹھوں
لگتا ہے کوئی اور وہاں بیٹھا ہے

ڈاکٹر مظفر حنفی
۳۵۸، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر نئی دہلی۔۲۵

شراب

اک زہر شرابِ ارغوانی تو نہیں
یہ سرخیِ مے خونِ جوانی تو نہیں

لہراتی ہے ساغر میں جو بجلی کی طرح
یہ موت کی تلوار کا پانی تو نہیں

تہذیب کی تخریب کا ساماں ہے شراب
غارت گرِ دیں دشمنِ ایماں ہے شراب

ناداں کلیجے سے لگاتا ہے جسے
دل بند و جگر گوشۂ شیطاں ہے شراب

یہ دل میں اترتی ہے سہاگن بنکر
ڈس لیتی ہے پھر روح کو ناگن بنکر

تاعمر اس انجام پہ لیلیٰ حیات
روتی ہے مقدر کو ابھاگن بنکر

وہ عالم بدمستی میں ساغر چھوٹا
وہ عفت و عصمت کا مقدر پھوٹا

وہ شق ہوا افلاک سینہ دیکھو
وہ عرش معلےٰ کا ستارا ٹوٹا

جذبات میں اک آگ لگا دیتی ہے
احساس کی ہر شمع بجھا دیتی ہے

چھا جاتی ہے جب ہوش پہ مستی بنکر
انسان کو حیوان بنا دیتی ہے

رعنائی افکار بدل دیتی ہے
شیرینی گفتار بدل دیتی ہے

بدکیش و بداندیش و بداطوار شراب
انسان کا کردار بدل دیتی ہے

پروفیسر غلام دستگیر صاحب شہاب
سابق صدر شعبہ اردو فارسی پونہ یونیورسٹی

۳۴۷ مصحان منشن لشکت واڑی پونہ ۱۰

مدتیں گزریں مگر آج تلک قائم ہے — میرے مقتل سے ترے رنگ حنا کا رشتہ (نازش)

اُردو تری آغوش کا پالا اسباق
ہے دیدۂ بینا کا اُجالا اسباق
انگشت بہ دنداں ہے زمانہ عابدؔ
پونہ سے جو رازیؔ نے نکالا اسباق

ہاں خاتمِ اردو کا نگینہ دیکھا
پیشانیٔ رازیؔ کا پسینہ دیکھا
دلّی ہو کہ لکھنؤ ہیں فدا سب اس پر
اسباق کا دنیا نے قرینہ دیکھا

اللہ رے اعجاز یہ عیسیٰ دم کا
لو چھٹ گیا چھایا ہوا بادل غم کا
جگنو کی طرح کرتا ہے جگمگ اسباق
یا قسمتِ اُردو کا ستارا چمکا

پیغمبرِ ذی شانِ جہانِ اُردو!
لہراتا ہوا ایک نشانِ اُردو!
اسباق جسے کہتے ہیں عابدؔ وہ ہے
آئینۂ کردارِ زبانِ اُردو!

اُردو کا یہ اک معجزۂ زندہ ہے
تاریکیٔ شب میں بھی درخشندہ ہے!
وہ میرؔ کا ہو دور کہ سیماؔ عابدؔ
ہر دور کا اسباق نمائندہ ہے

زیڈ عابدؔ شہابی مرحوم

۱؎ برادرم حکیم رازیؔ صاحب۔

جو پلٹ کر بھی نہ دیکھیں گے — تم سے وہ ٹوٹ کر ملیں گے بہت (عقیل شاداںؔ)

ظہیر غازی پوری

چہرے پہ خراشیں لئے عزت نکلی
ملبوسِ دریدہ میں شرافت نکلی

دیوارِ جنوں پھاند گئی ہے جب عقل
ننگی سرِ بازارِ جہالت نکلی

گفتار سزاوارِ عداوت بن جائے
اظہار عناں گیرِ جہالت بن جائے

روشن نہ ہوا تھا کہ خود آئینۂ علم
جلتے ہوئے شعلے کی علامت بن جائے

دعویٰ ہے کہ اندازِ انا تولتے ہیں !!
اخلاصِ فراواں کی ادا تولتے ہیں !!

ہیرے کی ترازو ہے انھیں ہاتھوں میں
جو ذائقۂ خونِ وفا تولتے ہیں !!

اپنے ہی میں روپوش میں ہو جاتا ہوں
دانستہ سزا کوش میں ہو جاتا ہوں

حق بات پہ جب میری زباں کٹتی ہے
کچھ سوچ کے خاموش میں ہو جاتا ہوں

شورش کو دل آویزیاں کیسے کہوں
کانٹوں کو بہاروں کی زباں کیسے کہوں

شوکیس میں تم لاکھ سجا کر رکھو
پتھر کو میں ہیرے کی دکاں کیسے کہوں

دلداری و الطاف و عطا بھول گئے
عکاسیِ تصویرِ وفا بھول گئے

احساس کے سینے میں لگا کر نشتر
کہتے ہیں وہ ہنسنے کی ادا بھول گئے

دو گام بھی ہمراہ نہیں چل سکتے
ہر شکل و شباہت میں نہیں ڈھل سکتے

وہ سرد ہواؤں سے پگھل جاتے ہیں
ہم آگ بھی پی لیں تو نہیں جل سکتے

ہر مسئلۂ فکر کو الجھاتے ہیں
بنتی نہیں جب بات بگڑ جاتے ہیں

کس نام سے ایسوں کو پکارا جائے
اوڑھی ہوئی قدروں پہ جو اتراتے ہیں

سرمایۂ اظہار نہیں ہو سکتی
گنجینۂ اسرار نہیں ہو سکتی

مجہول نظریات کی پابند نظر
گہوارۂ افکار نہیں ہو سکتی

رنگ باتیں کرے اور باتوں سے خوشبو آئے   درد پھولوں کی طرح مہکے اگر تو آئے (فیض)

ناوک حمزہ پوری

جاتا ہے اگر ہاتھ سے زر جانے دے
دینار و درم، لعل و گہر، جانے دے
لیکن نہ جھکے کبھی سرِ عزتِ نفس
گردن سے جو سر جائے تو سر جانے دے

افسانۂ دزدیدہ نظر جانے دے
ذکرِ رخ و گیسو و کمر جانے دے
اے دل نہ مجھے اب اس جھمیلے میں پھنسا
اس قصّے کو اے فکر بسر جانے دے

یہ مالِ منال اگر مگر جانے دے
یہ پیش و پس و زیر و زبر جانے دے
یا تو ہی آ کے میرے دل میں بس جا
یا دل میں مجھ کو ہی اتر جانے دے

کشتیِ حیات بے خطر جانے دے
گردابِ مصائب سے نہ ڈر جانے دے
یا موڑ دے دھارے کو موافق اپنے
یا ناؤ اپنی بہاؤ پر جانے دے
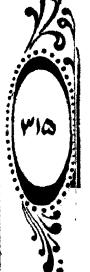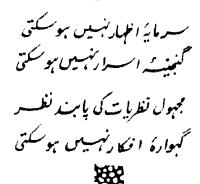
بھرتا ہے جو جام عمر بھر جانے دے
مرتا ہوں، تری بلا سے، مر جانے دے
بس ایک تمنّا مری پوری کر دے
الزامِ محبت مرے سر جانے دے

یہ غرّۂ نسبتِ پدر جانے دے
یہ فخر و غرورِ مال و زر جانے دے
معیارِ فضیلت تو فقط تقویٰ ہے
حسب و نسب و تخم و گہر جانے دے

میں ڈھونڈھ رہا ہوں اپنا گھر جانے دے
ہے طول طویل یہ سفر جانے دے
جانا ہے پرے کہکشاں سے بھی مجھے
اے شمس نہ روک اے قمر جانے دے

مت روک اسے تا بابِ اثر جانے دے
آہِ دلِ مظلوم سے ڈر، جانے دے
پہنچے گا مکافاتِ عمل کو ظالم
بھرنے دے گھڑا پاپ کا بھر جانے دے

خود سے محوِ نبردِ قضا ہی کون مجھ سا مصلوبِ دردِ تقاضا ہی کون (عتیق احمد عتیق)

ای ۔ بینجمن ناؔمی نادری

ایڈیٹر ماہنامہ "سازِ سرمدی" ۔ دہرہ دون

دولت کی ضرورت نہیں، دولت ہے سرآب
شہرت کی ضرورت نہیں، شہرت ہے سرآب

معبود! مرے دل میں محبت بھر دے
عزّت کی ضرورت نہیں، عزت ہے سرآب

انسان تجھے ناز ہے ہستی پہ فضول
تو خاک ہے، ہاں خاک ہے یہ بات نہ بھول

اک روز اتر جائے گا سب نشہ ترا
بے کار نہ جذبات کو اتنا دے طول

ہر آن تجھے رہتا ہے میرا ہی خیال
معلوم کیا تو نے کبھی اپنا بھی حال

جا آنکھ سے شہتیر نکال اپنی ندیم
پھر آ کے مری آنکھ سے تنکا بھی نکال

حیوان کو انسان بنا دیتی ہے
انسان کو حیوان بنا دیتی ہے

ناداں کو بنا دیتی ہے دانا، عورت
دانا کو یہ ناداں بنا دیتی ہے

بے شان کو ذی شان بنا دیتی ہے
انسان کو انسان بنا دیتی ہے

مومن کو بنا دیتی ہے کافر، عورت
کافر کو مسلمان بنا دیتی ہے

ہر گھر میں جراثیمِ سیاست توبہ
ہر آنکھ میں آثارِ بغاوت توبہ

پردے میں محبت کے عداوت افسوس
اس دورِ ترقی کی رذالت توبہ

مجھ کو کبھی کچھ دان دیا ہو جیسے
یا میں نے کبھی قرض لیا ہو جیسے

اب ایسے مجھے دیکھتی ہے یہ دنیا
مجھ پر کوئی احسان کیا ہو جیسے

دنیا میں غلط کام سے ڈرتا ہے کون
اس دور میں انجام سے ڈرتا ہے کون

اب نام خدا ہے بس قسم کھانے کو
اللہ کے اب نام سے ڈرتا ہے کون

ہم راز کو ہم راز نہ جانا جس نے
دم ساز کو دم ساز نہ جانا جس نے

بے چین وہ تا عمر رہا اے ناؔمی
غمّاز کو غمّاز نہ جانا جس نے

میں بادہ کدے کی راہ سے ہو کر گزر گیا
ورنہ سفرِ حیات کا کافی طویل تھا (عدمؔ)

تابش جلبی

معرفت ڈاکٹر کشیپ، گمنا روڈ، ممبئی ۱۰۰۰۰۴

اس سے جو کہو بدلیں اب ہے جانا
کھاتی نہیں اس فکر سے پہروں کھانا

پوچھو کہ تجھے چاہئے تحفہ کیسا
کہتی ہے مری یاد ہی لیتے آنا!

پہنا ہی نہیں اس نے پسندیدہ ہار
سمجھے ہوئے نفی حسن کی جسکو وہ بہار

ازراہِ مذاق کہ دیا تھا اک روز
ہے حسن خدا داد پہ گہنا بے کار

ہنستے ہوئے آ بیٹھی ہے میرے پاس
دیتی مزہ اور ہی لہجے کی مٹھاس

ہر رخ سے مجھے دیکھ کے خوش ہوتی ہے
جب اس کی پسند کا پہنتا ہوں لباس

ہے لحن گلو سوز بھی دلکش اک بین
تحسین کے لائق ہے سروں کی تزئین

ہوتی ہے جو نغمہ ریز مدھم لے میں
گاتے ہوئے رک جاتی ہے سینے کی مشین

آمد کی خبر ہے ساز دل پر مضراب
تحریر مری پڑھ کے ہے کیسی بے تاب

اس طرح وہ کر رہی رہ رہ کر پیار
خط چومتا پھرتا ہے عارض کے گلاب

ہر روز اٹھے اور اندھیرے سے نہائے
بھیگے ہوئے بالوں کو کچھ دیر سکھائے

باندھے ہوئے جوڑے کا تعویذ بھرے
اس ڈر سے کہ آسیب نہ کوئی لگ جائے

کتنی ہی کیوں نہ ہو مصروف مگر
وہ دیکھ ہی لیتی ہے مجھے جی بھر کر

میلی سی نظر آتی ہے جب بھی تصویر
کر دیتی ہے صاف آنچل سے گردِ نظر

کرتا ہوں کبھی جو تلخ لہجے میں خطاب
کر دیتی ہے ٹھنڈا وہ مرا جوشِ عتاب

ہو جاتی ہیں کافور جبیں کی شکنیں
ہنس کر دیتی ہے ترش روئی کا جواب

کرتا ہوں کبھی جو تلخ لہجے میں خطاب
ہو جاتی ہے جذبات سے مغلوب شتاب

سینے سے نہ جب تک میں لگا لوں اسکو
رکتا ہی نہیں گرم اشکوں کا سیلاب

لپٹے ہوئے پاتی ہے تو آتی ہے شتاب
کچھ اور ہی ہوتا ہے اندازِ خطاب

کہتی ہے کہ منہ اپنا سنگھاؤ پہلے
اک روز جو دھوکے سے پی لی تھی شراب

جادو مری باتوں کا چلتا ہی نہیں
غنچہ دلِ محزوں کا کھلتا ہی نہیں

ہو جاتا ہے اس سے جب بھی کوئی قصور
سر جیب خجالت سے نکلتا ہی نہیں

کیسی ہی کیوں نہ مصروف گھڑی
کتنی ہی کسی کام کی جلدی ہو پڑی

رکھتا ہوں سرِ شام جو میں گھر میں قدم
آنچل سر پر لئے وہ رہتی ہے کھڑی

اصراف کے انجام سے چونکاتی ہے
ہمسائے کی تاریخ کو دہراتی ہے

ہوتا ہے کسی ماہ میں جو خرچ سوا
پہروں وہ مجھے بیٹھ کے سمجھاتی ہے

ملتی ہے نظر اس سے جب بھی لبِ بام
کرتی ہے، وہ خود پہلے آغازِ کلام

تعظیم کو جھک پڑتی ہیں نازک پلکیں!
گل ریز تبسم کیا کرتا ہے سلام!

رُباعیات

رشید اعجاز

پانی ہی پانی ہے ہر رنگ میں تُو
تہہ داری تیری ہے جھرنا ہو کہ جُو
گہرائی میں جھانکوں، آب نمکیں!
گیرائی میں دیکھوں تو لال لہو!

پتّے تک چپ چاپ ہوائیں خاموش
سرتاسر آوازہے مہجورِ گوش
پہنچا دو بستی میں خبر یہ فی الفور!
جنگل کا جنگل ہی پڑا ہے بے ہوش

رکھتا ہے زباں جو اُسے تقریر بڑی
خامے کے پرستار کو تحریر بڑی
دونوں سے جو عاری ہے اُسے آہ زواہ
کہتے ہیں تہی دست کو تقدیر بڑی!

معدے کی ٹھنڈک ہے شکر آٹا دال
مانگے اُسیرِ "شوق" کتابی چوپال!
اک بلو ڑھی ہے جیب جواں سارے خرچ
دو آنکھوں میں دھول زمانے کا حال

غنچے کی بے تابی گائے گی سڑک
ٹھہریں تو تلوؤں کو کھائے گی سڑک
یہ کس نے سوچا تھا اعجاز بھلا!
مکتب سے مقتل تک جائے گی سڑک

عطّار مہر

ذوالنبری

پایا ہے قلم تو نے تو اعجاز دکھا
رکھتا ہے اگر ساز تو آواز سُنا
ظلمت کی نقابوں کو الٹ دے اے مہر
زریں لباسوں میں چھپے راز بتا

کرتے ہیں نمو اپنی گلابوں کی طرح
پاؤ گے انہیں مہر سرابوں کی طرح
ہوتے ہیں زمیں بوس "تکبّر پیکر"
فرعون تو مٹتے ہیں حبابوں کی طرح

اس دورِ کشاکش میں نئی پیاس جگا
چھوڑے جو دلوں کو وہی احساس جگا
دھڑکن کے سُر تال سے محروم ہیں دل
مرجھائی ہوئی آس میں الماس جگا

شہروں میں ہے جنگل میں بھی مشہور ہے تو
شہ رگ سے بھی نزدیک ہے منظور ہے تو
موسیٰ جو یہی کہتے تو ہوتا نہ گلا!!
ہم تیرے ہیں کیوں بندوں سے مستور ہے تو

گر ذہن کو چھوئے گا شیطان تمام
گھل جائے گا انسان میں حیوان تمام
جس سوچ پٹاری میں تعصب کا ہو ناگ
ہو جائے گا زہر آب وہ انسان تمام

فائدہ کیا کرے صحبت جو نہ ہو استعداد
رہ کے گلشن میں کبھی زاغ خوش الحاں نہ ہوا (ناسخ)

ثلاثیات

اظہار مسرت

۱۴۴۴، رام گنج بازار، جے پور - ۳۰۲۰۰۳

آج آخر مری خوش فہمی کا جادو ٹوٹا
میں سمجھتا تھا جسے اپنے بدن کا سایہ
وہ بھی تنویر کا منت کش احسان نکلا

شخصیت ، کے ہی تاریک نگر ہوتی ہے
شمع ہوتی تو ہے خود نور کا مخزن لیکن
شمع بجھ جاتی ہے تب جا کے سحر ہوتی ہے

سادہ لوحی کی بعد عمر سزا دیتے ہیں
کتنے کم ظرف ہیں یہ اونچی عمارت کے مکیں
اہل فن ہاتھ کا سورج بھی چھپا دیتے ہیں

زیست ہے رنگ ہے صحرائی اجالوں کی طرح
کتنے ناآدہ کن ہوس کی سزا پائی ہے
ہم مگر آج بھی زندہ ہیں خیالوں کی طرح

ہر ایک دوسرے کی نظر میں بدچلن ہے
ہر لب سے ہوتی ہے چیکاریوں کی بارش
ہر شخص کے بدن پر کاغذ کا پیراہن ہے

خاک سے اٹھ کے خدایا یہ قمر تک پہنچا
کتنی صدیوں سے رواں ہے یہ انسان لیکن
زیست کے در سے فقط موت کے گھر تک پہنچا

روشنی کون کس کو دیتا ہے
شام ہوتی ہے جب تو سورج بھی
اپنی کرنیں سمیٹ لیتا ہے

دو پڑوسی جو ملک ہوتے ہیں
ان کے بچھڑے ہوئے بھی رشتے
سرحدوں سے لپٹ کے روتے ہیں

خود سے منہ موڑنے سے کیا حاصل
گھر کے باہر بھی آئینے ہیں بہت
آئینہ توڑنے سے کیا حاصل

ساتھ رہ کر جدا سمجھتی ہے
چھین لوں جسم کا لباس ابھی
زندگی خود کو کیا سمجھتی ہے

آپ اپنا پیام وہ لائے
کون پیغمبروں کی سنتا ہے
اب اگر آئے تو خدا آئے

قمر اقبال

مدیر معاون، روزنامہ اورنگ آباد ٹائمز، بڈی لین
اورنگ آباد (مہاراشٹر)

تثلیثات

موت کا اعتبار کرتا ہوں
زندگی جانے کب دغا دے جائے
اس لیے خود سے پیار کرتا ہوں

زندگی دردو غم کا ڈیرا ہے
اپنی خوشیاں کہاں تلاش کروں
ہر قدم پر مہیب اندھیرا ہے

غم کے سینے میں جو اتر جائے
ملنے والی خوشی کو ٹھکرا کر
ساری دنیا میں نام کر جائے

وہ بڑا خوش نصیب ہوتا ہے
پیار ہو جائے رنج و غم سے جسے
عشرتوں کا نقیب ہوتا ہے

جب جدائی نصیب ہوتی ہے
ہلکا ہلکا سا درد اٹھتا ہے
دل کی حالت عجیب ہوتی ہے

آپ بھی کیا کمال کرتے ہیں
سیدھی سادھی سی بات پر مجھ سے
ٹیڑھے میڑھے سوال کرتے ہیں

دلدار ہاشمی
۰۶۴ ایروڈا پونہ ۶

نشۂ دولت کا بد اطوار کو جس آن چڑھا — سر پہ شیطان کے اک اور بھی شیطان چڑھا (ذوق)

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں — رنجِ حسد ہے جان سے جب تک کہ جان میں (ناسخ)

بہ جز احساس کہے مرے اندر　　برق ہے آفتاب ہے کیا ہے ؟ (محبوب راہی)

باب ۱۱
یادیں

ترتیب

مرے لبوں پہ شکوۂ تقدیر تو نہیں ذکرِ مآلِ گردشِ ایام ہی تو ہے (عتیق احمد عتیقؔ)

عکسی برنی

ابھی بجھا ہے ہوا سے غم کی چراغ ہستی کا جلتے جلتے
قضا کے سائے میں دم لیا ہے پہنچ کے راہی نے چلتے چلتے
قدم قدم تیرگی الم کی، نفس نفس یاس کا اندھیرا
چھپے گا مہرِ امید جا کے ستم کی وادی میں ڈھلتے ڈھلتے
تجلیوں نے نقاب ڈالا، چمن کے پہرے کو رات جاگی
پھل کے شاخوں پہ سو گئے ہیں گل اپنی آنکھوں کو ملتے ملتے
عجب تماشہ ہے یہ تلوّن، ذرا میں کچھ ہو، ذرا میں کچھ ہو
رخ اپنا جیسے ہوا بدل دے تپیدہ صحرا میں چلتے چلتے
شریف صورت، ذلیل طینت، لباس مومن، ضمیر کافر
یہ سانپ وہ ہیں جو کاٹ لیتے ہیں آستینوں میں پلتے پلتے
مٹے ہیں آخر کو جور پرور، جہاں میں عکسی یہی ہوا ہے
مگر بلاؤں کا قاعدہ ہے کہ سر سے ٹلتی ہیں ٹلتے ٹلتے

رواں ہوتا ہے اِس بستاں سرا سے کارواں گل کا   چٹکنے کو صبا غنچوں سے کے آوازِ درا سمجھے (ذوق)

بوئے گل

لطیف الزماں خاں، پاکستان

آئندہ فروری میں غالب کا صد سالہ جشن ہوگا۔ آپ نقوش کا غالب نمبر تو یقیناً شائع کریں گے؟"

"جی نہیں"

"آپ نے بے حد اہم نمبر شائع کیے ہیں۔ غالب نمبر کیوں نہیں؟"

"جس سے مضمون لکھنے کے لیے کہتا ہوں وہ اپنی مصروفیت کا اظہار کر دیتا ہے" میں یہ کام کر رہا ہوں میں وہ کام کر رہا ہوں"۔ نہیں جناب۔ میں غالب نمبر نہیں چھاپوں گا۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد میں نے کہا "میرے پاس چند غیر مطبوعہ اور مطبوعہ مضامین ہیں ان کا انتخاب کر لیجیے۔ نقوش کا غالب نمبر ضرور چھاپیے۔"

سرخ و سپید رنگ، گھنی بھنویں جو پیشانی پر سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ناک لانبی لیکن نتھنے جیسی پھلواری رکھی ہو، آنکھیں متجسس و متلاشی، سیاہ بال (بعد میں معلوم ہوا کہ خضاب حد درجہ سلیقہ سے استعمال کیا گیا تھا) لمبے لمبے ہاتھ پاؤں۔ ایک شانہ جھکا ہوا، نگاہ نیچی، نہایت اعلیٰ درجہ کا سوٹ پہنے ہوئے۔ باتوں میں اختصار ــــ طفیل صاحب سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔

"میں آپ کے ساتھ ملتان چلوں؟"

یوں غالب نے طفیل صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ جب تک میں ان سے ملا نہیں تھا، میں ان سے سخت برہم تھا۔ میں نے انھیں کئی خطوط لکھے تھے مگر جواب نہیں آیا تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ اکثر خطوط کا جواب نہیں دیتے اور نقوش میں کیا چھپنا چاہیے اور کیا نہیں چھپنا چاہیے اس کا فیصلہ تحریر کو پڑھ کر وہ خود کرتے ہیں۔ کوئی شخص اس سلسلے میں دخیل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے دن جب وہ میرے ہمراہ ملتان چلنے کے لیے لاہور اسٹیشن پر پہنچ گئے تو میری برہمی اور رنجش ختم ہو گئی۔ طلب ادب کی لگن، شوق اور حوصلہ، خلوص، مقصد سے لگن اور حقیقت پسندی کی روشن مثال میرے سامنے آئی۔ محض خط لکھ دینا ہی کافی نہیں ہوتا۔ ادبی پرچے کے معیار کو بلند رکھنے کے لیے سفر کر لینا بھی کافی نہیں اس میں کئی سخت مقام آتے ہیں۔

غالب کی عظمت اور اہمیت کو ہمہ وقت اور ہر جا ذہن میں رکھنے والوں کی تعداد کم نہیں لیکن اس مواد کو یکجا کرنا، اسے سلیقہ سے چھاپنا، حقیقت یہ ہے کہ عظمتِ رفتہ کی بازیافت کے مترادف ہے۔

چونکہ میں فرسٹ کلاس میں سفر کرنے پر نہ قادر تھا نہ آمادہ، طفیل صاحب فرسٹ کلاس کا ٹکٹ ہوتے ہوئے بھی تھرڈ کلاس میں آ بیٹھے تھے۔

محمد طفیل
مدیر "نقوش"
پاکستان

غالب میرا پہلا اور آخری عشق ہے۔ رشید احمد صدیقی صاحب میرے لیے انتہائی محترم ہیں۔ اور محمد طفیل میرا بھائی بھی میرا محسن بھی میرا دوست بھی۔ غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے مفہوم سے ناواقف رہتا۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت کو نہ جان پاتا۔ طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کے مفہوم و معنی سے بیگانہ محض ہوتا۔ یہ تینوں نر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ غالب جیسا نثر نگار اور شاعر تو کیا دنیا کی کسی زبان نے پیدا ہی نہیں کیا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا اچھا بھی برا بھی لیکن جس پامردی کے ساتھ رشید صاحب نے سرسید احمد خاں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے لیے اپنے قلب و ذہن قلم اور تحریر کو استعمال کیا اس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کے نہ ہونے کا یہی ثبوت ہے کہ اصل ایمان و وفاداری بشرط استواری ہوتا ہے۔ میں تو رشید صاحب کی نثر کو غالب کی نثر کے بعد سب سے اچھی نثر سمجھتا ہوں۔

نقوش پر بھی ہر طرح کا وقت آیا لیکن جس استقامت کے ساتھ طفیل صاحب نے اسے جاری رکھا اور ہر شمارہ کو خاص شمارہ بنا دیا۔ یہ کام ایک نرہی کر سکتا تھا کہ حریفِ مے مرد افگن عشق ہونا ہر ایک کو نصیب نہیں۔ اردو رسائل کے جو ایڈیٹر گزرے ہیں یا جو موجود ہیں ان میں سے اکثر مصلحت یا تنگ نظری

نہ چھوڑ تو کسی عالم میں راستی کہ یہ شے
عصا ہے پیر کو اور سیف ہے جواں کے لیے (ذوق)

کا انتظار رہے ہیں۔ طفیل صاحب نے نقوش کا ایک معیار متعین کیا۔ اس بلندی سے یہ کبھی نیچے نہیں اترے ایک راستہ ایک منزل، ایک طریقِ فکر ایک طرزِ استدلال، جو خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہے۔

ان حضرت کو نقوش سے کس درجہ عشق ہے اس کی ایک مثال ملاحظہ کیجئے۔ میں لاہور جاؤں تو قیام انہی کے یہاں ہوتا ہے۔ میں جاتے ہی یہ اعلان کرتا ہوں کہ فلاں ٹرین سے واپس جاؤں گا لیکن طفیل مجھے کبھی اس ٹرین سے نہیں آنے دیتے۔ ایک مرتبہ یہ ہوا کہ صبح سے شام اور شام سے رات ہو گئی طفیل صاحب نے بول کر نہ دیا۔ جب رات کے دو بج گئے تو رام پور سے آمدہ ایک پوسٹ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ ایک خود ساختہ ماہرِ غالبیات اکبر علی خاں نے لکھا تھا کہ اگر نو دریافت دیوانِ غالب شائع کرنا چاہتے ہو تو فلاں حکیم صاحب کے پاس شرائط نامہ ہے اسے پڑھ لو۔ ان ماہرِ غالبیات کو اور ان کے والد مرحوم کو طفیل صاحب کتابیں ہی نہیں بھیجتے رہے نقوش کا ہر شمارہ بھی بھیجا ہے بلکہ مالی امداد بھی کرتے رہے تھے اور ماہرِ غالبیات شرائط نامہ دکھا رہا تھا۔

ہم دونوں حکیم صاحب کے پاس شرائط نامہ پڑھنے پہنچے۔ بڑے میاں نے کاغذ ہمارے ہاتھوں میں نہ دیا دور سے پڑھا۔ میرا خیال ہے کہ جو سرمایہ کسی بھی شکل میں اس زمانہ میں تھا یا آج ان کے پاس ہے وہ اگر سارا کا سارا بھی دے دیتے تو شرائط پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ یہ حضرت اس بات پر آمادہ تھے کہ سب کچھ فروخت کر دیا جائے اور نقوش کا انتہائی شاندار اور دیدہ زیب غالب نمبر چھاپ دیا جائے میں نے کہا" ہم ایک آزاد ملک کے آزاد شہری ہیں ہمیں کسی شرائط نامہ کی ضرورت نہیں۔ اگر غالب اکبر علی خان کے نام بیاضِ غالب کا ترکہ چھوڑ جاتے تو اور بات تھی"۔

خدا نے اب سامان پیدا کر دیا کہ نو دریافت کلامِ غالب کا فوٹو سٹیٹ ہاتھ آ گیا۔ برصغیر میں ہم دونوں کے سوا کسی کو معلوم نہ تھا کہ نقوش میں "بیاضِ غالب بہ خطِ غالب" شائع ہو رہی ہے۔ میں نے کہا: "طفیل بھائی، اس بیاض کو کتابی شکل میں کیوں چھاپ نہیں چھاپ دیتے؟" بڑی متانت اور سنجیدگی سے بولے۔ "لطیف صاحب، اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قرآن نازل فرماتا تو میں اسے نقوش میں چھاپتا"

یہ ہے نقوش سے عشق کا حال۔

نقوش غالب نمبر ایک جس کے بارے میں مالک رام صاحب نے دلی سے لکھا تھا کہ ہندوستان نے لاکھوں روپے غالب صدی پر صرف کیا مگر نقوش جیسا غالب نمبر شائع نہیں ہو سکا۔ بیاضِ غالب دریافت ہوئی ہندوستان میں لیکن اسے پہلے شائع کیا طفیل صاحب نے۔ انہی دونوں باتوں سے ان کی شخصیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ بعد میں ہندوستان میں بیاض چھپی لیکن قیمت تین سو روپے تھی۔ نقوش میں بیاض کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تھا اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی۔ تجارت اور خدمت میں فرق تو ہونا ہی چاہیے تھا۔ ہندوستان اور پاکستان میں دیگر رسائل نے بھی غالب نمبر شائع کئے ہیں۔ مگر مولوی مدن کی سی بات کہیں نہیں پائی جاتی ایسی ہی باتیں طفیل صاحب کی سیرت کو بھی اجاگر کرتی ہیں۔ غالب پر جو کچھ شائع ہو میں یہ سمجھتا ہوں کہ لکھنے والے نے مجھ پر احسان کیا۔ نقوش کے غالب نمبر پا کر جو خوشی میں نے محسوس کی اس کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ ان غالب نمبر کو اولیت اور اہمیت اس لیے دیتا ہوں کہ اول تو معاملہ غالب سے عشق کا ہے دوم یہ کہ جن حضرات نے غالب صدی پر چھپنے والے رسائل کے غالب نمبر پڑھے ہیں وہ گواہی دیں دیں گے کہ نقوش ہی کا پلہ بھاری ہے۔

طفیل صاحب اور نقوش دونوں نے بڑے حاسد پیدا کیے ہیں۔ حاسدوں کو جہان میں راحت نہیں ہوتی اور جب تک جان میں جان ہے رنج حسد رہتا ہی ہے۔ لیکن حاسدوں کے لیے شاید ہی کبھی انھوں نے زبان سے ناشائستہ لفظ ادا کیا ہو۔ ایک مہذب اور معقول انسان کا لہجہ نہ اشتعال انگیز ہوتا ہے اور نہ ہی وہ شائستگی کو ہاتھ سے جانے دیتا ہے۔ اکثر لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ طفیل صاحب خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ اول تو ہر خط اس قابل ہوتا کہاں ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ دوم یہ کہ لکھنے والا بھول جاتا ہے کہ اگر ایک رسالہ کا ایڈیٹر اسلوب، الفاظ اور آواز کو نہیں پہچانتا تو وہ ایڈیٹر کیا ہوا۔ کچھ لوگوں کو یہ شکایت ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں نہیں چھپتی ایسے لوگ نہیں جانتے کہ ادبی لطافت، موضوع اور نفسِ مضمون، تحریر کی شائستگی اور پاکیزگی

اور اس کے کلاسیکی حسن کو طفیل صاحب ایک نگاہ ڈال کر جان لینے میں اس کے مرتبہ کو پہچان لیتے ہیں۔ وہ ہر تحریر کو دو مرتبہ ضرور پڑھتے ہیں۔ ایک اس وقت جب وہ نقوش میں اشاعت کے لیے منتخب کر لی جائے۔ دوسری بار اس وقت جب کتابت ہو جائے۔ انتشار اور بدنظمی ادب میں ہو یا کسی اور شعبہ میں انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایسے بدمذاق لوگوں سے کٹ کر بقول منٹو وہ "پابو کی گلی" میں مڑ جاتے ہیں۔ تاکہ بداخلاقی اور بدمذاقی کے چھینٹوں سے خود کو بچا سکیں۔

یہ جب گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو صبح ہی چل پڑتے۔ تانگہ میں سوار ہوتے اور نقوش کے دفتر میں آ بیٹھتے۔ سوائے ضروری کام کے ہرگز دفتر نہ چھوڑتے دفتر اس انداز سے ترتیب دیا ہے کہ منہ مغرب کی جانب رہتا ہے۔ کعبہ کی طرف پیٹھ نہیں کرنا چاہتے سیدھے ہاتھ پر ایک دقیانوسی کا بک ہے جس میں نہ جانے کب کب کے مسودات، کتابت شدہ، اور غیر کتابت شدہ بھرے پڑے ہیں۔ جنوب میں آنے والے رسائل اور کتب کے ڈھیر پڑے رہتے ہیں اور اکثر ادیب اس ڈھیر میں سے اپنی پسند کی کتاب یا رسالہ اٹھا لیتے ہیں۔ وہ ٹک ٹک دیکھتے رہتے ہیں اور کچھ نہیں کہہ پاتے۔ خود میں نے اس ڈھیر سے کتابیں اٹھائی ہیں۔ ان کی پشت پر مشرق ہے۔ وہاں بھی اخبارات اور رسائل جمع رہتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک میز پر خطوط، مضامین نظمیں، غزلیں اور مقالات کے علاوہ خدا جانے کیا کیا جمع رہتا ہے۔ اس میز کو میں نے کبھی سلیقہ سے سجا ہوا نہ پایا۔ مگر کمال یہ ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے یہ کابک یا میز سے نکال لیتے ہیں دوسرا شخص خواہ کتنا ہی تلاش کرے اسے مطلوبہ چیز نہ ملے گی۔ کمرہ تاریک ہے۔ روشن دان تک نہیں۔ آتے ہی بلب روشن کر دیں گے۔ اور کرسی پر بیٹھتے ہی ویسٹ پیپر باسکٹ میں تھوکنا شروع کر دیں گے۔ اور یہ عمل دن بھر جاری رہے گا۔ ہر آنے جانے والے کو دیکھتے رہیں گے جیسے چین آسکتی دیکھتی تھی۔ خطوط اور خاکے اسی دفتر میں بیٹھ کر لکھے گئے ہیں۔ میرزا ادیب آ گئے تو ان سے ڈراموں پر گفتگو ہو رہی ہے۔ اسلم کمال آ گئے تو جدید مصوری پر تبادلۂ خیال ہو رہا ہے۔ پریس کا مشین مین آ گیا "باؤجی" تو باؤجی اسے بھی جواب دے رہے ہیں۔

بند آنکھیں کیے جاتا ہے کدھر تو کہ تجھے
ہے ترا نقشِ قدم چشم نمائی کرتا (ذوقی)

کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کتنے ہی لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ ہر ایک سے اس طرح باتیں کرینگے کہ موجود ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ مخاطب وہی تھا۔ ناک پر عینک رکھے یہ لکھتے بھی رہینگے کوئی جانے لگے گا تو کھڑے ہو کر ہاتھ بھی ملا ئینگے اور پھر لکھنے لگینگے ۔

انہماک کی ایک صورت وہ ہوتی ہے جب ٹی وی پر کرکٹ ٹیسٹ میچ دکھایا جا رہا ہو یا ریڈیو پر کمنٹری نشر ہو رہی ہو ۔ جب پاکستانی ٹیم کھیل رہی ہو تو ان کا چہرہ گلنار ہو جاتا ہے ۔ انہیں کرکٹ کی ہر اصطلاح کا علم ہے ۔ ظہیر عباس بیک وقت فٹ پر سکوائر کٹ اور ماجد خاں کور ڈرائیو پر لاجواب شاٹ کھیلتے ہیں جاوید (میاں داد اس کے والد مرحوم کا نام ہے) یو انیٹ پر کھیلتے ہیں لیکن آوٹ بھی وہیں ہوتے ہیں۔ عمران خان کے سٹرائڈ دیکھ کر اس کی بال کی تیزی کا اندازہ ہوتا ہے ۔ بڈ آن ، بڈ آف ، ٹیپ ٹائن لیگ ، اِن سوئنگ اور آؤٹ سوئنگ ، لیٹ کٹ ، آوٹ سائٹ دی لیگ سٹمپ ، غرض ہر اصطلاح کا ذکر اس خوبی سے کرینگے کہ سننے والا حیران ہو جاتا ہے ۔ کرکٹ کمنٹری سنتے ہوئے یا ٹی وی پر میچ دیکھتے ہوئے یہ کسی قسم کی دخل در معقولات برداشت نہیں کر پاتے ۔ گھر پر ہوں تو ایسے مواقع پر کمرے میں بند ہو جاتے ہیں ۔ بھابی جان یا ہوٹل چائے بنا کر لا دیں تو احساس شکرگزاری سے ان کے چہرہ پر شفق پھوٹ پڑتی ہے ۔ ایک روزہ میچ ہو تو پھر ان کی بھنویں اور زیادہ گھنی ہو جاتی ہیں۔ یہ تن کر بیٹھ جاتے ہیں ، پیشانی پر شکن پڑ جاتے ہیں اور خون کا دوران بڑھ جاتا ہے ۔ مدمقابل اگر اچھا کھیل ہو رہا ہو تو اسے بھی داد دینگے ۔ ان کا خیال ہے کہ کھیل خواہ کوئی کھیلے اس سے لطف اندوز ہونا چاہئے ۔

جب کوئی صاحب دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو یہ پوچھینگے " چائے ؟" موسم گرما ہو تب بھی کہینگے "چائے" جواب خواہ کچھ ہو دوسرے کے لیے کولڈ اور اپنے لیے چائے منگا لینگے ۔ بات دراصل یہ ہے کہ چائے بہت پیتے ہیں ۔ اچھی بری کی قید نہیں ۔ جب مل جائے اور جہاں مل جائے جیسی مل جائے چائے نہیں چھوڑینگے ۔ جب دفتر کی اوپر والی منزل میں قیام تھا ۔ بھابی جان اس وقت ضرور یاد دلاتیں جب یہ نیچے سے اترتے " تسی بچار دی چائیں پینی ہے " وہ دو چار مرتبہ چائے بنا کر بھیج دیتیں لیکن یہ "بچار" کی چائے پیئے بغیر باز نہ آتے ۔

ڈاکٹر سلیم اختر بتاتے ہیں کہ اکثر ادیبوں کا یہ خیال ہے کہ جو طفیل صاحب ہوٹلوں میں نہیں جاتے اور عصر جدید کے ادباء و شعرا کے ساتھ وقت نہیں گزارتے وہ اس لیے کہ روپیہ خرچ نہیں کرنا چاہتے معاملہ اس کے برعکس ہے ۔ ایک مرتبہ ہم دونوں مجنوں گورکھپوری صاحب سے ملنے گئے ۔ دوران گفتگو مجنوں صاحب نے فرمایا " میں ہندوستان سے یک بینی و یک بیوی آیا تھا ، لاہور میں اگر طفیل نے میری جیب میں پانچ سو روپے نہ ٹھونس دیے ہوتے تو میں کراچی نہیں پہنچ سکتا تھا " یہ سنتے جاتے ہیں اور شرماتے ہیں ۔ فوراً بات کا رخ موڑنا چاہا لیکن مجنوں صاحب کو کون روک سکتا تھا " میں نے سوچا تھا نقوش کے لیے لکھتا رہوں گا ۔ لیکن میری بدتوفیقی کہ اب تک کچھ نہیں لکھ سکا ہوں ۔ " طفیل چند لمحوں کے بعد اٹھ کھڑے ہوئے " پھر حاضر ہوں گے ۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا ہے "

ایک روز ہم دونوں نقوش کے دفتر میں بیٹھے تھے ۔ ایک صاحب آئے ۔ بدن پر چیتھڑے ، آنکھیں چڑھی ہوئیں ۔ ہاتھ پاؤں پر میل ، ٹانگوں پر غلاظت لتھڑی ہوئی " آیئے آیئے ساغر صاحب ! " ہاتھ ملاتے ہوئے ان کے ہاتھ میں کچھ نوٹ تھما رہے تھے ۔ میں نے پہلی اور آخری بار ساغر صدیقی کو دیکھا تھا ۔ طفیل صاحب کہنے لگے " شراب کی طلب ہو تو آ جاتے ہیں ۔ کلال نہ ان کے مرتبہ سے واقف ہیں نہ منٹو کی عظمت سے آشنا تھے ۔ خدمت تو کرنی ہی پڑتی ہے "۔

طفیل صاحب کے ایک استاد ہیں ۔ انہیں بھی میں نے نقوش کے دفتر ہی میں دیکھا ۔ مجھے تو یوں محسوس ہوا جیسے منٹو کا کردار البشر سنگھ سامنے کھڑا ہو " ایوب خاں دی پٹڑ چڑاک ـــــ " دہائی کیا کہتے تھے ۔ اپنے استاد کے سامنے مودب بیٹھے ہیں اور خدا جانے کب سے ان کی ہی نہیں سارے گھر کی ضروریات کا خیال کرتے ہیں ۔

بمبئی سے عصمت چغتائی آئیں ۔ میں ٹیلیفون پر ان سے کہہ رہا تھا " آپ جلد آیئے "

" ارے بھائی کیسے آؤں ۔ کسی پبلشر سے کہو کہ میری کتابیں بغیر اجازت چھاپتے رہتے ہو کچھ رقم دلواؤ تو لاہور اور اسلام آباد تک ہو آؤں "

مجھے معلوم ہے کہ پبلشر دلی کا ہو یا لاہور کا کراچی کا ہو یا بمبئی کا ، علی گڑھ کا ہو یا راولپنڈی کا ، اسے تو صرف پیسہ چاہئے ۔ میں نے ٹیلی فون پر طفیل صاحب کو ساری گفتگو سنا دی ۔ کہنے لگے " یار ۔ عصمت آپا سے کہو ایک بار کسی طرح لاہور آ جائیں ۔ سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا "

عصمت آپا لاہور پہنچ گئیں ۔ چند روز قیام کرنے کے بعد وہ اسلام آباد روانہ ہوئیں تو پورا قافلہ ساتھ تھا ۔ کراچی سے عصمت آپا کے ہمراہ مدحت (عظیم بیگ چغتائی کی بڑی صاحبزادی) ڈاکٹر عطیہ (جنھوں نے تیرہ یا چودہ سال کی عمر میں سب سے پہلے سوتے سے اٹھ کر لحاف سنا تھا) کچھ بچے اور میں ۔ سب ریل کار میں سوار تھے ۔ واپسی ہوائی جہاز سے ہوئی اور سب خرچ طفیل صاحب نے برداشت کیا ۔ عصمت آپا نے بتایا کہ کراچی سے لاہور ہوائی سفر کا انتظام طفیل صاحب نے کیا ۔

میں نے اپنے پس انداز کیے ہوئے روپے سے رقم حاصل کی جو اجازت نامہ ملا اس میں میرے اندازے سے رقم کم تھی ۔ شام کو کھانے کے بعد پوچھنے لگے " مولانا ! کیا بات ہے ؟ صورت حال بتلائی چپ ہو رہے ۔ دوسرے دن صبح اپنے بیٹے جاوید سے کہنے لگے " پتر ، بیڈن روڈ چلنا ہے " میں بھی ساتھ تھا ۔ بنک سے دس ہزار روپیہ نکلوایا " یار ۔ یہ لیتے جانا " میں نے کل رقم بنک میں جمع کرا دی اور ٹھیک ایک ہفتہ کے بعد زکواۃ کاٹ لی گئی ۔ میں نے طفیل صاحب کی رقم واپس بھیج دی لیکن اس دور میں دوست کی یا کسی اور کی ضرورت کا خیال کرنے والے کتنے ہیں ؟ ایسی ہی چھوٹی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ان کی کشادہ قلبی اور فیاضی کا اندازہ ہوتا ہے ۔

حرص و آز انہیں چھو کر نہیں گزرے ۔ میں ایسے بے شمار واقعات سے واقف ہوں جو ان کے صاحب دل اور صاحب نظر ہونے کا ثبوت فراہم کرتے ہیں ۔ ہندوستان سے ایک ماہر غالبیات ڈاکٹر نثار احمد فاروقی تو اسی بار پر آتے ہیں کہ کس طرح نقد اور کتابوں کی شکل میں ان سے وصول کیا جائے وہاں سے سرکاری طور پر بھیجے جائیں اور یہاں سرکاری طور پر اعلیٰ درجہ کے ہوٹل میں قیام ہو تب بھی وہ بستر اٹھا کر طفیل صاحب کے گھر پہنچ جاتے ہیں کہ ہوائی سفر کے لیے روپے اور کتب اسی در سے ملتی

ہر شخص لہو کا پیاسا ہے ہر شخص لگے ہے فریدی ۔ مظلوم کسے ٹھہراؤ گے کس کو قاتل گرداؤ گے (محبوب الٰہی)

ہیں۔ ایسے فریب جو دیدہ و دانستہ کھائے جاتے ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ یہ بات نہیں کہ یہ جانتے نہ ہوں، سمجھتے نہ ہوں۔ سب کچھ جانتے ہیں سب کچھ سمجھتے ہیں لیکن کیا مجال جو گفتگو یا تحریر میں تلخی یا شدید گی آ جائے۔ ہرگز بدمزہ نہ ہوں گے۔ بلکہ مسکراتے رہیں گے اور خندہ روئی سے پیش آئیں گے۔ ان کی خوش طبعی میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ اپنی بذلہ سنجی کو برقرار رکھیں گے لیکن خوش گفتاری میں فرق نہ آنے دیں گے۔ دوسرے شخص کی حرص جوں جوں بڑھتی جائے گی۔ ان کے لہجے کی نرمی اور مزاج کی معصومیت میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ یہی سبب ہے کہ میں طفیل کی "خوبیوں پر جان دیتا ہوں ان کے عیوب سے واقف نہیں۔ یہ بات انسانی کمزوریاں کی وہ کس میں نہیں ہوتیں"۔ لیکن ایسی کمزوریاں جن سے کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا نہ قلم سے نہ زبان سے نہ تحریر سے۔ ان کی حمایت یا مخالفت میں خواہ کچھ کہا جائے یہ کسی قیمت پر اصابت رائے کو ترک کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ کبھی ہوش مندی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے گا۔ یہی ان کی شخصیت کی بڑائی ہے۔

یہ درست ہے کہ ہر تحریر نقوش میں نہیں چھپ سکتی میں ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جن کے دل میں یہ خواہش برسوں سے موجود ہے کہ ان کی تحریر نقوش میں جگہ پا جائے اور بعض اس غم میں گھلے جاتے ہیں کہ ان کی تصویر نقوش کے ٹائٹل پیج پر کیوں نہیں چھپتی اور پھر حاسدوں کا حلقہ بڑھتا چلا جاتا ہے لیکن طفیل صاحب کی نظر انہیں ادبی بددیانتی نہیں کرنے دیتی۔ ناقص اور نارسا تحریر نقوش میں جگہ نہیں پا سکتی۔ ادب کے نام پر رکاکت، اخلاق پستی، تنگ نظری، کھو کھلی اور ناشائستہ روایت، تعصب اور مصلحت آمیزی کا گذر نقوش میں نہیں ہو سکتا۔

جب نقوش کا کوئی شمارہ چھپتا ہے تو یہ حضرت جشن بانٹنے بیٹھ جاتے ہیں۔ جب بیاض غالب بخط غالب کا نقوش نمبر آیا تو تقسیم اور بخشش کا دائرہ اور پھیل گیا۔ میں ایک دن نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے کہا "جی"، طفیل صاحب ٹیلیفون پر ریسیور اٹھاتے ہی یہی دو حرفی لفظ کہتے ہیں۔ "طفیل جی! وہ آواز وہ دار نمبر کہاں چھپا ہے۔ اس واری دو بھیجیں"۔ میں بقول منشو جل کر کباب ہو گیا۔ لیکن ان حضرت نے دو نسخے فوراً بھیج دیے۔ ہندوستان سے ایک ماہر غالب نثار احمد فاروقی آئے تو کئی سو نسخے لے گئے اور وہاں جا کر تین سو روپیہ فی نسخہ کے حساب سے فروخت کیے حالانکہ اس کی قیمت صرف تیس روپے تھی خود میں نے بیاض غالب والے نقوش نمبر کو بہت سے حضرات کو بیس بائیس روپے میں دلوایا تھا۔ میں جھلا گیا۔ اور شکایت کی کہ "آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟"

"یار تم غصہ مت کرو۔ لوگ پڑھیں گے غالب شناسی کا دائرہ وسیع ہوگا۔ نہ پڑھیں گے تو ڈرائینگ روم میں سجائیں گے۔ پھر بھی غالب اور نقوش کا نام روشن ہوگا۔" اسی کو بلند نفسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلوص، حقیقی لگن اور شدید جذبہ کی یہی وہ روش اور تابناک صداقت ہے جو ان کو تمام ایڈیٹروں سے ممتاز و محترم بناتی ہے۔

محکمہ تعلیم کے ایک ڈائریکٹر ایک دن سیدھے گھر آگئے اور حکم صادر فرمایا کہ نقوش کا وہ شمارہ لاؤ جس میں غالب کا دیوان شائع ہوا ہے۔ میں نے طفیل صاحب کو ٹیلی فون کیا پھر خط لکھا۔ جواب آیا کہ "غالب نمبر ختم ہو چکا ہے کوئی نسخہ موجود نہیں ہے کسی سے لوں گا اور واپس نہ کروں گا تمہاری خاطر یہ بھی گوارا کر لوں گا"

میں نے ڈائریکٹر صاحب سے تو کچھ نہ کہا لیکن شکر و سپاس کا جو جذبہ طفیل صاحب کے لیے میرے دل میں تھا اپنی محدود بصیرت کے باوجود کہیں بلند ہو گیا۔

کسی شخص کے ذوق و ذہن کا اندازہ اس کے دستر خوان سے بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان سے جیلانی بانو آئیں یا رام لعل، عصمت چغتائی آئیں یا ڈاکٹر محمد حسن یہ ممکن ہی نہیں کہ طفیل صاحب انہیں مدعو نہ کریں۔ کراچی اور لاہور کے ادبا و شعرا ہی نہیں ملک بھر کے ادیب و شاعر آتے ہی رہتے ہیں۔ ایک روز ٹی ہاؤس سے مسعود اشعر کے ہمراہ میں بھی اٹھا مسعود صاحب کہنے لگے۔ "فاصلہ زیادہ ہے ہم آپ کو طفیل صاحب کے ہاں چھوڑ آئیں"

یوسف کامران صاحب نے کار سٹارٹ کی اور "کشور حسین" کا ذکر کرتے ہوئے جب نیو مسلم ٹاؤن پہنچے تو گویا ہوئے "اچھا! تو یہ ہے طفیل محل" ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ نہ طفیل صاحب گھر پر تھے نہ بھابی جان۔ بڑی بہو زاہدہ خانم نے فوراً چائے کا اہتمام کیا اور اس سے قبل آم پیش کیے صابر اودی اور فرخندہ لودھی نے آموں کو درخور اعتنا نہ سمجھا کہ آم کھانے کے لیے بھی ذوق و ظرف کی ضرورت ہوتی ہے۔ مسعود اشعر اور یوسف کامران صاحب نے آموں کے ساتھ انصاف کیا۔ دونوں صاحب ذوق ثابت ہوئے۔ چائے کی طرف توجہ نہ کی۔ کامران صاحب نے جاتے ہوئے فرمایا۔ "طفیل صاحب سے میرا سلام کہیے گا اور یہ بھی کہ بھائی آم سرد خانے میں رکھنے کی چیز نہیں اسے جس قدر جلد ہو سکے تنور شکم میں منتقل ہو جانا چاہیے۔ اگر وہ یہ کام نہ کر سکے تو یہ سرد خانہ میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔" میں نے دل میں کہا یہ طفیل کے دستر خوان کے کونے کا ایک مختصر ترین حصہ ہے۔ بھابی اور بہوئیں زاہدہ و بشریٰ لذیذ کھانے پکاتی ہیں۔ طفیل صاحب ہر آنے والے کو کھلاتے اور خوش ہوتے ہیں۔ خود بھی اچھا کھاتے ہیں اور اپنی ہومیو پیتھی کے علم کے بل بوتے پر ہر طرح کی بد پرہیزی کرتے ہیں۔

میرے ایک دوست نذیر احمد صاحب ہیں۔ کبھی انگریزی زبان کے بہت اچھے استاد اور اردو افسانے کے بہت اچھے ناقد تھے اب مرکزی سرکار کے بڑے افسر ہیں۔ ادب، منصب و مرتبہ کے بھاری بوجھ تلے دب گیا کچل گیا۔ خدا جانے کیا مرض تھا کہ دنیا بھر کا علاج کرا لیا ٹھیک ہی نہ ہوتے تھے۔ طفیل بھائی کے ایک ہم جماعت اور دوست محمود عالم قریشی صاحب بھی ہومیو پیتھی کے ماہر ہیں ایک صاحب اور تھے ان کا نام میرے ذہن میں نہیں ہے۔ تینوں ماہرین کا بورڈ بیٹھا تھا تشخیص ہوئی۔ طفیل صاحب نے دوا تجویز کی۔ تیسرے دن نذیر صاحب کا پیٹ تین انچ کم ہو گیا۔ شانے جو پتھر کی طرح سخت تھے اور سن تھے ٹھیک ہو گئے۔ طفیل صاحب نے بتایا کہ نذیر صاحب کا کیس بہت ہی ہوپلیس ہو گیا تھا۔

گڑھی شاہو میں رہتے تھے تو ایک شخص کا علاج کیا جس کے تمام بدن سے پانی ٹپکتا تھا۔ وہ امراض خبیثہ کا شکار تھا۔ دوران علاج وہ پھر اس گلی میں چلا گیا جہاں ایسے امراض پرورش

دوستوں کے واسطے ہوتا ہے جو حسن سلوک
ہے وہی دستور میرا اپنے دشمن کے لیے
(حکیم رازی)

پاتے ہیں۔ یہ نالاں ہو گئے اور علاج کرنے سے انکار کر دیا۔ لیکن جب اس کی جان پر آ بنی اور اس کی غربت نے اس قابل نہ چھوڑا کہ وہ دوا اور غذا خرید سکے تو یہ اس کے جسم پر پھاہے رکھتے اور دوا کھلاتے رہے۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گیا۔

گڑھی شاہو والے مکان میں ایک شب میرا گلا اچانک شدید درد اٹھا۔ میں کراہنے لگا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ طفیل صاحب کو تکلیف ہو۔ کراہنے کی آواز سن کر خود آ گئے ہومیوپیتھی کی چند گولیاں پانی میں حل کر کے کلیاں کرائیں اور درد غائب ہو گیا۔

اس سلسلے کی ایک بات اور سن لیجیے۔ حمیدہ ہاشمی کے شوہر کا انتقال لندن میں ہوا۔ تدفین بہاول پور کے قریب کسی خانقاہ میں ہونی تھی۔ خبر ملتے ہی دو کاریں لاہور سے روانہ ہوئیں۔ ایک میں خواتین دوسری کار میں طفیل صاحب اور مرحوم کے ہم زلف۔ خواتین والی کار آگے نکل گئیں۔ ملتان سے دس میل کے فاصلہ پر طفیل صاحب کی کار کا ڈرائیور اونگھ گیا۔ آنکھ کھلی تو موت یقینی نظر آئی۔ بھلا آدمی تھا اور سمجھ دار۔ طفیل صاحب آگے کی سیٹ پر تھے ڈرائیور نے خود کو بچانے کے لیے طفیل صاحب کو اس درخت کے سامنے کر دیا جس سے ٹکرا کر کار چکنا چور ہو گئی۔ ڈرائیور نے تو اردو ادب کو نقصان پہنچانے میں کسر نہ اٹھا رکھی تھی مگر جسے خدا رکھے۔

ایک ٹرک ڈرائیور نے انہیں نشتر ہسپتال ملتان میں پہنچا دیا اور وہی مجھے اطلاع دینے آیا۔ میں جب پہنچا تو جنرل وارڈ میں اس طرح بیٹھے تھے کہ پٹی پیشانی سے گزر کر سر کے پچھلے حصہ کو چھپاتی ہوئی، سر کے درمیانی حصہ سے گزر کر ٹھوڑی کو ڈھانپ رہی تھی۔ کپڑے خون میں لت پت تھے۔ سب سے پہلی بات جو انہوں نے کہی وہ یہ تھی "یار میں انجکشن کسی قیمت پر نہیں لگواؤں گا اور ہاں تم جلدی سے نکس وامی کا تھرمس لا دو اور ڈاکٹروں سے ہرگز اس کا ذکر نہ کرنا"۔ جب تک ہسپتال میں رہے نہ انجکشن لگوایا اور نہ ہومیوپیتھی کی دوا چھوڑی جبھی تو میں کہتا ہوں کہ یہ صاحب عزم و ہمت ہیں اور اپنے مشاہدہ اور تجربہ کی اہمیت سے بخوبی واقف۔

میں نے دو بار طفیل صاحب کو غصہ ہوتے بھی دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ بھابی جان نے ان کے چھوٹے بھائی ملک اکرم کے لیے کچھ کہہ دیا۔ انہیں غصہ آ گیا اور یہ بے باک صداقت کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکے۔ دوسری مرتبہ غصہ اس وقت آیا جب مجھے اسٹیشن پر سی آف کرنے میرے ہمراہ ٹیکسی میں سوار تھے۔ ڈرائیور نے طویل راستہ اختیار کرنا چاہا۔ وقت تنگ ہو رہا تھا ورنہ شاید اسے کچھ نہ کہتے لیکن جب ٹرین کے روانہ ہو جانے کا خدشہ بڑھ گیا تو یہ ڈرائیور پر برس پڑے۔ ایسے موقع پر لاہور میں جو زبان عام لوگ بولتے ہیں اس سے بھی واقف ہیں۔ اس تند و تیزی کے عالم میں بھی تلخی و زہر ناکی نہ تھی دوسرا شخص ہوتا تو بے قابو اور بے کیف ہو جاتا۔ نفرت ہو یا غصہ طفیل کبھی اپنی سطح پر اتر آئیں گے۔ ضبط و تحمل قدرت نے مزاج میں اس درجہ ودیعت کیا ہے کہ وہ ہر حال میں نرمی و ملائمت برتتے ہیں۔

دو مواقع پر بہت گھبراتے ہیں۔ موصوف کو پسینہ آ جاتا ہے حلق خشک اور اکثر آواز بند ہو جاتی ہے۔ ایک موقع تو وہ ہے جب کوئی خاتون ملنے آ جائیں اور دوسرا وہ موقع جب کہیں بر سر محفل تقریر کرنی پڑے یا تحریر سنانی پڑے۔

میں نقوش کے دفتر میں بیٹھا تھا۔ طفیل صاحب مزاج پرسی کو گئے تھے۔ ایک خاتون گلبرگ سے تشریف لائیں اور طفیل صاحب کو نہ پا کر یہ کہہ کر چلی گئیں "پھر حاضر ہوں گی" تھوڑی دیر کے بعد طفیل صاحب آ گئے۔ جب میں نے بتایا کہ ایک خاتون ملنے آئی تھیں تو یک لخت چہرے کا رنگ متغیر ہوا "ہیں! کون خاتون؟ میں ابھی آیا" پھر جو گئے تو چار بجے ڈرتے ڈرتے لوٹے "یار معاف کرنا۔ میں ضروری کام سے چلا گیا تھا۔ بھوک لگی ہوگی۔ چلو ذرا فٹافٹ چرغہ لے آؤ" کھانے کے دوران میں نے کہا "وہ کالی کلوٹی خاتون دو مرتبہ آ چکی ہیں" "یار۔ کھانا کھا لینے دو۔ ورنہ میں پھر ضروری کام سے چلا جاؤں گا"۔

ایسی خواتین جو ادب کی آڑ میں ملنا چاہیں یہ ان سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ لیکن جو ادب تخلیق کرتی ہیں ان سے یہ گھنٹوں باتیں کر لیتے ہیں شکیلہ اختر ہوں یا اختر جمال، عصمت چغتائی ہوں یا ہاجرہ مسرور و خدیجہ مستور۔ یہ سب ہوں مگر ایسی خواتین نہ ہوں جنہیں دیکھنا اور ملنا تو در کنار ذکر سنتے ہی ضروری کام یاد آ جاتا ہے۔

طفیل صاحب نک چڑھے بھی ہیں۔ اپنی پہ آ جائیں تو کسی کو نہیں گردانتے لیکن ایسا ادبی زندگی میں دو بار ہی ہوا ہے۔ قرۃ العین حیدر کے بڑے ناول نگار اور بڑی افسانہ نگار ہونے میں جو شبہ کرے وہ کافر۔ شنید ہے کہ وہ بہت سنوب ہیں ہوں گی۔ کوئی ایسا پیچ آ پڑا کہ مس حیدر اور طفیل دونوں اپنی جگہ پر اڑ گئے۔ اور پھر یوں ہوا کہ قرۃ العین حیدر کے آنسو نکل پڑے۔ طفیل چونکہ مزاجاً صرف محبت اور خلوص کی زبان جانتے ہیں اور بات کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ یہ مس حیدر سے بھی زیادہ نک چڑھے ہو گئے لیکن دونوں کو جلد احساس ہوا کہ "بات ایسی نہیں کہ ہم سے کہیں" لہٰذا وہ رشتہ پھر استوار ہو گیا جس کی بنیاد ادب پر ہے۔

نومبر ۶۳ء میں گلڈ کے نئے سیکریٹری جنرل کا انتخاب ہونا تھا۔ ہم سب کراچی پہنچے ہوئے تھے۔ ایک دن ایک صاحب آ گئے۔ ان کا نام لطف اللہ خاں تھا۔ ان حضرت کو عجیب و غریب شوق تھا۔ انھوں نے اپنے گھر پر آوازوں کی لائبریری بنا رکھی ہے۔ میں نے اس سے قبل اور اس کے بعد بھی دیکھی نہ سنی کہ آوازوں کی بھی لائبریری ہوتی ہے۔ وہ طفیل صاحب کی آواز ریکارڈ کرنا چاہتے تھے اور یہ آمادہ نہ ہوتے تھے۔ میں نے بہلا پھسلایا اور ہم سین گپتا روڈ کاسمو پولیٹن سوسائٹی کراچی پہنچے۔ لطف اللہ صاحب کے صاحبزادے اپنے والد محترم ہی کے مرض میں گرفتار تھے۔ سٹوڈیو میں کل چار افراد تھے آلات اس قدر حساس کہ ہلکی سے ہلکی آواز کو بھی گرفت میں لے لیتے تھے۔ طفیل صاحب نے اپنا کوئی خاکہ پڑھنا شروع کیا تو بلا مبالغہ سات مرتبہ پانی پیا۔

کسی بھی ادارہ کو چلانے کے لیے بڑے مضبوط اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ چار آدمی یک جان اور یک زبان تھے۔ فرائض کم سے کم تر ہوتے جاتے ہیں اور حقوق کا مطالبہ بڑھتا جاتا ہے۔ نقوش پریس میں بعض لوگ سالہا سال سے کام کر رہے ہیں اور آج تک یہ نوبت نہیں آئی کہ چھاپہ خانہ بے حیائی اور بد اصولی سے کسی کو نقب زنی کرتے ہوئے دیکھا گیا ہو۔ اس میں انتظامی صلاحیت سے کا دخل اتنا نہیں جتنا حسن سلوک کا۔

پریس میں قرآن مجید کے سیپارے چھپ رہے تھے۔ ایک کارکن روز سیپارے چھپاتا اور بازار میں فروخت کرتا تھا۔ یہ بات طفیل صاحب کے علم میں تھی۔ انہوں نے اس کی تنخواہ اور بڑھادی وہ پھر بھی چوری سے باز نہ آیا لیکن یہ اسے الگ نہ کرسکے۔ الگ کرسکتے ہی نہ تھے۔ لندن جو ایک شہر ہے دنیا میں انتخاب کر سیاست داں ہو یا ادیب، مورخ ہو یا مدرس، کارل مارکس ہوں یا سکندر مرزا۔ لندن جو از خود جائے وہ بھی۔ لندن سب کو پناہ دیتا ہے۔

طفیل صاحب کے بیٹے جاوید نے پریس کا چارج سنبھالا تو سیپارہ چوری کرنے والے ہی کو نہیں ٹنشن کے پرزے تبدیل کرنے والے سے کر کاغذ چرانے والے تک سب کو نکال باہر کروا کیا۔ لندن کسی کا کچھ بگاڑ تو بگاڑے ان کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ یہ جیسے گئے تھے ویسے ہی گھر لوٹ آئے۔ نہ سفر نامہ لکھا نہ بتان عجم کا حال سنایا۔ کوئی ایران میں اور کوئی اندلس میں اجنبی ہوتا ہے۔ یہ ہر جگہ اجنبی ہیں سوائے گھر کے۔

لندن سے آتے ہی پریس کا حال معلوم ہوا تو سخت پریشان ہوئے اور اداس بھی۔ پریس کے چوکیدار کو بلایا اور باری باری ہر کارکن کے گھر بھیجا "اسے دے بچے آپ پریشانی ہے ہوئے گا"

سب سے بڑے بیٹے فاروق کی شادی کی۔ بڑی دھوم دھام سے دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا۔ ایک چری تھیلا میرے سپرد کیا جو نوٹوں سے بھرا تھا "خوب خرچ کرو" مجھے کرالی جاملک کی پسند نہ تھی" یار — دوسری بوری خرید لو" فوراً نئی بوریاں آگئیں۔ دولہا میاں کو سلامی مل رہی تھی" تم ہی وصول کرو، تم ہی لکھو" حفیظ جالندھری صاحب نے سہرا لکھا" یار تم پڑھو" طفیل صاحب — فلاں صاحب کو دعوت نامہ بھیجا ہے؟"

"یار تم سے دوستی اسی لیے تو ہے کہ یوں سوچتے ہو۔"

مجھے معلوم تھا کہ کسی زمانہ میں ان صاحب سے روز کا ملنا تھا۔ نقوش کے سلسلے میں کوئی بات چلی اور بڑھ گئی تھی۔ یہ تک چرچے ہونے کا دوسرا موقع تھا۔ صلح صفائی تو ہوئی لیکن آمدورفت کم سے کم تر ہوتی گئی اور ملنا جلنا ترک ہو گیا۔ جن صاحب کا ذکر ہے وہ یوپی کے پٹھان ہیں۔ ان کے اسلاف نے جہاں داری کی ہے اور انہوں نے جہاں بینی۔ انہیں دعوت میں شرکت کرنی ہی چاہیے تھی۔ وہ شریک ہوئے۔ دونوں نے اپنی بڑائی کا ثبوت دیا۔

دوسرے دن صبح کو پلاؤ کی دیگ کے گرد ہم دونوں بیٹھے بوٹیاں چن چن کر کھا رہے تھے۔ یہ ناشتہ مختصر وقفہ سے دوپہر تک جاری رہا۔ کہنے لگے "یار — آپ کو ایک خاکہ لکھ سکتے ہیں، چھپا ہوا تو پڑھ ہی لیا ہوگا،" پانی پیتے جاتے اور خاکہ سنا رہے تھے خاکہ ایک افسانہ نگار خاتون کے بارے میں تھا میں نے کہا "یہ تو اس سے بہت مختلف ہے جو چھپا ہے"۔

"ہاں — بہن کا معاملہ ہے جس حد تک چھپ سکتا تھا وہ چھپ گیا۔ میں سوچتا ہوں وہ تو اب بھی ناراض ہی ہوں گی" — معلوم ہوا کہ آبگینوں کو ٹھیس نہیں لگنے دیتے۔ نگاہ نیچی رکھ کر گفتگو کرنے والا انسان کسی بھی موقع پر نہ بے تکلف ہوتا ہے نہ بے محابا —

ہمیشہ کرائے کے مکان میں رہے لیکن بھابی جان کی ہر خواہش کا احترام تو جیسے ایمان کا حصہ ہے کہنے کو یار لوگ اسے "طفیل محل" کہتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ مکان کا بالائی حصہ اب بھی نامکمل ہے۔ طفیل صاحب مقروض ہیں۔ جب میں پہلی مرتبہ نو تعمیر شدہ مکان پر پہنچا تو بولے" آپ نے ہماری بیگم صاحب کی حماقت ملاحظہ کرلی؟"

ایک مرتبہ کراچی میں خریداری کو نکلے۔ محمود عالم قریشی صاحب ساتھ تھے (محمود بھائی چور پکڑنے کے ماہر ہیں)۔ محمود بھائی ہم دونوں کو صدر بازار کراچی لے گئے اور ایک دلی والے کی دوکان پر جا بٹھایا۔ جو تاجر دلی سے آئے تھے ان کی پہلی نسل جوان ہو رہی تھی۔ کراچی کی آب و ہوا، پارسی حسن کی کافرما جرائی اور گوانیز نوخیز لڑکیوں کی عشوہ زائی کی دید اور رقرب نے دلی والے کی نئی نسل کو کپڑے کی فروخت کے نئے انداز سکھائے تھے۔ جب کوئی اچھے ڈیزائن کا کپڑا آتا تو ایک لڑکا انداز دلری سے کپڑے کو اپنے گرد یوں لپٹتا جیسے کسی کامنی نے ساڑھی باندھ رکھی ہو۔ طفیل صاحب، صرف ایک بار تو متحمل ہوئے کہ اس عالم میں اسپیر نگاہ ڈالیں" التفات ان نگاہوں نے دوبارہ نہ کیا" بھابی جان کے لیے اتنا کپڑا خریدا کہ میں حیران رہ گیا۔

شام کو جب یہ گھر پہنچے ہیں تو فاروق کے بچے دروازے ہی پر گھیر لیتے ہیں۔ بندیا (تابندہ) اور عصمت اتنی تیز، شوخ اور طرار ہیں کہ ان دونوں بچیوں نے اپنے باپ فاروق کی کم گوئی اور کم سخنی کا بدلہ سارے خاندان سے لے لیا ہے۔ کوئی اس جیب پر لٹکی ہوئی جاتی ہے کوئی اس پر نیسری پوتی پتلون کھینچ رہی ہے اور پوتا قادر روٹھ کر زمین پر لوٹ گیا یہ اسے منانے اور گود میں اٹھانے کو فرش پر بیٹھ گئے۔ اب کوئی کندھے پر سوار ہو رہا ہے کوئی نصیحوں کا تھیلا لے بھاگا داری چلا رہی ہے مگر دادا جان، ہنس رہے ہیں۔

کپڑے تبدیل کرکے اسلیپر ڈال گئے تو خیر ورنہ ننگے پاؤں گھر میں گھومتے پھرینگے۔ عام طور پر شلوار کرتا پہنتے ہیں۔ کھانا کھا کر ہال میں ٹہلینگے۔ ساری عمر ہو گئی گھر سے باہر ٹہلنے کبھی نہیں گئے۔ ٹیلی ویژن پر کوئی اچھا ڈرامہ ہوا تو دیکھ لینگے ورنہ کمرے میں جا کر لیٹ جائیں گے۔ ان کا خیال ہے ہر کتاب کتاب نہیں ہوتی۔ چنانچہ گھر کا کتب خانہ میں جو پہنچ گئی وہ کتاب ہے ورنہ دفتر کے ڈھیر میں سے جس کا جی چاہے اٹھا لیتا ہے۔ غالب لائبریری والے مرزا ظفر حسن صاحب اسی لیے تو طفیل سے ناراض ہیں کہ وہ اس ڈھیر کو غالب لائبریری میں کیوں نہیں بھیج دیتے۔ طفیل صاحب کا کہنا ہے کہ غالب سے منسوب جو ادارہ ہے اس میں کتابیں ہونی چاہئیں۔ ڈھیر تو ہر جگہ ملتے ہیں۔ دراصل یہ مزاج کا فرق ہے۔ یہ ذہن و فکر اور توضیح و تشریح کا فرق ہے۔ یہ انداز اور اسلوب کا فرق ہے۔

سونے سے قبل کوئی کتاب مطالعہ کے لیے اٹھا لیں گے۔ ان کا دلچسپ ترین مشغلہ لغت پڑھنا ہے۔ میں نے ایک دن پوچھ ہی لیا۔" آپ لغت کیسے اور کیوں پڑھتے ہیں"؟۔

"ہر لفظ ایک اکائی ہے اس کے معنی و مفہوم کو سمجھانے کے لیے مترادفات دیے جاتے ہیں۔ میں ہر لفظ میں ایک تصویر دیکھتا ہوں۔ صرف ایک اور مکمل تصویر لیکن جب دیے ہوئے معنی و مفاہیم کو پڑھتا ہوں تو اس تصویر کے مختلف زاویے بھی سامنے آتے ہیں۔ تصویر ایک مگر اس کے رخ کئی ہوتے ہیں۔"

ایک شب کہنے لگے" یار۔ آج جلدی سو جاؤ۔

گرا پردہ، گرے موسیٰ، گری بجلی
یہ ہلچل ڈال دی تیری ادا نے
(آغا حشر)

صبح چہل قدمی کو چلیں گے ۔" صبح ہوئی ۔ اردو بازار سے نکلے اور سڑک پر آکر رکشہ میں بیٹھے اور مینارِ پاکستان پہنچ گئے ۔ ایک ناٹے قد کا پہلوان دوڑ لگا رہا تھا۔ اور ایک خاتون خیمہ نما برقع پہنے تیز رفتاری سے سبزہ پر سیر میں معروف تھیں ۔ طفیل صاحب نے سلیپر اتارے اور پھر کرتا ۔ سوکھے ہوئے ہاتھ دو تین بار ہوا میں لہرائے ۔ میں' بنیان کے نیچے سے جھانکتی ہوئی پسلیوں کو گن بھی نہ پایا تھا کہ ان کی ورزش ختم ہو گئی ۔ بھاٹی دروازے سے ہوتے ہوئے کچھ کھانے کی چیزیں خرید کر گھر آگئے ۔ انہیں یہ معلوم ہے کہ لاہور میں حلوہ پوری کس دوکان پر اچھی ملتی ہے ۔ چھولے کہاں عمدہ ہوتے ہیں ۔ کچوریاں کس وقت اور کہاں تلی جاتی ہیں ۔ نہاری کا ماہر کہاں پایا جاتا ہے ۔ دلی والے جب تک بازار میں کچھ کھا نہیں لیتے تھے ان کا پیٹ نہیں بھرتا تھا ۔ طفیل لاہوری ہیں اس حد تک چٹورپن ضرور ہے کہ کبھی کبھار منہ کا مزہ ضرور بدل لیتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے گھر نہایت اعلیٰ درجہ کا کھانا تیار ہوتا ہے ۔

میں اور طفیل صاحب ایک دن اے جی آفس میں ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے اس دفتر کے نصف سے زیادہ ملازمین گزرتے ہیں ۔ جن صاحب سے ملنا تھا وہ بہت دیر میں آئے گرمی کی حدت میں شدت پیدا ہو چلی تھی ۔ پیدل ہی چل پڑے ایک دکان پر رک گئے ۔" لاہور میں یہاں سے اچھی دہی کی لسی اور کہیں نہیں ہوتی " میں نے لسی پی اور کیسر انہوں نے کھلایا۔ طفیل صاحب اکثر حیران ہوتے ہیں کہ میں چائے کیوں نہیں پیتا ۔ اور میں حیران ہوں کہ یہ لسی کیوں نہیں پیتے کہتے یہ ہیں کہ اب نہ موچی دروازے میں جلسہ ہوتا ہے اور نہ قوم کی خاطر چندہ ، لسی پینے کا لطف جاتا رہا ۔

طفیل صاحب کے خلاف جب کچھ لکھا جاتا ہے یا ہوٹلوں میں دن بھر بیٹھنے والے بیکار باتوں میں وقت گزارتے اور بیرا کو پانی کے گلاس کا آرڈر دینے والے ادبا، شعرا ان کی برائی کرتے ہیں تو مجھے ذرا حیرانی نہیں ہوتی ۔ یہ حضرات طفیل صاحب کی طرح ان تھک کام نہیں کر سکتے ۔ ان لوگوں میں یہ صلاحیت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کام کرنے والوں کی تلاش و جستجو کر سکیں ۔ نہ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ میر غالب اور اقبال یا دوسرے اکابرینِ ادب پر مواد کہاں سے حاصل ہو سکتا ہے ۔ چائے کی چسکی لگا کر دن گزارنے والوں کو یہ کیسے معلوم ہو سکتا ہے کہ ادب کے دفینے اور خزینے کہاں ہیں ؟ انہیں کیسے برآمد کیا جا سکتا ہے ۔ اور کس طرح ان کی ترتیب و تدوین کی جا سکتی ہے ؟ اپنی ناواقفیت کی بنا پر یہ حضرات بے کار راتیں گزارتے ہیں اور شرفا کو تنقیص و تعریض کا نشانہ بناتے ہیں ۔ طفیل صاحب نے کبھی سوقیانہ اور مخش باتوں پر توجہ نہ کی ۔ لوگوں کے چھکڑپن اور رکاکت کی طرف کبھی دھیان نہ دیا ۔ ایسے لوگوں کی بے بصری کا ماتم کرنے کی بجائے اپنی ذہانت اور ذہن کو تخلیقی کاموں کے لیے وقف رکھا ہے ۔

طفیل اپنے گردوپیش سے بے خبر و بے تعلق نہیں ہوتے ملک کا دو لخت ہونا ہو یا اس کی زبوں حالی ، عوام کی بے بسی ہو یا بے حسی ان کی ناکامی ہو یا انتشار و اضطراب یہ کسی بات سے بے خبر نہیں ہیں ۔ موقع پرست افراد سے سخت چڑ ہے ۔ ملکی حالات کی نامساعدت اور غیر ملکی حکومتوں کی ستم کیشیوں سے بخوبی واقف ہیں ۔ لیکن ہر شخص کے سامنے اظہار سے کتراتے ہیں ۔ اور چپ رہتے ہیں ۔ لیکن بے تکلف دوستوں میں دبے لفظوں میں نہیں واشگاف الفاظ میں وہ باتیں کہہ جاتے ہیں جو ہر شخص کہہ نہیں پاتا ۔ ان کی فکر بڑی واضح ہے وہ خارجی ماحول کا بھرپور انداز میں جائزہ لینے اور تجزیہ کرنے کے اہل ہیں ۔ نقوش کے طلوع کے عنوان سے ان کی بعض تحریریں سماجی کیفیت کی عبرت انگیز عکاسی کرتی ہیں ۔ یہ حضرت حالات کی بھٹی سے تپ کر نکلے ہیں ۔ یہ پرومیتھیس ۔ PROMETHEUS ۔ کی طرح کربِ مسلسل میں گرفتار رہتے ہیں ۔ اور اسی لیے نقوش کے ہر شمارے کو گزشتہ شمارے سے بہتر بنانے میں خون کو پانی کرتے رہتے ہیں ۔ اردو شعر و ادب کے مستقبل کے لیے بحالی تعمیر کے لیے جد وجہد ہمہ وقت ان کے پیشِ نظر ہے ۔ اس کی پاداش میں کتنا مالی نقصان اٹھایا ہے اس کا اندازہ عام شخص نہیں لگا سکتا ۔

طفیل ہر شخص کے سامنے نہیں کھلتے ۔ اجنبی ہو تو ہوں ، ہاں اور جی سے آگے نہیں بڑھے لیکن بے تکلف دوستوں کی موجودگی میں قہقہہ بھی لگاتے ہیں ۔ ہنستے ہیں تو سارا جسم ہلنے لگتا ہے ۔ چہرہ سرخ ہو جاتا ہے ۔ میں نے اس وقت انہیں بے حد ملول پایا ہے جب کوئی شخص مسلمانوں کی تہذیب کو گڑھے میں گرانے کی کوشش کرتا ہے ۔ یا شعر و ادب کی روایت کو رسوا کرنے پر تل جاتے ہیں ۔ یا ادب کو بد مذاقی پر محمول کرتا ہے ۔

کیسا خوش گفتار ، خوش اطوار ، کیسا باکردار ، ایڈیٹر کی حیثیت سے کیسا بلند قامت کیسا مخلص ، کتنا عالی حوصلہ کس قدر ان تھک کیسا باذوق ، کیسا معقول و معتبر کتنا خاموش طبع لیکن کس قدر شفیق اور کیسا شریف النفس جسے ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا ۔ دنیائے ادب کے لیے یہ محمد طفیل ہے المحمد نقوش ہے لیکن میرا تو یہ بھائی بھی ، محسن بھی اور دوست بھی ۔

واقعہ یہ ہے کہ عشق ایک ہی سے ہو سکتا ہے اور دوستی بھی ایک ہی سے ممکن ہے ۔ غالب کو نہ پڑھا ہوتا تو انسانیت کے معنی و مفہوم سے ناواقف رہتا ۔ رشید صاحب کی تحریروں کو نہ پڑھتا تو علی گڑھ کی اہمیت سے ناآشنا رہتا ۔ طفیل صاحب سے نہ ملا ہوتا تو دوستی کی نعمت سے محروم رہتا ۔

چھوڑ دامانِ قناعت ، کنجِ غفلت سے نکل ۔۔۔ چیر کر دریا کے سینے کو گہر پیدا کریں

گاہے گاہے باز خواں

ڈاکٹر عصمت جاوید
پرنسپل مشولاپور سوشل آرٹس اینڈ کامرس کالج

یہ مضمون میں نے اسمٰعیل یوسف کالج جوگیشوری کے جشن طلائی کے موقع پر کالج کے ادبی مجلّے پامر کے لیے لکھا تھا۔ لیکن سنا ہے کہ پامر کے محدود صفحات کی وجہ سے صرف اس کا ایک تہائی حصہ چھپ پائے گا۔ مکمل مضمون قارئین "اسباق" کی دلچسپی کے لیے بھیج رہا ہوں۔ (شولاپور)

اسمٰعیل یوسف کالج کا ذکر چھیڑتے ہی ذہن کے گوشے میں سوئی ہوئی نہ جانے کتنی یادیں کسمسانے لگتی ہیں۔ ذہن میں گدگدی کرنے لگتی ہیں اور جسم میں بھی۔ اور میں کبھی ایک رومانی شاعر یا انشا پرداز کی طرح سچ مچ خوابوں کی ایسی وادی میں پہنچ جاتا ہوں جسے صرف میرے حافظے نے محفوظ کر رکھا ہے۔ ڈھلتی ہوئی عمر میں نسیان کی شدت کے باوجود ان یادوں کی ایک ایک تفصیل آج بھی مجھ سے پوچھ لیجیے۔ سوچتا ہوں اگر انسان کے پاس حافظہ نہ ہوتا تو وہ کس طرح جی پاتا۔ جو کچھ گزر رہا ہے وہ تو زندہ حقیقت ہے ہی لیکن جو کچھ گزر جاتا ہے وہ مرتا نہیں بلکہ زندہ تر، پائندہ تر بن جاتا ہے۔ آج سے چالیس برس پہلے کا اسمٰعیل یوسف کالج اب بھی میرے لیے زندہ تر حقیقت ہے جہاں میں نے اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال گزارے ہیں جہاں مجھے زندگی برتنے کے مواقع فراہم ہوئے ہیں۔ زندگی کا شعور تو کالج کی چہار دیواری چھوڑنے کے بعد ملا لیکن جوانی کی نادانیوں کے ساتھ زندگی "جینے" کی جو مہلت یک نفس میرے حصے میں آئی وہ اسی کالج میں آئی۔ اسمٰعیل کالج وہ مادرِ علمی ہے جس کی گود میں میں نے اپنی عمرِ عزیز کے کم و بیش نو یا دس سال گزارے ہیں۔ نو یا دس سال کی مدت پر چونکیے نہیں کیونکہ ان میں سے تقریباً پانچ سال میں یہاں استاد کی حیثیت سے گزار چکا ہوں۔ اور عنفوانِ شباب کے پورے پانچ سال طالب علم کی حیثیت سے۔ لیکن شروع کے یہی پانچ سال میری زندگی کا عزیز سرمایہ ہیں جن کی یاد کا سہارا لے کر میں موجودہ زندگی کی تھکن میں تر و تازگی اور سردی میں گرمی پیدا کر لیتا ہوں۔

میں جون ۱۹۴۱ء یعنی آج سے چالیس سال قبل پہلی بار اس کالج کے حدود اربعہ میں داخل ہوا تھا اور فرسٹ ایئر سائنس میں داخلہ لیا تھا۔ اسکول کی سب سے اونچی کلاس سے ترقی کر کے کالج کی سب سے نچلی کلاس میں قدم رکھنا ایک خوشگوار تجربہ تھا۔ اگر میں اسکول سے اپنے ساتھ خود اعتمادی نہ لاتا تو شاید اپنے دوسرے ہم جماعتوں کی طرح احساس کمتری کا شکار ہو جاتا۔ کالج کی کھلی فضا دیکھی تو اسکول کا گھٹا گھٹا ماحول یاد آیا۔ اسکول میں میرے اساتذہ نے مجھے ذمہ دار سمجھ کر مجھ پر سنجیدگی کا جو خول چڑھا دیا تھا۔ اسے اتار پھینکنے کا یہاں موقع ملا۔ اسکول کے چھوٹے کمروں میں شرارت نہ کر سکنے کی دبی دبی خواہش نے کالج کے بڑے بڑے کمروں میں سر ابھارا! اور کھل کر کھیلنے کا موقع ہاتھ آیا۔ لیکن اس کے باوجود سالانہ امتحان میں دوسرے نمبر پر کامیاب ہوا جس پر مجھے کم لیکن میرے ان ساتھیوں کو زیادہ حیرت تھی جو میرے ساتھ کلاس روم کی پچھلی بنچ پر بیٹھ کر لیکچر کے دوران شور مچانے کی نئی نئی ترکیبوں میں میرا ساتھ دیتے تھے۔ امتحان کا ایک دلچسپ واقعہ یاد ہے۔ بائیو لوجی کے پریکٹیکل میں کچھ تنے، کچھ شاخیں، تھوڑی بہت جڑیاں پلیٹ میں سجا کر رکھی گئی تھیں۔ ہر پلیٹ پر ایک ایک سوال ٹائپ کر کے چسپاں کر دیا گیا تھا۔ طالب علم جوابی بیاض ہاتھ میں لے کر ہر پلیٹ کے پاس باری باری جاتے اور متعلقہ چیز سے متعلق سوال پڑھ کر بیاض میں جواب لکھتے۔ ایک میں بھٹا رکھا ہوا تھا سنہری بالوں میں ڈھکا ہوا۔ پلیٹ پر سوال درج تھا: اس کی جنس بتائی جائے! صحیح جواب مجھے معلوم نہ تھا میں نے مادہ لکھ دیا۔ جب امتحان ختم ہو گیا تو میں نے ایک ساتھی سے پوچھا کہ تم نے بھٹے کی جنس کیا لکھی؟ اس نے کہا "نر"۔ میں نے پوچھا کیا بھٹا نر ہے۔ اس نے کہا کیوں نہیں لمبی لمبی داڑھی نہیں دیکھیں اس کی۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ۔ میں نے تو سنہری بالوں کی رعایت سے 'مادہ' لکھ دیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ صحیح جواب نہ نر تھا نہ مادہ بلکہ غیر جنس ہے۔

جون ۱۹۴۲ء میں انٹر سائنس میں داخلہ ملا۔ لیکن بڑی مشکلوں سے، بڑی بڑی مشکلوں سے اس لیے کہ میں نے دوسرے سال کالج کھلنے سے پہلے داخلہ فارم ہی نہیں داخل کیا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ اسکول کی طرح کالج میں بھی ایک بار شروع میں داخلہ لے لیا جائے تو کافی ہے۔ ہر سال داخلہ فارم بھرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے لمبی چھٹیاں اطمینان سے گزارنے کے بعد کالج کھلنے پر جون میں وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ انٹر سائنس میں داخلہ پانے والوں کی فہرست میں میرے نام کا دور دور تک کہیں پتہ نہیں۔ بہت سٹپٹایا۔ فزکس کے پروفیسر سراج الحسن نقوی صاحب سے ملا۔ ان کی کوششوں اور سال اول کی شاندار کامیابی کی برکت سے داخلہ مل گیا۔ انجینیر بننے کا ارادہ تھا۔ اس لئے ریاضی مضمون لینا پڑا اور حیاتیات سے نجات ملی۔ غالباً اسی زمانے میں یا شاید اس وقت جب میں سال اول میں تھا اردو کے ایک ممتاز صاحبِ طرز انشا پرداز ادبی دنیا لاہور کے مدیرِ اعلیٰ جناب صلاح الدین احمد کالج تشریف لائے تھے۔ اور اردو کے افسانہ نگاری کی تاریخ پر ایک مقالہ پڑھا تھا۔ ان دنوں میں "پیرزادہ احمد ندیم قاسمی بی۔اے کو دھوا گے چل کر صرف احمد ندیم قاسمی رہ گئے اردو کا بہترین افسانہ نگار سمجھا جاتا تھا۔ جب صلاح الدین احمد صاحب نے احمد ندیم قاسمی کا اپنے مقالے میں کہیں ذکر نہیں کیا تو سوال کے وقفے میں میں نے فاضل مقرر سے اس کی وجہ دریافت کی تھی۔ انھوں نے میرے سوال کا جواب صرف مسکراہٹ میں دیا تھا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی (غالب)

میں نے ان سے کئی سوالات پوچھے تھے۔ وہ میرے سوالات سن کر بہت خوش ہوئے تھے اور کہا تھا کہ بیٹی جیسے دور افتادہ مقام پر بھی طلبہ ادب کے بارے میں کافی معلومات رکھتے ہیں یہ خوشی کی بات ہے۔ انہی دنوں میراجی ادبی دنیا کے مدیر معاون تھے اور اردو شاعری سے اپنے "ناجائز تعلق کی بنا پر اور اپنی نراملی شاعری سے کلاسیکیت کے رنگ میں ڈوبے ہوئے اہلِ ذوق حضرات کو پریشان کر رہے تھے۔ میں نے صلاح الدین احمد صاحب سے پوچھا تھا کیا میراجی مسلمان ہیں؟ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا "جی ہاں By Birth مسلمان ہیں"

یوں تو اسکول کے زمانے ہی سے میں چھوٹے موٹے ادبی رسالوں میں چھپنے لگا تھا لیکن ایک واقعے نے مجھے کالج میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے مشہور کر دیا ہوا یوں کہ جس زمانے میں میں انٹر سائنس میں پڑھتا تھا ان دنوں میری ملاقات اردو کے مشہور افسانہ نگار میرزا ادیب سے ہوگئی۔ وہ ایک فلمی کہانی کے سلسلے میں میرے والد منشی عبدالباقی سے ملاقات کرنا چاہتے تھے جو منروا موویٹون میں مکالمہ نویس کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ مرزا ادیب کو میرے اسکول کے زمانے کے ہم جماعت اسعد گیلانی ساتھ لائے تھے۔ یہ وہی اسعد گیلانی ہیں جو آگے چل کر مولانا مودودی کے سوانح نگار بنے۔ اوائل عمری میں ان کے افسانے ساقی میں چھپا کرتے تھے جو اس زمانے میں دہلی سے نکلتا تھا۔ مرزا ادیب عمر میں ہم دونوں سے کافی بڑے تھے۔ لیکن اپنی سادہ مزاجی اور ہماری سنجیدہ گفتاری کے باعث ہم میں گھل مل گئے۔ اس وقت وہ "مصور" ویکلی کے ایڈیٹر تھے۔ کیونکہ اس وقت سعادت حسن منٹو مصور سے الگ ہو کر بمبئی ٹاکیز سے منسلک ہو گئے تھے۔ مرزا صاحب ہم دونوں کی افسانہ نگاری کی جی کھول کر تعریفیں بھی کرتے تھے۔ اور مفید مشورے بھی دیا کرتے تھے۔ نوعمری میں تعریف کا نشہ بڑا تیز ہوتا ہے۔ انہی دنوں میں جب میں نیاز فتح پوری کے طلسم میں گرفتار ہو کر الحاد کی سرحد میں داخل ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی کالج کی زندگی سے متعلق ایک افسانہ "لاوا" کے نام سے لکھا تھا جس میں بتایا تھا کہ کس طرح کالج کی زندگی ایک طالب علم کو ملحد بنا دیتی ہے۔ افسانہ لکھتے وقت اپنی کلاس کی اور کالج کی کچھ مشہور اور خوبصورت لڑکیوں کا ذکر ان کے اصلی ناموں سمیت کر دیا تھا۔ سوچا تھا مبیضہ تیار کرتے وقت اصلی ناموں کی جگہ فرضی نام لکھ دوں گا۔ ایک روز مرزا ادیب گھر تشریف لائے اور کہا کہ عنقریب مصور کا "افسانہ نمبر" نکال رہا ہوں اس لیے تمہارا افسانہ درکار ہے۔ میں نے کہا کہ میرے پاس ایک افسانے کا مسودہ تیار ہے۔ اسے صاف کر کے آپ کو دے دوں گا۔ فوراً کہا ذرا دکھاؤ تو۔ میں نے رف کاپی دکھائی تو انہوں نے اپنے پاس یہ کاپی یہ کہتے ہوئے رکھ لی کہ میں نظرِ ثانی کر لوں گا۔ اس وقت یہ بات ذہن میں نہیں تھی کہ مجھے کرداروں کے نام تبدیل کرنے ہیں۔ بہر حال افسانہ مصور میں ایڈیٹر کے تعارفی اور تعریفی نوٹ کے ساتھ لڑکیوں کے اصلی ناموں سمیت چھپا۔ شومئی قسمت سے ہمارے ایک قدرداں صوبیدار صاحب تھے۔ ہوسٹل میں رہتے تھے اور کالج سے زیادہ کالج کینٹین میں اپنا وقت گزارتے تھے۔ اور نصاب سے زیادہ خارج از نصاب سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ انہوں نے کہیں یہ افسانہ پڑھ لیا اور جب اس افسانے میں کالج کی لڑکیوں کے اصل نام اور ان سے متعلق فرضی واقعات پڑھے تو پھر کیا تھا، انہوں نے ہوسٹل میں جی کھول کر اس افسانے کی پبلسٹی کی، یہ صورتِ حال دیکھ کر اس قدر خوف زدہ ہو گیا کئی دنوں تک مسلسل کالج سے غائب رہا لیکن ہنگامہ فرو ہونے کے بعد جب کالج آنے لگا تو اس وقت تک میں افسانہ نگار کی حیثیت سے کالج میں مشہور ہو چکا تھا۔ اکثر طلبہ افسانے کی ٹیکنیک سیکھنے کے لئے میرے پاس آتے تھے۔ اور میں ایک بزرگ کی حیثیت سے انہیں مشورے دیتا تھا۔ کچھ طلبہ کے کلام پر اصلاح بھی دیتا تھا۔ اب وہ زمانہ یاد کرتا ہوں تو ع

کاروبارِ دلِ ناداں پہ ہنسی آتی ہے

جب میں انٹر سائنس میں تھا اسی وقت گاندھی جی کی Quit India تحریک بمبئی میں شروع ہوئی تھی اس کے بعد Navy کی مشہور بغاوت بھی میرے طالب علمی میں ہوئی تھی۔ نیوی کی بغاوت کی خبر مجھے کالج میں اس وقت ملی تھی جب میں کسی اردو ڈرامے کی ریہرسل کے سلسلے میں شام گئے تک وہیں موجود تھا۔ میں کس طرح گورے سپاہیوں کی گولیوں سے بچتا بچاتا صحیح سلامت گھر پہنچا۔ یہ بجائے خود ایک سنسنی خیز داستان ہے۔ لیکن اس کا اسمٰعیل کالج سے وابستہ یادوں سے کوئی تعلق نہیں۔ البتہ ڈرامہ کی بات یاد آئی تو کچھ دلچسپ واقعات سن لیجیے۔

"بات کا بتنگڑ" پہلا ڈرامہ تھا جس میں میں نے بوڑھے اباجان کا رول ادا کیا تھا۔ میری ایک ہیروئن تھی جو حقیقی زندگی میں ایک مشہور وکیل کی بیوی اور ایک نوعمر فلمی ہیرو کی والدہ ہیں۔ یہ پارسی دوشیزہ تھی۔ اسے اردو نہیں آتی تھی لیکن اردو ڈرامے میں حصہ لیا تھا۔ گرین روم میں میرا شاندار میک اپ دیکھ کر انہوں نے کہا "آپ تو سچ مچ اباجان لگتے ہیں"! میں نے برجستہ کہا "پھر تو میں گھاٹے میں رہا"۔ میرا جوک غارت ہو گیا اس لیے Waste ہو گیا کہ انہیں اردو نہیں آتی تھی۔ اس ڈرامے میں میں نے بوڑھے کا رول اتنی کامیابی سے ادا کیا تھا کہ کچھ لڑکے ڈرامے کے بعد بھی مجھے اباجان کہہ کر چڑانے لگے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن میں نے زچ ہو کر ایک لڑکے کو قریب بلایا اور کہا "مجھے آپ کا اباجان بننا منظور ہے بشرطیکہ آپ کی امی کو شکایت نہ ہو"

اس دن کے بعد سے اس لڑکے نے مجھے اباجان کہنا چھوڑ دیا تھا۔ دوسروں نے بھی جب مجھ سے یہی شرط سنی تو ان کے بھی منہ بند ہو گئے۔ اب اردو ڈراموں میں بوڑھے کا رول میرے لیے مختص ہو چکا تھا اور یہ رول میرے لیے مناسب بھی تھا۔ کیونکہ اسی زمانے میں میں اپنے نوجوان شانوں پر بوڑھے کا سر لیے پھرتا تھا۔ اسی زمانے میں میں نے ایک تاریخی ڈرامے میں وزیر محمود گاواں کا رول ادا کیا تھا۔ اور اسٹیج پر مرنے کی اداکاری اس خوبصورتی سے کی تھی کہ بعد میں پتہ چلا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ میری ایک خوبصورت کلاس فیلو نے میری اداکاری کی داد دیتے ہوئے کہا تھا "آپ خوب مرتے ہیں" میں نے برجستہ جواب دیا "جی ہاں! صرف اسٹیج پر"۔ ایک مرتبہ اقبال کی موت پر Shadow Play کھیلنا طے پایا۔ اسکرپٹ تیار تھا۔ لیکن Shadow Play میں اقبال کا رول ادا کرنے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ تو پروفیسر نقوی نے مجھ سے ہنستے ہوئے کہا یہ سب لڑکے کتے کی موت مرنا چاہتے ہیں اقبال کی نہیں۔ آپ اقبال کی موت مریے۔ اسٹیج پر مرنا تو مجھے آتا ہی تھا۔ چنانچہ میں نے یہ رول ادا کیا اور اتنی کامیابی سے ادا کیا تھا کہ میری پرچھائیں کی نقل و حرکت دیکھ کر رقیق القلب ناظرین رو پڑے تھے جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ پتہ نہیں یہ اقبال سے جذباتی وابستگی کا نتیجہ تھا یا اس میں میری اداکاری کو دخل تھا۔

جہاں تک کالج میگزین "پام" (Palms) کا تعلق ہے میں ایک سے زائد بار اس کے حصہ اردو کا طالب علم مدیر رہ چکا ہوں۔ اس زمانے میں پام ششماہی تھا اور سال میں دو مرتبہ نکلتا تھا۔ زمانہ طالب علمی کی کچھ نظمیں اور مضامین اس کے شماروں میں شاید محفوظ ہوں "پام" کی رعایت سے ایک دلچسپ بات یاد آ گئی۔ ایک انتہائی خوبصورت طالبہ نے ___ نام کیا لوں، کوئی

مجھ کو لکھ کر رکھ لینے میں کوتاہی کی میں نے — صفحہ صفحہ تو کھلتا ہے دریا ساگر پھیلا تا (رشید افضل)

اللہ کی بندی ہوگی۔ جو پامز کی غالباً حصہ انگریزی کی ایڈیٹر تھیں۔ ایک روز پوچھنے لگیں کہ یہ اردو والے صرف نظمیں اور غزلیں ہی لکھتے ہیں PROSE کیوں نہیں لکھتے۔ میں نے کہا جب تک کالج میں آپ جیسی "شاعرگر" ہستیاں موجود ہوں تو لوگ شاعری نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے۔ جب میں نے محترمہ کے سامنے "شاعرگر" کی تشریح کی تو چہرہ گل سے گلستان ہوگیا تھا۔

کالج کے جن اساتذہ سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ان میں پروفیسر ایم ڈار کا نام سرفہرست ہے۔ فرسٹ ایئر سائنس میں میں نے کلاس میں پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے کچھ سوالات کے جوابات گستاخانہ انداز میں دیے تھے۔ جس کا مجھے آج تک افسوس ہے۔ مثلاً انہوں نے مجھ سے کلاس میں پوچھا تھا۔ تمہیں کتنے شعر یاد ہیں؟ میں نے ہتھیلیوں کے اشارے سے بتایا "اتنے" کہنے لگے یہ کیا بدتمیزی ہے۔ میں نے کہا شعروں کی صحیح صحیح تعداد تو نہیں بتا سکتا صرف "مقدار" بتا رہا ہوں۔ بہرحال پروفیسر نجیب اشرف نے پروفیسر ڈار سے میرے متعلق شکایت کی تھی کہ کالج میں ایک بڑا ہی گستاخ بدتمیز اور دریدہ دہن لڑکا آیا ہے۔ ڈار صاحب مجھے دیکھنے کے بڑے مشتاق تھے۔ ان دنوں میرے چچا (والد کے چچا زاد بھائی) کمال احمد بی۔ اے اسپیشل اردو کے طالب علم تھے۔ اور اگرچہ وہ بھی میری طرح پونا کے رہنے والے تھے لیکن لوگوں پر اپنے اہل زبان ہونے کا سکہ بٹھا چکے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ پروفیسر ڈار تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ اور اس کی وجہ بھی بتائی۔ میں جب ڈار صاحب سے ملا تو انھوں نے مشفقانہ انداز میں مجھے سمجھایا کہ استاد کی عزت کرنا ہر طالب علم کا فرض ہے اور پروفیسر نجیب اشرف معمولی آدمی نہیں۔ بلکہ بڑے عالم اور مشہور اہل قلم ہیں۔ میں یہ واقعہ بطور خاص اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ پروفیسر ڈار نے مجھے یہ نصیحت اس زمانے میں کی تھی جب پروفیسر ندوی سے ان کے تعلقات کشیدہ تھے۔ کوئی اور استاد ہوتا تو ایسے باغی طالب علم کی حوصلہ افزائی کرتا۔ ڈار صاحب کی عظیم شخصیت کا یہ صرف ایک پہلو ہے۔ وہ عربی، فارسی، اردو اور انگریزی چاروں زبانوں پر حاکمانہ قدرت رکھتے تھے۔ اور اپنے ذہین طالب علموں کو جی کھول کر حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ میں اس زمانے میں خود کو سچ مچ ذہین بلکہ ایک بڑا ادیب اور عالم سمجھتا تھا۔ لیکن آج اتنے برس گزر جانے کے بعد اور کئی کتابوں کا مصنف ہونے کے باوجود جب اپنے ہاتھ میں ہلدی کی گانٹھ ہی پاتا ہوں تو ہنستا ہوں کہ آج تو نہیں بلکہ آج سے تقریباً اڑتیس برس پہلے ہم بھی پنساری تھے۔ جب میں ۱۹۴۵ء میں سائنس سے آرٹس فیکلٹی میں منتقل ہوا تو ڈار صاحب کا میں باقاعدہ طالب علم ہوچکا تھا۔ وہ میرے فارسی کے استاد تھے۔ انہوں نے مجھ میں فارسی نہیں بلکہ اردو کا بھی صحیح ذوق پیدا کیا۔ وہ آزاد خیال تھے اور نجی محفلوں میں اپنے قریبی طالب علموں سے نازک مسائل پر کھل کر گفتگو کرتے تھے۔

مجھے متاثر کرنے والی دوسری شخصیت اسمٰعیل یوسف کالج کے بانی پرنسپل ڈاکٹر بدالرحمٰن کی ہے۔ جو مجھے جونیئر بی۔ اے میں فارسی ۴۶-۱۹۴۵ء میں پڑھاتے تھے۔ میں ان کا چہیتا شاگرد تھا۔ ایک روز وہ کلاس میں ہماری بیاضیں جانچ رہے تھے۔ لڑکوں نے فارسی میں کوئی مضمون لکھا تھا۔ پرنسپل صاحب ان کی زبان کی غلطیاں درست کر رہے تھے۔ میں میز کے قریب آکر کھڑا ہوگیا اور دیکھنے لگا۔ پتہ نہیں کسی کی کاپی تھی۔ اس میں مجھے ایک لفظ غلط نظر آیا۔ جسے پرنسپل صاحب نے درست نہیں کیا تھا۔ بلکہ آگے بڑھ گئے تھے۔ میں نے کہا فلاں لفظ مناسب نہیں۔ اسکی جگہ فلاں استعمال کرنا چاہیے تھا۔ فرمایا "اگر تم ایسی غلطی کرتے تو یہ غلطی بھی درست کرتا اور تمہیں بھی"۔ میں ان معذوروں کی زبان و بیان کی معمولی غلطیاں نظر انداز کر دیتا ہوں۔ یہ کہہ کر فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ان کی موت پر میں نے گنج گرانمایہ کے نام سے ایک مضمون لکھا تھا جو پامز کی خصوصی اشاعت میں چھپا تھا۔

تیسری شخصیت جس نے مجھے حد درجہ متاثر کیا پروفیسر نجیب اشرف ندوی کی ذات گرامی تھی۔ جن کا میں ایک دو نہیں بلکہ سات سال تک شاگرد رہا۔ میں ان کی شان میں اپنی گستاخیوں کا ذکر کرچکا ہوں۔ یہ اس وقت کی بات ہے۔ جب میں سائنس کا طالب علم تھا۔ اور اس حیثیت سے اردو کی میرے لیے کوئی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اردو مضمون میں صرف پاس ہونا لازمی تھا۔ اس کے کم یا زیادہ نمبر 'کلاس' پر اثر انداز نہیں ہوتے تھے۔ اور پھر انگریزی اور اردو کا مشترکہ پرچہ ہوتا تھا جس میں پاس ہونے کے لئے صرف ۳۵ نمبر درکار تھے۔ لیکن مجھے انجینیرنگ کالج میں داخلہ نہیں ملا تو میں ایک سال تک کالج سے باہر ریڈیو انجینیرنگ کا کورس کرتا رہا۔ اس میں بھی ناکام ہوگیا تو اسمٰعیل یوسف کالج میں دوبارہ داخلہ لیا۔ چونکہ جونیئر بی۔ اے میں میں نے اردو مضمون کا انتخاب کیا تھا اس لیے اب پروفیسر ندوی ہی میرے استاد تھے۔ میں اپنی قدیم گستاخانہ روش سے تائب ہوچکا تھا۔ لیکن شاید میں نے ان کا دل ضرورت سے زیادہ دکھا دیا تھا۔ اس لئے سعادت مند طالب علم بن کر صدق دل سے کفارہ ادا کرنے کے بعد بھی وہ مجھ سے کبیدہ خاطر رہے۔ ایک دن ان کی کلاس میں صرف چار طالب علم تھے۔ چہار عناصر کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کسی کو خاک کہا، کسی کو باد کسی کو آب لیکن خاکسار کو آتش قرار دیا۔ میں نے کہا اب آتش پر خاک پڑ چکی ہے۔ کہنے لگے کون جانے میں تو تمہیں سودائی سمجھتا ہوں۔ میں نے کہا شکر ہے سودائی نہیں کہنے لگے۔ وہ تو تم پیدائشی ہو، ایک روز کلاس میں مذاق کے موڈ میں تھے۔ ایک لڑکے سے پوچھا۔ لفظ 'عصمت' مذکر ہے یا مونث؟ لڑکے نے کہا 'مونث' میری طرف دیکھ کر فرمایا ہماری کلاس میں تو مذکر ہوا کرتا ہے۔ میں نے کھڑے ہو کر جواب دیا "تذکیر و تانیث کے بارے میں اردو کی منطق الٹی ہے۔ اردو میں مردوں کی نشانیاں داڑھی اور مونچھ مونث ہیں اور عورتوں کی چیزیں جوڑا اور دوپٹہ مذکر ہیں۔ اس لئے عصمت کا مونث ہونا تعجب خیز نہیں۔ جواب دیا تشریف رکھیے میں خاموش بیٹھ گیا۔ ایک روز کہنے لگے۔ تم عصمت کے ساتھ جاوید کیوں ہو؟ اسکول میں ہمارے استاد نکہت شاہجہاں پوری تھے وہ اکثر مجھے چھیڑ کرتے تھے کہ ہمیں ہمیشہ تمہاری فکر رہتی ہے۔ عصمت ہو کہیں لٹ نہ جاؤ۔ میں نے ان کی چھیڑ سے تنگ آکر اپنا تخلص جاوید رکھ لیا اور کہا کہ آپ میری عصمت پر لاکھ حملے کیجئے وہ جاوید رہے گی۔ یہ سن کر پروفیسر ندوی نے فرمایا جاوید کا باپ تو مر چکا ہے۔ ان کا اشارہ اقبال کی طرف تھا۔ میں نے کہا آپ اطمینان رکھیئے۔ میرے والد "باقی" ہیں (عبدالباقی میرے والد کا نام تھا اور باقی تخلص) خاموش ہوگئے۔

ایک عرصہ کے بعد جب میرا تبادلہ دور بھی مہاودیہ لیہ امراوتی سے اسمٰعیل کالج میں ہوا تو پروفیسر ندوی ریٹائر ہوکر انجمن اسلام ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ہوچکے تھے۔ وہ درسیات اردو ام۔ اے کے ناظم بھی تھے۔ اس وقت ان کے دل سے میرے خلاف جو خلش تھی دور ہوچکی تھی۔ بڑی شفقت فرمایا کرتے تھے اور مجھے پیار سے "بیٹا" کہا کرتے تھے۔ میں جانتا تھا کہ میں ان کا اکلوتا منہ بولا بیٹا نہیں تھا لیکن پھر بھی میں انہیں استاد سمجھتا تھا۔ اور استاد باپ کا

تشنہ آنکھوں سے میں جب دیکھوں نذیر آسماں ٹوٹا ہوا ساغر لگے (نذیر فتح پوری)

رشید احمد صدیقی

جگن ناتھ آزاد
جموں یونیورسٹی جموں کشمیر

——— ایک اظہارِ عقیدت جو صدیقی صاحب کے انتقال کے فوراً بعد ریڈیو سرینگر سے نشر ہوا ———

رشید احمد صدیقی کے انتقال کی خبر سے میرے دل و دماغ پر جو گذری اس کا اظہار لفظوں میں ممکن نہیں ہے۔ ابھی ہم لوگ مولانا عبدالماجد دریا بادی کو رو رہے تھے کہ رشید صاحب بھی ہم سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

رشید احمد صدیقی کے ساتھ میرے مراسم کی ابتدا ۱۹۴۵ء میں ہوئی اور عجیب بات یہ ہے کہ ہماری پہلی ملاقات ریل کے ایک سفر میں ہوئی۔ پٹنہ میں اردو کانفرنس تھی۔ اس کے ساتھ ایک مشاعرہ بھی تھا۔ رشید صاحب کو اس کانفرنس کی صدارت کرنا تھی اور مجھے کانفرنس کے علاوہ مشاعرے میں بھی شریک ہونا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں جس ڈبے میں سفر کر رہا تھا دہلی سے، رشید صاحب علی گڑھ سے اسی ڈبے میں سوار ہوئے۔ میں ان کی تصویر کہیں دیکھ چکا تھا۔ اگرچہ وہ اپنی تصویر کھنچوانے سے ہمیشہ نفور رہے۔ انھیں میں نے پہچان لیا۔ آداب عرض کیا۔ اپنا تعارف کرایا اور کافی دیر باتیں ہوتی رہیں۔ بعد میں جب میں نے یہ واقعہ اپنے دوست ڈاکٹر مختارالدین احمد سے بیان کیا تو انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ آپ خوش نصیب ہیں۔ ورنہ رشید صاحب نہایت کم گو انسان ہیں اور بہت کم باتیں کرتے ہیں بالخصوص کسی سے جب پہلی بار ملاقات ہو۔

اس بات چیت میں پنجاب کی شاعری اور پنجاب کے ادب کا ذکر آیا۔ رشید صاحب نے حفیظ جالندھری کی شاعری کا ذکر نہایت تعریفی انداز میں کیا۔ میں نے کہا رشید صاحب! آپ کی زبانی حفیظ صاحب کی تعریف سن کے مجھے حیرت سی ہو رہی ہے اور خوشی بھی۔ خوشی اس لیے کہ حفیظ میرے پسندیدہ شاعروں میں ہے۔ اور حیرت اس لیے کہ حفیظ کے متعلق ہندوستان بھر میں ایک سناٹا ہے۔ اور بالخصوص علی گڑھ میں تو آج حفیظ کو بہت اچھا تو کیا اوسط درجے کا شاعر بھی نہیں سمجھا جاتا۔

رشید صاحب:- لیکن ایک زمانہ تھا جب حفیظ علی گڑھ کے محبوب شاعر تھے۔

میں:- اسی بات پر تو میں بھی حیران ہوں کہ وہ زمانہ اب کہاں چلا گیا۔ حفیظ صرف علی گڑھ ہی کے نہیں بلکہ سارے ہندوستان کے محبوب شاعر تھے۔ اس لیے جب آپ نے حفیظ کی شاعری کا ذکر اس قدر تعریفی الفاظ میں کیا ہے تو میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

رص:- ادب میں اقدار بدلتی رہتی ہیں اور کسی شاعر کی مقبولیت ہمیشہ ایک جیسی نہیں رہ سکتی۔

میں:- آپ نے صحیح فرمایا ہے لیکن حفیظ کی شاعری کو لوگوں نے بہت جلد فراموش کر دیا ہے۔ اقدار اس قدر جلد کہاں بدلتی ہیں۔ ممکن ہے اس کا سبب ترقی پسند تحریک کا روز افزوں عروج ہو۔ جب سے سردار جعفری نے کچھ اس طرح کی بات کی ہے کہ جب جمہوری نغمے کا وقت تھا تو وہ شاہنامہ اسلام لکھتے رہے جب تحریک آزادی کی لہر اونچی اٹھی تو آزادی کے گیت گانے کے بجائے برطانیہ کے جنگی مقاصد کے نقیب ہو گئے اور جب عوامی جدوجہد کا زمانہ آیا تو پاکستان کی رجعت پرستی کے سرکاری ترجمان بن گئے تو ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں نے حفیظ کی شاعری کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔

رص:- ہو سکتا ہے۔ لیکن کسی شاعر کی زندگی میں اس طرح کے دو عارضی دور ہوتے ہیں۔ حفیظ کی شاعری کو نظر انداز کرنا اتنا آسان نہیں۔

میں:- رشید صاحب! دہلی میں والدِ محترم اور ڈاکٹر سید عابد حسین کے علاوہ میں نے کسی کو حفیظ صاحب کی شاعری کا مداح نہیں پایا۔ حیرت کا مقام ہے۔

اتنے میں ریل کسی اسٹیشن پر رکی اور یہ بات چیت ختم ہو گئی۔ رشید صاحب نے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے آئی۔ میں نے بل ادا کرنا چاہا تو رشید صاحب نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ بل میں ادا کروں گا۔ میں سینئر ہوں آپ جونیئر ہیں۔ میں نے تعمیل ارشاد تو کر دی لیکن یہ سینئر جونیئر والی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ چنانچہ بے اختیار میرے منہ سے نکلا کہ صدیقی صاحب! یہ تو خیر ایک حقیقت ہے کہ آپ سینئر نہیں بلکہ سینئر سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور آپ کے سامنے میں جونیئر ہی نہیں بلکہ جونیئر سے بھی کہیں کم ہوں۔ لیکن یہ اصطلاح میں سمجھا نہیں ہوں اس پر رشید صاحب ہنستے ہوئے بولے۔

"یہ علی گڑھ کی اصطلاحیں ہیں۔ اور بالعموم سفر ہی میں کام آتی ہیں۔ سینئر اور جونیئر کے فرائض الگ الگ ہیں۔ مثلاً اب چائے آئی ہے۔ اس کا بل میں ادا کروں گا کیونکہ میں سینئر ہوں لیکن اس کے معنی یہ نہیں کہ جونیئر مزے میں بیٹھ کے سفر کرتا رہے گا۔ سینئر کا بستر جونیئر ہی کو باندھنا ہوتا ہے اور جہاں قلی نہ ملے وہاں اسے یہ بستر اٹھا کے اسٹیشن سے باہر لے جانا پڑتا ہے۔ اب اس وقت دیکھیے۔ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہوں۔ اب جب ٹکٹ چیکر آئے گا تو اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا آپ کو کرنا ہوگا۔ ممکن ہے گتھم گتھا ہونے کی نوبت آ جائے۔ اس کے لیے تیار رہیے۔

یہ سن کے مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی اور ساتھ کی برتھ پر جو صاحب بیٹھے تھے وہ بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔

اِس کے بعد اتفاق ایسا ہوا کہ پٹنے میں ہمارا قیام بھی ایک ہی ہوٹل میں تھا یہ دو ایک دن کی رفاقت میرے لیے متاعِ گراں بہا تھی اور جس رشید احمد صدیقی کو پہلے کتابوں میں دیکھا تھا اس

جلائے کیا کوئی بجلی مرے نشیمن کو
طواف کر کے چمن سے نکل گئی ہوگی (مخلص معتوی)

کی شخصیت کی ایک بھرپور جھلک اب دیکھنے کو ملی۔

ابھی میں نے شروع ہی میں عرض کیا ہے کہ نام و نمود اور کسی قسم کی خواہش و شہرت سے انہیں ازلی اور ابدی نفرت رہی۔ اس سے متعلق ایک چھوٹی سی بات اور سن لیجیے۔

ابھی حال ہی میں مالک رام صاحب نے "تحریر" کا رشید احمد صدیقی نمبر نکالا ہے۔ جب یہ نمبر تکمیل کے مرحلوں میں تھا تو مالک رام صاحب نے ہم لوگوں کو خاص ہدایت دے رکھی تھی اور بالخصوص اپنے علی گڑھ کے دوستوں کو کہ رشید صاحب کو اس کی اطلاع نہ ہونے پائے۔ ورنہ وہ اس کی اشاعت رکوادیں گے۔ آخر جب یہ نمبر چھپ گیا اور اس کی ایک کاپی رشید صاحب کے پاس بھیجی گئی تو انہیں اس خاص نمبر کے چھپنے پر بڑی حیرت ہوئی اور مالک رام کو انھوں نے ایک خط میں لکھا کہ ؎

"مجھ سے اتنی جوا رادت ہے تو کس بات سے ہے"

ملنے کی ملاقات کے بعد رشید صاحب سے علی میں چند ملاقاتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک ملاقات سرور صاحب کی معیت میں ہوئی۔ اور ایک مختار الدین احمد کے ساتھ جو ملاقات مختار الدین آزاد کی معیت میں ہوئی اس میں موضوع گفتگو بڑی حد تک اقبال کی شاعری رہی۔ رومی کی مثنوی بھی بات چیت ہوئی۔ میں نے کہا بطور شاعر کے اقبال رومی سے بڑے ہیں۔ کہنے لگے "جو صلابت رومی کے اشعار میں ہے اقبال کے اشعار میں نہیں ہے" اس کے بات مثالیں دے دے کے اس نکتے پر روشنی ڈالتے رہے۔

اس ملاقات کے بعد ہم دونوں باہر آئے تو ڈاکٹر مختار الدین احمد نے پھر اپنا وہی فقرہ دہرایا کہ آپ اس معاملے میں خوش نصیب واقع ہوئے ہیں۔ رشید صاحب کم ہی کسی کو اتنا وقت دیتے ہیں۔ اور اس طرح کم ہی کسی کے ساتھ باتیں کرتے ہیں۔

رشید صاحب کے ساتھ میری خط و کتابت بھی رہی زیادہ نہیں کم۔ اس ضمن میں اپنے آپ کو میں بڑا خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ اس خط و کتابت میں دو مواقع ایسے بھی پیدا ہوئے جبکہ رشید صاحب نے خط لکھنے میں پہل کی۔

ابھی ایک برس کی بات ہے میرا ایک مقالہ ایک جریدے میں شائع ہوا عنوان تھا "کلام اقبال میں عورت کا مقام"۔ یہ مقالہ انھوں نے پڑھا تو مجھے اس کے متعلق ایک طویل خط لکھا۔ مقالے کی جی کھول کے تعریف کی اور ساتھ ہی یہ لکھا کہ آپ کو یہاں لفظ "مقام" نہیں لکھنا چاہیے۔ اسے بدل کے "درجہ" کر دیں یا "مرتبہ"۔ چنانچہ میں نے اس لفظ کو بدل دیا۔

اس ضمن میں دوسرا خط میری ایک نظم کے متعلق ہے۔ یہ بہت پہلے ملا تھا۔ نظم تھی "ماتم جہرو" اس میں انہوں نے نظم پڑھ کے یہ مشورہ دیا تھا کہ اس کے فلاں دو بندوں کو ملا کے ایک کر دیں، یعنی چھ مصرعے نکال دیں۔ نظم کا تاثر بڑھ جائے گا۔

رشید صاحب کے خطوط اور رشید صاحب سے ملاقاتیں میری زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔ ان کے ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو جانے پر اگر میں یہ کہوں کہ مجھے اس سے بہت صدمہ ہوا ہے تو یہ ایک چھوٹی بات ہوگی۔

رشید صاحب ایک بڑے نثر نگار، بڑے نقاد، بلند پایہ معلم اور بڑے انسان تھے۔ ان کے چلے جانے سے اردو ادب اور ہندوستان بلکہ ہندوستان و پاکستان کی دنیائے ادب میں صف ماتم بچھ گئی ہے اور اس مختصر سی بات چیت کے خاتمے پر مجھے عدم صاحب کا یہ شعر یاد آ رہا ہے۔ ؎

با کمال انساں کا مرجانا ہے نقصان خدا
کچھ خدا کا بھی تو مرگ ناگہاں گھر یا گیا۔

00—×—×—00

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا (ذوق)

بات کرنی مجھے مشکل کبھی ایسی تو نہ تھی
جیسی اب ہے تری محفل کبھی ایسی تو نہ تھی (ظفر)

مجھے یاد سب ہے ذرا ذرا.....

(کا ایک ورق)

کالی داس گپتا رضا

میں نے ۱۹۴۹ء میں مشرقی افریقہ کے لیے رختِ سفر باندھنا شروع کردیا۔ بات معمولی نہ تھی۔ کالے کوسوں کا سفر، سات سمندر پار۔ کتنے آسیبوں، کتنی بلاؤں سے پالا پڑسکتا تھا مگر اتنا لاکھ آریہ سماجی ہو، پوجا پاٹ کا مقام تو بنا ہی رہتا ہے۔ ماں نے پنڈت رکھا رام[1] کے لیے دوسرے ہی دن صبح کو گھر میں کتھا کرنے کا آدیش دیے دیا۔ پنڈت جی نے "ایتریہ برہمن"
(AITAREYA BRAAHMANA)
سے روہت اور ارجن کی گفتگو سنائی[2] اب اسے میرے لفظوں میں پڑھیے :

---

[1] پنڈت رکھا رام اپادھیائے اس وقت ساٹھ پینسٹھ کے پیٹے میں تھے۔ سنجی بدن، گندمی رنگ، لمبا قد، کمر قدرے جھکی ہوئی۔ عام طور پر صرف دھوتی پہنے رہتے تھے اور کرتا اوپر تن نہیں ڈھانپتے تھے۔ سنسکرت کے بڑے وِدوان مشہور تھا کہ کاشی کے تعلیم یافتہ تھے۔ میں نے پانی جی کی اشٹادھیائی (سنسکرت کی مشہور چھوٹی سی گرامر) ان سے پڑھنے کی کوشش کی تھی، مگر جی چرا کر رہ گیا۔ بڑے خوش آواز تھے۔ کالی داس کی میگھ دوت میں نے ان سے تمام و کمال سنی تھی۔ بہت اچھا سمجھاتے تھے شاید ۱۹۵۵ء کے قریب سورگباش ہوئے۔

[2] مہابھارت کے مشہور یودھا ارجن کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں، مگر روہت کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔ راجا ہریشچندر کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس نے ورن دیوتا سے سخت ریاضت کے بعد بیٹے کے لیے دعا مانگی۔ وہ منظور ہوئی مگر اس شرط پر کہ جب ہماری (ورن دیوتا کی) خواہش ہوگی ہم وہ بیٹا واپس بلالیں گے۔ چنانچہ روہت کا جنم ہوا، مگر بیٹے کے پیار میں راجا ہریشچندر (وہ لاکھ تپسوی تھا) وعدہ بھول گیا اور جب ورن دیوتا نے لڑکا واپس مانگا تو طرح طرح کے حیلے بہانے کرکے ٹالنے لگا۔ آخر اسے ایک دن روہت کو سب کچھ بتانا پڑا اور اسے واپس جانے کے لیے کہا۔ مگر اب روہت

[راجا اندر کا محل۔
ارجن بھوجن کے بعد
اندر کے جگمگاتے دربار
میں روہت سے ملتا ہے
نارد دور سے اس
ملاقات کو اپنی فطری تجسس سے دیکھتا ہے۔ روہت اپنا تعارف کراتا ہے۔ ارجن تعجب سے دیکھتا ہے]

ارجن: "سوریہ تم ہو، یعنی وہ جو ڈر کر گھر سے بھاگ نکلا کہ کہیں اس کا باپ اسے ورن کے حوالے نہ کردے"

نارد: (بیچ میں بولتے ہوئے) "کیا میں یہ سمجھوں کہ دو بہادروں میں جھگڑا ہونے والا ہے"؟

روہت: "نہیں۔ یہاں صرف ایک ہی ویر ہے اور وہ ہے ویرا ارجن۔ ارجن بالکل اسی طرح بات کر رہا ہے جیسے کہ ایک سورما کو کرنی چاہیے"۔

نارد: "کیوں نہیں روہت! تم پانڈوؤں کے مشہور کارناموں سے تو واقف ہی ہوگا"

روہت: "ہاں میں نے ان کے زبردست کارناموں کے سوائے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔ پانڈو شہزادے حقیقت میں عیش و عشرت میں کھوئے رہتے تھے۔ ان کی زندگی کو خودغرضی کے سوا دوسرا نام نہیں دیا جاسکتا"۔

(ارجن غصے سے لال پیلا ہوکر کچھ کہنے ہی والا

(بقیہ کالم ۱)

اور اس نے اسے ذاتی آزادی کے خلاف سمجھا اور وہ گھر سے نکل بھاگا۔ سورگ کے راجا اندر کو روہت کی یہ بلند حوصلگی پسند آئی۔ اس نے روہت کی مدد کرنے کی ٹھان لی اور صلاح دی کہ وہ سفر جاری رکھے اور زندگی کا صحیح مفہوم پاکر ہی دم لے۔ اسی تلاش کے دوران روہت کی مڈبھیڑ ارجن سے ہوتی ہے۔

تھا کہ نارد بول اٹھا)

نارد: "اجی چھوڑیئے۔ پانڈو تو دھرم کی رکھشا کرنے کے لیے ہی جیئے۔ تاکہ دنیا آرام سے رہ سکے"۔

ارجن: (خوش ہوکر) "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، روہت ابھی بچہ ہے۔ اسے کیا معلوم کہ ہمیں یہ سب کچھ کیوں کرنا پڑا"۔

روہت: "میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ تمہیں زندگی کی مشکلات کی للکار سے نمٹنا ہی پڑتا تھا، مگر کیا تم وہی نہیں ہو جس نے اپنے ہی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کی ٹھانی اور پھر اس پر پچھتائے اور نراش ہوکر ہتھیار ڈال دیئے؟ ہاں ہاں مجھے بھگوان کرشن کے وہ لفظ یاد نہیں جو انہوں نے اس وقت کہے تھے جب تم اپنے آپ کو ایک سورما کے بجائے گنہگار اور مجرم سمجھ بیٹھے تھے۔ تم میری نظر میں ایک رومانی 'صلح کل' دانشور اور حساس تو ہو مگر وہ سورما نہیں ہو جو ہر حال میں اپنی جان پر کھیل جاتا ہے"۔

نارد: "اے روہت! جب تمہارے باپ نے تمہیں ورن کو لوٹانا چاہا تھا تو کیا اسی وقت تم نراش نہیں ہوئے تھے"؟

روہت: "ہوا تھا۔ جب ماں باپ اپنے بچے کو نکال باہر کرتے تو بچہ یقیناً اپنے آپ کو بے گھر بچہ لگتا ہے، مگر میں نے ارجن کی طرح یہ نہیں مانا کہ میں غلطی پر ہوں اور میں نے ارجن کی طرح دل نہیں چھوڑا، ہتھیار نہیں پھینکے

پھر زمانہ مجھے غلط سمجھا

جھوٹ پھر بڑھ گیا صداقت سے (کالیدھم ہے پرچار)

بلکہ ایک مضبوط ارادے کا سہارا لیا اور حالات سے لڑنے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا"۔

ارجن:۔ "لیکن میں کشتری دھرم کا پاس کر رہا تھا"۔

نادر:۔ "اور میں جانتا ہوں کہ ارجن کے چار بھائیوں نے جوئے کے کھیل کے بعد حلف اٹھایا تھا کہ جلاوطنی کی مدت ختم ہوتے ہی اپنے حق کو حاصل کرنے کے لیے وہ جنگ کریں گے"۔

روہت:۔ "کیا ان میں وہیں اور اسی وقت کٹ مرنے کی ہمت نہ تھی۔؟"

نادر:۔ "وہ یدھشٹر جیسے دھرم پتر کے لفظوں کے بندھے ہوئے تھے"۔

روہت:۔ یدھشٹر یعنی وہ جو جوئے میں اپنی پتنی تک کو ہار دینے سے نہ ہچکچایا؟"

ارجن:۔ "خبردار۔ تم زیادہ دن زندہ رہتے دکھائی نہیں دیتے۔ اگر تم غور سے حالات کا جائزہ لو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم اوروں کی طرح وقت پڑنے پر بھاگ نہیں کھڑے ہوئے"۔

روہت:۔ "میں جانتا ہوں کہ لوگ ہوا دے رہے ہیں کہ میں گھر سے کائروں کی طرح نکل آیا ہوں۔ بعض کہتے ہیں کہ میں پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا تھا اور التجا کرنے لگا تھا کہ مجھے ورن کے پاس نہ لوٹائیے، اور یہ کہ میں نے وعدہ نبھانے میں اپنے باپ کی مدد نہیں کی۔ مگر کیا آپ جانتے ہیں کہ میرے لیے اس وعدے کے معنی کیا ہیں؟ میرے ماں باپ کو میرے متعلق ورن کی ایسی شرط ماننے کا کیا ادھیکار تھا؟ ایک آدمی دوسرے آدمی کی زندگی کا سودا کرنے کا کیا حق رکھتا ہے، چاہے وہ دوسرا آدمی اسکی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو ---؟"

ارجن:۔ "سورما وہی ہے جو فرض ہی ادا کرنے کو مقدم سمجھے، چاہے جان ہی کیوں نہ چلی جائے"۔

نادر:۔ (روہت سے) تمہیں چاہئے تھا کہ ہر ممکن طریقے سے اپنے باپ کی بات رکھتے"۔

روہت:۔ "لیکن میں آزاد زندگی جینا چاہتا تھا اگر ہیرو (HERO) کہلانے کے لیے ناانصافی تک برداشت کر لینا جائز ہے۔ اور دھرتی پر ظلم برداشت کر لینا اس لیے درست ہے کہ آکاش پر سورگ کے دروازے کھل سکیں تو مجھے یہ منظور نہیں ہے"۔

نادر:۔ "لیکن یہ آزادی ہے کیا چیز؟"

ارجن:۔ "کیا روایت سے بغاوت کرنا آزادی ہے؟"

روہت:۔ یہ درست ہے کہ اس وقت میں صحیح صورت حال سے واقف نہ تھا، مگر میں یہ محسوس ضرور کرتا تھا کہ جینے کے کچھ معنی ضرور ہیں۔ اور مجھے اس زندگی کے صحیح مفہوم کو تلاش کرنا ہے، اکیلے اور اپنے ضمیر کے اندر"۔

ارجن:۔ "اچھا تو تم ہیرو نہیں، ایک رشی ایک فلسفی بننا چاہتے تھے۔ تمہیں یہ احساس نہیں کہ اس عہد کے ٹوٹ جانے سے تمہارے باپ پر کیا گذری۔ وہ مدتوں دکھ درد میں مبتلا رہا اور تیرے کان پر جوں تک نہ رینگی"۔

روہت:۔ میں بھی کچھ کم مصائب سے نہیں گزرا۔ منزل ان کے لیے کبھی سہل نہیں ہوتی جو گھسے پٹے راستوں کو چھوڑ کر نئی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ تنہائی، در بدری اور دنیا کے طعنوں کا کرب مجھے مارے ڈالتے تھا، مگر میں نے تلاش جاری رکھی۔ کیونکہ یہی تلاش اب میری زندگی بن گئی تھی۔ اور جب میں نے اپنے مقصد کو اس معیار پر پہنچا لیا تو پھر ہر تکلیف میرے لیے راحت بن گئی۔ اور پھر اندر میرے پاس آیا، اپنی تمام گھن گرج کے ساتھ"۔

ارجن } "پھر"
نادر }

روہت:۔ "پھر اس نے مجھے حوصلہ بخشا اور کہا کہ لڑکے! جو تم کر رہے ہو وہ کھوج کی انتہا ہے۔ اس کے بعد صرف پانا باقی رہ جاتا ہے"۔

ارجن:۔ (ہنستے ہوئے) "یہ کوئی بات نہ ہوئی"۔

نادر:۔ "یہی بات ہے۔ رشی منی اور انسان جو کھوج کرتے ہیں اور اپنی باطنی قوتوں کو پہچان لیتے ہیں۔ وہ جو چاہے کر سکتے ہیں"۔

روہت:۔ "اور اندر نے یہ بھی کہا کہ بے گھر ہو کر کھوج کرتے رہنے والا راہی سب کچھ حاصل کر سکتا ہے، ہر معنی خیز چیز۔ آرٹ، فلسفہ راج کا راج سب کچھ اندر کھوج کو تخلیقی عمل کا نام دیتا ہے، لیکن کھوج کرتے رہنا شرط ہے۔ اسکی کہی ہوئی یہ نظم نئی نوع انسان کے لیے آہٹ دستاویز ہے"۔

بڑھے چلو بڑھے چلو

یہ ہلچلیں ہی نور ہیں!
شعور ہی ہے راستا
تلاش ہی مقام ہے
نثار دل ہی ہے خدا
جو چل پڑا وہ ست جگی
جو رک گیا وہ کل جگی
وہ شب گئی سحر آگئی

بڑھے چلو، بڑھے چلو

گناہ سے اقصور سے
بشر جو بھول بن گیا
غبارِ قلب بن گیا
نظر کی دھول بن گیا
وہ اک دفعہ جو چل پڑے
تو جان لو سب اس کے غم
فضا کے کانٹوں کی طرح
چھنٹے گئے تلف ہوئے
وہ پھر شاہانہ چال سے
چمنستانِ خشک میں
پنپتا پھول بن گیا
امر اصول بن گیا

بڑھے چلو، بڑھے چلو

سفر خود آگہی تو ہے
فنا بقا ہی تو ہے
یہ آفتاب کا سفر
اسے سمجھ لو راہبر
نہ وہ رکا نہ تم رکو!
گھٹاؤں میں، ہواؤں میں
خزاؤں میں، بلاؤں میں
نہ وہ جھکا، نہ تم جھکو

بڑھے چلو، بڑھے چلو
بڑھے چلو، بڑھے چلو

یہ کہہ کر اٹل روہت شاید کبھی نہ ختم ہونے والی راہوں پر روانہ ہو گیا۔ اور شاید آج تک رواں ہے

رہِ ملال و محن سخت بھی طویل بھی ہے   اسی کے پاس ہے منزل، قدم بڑھاتے چلو (کالیداس گپتا رضا)

گرمی کے دن تھے۔ دس ہی بجے سورج دوپہر کی طرح تمتمانے لگتا تھا۔ پنڈت جی بھوجن کر کے دکشنا لے کر رخصت ہوئے۔

اب شام ہوگئی، سورج ڈوب رہا تھا، مگر گرمی ابھی باقی تھی۔ میں ماں کے پاس بیٹھا پنکھا کر رہا تھا ڈیوڑھی کے باہر، پرکھوں کی حویلی کے قدیم مگر بڑے اور مضبوط دروازے کے قریب۔ چوکھٹ پر نہایت عمدہ کھدی ہوئی، رامائن پر ماں کی نظریں جیسے گڑ گئی تھیں۔ شاید رام بن باس کا منظر آنکھوں میں تھا۔ یکایک بولی "تم ایک لمبے سفر پر جانے والے ہو۔ روہت کی طرح کبھی قدم پیچھے نہ ہٹانا، خاموشی سے دل کی آواز سننا اور اس پر عمل کرنا، کٹھنائیوں سے نہ ڈرنا۔ تم سپھل رہو گے۔ تم جب واپس آؤ گے تو مجھے نہ پاؤ گے، مگر ان باتوں کو نہ بھولنا، شاستر پرماتما کا روپ ہیں، یہ کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔"

میں نے ہمیشہ خاموشی اور استقلال سے ماں کے کہے پر عمل کیا۔

بقیہ :- گاہے گاہے باز خواں .....

قائم مقام ہوتا ہے۔ میں نے ان کی موت پر ایک مضمون ماہنامہ 'شاعر' میں شائع کیا تھا۔

ان کے علاوہ اساتذہ میں پروفیسر سراج احسن نقوی، پروفیسر مولوی، پروفیسر ہمدانی، پروفیسر ترمذی اور پروفیسر ایل۔ [illegible] احمد سے کافی متاثر تھا۔ ان اساتذہ کی وضع مغربی، خوش لباسی اور نستعلیق انگریزی کے نقوش آج بھی میرے دل پر ثبت ہیں۔ یا رب کیسے کیسے لوگ تھے! جب میرا تبادلہ اورنگ آباد گورنمنٹ کالج میں ہوا تو اس وقت پروفیسر نقوی اورنگ آباد ہی میں مولانا آزاد کالج میں کے پرنسپل تھے۔ میں ان سے ملنے گیا تو بڑے پیار سے گلے لگایا۔ برسوں کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ کالج کے زمانے میں میں دبلا پتلا تھا۔ بعد میں بقول "ظ۔ انصاری" "بھاری" ہو گیا تھا۔ اس لئے میں نے نقوی صاحب سے کہا کہ آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟ پہلے تو میں دبلا تھا، کہنے لگے "پامر کا ہر شمارہ میرے پاس آتا ہے اور یہ تصویریں غور سے دیکھتا ہوں۔ جب تمہارا تبادلہ اسمٰعیل کالج میں ہوا تو اس وقت کی تصویریں بھی پامر میں دیکھی ہیں۔ میں اپنے ہر طالب علم کی خبر رکھتا ہوں" اسے کہتے ہیں محبت اور وضعداری!

کالج کے دوستوں میں [illegible] جی شیخ جنہیں ہم نکلسن شیخ کہتے تھے اور جو آگے چل کر سپرنٹنڈنٹ انجینیر ہو گئے تھے۔ اور ڈاکٹر عبد الستار شیش امام جو پتہ نہیں کیوں ڈاکٹر امام کے نام سے مشہور ہو گئے آج بھی مجھے یاد ہے۔ اور برسوں کے بعد ان سے اورنگ آباد میں ملاقات بھی ہوتی۔ مشہور لیڈر اور سابق وزیر حسین دلوائی بھی میرے کلاس فیلو تھے۔ دوستانی کے ہم جماعت فیلو دوستوں میں [illegible] [illegible] کے مسلک کو کیسے بھول سکتا ہوں جو زندہ مثال ہو۔ [illegible] اور اسمٰعیل [illegible] [illegible] میں ڈاکٹر میمونہ دلوی اور ڈاکٹر [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہم عمر تھے) پروفیسر مہوکر، پروفیسر [illegible] [illegible] [illegible] مالی، ڈاکٹر کانی، پروفیسر نشار مانی، پروفیسر بارکیر اور پروفیسر تانک کو کیسے بھول سکتا ہوں۔ ڈاکٹر عالی جعفری کو بھولنا خود فراموشی کے بعد بھی ممکن نہیں۔

صلاح الدین احمد کے علاوہ جو بڑی بڑی اور قابل ذکر شخصیتیں میرے زمانہ طالب علمی میں اسمٰعیل کالج تشریف لائی تھیں ان میں بانی پاکستان محمد علی جناح اور جادو بیان مقرر بہادر یار جنگ کی تقریروں کا نقش آج بھی دل پر ثبت ہے۔

غرض کس کس کو یاد کروں۔ کچھ شخصیتیں ممکن ہے اس وقت بھول رہا ہوں۔ ہاں وہ دیکھئے سلیمان چپراسی جس کا چہرہ ہمیشہ لائبریری میں نظر آتا تھا۔ نئے نئے مانوس چہرے ذہن کے پردے پر ابھر رہے ہیں۔ یہ ہیں جیب تاباتی جن کے قومی ترانے کی گونج آج بھی یاد ہے۔ یہ ہیں ملک واحد نا جنہوں نے کئی بار کالج کے لیے بریوریٹ ٹرافی جیتنے میں اپنی جادو بیانی سے کام لیا تھا۔ یہ ہیں مصطفیٰ کمال، کبھی ان سے بات کرنے کا موقع نہیں ملا، لیکن ان جیسا حسین اور خوش پوش طالب علم میں نے پھر کبھی نہیں دیکھا۔ وہ عیسائی طالبہ کے ساتھ [illegible] [illegible] میں دکھائی دیتے تھے جس کے ساتھ انہوں نے بعد میں شادی کر لی۔ یہ خوبصورت جوڑا ذہن کے پردے پر آج بھی گھومتا ہے۔ وقت نے اب تک ان کے چہروں سے خوبصورتی، دلکشی اور جاذبیت یقیناً چھین لی ہوگی لیکن تصویریں یہ نقوش اسی طرح زندہ و محفوظ ہیں جیسے تصویریں ہوتے ہیں اس لیے اے مادر علمی ایک دور افتادہ کا تجھے پیار بھرا سلام۔

خدا حافظ!

نہیں گوشِ نصیحت نیوش ہمہ [illegible] ورنہ ہر برگ ہے یاں نغمہ سرائی [illegible] [illegible]

گستاخیاں

پرکاش پنڈت

(ہندی رسالے 'ساریکا' کا وہ ہر دلعزیز کالم یا سلسلۂ مضامین' جسکی اشاعت کے ساتھ ساتھ 'ساریکا' کی اشاعت میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔)

ان دنوں ترقی پسند ادیبوں کے میر کارواں سجاد ظہیر عرف بنے بھائی زندہ تھے۔ بنے بھائی کی اہلیہ رضیہ سجاد ظہیر عرف رضیہ آپا زندہ تھیں۔ کرشن چندر اور ہندر ناتھ اور ساحر لدھیانوی زندہ تھے۔ اور زندگی کی ایک لہر تھی، جو ان مرحوموں اور خواجہ احمد عباس' کیفی اعظمی، اور پرکاش پنڈت وغیرہ موت سے محروموں کے رگ و پے میں موجزن تھی۔ اور یہ سب رنگ ماسٹر بنے بھائی کے سرکس میں شامل ہوکر 'حیات' نامی اردو ہفتہ وار کے لیے روپیہ فراہم کرنے شہر شہر اپنی کہانیوں، نظموں اور غزلوں کے کرتب دکھاتے پھر رہے تھے کہ معلوم ہوا مئو ناتھ بھنجن آ پہنچے ہیں۔

جولاہوں کی اس بستی کا نام بھگت کبیر کے کسی دوہے کا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے لیکن بھگت کبیر نے کبھی سوچا بھی نہ ہوگا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ان کے ہم پیشہ لوگوں کی اس بستی میں سوت کے بجائے کہانیاں بننے والے پہنچ جائینگے اور صبح اٹھ کر نہانے کے لیے پانی مانگیں گے۔

مئو ناتھ بھنجن میں اس وقت پانی کی کتنی افراط تھی یہ تو یار لوگوں کو اسٹیشن پر معلوم ہو گیا۔ جب ہندو پانی یا مسلمان پانی' یا کسی قسم کے پانی کے مٹکوں کے بجائے کھریا مٹی کے ڈھیلوں کا ایک ڈھیر نظر آیا جس کے اوپر دیوار پر ایک بورڈ آویزاں ——— 'استنجے کے لیے پاک مٹی ——— اور ایک سفید ریش مردِ مومن وہیں پلیٹ فارم پر کھڑے بڑے تندہی سے استنجہ فرما رہے تھے۔ یہ گویا اس بستی میں ہم کافروں کے خیرمقدم کی ابتدا تھی۔

جو ہو' ہم لوگوں کو بستی کے معزز اور امیر ترین گھرانوں میں ٹھہرایا گیا۔ خوب آؤ بھگت ہوئی۔ ایسے زور آور مرغن کھانے ٹھونس ٹھونس کر کھلائے گئے کہ بہت ترکے سب کی آنکھ کھل گئی۔ اور طرح طرح کے پانی کے مطالبے شروع ہو گئے۔

پینے کے پانی کے لیے تو صراحیاں موجود تھیں لیکن دوسرے ضروری حاجات کے لیے جب لیٹرن کا راستہ پوچھا گیا تو سب کے ہاتھ میں ایک ایک ٹونٹی دار لوٹا تھا دیا گیا کہ ناک کی سیدھ میں چلے جاؤ ——— باہر جنگل ہی جنگل ہے۔

جنگل میں منگل منا آئے تو نہانے کے پانی کیلیے درخواست کی گئی۔ بتایا گیا کہ یہاں جب کسی شخص کو نہانے کی تکلیف ہوتی ہے تو سیدھا دریا کا رخ کرتا ہے۔ دریا کا رخ پوچھا تو انکشاف کیا گیا کہ ان دنوں سوکھا ہوا ہے۔

بڑی گو مگو کی حالت تھی۔ مہمان نہانے کیلیے پریشان تھے۔ اور میزبان اس لیے بھی پریشان اور حیران تھے کہ آج تک اس بستی میں جتنے سرکس آئے تھے' ان میں کسی جناور نے نہانے کا مطالبہ نہیں تھا ——— لیکن مہمان نوازی کا تقاضا تھا کہ مہمانوں کی ہر فطری اور غیر فطری تکلیف رفع کی جائے۔ چنانچہ نہ جانے کہاں کہاں سے لا ڈھو کر پانی لایا گیا اور سوت رنگنے کے چوبچے بھر دیے گئے ——— اور جب یار لوگ ان چوبچوں میں سے نہا کر نکلے تو سب نیلے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ بے ساختہ بھگت کبیر کے پاکستانی شاعر صہبا اختر کا دوہا یاد آ گیا ؂

بانسری ہاتھ میں پکڑ کے منہ پر چھڑ کے نیلا رنگ
سب ہی کرشن بنیں تو رادھا ناچے کس کے سنگ

تحقیق کرنے سے پتہ چلا کہ مئو ناتھ بھنجن میں آج تک رادھا نہیں ناچی تھی۔ حالانکہ وہاں منوں تیل موجود تھا۔ ناچ کی تھکن مٹانے کیلیے نہانے کا ہونا ترشا پڑتا تھی۔

یہ وارنسی یعنی بنارس کا کلاسک ہوٹل تھا جہاں ...

کے لیے لوگوں سے چندہ جمع کرنے والے سب ادیبوں اور شاعروں نے اپنی حیات کی خاطر خود چندہ جمع کیا اور دو تین کمرے بک کرا کے باتھ روموں پر پل پڑے۔

سرکس کا وقت سات بجے شام تھا اور خواجہ احمد عباس اس شو کے لیے الگ بیٹھے 'بنارس کے ٹھگ' عنوان سے کہانی لکھ رہے تھے کہ سوا چھ بجے بنے بھائی کا نزول ہوا۔ فرمایا کہ چلیے سب انتظام ہو گیا ہے۔

'انتظام' لفظ کا مطلب [illegible] کنہیا نے یہ سمجھا کہ مئو ناتھ بھنجن کی طرح [illegible] کسی معزز اور امیر گھرانے میں ٹھہرانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا 'ابھی آیا' کہہ کر [illegible] کھسک گئے۔

سوا چھ کے ساڑھے چھ' ساڑھے چھ کے [illegible] سات اور پھر پورے سات بج گئے [illegible] چندر لوٹ کر نہیں آئے۔ [illegible] جلی آئی تھی کہ فوراً چلیے۔ [illegible] لوگ سیٹیاں بجا رہے ہیں۔ [illegible] طرف سراغرساں دوڑائے گئے [illegible] تو مل گئے لیکن وہ بک کرائے گئے تینوں [illegible] سے ایک کمرے کے باتھ روم کا [illegible] سے پکڑے ہوئے تھے کہ کرشن [illegible] کیا پکڑتے ہونگے ——— اور کیسے [illegible] چاہے جو ہو جائے' اسے نہیں [illegible]

بڑے جتنوں اور جتن [illegible] ان کے ہاتھ سے بانسری چھڑ [illegible] خاتمے کے فوراً بعد سے نہیں [illegible] واپس لا کر ان کے ہاتھ میں [illegible]

سرکس رات کے دس بجے [illegible] کامیاب رہا۔ جب والنٹیروں کی بھیڑ یہاں لوگوں سے [illegible]

راہی تعریف کے ان کھوکھلے شبدوں کے سوا آج کچھ بھی اردو کا کون مانگے ہے (محبوب راہی)

پھر کیئں تو بنے بھائی نے نہال ہو کر اعلان کر دیا کہ لاک ہوٹل کے تمام اخراجات اس جیب پونجی سے ادا کئے جائیں گے جس پر بڑے زوروں کا نعرۂ مستانہ نکلا اور فوراً دو پروگرام بن گئے ۔

ساہو جی کا دلیسی شراب کا وہ ٹھیکہ دیکھا جائے جہاں پریم چند کی کہانی "کفن" کے کردار گھیسو اور مادھو نے بڑھیا کے کفن کے لیے ملے پیسوں سے شراب پی تھی اور کلیجی کھائی تھی اور ناچے تھے ۔

رہبروں کے ہجوم کے پیچھے پیچھے ٹھیکے پر پہنچے اور یہ دیکھ کر سب کے جوڑ طبق روشن ہو گئے کہ ہر نام داس صحرائی نامی پنجابی لکھنے والے جو لوہے کے اوزاروں کے بیوپاری یا ایجنٹ ہونے کی وجہ سے ہندوستان کے تقریباً ہر اجتماع میں پہنچ جاتے ہیں ـــــ تین کلہڑ پی کر اور چوتھا کسی لڑکے پر چھوڑ کر تھرک تھرک کر ناچ رہے تھے اور گھیسو اور مادھو کی طرح ترنگ میں گا رہے تھے ۔

ٹھگنی کیوں نیناں جھمکاوے

× × × ×

دوسرا پروگرام ، یاد نہیں کہ خود کرشن چندر نے بنایا تھا یا عباس صاحب نے کہ بنارس آئے ہیں تو گرجا دلوی کی ٹھمری سنے بنا نہیں جائیں گے ۔ اس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے ۔ جب پوچھتے پچھاتے مطلوبہ علاقے میں پہنچے ۔ اتفاق سے ایک چیت قسم کا رہبر بھی مل گیا جو آڑی ترچھی اور ٹیڑھی ترچھی گلیاں پار کرا کے ادب اور کلچر کے ان نام لیواؤں کو ایک کوٹھے پر لے گیا ۔ جہاں ادھیڑ عمر کی ایک خاتون کٹوں میں پان کے بیڑے ٹھونسے بڑے ٹھسّے سے بیٹھی تھیں ۔ بڑے ادب اور تہذیب سے تشریف رکھنے کو کہا ۔ لیکن ابھی یار لوگ پوری طرح تشریف نہیں رکھ پائے تھے کہ پندرہ سے چھبیس برس کی آٹھ دس چھوکریاں قطار اندر قطار وارد ہوئیں اور پان کی بیڑوں والی محترمہ نے ، جو ظاہر ہے کہ گرجا دلوی ہی تھیں ، پان کے چھینٹے اڑاتے ہوئے کرشن چندر اور عباس صاحب کے سیتھوں ایسے گنجے سروں پر شفقت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا ۔ "چن لیجئے صاحب ! آپ کے سامنے ٹھمریاں ہی ٹھمریاں ہیں "

ویسا ہی چیت قسم کا ایک اور رہبر کلارک ہوٹل سے یار لوگوں کو سارناتھ کے درشن کرانے لے گیا ۔ وہاں کا بودھ مٹھ اور استوپ دیکھ کر پرکاش پنڈت سب سے زیادہ متاثر اور جذباتی ہو گئے ۔ کیونکہ وہ بودھ بھکشو دھرما نند کوسامبی کی مشہور گجراتی کتاب "بھگوان بدھ" کا ساہتیہ اکادمی کے لیے اردو میں ترجمہ کر چکے تھے اور ترقی پسند ادیب لیلانے کے باوجود بھگوان بدھ کے درمیانی راستے کو زندگی کے لیے سب سے متوازن راستہ سمجھتے تھے ۔

مٹھ میں اگر بتیوں کی خوشبو دار آفاقی قسم کے ماحول میں بودھ بھکشوؤں کے پیچھے کھڑے ہو کر "بدھم شرنم گچھامی" دھرم شرنم گچھامی ، سنگھم شرنم گچھامی" گا کر گنگنانے کے بعد وہ لمبا چوڑا رنبہ بھی دیکھا جہاں بڑے سندر مرگ یعنی ہرن ہرنیاں چوکڑیاں بھر رہے تھے ۔ ان مناظر سے سرشار ہو کر باہر آئے تو حضرت رہبر نے شاید پرکاش پنڈت کی دلی کیفیت بھانپ لی ۔ قریب آ کر کان میں بولا " صاحب ! اپنے ساتھیوں سے پوچھ لیجئے ۔ اگر رات یہاں سارناتھ میں گزارنا چاہیں تو ایسی درجنوں مرگیاں سیوا میں پرستت کر سکتا ہوں ..."

× × × × × ×

اس کے بعد کے کئی پڑاؤ اب پرکاش پنڈت کو یاد نہیں رہے ۔ تھوڑا سا کانپور کا پڑاؤ یاد ہے جہاں سرکس کے گھوڑے اس لیے جانے سے بچ رہے تھے کہ وہاں نشہ بندی تھی ۔ لیکن نشہ بندی کے کڑے انتظامات کی وجہ سے بیچ میونسپل ہال میں وہسکی اور لائیبر کی ایسی ندیاں بہا دی گئیں اور کیفی اعظمی نے اس میں اتنی زیادہ ڈبکیاں لگائیں کہ علاج کے لیے روس تک ہو آئے پر بھی آج تک ان کا فالج ٹھیک نہیں ہو سکا ۔

ارے ہاں ، ایک تھا متا رہبر تو ذہن سے اترا ہی جا رہا تھا ۔ بنارس میں گنگا کے گھاٹ پر سادھو سنتوں اور ایک منتر کر مندر مسجد کے درشن کر کے یار لوگ لپک جھپک ہوٹل کی طرف لوٹ رہے تھے کہ زیادہ سے زیادہ دس برس کا ایک لڑکا ایک لمبی چھڑی ہاتھ میں لئے سامنے آ کھڑا ہوا ۔ " ایک جوتی ساب ـــ اور سب دکھاؤنگا .... " اور اس نے بیچ سڑک پر بنے ایک چھوٹے سے مندر کی چھت تک چھڑی لے جاتے ہوئے کہا ۔ " سب سے پہلے یہ دیکھئے ساب ! یہ بکری آسن ہے "

اور ادب اور کلچر کے ان پرستاروں کے سر مارے ندامت کے جھک گئے کیونکہ اس ننھے سے لڑکے کے دکھائے ہوئے منظر کو اس وقت تو وہ دیکھ رہے تھے لیکن مندر کے آس پاس بنے گھروں میں رہنے والے لڑکے لڑکیاں ہر روز نہ جانے کتنی بار وہ اور ویسے ہی دوسرے مناظر دیکھ دیکھ کر نعرے لگاتے ہوں گے ـــ

زندہ باد ہمارا عظیم اور قدیم کلچر زندہ باد !

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو   آئینہ خاک ... ہے صورت پرست ہے ۔ ذوق

خیر مقدم

دلدار ہاشمی
۶۴۔ ایرووڈا پونہ ۔ ۶

۱۹۶۳ء کا زمانہ تھا۔ آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو پونہ ریس کورس میں تشریف لانے والے تھے۔ ریس کورس کے وسیع و عریض میدان میں خوب صورت ڈائس بنایا گیا تھا۔ ناظرین کے ہجوم کا یہ عالم تھا کہ جہاں تک نظر کی رسائی تھی سروں کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر دکھائی دیتا تھا۔ چند دوستوں (دشرتھ شیولے اور رتنیش نائک) کی کوشش اور سفارشات سے سرکاری طور پر مجھے اس جلسے میں نظم پڑھنے کی اجازت مل گئی تھی۔

نہرو جی کی آمد سے چند منٹ قبل میرے نام کا اعلان ہوا۔ میں نے مائک اپنے قد کے برابر کروایا اور نظم شروع کر دی۔ نظم کا پہلا بند پڑھتے ہی پورا میدان تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ جب اس شور کی بازگشت میری سماعت سے ٹکرائی تو میں ہکا بکا رہ گیا۔ میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ یہ شور کیسا ہے۔ لیکن جب وجہ سمجھ میں آ گئی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ یہ نظم کی داد تھی جو تالیوں کی صورت میں مجھے ملی تھی۔ میں نے نظم کا دوسرا حصہ جیسے ہی شروع کیا ہیلی کاپٹر کی گڑگڑاہٹ ہمارے سروں پر سنائی دی اور دوسرے ہی پل ہیلی کاپٹر میدان میں اتر آیا۔ نہرو جی ہیلی کاپٹر سے اتر کر جیسے ہی ڈائس پر تشریف لائے "چاچا نہرو زندہ باد" کے نعروں سے میدان گونجنے لگا۔ میری نظم کا بند میرے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ لیکن میں نے حوصلہ نہیں چھوڑا مضبوطی سے مائک تھامے اپنی جگہ خاموش کھڑا رہا۔ پنڈت جی نے مسند نشینی کے بعد منتظمین سے کہہ کر مجھے پھر سے پڑھوانا شروع کیا۔ میں نے نظم از سر نو شروع کی "تمہارے خیر مقدم کے لیے محفل سجائی ہے" پنڈت نہرو مسکرا دیئے۔ تالیوں کا شور دوبالا ہو گیا میں نظم پڑھتا رہا لوگ تالیاں بجاتے رہے اور پنڈت جی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھتے رہے۔ نظم ختم کر کے جب میں ڈائس سے اترا تو وقتی طور پر میری قسمت ہی بدل گئی تھی۔ لوگ مجھے گلے لگانے کے لیے بے تاب تھے لیکن پولس کی محافظت نے بچا لیا۔

پنڈت جی کو ہم سے بچھڑے ایک زمانہ بیت گیا لیکن ان کی یاد ہر سچے ہندستانی کے دل میں موجود ہے میں انتہائی کوشش کے باوجود ان کا ٹکٹکی باندھے میری طرف دیکھنے کا انداز بھولنا چاہوں تو بھول نہیں سکتا:

زاہد کمال کو صدمہ

پونہ کے ہر دلعزیز شاعر زاہد کمال کے برادر معظم میرزا حامد بیگ کا ان کے وطن اورنگ آباد میں انتقال ہو گیا۔

رونق جمال کو صدمہ

مختصر افسانوں کے خالق نوجوان ادیب نواب رونق جمال کے والد بزرگوار کا ان کے وطن امراوتی میں انتقال ہو گیا۔

حسین کریم خان کو صدمہ

اراکین اسباق کے مخلص دوست جناب حسین کریم خان کے برادر صغیر اسماعیل خان کا ایرووڈا میں انتقال ہو گیا۔

ادارۂ اسباق اور اراکین بزم اردو مرحومین کے حق میں دعائے مغفرت کرتے ہیں نیز پسماندگان کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

رنگ بھون بمبئی میں مشاعرہ

غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے رنگ بھون میں آل انڈیا مشاعرہ تھا جس کے کنوینر خواجہ عبدالغفور تھے پونہ کے اس وقت کے کانگریسی صدر کا سفارشی خط لے کر میں بیرسٹر انتولے کے بنگلے پر پہنچا (کانگریسی صدر کا خط انتولے جی کے نام تھا)، خط دیکھ کر انتولے مسکرائے اور پوچھنے لگے "مشاعرے میں کیا پڑھو گے؟" میں نے کہا "قومی ایکتا پر نظم ہے۔" انتولے پھر مسکرائے اور کہنے لگے "کہیں ایسا نہ ہو تم کچھ بھی پڑھ جاؤ اور مجھے بیڑیاں لگ جائیں"۔ جب میں نے یقین دلایا تو انھوں نے خواجہ عبدالغفور کے نام خط لکھا:

"خواجہ صاحب!

یہ شاعر پونہ سے آیا ہے، مشاعرہ پڑھنے کا متمنی ہے۔ پہلے اس کا کلام سن لیجیے اس کے بعد مشاعرے میں شامل کر لیجیے"۔

خط لے کر جب میں خواجہ صاحب کے پاس گیا تو مرحوم فراق گورکھپوری، قابل شاہجہاں پوری، مجروح سلطانپوری، سردار جعفری وغیرہ وہیں موجود تھے۔ میں نے خط خواجہ صاحب کو دیا۔ انہوں نے چاک کر کے پڑھا تو فراق صاحب نے پوچھا: "کیا ہے؟"

خواجہ صاحب نے کہا "پونہ سے ایک شاعر آیا ہے اور مشاعرہ پڑھنے کا خواہش مند ہے"۔

فراق صاحب نے برجستہ کہا۔

"آج کیا ہے پڑھوا دو۔ نوجوانوں کو موقع دو! ان کی حوصلہ افزائی کرو، یہی لوگ کل ایوان سخن کے محافظ ہوں گے"۔

اس وقت میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ فرط مسرت سے دل جھوم اٹھا تھا۔ میں نے بڑے بڑے مشاعرے پڑھے ہیں لیکن اس مشاعرے کی کیفیت ہی کچھ نرالی تھی فراق دنیا سے چلے گئے۔ لیکن ان کے کہے ہوئے جملے آج بھی میری سماعت میں زندہ ہیں۔

سچائیوں کو اوڑھ کے نکلا جو شہر میں
سارے تمام جھوٹ کے مجھ سے لپٹ گئے (نذیر فتح پوری)

رہیے اب ایسی جگہ چل کر

انیس چشتی

ٹھیک سے یاد نہیں، سردار عرفان سے پہلا تعارف کب اور کیونکر ہوا؟ البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ہمارا تعارف قلمی اور ادبی نوعیت سے تجاوز کر کے بے تکلف دوستی کی حدوں میں داخل ہوگیا تھا۔ انقلاب کے صفحات، خصوصاً ادبی سیکشن ہماری ملاقات کا پیش خیمہ بنے جس کے مضامین وہ بڑی لگن اور دلچسپی سے مرتب کرتے تھے۔ پہلی بار جب ان سے ملنے کا اتفاق ہوا تو یوں محسوس ہوا کہ پرانی شناسائی ہے۔ جیسا سنا تھا، ویسا ہی پایا۔ سانولی رنگت، چھریرا بدن، مائل بہ درازی، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، پیچھے کی طرف سلیقے سے سجے ہوئے بال، سیاہ فریم کی مستطیل عینک جس میں سے جھانکتی ہوئی متجسس آنکھیں، مسکراتے لب، جیسے ابھی ابھی کوئی تازہ لطیفہ سنا ہو۔ فطرت میں تواضع اور انکسار، شخصیت میں بلا کی جاذبیت گھنٹوں بات کرتے رہئے بوریت محسوس نہ ہوگی۔ اس خصوصیت کو ہمارے بزرگوں نے "سبک روئی" کہا ہے۔

اکثر ایسا ہوا کہ باندرہ کے فلیٹ میں ہم رات تقریباً آٹھ بجے بیٹھے اور خوش گپیوں کے درمیان جب چونکے ہیں تو گھڑی صبح کے ۲ بجا رہی ہوتی۔ دوستوں سے متعلق دل میں نرم گوشہ جو دوست نوازی سے تجاوز کر کے دوست پروری کی حد تک پہنچا ہوا۔ چال ڈھال، نشست و برخاست اور عادات و اطوار میں بلا کی خودداری اور اعتماد۔ پورا وجود گویا کہہ رہا ہو ؏

اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

سردار عرفان کامرس کے گریجویٹ تھے لیکن پیدا اردو ادب کے لیے ہوئے تھے۔ ان کا انگریزی ادب کا مطالعہ بھی بڑا وسیع تھا۔ ان کے کردار کے بارے میں لوس اور قتل کی تحقیق کرنے والے قیاس آرائیاں کر رہے ہیں، ابھی تک کوئی بات پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچی ہے۔ لیکن مجھے تو اتنا معلوم ہے کہ ایک شخصیت میں خدا نے لاتعداد صفتیں پوشیدہ کر دی تھیں۔ بیک وقت وہ ادیب و شاعر، صحافی، سخن فہم، محاسب خطاط، آرٹسٹ، فنون لطیفہ کے رسیا اور سب سے بڑھکر یہ کہ سچے مسلمان تھے۔ ورنہ جہاں ریڈیو اور ٹیلی وژن کا ذکر آیا پیشہ ور ادیبوں اور شاعروں سے ربط ہوا، فنون لطیفہ کے کوچے سے شناسائی ہوئی تو سمجھ لیجیے کہ عادات کے طور پر نہ سہی کم از کم فیشن کے طور پر تو شراب کی چسکی لگانی ہی پڑتی ہے ورنہ یہ محفل آپ کو نامہذب اور غیر ترقی یافتہ کے خطابات سے نوازیگی۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے انہوں نے شراب کبھی نہیں پی، کیونکہ اکثر انہوں نے ایسی محفلوں کا ذکر بڑی کدورت کے ساتھ کیا اور وہاں سے اکثر اٹھ آئے۔ اور شاکی ہونے کی بجائے شاکر رہے۔

طبیعت میں بے انتہا نفاست تھی۔ اس کے باوجود وہ حالات سے مجبور ہو کر ایسی جگہوں پر بودوباش رہے جہاں راستوں سے گذرتے وقت اکثر پائنچے سنبھالنے پڑتے تھے۔ ان محلوں کا جغرافیہ ہی اس قسم کا تھا۔ موجودہ سطح سے بلند ہونے کی کوشش میں لگے رہنا محنت ایمانداری اور لگن نے انہیں ان بستیوں سے نکال کر باندرہ کے فلیٹ میں پہنچایا۔ جب پہلی بار مکان دیکھا تو فرحت محسوس ہوئی۔ ان کا سلیقہ اور قرینہ، ساز و سامان کی دروبست کسی مسجع عبارت سے کم نہ تھی۔ یہاں پہنچ کر وہ زندگی میں یک گونہ سکون محسوس کرتے تھے۔ جس ماحول میں پلے بڑھے تھے اور جن حالات میں ان کی پرورش ہوئی تھی اس کے پس منظر میں

سردار عرفان، بحیثیت ایک قلم کار اپنی معراج پر تھے۔ ان کی آسائشیں اکتسابی تھیں۔ ان کے تعلقات دوستوں کا گز بننے کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ ان کے ارتقاء میں قلم کی سیاہی۔ جگر کے خون اور راتوں کی جگار کی آمیزش تھی۔

کم عمری کے باوجود بالغ نظری، طبیعت میں ٹھہراؤ، خیالات میں پختگی، مقصد کی لگن، کام کی تڑپ اور ارتقاء کا جنون لیے ہوئے کوئی نوجوان میں نے نہیں دیکھا۔

ماسکو کے ایک پبلشنگ ہاؤس میں ان کا حال ہی میں تقرر ہوا تھا بحیثیت اردو ایڈیٹر۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز نہیں کہ مکہ سے ان کا تعلق برائے نام تھا۔ گذشتہ ایک دو برس میں ان کے مطالعے کے رجحان میں بڑی تبدیلی آگئی تھی۔ شعر و ادب کے بعد ان کی طبیعت تصوف کی کتابوں کی طرف مائل تھی ملاقات پر اکثر دینی اور مذہبی کتابوں اور تفسیر قرآن کے اقتباسات پر گفتگو رہتی۔ قرآن کے دلائل اور آیات کا ذکر بڑے والہانہ انداز میں کرتے۔

اردو اکیڈمی کے استعفیٰ سے پہلے وہ ذہنی طور پر اور استعفیٰ کے بعد مالی طور پر بہت پریشان رہے۔ اخبارات میں ان کے خلاف مسلسل لکھا جاتا رہا۔ سچیوالیہ میں ریشہ دوانیاں بھی شروع ہوئیں۔ اسی زمانے میں ان کے چوری بھی ہوئی جس میں ایک بڑی رقم جاتی رہی۔ لیکن ان حالات کے باوجود ان کے چہرے کی مسکراہٹ پیشانی کی کشادگی متاثر نہ ہوسکی۔ میں نے ایک خط کے ذریعہ انہیں حالات سے سختی کے ساتھ

غمِ زندگی کے گیسو جسے موت نے سنوارا ترے ہاتھ سے سنورتے تو کچھ اور بات ہوتی (زاہد کمال پونہ)

نمٹنے کی تاکید کی حالانکہ میں جانتا تھا کہ سردار عرفان استقامت اور صبر و ثبات کا پیکر ہیں بہر حال ان حالات میں ہماری دوستی کا یہ تقاضا تھا کہ میں ان سے ہمدردی کرتا۔ انہوں نے ۷ نومبر ۱۹۷۶ء کو اس خط کے جواب میں دیگر باتوں کے علاوہ مجھے لکھا تھا کہ:

"آپ نے جن افراد کا ذکر کیا ہے ان کا جواب دینا یا بدلہ لینے کی ضرورت میں قطعی نہیں سمجھتا۔ اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ بفضلہ تعالیٰ یہ لوگ مجھے کسی قسم کا گزند نہیں پہنچا سکتے۔ علاوہ ازیں ایسے لوگ دنیا میں بھی ذلیل ہوتے ہیں اور اپنی عقبیٰ بھی خراب کرتے ہیں۔"

خط کا ذکر آ گیا ہے تو ضروری سمجھتا ہوں کہ ان کی خوشنویسی کا ذکر کروں۔

وہ بہت اچھے خطاط اور آرٹسٹ بھی تھے۔ قلم سے بننے والا ہر موڑ اور ہر زاویہ ان کے جمالیاتی ذوق کا پتہ دیتا تھا۔ اور سچ پوچھیے تو کتابت کے پیشے کو ان جیسے پڑھے لکھے لوگوں نے عزت بخشی ورنہ اس اردو کش دور میں صرف اچھی اردو تحریر کر کے باعزت جینا مشکل ہے۔ مہاراشٹر اسٹیٹ ٹیکسٹ بیورو کی آٹھویں سے دسویں تک الجبرا اور جیومیٹری کی تمام کتابیں ان ہی کی کتابت کردہ ہیں۔ انگریزی کی بھی بہترین کتابت کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا ہے گویا ٹائپ کے حروف کا عکس لے لیا گیا ہو۔ یہ ذکر تو کتابت یا خوشنویسی سے متعلق تھا۔ ان کی تصنیفی اور تخلیقی صلاحیت بھی بہت عمدہ تھی۔ زبان و مضمون پر اتنی مضبوط گرفت تھی کہ صفحے کے صفحے لکھ جاتے لیکن شاید ہی کہیں کوئی کٹا ہوا ہوتا۔ معلوم ہوتا کاغذ ان کی جاگیر اور قلم ان کی رعایا ہے۔ جو جملہ لکھتے فائنل ہوتا۔ بارہا ایسا ہوا کہ احباب ان کے نئے مکان میں خوش گپیوں میں مصروف ہیں اور سردار عرفان ہاتھ میں باریک نب والا قلم پکڑے کچھ لکھ رہے ہیں۔ پتہ چلا کہ رات میں سردار نے جو لکھا تھا وہ دوسرے دن حکومت کے ایوانوں میں کسی بھاری بھر کم شخصیت نے پڑھا اور جس کے منتخبہ خیالات کو اخباروں نے شہ سرخیوں میں جگہ دی وہ سردار عرفان نے دوستوں کی موجودگی میں مکان کے کونے میں ریڈیوگرام والی میز پر بیٹھ کر لکھا تھا۔ ادارہ انقلاب سے وہ ایک طویل عرصہ تک وابستہ رہے۔ روزنامہ کے کاتب صاحبان اس بات کی گواہی دیں گے کہ سردار عرفان کی جانب سے کتابت کے لیے دیا جانے والا مسودہ کس قدر نفیس ہوتا تھا۔ کیا مجال ہے کہ کالم کے حساب سے ان کی سطر میں ایک لفظ بھی زائد ہو۔

پونہ جب بھی آئے از خود رفتہ ہو جاتے۔ یہاں ان کے ذوق کو نئے بال و پر لگ جاتے کہتے بس ہیں تو پونا میں آسمان دیکھو نا۔ کتنا روشن نیلا اور چمکیلا ہے۔ بمبئی میں تو آسمان دیکھنا نصیب ہی نہیں ہوتا۔

ان دنوں وہ بہت اچھے اشعار کہہ رہے تھے بہت زود گو تھے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی ایک نظم دوسری جماعت کے نصاب میں شامل ہے۔

ایسی ہمہ گیر شخصیت کی جواں مرگی پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے۔ بمبئی کی پیروں پہ دوڑنے والی اور پہیوں پر پھسلنے والی زندگی سردار عرفان کو کھا گئی۔ ایک کروڑ کی آبادی مل کر بھی ایک شخص کا تحفظ نہ کر سکی۔ ان کی موت پر اب بھی اسرار کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ جس گھر کو انھوں نے شبانہ روز کی محنت سے بنایا تھا وہی سات دن تک ان کا مدفن بنا رہا۔ رشوت ستانی کے ذریعہ غنڈوں کو دی جانے والی چھوٹ پتہ نہیں اس ملک میں کیا رنگ لائیگی۔ بس ہمارا تو یہی کہنے کو جی چاہتا ہے کہ ع۔

رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

جہاں غنڈے نہ ہوں، قاتل نہ ہوں، پولس نہ ہوں اور پولس کے عملے پر نگرانی کرنے والی ناقص حکومت بھی نہ ہو۔ لیکن سردار عرفان کی فکر تو بہر حال بلند تھی انہوں نے اس سے دو مصرعے آگے سوچا اور اس پر عمل کیا۔

پڑیئے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار
اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو۔

"ایک ہزار قابل انسانوں کے مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک بیوقوف کے صاحبِ اقتدار ہونے سے"
(عمرو بن العاص رضؓ)

ہزار بار مرا عزم برقرار رہا
ہزار بار لگی آگ آشیانے کو (ڈاکٹر امانت پونہ)

پیٹ کے مسئلے بلاتے ہیں کارخانے، دکان، دفتر، جیل محبوب راہی

باب ۱۴
طنز و مزاح

ترتیب

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ   رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ   (اکبر الہ آبادی)

تختی سے تختے تک

یوسف ناظم
باندرہ - بمبئی

ہاں نگاہِ شوق وہ اٹھی نقاب!

امتحان اور امتحانی پرچے کوئی نئی بات نہیں ہیں۔ یہ سلسلہ اُس وقت سے جاری ہے جب انسان نے ہما سے کانوں میں بات پھونکی تھی کہ تعلیم سے ہی بات دور ہوسکتی ہے۔ نتیجا سامنے ہے، پہلے ہماری درس گاہوں میں "پٹائی" ہوا کرتی تھی۔ پھر کچھ دنوں کے لیے "پڑھائی" شروع ہوئی۔ اب "لڑائی" کا دور دورہ ہے۔ لیکن امتحان برابر ہوتے ہیں۔ ان کا وقت البتہ طے نہیں ہے۔ امتحان کا نتیجا بھی نکلتا ہے۔ لیکن اس کا بھی وقت طے نہیں ہے۔ ٹائم ٹیبل صرف ریلوں اور ہوائی جہازوں کی حد تک اچھا معلوم ہوتا ہے۔ امتحانوں اور اس کے بعد ہونے والے واقعات کو ٹائم ٹیبل کا پابند کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اب تو قدرت کے کارخانے کا بھی انتظام بدل رہا ہے جس موسم کا جب جی چاہتا ہے آجاتا ہے۔ گرمی کے دنوں میں بھی بارش ہوتی ہے اور بعض وقت بارش کے دنوں میں بھی بارش ہوتی ہے اس لیے اگر امتحان وقت پر نہ ہوں یا ان کا نتیجہ وقت پر نہ شائع ہو تو اتنی سی بات پر دل میلا نہ کرنا چاہیے۔

امتحانوں کے معاملے میں ایک پابندی البتہ پابندی سے ہونے لگی ہے۔ اب امتحان سے پہلے امتحانی پرچوں کا "آشکارا" ہونا امتحان کی لازمی شرط بن گیا ہے۔ ایسا نہ ہو تو امتحان کا لطف جاتا رہتا ہے۔ شروع شروع میں جب امتحانی پرچے وقت سے پہلے بے پردہ ہونے لگے تو لوگوں کو کچھ عجیب عجیب سا محسوس ہوا لیکن اب اگر کسی امتحان کے پرچے پہلے سے نمودار نہ ہوں تو امتحان منسوخ نہیں تو ملتوی ضرور کردیا جاتا ہے۔ امتحانی پرچوں کا طشت از بام کیا جانا اب ایک معززہ طریقِ کار کے مطابق ہے۔ ورنہ ذرائع حمل و نقل کی کمی اور مواصلاتی نظام کی خرابی کی وجہ سے امتحانی پرچوں کا فیض پہلے چند ہی لوگوں تک پہنچا تھا۔ اب ایسا نہیں ہے۔ ہر شہر اور شہر کے ہر محلے کے امیدوار اپنا اپنا سنڈیکیٹ بنا کر ان پرچوں کو قیمتاً حاصل کرسکتے ہیں۔ امتحان کو مقبول بنانے کے لیے یہ انتظام ضروری ہے۔ اخباروں میں بھی آئندہ بس ایک مرتبہ ایک ہی خبر چھپا کرے گی کہ اس سال کس امتحان کے پرچے قبل از وقت بے نقاب نہیں ہوسکے اور اس کوتاہی کا ذمہ دار کون ہے؟

اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی!

جب دنیا نے اتنی ترقی نہیں کی تھی تو طالب علموں کو سال میں صرف ایک مرتبہ فیل ہونے کی اجازت تھی۔ اب سال میں دو مرتبہ فیل کی سہولت عام کردی گئی ہے لیکن اتنی ذرا سی سہولت جسے قلیل کہنا چاہیے نا کافی ہے۔ اس لیے مزید سہولتوں کے لیے دوڑ دھوپ جاری ہے۔ یہ دوڑ دھوپ بھی خوب چیز ہے۔ پتہ نہیں اس کا مطلب دھوپ میں دوڑنا ہے یا دوڑ کر دھوپ میں اپنا دہ پسینہ سکھانا ہے جو عموماً بڑے لوگوں کی فرمائش پر بہایا جاتا ہے۔ اس دوڑ دھوپ کا تعلق بہر حال امتحان سے ضرور ہے کیونکہ امتحان ہوتے ہی دھوپوں میں ہیں۔ امتحان کی تاریخوں کا اعلان اس وقت ہوتا ہے جب دھوپیں ناقابلِ برداشت ہو جائیں۔ سارے امتحان عموماً اپریل یا مئی میں ہوتے ہیں۔ کیونکہ یہی وہ گرم بلکہ آتشیں مہینے ہیں جن میں ماہران لیبر کے مطابق چیل انڈا چھوڑتی ہے۔ (یاد رہے کہ پرندوں اور چرندوں میں چیل ہی وہ قوم ہے جو انڈا چھوڑتی ہے باقی سب لوگ انڈوں کو نیوڑا نہیں کرتے بلکہ نہایت ہی احتیاط کے ساتھ دیا کرتے ہیں۔) امتحان کا دوسرا جشن اکتوبر میں منعقد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ اکتوبر کی گرمی بھی دور دور تک مشہور ہے۔ گرمیوں میں امتحان مقرر کیے جانے کی وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ ان میں دن بڑے ہوتے ہیں۔ لکھنے کے لیے وقت زیادہ ملتا ہے اور غلطیاں زیادہ کی جاسکتی ہیں۔ طالب علموں کو اتنی سہولت تو ملنی ہی چاہیے۔

اپریل کے امتحان میں فیل ہونا مشکل نہیں ہے۔ جو طالب علم اس امتحان میں ذاتی یا موروثی قابلیت کی بنا پر فیل ہونا پسند نہیں کرتے وہ امتحان دیتے وقت ایسے طالب علم کے جوابی پرچے کی نقل کرتے ہیں جو خود اعلانیہ طور سے فیل ہونے کے مستحکم ارادے کے ساتھ امتحان ہال میں داخل ہوتا ہے۔ اکثر طالب علم جن کا وقت بہت قیمتی ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ دو پرچے کرنے کے بعد خود کو مزید زحمت نہیں دیتے۔ (وہ کہتے ہیں نتیجا معلوم ہو گیا)۔

اکتوبر کے امتحان میں دوسری مرتبہ فیل ہو جانے کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اپریل سے اکتوبر کی مدت میں مذکورہ طالب علم کی بینائی اتنی کمزور ہو جاتی ہے کہ وہ ٹھیک سے نقل نہیں کرسکتا۔ آج کل بینائی کا یہ عالم ہے کہ بیٹے باپ کو نہیں پہچان سکتے۔ لوگ کہتے ہیں اگر آنکھوں کے کمزور ہونے کی رفتار یہی رہی تو آگے چل کر میاں بیوی ایک دوسرے کو مس کر یا چھو کر ہی پہچان سکیں گے (سماجی علم کی اہمیت بڑھتی ہی جا رہی ہے)۔

امتحان یوں بھی ناقص چیز ہے۔ دنیا میں جتنے تجربے ناکام ہوتے ہیں، امتحان ان میں سرِفہرست ہے (کامیاب تجربہ صرف ایٹم بم کا ہوا ہے)۔ کوئی غبی طالب علم امتحان میں کامیاب ہو کر گدی پر بیٹھ جاتا ہے۔ تو کوئی ذہین طالب علم ناکام ہو کر ردی کے نیچے دب جاتا ہے۔

امتحان میں کامیاب ہونا طالب علم کی تنہا ذمہ داری ہے کیونکہ اس میں ممتحن بھی ہوسکتا ہے۔ اور اگر صرف ایک

پیدا معاشرے میں ہوا اس طرح بگاڑ
کھیتوں میں زلزلے سے پڑے جس طرح دراڑ (مرزا طفی)

ممتحن ہو تو فیل ہونے والے طالب علموں کے زخمِ جگر کسی ایک شخص کے دست و بازو کے نام منسوب کیے جا سکتے تھے لیکن یہ کام کئی لوگوں کے سپرد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ صرف ایک ممتحن اتنے سارے طالب علموں کو تنہا فیل نہیں کر سکتا اس لیے ہر ممتحن کے حصے میں چند سو طالب علم آتے ہیں جن پر انہیں اختیارِ کل حاصل ہوتا ہے۔ (اختیارِ کل اُس اختیار کو کہتے ہیں جس میں طالب علم کا کوئی جز سلامت نہیں رہتا) ـــــ فیل تو سبھی کرتے ہیں لیکن کوئی زخمی کرتا ہے تو کوئی شہید کسی کا وار بھاری ہوتا ہے تو کسی کا کاری۔ کیونکہ ہر ممتحن کے گھریلو حالات الگ الگ ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ممتحن گھر داماد ہوتا ہے تو ایک کثیر العیال۔ ایک کنوارا ہوتا ہے تو ایک تین چار مرتبہ کا شادی شدہ ہوتا ہے اور ایک کچھ ہوتا ہی نہیں ہے۔ طالب علموں کے جوابی پرچوں کی قدر و قیمت، پرچے جانچنے والوں کے گھریلو حالات پر منحصر ہوتی ہے۔

ممتحن کو اگر ناشتے میں دو انڈوں کا آملیٹ، آم کا مربہ، کرم پراٹھے اور گرم چائے نصیب ہوتی ہے تو ہر طالب علم چاہے اس نے اندرا گاندھی کو مہاتما گاندھی کی بیٹی ہی کیوں نہ بتایا ہو اعلیٰ نمبروں کا مستحق ہوگا اور اگر ممتحن منہ اندھیرے بغیر ناشتے کے گھر سے نکل گیا ہے تو جوابی پرچہ جانچتے وقت اسے انڈے ضرور یاد آئیں گے اور ہر طالب علم چاہے اس نے سارے بادشاہوں اور سارے راجاؤں کی بیویوں کے اسٹاک کی تفصیل تک صحیح لکھی ہو فیل ہونے سے بچ نہیں سکتا۔ (امتحان کے اصول کو توڑا نہیں جا سکتا)۔ ممتحنوں کے گھریلو حالات کو جانچنے اور جانچنے کے بعد ان حالات کو بدلنے کا آلہ ابھی ایجاد نہیں ہوا ہے۔

امتحان تحریری بھی ہوتے ہیں اور زبانی بھی۔ جب کسی شخص کی خدمت میں بہت زیادہ اونچی ڈگری پیش کرنے کا موقع آتا ہے تو اُس کا زبانی امتحان بھی درپیش ہوتا ہے۔ اور اُس سے کہا جاتا ہے کہ اُس نے اس بلند و بالا ڈگری کو ناجائز طور پر حاصل کرنے کے لیے جو مقالہ لکھا ہے اُس کا خلاصہ بیان کرے۔ یہ بڑا نازک وقت ہوتا ہے۔ امیدوار اس غلط فہمی میں رہتا ہے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے امتحان لینے والوں نے پڑھ رکھا ہے اور وہ اپنا لکھا یاد کرنے کی کوشش میں سب کچھ بھول جاتا ہے۔ جو ایک لحاظ سے مفید ہی ہوتا ہے لیکن وہ لوگ جنھیں معلوم ہے کہ ان کا لکھا ہوا مقالہ پڑھنے کی تاب کسی میں نہیں۔ زبانی امتحان میں بے کھٹکے کامیاب ہو جاتے ہیں۔ ان کے منہ زبانی جواب میں وہ سب ہوتا ہے جو ان کے مقالے میں نہیں ہوتا۔ زبانی امتحان میں امتحان دینے والے کا ناک نقشہ بھی دیکھا جاتا ہے۔ بعد میں یہی لوگ ملک کا نقشہ بناتے ہیں (جو واقعی قابلِ دید ہوتا ہے)۔

زبانی امتحان کے ڈراموں کے ہدایت کار ایک الگ ہی قوم کے لوگ ہوا کرتے ہیں۔ اُن کا پہلا سوال ہوگا ـــ مسٹر شمشاد حسین دلشاد حسین آپ کا نام کیا ہے؟ اور شمشاد حسین دلشاد حسین کو اپنا نام اس وقت ہرگز ہرگز نہیں آئے گا۔ اس سوال پر انھیں شبہ ہوگا کہ ان کا نام شمشاد حسین دلشاد حسین ہے بھی یا نہیں۔ بقول ایک ممتحن، یہ طالب علم کی ذہانت کا امتحان ہوتا ہے۔ زبانی امتحان دیتے وقت اس امیدوار کا حال برا ہوتا ہے جو ٹرین یا پلین میں پیدا ہوا ہو۔ ممتحن اس کی جائے ولادت معلوم کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے معاملے ممتحنوں کی سمجھ میں آ بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ ممتحن چاہے کتنے ہی قابل کیوں نہ ہوں قابلیت کی ایک حد ہوتی ہے۔ یہ صرف والدین کے سمجھنے اور سمجھانے کی بات ہوتی ہے۔ امیدوار اس موضوع پر کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔ اور ممتحن اس معاملے میں جتنی دلچسپی لیں گے معاملہ اتنا ہی الجھتا جائے گا۔ (ممتحنوں کو اپنی جائز حدود میں رہنا چاہیے)۔

جو طالب علم اور امیدوار، تحریری اور زبانی امتحان میں فیل نہیں ہو سکتے انھیں ایک اور امتحان کا موقع دیا جاتا ہے۔ اسے ڈاکٹری امتحان کہا جاتا ہے۔ تحریری امتحان کے وقت ہال میں اچھا خاصا مجمع ہوتا ہے۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کسی میلے کی خاموش فلم کا کوئی سیٹ لگا ہوا ہے۔ زبانی امتحانات کے موقع پر مجمع تو نہیں لیکن چھوٹی موٹی محفل کا سماں ہوتا ہے۔ لیکن ڈاکٹری امتحان میں دو بدو مقابلہ ہوتا ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر اور صرف ایک امیدوار۔ اس ڈوئل میں سیکنڈ اور مددگار رکھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ یہ امتحان بھی اکزامنیشن روم میں ہوتا ہے۔ لیکن یہ عام طور پر مستقبل کی طرح تاریک ہوتا ہے اور کہلاتا ہی ڈارک روم ہے (ایسا روم رکھنے کی اجازت ڈاکٹروں کے علاوہ صرف فوٹو گرافروں کو ہوتی ہے)۔ اس امتحان میں امیدوار کو سینہ پھلانا ہوتا ہے۔ لیکن سینے کی بجائے اس کی سانس پھول جاتی ہے۔ نروس بریک ڈاؤن بھی یہیں ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹری امتحان میں پرچہ دوبارہ نہیں جانچا جا سکتا۔ لیکن اگر امیدوار ایک ڈاکٹر کے ہاتھوں فیل ہونے پر مطمئن نہ ہو تو وہ اپنے آپ کو چار پانچ ڈاکٹروں کے ملاحظے کے لیے از سرِ نو پیش کر سکتا ہے۔ چار پانچ ڈاکٹروں کے مجمع کو میڈیکل بورڈ کہتے ہیں اور میڈیکل بورڈ کے پاس ناکام امیدوار کو خوش کرنے کا کوئی نسخہ نہیں ہوتا۔ سارے ڈاکٹروں کے اسٹیتھسکوپ ایک سے ہوتے ہیں۔

سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے

○ ہر چیز کا ایک نظام ہوا کرتا ہے۔ اس لیے ہمارے ہاں بھی ایک نظامِ تعلیم ہے۔

○ دنیا کی ہر چیز بدلتی رہتی کیونکہ ع

ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں۔ اس لیے ہمارا نظامِ تعلیم بھی ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔

○ اگر نظامِ تعلیم کے بدلنے میں بھی دو چار سال کی تاخیر ہو جائے تو اسے دفتری بھول چوک سمجھ کر نظر انداز کر دینا چاہیے۔ صبح کا بھولا شام کو اگر گھر آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ گھر یاد رہے تو کافی ہے۔

○ کسی زمانے میں ہمارا نظامِ تعلیم ایک سیدھی کی لکیر کی طرح تھا۔ اور ہم لوگ لکیر کے فقیر ہو کے رہ گئے تھے۔ فقیر ہونا کوئی بری بات نہیں لیکن لکیر کا فقیر ہونا ٹھیک نہیں۔ نظامِ تعلیم جتنا پیچیدہ ہوگا اتنا ہی مقبول ہوگا۔ نظامِ تعلیم کی پیچیدگی دور کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا کی جاتی رہیں۔ مشکلیں مسلسل پڑتی رہیں تو خود بخود آسان ہو جاتی ہیں۔ (بحوالہ اسد اللہ خان غالب)

○ جب ہم نے ترقی کا منہ نہیں دیکھا تھا تو ہمارے ہاں مدرسے کی تعلیم ختم کرنے کا نام میٹرک تھا۔ سارے ملک میں بس ایک نام رائج تھا۔ یہ بھی کوئی بات ہوتی اتنا بڑا ملک اور صرف ایک نظامِ تعلیم۔ وہ تو اچھا ہوا کہ کچھ دنوں بعد کچھ طالب علم ایچ ایس سی ہوئے تو کچھ ایس ایس سی۔ بعض ایچ ایس ایل سی کہلائے تو بعض ایس ایس ایل سی کی سند سے نوازے گئے جب ان مختلف ناموں سے خاطر خواہ افراتفری نہیں پھیل سکی تو کوئی پی یو سی کہلایا اور کوئی پی پی سی۔ کسی کو انٹر میں داخل ملا تو کسی کو ذسٹ ایئر میں۔ کسی کی اعلا تعلیم تین سال میں ختم ہوتی تو کسی کی چار سال میں بھی ختم نہ ہو سکی۔

○ جب اس طریقۂ عمل سے بھی طالب علموں کا تعلیم پانے کا شوق ختم نہیں ہوا تو اولڈ کورس اور نیو کورس

انسان کیوں مذمت ہو دولت کو دیکھ کر   جھنکار اس کی قلقلِ مینا سے کم نہیں۔ (قدسی مالیگانوی)

کے دو نظام تعلیم جاری کیے گئے۔ آخر ایک زمانے میں بنگال میں دو شفٹوں کا نظام جاری تھا۔ اس وقت لوگ کیسے چپ رہے)۔ ان دونوں نظام تعلیم کے آمیزے کی مدد سے مدرسوں اور کالجوں کے درمیان ایک جونیئر کالج کی ولادت کا انتظام کیا گیا۔ اب گیارہویں بھی ہے اور بارہویں بھی۔ والدین بھی مطمئن ہیں کیوں کہ انہیں نہیں معلوم کہ ان کے بچے گیارہویں میں ہیں یا بارہویں میں۔ کالج میں ہیں یا جونیئر کالج میں۔ ہائی اسکول ایک میں حصہ لینے کا حق انھیں حاصل ہے یہ کافی ہے۔

ہ پچھلے چند دنوں سے ہم عام طور پر دس جمع دو جمع تین کے نظام تعلیم میں مصروف ہیں۔ لیکن یہ اعلاد اب اپنی کشش کھو رہے ہیں (یہ چیز کی ایک حد ہوتی ہے)۔ آٹھ جمع چار جمع تین کے ہندسے زیادہ دل پذیر نظر آنے لگے ہیں۔ وقت وقت کی بات ہے۔ اور ہندسوں کا مجموعہ دیکھنا چاہیے نہ کہ ان کی ترتیب۔

ہ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دس جمع دو جمع تین کے نظام تعلیم سے سب کے سب بیک قطع تعلق کرلیں اس نظام تعلیم نے اتنے دنوں ہمیں محفوظ کیا ہے اس لیے آٹھ جمع چار جمع تین کے نظام تعلیم کو آنے تو دیا جائے لیکن دس جمع دو جمع تین کو جانے بھی نہ دیا جائے۔ ایسے اعتدال پسندی کہا جاتا ہے۔

ہ رہا مدرسوں اور مدرسوں کا معاملہ تو کہیں کہیں مدرسے بھی ہیں اور مدرس بھی لیکن طالب علم نہیں ہیں کہیں ٹیچر اور طالب علم دونوں موجود ہیں لیکن اسکول نہیں ہیں۔ اور بعض جگہوں پر اسکول بھی ہیں اور طالب علم بھی لیکن مدرس نہیں ہیں۔ لیکن ایسی باتوں سے تعلیم پر کوئی برا اثر نہیں پڑتا۔

ہ کئی لوگ ایسے ہیں جو اپنی مدد آپ کرلیتے ہیں اور عشق کے سوا امتحان کے علاوا اور کسی امتحان کی تیاری نہیں کرتے۔ عشق کے امتحان کی کوئی خاص تیاری کرنی بھی نہیں پڑتی۔ سب سے بڑا فائدہ اس امتحان میں یہ ہوتا ہے کہ آدمی ناکام ہو جائے تو محفوظ رہتا ہے۔ ورنہ عشق میں لوگ تختۂ دار تک بھی پہنچ گئے۔

بیٹھے بیٹھے جب الٹ جاتی ہے ماضی کی نقاب
دیکھتی ہے یہ سماں تخئیل کی بالغ نگاہ

جیسے تھوڑی دیر تھمی بوندیاں پڑنے کے بعد
چرخ پر خالی سمٹتے پھیلتے ابرِ سیاہ

جو لہا زمیں پر بھی ہے من کا بجھا بجھا ۔۔۔ وہ کیا گلا سکیں گے بھلا دال چاند پر (قدسی مالیگانوی)

گدھا گشت

پرویز یداللہ مہدی
۲۱۹، بہرام ۰ باندرہ (ایسٹ) ممبئی ۔ ۵۱..۴

(نوٹ: اس مضمون کے کردار و واقعات حتیٰ کہ انتخابی نشان تک فرضی ہیں کسی سے ان کی مطابقت اتفاقی حادثہ ہی ہوسکتی ہے۔)

ایک روز اچانک علامہ نچوڑ ہمدانی نے شاعری کے میدان میں جھنڈے گاڑنے کے پروگرام کو بالائے طاق رکھ کر الیکشن لڑنے کا دھڑلے سے اعلان کردیا۔ "میں نے آئندہ الیکشن میں کھڑے ہونے کا قطعی فیصلہ کرلیا ہے!"

ہم نے انھیں ٹوکا ـــــ علامہ صاحب! آپ ابھی ابھی ٹائیفائیڈ سے اٹھے ہیں ڈاکٹر نے آپ کو لیٹے رہنے کی سختی سے تاکید کی ہے۔!"

وہ بولے ـــ "کوئی بات نہیں، میں لیٹے لیٹے ہی الیکشن لڑوں گا۔"

ہم نے من میخ نکالی ـــ "ٹھیک ہے! جہاں تک لڑنے لڑانے کا سوال ہے، یہ ہر ہندستانی کا جمہوری حق ہے۔ لیکن آپ الیکشن ہی کیوں لڑنا چاہتے ہیں؟"

وہ بڑے گمبھیر لہجے میں بولے ـــــ برخوردار! میری بیوی ہمیشہ کے لیے میکے چلی گئی ہے۔ گھر سونا سونا ہو گیا ہے۔ آئے دن کے گھریلو جھگڑے بند ہوجانے کی وجہ سے زندگی کی رونق ختم ہوگئی ہے۔"

ہم نے حیرت سے کہا ـــــ "اسی لیے آپ الیکشن لڑنا چاہتے ہیں، گویا آپ کی نظر میں الیکشن لڑنا بیوی سے لڑنے کے مترادف ہے ـــــ"

"یونہی سمجھ لو ـــــ" وہ لاپروائی سے بولے۔ ہم نے تشویشناک لہجے میں پوچھا ـــ "آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کو آسانی سے ٹکٹ مل جائے گا ـــ؟"

"سیدھے راستے سے نہیں ملے گا تو بلیک میں خریدوں گا ـــ" وہ ٹھوس لہجے میں بولے۔ ہم نے جواباً انھیں چھیڑا ـــ "غالباً آپ میری بات سمجھے نہیں، میں الیکشن کے ٹکٹ کی بات کر رہا ہوں سینما کے ٹکٹ کی نہیں ـــ"

"میں بھی الیکشن کے ٹکٹ کی بات کر رہا ہوں۔"

وہ طنزیہ لہجے میں بولے ـــ "ہماری سیاست کے پچھلے دروازے سلامت رہیں تو تم اگر چاہو تو بلیک میں ساری ریاست کی ٹکٹیں خرید سکتے ہو۔" ہم نے ان کے خطرناک آرادے تیور دیکھکر پوچھا ـــ "اب جب کہ آپ نے الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یقیناً اپنے انتخابی نشان کے بارے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور سوچا ہوگا ـــ"

"بالکل سوچا ہے برخوردار! بلکہ اپنا انتخابی نشان قریب قریب طے کرلیا ہے۔" وہ بڑے مدلل انداز میں بولے۔ پھر محتاط نظروں سے اطراف واکناف کا جائزہ لینے کے بعد فرمایا، "تم نے بھی یقیناً یہ سنا ہوگا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں اور اس وقت ہم ہوٹل کے ایک کیبن میں بیٹھے ہیں۔ جس کی دیواریں لکڑی کی ہیں اور لکڑی کی دیواروں کے نہ صرف کان ہوتے ہیں بلکہ آنکھیں بھی ہوتی ہیں اور زبان بھی، لہذا تم اپنے کان میرے قریب لاؤ ـــ" ہم نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ وہ ہمارے کان میں پھسپھسائے ـــــ "میرا انتخابی نشان ہوگا گدھا ـــ!"

"گدھا ـــ؟" ہم نے بے ساختہ چلا اٹھے۔ علامہ جھنجلا کر بولے ـــ "آہستہ آہستہ، اگر کسی نے سن لیا تو گدھا ہوجائے گا میرا مطلب ہے غضب ہوجائے گا ـــ"

ہم نے اُن کی اس جھنجلاہٹ پر سر سے پیر تک انھیں گھورتے ہوئے بڑبڑا کر کہا ـــ "گدھا ـــ!

'میں نہیں ـــ' علامہ نے سٹپٹا کر تصحیح فرمائی ـــ میرا انتخابی نشان گدھا ـــ"

"ایک ہی بات ہے ـــ" ہماری زبان سے بے ساختہ نکلا۔

"پھر وہی بات ـــ" وہ مزید جھنجلا کر بولے۔ "میں کہہ رہا ہوں گدھا صرف انتخابی نشان ہے۔ ورنہ گدھا گدھا ہے۔ اور میں، میں ہوں ـــ"

"معاف کیجیے علامہ ـــ" ہم نے انھیں ٹوکا۔ "اگر آپ اس طرح اپنے اور اپنے انتخابی نشان کے درمیان چھوٹے بڑے، جانور اور انسان کا یہ فرق، یہ امتیاز یہ فاصلہ رکھیں گے تو پھر الیکشن میں آپکی جیت ناممکن ہو جائے گی۔" ہماری اس خوفناک وضاحت نے غالباً انھیں ڈرا دیا وہ گڑبڑا کر بولے ـــ "اگر میرے دل میں ذات پات چھوٹے بڑے، انسان اور حیوان میں فرق ہوتا، کسی قسم کا تعصب ہوتا تو انتخابی نشان کے طور پر گدھے کا انتخاب کبھی نہیں کرتا ـــ" اتنا کہہ کر علامہ خلا میں گھورنے لگے پھر لیڈرانہ اسٹائل میں بولے "تم نہیں جانتے، میں نے گدھے کا درجہ بلند کرنے کے لیے کیسے کیسے پلان بنائے ہیں، انتخابی مہم کے دوران جب میرا انتخابی نشان اپنے پیروں پہ چل کر حلقے کا گشت لگائے گا تو سیاست کی تاریخ میں تہلکہ مچ جائے گا ـــ"

ہم نے فوراً لقمہ دیا ـــــ آپ صرف تاریخ کہتے ہیں علامہ! میں کہتا ہوں آپ کے گدھے کو دیکھ کر سیاست کے جغرافیہ کا حمل ساقط ہوجائے گا۔" اس سے پہلے کہ ہمارا چھوڑا ہوا یہ لقمہ علامہ کو بدہضمی میں مبتلا کرتا ہم نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا ـــــ "ویسے علامہ، اس قدر معرکتہ الآراء دھوبی کا سہارا، کمہار کی آنکھ کا تارا، انتخابی نشان آپ کے ذہن رسا میں کیسے گھسا ـــ؟"

علامہ بڑے فلسفیانہ انداز میں بولے۔ "ہر انسان میں ایک گدھا موجود ہوتا ہے۔ برخوردار بس اس تک پہنچنے والی نظر چاہیے اچھے اچھے سیاست دانوں کی سیاست

مہمان گھر میں آئے ہیں لہٰذا میں کیا کروں
بیگم ہماری آج مظفر نگر گئی ۔ (لبری آزاد پونوی)

نظریں اپنے اندر چھپے گدھے تک نہیں پہنچ سکیں ۔ آج تک اور میں نے گدھے کا انتخاب کر کے آدھا میدان تو یقیناً مار لیا ہے۔"

ہم نے چوٹ کی ۔ "اس کا کیا ثبوت کہ آپ ہی کی نظر گدھے تک گئی ہو سکتا ہے خود گدھے کی نظر انتخاب آپ پر پڑی ہو ۔!"

"ایک ہی بات ہے ۔" وہ بے فکری سے بولے ۔ "میں گدھے پر گروں یا گدھا مجھ پر ۔"

"ویسے آپ نے انتخابی نشان کے طور پر جس گدھے کا انتخاب کیا ہے وہ دھوبی کا گدھا ہے کمہار کا یا خالص گدھا ۔!" ہم نے ایک نیا شوشہ چھوڑا علامہ گڑ بڑا کر بولے ۔ "یہ نئی "پخ" کیا چھیڑ دی تم نے ۔ ابھی ابھی تو تم نسلی امتیاز اور تعصب کے خلاف بھاشن دے رہے تھے اور اب گدھوں کی بھی درجہ بندی کرنے لگے ۔ میں پوچھتا ہوں کیا فرق ہوتا ہے دھوبی کے کمہار کے اور خالص گدھے میں ۔!"

ہم نے انھیں مزید بھڑکانے کے لیے کہا ۔ "یوں دیکھیے تو دھوبی کا گدھا، کمہار کے گدھے یا خالص گدھے سے مختلف نہیں ہوتا ۔ وہی چار پاؤں، وہی کھردرا پن سراپا، وہی گدھیالی رنگت، وہی فلاسفرانہ شان، لیکن رہن سہن کے فرق کی وجہ سے ان کے عادات و اطوار مختلف ہوتے ہیں ۔ دھوبی کا گدھا گھاٹ کا عادی ہوتا ہے، کمہار کا ہاٹ کا (بازار) کا اور خالص گدھا ٹھاٹ کا ۔" ہماری اس تشریح پر وہ بچوں کی طرح چہک کر بولے "گدھوں کے تعلق سے تمھاری معلومات قابل رشک ہے برخوردار! تم تو گدھوں کا چلتا پھرتا "انسائیکلو پیڈیا معلوم ہوتے ہو ۔"

"یہ دراصل آپ کی صحبت کا اثر ہے علامہ ۔!" ہم نے بے ساختہ لقمہ دیا ۔ جسے ان سنی ان سنی کرتے ہوئے وہ باوزن لہجے میں بولے ۔ "میں نے ابھی اور اسی لمحے فیصلہ کیا ہے کہ میری انتخابی مہم کے کرتا دھرتا بھی تم ہو گے ۔"

ہم نے برجستگی سے کہا ۔ "گویا اب آپ کے لیے اوپر خدا نیچے گدھا یا یہ گدا ہے" ۔

— ٭ — ٭ — ٭ — ٭ — ٭ —

وعدوں کا موسم پھر آ گیا ۔

انتخابات کی فصل پھر سے لہلہانے لگی ۔

علامہ بجوڑ ہمدانی نے پہلا مرحلہ تو بخیر و خوبی سر کر لیا ۔ بلیک میں ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہو گئے ۔

لیکن دوسرے مرحلے میں اٹک گئے ۔ ان کے انتخابی نشان کو چیف الیکٹورل آفیسر نے رد کر دیا ۔ اور اس کی جگہ سرکار کے منظور کردہ مختلف انتخابی نشانوں میں سے کوئی ایک منتخب کرنے کو کہا ۔ علامہ بھی اڑ گئے بولے ۔ "سرکار کی یہ کیسی نرالی منطق ہے ہاتھی گھوڑے بگاسے چھوٹے یہاں تک کہ لوہے کے انجن اور لکڑی کی بے جان سیڑھی پر مہربان لیکن ایک بے ضرر جانور سے یوں انجان، یہ سراسر تنگ نظری ہے ۔ تعصب ہے ۔!"

آفیسر نے بے بسی سے کہا ۔ "یہ اوپر کے آرڈر ہیں جناب ہم مجبور ہیں ۔" پھر ازراہ مہربانی فرمایا ۔ "میری مانیے تو اپنے انتخابی نشان کے طور پر ترازو منتخب کر لیجیے ۔ جو انصاف، مساوات اور برابری کی علامت سمجھا جاتا ہے ۔"

"یہ تو تصویر کا صرف ایک ہی رخ ہے جناب!" علامہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا ۔ "آپ کے اس ترازو کا دوسرا رخ ملاحظہ فرمائیے ۔ یہ انصاف مساوات اور برابری کی نمائندگی کم اور ڈنڈی مارنے والوں، کم تولنے والوں کی نمائندگی زیادہ کرتا ہے ۔" علامہ کی اس کھلی چوٹ پر آفیسر نے غصے سے کہا ۔ "اگر ترازو بدعنوانیوں کی علامت ہے تو آپ کا گدھا کس کی نمائندگی کرتا ہے ؟"

"محنت کش طبقے کی" ۔ علامہ کے اس برجستہ جواب نے آفیسر کو بوکھلا دیا ۔ وہ گڑبڑا کر بولے ۔ ہم محنت کش طبقے کے مسائل حل کرنے کے مجاز نہیں ہیں، بہتر ہوگا اگر آپ اپنے گدھے کے تعلق سے مرکز سے رابطہ قائم کریں ۔!"

مرکز سے رابطہ قائم کرنے سے پہلے ہم نے علامہ کا گدھے سے رابطہ توڑنے کی ایک اور کوشش کی ۔ مانا کہ گدھے میں بے شمار اوصاف حمیدہ پائے جاتے ہیں لیکن علامہ آپ نے شاید اس کے سب سے مشہور اوصاف 'غیر حمیدہ'، یعنی کہ "دولتی" پر غور نہیں فرمایا"

وہ جھنجلا کر بولے ۔ "تم میں یہ بہت بری عادت ہے ۔ فوراً ہر چیز کے پیچھے پڑ جاتے ہو، دیکھ لینا ایک دن تمہاری یہ عادت تمھیں بدنام کر کے چھوڑے گی" ۔ ہمارے کردار پر شک و شبہ کا کیچڑ اچھالنے کے بعد موصوف نے بڑے ہی فلسفیانہ بلکہ 'گدھیانہ' لہجے میں فرمایا ۔ 'مانا کہ مالک کی اگھاڑی اور گھوڑے و گدھے کی پچھاڑی کا شمار خطرناک چیزوں میں ہوتا ہے ۔ لیکن میں نے اس کا بھی حل ڈھونڈ لیا ہے ۔ ہم اپنے انتخابی پوسٹروں میں گدھے کا صرف 'فرنٹ' پوز ہی دیں گے ۔" ہم نے موصوف کی اس کی دور اندیشی پر ستائشی نظروں سے انہیں دیکھتے ہوئے مشورہ دیا ۔ "علامہ! اگر انتخابی پروپیگنڈے کو دوبالا کرنا ہو تو ہر پوسٹر میں گدھے کے 'فرنٹ پوز' کے ساتھ آپ اپنا بیک پوز (Back Pose) بھی دے ڈالیے ۔!!"

"تم پھر پشت پر پہنچ گئے ۔" وہ جھلا کر بولے ۔ ہم نے گڑبڑا کر جواب دیا ۔ "غلط مت سمجھیے علامہ! میں تو آپ کی پشت پناہی کر رہا ہوں ۔"

"فی الحال میری پشت پناہی چھوڑو اور یہ سوچو کہ کس طرح میرے گدھے کے آگے مرکز کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے ۔" اس گمبھیر مسئلہ کو چھیڑ کر موصوف خود کسی گدھے کی طرح گمبھیر سوچ میں ڈوب گئے ۔

— ٭ — ٭ — ٭ — ٭ — ٭ —

کسی ضروری کام کی وجہ سے ہم علامہ کے ساتھ مرکز کا سفر نہیں کر سکے ۔ وہ اکیلے ہی گئے اور آئے اور کمال یہ کہ کامیاب و کامران لوٹے تھے ۔ ہم نے حیرت سے پوچھا ۔ "علامہ آپ نے آخر کیا چکر چلایا کس طرح مرکز کو اپنے گدھے کا قائل کیا ؟" مخزبہ لہجے میں بولے ۔ "برخوردار! تم علامہ بجوڑ ہمدانی کو کیا سمجھتے ہو، جغادری لیڈروں کی موجودگی میں میں نے نہایت مدلل لہجے میں کہا ۔ ہمیں آزادی ملے لگ بھگ بتیس ۳۲ برس ہو گئے لیکن جس سوشلزم کو لانے کا وعدہ ہم عوام سے کرتے آئے ہیں وہ سوشلزم ابھی تک نہیں آیا، یہ بات نہیں کہ سوشلزم ہمارے ہاتھ نہیں لگا، ضرور لگا ہے لیکن اس کا بوجھ ہمارے فرسودہ انتخابی نشان نہیں اٹھا سکے ۔ پس اس سے ثابت ہوا کہ محض غلط انتخابی نشانات کے انتخاب نے رسوا کیا ہمیں ۔ سچ کہتا ہوں سوشلزم کا بھاری بوجھ صرف گدھا ہی اٹھا سکتا ہے ۔ صرف گدھے میں یہ قوت برداشت پائی جاتی ہے ۔ لہٰذا آپ تمام سے میری دست بستہ گزارش ہے کہ ایک بار مجھے اور میرے گدھے کو عوام کی خدمت کا موقع عنایت فرما کر دیکھیے ہم دونوں سوشلزم کے سہانے خواب کو شرمندۂ تعبیر کر کے آپ حضرات کو جو برسوں سے عوام کے آگے شرمندہ ہوتے چلے آ رہے ہیں سرخ رو ہونے کا شرف بخشیں گے ۔" علامہ کا بھاشن ختم ہوتے ہی ہم نے تالیوں سے ان کا سواگت کیا وہ چہکے ۔ "بالکل اسی طرح مرکز کے کرتا دھرتاؤں

نے بھی بے اختیار ہوکر تالیاں بجائیں اور کھٹاک سے تیرے گدھے کی لائین کلیر کا سگنل دے دیا ـــــ"

"گدھا مبارک ہو علامہ ـــ" ہم نے فوراً مبارکباد دے ڈالی پھر جوشیلے انداز میں کہا "آپ مرکز میں تھے میں نے یہاں آپ کی انتخابی مہم کے تعلق سے نئی نئی اسکیمیں بنا ڈالیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ آپ کا انتخابی نشان خود اپنے پیروں پہ چل کر سارے حلقے کا گشت کرے گا۔ میں نے اس میں اضافہ کیا ہے کہ حلقہ کی ہر گلی میں آپ کو بھی آپ کے انتخابی نشان پر بٹھلا کر گھمایا جائے۔" ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ علامہ چراغ پا ہوکر بولے۔ "تم میرا مذاق اُڑا رہے ہو برخوردار ـ!"

"ہرگز نہیں علامہ ـــ" ہم نے جواباً قندیل پا ہونے کا ناٹک کیا۔ "آپ کا دعویٰ ہے کہ سوشلزم کا بھاری بوجھ صرف گدھا ہی اٹھا سکتا ہے۔ یہی بات میں عوام پر اس طرح ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ جس طرح گدھا اب اپنا امیدوار کا بوجھ اٹھائے خوشی خوشی پھر رہا ہے۔ اسی طرح کل کو الیکشن جیت جانے کے بعد اپنے حلقۂ انتخاب کا سارا بوجھ تمام مائیل اپنی پیٹھ پر لادے پارلیمنٹ میں پہنچ جائے گا ـــ" ہماری اس تشریح نے علامہ کے غصے کو ٹھنڈا کردیا۔ وہ بھرائے لہجے میں بولے "بہت اچھے جارہے ہو برخوردار! گدھے کے ساتھ تمہارا انتخاب کرکے میں نے بڑی دور اندیشی کا ثبوت دیا ہے۔"

"فوراً ایک گدھا بُک کرلو۔"

"کرلیں گے ایسی جلدی بھی کیا ہے ـــ" ہم نے شرارتی لہجے میں کہا۔ "جب تک گدھے کا بندوبست نہیں ہو جاتا آپ بہ نفسِ نفیس اپنے حلقے کے چکّر لگایئے۔"

"وہ تو میں لگاؤں گا ہی ـــ" وہ فوراً بولے۔ "لیکن اب گدھے کے بغیر مجھے چین نہیں پڑنے والا، تم فوراً گدھے کی تلاش شروع کردو!"

"شروع کرنا کیا معنی؟ ـ میں تو تلاش بھی کر چکا ـــ اپنے دھوبی رام کھلاون کا گدھا ـــ" ہم نے مسکرا کر انکشاف کیا وہ اچھل کر بولے ـــ "رام کھلاون تو اپنا ہی آدمی ہے۔ اس کا گدھا بھی اپنا ہی ہے ـــ"

"بالکل ـــ" ہم نے لقمہ دیا ـــ "یوں سمجھیے آپ کا ہی بچّہ ہے۔"

— × — × — × — × — × — ×

جس وقت ہم دھوبیوں کی بستی میں پہنچے بڑی خاموشی تھی۔ غالباً تمام دھوبی اور ان کے گدھے گھاٹ گئے ہوئے تھے۔ البتہ رام کھلاون گھر پر ہی مل گیا۔ اس کا گدھا اپنی مالکن مسز رام کھلاون دھوبن کے ہمراہ گھاٹ گیا ہوا تھا۔ رام کھلاون اس وقت ہماری قمیص اور علامہ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا اس لیے ہمیں دیکھتے ہی اس کی روح فنا ہوگئی۔ ہمارا بھی خون کھول اٹھا لیکن مجبوراً کھولتے ہوئے خون کے گھونٹ پینے پڑے کیوں کہ اس وقت ہم اہلِ غرض کی حیثیت سے اس کے ہاں پہنچے تھے یوں انجان بن گئے جیسے ہماری قمیص اور علامہ کا پاجامہ اصل میں رام کھلاون ہی کی ملکیت ہوں۔ اپنی چیزوں کے تعلق سے ہماری یہ بے گانگی دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور پھر جب اسے ہماری آمد کی غرض و غایت کا پتہ چلا تو چہک کر بولا ـــ "ای کا مطلب ئیو ہوا کہ آپ لوگن ہمار گدھوا کے لیڈر بناوا کی بات کرت ہو ـــ" علامہ تڑاک سے بولے ـــ "بالکل یہی بات رام کھلاون بھیّا! تمہارا گدھا بہت بڑا لیڈر بنے گا ـ" یہ سنتے ہی رام کھلاون فوراً اپنی گھر والی کو گھاٹ پر یہ خوش خبری سنا کر گدھے کو ہمارے حضور میں پیش کرنے کی مہم پر نکل کھڑا ہوا۔

جب رام کھلاون لوٹا تو اکیلا نہیں تھا بلکہ اس کے ساتھ سارے دھوبی گھاٹ کی رونق تھی۔ اس نے یوں فخر سے اپنے گدھے کو ہم دونوں کے روبرو پیش کیا جیسے اگلے وقتوں میں بادشاہوں کے آگے نذرانے پیش کیے جاتے تھے لیکن رام کھلاون کے گدھے کو دیکھ کر ہم دونوں کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس قدر مریل تھا وہ گدھا کہ سوشلزم کا بوجھ سہنا تو دور ہم نے سوچا اگر کسی کاغذ پر صرف لفظ سوشلزم لکھ کر اس مریل کی پیٹھ پر ڈال دیا جائے تو کم بخت یقیناً لنگڑی بھگ بیٹھ جائے گا ـــ علامہ نے مایوس لہجے میں کہا ـــ "رام کھلاون بھیا! تمہارا گدھا تو لیڈر کم اور گبدڑ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ ہمیں تو ایک صحت مند، تندرست، توانا کڑیل جوان گدھا چاہیے اس نوجوان کی طرح ـــ" علامہ نے ہماری طرف اشارہ کیا۔ اس انکشاف پر جتنی بھی دھوبی برادری وہاں موجود تھی ہمارے قدموں میں بچھ گئی۔ ہر ایک کی زبان پر یہی رٹ تھی کہ اس کا گدھا تمام لیڈرانہ خصوصیات کا حامل ہے آن واحد میں تمام دھوبیوں نے بطور نمونے کے اپنے اپنے گدھے ہمارے سامنے لاکر کھڑے کردیے۔ اتنے سارے تندرست و توانا گدھوں کو دیکھتے ہی علامہ کی رال ٹپکنے لگی۔ ہمیں فوراً ایک نئی ترکیب سوجھی ہم نے موصوف کے کان میں کہا ـــ "سچ کہا ہے کسی نے اللہ مہربان تو گدھا پہلوان، اگر ہم ان سارے گدھوں کی خدمات حاصل کرلیں تو سارے حلقۂ انتخاب میں صرف گدھے ہی گدھے نظر آئیں گے ـــ"

"اس سے کیا ہوگا ـــ؟" علامہ نے دیدے نچا کر پوچھا۔

"وہ ہوگا جو سیاست کی تاریخ کی ہیئت بدل دے گا۔ روزانہ ایک آدمی اگر اتنے سارے گدھوں کو ہر جگہ ہر موڑ پر دیکھے گا تو نفسیاتی طور پر اس کے دل و دماغ میں گدھے کی تصویر سما جائے گی۔ نتیجتاً رائے دہندگی کے روز بے اختیار اس کے ہاتھ گدھے کے نشان پر مہر لگانے کے لیے مجبور ہو جائیں گے"۔ ہماری اس دور اندیشی پر علامہ پہلے تو بہت خوش ہوئے پھر اچانک متفکرانہ انداز میں پوچھا۔ "ان گدھوں پر کل کتنا خرچ آئے گا؟" ہم نے کچھ سوچتے ہوئے کہا ـــ "گدھوں کے مالک تو سستے میں پٹ جائیں گے۔ اب رہا گدھوں کے خورد و نوش کا خرچہ تو یہ بھی مفت میں ہو جائے گا ـــ آپ تو جانتے ہی ہیں گدھے کو کاغذ کس قدر مرغوب ہوتے ہیں۔ لہٰذا گھاس کے چکر میں مت پڑیے۔ آپ نے شاعری کے روپ میں جو ردّی کا ڈھیر لگا رکھا ہے وہ کس دن کام آئے گا۔ چھپنے چھپانے سے تو رہا ـ!"

ہم اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ موصوف بھڑک کر بولے۔ "تم میری شاعری کو گدھوں کی غذا سمجھتے ہو برخوردار!"

"اکھڑیے مت علامہ ـ یہ سچ ہے کہ سچ بڑا کڑوا ہوتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسے پی جانا صحت کے لیے مفید ہوتا ہے"۔ ہماری اس پینترے بازی نے علامہ کو کسی قدر ٹھنڈا کردیا۔ چناں چہ ہم مزید شیر ہوکر بولے۔ "جب گدھوں کی بریک فاسٹ، لنچ، ڈنر تینوں وقت آپ کی شاعری کھانے کو ملے گی تو اس سے آپ کو دوہرا فائدہ ہوگا ـــ ایک تو آپ کی شاعری ہضم کرنے کے بعد تمام گدھے جب بھی رینکیں گے بحر میں رینکیں گے۔ قافیہ ردیف وزن وغیرہ کا بھی پورا پورا خیال رکھیں گے۔ اور دوسری اہم بات جو لوگوں کے سامنے آئے گی وہ گدھوں کے تعلق سے مشہور غلط فہمی کا ازالہ کردے گی کہ یہ گدھے کوئی معمولی گدھے نہیں جن کے ہاں زعفران کی کوئی قدر نہیں بلکہ یہ گدھے وہ سخن فہم گدھے ہیں جو زعفران اور شاعری دونوں کی قدر کرنا جانتے ہیں ـــ" ہماری اس پینترے بازی نے وہ اثر دکھایا کہ علامہ نے فوراً دھوبی بستی کے سارے گدھے ایک ساتھ بُک کرلیے۔ سوائے اسی رام کھلاون کے مریل گدھے کے!!!

— × — × — × — × — × —

ساغر نگاہِ مست کے چلتے ہیں برملا . اس میکدے پہ بیٹھتے نہ دیکھیں کسی کی دھاڑ (مرزا طوسی)

گدھا گشت کے تیرہ دن نے دیکھتے ہی دیکھتے نمائندے سے زیادہ گدھوں کو عوام سے قریب کر دیا اور ادھر ہم نے بھی سر جوڑ کے نیا چونکانے والا الیکشن مینی فیسٹو ( ) تیار کر دیا۔ جس میں تقریباً تمام عوامی اور عصری مسائل کا خوبی کے ساتھ احاطہ کیا گیا۔ البتہ اردو کے تعلق سے ہمارے بیچ تھوڑا سا اختلاف ہوا۔ جیساکہ اردو کے تعلق سے سیاست دانوں کا عام رویہ رہا ہے کہ اس کی تعریف و توصیف میں زمین آسمان کے قلابے ملا کر جھوٹے وعدے کرتے آئے ہیں۔ ہم نے بھی انہی بنیادوں پر ایک لمبا چوڑا سنہرا کر جھوٹا خواب بُنا جس پر علامہ نے خفا ہو کر اعتراض کیا ــ "یہ خواب تو ہم لیے دکھاتا آیا ہے۔ میں اس سلسلے میں کہوں گا کہ اردو ایک غیر ملکی زبان ہے، ہمارے ملک کی گنگا جمنی تہذیب سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں۔ بلکہ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو کہوں یہ سرے سے کوئی زبان ہی نہیں ہے"۔

علامہ اتنا ہی کہہ پائے تھے کہ ہم نے انہیں ٹوکا ــ "اگر آپ نے الیکشن سے پہلے یہ بیان دے دیا تو آپ کی یقینی جیت یقینی ہار میں بدل جائے گی۔ ایک تو یہ بات ہمارے دستور کے سراسر خلاف اور منافی ہے، دوسرے اردو کے بارے میں یہ بیان آپ کو دراصل الیکشن جیتنے کے بعد دینا چاہیے جیسا کہ ہمارے بیشتر لیڈر حضرات کا وطیرہ رہا ہے ــ!" ہماری یہ دلیل اس قدر ٹھوس تھی کہ نہ صرف علامہ بلکہ ان کے گدھے بھی قائل ہو گئے ــ

ــــ x ــــ x ــــ x ــــ x ــــ

الیکشن کی مہم اپنے شباب پر تھی۔ رائے دہندگی سے چند روز قبل اچانک ایک سانحہ پیش آیا۔ جو گدھے راؤنڈ پر بھیجے گئے تھے وہ شام میں حسب معمول لوٹ کر نہیں آئے۔ ان کی تلاش میں آدمی دوڑائے گئے جو حلقۂ انتخاب کا چپہ چپہ چھاننے کے بعد یہ منحوس خبر لے آئے کہ مخالف کیمپ کے غنڈوں نے ان گدھوں کو آوارہ گدھے ثابت کر کے انہیں میونسپلٹی کے "کانجی ہاوز" میں بند کروا دیا ہے۔ اس خبر نے سب کے ہوش و حواس معطل کر دیے۔ یہ افتاد پڑی بھی تو اب دو چار ہاتھ جبکہ لب بام رہ گیا تھا۔ اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ جرمانے بھر کے انہیں چھڑایا جاتا۔ علامہ کا تو رو رو کر برا حال تھا۔ ہمیں اچانک ایک ترکیب سوجھ گئی۔ تخلیے میں ایک "گپت" بیٹھک بلا کر علامہ سے کہا

"کیا ہوا جو سارے گدھے عین وقت پر دشمنوں نے پکڑوا دیے، امید کی ایک کرن ابھی باقی ہے ــ!"

"امید کی کرن ــ؟!" علامہ کمرے میں نیم روشن بلب کے نیچے اجالے میں امید کی کرن تلاش کرنے لگے ہم نے تلاش کے اس غلط طریقے پر انہیں چھیڑا ــ "علامہ امید کی کرن یہاں نہیں، رام کھلاون دھوبی کے پاس ہے ــ!"

"رام کھلاون کے پاس ــ؟"

"ہاں اس کا گدھا ــ" ہم نے لفظ گدھے پر واقعی گدھے کے برابر زور دے کر کہا۔

"مگر وہ تو ایک دم مریل اور مرا گدھا ہے" ــ علامہ نے منہ بنا لیا ــ "بلکہ اس گدھے کو گدھا کہنا گدھے کی توہین ہے، اس کی جسمانی حالت دیکھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے اس گدھے کا "الف" گر گیا ہو اور اس میں دو چشمی "ھ" ہی نہیں ہے"

"مانا کہ وہ گدھا نہیں گدا ہے" ہم نے ان کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن نہیں ماموں سے کانا ماموں غنیمت ہوتا ہے اگر وقت پر کام آ جائے ــ" ہمارا اس بامحاورہ دلیل نے علامہ کو قائل کر دیا اور اسی وقت رات کے اندھیرے میں ہم دونوں رام کھلاون کے مریل گدھے کے اغوا کی مہم پر نکل گئے ــ!!

ــــ x ــــ x ــــ x ــــ x ــــ

انتخابات کی فصل کٹ گئی۔ خوش نصیب امیدوار منتخب ہو کر دعاؤں کی ڈوری کے سہارے پارلیمنٹ میں پہنچ گئے۔ اور علامہ بچوڑ ہمدانی ایک ساتھ کئی المیوں کا شکار ہو گئے۔ ایک تو عین وقت پر ان کے گدھے ان کی ساری تیاری چوپٹ کر کے وعدوں کی رسیاں تڑا کر بھاگ نکلے۔ دوسرے اپنی ڈوبتی ہوئی الیکشن کی "نیا" کو پار لگانے کے لیے انہوں نے جسے امید کی آخری کرن سمجھا تھا، امید کی اسی کرن عرف رام کھلاون کے مریل گدھے نے اپنا بدلہ لے لیا ــ علامہ نے جس بیدردی سے اسے ٹھکرایا تھا اس نے اس سے کہیں زیادہ بے دردی سے ان کے "دولتی" جھاڑ دی۔ تصویر نے یوں کہ علامہ کو الیکشن سے زیادہ گدھے کی دولتی کی "زد" کے لیے "نامزد" کیا تھا۔ نتیجتاً اپنی ضمانت کے ساتھ اگلے چار دانت بھی گنوا بیٹھے۔ البتہ ضمانت اور دانت گنوانے کے بعد یہ قابل ذکر تبدیلی ان میں آگئی ہے کہ جہاں کہیں کوئی گدھا نظر آتا ہے وہاں سے یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ــ!!!

ــــ x ــــ x ــــ x ــــ x ــــ

"اردو اور اہل اردو"

مشہور افسانہ نگار شین مظفر پوری لکھتے ہیں "ہندستان میں اردو کے مستقبل پر طرح طرح کی باتیں کرنا یا تو فیشن بن کر رہ گیا ہے یا پھر دفع الوقتی کا ایک مشغلہ۔ اردو کے دردمندوں کا سارا خلوص کلیتاً نہیں تو زیادہ تر بس حکومت سے احتجاج و مطالبہ تک محدود رہا ہے لیکن خود انہوں نے اس زبان کی ترقی اور بقا کے لیے کیا کیا؟ ــ ان پر کیا فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس دکھتی رگ پر ہاتھ رکھنے سے ناگفتہ بہ حقائق سامنے آ جائیں گے۔ سچی بات یہ ہے کہ اہل اردو اپنے مریض کی شفا کے لیے فقط دعا مانگتے رہتے ہیں"

"ذمہ داری کا احساس"

"اپنی ذمہ داری کا احساس اکثر ہمیں تنگ ظرفیوں کا زبردست مصلح بنا دیتا ہے۔ فرض کیجیے کہ ایک اخبار نویس اپنے گوشۂ عافیت میں بیٹھا ہوا وزرا کو کمال آزادی اور بے باکی سے اپنے زیر قلم کا نشانہ بنا دیتا ہے لیکن ایک دن ایسا موقع آتا ہے کہ وہ خود مجلس وزرا میں شریک ہوتا ہے اس وقت اس کی تحریر میں ایک دل پذیر متانت کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے، یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔

ایک نوجوان عالم شباب میں کتنا لاپروا ہوتا ہے۔ والدین اسے مایوسانہ انداز سے دیکھتے ہیں، اسے ننگ خاندان سمجھتے ہیں مگر والدین کے انتقال کے بعد یہ ننگ خاندان بھی کتنا سلامت رو اور محتاط ہو جاتا ہے۔ یہ ذمہ داری کا احساس ہے۔ یہ احساس ہماری نگاہوں کو وسیع کر دیتا ہے اور زبانوں کو محدود"

(منشی پریم چند)

نفسانیت کا عیب چھپانے کے واسطے   کرتا بھی ایک اوڑھے داڑھی بھی ایک آڑ (مرزا طوسی)

ہم صدر بنے

ڈاکٹر نریش
پنجاب یونی ورسٹی، ایوننگ کالج
چنڈی گڑھ - ۱۶۰۰۱۴

ہم جب بھی کبھی دیکھتے کہ ہماری جان پہچان کا کوئی آدمی کسی تقریب کا صدر بنا ہے تو ہمارا خون کھولنے لگتا۔ ہمیں تقریب کے منتظمین پر غصہ آتا کہ آخر وہ ہمیں صدر بننے کی دعوت کیوں نہیں دیتے۔ کئی بار ہم آئینے میں اپنی صورت دیکھ کر سوچتے کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہماری شکل ہی صدروں جیسی نہ ہو لیکن جب اخباروں میں چھپی دوسرے صدروں کی تصویروں کے برابر اپنی تصویر رکھ کر موازنہ کرتے تو ہمیں محسوس ہوتا کہ ہماری صورت باقی تمام صدروں سے کہیں بہتر ہے۔ فوٹو میں ہمارے چہرے پر کھدے چیچک کے داغ "بیوٹی اسپاٹس" بن کر چمک اٹھتے ہیں۔ ۔ ۔

کڑھنے، جلنے اور حسد کرنے کا یہ سلسلہ نہ معلوم کب تک جاری رہتا کہ ایک بار "جین نوجوان سبھا" کے چند ممبر ہم سے چندہ مانگنے آ گئے۔ انھیں "مہاویر شتابدی" کے سلسلے میں کسی تقریب کا انعقاد مقصود تھا۔ اور اس کے لیے انھیں پیسے کی ضرورت تھی۔ ہم ایک بار تو حیرت میں پڑ گئے کہ جب سارے شہر کو علم ہے کہ ہم چندہ اندہ نہیں دیتے ہیں تو ان لڑکوں کو یہاں آنے کی ضرورت کیسے ہوئی۔ لیکن پھر سوچا ممکن ہے بلی کے بھاگوں ہی چھینکا ٹوٹا ہو۔ لہذا ہم نے انھیں بٹھایا۔ چائے وائے پوچھی۔ انھوں نے نپے تلے انداز سے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو ہم نے اس نیک ارادے کے لیے ان کی خوب خوب تعریف کر دی۔ وہ خوش ہو گئے۔

ہم نے پوچھا:

"اس جلسے کی صدارت کون کرے گا؟"

"خدا جب دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کر دیتا ہے"۔ ان میں سے ایک کچی عمر کے لڑکے نے فوراً جواب دیا۔

"جناب! ہم آپ سے چندہ لینے ہی نہیں آئے، یہ گزارش بھی کرنے آئے ہیں کہ آپ اس جلسے کی صدارت بھی فرمائیے"۔

پہلے تو ہمارے جی میں آئی کہ پیشہ ور صدروں کی طرح ذرا نخرہ کریں۔ ان سے کہیں کہ "ہم سماج کے معمولی سے سیوک ہیں۔ کسی ذمہ دار عالم کو اس تقریب کی صدارت کے لیے بلائیے"۔ لیکن دفعتاً خیال گزرا کہ بچے ہیں، اگر عقل کی بات سمجھ گئے تو فوراً مکر جائیں گے۔ لہذا بغیر کسی تردد کے ہم نے ان کی تجویز قبول کر لی۔ ایک دیرینہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔

ہمیں ہرگز ان سے یہ امید نہ تھی کہ وہ ہمیں بلا کر لے جانے کا تکلف کریں گے یا ہمارے لیے گاڑی واڑی بھیجیں گے، اس لیے ہم خود ہی وقت مقررہ سے ایک گھنٹہ پہلے سج دھج کر تیار ہو گئے۔ جانے سے پہلے ہم نے آئینہ دیکھا۔ ہماری شیروانی پھر سے پریس ہونے والی تھی لیکن ہمارے پاس اس کے لیے وقت نہ تھا جیبی گھڑی کی زنجیر کو ذرا اور باہر نکال لیا، بالوں کو ایک بار پھر کنگھی کیا اور جلسہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ عام طور پہ ہم پیدل چلا کرتے ہیں لیکن اس دن خیال آیا کہ لوگ بھاگ دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟ کہ صدرِ محترم پا پیادہ چلے آ رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے تانگہ منگوا لیا۔

زندگی میں پہلی بار ہمارا استقبال ہوا۔ ہماری گل پوشی ہوئی اور ہم مسند پر جلوہ افروز ہو گئے۔ پروگرام چونکہ بچوں کے تیار کیے ہوئے دو ڈراموں پر مشتمل تھا۔ اس لیے ہمیں مسند سے اتار کر صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ ہمیں کچھ خاص برا نہیں لگا۔ سبھا کے پردھان نے ڈراموں سے پہلے ہی ہماری تقریر رکھ دی چونکہ اس کا خیال تھا کہ ڈرامے دیکھنے کے بعد لوگ ہماری تقریر سننے کو نہیں ٹھہریں گے۔

ہم نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی۔

"جین سماج کے جوشیلے نوجوانو اور خواتین و حضرات! آج سارے ملک میں بلکہ ساری دنیا میں مہاویر شتابدی منائی جا رہی ہے۔ جگہ جگہ میلوں ٹھیلوں کے ذریعہ مہاویر کو یاد کیا جا رہا ہے اور ان کی عظمت کے گیت گائے جا رہے ہیں۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ مہاویر کون تھے۔ مہاویر کا اصلی نام ہنومان تھا۔

ہماری زبان ابھی رواں ہوئی ہی تھی کہ سامعین میں ہلچل سی ہوتی دکھائی پڑی۔ ہم نے اپنی آواز ذرا اور بلند کی اور اپنی تقریر جاری رکھی۔

"وہ انجنی کے سپوت تھے، پون پتر تھے۔ جب شری رام چند جی سیتا ماتا کی تلاش میں پریشان ہو کر جنگل جنگل بھٹک رہے تھے تو مہاویر ہی تھے جو سمندر پر سے اڑ کر لنکا پہنچے تھے اور سیتا ماتا کی خبر لائے تھے۔ راون کا غرور مٹانے کے لیے مہاویر نے ہی لنکا کو جلا کر راکھ کی ڈھیر بنایا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دیکھیے آپ لوگ اطمینان سے بیٹھے رہیے بھگوان مہاویر کا چرچا ہو رہا ہے۔ اس وقت خلل اندازی کرنے سے آپ سیدھے نرک میں جائیں گے"۔

اسی وقت منتظمین میں سے کسی نے ایک چٹ مجھے تھما دی۔ لکھا تھا۔ "ہنومان پر نہیں، جینیوں کے بھگوان مہاویر پر بولیے جو جین دھرم کے بانی تھے۔ ہمیں اپنے صدارتی اختیارات میں یہ دخل اندازی بہت بری لگی۔ آخر ہم کوئی مفت میں تو صدر نہیں بنے تھے، پورے ایک سوا ایک روپے دیے تھے چندے میں۔ ہمیں غصہ آ گیا۔ ہم نے کہا۔

"ہم سے کہا جا رہا ہے کہ مہاویر صرف جین مذہب والوں کے تھے۔ یہ لغو ہے، سراسر غلط ہے، فریب ہے، دھوکا ہے۔ مہاویر کسی ایک قوم، ایک فرقہ یا کسی ایک علاقے کے نہیں تھے، وہ تو تمام کائنات کے تھے اسی لیے تلسی داس نے ان کے بارے میں کہا ہے:

مہاویر جب نام سنا دے
بھوت پشاچ نظر نہیں آوے"

باقی صفحہ پر

شعر کہتے نہیں ہے تخلص پرانے شاعر — منہ میں حُقّے کی نل ہو تو غزل ہوتی ہے (مرزا طوطی)

دعوت نامہ

سوشیل رتن چوپڑہ
مکان نمبر 1414 سیکٹر A 22
چنڈی گڑھ - 160022

دعوت نامہ بھیجنا یا دعوت نامے کی آمد دونوں آج کی انسانی اور سماجی زندگی کا اہم جز ہیں۔ جب خیال آتا ہے کہ یہ کارڈ یا کاغذ جسے دعوت نامہ کہا جاتا ہے کیسے اور کن حالات میں ایجاد ہوا ہوگا اور آج کس صورت میں ہمارے معاشرے میں سفر کر رہا ہے، تو مجھے یاد آتا ہے کہ جب ہم بچے ہی تھے تو لڑکیوں کے اسکول کی ایک ملازمہ جسے پیار سے سارے مائی کہتے تھے۔ گھر گھر آوازیں لگا کر لڑکیوں کو اسکول جانے کی دعوت دیا کرتی تھی۔ یہ زبانی دعوت نامہ تھا جسے ہر روز دوہرانے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی اسی طرح کسی کے گھر میں منگنی ہو، شادی ہو یا سوگ ہو تو نائن جملہ متعلقین کو گھر گھر جا کر ڈھولک بجانے دعوت کھانے یا سیاپا پر بیٹھنے کی دعوت دیا کرتی تھی۔

درگا اشٹمی کا تیوہار آتے تو گھر کی عورتیں محلے کی کنواری لڑکیوں کو حلوہ کھانے کی دعوت دیتی تھیں اور جاتے وقت شگون کے طور پر حسبِ المقدور ریزگاری بھی پلے باندھ دیتی تھیں۔ بچوں کا تیوہار ہو تو دعوت نامہ میراثن کی معرفت بھیجا جاتا تھا۔ کسی دوکاندار کے ہاں لڑکا تولد ہوا ہو تو لالہ جی کا منیم دعوتی پکوان یعنی لڈوؤں کا بھرا تھال گنگا جمنی صافی سے ڈھک کر دوکانوں اور گھروں میں تقسیم کرتا تا۔

یہ دعوتیں اور دعوت نامے تصنع سے بالکل مبرا تھے اور سادگی کے اعتبار سے خوبصورت بھی تھے اور پیارے بھی۔ ہر موقع محل کے مطابق نامہ بر مقرر تھے۔ گھر کی بہو بیٹیاں، میراثن، حجام، کمہار، منیم، مالی وغیرہ وغیرہ۔ یہ نقشہ محض ایک چھوٹے سے قصبہ کا ہے۔

شادی کا دعوت نامہ عموماً اور رواجاً قلم سے لکھا ہوا سرخ و سفید دھاگے میں بندھا ہوا ایک چھوٹا سا کاغذ کا رول ہوا کرتا تھا۔ اسے ہمارے علاقے میں "چھوٹی ہوئی چٹھی" کہتے تھے۔ کیونکہ اس کاغذ پر لوگ حسبِ حیثیت زعفران، سرخ رنگ یا ہلدی کے چھینٹے ڈال دیتے تھے تاکہ ایک نظر میں پتا چل جائے کہ پیغام شادی ہے۔ آہستہ آہستہ اس چھڑکی ہوئی چٹھی کی شکل مغربی وضع کے چھپے ہوئے دعوت نامے میں تبدیل ہوگئی اور دولہا اور دلھن کے نام کے علاوہ ان کی تعلیمی قابلیت، والدین کے اسماء اور عہدہ جات جائے رہائش اور دعوت نامہ چھاپنے والے چھاپہ خانے کا نام بھی دعوت نامے میں لکھا جانے لگا۔ اگر دولہا یا دلھن کا دادا، چچا، نانا یا بھائی کسی بڑے عہدے پر متمکن ہے۔ یا ویسے متمول شخص ہے تو اس کا ذکر بھی کر دیا جاتا ہے۔ اور پھر R.S.V.P جیسے الفاظ کا مطلب جانے بغیر کم و بیش ہر رشتہ دار اور دوست کا نام ان الفاظ کے نیچے چھاپ دیا جاتا ہے۔ ابھی چند روز ہوئے مجھے ایک دعوت نامہ موصول ہوا جس میں سولہ اشخاص کے نام چھپے ہوئے تھے۔ آپ کی تسلی کے لیے میں تفصیل عرض کیے دیتا ہوں۔

دولھا	1
دولھا کی فرم	1
دولھا کے والدین	2
دلھن	1
دلھن کا والد	1
R.S.V.P	5
جنکی معرفت دعوت نامہ جاری ہوا	5
کل تعداد	16

میرا اور میرے بیوی بچوں کے نام اس کے علاوہ تھے اور چونکہ وہ ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے میں نے یہ تعداد شامل نہیں کی۔

اس قسم کے دعوت نامے محض شادی کے موقع پر ہی جاری نہیں کیے جاتے۔ دعوت ناموں کا جاری کیا جانا ہر تقریب کا اہم جز بن گیا ہے۔ اور اگر دعوت نامے جاری نہ کیے جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ تقریب ہوئی ہی نہیں۔ گویا دعوت نامے کی اہمیت بذاتِ خود تقریب سے زیادہ ہے۔

بچے کی پیدائش، نام رکھنے کی رسم، سر منڈنے، پگڑی باندھنے کی رسم، سگائی، شادی، کریا، چوتھا، پاٹھ، بھوگ، مکان یا دوکان کا سنگِ بنیاد رکھنے کا موقع، پھر مکان یا دوکان کا تعارف، کسی لیڈر یا فلم ایکٹر کی تشریف آوری، مقابلہ حسن، مختلف اقسام کے ٹورنامنٹ، کھادی گرام ادیوگ کی نمائش، تعلیمی اداروں میں بزمِ والدین یا جلسہ تقسیم انعامات، غرض یہ کہ کونسی بات ہے جس کے لیے دعوت نامے جاری نہیں ہوتے۔ ان دعوتوں سے مختلف قسم کے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً آپ رام لیلا میں جائیں گے تو کسی مول چند کو مہارانی سیتا فرض کرکے کچھ نذر پیش کریں گے اور اسی طرح آپ جنتا میں اپنی نشست مخصوص کروا سکیں گے۔ اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو مہابیر دَل کے والنٹیر آپ کی جانب گھور گھور کر دیکھنے لگیں گے۔ اسی طرح کیرتن یا پاٹھ پارٹی میں آپکو اپنی جیب کا بوجھ ہلکا کرکے عاقبت سدھارنے کا موقع ملےگا۔ اگر کسی لیڈر کی آمد کے سلسلے میں دعوت نامہ قبول فرما کر آپ ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے ہیں اور دعوت نامہ پر الفاظ "P... پاس رقم نہیں ہیں" تو آپکو محکمہ پولس کی MOB CONTROL TRAINING کی داد دینے کا نادر موقع نصیب ہو جائے گا۔

کھلاڑی کلبیں ایک دوسرے کو چیلنج بھیجتی ہیں اور یہ بھی ایک قسم کا دعوت نامہ ہے کہ آیئے اور ہم سے مقابلہ کیجیے۔ یہ دعوت نامہ میری رائے میں رانا سانگا کے اس دعوت نامے سے بہتر قسم کا ہے جو اس نے بابر کو ہندستان آنے کے لیے بھیجا تھا اور اس کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس کے بعد ہندستانیوں نے وقتاً فوقتاً اپنے اعمال افعال سے عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کو جاری کیا۔ آپس میں ہی ایک دوسرے کو جنگی دعوت نامے جاری کرنے کا رواج ہمارے کلچر کا ایک نمایاں پہلو ہے اور ہم اس میدان میں باقی تمام ممالک سے آگے ہیں۔

کوئی ضروری نہیں کہ دعوت نامہ فرداً فرداً جاری کیا جائے۔ شہر میں پوسٹر لگائے جا سکتے

ماش کی دال ہو یا جھیل کی تازہ مچھلی [illegible] ہوتی ہے (مرزا طوسی)

ہیں کہ فلاں ٹریڈیونین کے جلسے میں آپ مدعو ہیں
کسی مندر یا اسکول کے گھنٹہ کو جگہ بہ جگہ بجا بجا کر
آپ کو مدعو کیا جاسکتا ہے کہ آپ فلاں بھر گو راج جیوتشی
جی کو فلاں صاحب کے مکان پر مل سکتے ہیں۔ اخبار
میں خبر یا اشتہار چھپوایا جاسکتا ہے کہ ادارہ بزم
کماربال میں فلاں موضوع پر لیکچر سننے کے لیے آپ
کو دعوت دی جاتی ہے۔ ریڈیو سیلون آپ کو مخاطب
کرکے فلم جنگل میں منگل دیکھنے کی دعوت دے سکتا ہے
یا پھر ریڈیو کشمیر اسرار بیگم کی زبانی سے

فرق کیا ہے اس زمین کی خاک اور اکسیر میں
چند دن کے واسطے اے دوست آ کشمیر میں

سنوا کر کشمیر کی سیر کی دعوت نشر کرسکتا ہے۔

دقت پیدا ہوتی ہے جب ان اشخاص کی فہرست مرتب کرنی پڑتی ہے جنھیں انفرادی طور پر دعوت نامے جاری کرنے ہوں۔ مختلف اقسام کے میزبان یہ موقع پر مختلف حل تلاش کرتے ہیں۔ مگر یہ کارپوریشن والوں نے یہ وقت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل کرلی ہے۔ ریڈ کراس کا میلہ ہو یا پہلوانوں کا دنگل، اقبال بیگم کا گانا ہو یا اندھوں کے اسکول کا جلسہ، بھیں بہ ستیوں کی دوڑ ہو یا کسی نئے جیل خانے کی رسم افتتاح۔ جشن جمہوریت ہو یا جشن آزادی۔ باپو کا جنم دن ہو یا یوم شہیداں، آرٹ کی نمائش ہو راج بھون میں برفی سموسہ پارٹی، صبح کا وقت ہو یا شام کا سردی کا موسم ہو یا گرمی کا، چائے تقریب دوڑ ہو یا نیز دیگ، سرکاری کارندے سیول لسٹ میں درج شدہ اصحاب کے نام دعوت نامے جاری رکھیں گے۔ اگر آپ اچھے پہلوان ہیں۔ دلیش بھگت ہیں، اچھے کھلاڑی ہیں یا آرٹسٹ ہیں تو بھی رہیے جاسیے۔ جب تک آپ کا نام سول لسٹ میں درج نہیں ہوتا آپ کے نام دعوت نامہ جاری نہیں ہوگا یقین مانیے سے

کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

ہم صدر بنے کا بقیہ ......

لیکن اس وقت تک سامعین بہت بے قرار ہو رہے قابو ہو چکے تھے۔ ان کا شور و غل اپنی حدوں سے تجاوز کر رہا تھا۔ لہٰذا ہم نے منتظمین کا مشورہ قبول کرکے اپنی تقریر ادھوری ہی چھوڑ دی۔

ہمیں قوی امید تھی کہ بسویرشتابدی تقریب کے بعد ہماری شہرت گھر گھر پہنچ جائے گی۔ اور اب ہمیں نت نئے جلسوں کی صدارت کے لیے مدعو کیا جائے گا۔ لیکن ہماری تمام امیدوں پر پانی پھر گیا۔ صدر بننے کی آرزو ایک بار تو پوری ہو چکی تھی لیکن اب ہماری طبیعت چاہتی تھی کہ پھر اسی طرح کبھی دوبارہ ہمارا استقبال ہو، ہمیں پھولوں کے ہار پہنائے جائیں۔ اور ہم مسند صدارت پر بیٹھ کر محسوس کرسکیں کہ گویا ہم اندر سنگھاسن پر براجمان ہیں اس دن تو ہماری بیگم ہمارا منہ تکتی رہ گئیں جب ہم نے گھر لوٹ کر ڈھیر سے پھولوں کا ہار تھماتے ہوئے کہا تھا۔

"تم ہماری قدر نہیں جانتیں، شہر والوں سے جاکر پوچھو کہ ہم کیا ہیں"۔

لیکن مقدر نے دوسری بار صدر بننے کا موقع آج تک عطا نہیں کیا۔ اور اب اس کی امید بھی کم ہوتی جارہی ہے۔

بقیہ:۔ مصیبت در مصیبت

پڑا تھا۔ لیکن یہ تین سو اکیاون روپے کہاں سے ادا کریں گے۔ اب یہ فکر دامن گیر ہے۔

کیا ہی اچھا ہوتا اگر ہمارے ان خیرخواہوں نے خود آنے کے بجائے اپنے کرایہ کی رقم ہمیں بھیج دی ہوتی تو ہم ایک نئی سائیکل بھی خرید لیتے اور لپنے بنئے کی دکان کا راستہ بدلنے سے بھی بچ جاتے۔

مجھ کو محسن جان کر دیں دھمکیاں
اب تو وہ بھی شاہ فیصل ہوگئے۔ (فخری سنبھلی)

مُصیبت دَر مُصیبت

فضل حسنین
۲۸ گلاب باڑی الہ آباد

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مصیبت کبھی تنہا نہیں آتی کیونکہ ایسے موقع پہ خیر خواہ حضرات کی بن آتی ہے۔ اور وہ اپنی اس کوشش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے ہیں کہ آپ اس مصیبت میں زیادہ سے زیادہ دنوں تک گرفتار رہیں۔ اور انھیں طرح طرح کی ہمدردیاں جتانے کا موقعہ ملتا رہے۔ ہم خود بھی ایک ایسے ہی حادثے کا شکار ہو چکے ہیں جس سے نجات حاصل کرنے میں ہمیں دانتوں پسینے آگئے۔

ہوا یوں کہ پچھلے دنوں ہم اپنی سائیکل پر سوار ایک بے حد بھیڑ والی سڑک سے گزر رہے تھے۔ جس رفتار سے سائیکل چل رہی تھی اس سے کہیں زیادہ تیز رفتار ہمارا ذہن افسانے کے نئے پلاٹ کی تلاش میں بھاگ رہا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ میں اچانک کمبخت ایک چوراہا درمیان میں آن ٹپکا اور ہماری آنکھوں نے لال بتی دیکھنے کی ذرا بھی زحمت نہ کی (شاید آنکھیں بھی نئے پلاٹ کی تلاش میں مشغول تھیں) نتیجے کے طور پر ہماری سائیکل ایک ٹرک کے نیچے آگئی۔ وفادار سائیکل نے یہ مصیبت بھانپتے ہوئے ہمیں دور پھینک دیا اور بے چاری خود قربان ہوگئی۔ اس لیے ہمیں معمولی سی خراشیں ہی آئیں۔

خیر صاحب جو ہونا تھا ہوگیا۔ لیکن دوسرے روز سے ہمارا راستہ چلنا ہی دشوار ہوگیا۔ جسے دیکھیے وہی پوچھ رہا ہے۔ "کہیے صاحب! کیسے ہوا؟" اور جب ہم ایک ہی بیان بار بار دوہراتے دوہراتے عاجز آگئے تو ہم نے اس حادثے کا تفصیلی بیان ٹیپ کرلیا اور ہر وقت اسے اپنے ساتھ رکھتے۔ جب بھی کوئی شناسا نظر آتا اس کا سوال پورا ہونے سے قبل ہی ہم ٹیپ ریکارڈر آن کر دیتے۔ اس پر کچھ لوگوں نے ہمیں مسخرہ قرار دیا۔ ہم ہر وقت ہنستے ہنسانے کے قائل، آخر کب تک ماتمی صورت بنائے رہتے۔ ایک ہفتے بعد ہم سے مسکرانے کا جرم ہو ہی گیا۔ اس پر ہماری خاص "لے دے" ہوئی کہ اتنا بڑا حادثہ ہوگیا اور یہ حضرت مسکرا رہے ہیں۔

ہم نے اس حادثے کا ذکر اپنی بیگم سے کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے نہیں کہ انھیں خود ہمارے ٹوٹنے پھوٹنے کا افسوس ہوگا بلکہ اس ڈر سے کہ سائیکل بیگم کے دادا کے دادا کی آخری یادگار تھی۔ یعنی یہ آبائی بیگم کی تھی۔ اور اس کی دیکھ بھال اور اسے چمکانا ہمارے ذمے تھا۔ لیکن ایک دن کسی دشمن نے بیگم کو اصل واقعہ بتا ہی دیا۔ پہلے تو بیگم نے خوب خوب لکچر جھاڑا۔ "میں تو جانتی ہی تھی کہ یہ نگوڑے افسانے اور ڈرامے کسی نہ کسی دن تمھیں لے ڈوبیں گے۔" لیکن جب دل کی بھڑاس کچھ نکل گئی تو انھوں نے اپنا آخری زیور بیچ کر ہمارے لیے ایک دوسری کھٹارا خریدی۔

لیکن اب ہماری حیثیت ایک بچے جیسی ہوگئی تھی۔ ہم جب بھی سائیکل لے کر باہر نکلنے لگتے تو ہمارے اوپر طرح طرح کی دعاؤں کی بارش کی جاتی۔ جیسے ہم کسی بہت لمبے سفر پر روانہ ہو رہے ہیں۔ کسی دن آفس سے واپسی میں کچھ دیر ہوجاتی تو بیگم دروازے پر کھڑی ملتیں۔

جب ہم سڑکوں پر چلتے تو اکثر لوگ ہماری طرف اشارہ کرکے افسوس ظاہر کرتے۔ "یہی ہیں بے چارے جن کا ایکسیڈنٹ ہوگیا تھا ......" اور اگر ہم اچھے موڈ میں تو فوراً چہرے پر ماتمی غلاف چڑھا لیتے کیوں کہ انھیں اس حادثے کا یقین دلانا بھی ضروری تھا۔

جب ان مقامی حضرات کی تعزیت کا سلسلہ کچھ سست پڑا تو ہماری ڈاک کافی سوجی آنے لگی۔ ہم بڑی خوشی سے یہ خطوط پڑھنا شروع کرتے کہ شاید ہماری کہانیوں کے سلسلے میں تعریفی خطوط ہوں گے لیکن ہم بہت بور ہوئے جب یہ خط کا ایک ہی مضمون نکلتا "بڑا افسوس ہوا۔ کیسے ہوا؟" مقامی لوگوں کو تو خیر ہم نے ٹیپ کے سہارے سنبھالا۔ لیکن اب ان خیر خواہوں کو تحریری بیان دینا ہمارے بس سے باہر تھا۔ لہٰذا ہم نے اس حادثے کا تفصیلی بیان چھپوا کر ہر خط کے جواب میں ایک ایک کاپی ارسال کردی۔ اور پھر ہم نے خط پڑھنا ہی بند کردیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برادری میں ہمارا "حقہ پانی" بند کرنے کے بارے میں غور کیا جانے لگا۔ کیوں کہ ان خطوط میں کچھ دعوت نامے اور کچھ غمی کے خطوط بھی تھے۔ ظاہر ہے جب ہم نے کوئی خط پڑھا ہی نہیں تو شریک ہونے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ خیر صاحب! ہم نے معافی مانگ کر کسی طرح اپنا "حقہ پانی" بحال کردیا۔

اب ہمارے یہاں مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوا کیوں کہ یہ خبر اخبار والے کافی تفصیل سے شائع کر چکے تھے۔ ہم نے ہر چند اپنے خیر خواہوں سے کہا کہ بھئی اخبار میں تو صاف صاف لکھا تھا کہ صرف میری سائیکل زخمی ہوئی تھی۔ اس پر انھوں نے مزید خلوص کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ارے صاحب! ان اخبار والوں کا کیا بھروسہ پوری خبر چھاپتے ہی کب ہیں۔" ہم ان سے کیسے کہتے کہ اس خبر کو جھوٹی ہی سمجھ لینے میں کیا حرج تھا۔ ہمارا چھوٹا سا مکان، پلنگ چھوڑ کر ہمیں فرش پر آنا پڑا۔

خدا خدا کرکے ہمارے ان ہمدرد مہمانوں کی آخری قسط رخصت ہوئی۔ ہم نے پورے ماہ کا حساب جوڑا تو پورے گیارہ سو اکیاون روپے نکلے جب کہ ہمارا ماہانہ اوسط خرچ آٹھ سو کے قریب لگ بھگ ہے۔ سائیکل کا نقصان تو اب کسی حد تک ہمارے ذہن سے مٹ

سیب کشمیر کو شرماتے ہوں رخسار جسیں
بات مصری کی ڈلی ہو تو غزل ہوتی ہے (مرزا طوسی)

جب فسادوں کی چلی بادِ خزاں تھے جو کل تک شہر جنگل ہو گئے

ہم جیسے چلے تھے یار سے ملنے کے واسطے رستہ ہمارا کاٹ کے بلی گزر گئی (بہری آزاد یونی)

عیب کرتے نہ مجھے لوگ فرشتہ کہتے   کاش اس دور کا میں بھی کوئی لیڈر ہوتا   (نرگس جسوانی)

۱۱۷۲۹

ہدیۂ تشکر

ادارہ "اسباق" کی یہ خوش نصیبی ہے کہ اُسے ہر قدم پر، ہر مرحلے پر ایسے ہمدرد ملتے گئے جن کی دعاؤں اور تعاون سے "اسباق" کے ادبی سفر کے دشوار مرحلے آسان ہوتے چلے گئے۔

چناں چہ بیگ محمد ہائی اسکول، ممبئی کے جواں سال و جواں فکر پرنسپل، عالی جناب سہیل لوکھنڈ والا صاحب بھی ہمارے ایسے ہی کرم فرماؤں میں سے ہیں جنھوں نے سال نامے کے لیے ہمیں اپنے مبارک اور پُر خلوص تعاون سے نوازا ہے۔

نیز اردو ادب کے مایۂ ناز محقق عالی جناب کالی داس گپتا رضاؔ صاحب (بمبئی)، مقبول ادیب ڈاکٹر ادے سرن اوماں (مرادآباد)، ملکہ نسیم صاحبہ (ہوشنگ آباد) ایاز قریشی (مہو)، جینت پرمار (احمدآباد)، جناب مانک ٹالا (بمبئی) اور ان تمام قلمی معاونین کا شکریہ ادا کرتے ہیں جنہوں نے ہمیں اپنے مالی اور فنی تعاون سے سرفراز فرمایا۔

صدر و اراکین بزم اردو و ادارہ اسباق، سالنامے کی اشاعت کے موقع پر ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

؏ "گر قبول افتد زہے عز و شرف"

تصحیح نامہ

قارئین سے گذارش ہے کہ مندرجہ ذیل صفحات پر خط کشیدہ

الفاظ کے مطابق تصحیح فرمائیں۔ .... ادارہ۔

صفحہ نمبر — ۷۹ — نظم "سید آصف" ۔ کنویں کی ڈور برہمن کی ملکیت سمجھوں

" — ۸۴ — نظم "سہیل عظیم آبادی" — شاعر کا نام ۔ سلطان احمد ساحل

" — ۲۰۴ — غزل "دلدار ہاشمی" اتنا داغدار ہے یہ کس کا پیرہن بتا

" — ۲۱۷ — غزل "نذیر فتح پوری" اتنا مشہور مرے خون کا قصہ ہوئے

" — ۲۱۷ — غزل "نذیر فتح پوری" دھیان سمتوں سے بٹے راہ سے ہٹ جائیں قدم

" — ۲۱۷ — غزل "سید آصف" سوداگر دنیا میں کس دن ہاتھ پسارے پیٹ بھرا (؟)

" — ۲۵۵ — نظم (ترجمہ) گجراتی نظم "غلام محمد شیخ"، ترجمہ (اردو) جینت پرمار

" — ۳۱۸ — نام شاعر "تابش حلیمی"

اپنے چہرے سے اپنا نمک مت اتار   رنگ اندھوں کے آگے دھنک مت اتار (رشید عثمانی)

۲۶ ایک مصرعے میں واؤ عطف کو متحرک کر کے "تیرہ و تار" نظم کیا گیا تھا۔ اس انتخاب میں یہ بھی شامل ہے۔

ص ۳۰ مطلع کے پہلے مصرعے میں "سرد راتوں سلگتے" کتابت ہوا ہے" جب کہ "سرد راتوں میں سلگتے" ہونا چاہیے۔

ص ۳۱ مطلع کا پہلا مصرعہ" اندرون ذات کی حد سے نکل" ہونا چاہیے تھا" جسے" اندرون کی حد سے نکل" کر دیا گیا ہے۔

ص ۵۵ تیسرے شعر کے دوسرے مصرعے" جدیدیت کے رنگ میں روایتیں ادا کرو" کے دوسرے رکن والے الفاظ" کے رنگ میں" کو "کی رنگیں" کر دیا گیا ہے" اصلاح کے اس اعادے سے مصرع بے بحر ہو گیا ہے۔

ص ۷۶ مقطع کے دوسرے مصرعے میں "شہر" کو بروزن دہر و قہر نہیں، سحر اور گھر کے وزن میں لایا گیا ہے۔

ص ۱۰۱ مطلع ہی کے پہلے مصرعے میں" دبی دبی سی" کے بعد" ہیں" چھوڑ دیا گیا ہے۔ مصرع ہے

ع دبی دبی سی ہیں چنگاریوں میں آہیں بہت۔

جلد بازی کی خامی کو اگر نظر انداز کر دیں تو آزاد غزل کی شناخت کی حدوں تک پہنچنے کے لیے آزاد غزلوں کا یہ پہلا مجموعہ بے حد اہم ہے۔ علیم صبا نویدی آزاد غزل کی سب سے معتبر آواز ہے۔ انھوں نے آزاد غزل کو خون جگر پلانے میں بڑا اہم رول ادا کیا ہے۔ "قید شکن" میں بھی ان کی فکری اور لفظی تجسس کی رنگ آمیزی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔

سر ورق سادہ، کاغذ سفید اور کتابت و طباعت معیاری ہے!

"نئی اُردو شاعری"

مضامین ـــــ زینت اللہ جاوید
قیمت ـــــ دس روپے
ناشر ـــــ ایجوکیشنل پبلی کیشنز، منظور پورہ اورنگ آباد (دکن)
مبصر ـــــ عتیق احمد عتیق

۱۸۵۷ء کی جدوجہد اور انقلاب کے بعد حالی و آزاد کی بدولت دنیائے شعر و ادب کو جس نئے موڑ کی بشارت ملی اور جس کے طفیل ادب کی نئی راہوں اور نو بہ نو سمتوں کو نکھارنے خون سے بھر دینے والے سامنے آئے، آنھیں کی تو یہ قربانیاں تھیں جن کے نتیجے میں فکر و خیال کی ٹہنیوں میں کھلے ہوئے ان گنت گل بوٹے ہمارے لبستان ادب کو آج بھی مہکائے ہوئے ہیں، انہی مہکتی ہوئی حقیقتوں کے بالترتیب ادراک کے لیے زینت اللہ جاوید کی کتاب" نئی اُردو شاعری" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کتاب کے مجوزہ عنوانات نئی شاعری سے پہلے ـــ نئی شاعری ـــ نئی شاعری میں ذات کا کرب ـــ نظریہ وجودیت ـــ وجودیت کا مسئلہ ـــ علامت پسندی ـــ نئی ترقی پسندی ـــ لاشعوریت ـــ عہد حاضر میں میر کی افادیت ـــ آل احمد سرور اور جدیدیت ـــ ڈاکٹر محمد حسن اور جدیدیت ـــ میں ادب اور زندگی کی بتدریج بدلتی ہوئی قدروں یا زیادہ صحیح لفظوں میں یہ کہ نمود فن کے دائرے کی توسیع کا کام آں زمانے سے آج تک جس معیار و رفتار سے ہوتا رہا ہے اسی ادبی سفر کے تسلسل و تواتر کی تفصیل یا اس کی روح کو ایجاز و اختصار کے قالب میں اتار کر مصنف نے ایک قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ بالخصوص نئی اُردو شاعری کے وہ مختلف رجحانات و میلانات جو اپنی متعاقب دہائیوں کے ساتھ نیا روپ دھارتے اور دامن ادب کو مالا مال کرتے رہتے ہیں ان کے اسباب و علل پر نہ صرف روشنی ڈالی گئی ہے بلکہ ایک غیر جانبدارانہ تجزیاتی مطالعہ کے ذریعے انھیں تجزیہ بھی سمجھا بھی دیا گیا ہے۔

یہ سلسلۂ نقد و نظر ٹھوس حقائق پر مبنی مواد کی حامل یہ کتاب ماضی کے عظیم ادبی ورثہ کی محافظت اور حال و مستقبل کی تعمیر و تشکیل کے لیے اپنے ہر قاری کو اُبھارتی ہے۔ زینت اللہ جاوید مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنا معیار فکر ہی اس پر قائم کیا ہے کہ اُن کے اپنے مقصود نگارش کو عصبیت کی ہوا تک نہ لگنے پائے۔

گرانی کے نام پر لوٹ کھسوٹ کے اس دور میں تقریباً سو صفحات پر مشتمل وہ کتب جو زیادہ سے زیادہ پانچ روپیوں کی لاگت میں تیار ہوتی ہیں ان کی قیمتیں دس روپے سے کم تو رکھی ہی نہیں جاتیں لیکن" نئی اُردو شاعری" جو ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل اور اپنے مواد و معیار کے اعتبار سے ایک وقیع کتاب ہے جس کا کاغذ نفیس اور کتابت و طباعت بھی اچھی ہے، صرف دس روپوں میں حاصل اور اضافہ و استفادہ کے لیے ملک کی تمام لائبریریوں اور ذاتی کتب خانوں کی فہرست میں شامل کی جا سکتی ہے۔

نام کتاب: بے ارادہ

مصنف : جوگندر پال
ناشر : زم زم بک ٹرسٹ دہلی
سنہ اشاعت: ۱۹۸۱
قیمت : پچیس ۲۵ روپے
تبصرہ نگار: عصمت جاوید

"بے ارادہ" جوگندر پال کی تازہ ترین کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ جن لوگوں نے جوگندر پال کی کہانیوں کے مختلف مجموعے" رسائی"، "مٹی کا ادراک"، "بے محاورہ" وغیرہ اب تک پڑھے ہیں انھیں جوگندر پال "بے ارادہ" میں بھی اسی انداز فکر کے ساتھ نظر آئیں گے جو اب ان کی پہچان بن گیا ہے۔ وہی خود کلامی کا انداز، وہی اقوال محال (Paradoxes) کے پردے میں متضاد حقیقتوں کو ٹکرا کر ان کی تہ میں چھپی ہوئی سچائی کو تلاش کرنے کی کوشش۔ لیکن بے ارادہ میں سماجی حقیقتوں کا احساس زیادہ تیکھا محسوس ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں ہندو مسلم فساد کی گونج ہے، سماجی نا انصافیوں کے حوالے ہیں، پاش کالونیوں کی مصنوعی زندگی ہے۔ غیر سماجی، غیر اخلاقی اور غیر قانونی حرکتوں کے مضر سماجی معزات ہیں۔ یہ سب کچھ ہے پھر بھی ان کہانیوں میں مقصدیت کا پیر تسمہ پا حقائق کی گردن پر سوار نہیں ہے بلکہ ان کہانیوں کو زندگی صرف خام مواد فراہم کرتی ہے اس لیے یہ کہانیاں "بارادہ" لکھی جانے کے باوجود بڑی حد تک بے ارادہ ہیں۔ کیوں کہ فن کار نے اپنے ارادے کی لگام ڈھیلی چھوڑ دی ہے۔ البتہ بعض بلکہ اکثر کہانیوں میں یہ لگام ضرورت سے زیادہ ڈھیلی چھوٹ گئی ہے۔ اس لیے یہ کہانیاں قاری کے لیے الجھن بن جاتی ہیں۔ ان میں کہانی پن کی ضرورت سے زیادہ کمی کھٹکتی ہے۔ پھر بھی اس مجموعے میں کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جن میں وہ کہانی پن کو

قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں ۔ یہ افسانے حرف ایسی کے نہیں بل کہ اردو ادب کے شہ پارے کہلانے کا حق رکھتے ہیں ۔ مثلاً " جادو" "بے گور" " باہر والا " " بہرے " وغیرہ جادو اس بد نصیب لوکرانی کی کہانی ہے جس کی عصمت نیند میں لوٹ لی جاتی ہے اور وہ ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے ۔ کہانی کا تانا بانا اس چابک دستی سے بنا یا گیا ہے کہ کہانی میں قاری کی دلچسپی بھی قائم رہتی ہے اور اس کے مرکزی کردار سے ہمدردی بھی ۔ "باہر والا" علامتی افسانہ ہونے کے باوجود اپنی دلچسپی برقرار رکھتا ہے اور سماج کی غیر قانونی سرگرمیوں پر طنز بن جاتا ہے ۔ "کھلونے" "سہمی آنکھوں کا " "بہرے " اور واردات پیٹ بھروں کے مسائل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور زندگی سے بھرپور ہیں ۔ ایک فقیر ۔۔۔۔ یہ صدا لگایا کرتا تھا "تم مجھے روٹی دے دو میرا خدا تمھیں دکھ دے گا ۔ " بابا روٹی چاہتے ہو تو لوگوں کے لیے سکھ مانگو" فقیر نے جواب دیا " تم اس کالونی کے رہنے والے معلوم ہوتے ہو تمھارے محلے میں آؤں گا تو تمھارے لیے سکھ ہی مانگوں گا ۔ مگر یہ لوگ اپنے سکھوں ہی سے دکھی ہیں اس لیے ان کے سکھ کے لیے دکھ مانگتا ہوں "۔ پھر اس مجموعے کا نہایت ہی کامیاب افسانہ " بے گور" ہے جو زندہ درگور ہندستانیوں پر ۔ یہاں کی معاشی نابرابری اور ۔۔۔ پر بھرپور طنز ہے ۔ ایک امریکی ڈاکٹر کو تجربے کے لیے انسانی لاشوں کی تلاش ہے ۔ امریکہ میں یہ ۔۔۔ آسانی سے نہیں مل سکتیں کیوں کہ اس " دیس میں ۔۔۔ کی نوبت نہیں آتی " رام دین کہیں سے لاشوں کا انتظام کرتا ہے ۔ لیکن یہ چلتی پھرتی زندہ لاشیں ہوتی ہیں ۔ اس لیے ڈاکٹر انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے ۔ آخر رام دین جھنجھلا کر کہہ اٹھتا ہے " بڑے بدقسمت ہو ۔ اگر یہ واقعی مر چکے ہوتے تو ٹھاٹ سے امریکہ جا پہنچتے "

بہ حیثیت مجموعی " بے ارادہ " اردو افسانوی ادب میں خوش گوار اضافہ ہے ۔ لیکن کتاب کا گٹ اپ انتہائی خراب ہے کاغذ بھی معمولی ہے ۔ اور طباعت بھی ۔ موجودہ گرانی و افسانہ نگار کے نام کے پیش نظر کتاب کی قیمت پچیس روپے مناسب ہے ۔

نام کتاب : کالی داس گپتا رضا

تحقیق و تالیف اور شعر کی روشنی میں

مصنف : ظفر ادیب
طابع و ناشر : جی ۔ کے مانک ٹالا
تاریخ اشاعت : یکم جنوری ۱۹۸۲ء
قیمت : پینتیس ۳۵ روپے
تبصرہ نگار : عصمت جاوید

کالی داس گپتا رضا کا نام علمی و ادبی حلقوں میں دیکھتے ہی دیکھتے جانا پہچانا بن گیا ہے ۔ متعلقات غالب اور سہو و سراغ ان کی ایسی تصنیفیں ہیں جو انھیں نہ صرف محقق کی حیثیت سے متعارف کراتی ہیں بلکہ تحقیق کی دنیا میں بالخصوص غالب سے متعلق انکی دریافتیں معتبر و محترم سمجھی جاتی ہیں ۔ وہ شاعر بھی ہیں اور جوش ملسیانی کے توسط سے ان کا سلسلۂ تلمذ داغ دہلوی سے ملتا ہے ۔ زیر تبصرہ کتاب ان کی سوانح عمری ہے ۔ اردو میں سوانح نگاری کی صنف آج بھی عہد طفولیت میں ہے ۔ پھر زندوں کی سوانح عمری رقم کرنا پل صراط پر چلنے سے کم دشوار کام نہیں ہے ۔ لیکن آج کے پبلسٹی دور میں زندہ ادیبوں اور فن کاروں کی سوانح عمریاں لکھنے کا چلن خاصہ عام ہو چلا ہے ۔ یہ سوانح عمری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔ طابع و ناشر اور دیباچہ نگار مانک ٹالا یہ جانتے ہیں کہ " اردو میں ایسے بھی شہرت کے رسیا ہیں جو خود ہی تعریف و توصیف میں مضامین لکھ کر دوسروں کے نام سے شائع کروا ڈالتے ہیں " لیکن رضا صاحب سے متعلق وہ قاری کو یقین دلاتے ہیں کہ " رضا صاحب کی بات ہی اور ہے " چناں چہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں " رضا صاحب چاہتے تو اسے اپنے اشاعتی ادارے سے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کروا سکتے تھے ۔ لیکن ہمیشہ کی طرح ان کا انکسار آڑے آیا اور انھوں نے اس کی اشاعت روک دی " پھر بھی کتاب کیوں لکھی گئی اور کس طرح چھپی اس کا علم ذہین قاری کو ما فی بین السطور سے ہو جاتا ہے ۔ جنھوں نے متعلقات غالب اور سہو و سراغ کی عمدہ کتابت و طباعت کو دیکھا ہے وہ زیر نظر کتاب کی طباعت اور کاغذ کو ذہن میں رکھ کر مانک ٹالا صاحب کے بیان پر ایمان لا سکتے ہیں ۔

بہر حال کتاب لکھی گئی اور منظر عام پر آئی ۔

سوانح نگار کی نہ تو اپنے " ہیرو " سے پہلے ملاقات تھی اور نہ بعد میں کوئی تعلق قائم ہوا ۔ بل کہ تصنیف کے آغاز سے آخر تک صرف دو بار مختصر ملاقاتوں کا موقع ملا ۔ یہی وجہ ہے کہ سوانح نگار نے گپتا صاحب کی شخصیت کے بارے میں جو کچھ لکھا اس میں کچھ سنی سنائی لیکن زیادہ چھپی چھپائی باتوں کو دخل ہے ۔ سوانح نگار کو اپنے ہیرو کے حالات زندگی بیان کرنے کے سلسلے میں مختلف عنوانات قائم کرنے پڑے جن میں سے تین قابل ذکر ہیں (۱) رضا صاحب کی تحریروں سے (۲) دوسروں کی تحریروں سے (۳) میری اپنی نظر میں ۔ رضا صاحب کی جن تحریروں کے اقتباسات دیے گئے ہیں وہی اس باب کا حاصل ہیں ۔ دوسروں کی جن تحریروں سے مدد لی گئی ہے ان کا تعلق دیباچوں اور پیش ناموں سے ہے ۔ جو مخصوص سیاق و سباق میں لکھی گئی ہیں ۔ ان میں مالک رام اور گیان چند جین کے تاثرات وقیع ہیں ۔ بلکہ گیان چند جین نے رضا صاحب کے شوق مطالعہ اور ان کی ذاتی لائبریری کا نقشہ جن الفاظ میں کھینچا ہے اسے حاصل مطالعہ سمجھنا چاہیے ۔ سوانح نگار کی نظر میں اس کا ہیرو شریف الطبع ، شریف النفس اور شریف الشعور (؟) ہے ، استاد کا احترام کرتا ہے ، اردو نواز ہے وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ اس ذیلی عنوان کے تحت اور کوئی نئی بات ایسی نہیں معلوم ہوتی جس سے پتا چلے کہ رضا صاحب کی دلآویز شخصیت کے نقوش کیا ہیں ۔

محقق کی حیثیت سے سوانح نگار نے رضا صاحب کو قاضی عبدالودود ، مولانا امتیاز علی عرشی مالک رام ، اور ڈاکٹر گیان چند کے زمرے میں شامل کیا ہے ۔ تحقیق کا صحیح ذوق رکھنے والوں کو اس دعوے سے اختلاف نہیں ہو سکتا لیکن ان کی تحقیقی صلاحیتوں کا تجزیہ کرتے ہوئے سوانح نگار کے قلم سے ایسے عجیب و غریب جملے نکل گئے ہیں : ایک جملہ ہے " انھوں نے تحقیق کو تخلیق کا مرتبہ دینے کی لگن لگائی ہوئی ہے جو فی زمانہ کم پائی جاتی ہے " (ص ۵۵) تحقیق و تخلیق دو جداگانہ صلاحیتیں ہیں ۔ اگرچہ ادب میں ان کا مشترکہ خط بھی ہے ۔ تاثراتی تنقید کو تخلیقی تنقید تو کہا جاتا ہے اور وہ درست بھی ہے ۔ لیکن تحقیق کو تخلیق کا مرتبہ دینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی ۔ اور اسی صفحے پر یہ جملے ہیں سمجھ میں نہیں آئے " رضا صاحب ایسا ادیب ، فقیہ شہر نہیں ہو سکتا ، فقیہ شہر ہوتا ہے اور وہ بھی اور اور (کذا)

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو (ذوق)

لباس میں تاکہ کم ہی لوگ اسے پہچان سکیں"

***

درد و داغ

تصنیف: درد و داغ
مصنف: سہیل مالیگانوی
قیمت: دس روپے
ملنے کا پتہ: ادارہ ہم زبان، نشاط بک سینٹر
قدوائی روڈ مالے گاؤں ۲۰۳–۴۲۳
تبصرہ: ظہیر الحسن

رباعی ایک ایسا آئینہ جہاں نما ہے جس کے چار مصرعوں کے احاطے میں ساری کائنات سمٹ آتی ہے۔ رباعی کی یہی خوبی اور انفرادیت ہے کہ وہ مختصر سے مختصر الفاظ کے دائرے میں بسیط سے بسیط مضمون کو مقید کردیتی ہے۔ شاعر کے داخلی احساسات، اور خارجی مشاہدات کی ایسے حسین پیرائے میں عکاسی کرتی ہے کہ یہ عکس ذہن پر نقش ہو جاتا ہے۔ اس لحاظ سے، رباعی گوئی کا فن، کافی دشوار ہے۔ اردو ادب میں، شروع سے ہی تقریباً ہر بڑے اور چھوٹے شاعر نے اس فن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور آج اپنے یہاں رباعی کا بڑا گراں قدر اور ضخیم سرمایہ موجود ہے۔

انیس، حالانکہ مرثیہ کے میدان کے شہسوار تھے اور اس صنف سخن کے تاجدار، لیکن ان کی رباعیاں اردو ادب میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ جوش اور فراق پر بھی یہ بات صادق آتی ہے۔ ان ماہرین کلام کی رباعیوں کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ رباعی کہتے وقت گویا ان کی تمام قدرت بیان اور صلاحیت اظہار، ایک مرکز پر مجتمع ہو جاتی ہے۔ جناب سہیل مالیگانوی کی زیر تبصرہ کتاب " درد و داغ " میں، منظومات کا بیشتر حصہ رباعیوں پر مشتمل ہے۔ شاعر کا تعارف کراتے ہوئے پیش لفظ میں ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے نہایت بجا طور پر کہا ہے کہ " اردو میں رباعیوں کا انتخاب کرتے وقت، اگر کوئی انیس، جوش، یگانہ، امجد اور شاد کے ساتھ سہیل کا نام لینا، دانستہ طور پر بھولا تو وہ یقینی کم نظر شمار کیا جائے گا۔

" درد و داغ " میں چند نظموں اور غزلوں کے علاوہ کل ۲۴۵ رباعیاں ہیں۔ اور شاعر نے اپنا سارا زورِ بیان انہیں رباعیوں پہ صرف کیا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ شاعر نے، ان رباعیوں میں صرف روایتی مضامین ہی نہیں باندھے بلکہ آج کے دور، آج کے سماج، اور آج کی سیاست کا خاکہ بھی بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعے کی بعض رباعیاں تو یقیناً چونکا دینے والی ہیں، اور رباعی کے اعلا ترین معیار پر پوری اترتی ہیں۔ پہلی ہی رباعی شاعر کی وسیع القلبی اور گہرے تجربے کی ترجمان ہے:

رو گھونٹ نہیں، ایاغ اپنا دے دوں
دو پھول نہیں، میں باغ اپنا دے دوں
ڈرتا ہوں کہ دورِ نو رہے گا زندہ!
ناداں کو اگر دماغ اپنا دے دوں

رباعی کے سلسلے میں قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ تعین نہیں ہے کہ ایک شعر پر تین یا چار مصرعے، محض حاشیہ آرائی کے طور پر لگا دیے۔ بلکہ اس کا اپنا ایک مکمل پیکر ہوتا ہے، اور ہر مصرع اس کے مجموعی وجود کے لیے لازمی جز ہے۔ چاروں مصرعے مل کر ایک لطیف، اچھوتے خیال کو الفاظ کے ملبوس میں پیش کرتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ رباعی کے چاروں مصرعے ایک دلکش مضمون کی عمارت کے چار ایسے ستون ہیں، جن کے بغیر اس عمارت کا قیام ناممکن ہے۔ جوش کی رباعی ملاحظہ ہو:—

اک سلسلۂ لامتناہی ہے کہ زُلف
گہوارۂ بادِ صبح گاہی ہے کہ زُلف
اے مستِ شباب، دوش سیمیں پہ ترے
ڈھلکی ہوئی رات کی سیاہی ہے کہ زُلف

رباعی کے روایتی مضامین ہیں، ساقی و ساغر، بے ثباتیِ دنیا، ناپائیداریِ حیات، ستم گاریِ فلک کج رفتار، اہلِ دنیا کی ہوس پرستی، صاحبانِ عمامہ و دستار کی ریاکاری، اور اسی قبیل کے دوسرے خیالات۔ سہیل کی رباعیاں ان سب کے علاوہ زمانۂ حال کی زبوں حالی اور سرمایہ و محنت کی باہمی آویزشوں کا جائزہ بھی لیتی ہیں۔ اور تسخیرِ قمر اور مہم مریخ جیسے جدید سائنسی واقعات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش بھی کرتی ہے۔ آج سے تقریباً ساٹھ سال پہلے علامہ اقبال نے جمہوریت کے متعلق ایک قطعہ کہا تھا:

اس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں، تولا نہیں کرتے

آمریت اور جمہوریت کی بحث، نہایت پیچ در پیچ اور بہت پرانی ہے، اور نہ اس وقت موقع ہے کہ ہم اس بحث میں پڑیں۔ سہیل نے ایک شاعر، ایک صاحبِ فکر کی حیثیت سے اسی مسئلہ پر غور کیا ہے وہ جس نتیجے پر پہنچے ہیں، وہ یہ ہے:

چنگیز و ہلاکو کو بُرا کہتے ہیں
شاہی کو یہ ظلم ناروا کہتے ہیں
اربابِ نظر سے ہے گزارش اتنی
اس فتنۂ جمہور کو کیا کہتے ہیں

فتنۂ جمہور کا تذکرہ اپنی جگہ درست، لیکن اس کے ساتھ ہی جمہور کی ناقدری کا بھی سہیل کو شدید احساس ہے جمہوریت کے نام لیوا کس طرح خونِ جمہور سے اپنے لقمہ کو تر کرتے ہیں۔ بلند و بالا عمارتوں میں رہنے والے دنیا کی تمام آسائشوں سے اپنا دامن بھرنے والے آج کس طرح جمہوریت کا پرچم اونچا کرکے دنیا کو فریب دے رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہم لوگوں پر روشن ہے۔ بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ ہمارا آئے دن کا تجربہ ہے۔ سہیل کی نگاہ دور رس سے بھی یہ بات پوشیدہ نہیں، بلکہ ان کا تجربہ شاید اس سلسلہ میں اور بھی گہرا رہا ہو۔ ان کی رباعی ہے:

جمہور کی عزت، نہ کوئی قیمت ہے
جمہور کے حصے میں بڑی ذلت ہے
ہر شیش محل سے ہو رہا ہے اعلان
جمہوریت اک داشتۂ دولت ہے

سہیل کی فکرِ رسا نے رباعیوں کے سانچے میں دورِ حاضر کی عالمی سیاست اور اس کی ریشہ دوانیوں کو بڑی کامیابی سے ڈھالا ہے۔ حالاں کہ رباعی نازک سی جان، ایسے بھاری بھرکم مضمون کی بہ مشکل ہی متحمل ہو سکتی تھی۔ اس سلسلے میں پھر علامہ اقبال یاد آگئے۔ جنھوں نے " لیگ آف نیشنز " کے بارے میں بڑے پتے کی بات کہی تھی:—

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

سہیل نے بھی مجلسِ اقوام کی خبر لی ہے اور بہت اچھی طرح خبر لی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

دنیا کے ہیں دس بیس جواری بیٹھے
شاہوں کے لباس میں بھکاری بیٹھے
ہے مجلسِ اقوام تماشے کی جگہ
کس شان سے ہیں چند مداری بیٹھے

ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل رباعیوں کے اس مجموعے میں نوش و نیش، شعلہ و شبنم، امید و ناامیدی

بہر عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ (مومن)

رنج و راحت کا ایسا خوش گوار امتزاج ہے، جو شاعر کے مزاج کی مختلف کیفیتوں، اس کے گوناگوں تجربوں اور اس کے ہمہ جہتی مشاہدوں کا عکس پیش کرتا ہے سہیل نے زندگی کو ہر پہلو سے دیکھا ہے۔ انسانی فطرت کی بلندی اور اس کی پستی، دونوں کی حقیقت سے وہ واقف ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کے دل میں انسانیت کا درد ہے۔ اور ان کو اس کا سخت افسوس ہے کہ اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کے باوجود انسان تخریب کے عمیق غار کی طرف بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ چاند پر پہنچنے والا، ستاروں پر کمند پھینکنے والا، خود اپنے گرد و پیش بکھرے ہوئے دکھوں کا مداوا کیوں نہیں کرتا:

اک دانہ جو تم سے بنایا نہ گیا
مردہ کیڑا کوئی جلایا نہ گیا
مریخ و قمر پہ اڑ کے جانے والو
انسان کا دکھ تم سے اٹھایا نہ گیا

بادہ و ساغر اور چشم ساقی کی فسوں کاری کے مضامین بھی اس مجموعے کی رباعیوں میں بڑی برجستگی اور خوبی کے ساتھ نظم ہوئے ہیں، اور شاعر نے رباعی کی دیرینہ روایت پر کہیں آنچ نہیں آنے دی ہے۔ لیکن ان مضامین پر پہلے اتنا کچھ کہا جا چکا ہے کہ اس میں کوئی نیا پہلو نکالنا، جوئے شیر لانا ہے، ہاں اسلوب بیان کی ندرت کی گنجائش تو ہر وقت موجود رہتی ہے مثلاً یہ رباعی:

نغمہ، فریاد، رنج، راحت، ماتم
شعلہ، کافور، زخم، نشتر، مرہم
ہیں، ان کے سوا، نظر کی کیا کیا قسمیں؟
مستی، صہبا، سرور، کوثر، زمزم

سہیل کی اکثر رباعیوں پر خیام کا رنگ غالب ہے، اور یہ کوئی عیب نہیں، بلکہ ہنرمندی کی دلیل ہے۔ چوں کہ سہیل کا فارسی ادب کا مطالعہ بہت گہرا ہے، خیام کی رباعیوں کا اثر قبول کرنا، ایک فطری امر ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ خیام کو رباعی گوئی میں امام فن کی حیثیت حاصل ہے۔ اور امام کی پیروی عین سعادت ہے۔ اسرار کائنات کی نقاب کشائی میں انسانی جستجو کی کم مائیگی کس خوبی سے بیان ہوئی ہے:

رفتار نجوم کا ہے ناظر کوئی
اسرار عناصر کا ہے ماہر کوئی
ہے سب کی زباں پہ اک ادھورا قصہ
کہتا نہیں حرف آخر کوئی

تقریباً اسی خیال کو، خیام نے اپنے انداز میں کہا ہے:

دورے کہ در و آمدن و رفتن ماست
آں را نہ بدایت، نہ نہایت پیداست
کس می نزند دمے دریں معنی راست
کیں آمدن از کجا و رفتن بہ کجاست

کسی بھی شاعر کا سارا کلام، تمام خوبیوں سے مملو نہیں ہوتا۔ مجموعے میں کچھ رباعیاں ایسی بھی ہیں جن میں ردیف و قافیہ کے ساتھ، خیال کی بھی تکرار ہے۔ چند رباعیاں لفظی وقار کے اعلا معیار پر نہیں اترتیں۔ لیکن یہ ایسی کمی ہے، جو ہر فن کار کے کلام میں تلاش کرنے پر بہ آسانی مل جاتی ہے مجموعی اعتبار سے ہم بڑے صدق دل کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ سہیل کی رباعیاں اردو ادب کی رباعیات کے خزانہ میں، ایک بیش قیمت اضافہ ہے۔

***

"ریت گھڑی"

مصنف: ساجد رشید
قیمت: پندرہ روپے
طباعت: فوٹو آفسیٹ: صفحات - ۱۱۲
ناشر: خیاباں پبلی کیشنز، ۱۰۵، نشان پاڑہ روڈ بمبئی ۹۰۰۰۰۴
تبصرہ نگار:- عطار محمد ذوالنورین

"انسانی قدروں کی بساط مضحکہ خیز طور پر الٹ گئی ہے"
وزیر شاہ پر سوار ہو گیا ہے
ہاتھی گھوڑے کہیں کے کہیں جا پڑے ہیں
اور پیادے چاروں خانے چت ہیں
اس بکھری بازی کو دوبارہ کون جمائے؟"

ایک نوحہ، ایک سوال، سوال قائم کرنے والے اردو کے جانے پہچانے افسانہ نگار سلام بن رزاق، اور مذکورہ سوال قایم ہوا ۵ دسمبر ۱۹۷۷ء کو ۔۔۔! پانچ دسمبر ۱۹۷۷ء سے دسمبر ۱۹۸۱ء تک کافی تعداد میں اردو کے افسانوی مجموعے منظر عام پر آئے۔ وہ پریم چند اور کرشن چندر کے عاشق تھے۔ ان چار برسوں میں منظر عام پر آنے والے افسانوی مجموعوں پر بے اطمینانی کا اظہار کرنے لگے۔ کیوں کہ پریم چند کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے پائے کے افسانے اردو کے ان افسانہ نگاروں کے پاس نہیں تھے جنہوں نے اپنا تخلیقی سفر ۱۹۶۰ء کے بعد شروع کیا تھا۔ اور ایمان داری کی بات تو یہ ہے کہ ایسے لوگوں نے جو اس قسم کے دعوے کرتے رہے ہیں ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانے نگاروں کو با دل نخواستہ پڑھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سچویشن ہی پیدا کیوں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد والے افسانہ نگاروں نے اپنے کو ترقی پسند افسانہ نگار کہلوانا، یا لکھنا پسند نہیں کیے جدیدیت ان سے قریب تھی لہذا وہ اپنے کو جدید افسانہ نگار کہتے بھی رہے لکھتے بھی رہے۔ لیکن جدیدیت سے وابستگی ان افسانہ نگاروں کو ان معنوں میں مہنگی پڑی کہ ایک طرف تو ترقی پسند نظریات کے قارئین نے انھیں پڑھنا ہی پسند نہیں کیا اور دوسری طرف جدید شاعری اور جدید افسانے میں نٹ باز در آئے ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں کو بیک وقت تین محاذ پر معروف ہونا پڑا۔ ایک ترقی پسند، جو تخلیقی سفر میں تھک چکے تھے اور ہانپتے کانپتے خطوط نویسی پر اتر آئے تھے۔ دوسری طرف جدیدیے، جن کی دانست میں ان پر شاعری اور افسانہ نگاری ختم تھی۔ تیسری سمت وہ نٹ تھے جن کی طرف سلام بن رزاق نے اپنی کتاب "ننگی دوپہر کا سپاہی" کے پیش لفظ میں اشارہ کیا ہے۔

ان تین محاذوں پر نگاہ رکھتے ہوئے اپنا قاری پیدا کرنا، یا اس کا اعتماد حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف تھا۔ اور ہے خوشی اس بات کی ہے کہ ۱۹۶۰ء کے بعد کے افسانہ نگاروں نے بتدریج اپنے قاری بھی پیدا کیے۔ اور ان کا اعتماد بھی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش کا سہرا ان افسانہ نگاروں کی دو اور دو چار والی واضح پالیسی کے سر بندھتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

"میری وابستگی زندگی سے ہے۔ اور یہی میری تخلیقی قوت ہے۔ میں نے اپنی اس مختصر زندگی کو لمحہ لمحہ جی کر، جو کرب اور تجربات سمیٹے ہیں، وہی میری کہانیوں کے محرکات ہیں۔"

یا پھر

"میں عرفان کی اس منزل کو نہیں پہنچا ہوں۔ اس لیے اپنے پسماندہ ملک کے عام آدمی کی طرح ترقی یافتہ

جس سے کترا کے نکلتے رہے برسوں سر راہ اس سے جب ہاتھ ملایا تو وہ اپنا نکلا (مظہر امام)

مغربی ممالک سے امداد کے نام پر بھیک میں ملا گیہوں کھاتا ہوں، غیر فلٹر شدہ پانی پیتا ہوں" ماخوذ از ـــــ پیش لفظ " ریت گھڑی "

" ریت گھڑی " ساجد رشید کے بارہ افسانوں پر مشتمل کتاب ہے ۔ اور ساجد رشید کا شمار بھی ان ہی افسانہ نگاروں میں کیا جائے گا جو ۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانے کے افق پر ابھرے ہیں ۔ ان کا تخلیقی سفر جاری ہے " ریت گھڑی " کے افسانوں کے مطالعے کے بعد جو مجموعی تاثر ذہن پر قائم ہوتا ہے وہ کچھ اس طرح کا ہے کہ ریت گھڑی کے افسانہ نگار نے اپنے آس پاس کی کہانیاں بیان کی ہیں ۔ عموماً ان کے موضوعات بھی وہی ہیں ۔ اور ان موضوعات کے تحت ساجد نے جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو پیش کیا ہے وہ ہی دراصل خاصی اہمیت کی حامل ہیں ۔ کہانی " آنسو گیس کا غبار " سے یہ سطریں ملاحظہ فرمائیں ۔

" بس کے چلتے ہی ٹھنڈے لوہے کی چھڑ پکڑ کر فٹ بورڈ پر ٹنگ گیا ۔ اندر لوگ کبھی کچھ بھرے ہوئے تھے " بیٹا ابھی کیا ہے جب تمہارا وقت آئے گا تو لوگ بس کی چھتوں پر بیٹھ کر سفر کریں گے "

" اور انکل تب ٹکٹ بیس پیسے نہیں بیس روپے ہوگا ! اسی جوان نے چٹکی لی ۔

" ٹھنڈے فٹ بورڈ پر ٹنگا سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے ؟ " ان " میں یا " ان میں " ؟ اسے لگا جیسے وہ انکل اور جوان بس میں سفر کر رہے ہیں ۔ اور یہ خود دکانوں اور عمارتوں کی طرح پیچھے چھوٹتا جا رہا ہے ۔ اس نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ بس کا ٹکٹ دس پیسے سے پندرہ اور پندرہ سے بیس پیسے کب اور کیوں ہوا ؟ سرکار کا خزانہ خالی ہو رہا ہے یا عوام کی جیبیں ، ساتوں کا محصول تو لیا گیا مگر راتیں کتنی ہیں ؟

ساجد رشید اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذریعہ بڑی بات کہتے ہیں ۔ کبھی علامتوں کے توسط سے " جلتے پروں سے اڑان " اور ٹائیٹل کہانی " ریت گھڑی "

" چشمہ حیران پریشان ایک ایک پودے میں کھوج رہا ہے اسے ، اندر گملے میں گلاب کے پودے کے سوکھنے کا عمل جاری ہے ۔

" یہ روز تم کیا ڈھونڈتے رہتے ہو ؟ ایک تنہا بابا سوٹ جو غالباً روز ہی اسے دیکھتا رہا ہے پوچھ بیٹھتا ہے ۔

" میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں کہیں دیکھا ہے تم نے ؟

" کسے ؟ بابا سوٹ حیرت سے پوچھتا ہے ۔

" وہی تھکے رنگین پروں والی "

ملاحظہ کیا آپ نے صنعتی شہر کی زندگی کا مرثیہ ـــــ علامت ہے لیکن گنجلک نہیں اسی طرح ساجد کے بیشتر افسانے وضاحتی انداز بھی رکھتے ہیں لیکن ساجد کے وضاحتی طرز کے افسانوں میں خطیبانہ انداز بری طرح کھٹکتا ہے ۔ کہیں کہیں یہ طوالت بھی اختیار کر جاتا ہے ۔ " پانسا " میں اس کی طوالت نے اکتاہٹ پیدا کی لیکن ساجد نے تکنیکی طور پر افسانے کی رفتار اتنی تیز رکھی ہے کہ اس کے آگے یہ عیب ماند پڑ جاتا ہے ۔

" پل " اس مجموعے کی بہت ہی اچھی کہانی ہے لیکن اس میں ساجد نے جزئیات پر کچھ زیادہ ہی دھیان دیا ہے اور ہر جزئیات کے بیان میں تمثیل کا سہارا لیا ہے ۔ اگر مثالوں کا سہارا نہ لیا جاتا تو یہ کہانی مزید چست ہو سکتی تھی " پل " ایک کرایے کے قاتل کی نفسیات کی کہانی ہے ۔

اوپر سے گرتا اندھیرا ، فش ٹینک ، لہو میں ہنہناتے گھوڑے ، اندھیرا اندھیرا ، ایکس رے ، نمبر دار اور کٹے ہوئے تارے ساجد کے افسانوی مجموعے کی دیگر کہانیاں ہیں ۔

۱۹۷۰ء کے بعد اردو افسانے کے افق پر نمودار ہونے والے بیشتر افسانہ نگاروں نے موضوعات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان میں بھی تجربے کیے ہیں ۔ ساجد رشید بھی بالکل عوامی زبان استعمال کرتے ہیں ۔ ان کے افسانوی کردار ضرورت پڑنے پر اسی طرح گالم گلوچ کرتے دکھائی دیتے ہیں جس طرح ہم صبح شام اپنے اردگرد سنتے رہتے ہیں ۔ لیکن جہاں ساجد خود کچھ کہتے ہیں وہاں وہ کہیں کہیں لڑکھڑا بھی جاتے ہیں ۔

مجموعی طور پر ساجد کا یہ افسانوی مجموعہ ایک اچھا اور دیرپا تاثر چھوڑتا ہے ۔ مجموعہ بہت ہی خوب صورت شائع ہوا ہے جس کے لیے پبلشر مبارکباد کے مستحق ہیں ۔ لیکن اتنے خوب صورت مجموعے میں کتابت کی غلطیاں اور قلم کا فرق بری طرح کھٹکتا ہے ۔ چوتھے صفحے پر افسانہ نگار کا اسکیچ یوزر آصف خاں نے بنایا ہے اور بہت ہی خوب بنایا ہے ـــــ

ناول :۔ " زخم اور آئینہ "

مصنف :۔ نذیر فتح پوری

ناشر :۔ گل کدہ پبلی کیشنز سہسوان (بدایوں ، یو۔پی)

قیمت : ۵ روپے

مبصر :۔ احمد کمال پروازی

معرفت اہلیہ بانی مارگ (کوٹ) اوجین ۔ ایم۔پی ۔

" ہنری جیمس " اپنے مضمون " فکشن کا فن " میں لکھتا ہے کہ " آپ اس وقت تک اچھا ناول نہیں لکھ سکتے جب تک آپ میں حقیقت کا شعور نہ ہو ، مگر اس شعور کو پیدا کرنے کا کوئی نسخہ تجویز کرنا مشکل ہے انسان لامحدود ہے اور حقیقت کی بھی لاتعداد رنگا رنگ صورتیں ہیں "

ادھر ارسطو نے اپنی تصنیف " بوطیقا " میں شاعری کے برخلاف ، اپنے استاد افلاطون کے بے رحمانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے " میں شاعری (ادب) دراصل ذہن انسانی کا Katharsis کرتے ہیں ۔ کیتھارسس سے اس کی مراد ہے " تزکیہ روح " اور تزکیہ روح کی اساس اس نے المیہ پر رکھی ہے کیونکہ کسی المیہ کے واقعات روح برانگیختہ کرکے خوف اور رحم کے جذبات کو اس سطح پر لے آتے ہیں کہ وہ نہ صرف ختم ہو جاتے بلکہ اپنی ہیئت تبدیل کرکے عزم و عمل کے نئے پیکروں میں ڈھل جاتے ہیں

محولہ بالا سطور کے زیر اثر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی فن پارے کی سب سے اہم اور ناگزیر خصوصیت ، حقیقت کے اس شعور میں مضمر ہے کہ وہ کہاں تک بذریعہ فنی وسائل ، قارئین کے جذبات کو اس مقام پر لے آتا ہے جہاں کہ تزکیۂ روح کے تمام اسباب خود بخود مہیا ہو جائیں ۔ فی الحال ہمیں اسی استدلال کی روشنی میں نذیر فتح پوری کی ناول کا مطالعہ کرکے کسی نتیجے پر پہنچنا ہے ۔

ناول نگار نے ابتدا سے ہی بلکہ عنوان (زخم اور آئینہ) سے ہی اس بات کا کما حقہ ، خیال رکھا ہے ۔ مصنف نے اپنی ناول کی بنیاد المیہ پر رکھی ہے ، جو کہ انتہائی نظم و ضبط اور ربط و تسلسل کے ساتھ اپنی ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا انجام تک پہنچتا ہے ۔ ناول نگار کا اسلوب آہستہ آہستہ لیکن پورے اعتماد کے ساتھ فن اور زندگی کا رشتہ استوار کرتا نظر آتا ہے ۔ مقصد اور فنی احساس کے درمیان کہیں

یہ کیا دستور ہے ، کیسا چلن ہے ، ریت ہے کیسی   خطا کوئی کرے الزام اہل دل کے سر آئے (حکیم رازی)

بھی عدم توازن کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی ہے۔ ایک متوازن نقطۂ نگاہ آغاز سے انجام تک واقعات و کردار کی تعمیر کرتا ہوا دکھائی پڑتا ہے۔

نذیر فتح پوری کی تصنیف "زخم اور آہیں" دراصل ہمارے عصری مسائل کا آئینہ خانہ ہے۔ جو بیک وقت کئی عکسوں کا مظہر ہے۔ جیسے شہر اور شہری ماحول کے پروردہ کردار، مزاج، ذہن، فیشن، کہنہ اقدار کی شکست و ریخت، نئی اقدار کا انتشار، صنعت، ٹیکنالوجی، اور مشینی عہد سے پیدا شدہ ذہنی اور روحانی کھوکھلا پن، اقتصادی، معاشی، سماجی، ناہمواری، نسلی قومی اور مذہبی بے ربطگی وغیرہ کہانی کے وہ جزئیات جو مشترک ہو کر ایک فنی وحدت کی شکل اختیار کر جاتے ہیں۔ اور ناول میں اہم عناصر کا درجہ رکھتے ہیں۔

ناول کا ہیرو عارف ایک خوب صورت نوجوان ہے وہ بیک وقت ایک فرماں بردار بیٹا، وفادار دوست محبت میں ٹھکرایا ہوا مجروح دل اور دردمند انسان ہے۔ وہ اپنی جفا کار محبوبہ کی اُن حالات میں مدد کرتا ہے جب کہ اس کا شوہر اسے بنا کر حالات کے رحم و کرم پر تن و تنہا چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اور وہ موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ یہ ہی وہ شخص تھا جس کی دولت کی عارضی چمک دمک سے مغلوب ہو کر کہانی کی ہیروئن نظر نے عارف کو ٹھکرا دیا تھا۔ رات کے خوف ناک اندھیرے میں جب عارف اس کی دل ہلا دینے والی چیخیں سنتا ہے اور مدد کے لیے تیار ہوتا ہے۔ تو اسے اس بات کا قطعی علم نہیں ہوتا ہے کہ یہی وہ عورت ہے جس نے اس کی کائنات کو غارت کیا ہے۔ یہی وہ عورت ہے جس نے اس کے خوابوں کے شیش محل کو ٹھوکروں سے اُڑا دیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ وہی قلوپطرہ زادی ہے جس نے سانپ بن کر اسے ڈس لیا ہے۔ بہرکیف وہ عارف جو کہ انسانیت کی گرتی ہوئی قدر و قیمت کا علمبردار تھا اپنی لاعلمی میں اسے ہسپتال لے آتا ہے اور ایک اجنبی عورت کے لیے اس وقت تک جاگتا رہتا ہے جب تک اسے یہ معلوم نہیں ہو جاتا ہے کہ اب مریضہ خطرے سے باہر ہے۔

اگرچہ مصنف نے حرفِ اول میں شبانہ کے کردار کو اپنا "آئیڈیل" کہا ہے اور اس کی وجہ مصنف کی اس نام سے فطری محبت ہے۔ یہاں اختلاف کی گنجائش نکل سکتی ہے۔ کیوں کہ آپ اپنی شخصی محبت سے قاری کو تو اپنا ہم خیال نہیں بنا سکتے۔ صرف نام سے محبت ہونا ہی کردار کی کامیابی کا منطقی جواز نہیں بن سکتا۔ کردار کی پرورش اور اس کی تنظیم و تعمیر اس کی مقبولیت کی پہلی شرط ہے۔ بہر حال شبانہ پھر بھی ایک اہم کردار ہے۔ مصنف کی جذباتی وابستگی کے باوجود بھی اس کردار کی انفرادیت اسی ہے کہ اس کا زندگی اور زندگی کی تلخیوں سے براہ راست تعلق ہے۔ وہ دوہرے کردار کی مالک ہے۔ ایک تو سرکاری نرس، جس کا اظہار ناول نگار نے صفحہ ۹۱ کی آخری سطر میں انتہائی کاٹ دار لہجے میں اس طرح کیا ہے کہ اس جملے کی نشتریت دل و دماغ پر ثبت ہو کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً "ایسے مہلک حالات میں اسے سرکاری نرسوں کے حوالے کر کے جانا کہاں کی دانشمندی ہے"

شبانہ کا دوسرا کردار اس عورت کا ہے جس کی رگ رگ سے ممتا اور بے لوث محبت کے سرچشمے پھوٹتے ہیں وہ عارف کی خود نوشت داستان پڑھ کر بے حد متاثر ہوتی ہے وہ عارف کی زندگی کے خلا کو اپنی ہمدردی اور بے لوث محبت سے پُر کرنا چاہتی ہے۔ وہ ایک عورت ہوتے ہوئے بھی جب کہ فطری شرم و حیا اس کے نام سے مخصوص ہے۔ وہ نسائی قیود بند کا دامن چاک کر کے ایک بے ساختہ جھرنے کی طرح پھوٹ پڑتی ہے۔ وہ اپنی خواہش کا برملا اظہار اس طرح کرتی ہے۔ "کیوں نہ ان زخموں کو بھر لیا جائے ہم دونوں ایک دوسرے کے دکھ بانٹ لیں زندگی بہت آسان ہو جائے گی۔"

عارف، نظر اور شبانہ ناول کے تین مرکزی کردار ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے ان کرداروں کی تنظیم و ترتیب میں بڑی جاں فشانی سے کام لیا ہے۔ مکالموں کے ذریعے پس منظر اور پیش منظر کی بڑی کامیاب عکاسی کی ہے۔ ناول کے پر جو ایک مضبوط گرفت ابتدا سے انتہا تک ہونا چاہیے وہ اس ناول کا خاصہ ہے۔ اور سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ نذیر فتح پوری کا رجحان ناول نگاری کی طرف ہے۔ قاری اس ناول کو یقیناً پسند کریں گے۔ اور پسند ہی بقول ہنری جیمس کے "کسی فن پارے کو پسند اور ناپسند کرنا وہ قدیم اصول ہے جو آج بھی اپنی جگہ مسلّم ہے۔ بہترین سے بہترین تنقید بھی اس اصول کی جگہ نہیں لے سکتی۔"

ناول کی قیمت بہت کم ہے اسے مصنف کا ایک تحفہ ہی سمجھنا چاہیے۔

"بھیگا ہوا کاغذ"

ایک تجزیہ ــــ شاہد تیر
شاعر ــــ ممتاز راشد

رسالوں اور کتابوں کی دنیا میں یوں تو نئے پرانے شعرا کی خاصی بھیڑ دکھائی دیتی ہے۔ مگر بہت کم نام ایسے ہوتے ہیں جن میں اپنی طرف متوجہ کرنے کی بھرپور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ ممتاز راشد جدید اردو شاعری کا وہ معتبر نام ہے جس کی شناخت کا مسئلہ کبھی درپیش نہیں آنے پائے گا۔

ممتاز راشد کے تمام کلام کو پڑھ جائیے مگر غزلوں میں زندگی، انتظار، شمع، آئینہ، اشک، گل پھول، زخم، گلشن، خواب جیسے الفاظ کی بھرمار دکھائی دے گی۔ یہ وہ ہی الفاظ ہیں جو جدید تر شعرا کی زبان میں گھس پٹ گئے ہیں اور کثرت استعمال کی وجہ سے اپنی معنویت کھو چکے ہیں۔ مگر راشد کی غزلوں میں مذکورہ بالا الفاظ اتنی تازگی و توانائی سے بھرے ہوئے معلوم ہوتے ہیں جیسے ان کا استعمال پہلی بار کیا جا رہا ہو۔ یہی راشد کے لہجے کی قابلِ قدر خصوصیت ہے کہ جگر و حسرت کے دور کے عام عاشقانہ مضامین نئے پیکر میں ڈھل کر آتے ہیں اور قاری کو ایک نئے ذائقے سے روشناس کراتے ہیں۔

میں نے "بھیگا ہوا کاغذ" کی ورق گردانی کی تو مجھے خوابوں کا رنگا رنگ خزانہ ہاتھ آ گیا۔ یہ وہ خواب ہیں جیسے ایک سچے شاعر کی آنکھ کروٹیں بدلتی ہے۔ کبھی ناموافق حالات کا ایک ہی گہرا وار ان خوابوں کے بھی تار پود بکھیر دیتا ہے۔ کبھی محبوب کی قربت ان خوابوں کو طلوع ہوتے ہوتے سورج کی طرح سبک و چمک دار بنا دیتی ہے ؎

تمام عمر بہلتے رہے ہیں خوابوں سے
ہمیں ملے ہیں سہارے انہیں سرابوں سے
کوئی تصویر نہیں رنگ آبلتے کیوں ہیں
چشم نمناک میں کچھ خواب سے یہ کیوں پلے

ناقص کا مضامیں سے مطلب نہ بر آوے — جز کور ہو عینک سے اسے کیا نظر آوے (ذوقؔ)

جنسِ تعبیر کی قیمت نہیں بازاروں میں
کون سے در پہ یہ خوابوں کا سوالی جائے
اس کی آنکھوں میں خوابوں کی بھیڑ پاؤ گے
وہ ایک شخص جو تنہا دکھائی دیتا ہے
خواب کس طرح بکھرتے ہیں سمجھنا ہے اگر
اپنے سر پر کسی دیوار کا سایہ کرلے
کھو نہ جائے کہیں ہر خواب صداؤں کی طرح
" زندگی محوِ تجسس ہے ہواؤں کی طرح
خواب زندہ ہیں تو ہر درد جواں پاؤ گے
اب بھی آنکھوں سے وہی رنگ رواں پاؤ گے
ہم ہی کچھ نادان تھے جانے کتنے خواب گنوا بیٹھے
اس نے یوں ہی دیکھ لیا تھا چلتے چلتے ایک نظر
دور تک بکھرے ہوئے ہیں زخم یادیں اشک خواب
ہر طرف شمعیں ہیں شمعیں ہیں جدھر جائیگی شام
تمام دور کی موجیں تھیں خواب کی صورت
بجا تھی پیاس سوالوں میں ڈوب جانے کیا

ممتاز راشد کے اشعار کا یہ "خواب خواب سفر" قاری کو دیکھی ان دیکھی دنیاؤں کی سیر کراتا ہے۔ اشعار پڑھتے وقت آنکھوں کے ارد گرد طلسمی دھواں سا ابلتا دکھائی دیتا ہے۔ قاری کو تخلیقی عمل میں شریک کرپانا ہی کسی شاعر کا کمالِ فن ہے جو ممتاز راشد میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

زندگی شیشہ گہ خواب سے نکلی نہ کبھی
وقت پتھر ہے یہ احساس گراں تھا کتنا

راشد کی غزلوں میں دوسرا اہم سمبول (SYMBOL) شام اور تنہائی ہے۔ جو اس دور کے عام آدمی کی آدمی قدر ناشناسی اور قابلِ رحم سماجی و معاشی حالت کا اظہار کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے ؎

بنا رہا ہوں ہر اک رخ سے شام کا منظر
پڑا ہے ڈوبتے رنگوں سے واسطہ مجھ کو!
گھیرے نہ جانے کب کسے تنہائی کا عذاب
اوروں کے ساتھ اپنا بھلا مانگتے رہو
برسے گا آج ٹوٹ کے خاموشیوں کا قہر
ہر اک قدم پہ اسکی صدا مانگتے رہو
ڈھونڈتے رہ جاؤ گے ساحل پہ قدموں کے نشاں
رات کے گہرے سمندر میں اتر جائے گی شام
مجھ کو بھی دی ہے آسمانے شبوں کی تاریکی
وہ شخص جس کے لیے روشنی ترستی رہی

بھٹک رہا ہوں میں حالات کے اندھیروں میں
چمک رہا ہے ترے آنسوؤں سے گھر میرا

ممتاز راشد اسی دور کے باشعور شاعر ہیں اور ان کا یہ اعتراف ؎

ارزاں نہ کرسکے کبھی جنسِ شعورِ فن
اس عہدِ کم نگاہ میں راشد بھی میر ہیں

انھیں زیب دیتا ہے۔ شاید ان کے لیے کبھی نہ کہنا پڑے ۔ ع

کھو گئیں وقت کے جنگل میں صدائیں کیا کیا

"بھیگا ہوا کاغذ" صوری اعتبار سے بھی خوب صورت کتاب ہے۔ ٹائٹل، کتابت، طباعت سب اعلا معیار کے ہیں۔ قیمت دس روپے ہے جو مناسب ہے۔

٭٭٭٭

کھل جا سم سم

تبصرہ :
پروفیسر گوپی چند نارنگ
جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی :
شاعر : مظفر حنفی

مدھیہ پردیش اردو اکادمی کی مالی معاونت سے ڈاکٹر مظفر حنفی کا آٹھواں مجموعۂ کلام خوب صورت گٹ اپ کے ساتھ منظرِ عام پر آیا ہے۔ نئی اردو شاعری میں مظفر حنفی ایک معتبر، مستند اور منفرد آواز کا نام ہے۔ ان کا لہجہ دور سے پہچانا جا سکتا ہے۔ ان کے لہجے کی انفرادیت کا ہمیشہ اعتراف کیا گیا ہے۔ غیر ضروری آرائشگی سے اجتناب کرتے ہوئے مظفر حنفی جس بے تکلفی کے ساتھ عام بول چال کی زبان میں رواں دواں شعر کہتے ہیں اور بات کہنے کے لیے جس انوکھے اور نادر اسالیبِ بیان سے کام لیتے ہیں، اس کی مثال ان کے معاصرین میں نظر نہیں آتی۔ زبان پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور اسکی لطافتوں اور نزاکتوں سے مظفر کی گہری شناسائی ہے چناں چہ ان کے یہاں ایک ایسی قادر الکلامی کی کیفیت نظر آتی ہے جو مدتوں کے ریاضِ سخن کے بعد ہی نصیب ہوا کرتی ہے۔ مظفر حنفی نہ صرف اردو کے کلاسیکی سرمایہ پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کا مشاہدہ بھی وسیع ہے۔ لہٰذا مطالعہ اور مشاہدہ کے اس تال میل سے ایسے ایسے پہلو والا شعر تخلیق کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں جن میں جذبے کی گھلاوٹ، فکر کی شادابی، احساس کی گرمی، طرزِ ادا کی ندرت اور جدید حسیت شیر و شکر کی طرح آمیز نظر آتے ہیں۔ مظفر حنفی کسی خاص نظریہ فکر کے اسیر نہیں اس لیے ان کی شاعری میں اٹل اپنی بات اور انفرادی فکر ملتی ہے۔ وہ ایسے واشگاف انداز میں اور بے باک لہجے میں گفتگو کرتے ہیں کہ ان کے خلوص اور صداقت شعاری کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

میں اس تبصرے میں اجمالاً چند ایسے نکات کی طرف اشارے کرنا چاہتا ہوں جن کی طرف مظفر حنفی کے ناقدین کی نگاہ کم ہی گئی ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ مندرجہ بالا امور کے ساتھ مظفر حنفی کی انفرادیت میں ان خصوصیات کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔

مظفر حنفی کے اکثر اشعار میں ایک خاص نوع کی واقعاتی فضا پائی جاتی ہے۔ اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی افسانے کے مرکزی واقعے کو شعر کے قالب عطا کردیا گیا ہے۔ شعریت اور واقعیت کا یہ امتزاج ان کے کلام کو ایک ایسی کیفیت کا حامل بنا دیتا ہے جس کا ذائقہ ہم عصر شاعری سے بالکل الگ ہے۔ مثلاً یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

میں گنہگار اور ان گنت پارسا چار جانب سے یلغار کرتے ہوئے
جیسے شب خون میں بوکھلا کر اٹھیں لوگ تلوار تلوار کرتے ہوئے

ایک دیوار پہ چھپا تھا اشتہار کوئی
ہم بھٹکتے رہے دربدر دھوپ میں

یہ بھی کوئی آرزو تھی غرق ہو جاتا جہاز
ایک تختہ اور میں بہتا، سمندر دیکھتا

بہت حساس بے حد نرم دل تھا
بھٹکتا ہے وہ سڑکوں پر برہنہ

پھر ایسا بھی اک دور آیا یہاں
شجر خود ہی اپنے ثمر کھا گئے

اردو والوں کو اکثر اس محرومی کا احساس ستاتا ہے کہ صنمیات (اساطیر) سے استفادہ کے مواقع انھیں دستیاب نہیں کیونکہ اسلامی عقائد مائتھولوجی کی تخلیق پر قدغن لگاتی تھی۔ مظفر حنفی ایسی کسی محرومی کا شکار نظر نہیں آتے۔ انھوں نے قصص الانبیاء، طلسم ہوش ربا اور اسی قسم کی دوسری داستانوں سے اپنی شاعری کے لیے مائتھولوجی کا کام لیا ہے جس کی وجہ سے ان کے بہت سے اشعار میں صدیوں کی وسعت ایک پراسرار طلسمی تحیر کی کیفیت اور دھوپ چھاؤں نظر آتی ہے ؎

ملا جو سایا تو دیوار آ پڑی سر پر
جہاں کھلا تھا کوئی در بلا نکلتی تھی!

تا رستے شفق نے چھلکے تھے شبنم میں جو ابھارا تھا وہ کتنا دلکش منظر تھا جب ہم کو پسینہ آیا تھا (عندلیب شادانی)

فنا کی چار دیواری یہاں بھی ہے وہاں بھی ہے
کلینڈر کے یہ آسیب کس گھر میں نہیں رہتا

اس وقت جب طلسمِ فلک ٹوٹنے کو تھا
ایسا ہوا کہ مجھ کو ہلانے لگی زمیں

روز اس کے پاس جا کر بیٹھنا
روز کچھ دیوار جیسا درمیاں

ہر منیر کی مہک چاند کی ہر کرن کے ساتھ
خوف زدہ سا لے نظیر خود ھیں سال کے سب

شیو جی تانڈو ناچ گئے
وہ مسند سے ہلا نہیں

اُدھر ساحل پہ انکا پھونک دینا کشتیاں اپنی
ہمارا پرچم و نقارۂ لشکر جلا دینا

مظفر حنفی ہمارے دور کے ان چند نئے شاعروں میں سے ہیں جن کی لفظیات کا دائرہ خاصا وسیع ہے انھیں نئی بات پرانے انداز میں اور پرانی بات نئے اسلوب میں کہنے پر قدرت حاصل ہے۔ اکثر قدیم علامتیں ان کے جذبے میں تحلیل ہو کر نئے مفاہیم اور جدید حسیت کی آئینہ دار بن جاتی ہیں . . . سفینہ، بادبان، خنجر، وحشت بگولہ، بیاباں وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جن سے ہماری کلاسیکی شاعری نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ اور نئے شعراء میں سے اکثر ان کے امکانات سے مایوس ہو کر انہیں اپنی شعری لفظیات سے جلا وطن کر چکے ہیں۔ مظفر حنفی کے یہاں ان کے فنکارانہ برتاؤ اور تخلیقی استعمال کی چند مثالیں دیکھیے ؎

ریتوں ریت سفینہ مولا پانی دے
ساون پیٹے سینہ مولا پانی دے

بھول میلہ سا لگا کر مرے گھر آنگن میں
در و دیوار پہ وحشت کا بیاباں لکھنا

موجوں کی مار دھاڑ میں لنگر اکھڑ گیا
یہ بادباں گئے وہ ترے ناخدا چلے

لطیفہ ہے کہ میرے قبضۂ قدرت میں دنیا تھی
تو میرا ہاتھ اکثر قبضۂ خنجر میں رہتا تھا

جھوم کر اٹھا بگولہ برگِ زرد اے برگِ زرد
لطف آتا ہے ہوا سے چھیڑ خانی میں بہت

ایک خاص حلقے کی جانب نئے شاعروں پر بطور خاص یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری دروں بینی کا شکار ہے اور اس میں سماجی معنویت کی کمی ہے۔ مظفر حنفی کا کلام ایسے اعتراضات کا منہ بولتا جواب ہے۔ ان کے ہاں ذات اور کائنات کے تقاضوں کا خوش گوار امتزاج ہے۔ ان کے اشعار میں اپنے دور کے مسائل اور مشینی عہد کی پیچیدگیوں کے واضح عکس مرتسم ہیں۔ اکثر وہ اپنے مخصوص کھلنڈرے انداز میں اہم مسائل پر ایسے دلچسپ پیرائے میں رائے زنی کرتے ہیں کہ شعریت بھی مجروح نہیں ہوتی۔ اور سماجی معنویت کا رنگ بھی ابھر آتا ہے ؎

وہ خنجر بھونکنا، بس توڑنا، دفتر جلا دینا
مری جانب سے بھی لوبان چٹکی بھر جلا دینا

جال کے اندر لاکھوں چیخیں
پہلے تم اپنے پر تولو ! ! !

صدائے بازگشت بھی نہ آئی میری چیخ پر
جنگل بجا تو ہر طرف جوان ہی جوان تھے

وزیرِ من کرو کیسی بازی جمائے گا جانتے ہیں ہم بھی
وہی تو پیدل کٹا کے فرزین کیلئے گھر نکالتا تھا

ہر چند کہ آئین میں تحریر نہیں ہے
آزادیٔ گفتار پہ تالے ہیں عزیزو

یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ مظفر حنفی کی شاعری زمین سے لگ کر چلتی ہے۔ اور اس میں گھریلو زندگی کی ایسی بو باس ہے جس کی شناخت دور سے کی جا سکتی ہے مظفر کی پیکر تراشی میں بھی انوکھا پن ہے۔ اس مجموعے سے متعدد ایسے اشعار پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا شمار اس عہد کے منتخب اشعار میں کیا جا سکتا ہے۔ فکر کی شادابی، احساس کی گرمی، طرزِ ادا کی ندرت اور شوخی، واقعیت اور طلسمیت مظفر حنفی کی جس شعری انفرادیت کی شیرازہ بندی کرتے ہیں، اسے نظر انداز کر دینا آسان نہیں ــــ

*****

فکر بَر

کتاب: فکر بَر

شاعر: علیم صبا نویدی

تاریخ اشاعت: جون ۱۹۹۱ء

ناشر: تامل ناڈو اردو پبلی کیشنز، ماؤنٹ روڈ مدراس ۲

قیمت: اٹھارہ روپے

مبصر: ڈاکٹر عصمت جاوید

علیم صبا نویدی کا زیر تبصرہ مجموعہ فکر بَر نئی غزل میں ایک خوش گوار اضافہ ہے۔ تامل ناڈو سے اٹھتی ہوئی یہ آواز ہر اس فرد کی آواز ہو سکتی ہے جس میں جدید حسیت سانس لے رہی ہے۔ طرحِ نو (مطبوعہ ۱۹۷۶ء) اور ردِ کفر (۱۹۷۹ء) کے بعد وہ فکر بَر کی شکل میں نئی سوغات اہلِ ذوق کے لیے لائے ہیں ــ میں فکر بَر کو طرحِ نو کا تسلسل سمجھتا ہوں۔ اور توسیع بھی۔ ردِ کفر میں آزاد غزلوں کا تجربہ ہے۔ جسے پڑھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ یا تو آزاد غزل اب تک اپنا مزاج نہیں بنا پائی ہے یا علیم صبا کا مزاج ہی اس سے لگا نہیں کھاتا (یہ اور بات ہے کہ اگر آزاد غزل کا اردو ادب میں کوئی مستقبل ہوا تو ردِ کفر کو بھی اس کے ماضی میں جگہ مل جائے گی)۔ نئی پابند غزل ہی علیم صبا کا مزاج ہے اور اسی میں ان کی اور ان میں گھلی ملی عصرِ جدید کی ناآسودگی، کرب اور بے قراری اپنا اظہار تلاش کر لیتی ہے۔ ان کی غزلوں میں عربی، فارسی لفظوں کا جو آہنگ ہے وہ سوداؔ کی یاد دلاتا ہے۔ غزل گو کی حیثیت سے سوداؔ کی بد قسمتی یہ تھی کہ انہیں میرؔ سا ہم عصر ملا تھا۔ اور میرؔ کی غزلوں نے ان کی غزلوں کو اس حد تک ماند کر دیا تھا کہ وہ اپنے زمانے میں صرف قصیدہ نگاری کی حیثیت سے مشہور ہو گئے اور انھیں کہنا پڑا

لوگ کہتے ہیں کہ سوداؔ کا قصیدہ ہے خوب
ان کی خدمت میں میں لے کر یہ غزل جاؤں گا

اگر میں علیم صبا کے سلسلے میں سوداؔ کا ذکر کروں تو اس میں چونکنے کی بات نہیں اور نہ علیم صبا یا کسی کے لیے یہ کوئی فخر کی بات ہے۔ دراصل میرؔ، سوداؔ، انشاءؔ اور غالبؔ اردو غزل کے بنیادی رجحانات ہیں۔ اور اس اعتبار سے جب تک اردو غزل رہے گی یہ رجحانات زندہ رہیں گے نئی غزل میں بھی یہ زندہ ہیں۔ فکر بَر کے مطالعے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ الفاظ کا ایک دریا ہے جو امڈا چلا آ رہا ہے اور ردیف و قوافی کی چٹانیں درمیان میں آ جانے کی وجہ سے یہ دریا اور بھی اچھلتا اور مچلتا ہے مجھے علیم صبا کی غزلوں میں معنوی تہہ داری نظر نہیں آئی لیکن جھکڑ پن کے بغیر جدید حسیت کا اظہار کر جانا معمولی اکتساب نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں سب سے بڑی چیز وہ جدید آہنگ ہے، وہ جدت شگفتہ لہجہ ہے جو غزل کو نئی سمت و رفتار دیتا ہے۔ فکر بَر کی غزلوں کے مطالعے سے یوں لگتا ہے جیسے ذہن کے زیرِ سایہ اشعار کی تخلیق خود بخود ہو رہی ہو اور ذہن صرف (Catalyst) کا کام کر رہا ہو۔ اگر فن کی تخلیق ارادہ اور بے ارادہ پن کے درمیان ہو تو اس سے شعور اور لاشعور کی ایسی جھلملی بن جاتی ہے جس سے چمک

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یاں
اپنے اپنے بوزنہ پہ جو گدا تھا شیر تھا (درد)

و فکر چھن چھن کر فنی تخلیق میں گھل مل جاتے ہیں۔ مجھے نئی غزل کا ہر شعر سمجھنے کا دعوا نہیں اور نہ شاید کسی کو ہو لیکن اگر کسی غزل کے مطالعے سے شگفتگی، تازگی اور سب سے بڑھ کر تاریخی قوتوں، عمرانی تقاضوں، قدروں کی شکست و ریخت اور شناخت کی تلاش کا ہلا جھلا احساس جدید قاری کے ذہن میں پیدا ہو تو یہ غزل نئی غزل کہلاتی ہے۔ علیم صبا کے اشعار اسی طرح کا ملا جلا احساس پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے میں فکر بر کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ ہوں:

اس گھر کی بیوگی کو بھلا کون دے سہاگ
جس گھر کا باوقار تبسم شہید تھا

تابوت کے لباس پہ چھڑکا گیا ہے عطر
خوشبو کے قتل کا جہاں ماتم شدید تھا

نیندوں کی سرحدوں سے اتر بھی نہ پائے لوگ
سپنوں کے سب جلوس سویرا نگل گیا

ہونٹوں پہ جنبشوں کا لہو خشک ہو گیا
جب صلیب یاس پہ میری ہنسی چڑھی

کفو ڑی سی روشنی ہی سہی، مستعار دے
میرے بدن میں لمس کا سورج اتار دے

ہر اک افق کو ہے جستجو مسیحا کی!
مزاج جب سے ہوا مضمحل چراغوں کا

میرے کمرے کی اداسی سے لپٹ کر روئیں
دھوپ کا قرب نہ ملنے سے کنواری شاخیں

پیڑ بیوہ ہو گئے ہیں، پتیاں سب اڑ گئیں
مسکراتے موسموں کی دھجیاں سب اڑ گئیں

قفس پسند ہوں ہر چند مرا نیا احساس
ہر اک حصار سے باہر اچھالتا ہے مجھے

میری شناخت کون کرے گا کہ اب بھی میں
اجڑے ہوئے دیار کی نادیدہ گرد ہوں

مرے اندر مجھی سے کھیلتا ہے
یہ کالا ناگ بھی ہے کس غضب کا

یہ اشعار صرف بطور نمونہ چن لیے گئے ہیں۔ اسی قسم اور پایے کے کئی اشعار فکر بر میں مل جائیں گے۔ بے شک علیم صبا کو زبان و بیان پر بڑی قدرت حاصل ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان سے سہو ہو گیا ہے۔ مثلاً

میری سانسوں میں بہاروں کی ہے بھینی خوشبو
میرے حصے میں نہ بادل، نہ گھٹا آئی ہے

اس شعر میں بادل اور گھٹا دونوں کا اس طرح ذکر کیا گیا ہے گویا یہ دو الگ چیزیں ہوں حالانکہ بادل اور گھٹا مترادف الفاظ ہیں۔

اپنے مقطع کے بارے میں ایک جگہ قیمتی حاشیے میں لکھتے ہیں:

"اکثر مقطعوں میں نویدی کی ی ساقط از وزن ہے۔ تخلص ہونے کی وجہ سے میں نے عمداً اسے سنبھال رکھا ہے"

حالانکہ اس شعر میں ی ساقط از وزن نہیں بلکہ صرف دبتی ہے۔ اور شعر میں حروف علت کا دبنا جائز ہے خود ان کے اکثر اشعار میں جہاں تخلص کا استعمال نہیں ہوا ہے حروف علت دبتے ہیں، اسے تخفیف کہتے ہیں، اسقاط نہیں۔ ذیل کے اشعار دیکھیے ان میں خط کشیدہ الفاظ میں حروف علت دبتے ہیں:

ہر فرد میں فریب کی تھیں کونپلیں جواں
ظاہر میں آسمانی کتابوں کا خوف تھا

پیراہن شعور تو پہنے ہوئی تھی رات!
سب تیرگی کے زینے کہاں روشنی چڑھی

اس لیے علیم صبا کو معذرت پیش کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا شکار تو ع ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے۔ البتہ ضمیر رجعی Reflex Pronoun کے استعمال میں ان سے سہو ہو گیا ہے۔ اور یہ سہو ان لوگوں سے ہو جاتا ہے جو اہل زبان نہیں:

کاغذ کے ہونٹوں پر رکھ دوں کیوں نہ مری دہکتی آواز

یہاں میری (مری) کی جگہ 'اپنی' کا محل استعمال تھا۔ اسی طرح مندرجۂ ذیل شعر میں لذت کشید (بجائے لذت کش) کی ترکیب محل نظر ہے۔

مجھ کو سکوت شب کے تسخر کا رنج کیوں
احساس میرا زخم سے لذت کشید تھا

کتابت و طباعت عمدہ۔ کتابت کی صرف ایک غلطی نظر آئی۔ صفحہ چھیالیس پر مطلع میں "میں نور ہوں" کی جگہ "میں نور ہو" لکھا ہوا ہے۔ البتہ کاغذ بہت معمولی استعمال ہوا ہے۔ بہر حال یہ مجموعہ خرید کر پڑھنے اور ذاتی لائبریری کی زینت بنانے کے قابل ہے۔

نام کتاب: **نئی اردو قواعد**

مصنف: ڈاکٹر عصمت جاوید
طابع و ناشر: ڈائرکٹر، ترقی اردو بیورو، ویسٹ بلاک ۸، آر کے۔ پورم نئی دہلی ۲۲ ۱۱۰۰
سنہ اشاعت: ۱۹۸۱
قیمت: ۱۷ روپے
تبصرہ نگار: ڈاکٹر صادق۔ استاد دہلی یونی ورسٹی

اگرچہ زبان و ادب میں جسم و جاں کا رشتہ ہے کیوں کہ ادبی تخلیق کے سوتے زبان ہی سے پھوٹتے ہیں لیکن زبان ادب سے ہٹ کر بھی اپنا وجود رکھتی ہے۔ یہ کسی قوم کے تمام تہذیبی سرمایہ کو اپنے اندر سمیٹنے کے ساتھ ساتھ اس کی فکری توانائی اور علمی ترقی کا اشاریہ بھی ہوتی ہے۔ علمی سطح پر اردو کی ترقی کی موجودہ رفتار ایسی نہیں کہ اس میں مزید اضافے کی خواہش بے محل سمجھی جائے۔ ہماری بد نصیب زبان اب تک جدید ترین اصولوں پر تدوین ہوئی لغت، قاموس (انسائیکلوپیڈیا) فرہنگ مترادفات (Thesaurus) اور مصطلحات علمیہ کے انتظار میں چشم براہ ہے۔ پتا چلا ہے کہ ترقی اردو بیورو، محکمہ تعلیمات، مرکزی حکومت نئی دہلی اس سمت میں اپنی کوششیں جاری رکھے ہوئے ہے صرف ع پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ۔ اردو کی ہمہ جہتی علمی ترقی کے سلسلے میں بیورو کا یہ قدم قابل ستایش ہے کہ اس نے ڈاکٹر عصمت جاوید کی تصنیف 'نئی اردو قواعد' کو اہتمام کے ساتھ شائع کیا ہے اور اس کی نظر انتخاب ایک ایسے شخص پر پڑی ہے جو نہ صرف اردو لسانیات کا استاد رہ چکا ہے بلکہ جس نے لسانیات پر کتابیں بھی لکھی ہیں۔ اردو میں قواعد نویسی کی روایت نہ ہونے کے برابر سمجھی جائے تو کچھ ایسی غلط بات بھی نہیں ہوگی۔ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر گیا اس دوران گنگا میں کافی پانی بہا لیکن بات مولوی عبدالحق کی اردو قواعد سے آگے نہیں بڑھ پائی اور ہم آپ اس بھاری پتھر کو چوم کر آگے بڑھنے میں اپنی عافیت سمجھتے آئے ہیں۔ ڈاکٹر عصمت جاوید کی زیر نظر تصنیف 'نئی اردو قواعد' اس

ہو جب ہی کہتا ہے چل یاں سے تجھے کھتا ہے لا دانے   تو کل ہو تو کیونکر ہو قناعت ہو تو کیونکر ہو (ظفر)

پچاس سالہ جمی ہوئی برف کو توڑنے کے سلسلے میں تیشۂ فرہاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ قواعد خوانی سے ہم اہل اردو الرجی (ALLERGY) ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ہمارا پڑھا لکھا طبقہ اب بھی اسی بھرم میں ہے کہ جب ہم اہل زبان ٹھہرے تو قواعد کے اصولوں سے اپنے ذہن کو گرانبار کرنا کہاں کی دانشمندی ہے، اس غلط فہمی کی جڑیں بڑی دور تک ہمارے ذہنوں کے اندر اتر چکی ہیں، اس لیے جناب عصمت جاوید ان جڑوں پر تیشہ زنی کرتے ہوئے ابتدائیہ بالکل صحیح فرماتے ہیں کہ "کسی زبان کے پس منظر میں کام کرنے والے اصولوں کا شعوری علم خود اہل زبان کے لیے اظہار و بیان کی نئی نئی راہیں تلاش کرنے کی اور اس زبان میں ابہام کی پیچیدگیوں سے بچ کر صراحت اور نفاست پیدا کرنے کی سمت میں ایک بڑا قدم ہے۔ کسی زبان کی غیر شعوری واقفیت اس زبان کے لسانی مزاج کا شعور نہیں دیتی اور نہ وہ بصیرت عطا کرتی ہے جو اپنی زبان کو دنیا کی مختلف النوع زبانوں کے محاذی رکھ کر دیکھنے سے پیدا ہو سکتی ہے۔ اس سے نہ تو اپنی زبان کو تاریخی تسلسل میں دیکھنے والی نظر ملتی ہے اور نہ اپنی زبان کے حدود اور وسعتوں کا اندازہ ہوتا ہے (الفاظ کو خط کشیدہ کرنے کا عمل ہمارا ہے)"۔

جاوید صاحب کی یہ دلیل تو کسی سے اٹھائے نہیں اٹھے گی کہ عمل انہضام کی پیچیدگیوں کا علم رکھے بغیر ہم کھانا ہضم کر لیتے ہیں لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمل انہضام کا علم ہمارے لیے قطعی غیر ضروری ہے۔

ہر اہل علم جانتے ہیں کہ یورپ میں فن قواعد نویسی نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ اور اب تک اس میدان میں انقلابی تجربے کیے جا چکے ہیں۔ اور مختلف اقسام کی قاعدیں جیسے توضیحی قواعد، ساختی قواعد، تقابلی قواعد اور تبادلی قواعد وغیرہم لکھی جا چکی ہیں۔ آج صرف یورپ میں نہیں بلکہ امریکہ اور روس میں بھی قواعد نویسی متفقہ طور پر لسانیات کا جزو لاینفک سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اردو کی علمی دنیا پر ان بدلتے ہوئے رتوں کا کوئی اثر نہیں۔ حالاں کہ اردو میں بھی لسانی نقطۂ نظر سے قواعد لکھنے کی ضرورت سخت بھی ہے اور دیرینہ بھی۔ زیر نظر تصنیف اردو کی پہلی توضیحی قواعد ہے جس میں پہلی بار زبان کے مکتوبی پہلو سے صرف نظر کر کے اس کے گفتاری پہلو کو توجہ کا مرکز بنایا گیا ہے۔ اور جملے کے تعین میں لہجے کے آتار چڑھاؤ کو اہمیت دی گئی ہے۔ جملے میں لفظوں کی ترتیب (ORDER) کیا گل کھلاتی ہے۔ تفاعلی الفاظ (Function words) کس طرح اور کن ضابطوں کے تحت اپنی شکلیں بدلتے ہیں اور جنس و تعداد سے اسم اور فعل اردو جملے میں کیا کیا اور کیسے کیسے اثر قبول کرتے ہیں۔ یہ سب کرشمے آپ کو پہلی بار اس قواعد میں دیکھنے کے لیے ملیں گے۔ اس قواعد میں خوبی یہ ہے کہ "گردان" کے فرسودہ طریقے کو ترک کر کے فعل میں ہونے والی تبدیلیوں کو فارمولوں میں ڈھالا گیا ہے۔

ترکیب (Phrase) اور مرکب کا فرق، مشتق و مرکب کا امتیاز، داخلی اشتقاق اور خارجی اشتقاق میں حد فاصل قائم کر کے ہندی الاصل اور عربی الاصل الفاظ میں اشتقاق کے اصولوں کی نشاندہی یہ اور ایسے کئی مسائل کسی اردو قواعد میں پہلی بار زیر بحث لائے گئے ہیں۔ یہ مسائل دیکھ کر آپ حیران ہوں گے کہ جو زبان دن رات اوڑھنے بچھونے کی طرح استعمال کرتے ہیں وہ اس قدر پیچیدہ ہے اور اس کی پیچیدگیوں میں اس قدر باضابطگی ہے۔ اور مولیر کے کردار کی طرح آپ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ میں اب تک جو کچھ بولتا رہا ہوں وہ نثر ہے۔ اس لیے یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ یہ کتاب اردو قواعد نویسی میں نشان منزل کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس نئی قواعد میں جو لسانی اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں انھیں اردو۔ انگریزی اور انگریزی۔ اردو فرہنگوں کی صورت میں کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی افادیت بڑھ گئی ہے۔ میری رائے میں اس کتاب کے بغیر لائبریری۔ چاہے وہ کالج کی ہو یا اسکول کی۔ پبلک لائبریری ہو یا ذاتی۔ نامکمل رہے گی۔ چوں کہ یہ کتاب ترقی اردو بیورو نے چھاپی ہے اس لیے کتابت و طباعت معیار اعلا ہے البتہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اکثر اوقات اکثر مقامات پر کتابت کی کئی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اگر کتاب کے ساتھ صحت نامہ بھی شامل ہوتا تو تلافی مافات ہو جاتی۔ تعجب ہے کہ پروف ریڈنگ کی طرف کیوں خاطر خواہ توجہ نہیں کی گئی۔ اس کتاب میں تبادلی قواعد اور ساختی قواعد دونوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ اگر فاضل مصنف کسی ایک قواعد کو رہنما بناتے تو زیادہ اچھا ہوتا۔ صوتیات کا حصہ تشنہ محسوس ہوتا ہے۔

البتہ صرف اور نحو کے تحت سیر حاصل بحثیں ہیں۔ کچھ لسانی اصطلاحوں کے اردو ترجمے بھی محل نظر ہیں۔ لیکن مصنف کو اس سلسلے میں معذور سمجھا جا سکتا ہے کیوں کہ یہ کتاب ترقی اردو بورڈ کی لسانی کمیٹی نے چھاپی ہے اس لیے لسانی اصطلاحیں بھی وہی استعمال کی گئی ہیں جنھیں ترقی اردو بورڈ کی لسانی کمیٹی نے تیار کیا ہے اور یکسانیت کے اعتبار سے یہ ضروری بھی ہے۔ ورنہ خود یورپی زبانوں میں لسانیات کی اصطلاحوں کے بارے میں اتفاق رائے نہیں پایا جاتا جس سے لسانیات کے طلبہ کا الجھن بھی ہوتی ہے اور غلط فہمی بھی۔

میں ڈاکٹر عصمت جاوید کو ایسی گرانقدر اور تاریخ ساز کتاب لکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اہل اردو اس کتاب کو جو برصغیر ہند و پاک میں اپنی نوعیت کی پہلی کوشش ہے، ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

آخر میں میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس قواعد کی قدر شناسی صرف انھیں لوگوں کی بس کی بات ہے جو لسانیات میں درک رکھتے ہیں اور جن کا اپنا مطالعہ قواعد نویسی وسیع و عمیق ہے۔ اس لیے اس کتاب کو ہندستان کی مختلف یونی ورسٹیوں میں ایم۔ اے کی درسیات میں شامل تو کیا جا سکتا ہے اور شامل کرنا بھی چاہیے لیکن پھر بھی ایسی قواعد کی ضرورت اب بھی باقی رہتی ہے۔ جو اسکول کے طلبہ کے لیے لکھی گئی ہو۔ آج اسکولی سطح پر جو قواعدیں داخل نصاب ہیں وہ صرف ضابطے کی خانہ پری کرتی ہیں۔ جن کے پڑھنے یا جنھیں رٹ لینے سے طالب علموں کو امتحانی پرچوں میں زیادہ نمبرات تو مل سکتے ہیں لیکن ان سے اردو زبان کا مزاج سمجھنے میں انھیں کوئی مدد نہیں مل سکتی۔

اگر عصمت جاوید صاحب اس طرف بھی توجہ کریں تو ایک دیرینہ علمی ضرورت پوری ہو جائے گی۔ اور اردو قواعد نویسی پر ان کا احسان مسلّم تسلیم کیا جائے گا —

ہے محال عقل زیر آسماں حرص جس دل میں ہو وہ خرّم رہے (درد)

نام کتاب: "ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ"

مصنف: ڈاکٹر صادق، شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی
ناشر: اردو مجلس ۲،۷۷ بازار چتلی قبر دہلی
سالِ اشاعت: ۱۹۸۱ء
قیمت: چالیس روپے
مبصر: ڈاکٹر عصمت جاوید

ایسے زمانے میں جب ترقی پسند ادبی تحریک جدیدیت کی ہنگامہ آرائیوں اور شور و شغب میں اپنی پہچان گم کر چکی ہے اور اپنے دورِ عروج کی بہترین توانائیاں صرف کرنے کے بعد بہ حیثیتِ مجموعی موجودہ اردو ادب کا غالب رجحان نہیں رہی ہے، اس نیم سیاسی، نیم ادبی تحریک کے گذشتہ کارناموں اور اردو ادب پر اس کے احسانات کا محاسبہ کرنے کی کوشش کرنا جراتِ رندانہ سے کم نہیں ہے۔ اور ڈاکٹر صادق نے اس جراتِ رندانہ سے کام لے کر ایک سرد مزاج نقاد کے فرضِ منصبی کو پورا کیا ہے۔ ڈاکٹر صادق اردو کے جانے پہچانے نئے شاعر ہیں۔ نئی اردو شاعری کو نئی سمت و رفتار دینے میں ان کے مجموعے دستخط اور سلسلہ اپنا جاندار رول ادا کر چکے ہیں۔ وہ تجریدی آرٹ میں بھی درک رکھتے ہیں۔ اور اکثر کتابوں اور رسائل کے سالناموں کے ٹائٹل ان کے آرٹ سے مزین دیکھے گئے ہیں۔ وہ نئے افسانہ نگار بھی ہیں۔ ان کے افسانوں میں بھی جدیدیت کی وہ تمام خو، بو، موجود ہے جو انھیں ترقی پسند تحریک کے دھارے سے الگ کرتی ہے۔ اس کے باوجود ترقی پسند تحریک سے ان کی دلچسپی، بل کہ اس تحریک کے احسانات کا عرفان و اعتراف ان کی وسیع النظری اور متوازن رویے پر دال ہے۔ یوں تو ترقی پسند تحریک کے احسانات اردو نظم و نثر دونوں پر ہیں۔ لیکن نثر میں اس کا بہترین مظہر افسانہ ہے۔ اس لیے ڈاکٹر صادق نے اپنی کتاب کے لیے جو موضوع چنا ہے وہ ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ ہے۔ ڈاکٹر صادق نے یہ کتاب ترقی پسند تحریک کے مالہٗ و ماعلیہ کا جائزہ لینے یا اس کے دفاع میں نہیں لکھی ہے۔ اس لیے پیشِ لفظ میں انھوں نے اس حصار کا تعین کر دیا ہے جس کے اندر رہ کر انھوں نے یہ کتاب لکھی ہے۔

"میں نے اس کتاب میں ترقی پسند ادبی تحریک اور اس کے تحت اولین دور (۱۹۳۶ء تا ۱۹۵۵ء) میں تخلیق کیے جانے والے افسانوں کا معروضی مطالعہ پیش کرنے کی امکان بھر سعی کی ہے۔ ترقی پسند تحریک پر کیے گئے اعتراضات کے جواب دینا اور انھیں صحیح یا غلط ثابت کرنا، میرے موضوع سے خارج ہے"۔

اس طرح یہ کتاب نزاعی مباحث سے بلند ہو کر معروضی سطح پر ایک نیم سیاسی، نیم ادبی تحریک کی دین کا اعتراف بن جاتی ہے۔ اور تنقیدی ادب میں ایک معتبر آواز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اردو میں ترقی پسند تحریک کی ابتدا ۱۹۳۶ء میں ہوتی ہے۔ لیکن اس تحریک کے لیے انیسویں صدی ہی سے زمین ہموار ہونے لگی تھی۔ جس کا جائزہ مصنف نے مختلف مذہبی، سیاسی، اصلاحی، سائنسی اور معاشرتی تحریکوں کے پس منظر میں تفصیل سے کیا ہے۔ اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح ہندستانی ذہن آہستہ آہستہ اس تحریک کے لیے تیار ہو رہا تھا جو ایک بین الاقوامی تحریک تھی لیکن اصل موضوع کے پیشِ نظر یہ بحث ضرورت سے زیادہ طول پکڑ گئی ہے۔ اور ترقی پسند تحریک سے قبل کے افسانوں کا جائزہ بھی تناسب میں بڑھ گیا ہے۔

کسی تحریک یا نظریے کے تحت تخلیق ہونے والا ادب اپنے اندر اس تحریک یا نظریے کی مشترک صفات کو اپنے دامن میں سمیٹنے کے باوجود فن کار کی امتیازی خصوصیات کا بھی حامل ہوتا ہے۔ اکثر خلاف ذہن جب ان نظریاتی حدود کو توڑتے ہیں تو لکیر کا فقیر نقاد چیخ اٹھتا اور انھیں اپنی برادری سے خارج کرنے کا فتوا بھی صادر کرتا ہے۔ چناں چہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ بھی یہی ہوا منٹو کو ترقی پسندوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا اور عصمت چغتائی کی 'عہدِ جاہلیت' کی گمراہیوں کی پردہ پوشی کر کے انھیں بزعم خود بڑی فراخ دلی سے ترقی پسندوں کی برادری میں جگہ دی گئی۔ ڈاکٹر صادق نے اس طرح کے تنگ نظر اور سخت گیر نقادوں سے اختلاف کر کے منٹو اور عصمت کو اس تحریک سے وابستہ رکھا ہے جس سے ان کے معروضی رویے کا پتہ چلتا ہے۔ اسی طرح انھوں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت اور منٹو کے افسانوی فن کے باریک سے باریک خدوخال اس خوبی سے نمایاں کیے ہیں کہ دور سے ہم شکل نظر آنے والے یہ چہرے ایک دوسرے سے ممتاز دکھائی دیتے ہیں۔ اور ان کی پہچان آسان ہو جاتی ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے اور نہ ہر ایک کے بس کا ہے۔

ڈاکٹر صادق نے کلیشیز (CLICHES) الجھی ہوئی زبان اور بیشتر شماریات سے متعلق ہونے والے   کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر بھروسہ کرنے اور اپنے قلم کی قوت کا سہارا لینے کے بجائے ان فن کاروں کی تخلیقات کو سلجھے ہوئے ذہن کے ساتھ غور سے پڑھا ہے اور ڈوب کر لکھا ہے۔ یہی خوبی اس کتاب کو تنقیدی ادب میں ایک خوش گوار اور کارآمد اضافے کی حیثیت دیتی ہے اور ڈاکٹر صادق کو ایک سلجھے ہوئے نقاد کی حیثیت سے روشناس کراتی ہے۔ ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔ اور یہ دیدہ زیبی شاید مصنف ہی کے آرٹ اور رنگوں کے حسنِ انتخاب کی مرہونِ منت ہے کاغذ عمدہ ہے لیکن کتابت و طباعت کا معیار وہ نہیں جو چالیس روپے والی کتابوں کے ہونا چاہیے۔ یہ کتاب علمی حلقوں میں قابلِ پذیرائی ہے

گزارش

اہلِ قلم حضرات سے گزارش ہے کہ اشاعت کے لیے اپنی تخلیقات روانہ کرتے وقت جواب طلب امور کے سلسلے میں اپنا لکھا، دو سو پیسے کے ڈاک ٹکٹ لگا لفافہ ضرور ارسال فرمائیں۔ بصورتِ دیگر غیر مطبوعہ تخلیقات نامنظور ہونے کی صورت میں ضائع کر دی جاتی ہیں۔ ایسی تخلیقات جن کے ساتھ لفافہ منسلک نہ ہوں ان کے تلف ہونے کی ذمہ داری ادارے پر نہ ہوگی۔

تخلیقات کے ہمراہ پوسٹ کارڈ سائز کی واضح تصویر بھی ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

حرص کے پھیلتے ہیں پاؤں بقدرِ وسعت
تنگ ہی رہتے ہیں دنیا میں فراغت والے (ذوقؔ)

تعارف :

عالی جناب سید محمد عبدالقادر ولد مولانا قاری حافظ سید عبدالحیؒ

اس عالم فانی میں ازل ہی سے دو قسم کے لوگ موجود رہے ہیں ۔ ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو شیطان کی پیروی کرتے ہوئے اپنے شب و روز برائیوں اور سیاہ کاریوں میں بسر کرتے ہیں۔ ایسے لوگ بارگاہ ایزدی میں سخت ناپسندیدہ و معتوب ہوتے ہیں ۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جو نیکوکار ہوتے ہیں اور حقوق اللہ کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ حقوق العباد کو بھی فراموش نہیں کرتے ایسے لوگوں کے وجود پر زمین ناز کرتی ہے اور انسانیت ان پر عزت و اکرام کے پھول برساتی ہے ۔

اللہ جل شانہ بڑے فخر سے اپنے ان بندوں کا ذکر فرشتوں کی محفل میں فرماتا ہے۔ ارشاد باری ہوتا ہے " یہ تم ہی تھے جو کہتے تھے کہ اے ہمارے رب! انسان کی تخلیق مت فرما کیوں کہ یہ زمین پر فتنہ و فساد برپا کرے گا۔ تیری حمد و ثنا اور بندگی کے لیے ہم کافی ہیں ۔ اور میں نے تم سے کہا تھا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے ۔ اب دیکھو لو میرے ان بندوں کو جو میری محبت میں، میری رضا و خوشنودی حاصل کرنے کی خاطر میرے احکام کی بجا آوری میں کیسی کیسی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کرتے ہیں اور ان کے قدم بڑے استقلال و استقامت کے ساتھ صراطِ مستقیم پر جمے رہتے ہیں۔ ان کی جبینیں میرے سامنے سجدہ ریز ہوتی ہیں اور یہ اخلاص کے ساتھ میرے بندوں کی خدمت میں بھی لگے رہتے ہیں "

درحقیقت ایسے ہی پاکیزہ نفوس کے دم سے یہ دنیا خدا کی رحمتوں اور نعمتوں سے محروم نہیں ہوئی ورنہ آج کے اس بے دینی اور فتنہ و فساد کے دور میں رحمتوں کے نزول کا تصور بھی نہ ہوتا! ایسے ہی پاکیزہ، متقی و پرہیزگار لوگوں میں عالی جناب سید محمد عبدالقادر صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے جنھوں نے محض خدائے بزرگ و برتر کی رضا و خوشنودی کے حصول کے لیے خدمتِ خلق کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیا ہے۔

موصوف کا وطن مالوف لکھنؤ ہے ۔ لیکن بچپن ہی میں آپ اپنے والدین کے ہمراہ بمبئی منتقل ہو گئے ۔ اور یہیں کے ہو کر رہ گئے ۔ آپ مشہور و معروف عالم حضرت مولانا قاری حافظ سید عبدالحیؒ نوراللہ مرقدہٗ کے فرزند دلبند ہیں ۔ اہل بمبئی حضرت مولانا سے کما حقہٗ واقف ہیں جنھوں نے چالیس سال تک تراویح میں انھیں قرآن مجید سنایا ہے۔ ان چالیس برسوں میں مسلسل چھبیس برس آپؒ نے بمبئی کی اسمٰعیل حبیب مسجد میں تراویح میں قرآن مجید سنایا ہے ۔ حضرت مولانا ودود الحیؒ صاحب جیسی شخصیت آپؒ کے تلامذہ میں سے ہیں ۔ عالی جناب سید عبدالقادر صاحب کو تمام اوصافِ حمیدہ اپنے والد بزرگوار سے ورثے میں ملے ہیں۔ جن کی جھلکیاں ان کی زندگی میں ہمیں ہر قدم پر دکھائی دیتی ہیں ۔ نورٌ علیٰ نور ۔ آپ کو حضرت مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری نوراللہ مرقدہٗ و بعد ازاں حضرت مولانا ابوالحسن ندوی صاحب، مدظلہٗ العالی، سے شرفِ بیعت حاصل ہوا۔ ان دونوں بزرگوں کی سرپرستی، رہبری و چشم کرم نے آپ کے اوصافِ حمیدہ کو غیر معمولی جلا بخشی ۔

عالی جناب عبدالقادر صاحب کی ذات اخلاص، ایثار اور دیانتداری کی ایک چلتی پھرتی عظیم درس گاہ ہے ۔ آپ نے کئی بار ضرورت مند لوگوں کے کچھ ایسے کام بھی کیے ہیں کہ جن کی بدولت آپ کروڑوں روپے حاصل کر سکتے تھے ۔ لیکن اللہ رب العزت کی رضا و خوشنودی کی خاطر آپ نے یہ کام مفت انجام دیے ۔ اور ان کروڑوں روپیوں کو اس طرح ٹھکرا دیا جیسے ایک بچہ کسی ٹوٹے ہوئے بے مصرف کھلونے کو ٹھوکر مار کر دور پھینک دیتا ہے ۔ یوں کروڑوں روپیوں کی آمدنی سے منہ موڑ لینے پر دنیا پرست لوگوں نے انھیں بے وقوف سمجھا ۔ لیکن وہ ناداں یہ نہیں سمجھے کہ اللہ جل شانہٗ ایسے ہی "سادہ لوح" لوگوں پر اپنی رحمتیں نازل کرتا ہے اور وہ اس کے مقبول بندے ہوتے ہیں ۔

آپ پھلوں کے تاجر ہیں ۔ اور اس مناسبت سے آپ کی فطرت میں تمام پھلوں کی مٹھاس اور شیرینی اس قدر جذب ہو گئی ہے کہ آپ سے ملنے والا چند ہی لمحوں میں آپ کی شخصیت کی متضا طیسیت و تکلم کی شیرینی و حلاوت سے متاثر ہو جاتا ہے ۔ اور رخصت ہوتے وقت آپ کی عظمت و بزرگی کی شمع دل میں فروزاں کر کے لوٹتا ہے جس کی لو کبھی مدھم نہیں ہوتی ۔ بمبئی کی مشہور کرافورڈ مارکیٹ آپ کی تجارت کا مرکز ہے۔ آپ نے کرافورڈ مارکیٹ کے تاجروں کو بھی اپنی خدمات سے محروم نہیں رکھا۔ چناں چہ ان کے مسائل حل کرنے کے لیے آپ نے دی مہاراشٹرین فروٹ اینڈ ویجیٹیبل ٹریڈرس ایسوسی ایشن" کی بنیاد ڈالی جس کے صدر آپ کے برادر عالی جناب ڈاکٹر سید عبدالواحد صاحب ہیں ۔ اس ایسوسی ایشن کے ذریعہ مفاد پرستوں کی کھلی مخالفت و عداوت کے باوجود آپ ان تاجروں کے مسائل حل کرنے میں ہمہ تن مشغول رہتے ہیں ۔

" ادارہ اسباق " کی یہ خوش نصیبی ہے کہ ایسی نیک سیرت و پاک طینت شخصیت کا اسے تعاون حاصل ہے ۔

ایم یوسف - ایم - اے - بی - ایڈ

تفتیش جب بھی کی کسی اونچے مکان کی ٹوٹے گھروں سے اس کا جا ملا رابطہ (ندیم فتح پوری)

یہ تنگ نائے دہر نہیں منزلِ فراغ   غافل! نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو (ذوقؔ)

منھ سے بس کرتے نہ ہرگز یہ خدا کے بندے
گر حریفوں کو خدا ساری خدائی دیتا (ذوقؔ)

I. AHMED & COMPANY

- IMPORTERS, EXPORTERS, & CONTRACTORS
- FROZEN MEAT-SEA FOOD-TANNED SKINNS LIVE STOCKS & GENERAL MERCHANDISE

TEL.: 345531 – 345716
CABLE: EMTEYAZ
TELEX: 11-2406 IAC IN

22-24 F-Block Sitaram Bldg.
Palton Road, BOMBAY 400 001

NO. PNCE -67

* URDU MONTHLY ASBAQUE" *
572 SACHAPIR STREET
POONA
411001
ISSUE NO. 11,12,13,14